E-Content

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India

Subject / Course - M.A.

Paper : History of Indian Economy

Module Name/Title : Early Medieval Indian Economy

DEVELOPMENT TEAM	
CONTENT	DDE SLM/ Dr. Khalid P. & Dr. Mahboob Basha
PRESENTATION	Dr. Khalid P. & Dr. Mahboob Basha
PRODUCER	M.A. Muneer

IMC MANUU
Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India
//imcmanuu

اکائی 7 کچھ اولین ریاستوں کی معیشت کے تقابلی ڈھانچے (موریہ، کشان، ساتواہن، گپت)

ساخت

7.1 تعارف
7.2 موریہ سلطنت کی معاشیات
7.2.1 زراعتی معاشیات
7.2.2 غیر زراعتی پیداوار
7.2.3 تجارت
7.2.4 لگان کے ذرائع سے آمدنی
7.3 کشان سلطنت کی معاشیات
7.3.1 زراعتی معاشیات
7.3.2 تجارت، تاجر اور سکوں کا چلن Monetization
7.3.3 دستکاری پیداوار انجمنیں (Guilds) اور شہرکاری
7.4 ساتواہن سلطنت کی معاشیات
7.4.1 زراعتی معاشیات
7.4.2 دستکاری، صنعتیں اور تجارت
7.5 گپت سلطنت کی معاشیات
7.5.1 زراعتی معاشیات
7.5.2 غیر زراعتی پیداوار
7.5.3 انجمنیں (Guilds)
7.5.4 تجارت اور تاجر
7.5.5 سکے (Coinage)
7.5.6 لگان کے ذرائع سے آمدنی
7.6 خلاصہ
7.7 فرہنگ
7.8 مشقیں
7.9 معاون کتب

7.1 تعارف

چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر چوتھی صدی عیسوی تک کی مدت میں برصغیر ہندوستان میں ابتدائی سلطنتوں کا ظہور ہوا۔ ان میں سب سے پہلی سلطنت موریہ

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad

سلطنت (تقریباً 324-187 قبل مسیح) ہے اس کے بعد ساتواہن (50-320 عیسوی) اور گپت تقریباً (320-570 عیسوی) سلطنت سامنے آئیں۔ موجودہ اکائی میں ہم ان سلطنتوں کی معاشی ساخت کا تقابلی مطالعہ پر دھیان مرکوز کریں گے۔ موریہ عہد کو عام طور پر ابتدائی ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ میں میل کا پتھر مانا جاتا ہے۔ موریوں نے تقریباً ایک کل ہند سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اس کی وسعت شمال میں افغانستان سے لے کر جنوب میں کرناٹک تک، مغرب میں کاٹھیاواڑ سے لے کر مشرق میں شاید شمالی بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ وسیع سلطنت مختلف نسلوں اور تہذیبوں کا آمیزہ تھی۔ انھوں نے بر صغیر کے مختلف علاقوں کے بے پناہ تہذیبی فرق کو کم کیا۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ موریہ سلطنت تین منطقوں میں تقسیم تھی۔ مرکزی ریاست (بہار میں مگدھ)، بنیادی علاقہ جیسے موجودہ گندھار، کلنگ، سوراشٹر اور مالوہ اور آس پاس کے محیطی علاقے۔ محیطی علاقوں میں شکار کے ذریعہ غذا جمع کرنے والے سماج سے لے کر زراعتی سماج تک شامل تھے ان میں شاید جزیرہ نما کا ایک بڑا حصہ اور شمالی برصغیر کے کچھ حصہ بھی شامل تھے۔

پہلی صدی قبل مسیح میں کشانوں نے جو بنیادی طور پر وسط ایشیاء کا ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا، ایک وسیع سلطنت قائم کی جس کے اقتدار کا اہم مرکز باختر (Bactria) (شمالی افغانستان میں بلخ) تھا۔ کنشک اول (تقریباً 123-100 عیسوی) کے وقت یہ سلطنت اپنی اقتدار کے انتہائی عروج پر تھی تب اس میں شمالی ہندوستان کے وسیع علاقوں سے مشرق میں چمپا اور بھاگل پور، مغرب میں سندھ کی نچلی وادی اور گجرات تک کے علاقے، چینی ترکستان اور آکسس ندی کے شمال تک کے علاقے شامل تھے لیکن متھرا سے مشرق کے علاقوں پر کنشک اول کے جانشینوں کا کنٹرول کم ہی رہا۔ جب 262 عیسوی میں پشاور تک کشان شہر تک کو ساسانی سلطنت میں ملا لیا گیا تب اس سلطنت کی موت کی گھنٹی بج گئی۔ پشاور سے متھرا تک کا علاقہ مقامی طاقتوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔

ساتواہنوں کو راجاؤں کی پرانک روایتی فہرستوں میں آندھرا کی نسل بتایا گیا ہے۔ ان کے روایتی اقتدار کا مرکز پرتشٹان (Pratishthana) اور مہاراشٹر کے اورنگ آباد ضلع کا جدید پیٹھن (Paithan) نگر تھا۔ یہ خاندان پہلی صدی قبل مسیح، اقتدار میں آیا اور تیسری صدی عیسوی کے لگ بھگ پہلے چوتھائی حصہ میں آخر کار ختم ہو گیا۔ ان کا اصل علاقہ غالباً وسطی دکن تھا۔ ان کی حکومت کے ابتدائی دور میں ان کا اقتدار سانچی سمیت وسط ہندوستان کے کچھ حصوں، مغربی دکن اور شاید جنوبی دکن تک پھیلا ہوا تھا۔ گوتمی پتر ستکرنی (تقریباً 196-167 عیسوی) ساتواہن خاندان کا سب سے مشہور راجا تھا۔ اس نے ساتواہن ریاست کو مشرق تک وسعت دی۔ بالاشری کے ناسک کتبے، گوتمی پتر کے ناسک دستاویزوں، سناتی (ضلع گلبرگ) میں ملے ایک ریکارڈ اور گوتمی پتر کے مختلف علاقوں سے حاصل سکوں کے ملے جلے ثبوتوں کے مطابق اس کی ریاست کاٹھیاواڑ، جنوبی راجستھان کے ایک حصہ اور مشرقی دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ دکشن پتھ پتی (Dakshin apathapati) 'دکن کے مالک' کا لقب اختیار کرنے والے ساتواہن راجا مغربی ہندوستان کے ساکا چھترپوں (Saka Kshatrapas) کے ساتھ لمبی لڑائیوں میں الجھے رہے۔ معاشی محرکوں نے اس دشمنی کو ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔

چوتھی صدی کی ابتداء سے لے کر چھٹی صدی کے وسط تک (320-570 عیسوی) گپت خاندان شمالی ہندوستان کی اہم سیاسی طاقت تھا۔ چندر گپت کے ہاتھوں سلطنت کے قائم ہونے کے ساتھ گنگا وادی کے وسطی حصے اور پاٹلی پتر کے آس پاس کے علاقے کو اہمیت حاصل ہوئی۔ ہمیں الہ آباد پراساستی (Allahabad Prasasti) سے معلوم ہوتا ہے کہ چندر گپت اول کے جانشین سمندر گپت کے عہد (335-375) میں گپت حکمرانوں نے گنگا، جمنا دو آب، گنگا کی بالائی وادی، پنجاب ہریانہ، وسطی ہندوستان اور مالوہ کے پٹھاری علاقہ میں اپنے دشمنوں کا صفایا کر دیا اور گنگا کی نچلی وادی میں پاؤں پھیلانے کی کوشش کی۔ اس طرح چوتھی صدی عیسوی کے آخری چوتھائی حصہ میں مغربی ہندوستان میں مالوا کے مغربی حصوں گجرات اور کاٹھیاواڑ کو چھوڑ کر تقریباً پورے شمالی ہندوستان ان کا اقتدار تھا۔ سمندر گپت کے بیٹا اور جانشین چندر گپت دوم (375-414) نے اس کام کو کامیابی کے ساتھ پورا کیا مغربی مالوا میں گپت سلطنت کی توسیع متھرا پر اس کی مضبوط پکڑ کی وجہ سے ممکن ہوئی جو گنگا جمنا دو آب کا مشہور مرکز تھا اور جہاں سے مالوا کے پٹھار کے راستے مغربی ہندوستان میں پہنچا جا سکتا تھا۔ گپت سموت 90 یعنی 410-409 میں ساکا راجاؤں کے سکوں کے نمونے پر گپت راجاؤں کے ذریعے جاری سکوں سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ اس علاقہ پر قبضہ نے گپت راجاؤں کو گنگا وادی کے زرخیز علاقوں کے علاوہ مغربی ہندوستان کے وسیع ذرائع کا بھی مالک بنا دیا۔

7.2 موریہ سلطنت کی معاشیات

موریہ سلطنت کی معاشیات کو سمجھنے کے لئے اہم ذرائع ہیں: 'انڈیکا' جس کے مصنف میگستھنیز (Megasthenes) چندر گپت موریہ کے دربار میں سیلیوکس (Seleucus) کے سفیر (ambassador) کی شکل میں آیا تھا۔ اشوک کے کتبات جو سلطنت کے کم وبیش بڑے حصے میں اہم جگہوں پر کھدوائے گئے تھے، کھدائیوں سے حاصل آثاری باقیات، اور کوٹلیہ کی ارتھ شاستر (Arthasastra) جو سیاسی اقتدار کے معاشی فائدوں کی حامی ہے۔

اس وسیع سلطنت کی بنیاد ایک بڑی فوج تھی اور اتنی ہی موثر حکومت جس کو چلانے کے لئے وسیع ذرائع کی ضرورت تھی۔ ریاست کے ذریعے کنٹرول معاشی ڈھانچے میں ہی وسیع ذرائع کا ایسا اجتماع ممکن تھا۔ اشیاء کی پیداوار اور تقسیم میں موریہ سلطنت عملی حصہ لیتی تھی۔ موریوں کے پاس ایک حتمی لگان کا نظام تھا۔ ارتھ شاستر میں لگان وصولی کو سب سے اہم کاموں میں رکھا گیا ہے اس سلسلے میں خصوصی، مفصل اور ریاست کے انتظامی امور سے متعلق بہت اہم مطلق ابواب اور ہدایات دی گئی ہیں۔

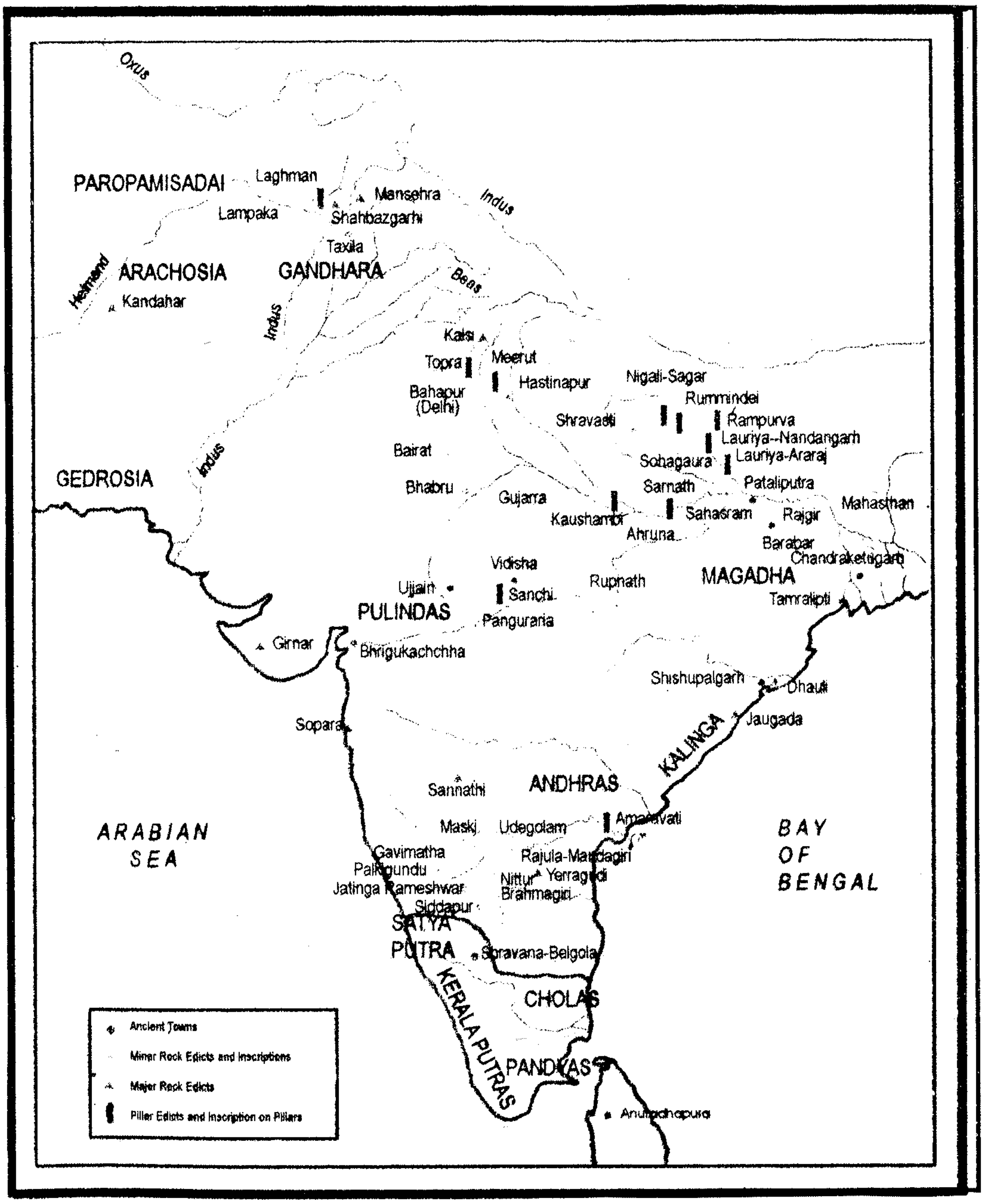

نقشہ 1: موریہ سلطنت (رومیلا تھاپر، ارلی انڈیا فرام دی اوریجنس ٹو اے ڈی 1300، پینگوئن، 2002، نقشہ 5 پر مشتمل)

7.2.1 زراعتی معاشیات

زراعت اورزراعتی علاقہ سے حاصل لگان ان کی معاشیات کی بنیاد تھے۔موریہ وہ پہلی سیاسی طاقت تھے،جن کا سندھ اورگنگا،دونوں کے ندی نظام پر جو بڑے بڑے زرعی طبقات کوسہارا دیتا تھا،پرکنٹرول تھا۔سیتا دھیکش (Sitadhayksha) زراعتی نگراں کی نگرانی میں سرکاری زمین سے حاصل آمدنی شاہی خزانہ کی آمدنی کے اہم ذرائع تھے۔میگستھنیز سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کا سب سے بڑا حصہ کسانوں کا تھا۔سب سے بڑے درجے میں کسان موریوں کے شہری اورفوجی،دونوں قسم کے ڈھانچوں کے رکھ رکھاؤ کے لئے زراعت اوراس کی ضرورت کی مرکزی اہمیت کوواضح کرتے ہیں۔زراعتی میدان ریاست کی سرگرمیوں کے علاوہ کاشت کاروں یازمین مالکان کی شکل میں خودزمین مالکان کھیتی کرتے تھے یا کراتے تھے اورریاست کومتعدد قسم کے ٹیکس دیتے تھے۔شکاری اورگڈریے دیہاتی علاقوں کوجنگلی جانوروں سے خالی کراتے تھے اوراس طرح زراعتی علاقہ کوبڑھانے میں حکومت کی مدد کرتے تھے۔اس سے نئی بستیوں میں ضروراضافہ ہوا ہوگا۔ان کی اہمیت کاارتھ شاستر میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ان نئی بستیوں نے سلطنت کے اقتدار کے موجودہ معاشی اور مالیاتی بنیاد کی وسعت میں بھی ترقی دی۔میگستھنیز نے غلامی نظام کی غیرموجودگی پربھی تنقید کی ہے لیکن مالدار گھرانوں میں گھریلو غلام مستقل طور پر پائے جاتے تھے۔داس کرم کار لفظ کا مطلب غلام اورکرائے کا مزدور ہے۔ان دونوں کی حالت اچھی نہیں تھی اور غالباًان کا استحصال بھی بہت زیادہ ہوتا تھا۔غلام مزدوروں کا استعمال کانوں میں اورکچھ دستکار انجمنوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔چندر گپت موریہ اوراشوک دونوں کے عہد میں،سینچائی،میں ریاست کی پہل کا پورا علم ہمیں شک راجا رودردمن (تقریباً150-130عیسوی) کی جونا گڑھ پرشاشتی (150عیسوی) میں مذکور سدرشن آبی ذخیرے کی تاریخ سے ہوتا ہے۔اشوک نے نہ صرف اس آبی ذخیرے کا رکھ رکھاؤ کیا بلکہ اس میں نالیاں بھی بنوائیں جس سے آس پاس کے زراعت کے لائق علاقوں میں پانی کی تقسیم میں یقیناً مدد ملی۔کسانوں کے فائدہ کے لئے ریاست علاقائی سطح پربھی سینچائی کی سہولتیں عطا کرتی تھی اور پانی کی فراہمی کوکنٹرول کرتی تھی۔میگستھنیز نے ایک خاص درجہ کی افسران کا حوالہ دیا ہے جو پانی کے نکاس کے راستوں کا معائنہ کرتے تھے تاکہ کسانوں کو برابر برابر پانی ملے۔ہوسکتا ہے یہ افسروہی راجوکا (Rajuk) ہوجواوردوسرے مختلف کاموں کے ساتھ فلاحی اموری نگرانی بھی کرتے تھے۔

جونا گڑھ شاپرشتی (Junagarhprasasti)

(یہ لوگ (باہنر)

(سطر1) گری نگر (ایک لمبی دوری؟) سے نکالی گئی یہ شدرشن جھیل اتنے اچھے طریقہ سے بنی ہوئی ہے کہ ایک پہاڑ کی مضبوطی کا مقابلہ کرسکے کیونکہ اس کے سبھی بندھ مضبوط ہیں،لمبائی،چوڑائی اوراونچائی میں بنادرز کے بنائے گئے ہیں اور پتھر(مٹی) کے ہیں ایک قدرتی باندھ سے آراستہ ہیں۔(بنے ہوئے ہیں) اورخوبصورت طریقہ سے بنے نکاس کے راستوں،نالوں اورگندے پانی سے بچاؤ کے ذرائع سے آراستہ ہیں۔۔۔۔تین سیکشن۔۔۔۔اوردیگر خصوصیات (آج) ایک بہترحالت میں ہیں۔

(سطر3) یہی آبی ذخیرہ اس راجا مہا چھترپ رودردمن جس کے نام کوعزت کے ساتھ دوہرایا جاتا ہے،جس کا نام لینا واجب التعظیم ہے،جو بیٹا ہے.......اوراس مہا چھترپ راجاچشٹان کے بیٹے کا بیٹا ہے،کے 72ویں سال میں مارگ سیر(Margasira) کے نصف سیاہ کے اول کو۔جبکہ بادلوں سے گررہی بارش کے سبب،جبکہ زیادہ خوفناک ہوچکی (Suvarnasikata Palasini) سورن سیکٹ پلاشینی کے اور ارجایت (Urjayat) پہاڑ سے نکلی دوسری ندیوں کے سیلاب کی وجہ سے زمین ایک سمندر کی طرح بن گئی ہو،یہ باندھ.......حالانکہ مکمل پیش بندیوں کے (لی گئی تھیں)؟ لیکن ایک طوفان کی وجہ سے ابال پرآئے پانی نے،ایک دنیاوی عہد کے خاتمہ پر دکھائی دینے والے بے حد غصہ کے ساتھ پہاڑی چوٹیوں،درختوں،ساحلوں،کنگوروں،اوپری منزلوں،دروازوں اورچبوتروں پربنی پناہ گاہوں کو چور چور کردیا اور پتھروں،درختوں،جھاڑیوں،بیلوں کو چاروں طرف منتشرکردیا تب اسے ندی کے ساحل پر بنایا گیا تھا۔

(سطر 7) چار سو بیس (420) ہاتھ لمبی، اتنی ہی چوڑی (اور) 75 ہاتھ گہری ایک درار کے راستہ سب پانی باہر نکل گیا جس کی وجہ سے یہ آبی ذخیرہ تقریباً ریگستان جیسا (دیکھنے میں) زیادہ بدصورت (ہوگیا)

(سطر 9) اس مہا چھترپ رودرمن نے ہزاروں سالوں تک برہمنوں کی....... کے لئے اپنے ثواب اور نیک نامی میں اضافہ کرنے کے لئے —— شہروں اور دیہاتوں کے باشندوں کو لگان لگا کر ستائے بنا، ان سے بے گار لئے بنا، اور دکھاوٹی کام کئے بغیر...... اپنے ذاتی خزانہ سے ایک بھاری رقم (کا خرچہ کرکے) اور بہت زیادہ وقت لگائے بغیر (سبھی) ساحلوں پر...... لمبائی اور چوڑائی میں تین گنا مضبوط یہ باندھ بنوایا....... (اور اس طرح) دیکھنے میں اس (آبی ذخیرہ) کو اور بھی خوبصورت بنوایا۔

(سطر 16) اس بارے میں جب مہا چھترپ کے مشیروں اور انتظامی افسروں نے، جو اگرچہ وزیر کے عہدے کے لئے پوری طرح قابل تھے، درار کے بڑا ہونے کی وجہ سے بیکار (سمجھے جانے والے) اس کام کے لئے بے توجہی دکھائی اور (اس کام کے) ابتداء کی مخالفت کی اور جب باندھ کی تعمیر نو کے لئے غمزدہ عوام پکار پکار کر التجا کر رہی تھی تب (یہ کام) وزیر سوویسکھ (Suvisakha) کا بیٹا کلیپا (Kulaipa) نے جو ایک پہلوا (Pahlava) تھے، کرایا جسے شہروں اور دیہاتوں کے باشندوں کے فائدہ کے لئے راجا کے ذریعے مقرر کیا گیا تھا۔ جس کی حکومت پورے انرتا اور سوراشٹرا (Anarta and surastra) پر تھی (ایسا وزیر) جس نے اپنے اچھے کاموں کے ذریعے اور دنیاوی اور آخرت کے ضمن میں اپنے اچھے خیالات کے ذریعے (عوام کا) لگاؤ بڑھایا جو قابل اور صابر تھا اور ضعیف الارادہ و مغرور نہ تھا، جو ایماندار تھا (اور) جسے رشوت سے خریدا نہیں جاسکتا تھا اور جس نے اپنی اچھی حکومت کے ذریعے اپنے مالک کی روحانی منزلت، نیکنامی اور شہرت کو بڑھایا۔

ایف کیل ہارن: دی جوناگڑھ راک انسکرپشن آف رودردمن، اپی گرافیا انڈیکا، جلد 8، 1981، صفحہ 9-45۔

7.2.2 غیر زراعتی پیداوار

موریہ سلطنت میں غیر زراعتی علاقہ سے بھی وسائل حاصل کئے جاتے تھے۔ ارتھ شاستر کی سفارشوں اور قدیم مصنفوں کے مشوروں سے اشارہ ملتا ہے کہ زراعتی علاقہ سے حاصل لگان کی اچھی خاصی بھرپائی تجارت، معدنیات اور دھاتوں کے استعمال، دھات اور مختلف قسم کی صنعتوں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ جنوبی ہندوستان کے کچھ حصے جن کی تہذیبی حالت مگدھ اور گندھار جیسی نہیں تھی۔ لوہے، سونے اور ہیرے کے دستیابی کی وجہ سے معاشی نظریہ سے اہم ہوگئے۔ اشوک کے متعدد کتبات دکن میں قائم ہیں۔ اشوک کے کتبات کرنول، گلبرگ، رائے چور، بیلاری اور چتل درگ ضلعوں سے ملے ہیں۔ ان میں سے پہلا آندھرا پردیش اور باقی کرناٹک ضلع میں واقع ہیں۔ وہ غالباً جنوبی صوبہ میں آتے تھے جس کا صدر دفتر (مسکی کے پاس) سوورن گری میں تھا۔ یہ اس ثبوت کا اشارہ ہے کہ موریہ اس علاقہ کے قیمتی معدنیات کے ذرائع سے واقف تھے اور ان میں دلچسپی لیتے تھے۔ کانوں کے کام پر اور معدنیات کی تجارت پر ریاست کی اجارہ داری تھی۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ موریہ افسر معدنیات کی بالواسطہ نگرانی کرتے تھے اور ان میں ایسی دھاتوں کی فلز والی کانیں بھی تھیں جن کا استعمال اوزار بنانے کے لئے کیا جاسکے۔ اس وجہ سے حکومت کو ایسی نئی کانوں کا پتہ لگانے اور ان کی کھدائی کرنے کی فطری طور پر رغبت ہوئی ہوگی جو کثیر آمدنی کا علاقہ بن سکیں۔ کان کنی اور دھات صاف کرنے کی تکنیک پر ارتھ شاستر میں مفصل ذکر کیا گیا ہے، کچی دھاتوں کی خصوصیت اور ان کے گلنے اور صاف کرنے کے طریقوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب بار بار یاد دلاتی ہے کہ کانیں دولت کا ایک اہم ذریعہ ہیں اور وہ نئی بستیوں کے ظہور کی اہم وجوہات ہیں۔ یہ بات اہم ہے کہ موریہ سلطنت کا سب سے جنوب میں واقع صدر دفتر سوورن گری کولار کی سونے کی مشہور کانوں کے پاس واقع تھا۔ ریمنڈ آلچن (Raymond Allchin) نے کرناٹک اور آندھرا پردیش میں سونے اور ہیرے کی کانوں پر بہت پہلے سے کام کئے جانے کے نشانات کا پتہ لگایا گیا ہے۔ ان کی رائے میں یہ بہت پہلے، موریہ عہد کی بات بھی ہوسکتی ہے۔

کانوں اور کارخانوں کی شروعات

نمبر 1: کانوں کے ناظم کوزمین میں (دھات) دھاتوں والے معدنی پرتوں کے علم اور دھات صاف کرنے سے، گلانے کے ہنر اور قیمتی پتھروں کو رنگنے کے ہنر سے واقفیت ہونے کی وجہ سے یا ان علاقوں میں ماہرین کی مدد حاصل ہونے کی وجہ سے اور ہنر مند مزدوروں اور آلات سے پوری طرح لیس ہونے کی وجہ سے چاہئے کہ فضلہ (dross) گھڑیا (crucibles) کوئلہ اور راکھ کی پہچانوں کی بنیاد پر ایک پرانی کان کا معائنہ کرے یا ایک نئی کان کا معائنہ کرے وہاں زمین کے اندر چٹانوں میں یا رقیق شکل میں خام دھات ہوں جو زیادہ گاڑھے رنگ کی اور بھاری ہو اور جن کی تیز بو اور ذائقہ ہو (صفحہ 105,2.12.1)

نمبر 5: زمین کے اندر یا چٹانوں میں موجود ایسی خام دھات جو پیلے یا تانبہ کے رنگ کی یا لال پیلی ہوں، جو توڑے جانے پر نیلی دھاریاں دکھائیں یا ہنگ (Mudga) یا ماس پھلی (Masabean) یا کرسر (Krsara) کے رنگ کی ہوں جو چتی داریوں یا جس میں دہی کے گومڑے پڑے ہوں، جن کا رنگ ہلدی یا ہلیلہ یا کمل پتی یا کائی، جگر، تلی یا زعفران کے رنگ کے ہوں، جو توڑے جانے پر باریک ریت کی لائنیں، چتیاں اور (Savstikas) سواستک سامنے لائیں، جن میں کنکریاں ہوں اور چمکیلے ہوں جو گرم کرنے پر ٹوٹے نہیں اور ڈھیر سا جھاگ اور دھواں چھوڑیں وہ سونے کی کچی دھات ہوتی ہیں اور ان کا استعمال تانبے اور چاندی کی شکل میں قلب ماہیت طور پر سوزن کاری کے لئے کرنا چاہئے۔

کوٹلیا، ارتھ شاستر، مترجم آر۔ پی۔ کانگلے، دوسرا ایڈیشن ممبئی، 1972، جلد 2، باب 12، جز 30، صفحہ 6-105

شراب اور نمک کی تجارت پر ریاست کی تقریباً اجارہ داری تھی۔ سرکار جہازوں کو بنواتی اور ملاح وتاجروں کو کرائے پر دیتی تھی۔ ان سب کی وجہ سے معاشیات میں ترقی ہوئی اور ان کی وجہ سے خزانہ میں بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ شمالی کالے پالش والے ظروف کا استعمال اور بھارت کے ایک بڑے حصہ میں تقریباً 300 ق۔م سے ہی مہری (Punch Marked) سکوں کا اجراء بھی موریہ عہد میں تجارت کی توسیع سے متعلق ادبی ثبوتوں سے میل کھاتا ہے۔ ظروف کی یہ قسم منقش بھورے ظروف (PGW) کے بعد آتی ہے۔ اور تکنیکی اعتبار سے اس سے زیادہ آگے ہے۔ شمالی سیاہ پالش والے ظروف کے عہد کو کم وبیش تقریباً 600 سے 100 ق۔م تک مانا گیا ہے۔ اس کے باقیات سب سے زیادہ گنگا کی وسط وادی میں لوہے کی بنی اشیاء کے ساتھ ساتھ ملے ہیں حالانکہ یہ سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی ملے ہیں۔ اس برتن کے استعمال کی ابتداء گنگا کی وسط وادی میں شہرکاری کی ابتداء کے ساتھ ہی ہوئی۔ اس برتن کا استعمال سماج کے مالدار طبقوں کے ذریعے کیا جاتا تھا اور اس لئے اسے ڈیلکس برتنوں کے درجہ میں رکھا جاتا ہے۔ مہری سکوں کی دھات یا تو چاندی تھی یا تانبہ تھا اور ان کی شکل گول / لگ بھگ گول یا مربع / تقریباً مربع ہوتی تھی۔ ان سکوں پر کسی راجا کا نام یا سیاسی اقتدار کی چھاپ نہیں ہے اس کے بجائے دھاتوں کے ٹکڑوں پر الگ الگ ٹھپوں کی مدد سے علیحدہ علیحدہ نشان بنا دئے جاتے تھے۔ بڑی تعداد میں چاندی کے مہری سکوں کے حصول سے اشارہ ملتا ہے کہ زر کی ایک بڑی مقدار چلن میں تھی۔ مبادلہ کے ذریعہ ان سکوں کا مستقل استعمال یقیناً ہی پھلتی پھولتی تجارت کا ثبوت ہے۔ تانبے کے ایسے سکے بھی ملے ہیں جن کو موریہ عہد کا مانا جاسکتا ہے۔ ارتھ شاستر میں سکوں کی ڈھلائی کو ریاست کا اہم اختیار شاہی مانا گیا ہے۔ ہمیں ایک ''روپ درشک'' (Rupadarshaka) کہلانے والے ایک آفیسر کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ جس کو حکومت نے سکوں ڈھلائی کروانے اور رائج کرنے پر نگرانی رکھنے کا اختیار دیا تھا۔ موریہ حکومت نے سکوں کی ڈھلائی کو ایک کل ہند یا تقریباً کل ہند کی شکل عطا کی ہے۔

7.2.3 تجارت

موریہ عہد میں تجارت کی توسیع اور دور دراز کے علاقوں کے بیچ روابط کے قائم ہونے کی وجہ سے مبادلہ کو بڑھاوا ملا۔ خاص طور پر کانچ، مٹی اور موتیوں جیسی معمولی

اشیاء کے مبادلہ کو اور ساتھ ہی سنگ سلیمانی (agate) عقیق (carnelian)، یشپ (Jasper) اور لاجورد کے موتیوں کے مبادلہ کو بھی۔ بھڑ گو کچھ (بھڑوچ) ہاتھی دانت اور سیپی کے کاموں سے جڑا ہوا تھا۔ متھرا بھی موتی بنانے کا اہم مرکز تھا۔ کوٹلیا کی ارتھ شاستر تجارت پر ریاست کی نگرانی اور کنٹرول کی زوردار پیروی کرتی ہے۔ ریاست کی تجارتی پالیسی بنانے اور پوری طرح سے نگرانی رکھنے کا کام پانیادھیشک (Panyadhyaksha) یا تجارت کے مہتمم کو سونپا گیا تھا۔ لگتا ہے کہ ارتھ شاستر اندرونی اور غیر ملکی تجارت دونوں کی لگان دینے کی طاقت سے واقف تھی۔ پھر بھی مناسب اعداد وشمار کی کمی میں یہ طے کرنا مشکل ہے کہ واقعی موریہ کس حد تک تجارت کی نگرانی اور قابو رکھتے تھے۔ میگستھنیز سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جہاز بنانے پر موریہ حکومت کی اجارہ داری تھی۔ ارتھ شاستر نوادھکش (Navadhayksha)، جہاز رانی مہتمم کے مطابق جہاز رانی پر ریاست کی نگرانی کی سفارش کرتا ہے۔ سمندر اور سمندری تجارت کے تئیں موریوں کے رخ کو سمجھنے کے لئے ثبوت کافی نہیں ہے پھر بھی یہ سمندری تجارت میں موریوں کی کچھ دلچسپی کا اشارہ ہوسکتا ہے۔ بحرین کے پاس فیلکا (Failaka) میں ہوئی آثار قدیمہ کی کھوجوں سے سیلیوسڈ Seleucid کی حکومت کے دوران جس کے ساتھ موریوں کے مستقل روابط تھے فارس کی خلیج میں تجارت کی سرگرمی کا پتہ چلتا ہے۔ فیلکا کے ذخیرہ میں ہمیں ہندوستانی اشیاء بھی دکھائی دیتی ہیں جیسے سانچے میں ڈھلے برتن، ٹھپے دار برتن (گلاب، پتیاں)، کالے ڈھلے ہوئے ظروف، وغیرہ اور فیلکا کی یہ آثار قدیمہ اشیاء گریک عہد میں میسوپوٹامیہ اور ہندوستان کے تعلقات کی وضاحت کے لئے ایک بنیادی حوالہ کے جز بنتی رہی ہیں۔ سیلیوسڈ عہد میں ہندوستانی اشیاء کی تجارت کی تصدیق دیگر گریک (Hellenistic) ذرائع سے ہوتی ہے۔ مثلاً ہمیں 287-288 ق م میں دی دائما (Didyma) میں اپولو کے مندر میں سیلیوکس اول (281- 311 ق م) کے چڑھائے نذرانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں لوبان (Frankincense) گوند (Myrrh) تیز پتہ، دال چینی اور کوٹھ (Costus) بھی شامل تھیں۔ ان میں سے بعد کی تین اشیاء یقینی طور پر ہندوستان سے برآمد ہوتی تھیں۔

7.2.4 لگان کے ذرائع/وسائل سے آمدنی

ٹیکس لگانا موریوں کے لئے ذرائع آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ عام ٹیکسوں کو ریاست کی سبھی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ریاست متعدد معاشی کاموں میں حصہ لیتی تھی اور ان پر کنٹرول رکھتی تھی جو ریاست کی آمدنی کا فائدہ مند ذریعہ تھا۔ بڑی تعداد میں مروجہ اور نئے ٹیکس وصول کئے جاتے تھے۔ اہم ٹیکس تھا کسانوں کی پیداوار میں ریاست کا حصہ۔ جو 1/6 یا 1/4 ہوتا تھا۔ معین حصہ کے علاوہ بالی اور ادک بھاگ (bali and udakabhaga) (پانی کا ٹیکس) بھی وصول کئے جاتے تھے۔ رمن دئی کے (Rummindei) اشوک کے کتبے سے کافی واضح ہے کہ موریہ حکومت بھاگ (پیداوار میں حصہ) اور بالی (ایک ضروری بھگتان) دونوں کی وصول کرتی تھی۔ کسانوں سے پنڈاکر (Pindakara) وصول کیا جاتا تھا جو گاؤں کے گروپوں کے ذریعہ ایک مشت رقم ہوتی تھی۔ سینچائی کا ٹیکس مساوی درسے نہیں بلکہ پانی کے حصول کے مطابق لیا جاتا تھا۔ راجدھانی میں رہنے والے دستکاروں کی انجمنوں سے بھی ٹیکس وصول کئے جاتے تھے۔ شہری مراکز دستکاری اور تجارت پر ریاست کے کنٹرول کی وجہ سے ہی اہم نہیں تھے بلکہ اس لئے بھی تھے کہ مختلف قسم کے ٹیکسوں کی شکل میں وہ بھاری رقم دیتے رہتے تھے۔ خزانہ میں کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک مشت لیا جانے والا پرنئے (Pranaya) جیسا زائد ٹیکس لگایا جا سکتا تھا جو مٹی کی نوعیت کے مطابق پیداوار کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی حصہ ہوسکتا تھا۔ سرکاری آفیسر لگان وصول کرتے تھے اور زمین سے جڑے دستکاروں کی دیکھ بھال کرتے تھے جیسے لکڑ ہاروں، بڑھئی، پیتل کے کاریگروں اور کان کے مزدوروں کے کاموں کے ٹیکس کی دریں بہت زیادہ تھیں اور ان کی مدیں بھی متعدد تھیں لیکن سرکار کے پاس بقایا وصول کرنے کے لئے ایک طاقتور نظام تھا۔ پتنجلی (Patanjali) کا مہا بھاشیہ (Mahabhashya) بتاتا ہے کہ سونے (Gold) کے لئے متمنی موریوں نے مورتیاں بنوائیں؛ یہ اشارہ دیتا ہے کہ موریہ حکومت ہر ممکن ذریعہ سے

رمن دیئی ستون کا کتبہ (Rumindei Pillar Inscription)

مہاراجا پیاداسی (Piyadasi) دیوتاؤں کے محبوب نے جن کا 20 سال پہلے راج تلک (تاج پوشی) ہو چکا تھا (1) وہ خود آئے اور انھوں نے عبادت (2) کی اور کہا (3) ''یہاں بدھ شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے''۔ اور انھوں نے پتھر کی ایک بڑی سی شلا (پٹی) لگوائی جس پر ایک بڑا سورج (؟) بنا ہوا تھا (4) اور انھوں نے ایک پتھر کے ستون کو ٹیکس سے آزاد اور دولت کا دفتر وصولیابی بھی (6) بنوایا۔

جی بہولر، دی اشوکا ایڈیکٹ آف پیڈریا اینڈ نیگلیوا، اپی گرافیا انڈیکا، 1898-99، جلد 5، صفحہ 4

معاشی فائدہ پانے کی فکر میں لگی رہتی تھی۔

اس طرح حاصل وسائل کا استعمال متعدد مقاصد سے کیا جاتا تھا۔ لیکن وسیع انتظامی مشینری کے اور ایک مستقل فوج کے رکھ رکھاؤ سے واضح ہے کہ ذرائع کا ایک کافی بڑا حصہ خرچ ہو جاتا تھا۔ عوام کی ترقی کے کاموں اور موریہ سلطنت کی عام ترقی کے لئے ذرائع کی ضرورت پڑتی تھی۔ حالانکہ یہ ترقیاں سبھی علاقوں میں ایک جیسی نہیں تھی۔ کہا گیا ہے کہ مگدھ کے مرکزی صوبہ کو مالدار و خوشحال بنانے کی کوشش کی جاتی تھی اور اس لئے دوسرے علاقوں سے اس کا تعلق استحصالی تھا۔ موریہ سلطنت کا حصہ ہونے کے باوجود دکن کے اہم علاقوں پر سنگ کلاں عہد کے تہذیبی طور طریقوں کی اہمیت جاری رہی۔ اس وسیع سلطنت میں اشوک کے مواصلاتی انتظام کے عمدہ رکھ رکھاؤ کا ثبوت اشوک کے کتبے ہیں۔ اشوک کے کتبے دکشن پتھ اور اتر پتھ، دونوں میں اہم جگہوں پر واقع ہیں۔ مثال کے طور پر اتر پتھ میں ضلع چمپارن (بہار) میں لوریا نندن گڑھ اور لوریا۔ ارراج کے کتبے واضح طور پر نیپال کی ترائی کے راستہ میں واقع ہیں۔ جہاں لمبنی گرام اور نیگلی ساگر میں اشوک کے کتبے ملے ہیں۔ بہار سے ایک اور شاخ بربر پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ ساسارام (سہسرام) ہوتے ہوئے بنارس اور کوشامبی کی طرف جاتی ہیں۔ اشوک کی کتبے ان سبھی مقامات پر ملے ہیں۔ جنوبی راستہ میں بھی اشوک کے کتبے اہم ہے۔ مثلاً جھانسی کے پاس گجر، بندیل کھنڈ سے گوداوری ڈیلٹا کی طرف جانے والی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر واقع قدیم ودیشا سے کچھ کلومیٹر پر واقع سانچی، قدیم وِدربھ، دیوٹک اور کونکن ساحل پر سوپارا میں ہمیں یہ کتبات ہیں۔ آندھرا پردیش کی بھی بڑی فوجی اہمیت تھی۔ اس بات کو نہ صرف کرنول (Kurnool) ضلع میں اشوک کے کتبات کی موجودگی سے بلکہ ویر پورم (کرنول) میں ایک ٹکسال کے آثاری ثبوت سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس ٹکسال کو موریوں کے سکے جاری کرنے کا اختیار تھا۔ اشوک کے کتبوں کی تقسیم سے اشارہ ملتا ہے کہ رابطہ کرنول سے رائے چور دوآبہ، بیلاری اور چتل درگ ضلعوں تک تھا۔ میگستھنیز کے ثبوتوں کی بنیاد پر اسٹرابو (Strabo) نے کہا تھا کہ اگیرونوموئی (Agronomoi) عوامی سڑکیں بناتے ہیں اور ہر دس اسٹیڈیا (Stadia) پر میل کا پتھر لگا دیتے ہیں۔ تاکہ سڑک اور فاصلے کو ظاہر کیا جاسکے۔ اس کی تصدیق اشوک کے دولامکھن کتبوں سے ہوتی ہے جو مختلف مقامات کی دوریوں کے ظاہر کرنے کا کام کرتے تھے۔ سڑکوں کی تعمیر اور ایک بہتر مواصلاتی نیٹ ورک کا رکھ رکھاؤ تبھی ممکن ہے جب ریاست کی ایک ٹھوس معاشی بنیاد ہو۔ ٹیکس اور دوسرے ماخذوں سے حاصل ذرائع کا استعمال اشوک کے دھم (Dhamma) کی تبلیغ کے لئے بھی کیا گیا۔ نئے افسران کی ملازمت، دھم سفروں کے انتظام، مٹھوں سمیت مذہبی یادگاروں کے قائم کرنے کے لئے فطری طور پر دولت کا بھاری خرچہ ہوتا تھا۔ صرف موجودہ ذرائع کا استحصال کر کے ہی نہیں بلکہ ذرائع کی نئی بنیاد بنا کر معاشی پروگراموں کا از سر نو نظم کر کے ہی یہ رقم جمع کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ معاشی پروگرام انتظامی یا حکومتی طرز کے زیادہ ہوتے تھے۔

زراعتی اور غیر زراعتی سیکٹر سے آنے والے ان بے شمار وسائل کی وجہ سے شہری مرکزوں کی تعمیر اور ترقی ہوئی۔ ان شہری مراکز کی کھدائی سے حاصل موریہ عہد کے باقیات سے معیار زندگی میں سدھار کا پتہ چلتا ہے۔ گول کنوؤں (ring-wells) اور جذب کرنے والے (Soaked Pit) گڑھوں کی بڑی تعداد ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ گنگا کی وادی کے پاٹلی پتر، کوسامبی وغیرہ شہروں کے علاوہ دوسرے اہم شہر ٹکشلا (Taxila) پاکستان، اجینی مدھیہ پردیش، مہاستھان (Mahasthan) ضلع بوگرا بنگلہ دیش، شیشو پال گڑھ (Shishu pal garh) اڑیسہ، امراوتی (Amaravati) کرشنا ڈیلٹا۔ سوپارہ (Sopara) (ممبئی کے پاس) قندھار (افغانستان) تھے۔ شِشو پال گڑھ کچھ لوگوں کے مطابق توشالی (Toshali) ہے اور یہاں حفاظتی انتظام کے شواہد دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ شہری مرکز ایک جیسے رقبہ اور پیٹرن Pattern والے نہیں تھے۔

7.3 کشان سلطنت کی معاشیات

ادبی کتباتی ریکارڈ اور سکوں کے ساتھ ساتھ کھدائی اور غیر معروف مقامات کے ساتھ آثار قدیمہ کے باقیات، کشان سلطنت کی معاشیات کے مطالعہ کا اہم ذریعہ ہیں۔ اس عہد کے متعدد کتبات ہمیں ملتے ہیں جن میں سے زیادہ تر عطیہ نوعیت کے ہیں ساتھ ہی کشان راجاؤں کے ذریعے جاری سکوں کی ایک بڑی تعداد بھی ملتی ہے۔ اہم ادبی ماخذ پیری پلس آف دی اریی تھرین سی (تقریباً پہلی صدی عیسوی کے آخر میں)، پلنی کی نیچورلس ہسٹوریا (تقریباً 79 عیسوی)، اسٹرابو کی جیوگرافیکن اور کلاودیس پٹولمی کی جیوگرافیکے ہیوفیگیسس (تقریباً 150 عیسوی) ہیں۔ چینی تاریخی تخلیقات ہیں: ہاؤ ہان شو، بعد کی یا مشرقی ہان خاندان (220-25ء) کی تاریخ جسے پانچویں صدی میں فان یہ Fan ye نے تخلیق کیا تھا اور چی ین ہان شو بعد کی یا مشرقی ہان خاندان کی تاریخ جسے عام

طور پر پان۔کو (Pan Ku) سے معنون کیا جاتا ہے۔مگر جسے اس کے والد پان پی آو نے شروع کیا اور اس کی بہن پان چاؤ (Pan Chau) نے پورا کیا تھا، یہ بھی اس عہد کی معاشیات پر روشنی ڈالتی ہے۔متعلق عہد کی معاشیات کے بارے میں حالانکہ ہندوستانی ادب سے ہمیں بلواسطہ اطلاعات نہیں ملتی لیکن ان میں سے کچھ تخلیقات جیسے جاتک (Jatakas)، انگوجہ (Angavijja)، للت وستار (Lalilavistara) وغیرہ کشان عہد کی معاشی حالتوں پر کچھ روشنی ڈال کر ہماری جانکاری میں اضافہ کرتی ہیں۔

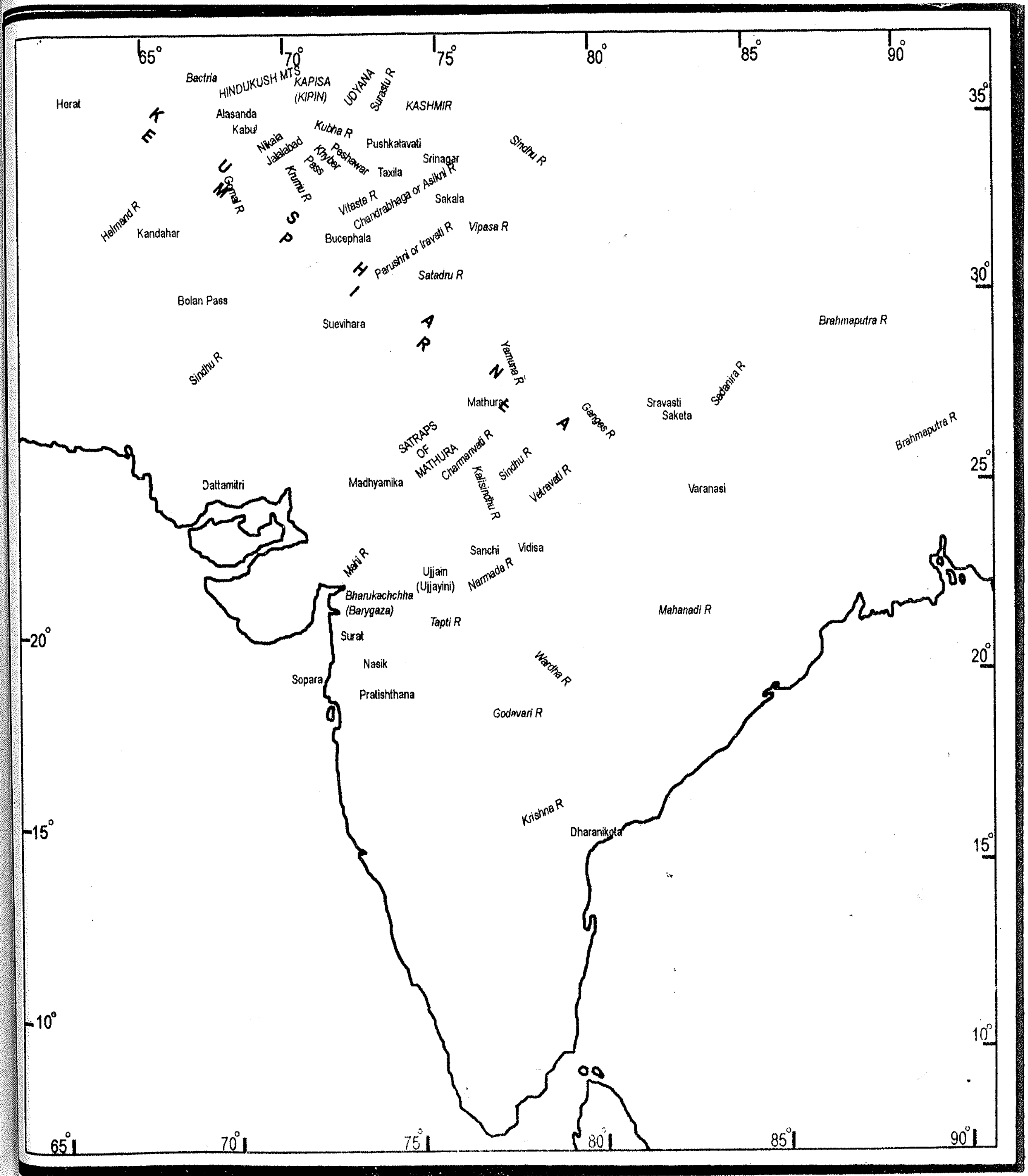

نقشہ 2 کشان اور ساتواہن (کے۔اے نیل کنٹھ شاستری، اے کمپر ہینسیو (Comprehensive) ہسٹری آف انڈیا، جلد دوم۔دی موریاز اینڈ ساتواہنس، 325 بی۔سی۔اے۔ ڈی 300، کلکتہ، 1957، صفحہ 288 پر مشتمل۔

7.3.1 زراعتی معاشیات

کشان عہد میں زمینی انتظام پر بہت کم جانکاری ہمیں حاصل ہے۔ زراعتی پیداوار میں ریاست کی پہل بہت واضح نہیں ہے۔ زمین کے بڑے بڑے علاقوں کی حکومت کے ذریعے جتائی کرانا کشان ریاست میں شاید ہی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن زراعتی پیداوار کے توسیع کے لئے سینچائی پر بہت دھیان دیا جاتا تھا کم از کم سلطنت کے مغربی شمال حصہ میں۔ پیشاور علاقہ کے ایک سروے (Survey) کی بنیاد پر ماہرین نے پرانی نہروں کے باقیات کا، ندیوں کے کنارے زرعی زمینوں کی موجودگی کا اور پہاڑوں کی ڈھلانوں پر ایسے کھیتوں کی موجودگی کا پتہ لگایا ہے جن میں بارش کے پانی کو اوپر کے کھیتوں سے نیچے کھیتوں تک لیجانے کے انتظام کئے گئے تھے۔ جس کی ابتداء کشان عہد میں ثابت کی جاسکتی ہے۔ کشان عہد میں خروشتی (Kharoshti) رسم الخط میں لکھے گئے ذاتی عطیہ خطوط کنوؤں کی کھدائی کے حوالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس سے غالباً یہ اشارہ ملتا ہے کہ متعلق علاقوں میں کنویں کے پانی کو ایک اور اہم ذریعہ مانا جاتا تھا۔ جس کا استعمال سینچائی کے لئے کیا جاسکتا تھا اور اس لئے ایک آبی ذخیرہ بنوانا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ درگئی (Dargai) (اب پاکستان میں) کے مشرق میں ورٹر (Varter) علاقہ میں سورین (Sorane) میں کھدائی سے ملے ایسے ہی ایک کنویں کو اسی عہد کا مانا جاتا ہے۔ حالانکہ سندھ کی زرخیز وادی میں اور گنگا کی وادی کے ایک حصہ میں کشانوں کے پاس قدرتی غلہ خیز خطے تھے پھر بھی انھوں نے ان علاقوں میں زراعتی پیداوار کو بڑھاوا دینے کے لئے سب کچھ کیا جن میں بھرپور بارش نہیں ہوتی تھی۔

7.3.2 تجارت، تاجر اور سکوں کا چلن

کشان ریاست میں زراعت، معاشیات کی اہم بنیاد نہیں تھی۔ کشان راجاؤں نے بڑی مقدار میں وسائل کو حرکت پذیر، اندرونی اور بیرونی تجارت کے ذریعے بنایا۔ زیادہ تر معاشی اہمیت کے علاقوں پر اختیار، دست کاری پیداوار، کان کنی اور عوام پر لگائے جانے والے مختلف قسم کے ٹیکس، سلطنت کے دیگر مالی اور معاشی وسائل تھے۔

سلطنت کی اندرونی تجارت کا اشارہ اچھے خاصے آثار قدیمہ کے ثبوتوں سے ملتا ہے۔ مشرقی افغانستان میں واقع بگرام (Begram) میں کی گئی کھدائیوں سے کشان عہد کی ایک ذخیر اندوزی کی جگہ سامنے آئی ہے جہاں مختلف ملکوں سے اور کشان ریاست کے اندر کے مختلف علاقوں سے آئے مال رکھے جاتے تھے مثلاً ہمیں نقاشی دار ہڈیوں اور ہاتھی دانت کی تختیاں ملی ہیں جن پر متھرا آرٹ طرز کی تصویریں کھدی ہوئی ہیں۔ اہی چھتر Ahichchhatra (اتر پردیش) میں کشان پرت سے حاصل برتنوں سے، چپٹی سطح والے برتنوں کے تئیں دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے لئے ان کی سطح کو چوکور یا گول بنایا جاتا تھا جو یقیناً ہی سرکپ (تکشلا II) کی ظروف عہد کی ایک خاصیت ہے۔ اہی چھتر کے ظروفوں کی اس جدت کی وجہ یہ تھی کہ مقامی کمہار کو تکشلا کے مٹی کے برتنوں کا علم تھا جو قبل عہد کشان کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ کوشامبی (کوسم، مشرق اتر پردیش) میں کشان سطح سے جو نئے قسم کے ظروف ملے ہیں ان کو بھی تکشلا کے ظروفوں سے ملتا جلتا کہا گیا ہے۔ کوسم کے برتنوں پر بنی کچھ ڈیزائنوں کا مقابلہ وسط ایشیاء کے کچھ خانہ بدوش قبیلوں کے ظروف سے کیا جاسکتا ہے۔ متھرا فن کی کچھ طرز وانشاء خصوصیات کو راغب کرنے کا ذریعہ تکشلا (گندھار) کے راستے مغربی ایشیاء کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس عہد کے شمالی ہندوستانی مقاموں سے ٹیرا کوٹا کی انسانی شکلیں ملی ہیں جن کے سر اور لباس خصوصیات ہندوستانی نہیں ہے۔ یہ تبھی ممکن تھا جب ایسی خصوصیات والے لوگوں سے فنکاروں کا رابطہ ہو۔ ہمارے پاس تکشلا اور متھرا کے ایسے کتبے ہیں جو اشارہ دیتے ہیں کہ سلطنت کے مغربی حصہ سے لوگ ان شہروں میں آتے رہتے تھے۔ اس طرح کشان سلطنت کے دور دراز کے علاقوں میں تاجروں، فنکاروں وغیرہ کی شکل میں خیالات اور لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ حرکت پذیری اس لئے ممکن ہوئی کہ آکسس علاقوں سے لے کر بحر عرب تک اور شمالی ہندوستان کے اندرونی علاقوں تک بھی کشانوں کا مضبوط مرکزی اقتدار، ریاست کے مختلف علاقوں کے تاجروں کو وسیع علاقہ میں حفاظت اور آنے جانے کی آزادی عطا کرتا تھا۔

سلطنت کے دور دراز کے صوبوں کو جوڑنے کے لئے ترسیل کے متعدد وسائل تھے۔ پیری پلس (Periplus) میں تھینا (Thina) (چین) سے اور باختر کے ذریعہ شمالی ہندوستان اور اوزین (اجین) ہوتے ہوئے مغربی ہندوستان کی مشہور بندرگاہ بیری گازا تک تجارت کی اشیاء کے آنے جانے کا حوالہ دیا گیا۔

اندرونی تجارت کے علاوہ اس عہد کی تجارتی سرگرمیوں کا سب سے اہم پہلو سمندری اور زمینی دونوں ذریعہ سے لمبی دوری کے بین الاقوامی مبادلہ نیٹ ورک میں ہندوستان کا زبردست حصہ ہے خاص طور پر رومن سلطنت کے ساتھ۔ چین کے ساتھ رومن سلطنت کے تجارتی تعلقات تھے اور روم کے بازاروں میں چینی ریشم کی مانگ تھی۔ اس کی سپلائی مشہور شاہراہ ریشم کے راستے دوسری اشیاء کے ساتھ ساتھ کی جاتی تھی۔ اس کے لئے کوئی ایک سیدھا راستہ نہ تھا کیونکہ اس کی بہت سی شاخیں تھیں۔ یہ راستہ چین میں لویانگ سے شروع ہوتا تھا اور وسط ایشیا، مغربی ایشیا اور یوریشیا سے گزرتے ہوئے بحیرہ روم کی دو بندرگاہوں انطاکیہ (Antioch) اور اسکندریہ (Alexanria) تک جاتا تھا۔ ہاؤ ہانشو (Hau Hanshu) میں 105 عیسوی کے آس پاس تک کی بلکہ 125 عیسوی کے آس پاس تک سے متعلق خبریں ملتی ہیں۔ اس میں موجود ایک حصہ تاچن (Ta-ch in) (مشرقی رومن) اور شین تو (Shen tu) نچلی سندھ وادی کے بیچ تجارتی روابط کا حوالہ ملتا ہے۔ تب یہ وادی یو ہے۔ چن (Yueh Chin) (کشانوں) کے اقتدار میں تھی۔ ہندوستانی مال اپنی اصلی لاگت سے سوگنا قیمت پر بیچا جاتا تھا۔ پیری پلس آف دی ایری تھرین سی، پلینی کی نیچرلس ہسٹوریا اور اسٹرابوا کی جیوگرافیکن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مانسونی ہواؤں کے زیادہ بہتر علم اور استعمال کی وجہ سے بحر احمر کے راستے ہندوستان کے ساتھ اور خاص طور پر اس کے مغربی کنارہ کے ساتھ سمندری روابط میں اضافہ ہوا۔ بحر احمر پر قائم بیری نیک یا مایوس ہورموس یا لیوکوس (Leukos) بندرگاہ کی سرحد سے ایک جہاز اگر چلتا تھا تو بیس دن نہ سہی، چالیس دن سے کم میں ہندوستان کی مغربی سرحد پر پہنچ جاتا تھا۔ اس سے ہندوستان اور مشرقی بحیرہ روم (Mediterranean) علاقوں کے بیچ فطری طور پر متبادل اور تیز مواصلات کو بڑھاوا ملا۔ اس طرح کشان حکومت کے قائم ہونے کی وجہ سے برصغیر کے شمال مغربی سرحدی علاقہ کے راستے ہندوستان کی مغربی ساحل تک سامان کی نقل حرکت ہونے لگی۔ (اس تجارت کے نیٹ ورک کے لئے پیش بلاک کی اکائی 8 کے نقشہ 4،3 اور 5 کو دیکھیں)۔

پیری پلس اور پٹولمی کی جغرافی میں شمالی ہندوستان کی دو بندرگاہوں کا اہم طور پر ذکر کیا گیا ہے یہ ہیں سندھ ندی کے دہانے پر قائم بار بیری کم Bar (baricum) اور گجرات میں نرمداندی کے دہانے پر مقیم بیری گا جایا بھری گو کچھ۔ ہاؤ ہانشو کی دلیل ہے کہ نچلی سندھ وادی کو جیتنے کے بعد کشان زیادہ خوشحال (مالدار) اور طاقتور ہو گئے۔ چونکہ رومن سلطنت کے مشرقی علاقوں سے نچلی سندھ وادی کے مستقل تجارتی تعلقات تھے۔ اس لئے ہاؤ ہانشو کی اس بیان سے اشارہ ملتا ہے کہ نچلی سندھ وادی (چینی دستاویزوں کے شین۔ تو) میں کشانوں کی آمدورفت خاص طور پر رومن سلطنت کے ساتھ پھلتی پھولتی تجارت کے ذریعے ملنے والے فائدوں کے امکان سے تحریک یافتہ تھی۔ اس تجارت میں توازن بھی ہندوستان کے حق میں تھا۔ قراقرم کے راستہ میں حال میں ملی پتھروں پر بنی تصویر وسط ایشیا علاقہ سے شمالی ہندوستان پہنچنے کے لئے ایک چھوٹے ممکن ہے زیادہ خطرناک، چی۔ پن (Chi-pin) کشمیر راستہ کے استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی کبھی گھوڑوں کی تصویر سے اس ٹھوس امکان کا اشارہ ملتا ہے کہ وسط ایشیاء کے گھوڑے اسی قراقرم راستہ سے شمال کے میدانوں میں پہنچتے تھے یہ بات چٹانوں پر بنی یا کھدی ہوئی تصویروں میں گھوڑوں کی خوبصورت پیش کش سے واضح ہے جن میں آدمی یو ہے۔ چہ (Yueh-Chic) (کشان) لباس پہنے ہوئے ہیں۔ وسط اور مغربی ایشیا کے مقامی راستوں میں داخلوں کے دروازوں کا کام کرنے والے تکشلا اور پشکلاوتی شہر اور مشہور متھرا شہر، جو کشانوں کا ایک اہم سیاسی مرکز تھا، اس بین الاقوامی تجارت سے بہت مستفیض ہوئے۔ جیسا کہ ہاؤ ہانشو، پیری پلس اور پلینی کی روداد سے پتہ چلتا ہے۔ اس بین الاقوامی تجارت میں درآمد برآمد کی متعدد اور طرح طرح کی مدات تھی۔

ایسی تجارتی خوشحالی فطری طور سے وسیع استعمال بصورت زر (Monetization) کی مانگ کرتی تھی۔ یہ کشان معاشیات کا ایک اہم پہلو تھا۔ کشان سکوں کی بڑی تعداد اور بشمول سکوں کے کچھ ذخائرہ ہندوستان اور وسط ایشیاء کے متعدد حصوں میں یہاں تک کہ کشان ریاست کی سرحد سے دور بھی، ان کے حصول سے ان کے چلن کا اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً کشانوں کے سونے کے سکوں کا ایک ذخیرہ ایتھوپیا میں پایا گیا۔ یہ کشان سونے کے سکوں کی بین الاقوامی اہمیت کا ثبوت ہے۔ رومن سلطنت کے ساتھ تجارت کے نتیجہ میں ہندوستان میں رومن سونے کی بھاری آمد نے سونے کے سکوں کو ڈھالنے کے بارے میں کشانوں کے فیصلہ کو اکسایا ہوگا۔ لیکن ہندوستان میں رومن سونے کے سکوں کا استعمال زیادہ ترقیمتی دھاتوں (Bullion) کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ پیری پلس (Periplus) سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مشرقی رومن کے ساتھ ساتھ ایشیا اور افریقہ کے کچھ اور ممالک کے ساتھ اشیاء کے مبادلہ کے تعلق میں ہندوستانی برصغیر کی جس کا ایک اچھا خاصا حصہ کشان سلطنت میں آتا تھا، اچھی حالت تھی۔ دیگر باتوں کے علاوہ بقایا رقم رومن سونے میں لی جاتی تھی۔ اس لیے کشان سلطنت کو سکوں کی کسی طرح کی برآمد کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پلینی کا اس تعلق سے شکایت کی وجہ یہی تھی کہ سلطنت سے بھاری تعداد میں

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad

رومن سکے باہر جارہے تھے۔خود کشان صرف نچلی سندھ وادی میں چاندی کے سکے ڈھالتے تھے پھر بھی متھرا میں ملے سال 28 کے ایک کتبہ سے اشارہ ملتا ہے کہ نجی ایجنسیوں کے ڈھالے ہوئے چاندی کے سکوں کو کشان سلطنت میں رائج کرنے کی اجازت تھی۔ بڑی تعداد میں تانبے کے سکوں کی دستیابی، سکوں کے چلن کا ایک اور اہم پہلو تھا۔ عام طور پر چھوٹے سودوں کے لئے تانبہ کے سکے صحیح معنی میں پوری سلطنت میں یہاں تک کہ لوگوں کی روزانہ زندگی میں بھی رائج تھے۔ ان کا کوئی مقامی کردار نہ تھا۔لیکن اشیاء کا باہمی تبادلہ عام بات تھی۔ پلینی نے سیریس (کاش گڑھ) میں اشیاء کے باہمی تبادلے کی رسم کا حوالہ دیا ہے۔متعدد سونے کے سکوں کے لئے ضروری سونا باختر سے آتا تھا جو بہت پہلے سے ہی بازاروں میں سونے کی فراہمی کیلئے مشہور تھا اور یہ برصغیر ہندوستان کے کچھ سونا پیدا کرنے والے علاقوں سے بھی آتا تھا۔ کشان ٹکسالوں کے آفیسر ہوسکتا ہے روم سے درآمد سونے کے سکوں اور سونے کی اشیاء کو پگھلا کر بھی سونا حاصل کرتے رہے ہوں۔(پیری پلس، حصہ 39 اور 49 دیکھیں)

جس عہد کی خصوصیت پھلتی پھولتی تجارت ہو یہ طے ہے کہ اس میں ہمیں مختلف درجوں کے تاجر ملیں گے۔ کشان سلطنت کی سرحدوں کے اندر اور کشان عہد کے دستیاب کتبے، ونک (vanik) (چھوٹا تاجر) سارتھاواہا (کارواں تاجر) ویواہاری (تاجر) اور سریشٹھی (مالدار تاجر اور ایک تجارتی انجمن کا سربراہ) کا حوالہ دیتے ہیں۔ پالی مذہبی گرنتھوں اور جاتک کہانیوں میں سریشٹھی راجا کے سب سے قریبی دوستوں اور معاونوں میں ایک دکھائی دیتا ہے۔ کشان عہد سے ٹھیک پہلے ہند۔ پارتھیائی حکمراں گونڈو فیرس (Gondophares) (تقریباً 20/21 عیسوی سے 45/46 عیسوی تک) کے عہد میں راج شریشٹھی (شاہی تاجر) کا ذکر ملتا ہے تاجروں کی مختلف طبقوں کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف الفاظ ان کی معاشی اور سماجی حالات کے فرق کا اشارہ دیتے ہیں۔ کچھ تاجر تو اتنے مالدار تھے کہ بھاری عطیات دیا کرتے تھے۔

7.3.3 دستکاری پیداوار، انجمنیں اور شہر کاری

معاشی زندگی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت دستکاری کی افزائش تھی۔ جس کا بڑھتی ہوئی تجارت سے گہرا تعلق تھا۔ کشان عہد اور خاص کر متھرا سے حاصل کتباتی مواد کو دیکھیں تو اس وقت رائج دستکاری اور پیشوں کا کچھ اندازہ ہم کر سکتے ہیں مثلاً تعمیری افسروں (نوکارمک)، اداکاروں (سیل کھا)، بڑھئی (بڈھاگی)، عطر والوں (گندھیکا)، سناروں (سورن کار)، کپڑا بنانے والے (پروایکا)، لوہار (لوہ کار)، زیورات بنانے والے (منی کار) وغیرہ کے ذکر ملتے ہیں۔ کشان عہد کے مقامات سے ظروف مٹی کی اشیاء، دھات، پتھر، ہاتھی دانت اور ہڈیوں سے بنی اشیاء، تختیوں اور مورتیوں، منکوں یعنی موتیوں وغیرہ کی شکل میں جو آثار قدیمہ کی اشیاء ملتی ہیں وہ کشان عہد کے مادی تناظر میں کمہاروں، لوہاروں، مورتیاں بنانے والوں، بنکروں اور ایسے ہی دوسرے دستکار گروہوں کی موجودگی کا اشارہ دیتی ہیں۔ کشان عہد میں ہڈیوں اور ہاتھی دانت کی کاریگری کی بھی ترقی ہوئی۔ ان کا استعمال عیش وعشرت کی اشیاء، گھریلو سامانوں اور ہتھیاروں کے بنانے میں ہوتا تھا۔ ہاتھی دانت کے کام کے بہترین نمونے بگرام اور تکشلا میں ملے ہیں۔ مختلف درجوں کے دستکار روزانہ کی ضروری اشیاء اور عیش وآرام کی اشیاء کی بھی پیداوار کرتے تھے۔

پھر بھی صنعتی پیداوار کے جس علاقہ میں ریاست کا کنٹرول واضح تھا وہ کان کنی کی صنعت تھی۔ کان کنی کے ذریعے ریاست کے خزانہ میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ پٹولمی کی جغرافیکے ہوئیگیس سمیت کتبات اور ادبی مواد سے اشارہ ملتا ہے کہ کشانوں نے مشرقی مالوا میں (جیسے دشرن، آکار، پورو مالوا اور کوسا کے ناموں سے مذکور کیا گیا ہے) ہیروں کی کھدائی کے لئے پہل کی تھی۔ لگتا ہے کہ ہیرے کی بڑی کانوں کی وجہ سے ہی کشان آکار کی طرف کھنچے ہونگے (کچھ ادبی ماخذوں کی بنیاد پر اس کی شناخت مشرقی مالوا کی شکل میں کی جاسکتی ہے)۔ جواہرات کی جو تجارت کی اہم اشیاء تھیں، کان کنی اور فروخت پر کشان حکومت نے کچھ کنٹرول تو ضرور رکھا ہوگا۔ پلینی کی نیچورلس ہسٹوریا میں ایسٹرائن (astrion) جیسے کرسٹلوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو پاتالین (سندھ کا ڈیلٹا علاقہ) میں پائے جاتے تھے۔ ہاؤ ہانشو سے اشارہ ملتا ہے کہ سندھ کی نچلی گھاٹی سونے، چاندی، تانبے، لوہے، سیسہ، ٹن وغیرہ کی پیداوار کرتی (بلکہ انھیں اپنے بازاروں میں فراہم کراتیں) تھی۔ ان میں سے کم از کم کچھ اشیاء کشان سلطنت میں واقع کانوں سے حاصل کی جاتی ہونگی۔ پلینی کی نیچورلس ہسٹوریا اور مینس پہاڑ (پاکستان کے سالٹ رینج) میں نمک کی کان کے حوالے دیتی ہیں۔ اور اس کا کہنا ہے کہ ریاستی آفیسر سونے اور موتیوں کی کانوں سے بھی زیادہ لگان نمک کی کانوں سے پاتے تھے۔ نمک کی پیداوار کی اہمیت ٹھیک طور پر اس کی لگان دینے کی طاقت کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔

تجارتی گروہ (جن کو زیادہ تر شرینی کہا جاتا تھا) اس عہد میں اہمیت حاصل کر رہے تھے۔ تقریباً سبھی صنعتی کام اور اہم پیشے اپنی اپنی شرینی کی شکل میں منظم تھے۔ شرینی کی متعدد اور طرح طرح کی سرگرمیاں تھیں۔ وہ کچھ بینک کی ایک قدیم شکل میں کام کرتے تھے۔ بہت سی مثالوں میں شرینی مستقل جمع رقم (اکشے نیوی) (Akshayanivi) اس شرط پر قبول کرتی تھیں کہ اصلی سرمایہ کو نہیں چھوا جائیگا اور صرف سود کا استعمال کیا جائیگا۔ دستکاری کی وسیع سرگرمیوں اور تاجروں کے لئے اس قسم کی پونجی کی فراہمی یقینی ہوتی تھی۔ (شرینی کی تفصیلی جانکاری کے لئے ہمارے کورس ای۔ایچ۔آئی۔03 کا بلاک 1 اکائی 4 دیکھیں)۔

سلطنت کی معاشی خوشحالی کی وجہ سے شہروں کی ترقی میں تیزی آئی۔ باختر، پیوکولاوٹس (Peucolaotis) (پشکلاوتی) تکشلا، مودورا (متھرا) وغیرہ شہر جو کشان حکومت سے بھی پہلے وجود میں آ چکے تھے اور پروان چڑھ چکے تھے۔ تکشلا (سرکپ) ایک پوری طرح منصوبہ بند شہر تھا۔ رہائشی مکان ایک واضح منصوبہ کے ذریعے بنائے گئے۔ تھے ایسے منصوبہ بند شہری مرکز ایک نئی جدت تھے اور اس پر غیر ملکیوں کا اثر ایک دم صاف ہے۔ اہی چھترا میں کنکریٹ کی ایک سڑک ایسی سطح سے ملی ہے جسے تقریباً 200 عیسوی کی کہا جاسکتا ہے۔ متھرا نے سب سے پہلے سیتھی پارتھیائی عہد میں اور بعد میں کشان عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔ متھرا کے پاس سونکھ (Saunikh) میں سطح 16 کی سطحی شکل شہری منصوبہ کی سب سے ترقی یافتہ اور منظم دور کا پتہ دیتی ہے۔ ایسے رہائشی مکانوں کے باقیات ملے ہیں جو گارے اور مختلف سائز والی پکی اینٹوں کے بنے تھے۔ متھرا کی قلعہ بندی پھر سے کرائی گئی، اسے بڑھایا گیا اور اس کی مرمت کرائی گئی۔ قلعہ بندی کے باقیات سے اشارہ ملتا ہے کہ کشان عہد میں متھرا ایک بڑے اور خوشحال شہری مرکز کی شکل میں ابھرا۔ متھرا کی خوشحالی تجارت پر اور خاص کر عبوری تجارت پر منحصر تھی کیونکہ وہ ایک ایسے مقام کی شکل میں ابھرا جہاں متعدد اہم زمینی راستے آکر ملتے تھے۔ متھرا کی پارچہ بافی واحد وہ پیداوار تھی جس کی وجہ سے متھرا حقیقت میں ترقی کر سکتا تھا (موجودہ بلاک اکائی 8 بھی دیکھیں)۔

پھلتی پھولتی تجارت اور دستکاری اور صنعتوں کی اشاعت کی وجہ سے کشان راجاؤں کو اس کا کافی موقعہ ملا ہے کہ وہ تاجروں پر اور خاص طور پر نجی صنعت کاروں کے ذریعہ چلائی جارہی صنعتوں اور دستکاروں پر مختلف قسم کے ٹیکس لگا کر اپنے شاہی خزانہ کو بھر سکیں۔ کشان سکوں کی بھاری تعداد بھی اشارہ دیتی ہے کہ ٹیکس نقد جمع کرائے جاتے تھے لیکن آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ اشیاء کی شکل میں بھی جمع کرائے جاتے تھے۔ بگرام (مشرقی افغانستان) کی کھدائیوں سے کشان عہد کا ایک ذخیرہ گھر سامنے آیا ہے جس میں مختلف دیشوں کے مال جمع کئے جاتے تھے۔ مارٹائمر وہیلر (Mortimer Wheeler) کا خیال ہے کہ ذخیرہ گھر ممکن ہے بین الاقوامی تجارت میں لگے تاجروں سے اشیاء کی شکل میں حاصل سرحدی ٹیکس کے لئے کسٹم ڈپو تھا۔ بگرام پوری طرح کشان سلطنت کا حصہ تھا اور اس لئے یہ ثبوت اشارہ دیتا ہے کہ کشان آفیسر اشیاء کی شکل میں بھی ٹیکس وصول کرتے تھے، صنعتی پیداواروں، زراعتی پیداوار اور تجارت کی دوسری دیگر اشیاء پر ٹیکس کی بھاری رقم واضح ہے کہ خوشحال اور بڑے پیمانے کی صنعتوں کے ذریعہ جمع کرائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ تاجر سلطنت کے مالی وسائل بڑھانے ہیں مدد دیتے تھے لیکن دولت فطری طور سے سماج کے ایک نسبتاً چھوٹے گروپ کے ہاتھوں میں مرکوز تھی اور اس طبقہ کا ایک حصہ اپنی دولت کا بھونڈا مظاہرہ بھی کرتا تھا۔ اس کا اشارہ بارڈسینس نے اپنی کتاب بک آف دی لاز آف داکنٹریز میں دیا ہے جس میں وہ کشانوں کی گھوڑوں کو سونے اور جواہرات سے سجانے کی عادت کا حوالہ دیتے ہیں۔ ترک بھڑک کے ایسے دکھاوے نے مال ودولت اور طاقت کی بنیاد پر طبقوں کے بیچ کے فرق کو اور شدید کیا ہوگا۔ حالت ممکن ہے ایسی ہی تھی اس کا اشارہ اسلیان سٹا (Assalayana Sutta) کے چینی ترجمہ کے ایک پیراگراف سے ملتا ہے جس میں کشانوں کے سماج کو دو طبقوں، نوکر اور مالک پر مشتمل بتایا گیا ہے۔ پالی متن میں یہ لفظ آیا (ayya) اور داس ہے۔ غلامی کا رواج حقیقت میں موجودہ تھا ممکن ہے جنگ کے قیدیوں کو غلام بنالیا جاتا ہو۔ مشکل حالات میں زندگی گزارنے والے نوکر طبقے کے افراد غذا کے لئے غلامی قبول کرتے رہے ہونگے۔ کشان سلطنت میں غلاموں کی ممکن ہے کہ مستقل درآمد کی جاتی ہو۔ ممکن ہے گھریلو کاموں کے لئے بھی غلاموں کو لگایا جاتا ہوگا۔ غلامی رسم کی ترقی حکمراں طبقہ اور تجارتی مہم جوؤں کے لئے فائدہ مند تھی۔ ریاست میں جو لوگ اصولاً آزاد تھے ممکن ہے ان پر بھی بیگار لادنے کا چلن تھا۔ رودرمن کا تقریباً 50-149 عیسوی کا جونا گڑھ کتبہ سلطنت میں وشٹھی (Vishti) یعنی بیگار کے چلن کا حوالہ دیتا ہے۔ چونکہ رودرمن اول کا خاندان اس علاقہ پر کشانوں کی طرف سے حکومت کر رہا تھا جو تقریباً 50-149 سے بہت پہلے کی بات نہیں ہے اس لئے کشان سلطنت میں یا کم از کم ان کے ہندوستانی صوبوں میں لوگوں کو بیگار مزدوری کرنے کی مجبوری کا نظام رہا ہوگا۔

ایک وسیع سلطنت پر ایک مرکزی اقتدار کی حکومت کی وجہ سے ایک بڑے علاقے میں کم از کم آزاد افراد کا آزادی کا ساتھ آنا جانا ممکن رہا ہوگا۔ حفاظتی سیاسی ماحول، تجارت اور دستکاری کے پھلنے پھولنے میں مددگار رہا۔

7.4 ساتواہن سلطنت کی معاشیات

ساتواہن سلطنت کی معاشیات کو جاننے کیلئے اہم ذریعہ ان کے مغربی ہندوستان کے ہم عصر ساکا شترپوں (Saka Kshatrapas) کے کتبے، ساتواہنوں کے سکے اور یونانی رومن ادب ہے۔ جیسے پیری پلس آف دی اریری تھرین سی، پلینی کی نیچورل ہسٹری اور پٹولمی کی جغرافیکے ہوفی گیسس وغیرہ ہیں۔ تاریخ دانوں نے جن ہم عصر ملکی متون کا استعمال کیا ہے وہ ہیں ساتواہن راجا ہل کی گاتھا سپتستی (Gatha Saptasati)، جاتک کہانیاں (Jata Ka Storeis) وغیرہ۔

7.4.1 زراعتی معاشیات

ساتواہن عہد میں ایک خوشحال زراعتی علاقہ کی شکل میں دکن کے کچھ زرعی علاقوں کی صلاحیت سیر حاصل ہوئی۔ کتبوں اور ادب میں بھی ہمیں اس علاقہ میں پیدا ہونے والی فصلوں کی بڑی تعداد کے حوالے ملتے ہیں۔ پرانی فصلوں کے ساتھ دیگر کئی نئی فصلیں بھی سامنے آئی ہیں ان میں دو اہم نقدی فصلیں بھی شامل تھیں،

کالی مرچ کے بارے میں پلینی کا بیان

کالی مرچ کا پودا (ہندوستان میں) ہر جگہ اگتا ہے اور یہ دیکھنے میں ہماری صنوبری جھاڑی (Junipers) جیسا ہوتا تھا۔ حالانکہ کچھ مورخوں کا دعویٰ ہے کہ یہ صرف کاکیشس کے ان ڈھلوان دار علاقوں میں اگتے ہیں جہاں سورج کی روشنی پوری مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ جونی پر سے یہ بیج اس معنی میں مختلف ہوتا ہے کہ یہ بہت چھوٹی چھوٹی پھلیوں میں بند ہوتے ہیں جیسا کہ ہم موٹھ میں دیکھتے ہیں۔ ان ہی پھلیوں سے وہ چیز بنتی ہے جسے لمبی مرچ کہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ پھوٹیں ان کو توڑ کر دھوپ میں سکھا لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کو پکنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ پھٹ جاتی ہیں۔ اور پکنے پر سفید مرچ سامنے آتی ہے جو سورج کی گرمی لگنے پر اپنا رنگ بدل لیتی ہے اور اینٹھ جاتی ہے۔ ان فصلوں میں زیادہ تر ایک خاص بیماری لگنے کا امکان رہتا ہے کیونکہ اگر موسم برا ہوا تو اس پر ایک مٹ میلی چتی کا حملہ ہوسکتا ہے جو بیجوں کو سڑا کر کھوکھلے چھلکے بنا دیتی ہے اسے بریگما (Bregma) کہتے ہیں جس کا ہندوستانی زبان میں مطلب ہے: مرا ہوا۔ کالی مرچ کی سبھی قسموں میں یہی سب سے تیکھی اور سب سے ہلکی ہوتی ہے جبکہ اس کا زیادہ پیلا پن اس کی خصوصیت ہے۔ کالے رنگ والی مرچ زبان کو سب سے زیادہ ذائقہ دار لگتی ہے جبکہ سفید قسم ان دونوں سے کم تیکھی ہوتی ہے۔ اس پودے کی جڑ وہ چیز نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگوں نے مان لیا ہے۔ کچھ مورخین اسے زمپی بیری (Zimpiberi) کہتے ہیں اور اسے کچھ لوگ زنجی بیری (Zingiberi) (مطلب ادرک) کہتے ہیں۔ حالانکہ اس کا ذائقہ کافی ملتا جلتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ادرک عرب میں اور غاری (Troglodyte Country) علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اور جہاں اس کی کاشت ہوتی ہے۔ یہ ایک چھوٹا پودا ہوتا ہے جس کی سفید جڑ ہوتی ہے۔ اس کے بے حد تیکھے پن کے باوجود یہ بہت تیزی سے سڑ بھی سکتا ہے۔ اس کا دام چھ دیناری فی پاؤنڈ ملتا ہے۔ لمبی مرچ میں الیکزینڈریا کی سرسوں سے بہت آسانی سے ملاوٹ کی جاسکتی ہے یہ 15 دیناری فی پاؤنڈ پر بکتی ہے۔ سفید والی سات اور کالی والی چار پر۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ غذا کی من پسند چیز کیسے بن گئی۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں دوسری چیزیں ہمیں متوجہ کرتی ہیں کچھ تو اپنی مٹھاس کی وجہ سے اور کچھ اپنی اچھی شکل کی وجہ سے۔ وہیں دوسری طرف اس مرچ میں دانا یا پھلی ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو اسے پسندیدہ بنائے۔ اس کا تیکھا پن وہ اکیلی خاصیت ہے جس کی وجہ سے اسے اہمیت دی جاتی ہے اور پھر بھی اسے اسی کے لئے دور دراز واقع ہندوستان سے لایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ کالی مرچ اور ادرک، دونوں متعلق دیشوں میں جنگلی فصلوں کی شکل میں اگتے ہیں اور پھر بھی ہم ان کو یہاں سونے چاندی کی ہی طرح تول کے بھاؤ میں خریدتے ہیں۔

جان ڈبلیو میک کرنڈل، اینشینٹ انڈیا ایز ڈسکرائبڈ ان کلاسکیل لٹریچر، ویسٹ منسٹر، 1901۔ دوسری اشاعت، 1971، صفحہ 122-121۔

شمالی کونکن میں ناریل اور مالا بار ساحل پر کالی مرچ۔ پیری پلس آف دی اریی تھرین سی، میں اور پلینی کی نیچورل ہسٹری میں بھی مالا بار ساحل پر کالی مرچ کے حصول کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتبوں میں ایسے باغانوں کا ذکر ہے جس میں ناریل کے پودے 8000 سے کم نہیں تھے۔

گوداوری اور کرشنا کے بیچ کے ساحلی علاقے چاول کی کھیتی کے لئے خاص کر خوشحال ہو گئے۔ چاول کی بھاری پیداوار کے نتیجہ سے یہ بر آمد کی ایک اہم شے تھی۔ زراعت کی دیگر فصلیں گیہوں، جوں، جوار، باجرہ، مسور، تلہن وغیرہ تھیں۔ مختلف قسم کے تلہنوں میں تل کی وسیع کھیتی کی جاتی تھی۔ نرمدا کا علاقہ کافی تل پیدا کرتا تھا اور بیری گازا سے تل کا تیل بر آمد کیا جاتا تھا۔ دکن میں تل پیشکوں (تیلیوں) کی گلڈ کی تشکیل تل کے تیل کی تجارتی اہمیت کا ثبوت ہے۔ گا تھا سپت ستی میں گوداوری کی وادی میں سرسوں کی راجک (Rajika) قسم کی زراعت کا ذکر ملتا ہے۔ تاپتی، گوداوری، نرمدا اور کرشنا کی وادیوں کی کالی مٹی بڑے پیمانے پر کپاس کی کھیتی طبعی ماحول کے مطابق تھی۔ دکّن کے کچھ علاقوں میں گنّے اور پامیرا تاڑ کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔ گا تھا سپت ستی گڑ۔ یانتر کا Guda) (Yantrika ذکر کرتی ہے جو ممکن ہے گنّے کا رس نکالنے کے کام آتا تھا۔ جنّار کے ایک کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ پامیرا تاڑوں کی ایک قسم کی زراعت کے لئے ایک کھیت کو عطیہ میں دیا گیا تھا۔

سینچائی پر خصوصی دھیان دیا جاتا تھا۔ گا تھا سپت ستی میں ہمیں گھڑوں کی مالا والے رہٹ (رہیٹ گھڑیا) کا حوالہ ملتا ہے۔ کنہیری سے حاصل دوسری صدی عیسوی کے ایک کتبے میں سوپارہ کے سیٹھی (Sethi) پنک (Punaka) کے ذریعہ ایک تالاب/ ٹینک (Talaka) کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ شاکا راجہ رودرمن اول (لگ بھگ 150-130 عیسوی) کے ذریعہ سدرشن جھیل کی مرمت اور دوبارہ سے تعمیر، بے شک اس عہد کی سب سے مشہور سینچائی منصوبہ بندی ہے۔ سینچائی کی سہولیات پر نجی کنٹرول بھی ہوتا تھا اور شاہی اقتدار کا بھی۔

ساتواہن عہد میں چھوٹے زراعتی کھیت (زمین) وجود میں آئے جو زیادہ تر نجی مالکوں کے ہوتے تھے۔ یہ مذہبی گروپوں اور افراد کو زمین کے پلاٹ کے تحفہ/ بیچنے Gift/ Sale کا واضح کتباتی ثبوت ہے۔ مغربی چھترپ (Kshatrapa) راجا نہپن (Nahpana) (تقریباً 125-105ء) کے داماد اوشبھدت (یارشبھدت) کو بودھ سنگھ کو عطیہ میں دینے کے لئے ایک برہمن سوامی سے زمین کا پلاٹ خریدنا پڑا تھا۔ جنار (Junnar) کے کتبات مختلف گاؤں میں زمینی پلاٹ کے عطیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن زمین پر ریاستی ملکیت کا چلن تھا۔ مثلاً گوتمی پتر ساتکرنی کا تقریباً 130 عیسوی کا ناسک غاری کتبہ کچھ بودھ بھکشوؤں کے نام شاہی زمین (راجم کھیتم) کے عطیہ کا ذکر کرتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ''اگر زمین پر کھیتی نہیں ہوتی تو گاؤں بھی نہیں بستا''۔ اس طرح یہاں ہمیں اس ثبوت کا اشارہ ملتا ہے کہ کچھ عطیہ زمین پر کھیتی کرانے کے لئے بھی دیئے جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زراعت کی اشاعت ریاست کے اصول کا حصہ تھا۔

7.4.2 دستکاری، صنعتیں اور تجارت

لیکن دستکاری کی اشاعت اور تجارت کی توسیع معاشی زندگی کا سب سے قابل تذکرہ پہلو تھا۔ ساتواہن عہد میں دستکاروں کی ایک بڑی تعداد کے کتباتی ثبوت ملے ہیں۔ جنہوں نے مختلف مذہبی گروپوں اور انسانوں کو عطیہ دینے کے معاملہ میں اپنے نام، پیشے اور مذہبی تعلق کے نشان چھوڑے ہیں۔ ایسے دستاویز مغربی دکن کی غاروں سے اور بھرہوت اور سانچی کے بودھ مقامات سے ملتے ہیں۔ کتباتی ثبوتوں میں ہمیں بڑھئی (ودھا کی)، بانسوں کا کام کرنے والے (واسکار) سرکنڈے کا کام کرنے والے (کوناچک)، ٹھٹھیروں (کسکار)، کمہاروں (کلارک)، بنکروں (کولک)، جوہریوں (منی کار) ہاتھی دانت کے کاریگروں (دنت کار) عطر فروشوں (گندھیک)، کپڑا بنے والوں (پروارک)، تیلیوں (تلا پیشا کا)، مالا بنانے والوں (مالا کار)، سناروں (سورن کار) لوہاروں (لوہک کاروک) کے ذکر ملتے ہیں۔ پیٹھن (پہلے کا پرتشٹھان، اورنگ آباد سے 56 کلومیٹر) مسکی (رائے چور، کرناٹک) اور کونڈاپور (حیدرآباد سے 90 کلومیٹر آندھرا پردیش) میں ہوئی کھدائیوں سے لاجورد، عقیق، کرسٹل، عقیق یمنی، سنگ سلیمانی، یاقوت اور لعل کے موتی ملتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ تو علاقائی پیداوار ہی نہیں تھے۔ دانوں، ادھورے موتیوں او رموتیوں کے سانچوں کی موجودگی اشارہ دیتی ہے کہ موتیوں کی پیداوار بھوکردن (Bhokardan) (ضلع جالنا، مہاراشٹر)، نیواسا (Nevasa) (ضلع احمد نگر مہاراشٹر)، تیر Ter (ضلع عثمان آباد، مہاراشٹر) پیٹھان وغیرہ مقامات پر

ایک علاقائی صنعت تھی۔ پیری پلس آف دی اریری تھرین سی میں (جسے پہلی صدی عیسوی کے وسط یا بعد والے حصہ میں لکھا مانا جاسکتا ہے) وسط دکن میں دو سرگرم کپڑا بنانے والے مرکزوں کی بات کہی گئی ہے: یہ ہیں تگر (تیر) اور پیٹھان (پرتشٹھان)۔ تیر میں ہوئی کھدائیوں میں کپڑوں کی رنگائی کے کئی ناندیں (Vats) ملی ہیں جو پیری پلس کے ثبوت کی گواہی دیتے ہیں۔ رنگائی کے ایسی ناند (vats) اریکا میڈو (Arikamedu) (پانڈیچیری کے قریب) میں ہوئی کھدائیوں میں بھی ملے ہیں۔ یہ ڈھانچہ پہلے سے تیسری صدی عیسوی کے ہیں جب کرگھا صنعت کی ترقی ہو رہی تھی۔

گلڈ (شرینی) ساتواہن عہد میں تجارت اور صنعت کی ایک خاص خصوصیت تھی۔ ان انجمنوں نے تجارت کے لئے پیداوار میں ضروری اضافہ کئے اور یہ شہری زندگی کا اہم جز بن گئی۔ دستکار اور صارفین، دونوں کے فائدے کی حفاظت کے لئے یہ انجمنیں کاروبار سے متعلق قانون طے کرتی تھیں۔ اور تیار مال کی خوبی کی درجہ بندی اور قیمت بھی طے کرتی تھیں۔ تقریباً سبھی صنعتی کام اور اہم پیشے اپنی اپنی انجمنوں اور اپنے اپنے طبقوں میں منظّم تھے۔ مغربی، مشرقی یا وسط دکن سے اور وسط ہندوستان سے ملے دستاویزوں کی بڑی تعداد ان کی معاشی اہمیت میں کوئی شک ہی نہیں رہنے دیتی، جاتکوں، اودانوں، ملند پنہو، منوسمرتی، یجناوالیکا سمرتی، مہابھارت وغیرہ مختلف ادبی ماخذوں میں بھی ان کی اہمیت کو مانا گیا ہے۔ انجمن کا نیتا جیٹھک یا پرمکھ کہلاتا تھا۔ اس عہد کا قانونی ادب (Legal Literature) آفیسروں (کاریہ چنتک Karyachintakas) کا تذکرہ کرتا ہے اور اس طرح انجمنوں کی بڑھتی پیچیدگیوں اور بڑھتے کاموں کا اشارہ دیتا ہے۔ اسی عہد میں انجمنوں نے بینک کا کام کرنا اور عوام کی بھلائی کے کاموں میں بھی مدد کی۔ جنار (Junnar) کے ایک کتبے میں تحریر غلہ تاجر (دھنک) کی مدد سے سات کمروں والی ایک غار کی کھدائی اور ایک حوض کی تعمیر کا ذکر ہے۔ تجارت کے پھلنے پھولنے کے لئے معقول ماحول میں تاجروں کا اہمیت حاصل کرنا فطری تھا۔ ساتواہن کتبے سیٹھی (Setthi) ونج (Vanij)، سارتواہ اور نیگم جیسے لفظوں کا ذکر تاجروں کے لئے کرتے ہیں۔ یہ تاجر اکثر تجارتی انجمنوں میں منظّم پائے جاتے ہیں جیسے کارلے (Karle) کے کتبے میں مذکور ونی گرام (Vanigrgama)۔ موثر طریقے سے یہ دلیل دی گئی ہے کہ کاروباری اور تجارتی انجمنوں کا گہرا رشتہ مذہبی اداروں اور خانقاہوں سے تھا اور ساتواہن ریاست میں تجارت کی توسیع میں ایک اہم کردار نبھایا۔ خانقاہیں ایسی ہی تنظیموں کی طرح کام کر رہی تھی جو فصل کے پیٹرن، دور دراز کے بازاروں، یہی بستیوں کی ساخت اور تجارت سے متعلق خبریں دیتی تھیں۔

اہم بات یہ ہے کہ دستکاری اور صنعتوں کو محصول کا اہم ذریعہ مانا جاتا تھا لیکن ان پر ریاست کا کنٹرول کم تھا۔ یہ بات کارلے (Karle) کے ایک کتبے میں دستکاروں (کروکار) پر محصول لگائے جانے کے ذکر سے ظاہر جاتی ہے۔ چونکہ اس عہد میں دستکاری اور صنعتوں کی بہت ترقی ہوئی اس لئے دستکاروں پر ٹیکس لگانے سے شاہی خزانہ کو بھاری محصول ملنا ممکن تھا۔ لیکن کان کنی کا کام راجا کا خصوصی اختیار تھا۔ ساتواہن کتبات میں نمک ٹیکس (الون کھٹکم۔ الونا کھڈکم (alonakhatakam- alavanakhadakan) کے معاف کئے جانے کا ذکر ملتا ہے جو اس عہد میں نمک ٹیکس کے چلن کا اشارہ دیتے ہیں۔ ممکن ہے ساتواہن راجاؤں نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ نمک کی پیداوار ٹیکس کی صلاحیت کے نظریہ سے اہم ہے۔ کارلے کتبے میں دیے مئے (deya meya) لفظ کا استعمال کیا گیا ہے جو دستکاروں (کروکار) پر لگایا گیا تھا۔ دئے مئے کا مطلب ممکن ہے وہ ٹیکس جو دیے (deya) تھا اور جسے کچھ قابل پیمائش (meya) طریقوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ لگتا ہے ساتواہن، شے اور نقد دونوں شکلوں میں ٹیکس کی وصولی کرتے تھے۔ مغربی چھترپ راجا رودر دمن اول (150ء) کے جوناگڑھ کتبے سے ہمیں مستعمل بلی (usual bali) (عوام پر لازمی ٹیکس یا عطیہ) شلک (Sulka) (کشتیوں پر ٹیکس، چنگی، مالوں پر لگے ٹیکس وغیرہ) اور بھاگ (bhaga) (راجا کا حصہ عام طور پر پیداوار کا چھٹا حصہ) کا پتہ چلتا ہے۔ اسی کتبے کے مطابق رودر دمن اول نے ٹیکس (وقت، وقت پر لگنے والا ٹیکس یا کسی اور قسم کا ٹیکس) وشٹی (vishti) (بے گار) اور پرانایہ (Pranaya) (فیض رسانی قسم کا محصول ٹیکس (benevolence tex of non recurring nature) کی شکل میں 'شہر اور گاؤں کے رہنے والوں پر ظلم کئے بنا' ایک باندھ کی تعمیر نو کرائی تھی۔ چونکہ مغربی چھترپ اور ساتواہن ہم عصر حکمراں تھے اور کم و بیش ایک ہی علاقے پر حکومت کر رہے تھے اس لئے ممکن ہے کہ ان دونوں طاقتوں کی محصول کی نوعیت ملتی جلتی ہو۔

بڑے پیمانے پر سکہ رائج کرنا ساتواہنوں کے معاشی پروگرام کا حصہ تھا۔ ان کے سیسے، تانبے، پوٹن (تانبہ، جستہ اور ٹن کی ایک ملی جلی دھات) اور چاندی کے سکے پائے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ساتواہن سلطنت میں سیسے کے سکوں کا غلبہ تھا۔ ساتواہنوں کے چاندی کے سکوں کی تعداد ان کے مقابلے کم ہے۔ ابھی تک ساتواہن سکوں کے بہت سے ذخیرے (Hoard) پائے گئے ہیں اور چاندی کے سکوں والے جوگل تھیمبی (Jogalthembi) ذخیرہ کو

چھوڑ دیں تو دوسرے ذخیرے تانبے، پوٹن یا سیسے کے سکوں کے ہیں۔ ساتواہن سکوں کی ایک واضح علاقائی تقسیم ہے اور دیگر مثالوں میں پہلے کے سکوں کے رواج کا اثر ناقابل تردید ہے۔ ان کے مقام پیدائش اور دوسری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک خاص قسم کے سکے کسی خاص علاقہ میں رائج رہے ہوں گے۔ مثال کے طور پر ساتواہنوں کے ایک سکہ میں چت حصہ میں شیر اہم نشان ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ سکوں کی یہ قسم گجرات میں رائج تھی حالانکہ اسی کی ایک مختلف شکل آندھرا پردیش کے کرشنا۔ گوداوری ضلعوں میں پائی گئی ہے۔ آخر ساتواہنوں کے جہاز قسم کے سکوں کے پٹ حصہ میں اجین (Ujjain) کا نشان ہے اور یہ خاص طور پر کورومنڈل ساحل پر پائے گئے ہیں۔ جہاز قسم کے کچھ سکے گنٹور ضلع میں اور آندھرا پردیش کے کچھ اور علاقوں میں پائے گئے ہیں۔ جہاز کے نشان کا استعمال پھلتی پھولتی ساحلی تجارت کا اشارہ دیتا ہے۔ بنگال کے ڈیلٹا سے تمل ساحل تک پورا مشرقی ساحل ایک ہی نیٹ ورک کا حصہ تھا۔ یہ بات گول چھلے دار ظروف (Rouletted ware) کے ٹکڑوں کی تقسیم سے واضح ہے۔ ساتواہن سکوں کی سب سے بڑی تعداد وہ ہے جن میں چت حصہ میں ہاتھی بنا ہے اور پٹ حصہ میں یا تو اجین کا نشان ہے یا کنارہ پر پیڑ بنا ہے۔ پہلے گروپ کے سکے، جن میں پٹ حصہ میں اجین کا نشان ہے دکن میں دور دور تک ملے ہیں جبکہ دوسرا گروپ زیادہ تر شمالی مہاراشٹر تک محدود ہے۔ سیسے کا اہم ذریعہ ممکن ہے راجستھان کی اگوچہ (Agucha) اور زاور (Zawer) کانیں تھیں جن میں ہندوستان میں سیسے کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے اور جہاں پہلے سے کان کنی کے سراغ ملتے ہیں۔ لیکن قبل ساتواہن عہد کی سداکن (Sadakana) اور کرا (Kura) سکّوں کے سیسے کا نظیری تجزیہ بھی اہم ہے۔ ان سکّوں میں سیسے کا نظیری تناسب کسی بھی دیگر معلوم ایشیائی سیسے کے منبع سے مختلف ہے۔ لیکن وہ سیسے کے سارڈینائی (Sardinian) اور اسپینش (Spanish) سیسے کے منبع کے کافی قریب ہیں جن کا استعمال 50 عیسوی تک یونانی اور رومن کرتے رہے ہے۔ اس کے برخلاف آخر ساتواہنوں کے سکوں کا نظیری سیسہ تجزیہ زاور (Zawer) کی کانوں جیسے علاقائی ذرائع کے استحصال کا اشارہ دیتا ہے۔ ساتواہنوں کے چاندی کے سکے جن کی کم ہی تعداد کی جانکاری ہے ممکن ہے پوری سلطنت میں رائج ہوں۔ ان کی ایک شاہی اہمیت تھی۔ معلوم نمونوں کی اہم تعداد یہ اشارہ دیتی ہے کہ یہ سکے ایک قسم کے علامتی سکے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ بڑی تعداد میں چاندی کے سکوں کی ڈھلائی ساتواہن راجاؤں کو ممکن ہے اس وجہ سے ضروری نہ لگی ہو کہ ان کی علاقائی طلب ایک بڑی حد تک چھترپوں کے چاندی کے سکّوں سے پوری ہو جاتی ہو جو ساتھ ہی ریاست میں رائج تھے۔

ساتواہن سکّے

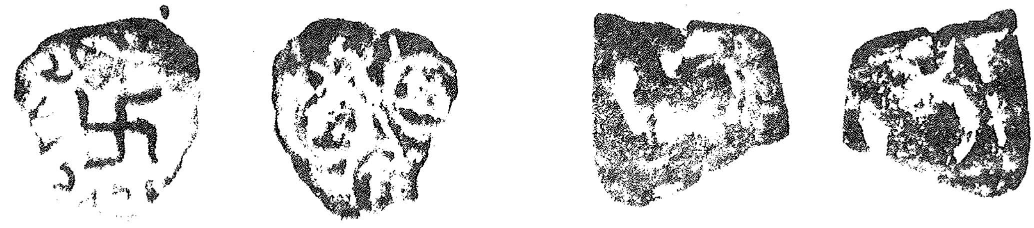

Obverse　Reverse　Obverse　Reverse

آر، بی، آئی مانیٹری میوزیم گیلری، اینشینٹ انڈیا کوائن ایج۔

دستکاری اور دستکاروں اور سکّوں کی افزائش کے ساتھ ہی ساتھ ہی مین سلطنت میں تجارت کی سرگرمیوں میں تیزی آئی۔ لگتا ہے کہ اپنی حکومت کے ابتدائی دہوں تک ساتواہن اس حالت میں آ چکے تھے کہ وسط دکن سے مغربی شمالی دکن میں واقع بندرگاہوں تک جانے والے اہم تجارتی راستوں پر قابو پاسکیں۔ براعظم کے اندر اور وسط ایشیا اور چین کے ساتھ بھی لمبی دوری کی علاقائی تجارت کی توسیع ہوئی۔ سمندری تجارت مغرب میں بحیرہ روم کے علاقوں سے لے کر مشرق میں جنوب مشرقی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ بودھ مذہب سے حاصل حوصلہ افزائی اور رواداری نہ ماحول اس کو بڑھاوا دینے والی وجوہات تھیں۔ پیری پلس کے ذکر سے ایسا لگتا ہے کہ دکن اور رومن قدیم (Orient) کے تجارتی رشتوں کی وجہ سے ایک ابتدائی ساتواہن راجا کے عہد میں کلینا، بمبئی کے پاس کلیان، میں ایک باضابطہ بازاری شہر کا قیام ہوا۔ پیری پلس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سندانوں (Sandanes) کے عہد حکومت

LIBRARY Hyderabad

میں کلیان کے بندرگاہ کی مغربی چھترپ راجا نے معاشی ناکہ بندی کی تھی اور اتفاقاً وہاں آنے والے یونانی جہازوں کو پہرے کے تحت بیری گازا (بھڑوچ) میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس طرح علاقوں پر کنٹرول کے علاوہ رومن سلطنت اور ہندوستان کی تجارت سے ملنے والے منافع کے لالچ نے بھی ان طاقتوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔ پیری پلس نے اس کا واضح ذکر کیا ہے کہ ساتواہن عہد میں مغربی ساحل کس طرح تجارت کے شور شرابے سے آباد تھا۔ رومن جہاز بیری گازا، کلیان اور چول (مہاراشٹر کے رائے گڑھ ضلع میں واقع علی باغ سے 15 کلومیٹر دور) میں لنگر ڈالتے تھے۔ ساتواہن عہد میں آندھرا ساحل پر کنٹو کسیلا (Kantokasylla) اور ایلوسیگنے (Allosygne)، مشرقی ساحل پر دو اہم بندرگاہیں تھیں اس ساحلی خطے کی اہمیت ساتواہن کے جہاز قسم کے سکّوں سے ظاہر ہے اور گھنٹسال (Ghantasal) (وجے واڑہ سے 75 کلومیٹر دور، آندھرا پردیش) میں ملے ایک کتبے سے بھی ظاہر ہے جس میں ایک مہاناوک (Mahanavika) کا ذکر ملتا ہے۔

> **پیری پلس کا ناکہ بندی کا تذکرہ**
>
> 52۔ (دکن پردیش) کی علاقائی بندرگاہ جو ایک قطار میں واقع ہیں۔ اکابارو، سوپارہ، اور کلینا شہر ہیں، ان میں سے آخری، بڑے سارا گانوس (saraganos) کے زمانے میں تجارت کی ایسی بندرگاہ تھی جس پر سب کچھ قانون کے مطابق چلتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے کیونکہ اس پر سندانوں کے اختیار کے بعد (تجارت کیلئے) کافی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے جو یونانی جہاز وہاں اتفاقاً آجاتے ہیں وہ پہرے میں بیری گازا پہنچا دیئے جاتے ہیں۔
>
> لیونل کیسون، دی پیری پلس مارس اریری تھرائی، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، نیو جرسی، 1989، صفحہ 18۔

سرپارک (Surparaka) وجینتی (Vaijayanti) دھانیہ کٹک (Dhanyakataka)، کلیان (Kalyana) ناسک، بھری گوکچھا (Bhrigukachchha)، گھنٹ سال (Ghantsal) میں رہنے والے مختلف دستکاروں اور تاجروں کے جو حوالے کارلے، کنہیری، جنار (Junnar) اور امراوتی کے کتبوں میں ملتے ہیں وہ دکن کے سبھی اہم شہروں کو جوڑنے والے راستوں کے ایک نیٹ ورک کا پتہ دیتے ہیں۔ پیٹھن سے ماہیشور، اجین، شراوستی اور ویشالی تک جانے والا زمینی راستہ آمدورفت سے بھرپور تھا۔ اس راستہ کی اور شاخیں بھی تھیں جو کرشنا کی نچلی وادی تک جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک مغربی ساحل پر سرپارک کی طرف جاتی تھی۔ ان سبھی شاخوں میں سب سے اہم وہ تھی جو اجین سے بھرگوکچھا کی مشہور بندرگاہ تک جاتی تھی۔ اندرونی بازاروں سے مغربی ساحل کے سب سے اہم بندرگاہ کو جوڑنے والا یہ راستہ تاجروں کے لئے بہت ہی اہم تھا۔ قدیم تجارتی راستے نانا گھٹ نے بھی ساتواہن سلطنت کی معاشی سرگرمیوں میں ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ یہ جنار کے آس پاس کے زرخیز علاقے کی اور دیگر اندرونی علاقوں کی پیداواروں کے لئے نکاس کا کام کرتا تھا اور کلیان اور سوپارہ بندرگاہوں سے سامان اور اشیاء کو اندرونی علاقوں تک لے جاتا تھا۔ ایک راستہ وہ بھی تھا جو تیر سے جنوب کی طرف جاتا تھا جہاں کونڈاپور واقع تھا اور اکن پلی (Akkanpalle) ضلع نال گونڈا سے گزر کر ارجن کونڈا تک جاتا تھا۔

ایسے ماحول میں جس میں زراعت کو توسیع، دستکاری اور دستکاروں کی افزائش ہو رہی تھی اور مختلف انجمنوں کے تاجروں اور سکّوں کے رواج کے ساتھ تجارت اپنے عروج پر تھی۔ اس ماحول میں شہری مرکزوں کی ترقی فطری تھی۔ مغربی اور وسط دکن سے ایسے متعدد شہری مقامات کی جانکاری ملتی ہے جن میں نیواسا، تیر (Ter) اور ستنی کوٹا کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ ساتواہن سلطنت کا اٹوٹ حصہ بننے کے بعد مشرقی دکن بھی اس بڑھتی شہرکاری کے اثر میں آیا۔ امراوتی، بھوٹی پرولو، سلی ہنڈم، ناگ ارجن کونڈا میں، سبھی کرشنا ڈیلٹا میں، ہوئی کھدائیوں سے شہری حجم کا پتہ چلتا ہے۔ مشرقی ساحل سے ان کی قربت کی وجہ سے ان کی اہمیت بڑھ گئی کیونکہ اس ساحل پر کچھ اہم بندرگاہیں قائم تھیں۔ کرشنا ندی میں جہاں تک جہاز رانی ممکن تھی دھانیہ کٹک ایک اندرونی بندرگاہی شہر کا کام کرتا تھا۔ کتباتی ریکارڈ بھی شہری مراکز کی ترقی کی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے کتبات ہیں جن میں شہر اور نگم (بازار مراکز) کا تذکرہ ہے۔

7.5 گپت سلطنت کی معاشیات

گپت سلطنت کی معاشیات کی صحیح سمجھ کے لئے ہمیں آثار قدیمہ اور ادبی، دونوں قسم کے ماخذوں کا سہارا لینا ہوگا۔ گپت حکمرانوں کے عہد کے متعدد کتبات اور ان کی وسیع سکوں کا نظام بہت زیادہ اہم ہے۔ سمرتی گرنتھوں، وار اہ میر (Varahamihira)، کی بر ہا جا تک (Brhajjatka) اور بر ہت سمہتا اور کالی داس کی تصنیفوں کے علاوہ سب سے مفید ادبی تصنیف امر سنگھ کی امر کوش ہے جو اس عہد کے معاشی زندگی کے بارے میں متعدد جانکاریاں فراہم کرتا ہے۔

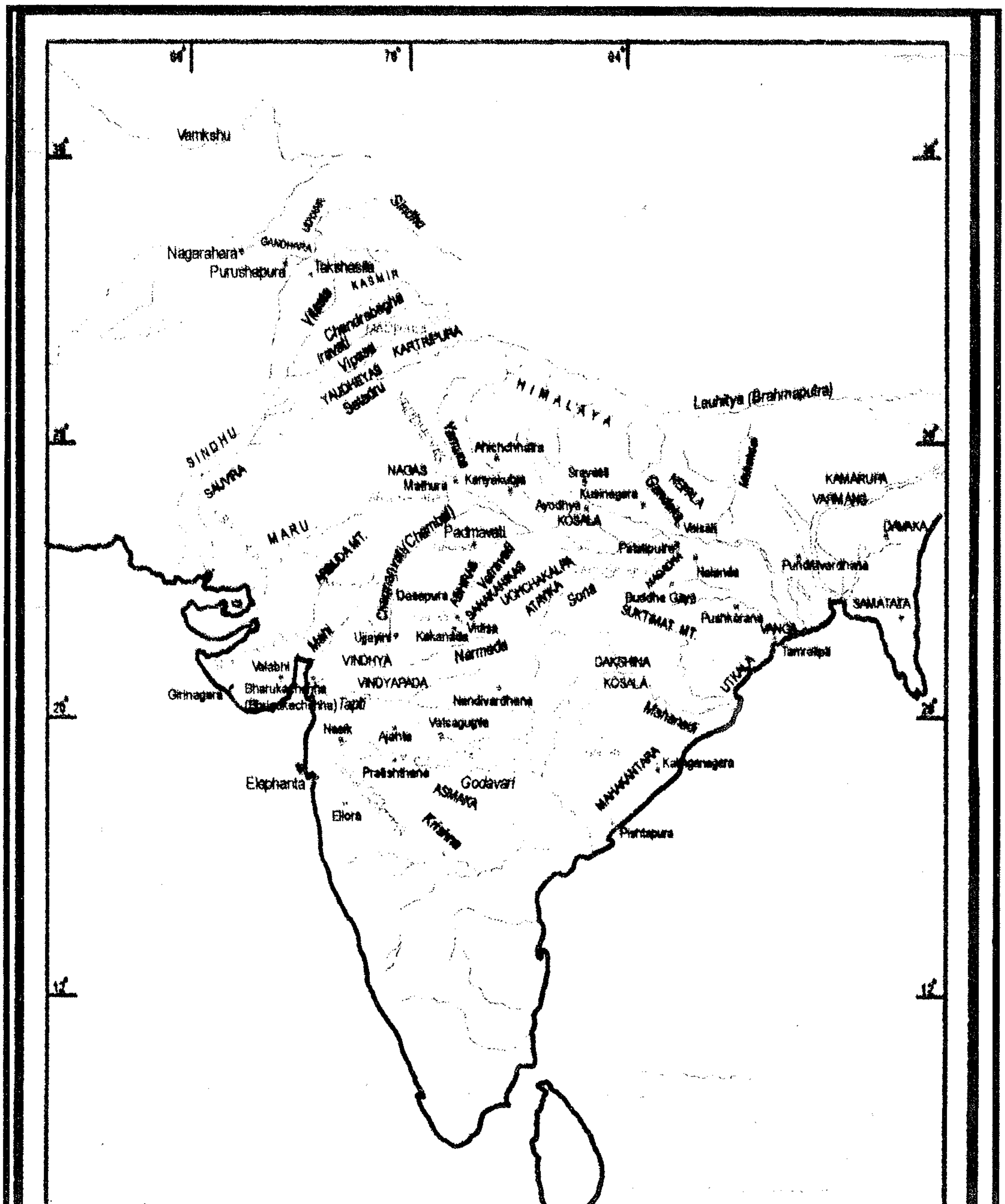

نقشہ 3۔ گپت اور واکاٹک (آرسی، مجمدار، مرتبہ اے کامپر ہینسیو ہسٹری آف انڈیا، جلد 3، حصہ 2، اے۔ ڈی۔ 985-300 نئی دہلی، 1982، صفحہ 1483 پر مشتمل۔

7.5.1 زراعتی معاشیات

گپت عہد میں اگرہاروں (Agraharas) کی تخلیق قابل ذکر ہے۔ اگر ہار لفظ کے معنی زمین کا ٹکڑا یا ٹکڑے اور گرام یعنی دیہاتوں کا عطیہ ہیں۔ یہ لگان سے آزاد ہوتے تھے اور عام طور پر راجا کے حکم پر تانبہ کی پلیٹ پر حکم جاری کر کے مذہبی افراد اور یا اداروں (کسی برہمن، مندر، مٹھ، کسی بودھ وہار یا جین وہار) کو عطیہ میں دیئے جاتے تھے۔ زراعت کی تاریخ کی سمجھ کے لئے یہ حکم نامہ بہت اہم کردار نبھاتے ہیں کیونکہ یہ ملکیت زمین کی منتقلی کو بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان کی سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی حالات کے بارے میں بھی ہمیں خبریں فراہم کراتے ہیں۔

بنگال سے ملی تانبہ کی پلیٹ زمین کی قسموں، زمین (پلاٹ) کی پیمائش کے طریقوں، زمین (پلاٹ) کی قیمتوں اور عطیہ حاصل کرنے والے کو زمین کی منتقلی کے طریقہ پر اہم جانکاری عطا کرتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ زراعت کی زمین (علاقہ) رہائشی زمین یعنی پلاٹ (واستو) اور جنگل (ارنیا) (aranya) میں

> **دامودر پر کی تانبہ کی پلیٹ۔تحریریں**
>
> سال **100** (اور) **20** (اور) **9** (**129**=) **میں ویشاکھ (Vaiskha) کی 13 ویں** تاریخ پر مادتیہ پرم بھٹارک مہاراج ادھیراج **شری کمار گپت** زمین کے حکمران تھے۔ اور اپرک چرت دت پنڈرووردھن صوبہ (بھکتی) میں ان کے لطف وکرم کا حامل تھا (مہاراج کے قدموں کے ذریعے قبول کیا گیا) اور اسکے (چرت دت) کے ذریعہ نامزد کمار اماتیہ ویتر ورمن کوٹی ورش ضمن میں تھا جو (**چترت دت**(**Chiratadatta**) کہ حکومت میں ہمیشہ پھلتا پھولتا رہا، جو شہر کی گلڈ کے صدر دھرتی پال، تاجر بندھومتر، دستکاروں کا مکھیا دھرتی متر (Dhritimitra) اور صدر محرر سمبا (Samba) (؟) پال کے ساتھ ملکر شہر کی حکومت چلا رہا تھا۔ (جبکہ)........... (ان کو) اس طرح مخاطب کیا: ''اپرداکشیہ (نیوی) (Nivi)، (نا قابل منتقلی) کی شرط ہٹا کر (زمینوں کے عطیہ کے لئے) میری پانچ روزانہ کی قربانیوں (پنچم مہایگیہ) کے لئے .... قائم (موجود) قانون کے مطابق (زمین) کے عطیہ کا انتظام کریں''۔ جب اس درخواست کو پانے کے بعد محافظ دفتر، رشی دت، جیانندن اور وی (بھودت)؟ کے طے کئے ہوئے جرمانوں پر یہ یقین ہوگیا کہ زمین دی جاسکتی ہے تو ایراوت (؟) کے مغرب میں ہٹ اور پنک (؟) کے ساتھ پانچ درون (؟) زمین دی گئی۔ ہر ایک کلیہ واپ زمین کے بدلے تین دینار کی قائم درسے دو (؟) دینار ملنے کے بعد دی گئی.............. اس لئے (ایسے عطیوں کے) ثواب پر غور وفکر کر کے مستقبل میں اس عطیہ کی عزت انتظامی افسران کے ذریعے کی جائے گی اور وہاں زمین کے عطیوں کے بارے میں یہ دو جملے (شو) بھی پائے جاتے ہیں (1) اے یدھشٹر، سب سے اچھی زمین کے مالک، دوبار پیدا ہونے والے (برہمنوں) کو دی جاچکی زمینوں کی ہوشیاری سے حفاظت کرو۔ کیونکہ زمینی عطیہ کی حفاظت (خود) عطیہ سے بھی زیادہ ثواب کا م ہوتا ہے۔ (2) ''متعدد (آدمیوں) کے ذریعہ زمین دی گئی ہے اور (مستقبل میں) متعدد افراد کے ذریعہ دی جائے گی (پر) (زمینی عطیہ کا) پھل اسے حاصل ہوتا ہے جو کسی خاص وقت میں زمین کا مالک ہو''۔
>
> رادھا گوند بسک، دی فائیو دامور پور کاپر پلیٹ انسکر پشنز آف دی گپت پیریڈ، اپی گرافیا انڈیکا، جلد 15، 1982، نئ دہلی، پلیٹ نمبر دو، (ترجمہ) صفحہ 113۔

فرق کیا جاسکے۔ پرتی کھیت کو خلا کہا جاتا تھا۔ خلا چھیتر (Khila kshetra) کی تعبیر ایک قابل کاشت کھیت کی شکل میں کی گئی ہے جسے فی الحال پرتی (خالی) چھوڑ دیا گیا ہو۔ پرتی زمین کی تشریح آگے خاص طور سے اپرہاٹ (جس پر کبھی کھیتی نہں ہوئی) ادیا استمب (Adyastamba) (جو کبھی نہ صاف کی گئی، جھاڑیوں وغیرہ سے ڈھکی ہو)، اپرد (Aprada) (کچھ نہ دینے والی) اور راپرتیکا رال (Apratikaral)، اتپرتیکا رال

(Utpratikaral)سنیہ پرتیکارا(Sunyapratikara)(وہ زمینی حصہ جس نے کبھی کوئی لگان نہیں دیا) کی شکل میں کی گئی ہے۔زمینی حصوں کھیتوں کا رقبہ کا تعین ادھواپ(Adhavap)درونواپ(Dronavapa) کلیاواپ(Kulyavapa) کی شکل میں اور صرف ایک بار پاٹک(Pataka) کی شکل میں کیا گیا ہے۔(وینیہ گپت کی 8-507 عیسوی کا گوئی گڑھ تانبہ کی پلیٹ دیکھیں) کلیاواپ، درون واپ اور ایک ادھواپ لفظوں کے اضافہ کے نظریہ سے زمین کے ان رقبوں کی طرف اشارہ ہے جو کبھی کبھی ایک کلیہ (Kulya)، ایک درون اور ایک ادھک(adhaka) بیج بونے کے لئے ضروری ہے۔یہ زمینی عطیے اس بات کا بھی حوالے دیتے ہیں کہ زمین کو ناپنے کے لئے باری باری سے دو چھڑیوں (نالوں) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ہمیں اشٹک نوکن لبھیم (Astaka-Navakanalabhym)،(8X9) نال اور شڈک نوکن لبھیم(6X9)(Sadka-Navaknalabhyam) نال اور نوک نوکن لبھیم (9X9) نال جیسے تاثرات بھی ملتے ہیں۔ان تاثرات کے صحیح تشریح پر اختلاف ہے۔ممکن ہے کہ ان نالوں کا استعمال زمینی حصوں کے لائن ناپنے کے لئے کیا جاتا ہو۔فطری طور سے کھیتی کے لائق زمینی حصوں کے زیادہ دام ملتے تھے۔چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں ونگ(Vanga) (بنگلہ دیش کے ڈھاکہ۔وکرم پور۔فرید پور علاقوں میں) جتے ہوئے زمینی حصوں کی قیمت چار دینار (گپت سونے کا سکہ) فی کلیاواپ کے بھاؤ سے لگایا جاتا تھا جبکہ پنڈروردھن بھکتی (قدیم شمالی بنگال) کے اندر کوٹی ورش کے آس پاس کے علاقہ میں پرتی، بغیر جتے اور کچھ نہ دینے والی قسم کے زمینی حصوں کی قیمت تین دینار تھی۔اسی بھکتی (صوبہ) کے دوسرے علاقوں میں اسی قسم کے زمینی حصوں کی قیمت تھی دو دینار فی کلیاواپ۔کتبات سے پتہ چلتا ہے کہ کوٹی ورش میں عیسوی 443/444 سے 544 / 543 کے بیچ زمین کی قیمت ساکن رہی۔بنگال کے یہ سند نامے، بیع نامے کم عطیہ نامے تھے۔برصغیر کے دوسرے حصوں میں زمین براہ راست راجاؤں کے ذریعہ عطیہ میں دی جاتی تھیں۔

زمینی حصوں کی خرید کی مثالیں واضح کرتی ہیں کہ قدیم بنگال میں زمین کی نجی ملکیت کا دستور رائج تھا۔حالانکہ زیادہ تر برہمن ہی زمین کے مالک بنے کیونکہ زمین کے عطیہ عام طور پر مذہبی افراد کو دیئے جاتے تھے، پھر بھی ہمارے پاس غیر برہمن دیہاتیوں کے زمین مالک ہونے کے مثالیں ہیں۔چھٹی صدی کے قدیم سمتات(Samtata) علاقہ سے حاصل ایک تانبہ کی پلیٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑھئی (وردھک) اور مستری (میکینک، ولال) بھی زمین کے مالک تھے۔برہمنوں کو دی گئی زمین کو، ظاہر ہے وہ خود جوتتے بوتے نہیں تھے۔وہ کاشتکاروں کو کام پر رکھتے تھے جو زمین مالک نہیں تھے۔زمینی معاشیات کی درجہ بندی پر مشتمل تنظیم میں یجنا والکیہ (Yajnavalkya) نے تین دور شامل کئے ہیں۔یعنی مہی پتی(Mahipati)(راجا)، چھیتر سوامی (زمین کا مالک) اور کرشک (کاشتکار) جس کی برہسپتی نے عام طور پر تصدیق کی ہے۔اس طرح کرشک کو مالک سے مختلف ٹھہرایا گیا ہے اور سوامی زمین مالک بچولیہ کی شکل میں آجاتا ہے۔اس سے عطیہ دینے والوں کی مادی حالت اور حیثیت میں قابل تعریف عروج کا پتہ چلتا ہے۔عطیہ پانے والے زیادہ تر برہمن تھے۔اسی وجہ سے عطیہ پانے والے شاہی حکم کے ذریعہ لگان اور محصول پر مزے کیا کرتے تھے۔

زمین مالک بچولیوں کی حیثیت میں عروج کی تشریح دانشوروں کے ایک گروپ نے مادی زندگی میں ایک اہم تبدیلی کے ایسے مظہر کی شکل میں کی ہے جس نے معاشیات کے غیر زراعتی علاقہ کو پس منظر میں دھکیل کر دیہی زراعتی معاشیات میں اپنی جڑیں جمالیں۔ان کی رائے میں پہلے کے تاریخی دور کی متحرک شہری معاشیات گپت عہد میں تانبہ کی پلیٹوں پر کنندہ راجاؤں کے سند ناموں کی افراط کی وجہ سے ایک خود کفیل بند دیہاتی معاشیات کے متبادل ہونے لگی تھی۔پھر بھی یہ بات اہم ہے کہ بنگال میں عطیہ میں دی گئی زیادہ تر زمین بنجر اور غیر زراعتی زمینیں تھیں اور راجا کی ملکیت تھی۔اس لئے ان زمینوں کی فروخت نے نہ صرف شاہی خزانہ میں اضافہ کیا بلکہ غیر زراعتی زمینوں کو آہستہ آہستہ کاشت کے لئے لائق بھی بنایا۔گپت عہد کے کتبات میں ہم پشٹ پالوں (دستاویزوں کا محافظ) کو زمین کی منتقلی کی اجازت دیتے دیکھتے ہیں۔کیونکہ اس سے راجا کے معاشی مفادات متاثر نہیں ہوتے تھے۔پنڈروردھن بھکتی (قدیم شمالی بنگال) کی کچھ کتبات میں ہمیں دیہات کی سطح پر اہم سماجی گروپوں کے دو طرح کے نمائندہ ملتے ہیں۔کٹم بن اور مہتر (Kutumbin and mahattra)۔ان دونوں لفظوں کے معنی ہیں خوشحال کاشتکار۔کٹم بنوں کے خلاف مہتروں کو اونچی سماجی حیثیت حاصل تھی۔قدیم بنگال کے دیہاتی سماج میں کٹم بن اور مہتر کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہے کہ زمین سے متعلق سودوں کی درخواستوں میں نہ صرف ان کو مخاطب کیا جاتا تھا بلکہ ایسے سودے جب پورے ہو جاتے تھے تو وہ زمین کی منتقلی کی درست حد بندی کی نگرانی بھی کرتے تھے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad
IMC LIBRARY

ایک معاشیات، جو خاص طور پر زراعت پر مشتمل تھی، میں سینچائی کے انتظام ضروری تھے۔ جن علاقوں پر بارش اور ندیوں کی عنایت تھی ان میں مقابلتاً سینچائی کی ضرورت ان سے کم تھی۔ بنگال ایسے ہی علاقوں میں ایک تھا یہاں ہم تالابوں، دلدلی علاقوں، گڈھوں اور ندیوں کے کنارے کنارے بندھوں کی بھرمار پاتے ہیں۔ ایسے ہی تالابوں کی جان کاری برصغیر کے مختلف حصوں سے ملتی ہے۔ سینچائی کے منصوبہ کی قابل ذکر مشہور مثال گجرات میں واقع وہ سیتو (سینچائی منصوبہ) ہے جس کا نام سدرشن (Sudarshana) تھا۔ اسے چوتھی صدی عیسوی قبل کے نصف آخر میں چندر گپت موریہ کے ذریعہ بنوایا اور اشوک کے ذریعہ اس کو اور وسیع کیا گیا تھا۔ لیکن ساکا راجا رودرمن اول کے عہد میں اس کی مرمت کرائی گئی۔ گپت راجا سکند گپت کے عہد میں اس سیتو (Setu) کو ایک بار پھر نقصان پہنچا اور سوراشٹر (Surashtra) کے گپت صوبائی گورنروں (ورن دت او رچکر پالت) نے اس کی مرمت کرائی۔ کاٹھیاواڑ میں گرنار (Girnar) (قدیم گری نگرم) کے آس پاس اس بڑے سینچائی منصوبے کے تھوڑے سے ہی باقی ماندہ نشان ملے ہیں۔ ندیوں اور تالابوں سے نہریں نکال کر سینچائی کے لئے دور دراز کے کھیتوں تک لے جائی جاتی تھیں۔ نہروں نے ندیوں کی باڑھ کو روکنے میں بھی مدد کی کیونکہ ان کو امرکوش میں جل نرگم (نکلنے کا راستہ) کہا گیا ہے۔ سینچائی اور کھیتی کے معاشی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ریاست کے ذریعہ سینچائی کے وسائل کی مکمل حفاظت کی جاتی تھی۔ جو لوگ انہیں نقصان پہنچاتے تھے ان کو جرمانہ اور سزا دی جاتی تھی۔

سینچائی منصوبوں کی تعمیر نے زراعت کی حوصلہ افزائی کی۔ چاول (دھانیہ) یقیناً ہی سب سے اہم فصل تھی۔ رگھوونش میں کالی داس نے متعدد قسم کے چاولوں کی فہرست دی ہے یہ ہیں۔ سالی (Sali) نیور (Nivara) کالم (Kalama) انچا (Uncha) شیاما کا (Shyamaka)۔ ان میں سالی سب سے اچھی قسم تھی۔ کسانوں کو سالی دھان کے پودوں کی روپائی کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ امرکوش میں چاول کے علاوہ دیگر غذائی اجناس کی قسموں کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہے جو، مٹر، مسور پھلیاں، گیہوں اور دالیں۔ کالی داس گنے کے کھیتوں کا ذکر کرتے ہیں، خاص کر پندر (شمالی بنگال) کے کھیتوں کا۔ عام طور پر گنا سردی میں بویا جاتا تھا یہ اس علاقہ میں نقدی فصلوں کی کاشت / بوائی کا ایک مظہر ہے۔ لیکن امرکوش میں ان نقدی فصلوں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر پہلے ماخذوں میں ملتا ہے۔ یہ ہیں کپاس، تلہن، نیل اور سرسوں۔ امر سنگھ کے مطابق جنوب بعید سپاری کی کاشت اور کالی مرچ اور الائچی جیسے مسالوں کے باغات کے لئے مشہور تھا۔ کالی داس کلنگ کے ناریلوں کا ذکر کرتا ہے۔ لگتا ہے کہ کونکن ساحل پر ناریل کے باضابطہ باغات قائم تھے۔ یہ ایک بہت مفید پھل تھا کیونکہ ریشے کی شکل میں یہ ایک غیر معمولی پیداوار دیتا تھا جو پانی کی آمدورفت کے لئے تختوں کو جوڑنے کی تکنک کے ذریعہ بنائے گئے روایتی ہندوستانی جہازوں کے لئے لازمی تھا۔ پیداواری فصلوں کا اختلاف کسانوں کے ذریعے ان کی کاشت کے لئے معقول مختلف قسم کی مٹیوں کے پختہ علم کا مظہر ہے۔

7.5.2 غیرزراعتی پیداوار

گپت سلطنت کی معاشیات میں غیرزراعتی علاقہ بھی اتنا ہی اہم تھا۔ دستکاری کی مختلف قسموں کا رواج امرکوش سے واضح ہے۔ دھاتوں اور خاص کر لوہے پر مشتمل صنعتوں کی ترقی دستکاری کاموں کی ایک انوکھی خاصیت تھی، پھاوڑے، ہنسیہ، ہلوں کے پھال، زنجیریں، لوہے کے تسلے اور کڑاھائیاں، تلواریں، لوہے سے بنے دوسرے ہتھیار اور لکڑی، بانس، اور چمڑا کاٹنے چیرنے کے اوزاروں جیسے مفید آلات کا ہمیں علم ہے۔ لیکن لوہے کے کام کی افضلیت کی سب سے مشہور مثال یقیناً مہرولی (دہلی) کا وہ کتبہ کندہ کیا ہوا لوہے کا ستون ہے جو پانچویں صدی سے ہی زنگ آلودگی سے آزاد ہے۔ کتاب میں کرم کار (Karmakara) اور لوہ کار کے حوالے لوہاروں کی موجودگی کے مظہر ہیں۔ رگھوونش میں لوہے کے ٹکڑے کو گرم کرنے اور فولاد کے ایک ہتھوڑے (ایوگھن) کی مدد سے پیٹ کر کچھ بنانے کے حوالے ملتے ہیں۔ سونا، چاندی، تانبہ، کانسہ، اور پیتل جیسی دوسری دھاتوں کے کام بھی گپت سلطنت میں کافی ترقی یافتہ تھے۔ تانبہ ان دنوں لوہے کے بعد ممکن ہے سب سے مفید دھات تھی۔ امرکوش سنار اور لوہار کے ساتھ تانبہ کے کام کا حوالہ بھی دیتا ہے۔ سلطنت کی تانبہ کی پلیٹوں پر تحریر سندنامے، تانبہ کے کام کرنے والوں اور نقاشی کرنے والوں کی تکنیکی مہارت کا اشارہ دیتے ہیں۔ تانبہ اور کانسہ کا استعمال برتن اور مورتیاں بنانے کے لئے بھی کیا جاتا تھا۔ الہ آباد کے پاس واقع بھیٹ (Bhita) سے کھدائی میں تانبہ کے متعدد برتن ملے ہیں جیسے کھانا بنانے کا برتن، گول ڈھکن، پیالیاں، اتھلی پلیٹیں وغیرہ۔ زیادہ تر مثالوں میں بنانے کا طریقہ سانچوں میں ڈھلائی (Casting) تھی۔ حالانکہ کچھ اشیاء دھاتوں کو گرم کرنے کے بعد پیٹ کر بھی بنائی جاتی تھیں۔ سلطان گنج سے حاصل، بدھ کی تانبے کی دیوپیکر مورتی گپت عہد میں تانبے کی ڈھلائی کی بہترین مثال ہے۔ کمہار (کنبھ کار) کی دستکاری کا عوام کی روزانہ کی زندگی سے اٹوٹ رشتہ تھا۔ مٹی سے بنے برتنوں کی بھاری تعداد اہم آثار قدیمہ مقامات، جیسے راج گھاٹ، اہی چھتر اور بھیٹ سے کھدائی میں

مندسور کے ریشم بنانے والوں کی گلڈ (انجمن)

(شعر 5-4) لٹا صوبہ سے، جو پھلوں کے بوجھ سے جھکے خوبصورت پیڑوں، مندروں، ایوانوں اور وہاروں کی وجہ سے بہت خوبصورت ہے (اور) جس کے پہاڑ بناتات سے ڈھکے ہوئے ہیں، **داس پور** (شہر) میں معروف دستکاری والے وہ (لوگ) پہلے تو (اس کے لئے) اپنے دل میں، پوری عزت لئے اور پھر (جسمانی) ایک طبقہ کے شکل میں، بچوں اور رشتہ داروں کو ساتھ لے کر، سفر کی پریشانیوں وغیرہ پر دھیان نہ دیتے ہوئے واضح طور سے اس دیش کے حکمراں کے بہتر خوبیوں سے روشن ہو کر آئے۔

(شعر 15) پھر لگاتار جلسوں کے بعد، اور دن بدن گرم جوشی میں ترقی ہونے کے ساتھ، (اور) راجا کے ذریعہ (ان سے) بیٹوں کی طرح عزت کا سلوک کئے جانے کی وجہ سے وہ شہر میں ہی خوش اور (سکھ) آرام کے ساتھ رہنے لگے۔

(شعر 16) کچھ کا (اس طرح) کا موسیقی سے گہرا لگاؤ ہے، جو کانوں کو اچھا لگتی ہے، دوسرے سوسوانح عمری (کے مصنف) ہونے پر فخر ہونے کی وجہ سے خوبصورت کہانیاں لکھنے کے قابل ہیں (دوسرے) عاجزی کی مورتی ہیں اور عمدہ مذہبی گفتگو میں منہمک ہیں اور دیگر بہت کچھ ایسا بولتے جو مسرور کن، کرختگی سے آزاد (اور پھر بھی) فائدہ مند ہے۔

(شعر 17) کچھ اپنے خود کے مذہبی رسوم کے عالم ہیں، اسی طرح دوسروں نے، جو ٹھنڈے مزاج کے ہیں، (ویدک فلکیات کی) سائنس پر عبور حاصل کیا ہے اور دیگر، جو جنگ میں بہادر ہیں آج بھی دشمنوں کو بھاری نقصان پہنچاتے ہیں۔

(شعر 23) جب **کمار گپت** کی زمین پر حکومت تھی۔

(شعر 24) ایک تھا راجا **وشوورمن** (عوام کا) محافظ، جو علم میں شکر (Sukra) اور برہسپتی کے برابر تھا، جو زمین کے راجاؤں کا زیور تھا (اور) جس کے کارنمایاں جنگوں میں پارتھ کے کاموں جیسے تھے۔

(شعر 26) اس کا بیٹا (تھا) استقامت اور سیاسی اقتدار کا مالک راجا بندھوورمن، (اپنے) دوستوں کو پیارا، (اپنی) عوام کے لئے دوست جیسا، جس نے (اپنے) دوستوں کی پریشانیوں کو دور کیا (اپنے) دشمنوں کے فخریہ حمایتیوں کو تباہ کرنے میں ماہر صرف ایک آدمی۔

(شعر 29) جب راجاؤں میں سانڈ کے (برابر) مساوی، بڑا دل (اور) چوڑے کندھوں والا ہی بندھوورمن اس (داس پور) (شہر) کی حفاظت کر رہا تھا جو زیادہ خوشحال تھا، چمکیلی کرنوں والے (سورج کے دیوتا) کا ایک اونچا اور بے نظیر مندر ریشمی کپڑوں کے، بنکروں کے ایک گلڈ کے ذریعہ بنوایا گیا۔ جن کے سرمایہ کے ذخیرہ (ان کے) دستکاری کی وجہ تھے۔

(شعر 44) سورج کا یہ عظیم مندر وتسبھٹی (Vatsbhatti) کے ذریعہ، گلڈوں کے حکم پر اور (سورج کے دیوتا کے لئے اس کی) اطاعت و بھگتی کے نتیجہ میں بنوایا گیا، اور یہ تفصیلی بیان احتیاط کے ساتھ تخلیق کیا گیا۔

مندسور انسکرپشن آف کمار گپت (ا) اینڈ بندھوورمن برس 1493 اینڈ 529، جے۔ فلیٹ، کارپس انسکرپشنم انڈی کارم، جلد 2، صفحہ 332-328 میں دیکھیں۔

ملی اشیاء سے ظاہر ہے۔ مٹی کے برتنوں کو ڈھالنے، رنگنے اور پکانے میں اس عہد کے کمہار کافی مہارت کا ثبوت دیتے تھے۔ ان برتنوں میں مختلف سائز والے کھانا پکانے کے برتن، مختلف قسم کے کٹورے، متعدد سائز کے مرتبان، برتنوں کے ڈھکن، رنگریز کا سانچہ وغیرہ شامل تھے۔ ادب اور مورتیوں کی نمائندگی سے بھی کپڑوں کی جن متعدد قسموں کا علم ہوتا ہے وہ اس دستکاری کی پھلتی پھولتی حالت کا واضح ثبوت ہے۔ ریشم صنعت کے بارے میں سب سے اہم ثبوت مند سور (Mandasore) کے 436 اور 473 عیسوی کے کتبات سے ملتا ہے۔

اس میں ان ریشم بنانے والوں کا ایک گلڈ کی بات کہی گئی ہے جو بنیادی طور پر گجرات میں آباد تھے۔ لیکن بعد میں داس پور (Dasapura) یا جدید مند سور گئے تھے۔ کتبات سے بڑھئی (سوتر دھار یا وردھکی) کا علم بھی ہوتا ہے۔ ہاتھی دانت کی صنعت بھی کافی ترقی یافتہ تھی۔ ہاتھی دانت سے اشیاء بنانے والوں کی برتری الہ آباد کے پاس بھیٹ (Bhita) میں کھدائی سے حاصل نمونوں سے پتہ چلتی ہے۔ ہاتھی دانت کا استعمال عیش و آرام کی اشیاء بنانے کے لئے ہوتا تھا۔ کالی داس ہاتھی دانت کے بنے آسنوں (کرسی) کا تذکرہ بھی کرتے ہیں تیل کی پیداوار اس عہد کی ایک اور ضروری صنعت تھی۔ جیسا کہ تیلیوں کا ایک گلڈ کے وجود سے علم ہوتا ہے۔ یہ یقیناً ہی ایک پھلتی پھولتی صنعت تھی۔ سکند گپت کے عہد میں اندر پور (اندور، مدھیہ پردیش) شہر میں تیلیوں کا ایک مشہور گلڈ بھی تھا جس کے سردار کا نام جیونت (Jivanta) تھا۔ ادبی متون اور کتبات، شراب صنعت پر بھی کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ وشنوسین (592 عیسوی) کی سند میں ہمیں شراب بنانے والے (کلار) (Kallar) پر ٹیکس لگائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔

7.5.3 انجمنیں

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ 175 سے 300 عیسوی تک کے عہد کے مقابلہ میں گپت عہد کی کتباتی تحریروں میں گلڈوں کے حوالوں کی تعداد کم ہے، پھر بھی کتبات کی محدود تعداد یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ وہ ابھی بھی متعلق عہد کی معاشی زندگی کی ایک اہم خاصیت تھی۔ گلڈ کی اہمیت کی طرح کاروباری گروپوں کی اہمیت کو بساڑھ (شمالی، بہار میں قدیم ویشالی) میں پائی گئی مٹی کی مہروں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سرشیٹھی۔ سارتھواہا۔ کلک نگم، کلک نگم، سرشیٹھی، کلک نگم وغیرہ کے حوالہ دینے والی مہریں یہ اشارہ دیتی ہیں کہ ان گلڈوں کی اپنی باضابطہ مہریں ہوتی تھیں۔ 300 عیسوی سے پہلے ہمیں ایسی مہروں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا جس کا مطلب یہ ہو کہ گلڈوں کی سرگرمیاں زیادہ منظم ہو چکیں تھیں اور ان کے کام کا دائرہ بڑھ چکا تھا۔ جہاں کلک نگم (Kulika-Nigam) یقیناً ہی دستکاروں کی تنظیم تھی، وہیں سرشیٹھی۔ سارتھواہ۔ کلک نگم کی تشریح ایک چھتریہ تنظیم کی شکل میں کی جاسکتی ہے جس میں تاجروں، کارواں تاجروں اور دستکاروں کی اپنی گلڈ شامل تھیں۔ بنگال کا شاہی سند نامہ اول کلک (Kulika) (اہم دستکار) اور اول کائستھ (محرروں کی تنظیم کا صدر) کی باتیں کرتے ہیں۔ ناسک کی چوتھی صدی کے ایک کتبے میں کمہاروں کے ایک گلڈ (کلارک گلڈ) کا ذکر آیا ہے۔ کمار گپت اول (415-455 عیسوی) اور بندھو ورمن کی مندسور کتباتی تحریر دکھاتی ہے کہ ریشم بننے والوں کی ایک گلڈ نے کس طرح 38-437 عیسوی میں سوریہ دیوتا کا ایک شاندار مندر بنوایا اور پھر 74-473 عیسوی میں اس کی مرمت کرائی۔ اس گلڈ کے کچھ ممبروں نے مندسور آنے کے بعد اپنا ریشم کی بنائی کا کاروبار چھوڑ دیا اور تیر اندازی، نجوم اور قصہ گو جیسے پیشوں کو اپنا لیا جن کی حقیقت میں کچھ زیادہ معاشی اہمیت نہیں تھی۔ ریشم بننے والوں نے نہ صرف اپنی اصلی رہائش کی جگہ ترک کردی بلکہ اپنا کاروبار تک بدل دیا، یہ حقیقت دستکاروں کے ایک گروپ کی جغرافیائی اور کاروبار کی حرکت پذیری کا اشارہ دیتی ہے۔ پھر بھی پیشے کی تبدیلی کسی گلڈ کے لئے عام طور پر اتصال منظم شکل کے لئے خطرہ ہوتا تھا۔ اس عہد کے سمرتی گرنتھوں میں الگ ہی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ یہ گرنتھ گلڈ کے مکھیا کے علاوہ مدھیست (Madhyastha) اور کاریہ چنتک (karyachintaka) (ایگزیکٹو آفیسر) کی سفارش کرتے ہیں۔ اس سے فطری طور پر گلڈ کے کاموں کے وسیع دائرہ کا پتہ چلتا ہے۔ گلڈ کے قوانین کو ان گرنتھوں میں کچھ حد تک ریاست کے قوانین کے ہم وزن مانا گیا ہے۔ گلڈوں نے افراد سے دائمی جمع رقوم کا لینا اور سالانہ سود دینا جاری رکھا، عام طور پر ان کا استعمال خصوصی مذہبی اور عوام کی بھلائی کے منصوبوں کے لئے کیا جاتا تھا۔

7.5.4 تجارت اور تاجر

دستکاری اور صنعتوں کی توسیع گپت حکومت میں فرحت بخش تجارتی سرگرمیوں کا اشارہ ہوسکتی ہے۔ اس عہد کا ادب عوام کے درمیان مستقل سودوں کی بات کرتا ہے۔ امرکوش میں تجارتی سودوں کے معنی میں لفظ کریہ، وکریہ (Kraya- Vikraya) آیا ہے۔ امرکوش ایک بہت زیادہ امیر تاجر (سرشیٹھی) اور ایک

کارواں تاجر (سارتواہ) کے درمیان واضح فرق کرتا ہے۔ اس عہد کے کتبات میں بھی سر یشٹھی اور سارتواہ کا ذکر ملتا ہے۔ شمالی بنگال کے، پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کی تانبہ کی پلیٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ نگر سر یشٹھی اور سارتواہ ضلع پریشد کے ممتاز ممبر ہوتے تھے جو ان کے پیشے کی اہمیت کا مظہر ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ کالی داس بھی وپنی (Vipanis) (دکانوں) سے اچھی طرح متعارف تھے۔ دوسری دکانوں کے علاوہ ہمیں شراب کی دکانوں کے اور شراب پینے کے لئے وہاں لوگوں کے مجتمع ہونے کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ یہ دکانیں کبھی کبھی سڑک (اپن مارگ) (apanamarga) کے دونوں طرف ہوتی تھیں۔ چونکہ تاجر دیش کی دولت میں اضافہ کا ذریعہ ہوتے تھے۔ کمندک نے راجا کو تاجر طبقہ کی خصوصی طور سے حفاظت عطا کرنے کی صلاح دی ہے۔

طاقتور گپت ریاست کے ذریعہ عطا کردہ حفاظت نے آسانی سے افراد اور اشیاء کی آمد و رفت کو بڑھاوا دیا۔ اس بات کو چینی سیاح فاہیان نے بھی دوہرایا ہے جس نے تقریبا 399 عیسوی سے لے کر 414ء تک ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ تاجر اور مال، زمینی راستوں سے ہی نہیں بلکہ ندی کے راستوں سے بھی آتے جاتے تھے، خاص طور پر گنگا کی وسط وادی اور گنگا کے نچلے علاقوں میں۔ امرکوش میں مختلف درجہ کی کشتیوں کے لئے الگ الگ لفظ جیسے اڈپ (Udupa) (بیڑا) نو (Nau)، ترنی، درونی، وغیرہ (کشتیاں) اور پوت ونک (Pota vanik) (تجارتی جہاز)، ملتے ہیں۔ پوت کے ملازمین میں ناوک (Navika) (کشتی چلانے والا) نیامکا (Niyamaka) (کپتان) اور کرن دھار (Karandhara) (چپو یا پتوار چلانے والا) کا ذکر آیا ہے۔ مختلف قسم کے پانی کی دستکاریوں کے ندیوں کے راستے وسیع سرگرمیوں کے اشارے دیتے ہیں۔ (Vainyagupta) وینیہ گپت (507 عیسوی) کا گونائی گڑھ تانبہ کی پلیٹ نویوگ (Nauyoga) کا ذکر کرتی ہے جو کشتیوں کے ایک اسٹیشن کا مظہر ہے۔ بنگال کی پانچویں چھٹی صدی عیسوی کی تانبہ کی پلیٹوں میں ایسی ہی کشتیوں کے اسٹیشن کا کبھی کبھی ذکر آتا ہے۔ جیسے نو دنڈک، نو بندھک۔ بنگال جیسے ندیوں کے جال والے علاقے میں کشتیوں کے یہ اسٹیشن بین ملکی آنے جانے کی سہولتیں عطا کرتے ہوں گے۔ بنگال کا یہ دریائی علاقہ بنگال کی خلیج سے بھی جڑا تھا۔ واقعتاً دھیان دینے کی اہم بات یہ ہے کہ بند زمین، شمالی ہندوستان کو سمندر تک اکیلا راستہ بنگال کا ڈیلٹا ہی عطا کرتا ہے اس علاقہ کی سب سے زیادہ اچھی بندرگاہ تامر لپت (تملوک، ضلع میدنی پور، مغربی بنگال) تھی جو روپ نرائن (Rupanarayan) ندی کے داہنے کنارے پر واقع تھی۔ یہ گنگا کی وسط وادی اور برصغیر کے مشرقی شمالی علاقہ کے لئے اہم تجارتی راستہ تھا۔ یہ لمبا چوڑا سمندری علاقہ اور اس کے غیر ملکی اہمیت کی وجوہات میں ایک تھا۔ تملوک میں گپت عہد کی نشانیاں ٹیراکوٹا کی مورتیاں، ٹیراکوٹا کی تختیوں پر شہروں کے مناظر، سکے اور کم قیمتی موتی ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں فاہیان جب تامر لپت آیا تب وہ اپنے حشمت کی انتہاء پر تھا۔ جزیرہ نما ملائے کے ویلزلی علاقہ سے ایک کتبہ ملا ہے جسے چھٹی صدی عیسوی کا کہا جا سکتا ہے یہ بدھ گپت نام کے ایک مہاناوک (جہاز راں کپتان) کا حوالہ دیتا ہے جو رکت مرتک کا رہنے والا تھا، اس کی پہچان مرشدآباد، مغربی بنگال کے علاقہ رکت مرتک کی شکل میں کی جا سکتی ہے فطری طور سے یہ بات متعلق عہد میں جنوبی مشرقی ایشیاء کے ساتھ بنگال کے سمندری راستوں کے تعلق کو اور بحر ہند کے مغربی حصہ کے نیٹ ورک میں بنگال ساحل کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ ہندوستان کا مغربی ساحل، جس کی اہمیت رومن سلطنت میں تیسری صدی عیسوی کے وسط سے ہی ہندوستانی اور جنوب مشرقی ایشیائی مالوں کی طلب گرنے کی وجہ سے کچھ کم ہو گئی تھی۔ خلیج فارس کے اہم سمندری راستہ کی شکل میں ابھرنے اور قسطنطنیہ کے بازنطینی (Byzantine) بادشاہوں اور ایران کی ساسانی سلطنت کے اس میں دلچسپی دکھانے کی وجہ سے پھر سے آہستہ، آہستہ متحرک بن گیا۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ پر گپت راجاؤں کی فتح ہو سکتی ہے اگر خلیج فارس کے ساتھ تجارت کے فائدہ کے امکان رہے ہوں۔

7.5.5 سکہ سازی

گپت راجاؤں کو سونے اور چاندی کی بہتر سکّوں کی ڈھلائی کا سہرا باندھا جاتا ہے۔ گپت عہد کی سونے کے سکوں کے متعدد ذخیروں (Hoards) کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ ابتدائی گپت راجاؤں نے سابق کشان راجاؤں کے معیار وزن کا تتبع کیا۔ لیکن سکند گپت نے گپت سونے کے سکوں کے معیار وزن کو 124 گرین (Grains) سے بڑھا کر (حالانکہ مختلف سکّوں کے وزن میں ہلکا سا فرق ہوتا تھا) 144 گرین کر دیا (اسے سورن مان کہا جاتا تھا)۔ دھیان میں رہے کہ معیار وزن میں حالانکہ اضافہ ہوا لیکن پانچویں صدی عیسوی کے آخری چوتھائی سے ہی سکّوں میں سونے کا فیصد آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ سکوں کی یہ ملاوٹ سلطنت کی معاشی پریشانیوں کا اشارہ دیتی ہے۔ اس ملاوٹ میں مسلسل اضافہ کے باوجود گپت راجاؤں نے سونے کے سکوں کی ڈھلائی جاری رکھی اور 144 گرین کا مساوی معیار وزن بنائے رکھا۔ جہاں تک سونے کے ذرائع کا سوال ہے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بہار کی سونے کی کانوں سے کان کنی ممکن ہے

اسی عہد میں کی گئی۔ چاندی کے سکوں کی ڈھلائی چندر گپت (تقریباً 380-415) کے عہد میں شروع ہوئی جب اس نے چوتھی صدی عیسوی کے آخری حصہ میں ساکا چھترپوں سے ہندوستان کے مغربی حصہ کو جیتا۔ یہ سکے مغربی چھترپوں کے چاندی کے سکوں کی طرز پر ڈھالے گئے۔ چندر گپت دوم کے بیٹے اور نائب کمار گپت اول (تقریباً 415-455ء) نے چاندی کے سکوں کی ڈھلائی جاری رکھی۔ یہ سکے صرف مغربی صوبوں کے استعمال کے لئے ہی نہیں تھے، جیسا کہ اس کے والد کے زمانے میں تھا، بلکہ اس نے گپت سلطنت کے وسطی صوبوں میں بھی چاندی کے سکوں کا رواج شروع کیا۔ بعد کے گپت راجاؤں میں صرف سکند گپت (تقریباً 455-480ء) اور بدھ گپت (تقریباً 476-495ء) نے ہی چاندی کے سکوں کو جاری رکھا۔ گپت عہد میں سونے اور چاندی کے سکوں کے علاوہ تانبے کے سکے بھی رائج تھے حالانکہ ان کی تعداد بھی کم تھی۔ دلیل دی جاتی ہے کہ تانبہ کے سکوں کے کم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تانبہ سونے اور چاندی سے سستی دھات ہے اور اس لئے اسے جمع کر کے نہیں رکھا جاتا تھا۔ خیال رہے کہ فاہیان کے مطابق سونے کے سکوں کے علاوہ کوڑیوں کا استعمال بھی جاری تھا اس طرح اس عہد میں سکوں کے دستور کی تاریخ میں پیچیدگیوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

گپت عہد کے سونے اور چاندی کے سکے

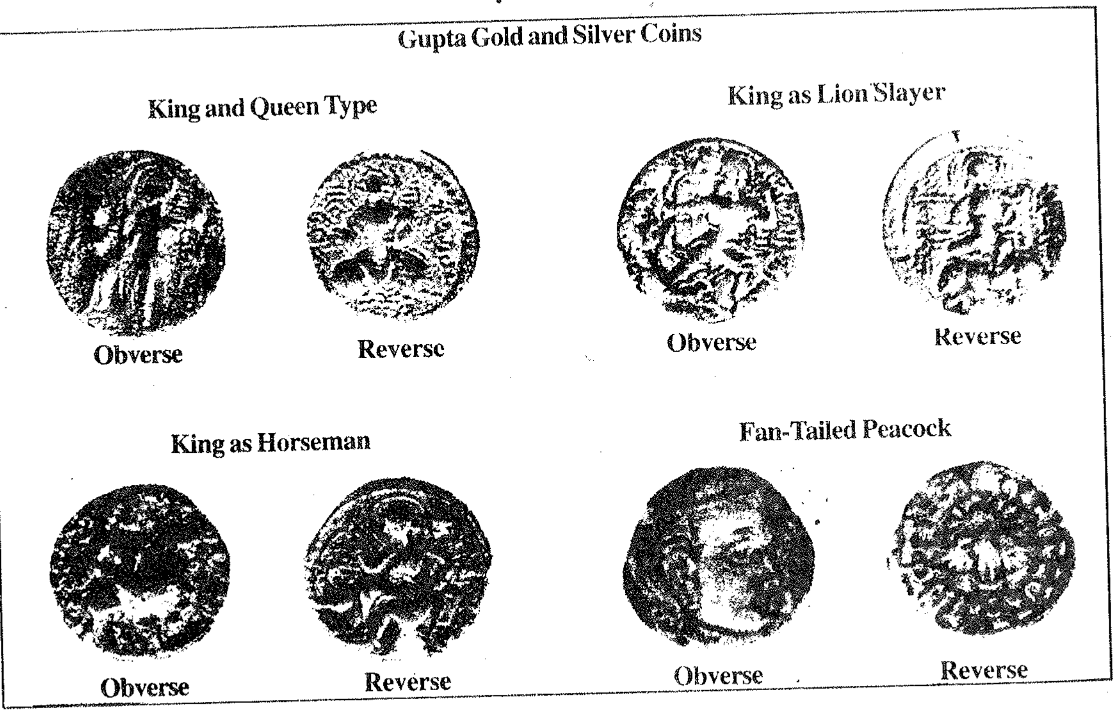

آر۔ بی۔ آئی۔ مانیٹری، میوزیم گیلری، اینشینٹ انڈیا کوائن ایج۔

7.5.6 محصول وسائل سے آمدنی

ایک وسیع وعریض سلطنت کو اقتدار میں بنائے رکھنے کیلئے فطری تھا کہ گپت راجاؤں نے متعدد قسم کے محصولوں کا سہارا لیا۔ زمینی لگان یعنی مالگذاری شاہی خزانہ کے لئے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ کیونکہ زراعت معاشیات کی اہم بنیاد تھی۔ بنیادی ٹیکس بھاگ یعنی پیداوار کا حصہ تھا۔ کوئی بھی گپت کتبہ راست بھاگ کے فیصد کی مانگ کا ذکر نہیں کرتا حالانکہ بیگ رام اور پہاڑ پور سے ملی تانبہ کی پلیٹ میں زمین کے عطیہ سے پیداوار کا چھٹے حصہ دینے کا ذکر ہے۔ اس کی بنیاد پر ہم یہ مان سکتے ہیں کہ یہ شرح اس عہد کی معیاری شرح تھی۔ راجا کے شد بھاگن (Sadbahagin) (چھٹے حصہ کا حاصل کردہ) کہے جانے سے اشارہ ملتا ہے کہ روایتی شرح بھی 1/6 تھی۔ لگان سے متعلق دو دیگر عام لفظ کرا اور اپریکر (Kara-uparikar) تھے۔ کرا اور اپریکر کے صحیح معنی کا تعین کر سکنا ممکن نہیں ہے۔ ڈی۔ سی۔ سرکار کی رائے میں یہ ممکن ہے بنیادی اور رعایتی ٹیکس تھے۔ تانبہ کی پلیٹوں پر لکھے شاہی حکم نامے ہمیں کچھ اور ٹیکسوں کے نام بتاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تھا اڈرنگ (Udranga) جسے اوڈرنگکا (Audrangika) کے ذریعہ وصول کیا جاتا تھا۔ اکثر اس کے معنی مقامی عوام پر لگا ٹیکس بتایا گیا۔

ہے۔ ہرنیہ (Hirana) ہماری کچھ کتبات میں درج ایک دوسرا لفظ ہے دھانیہ لگان سے متعلق ایک اور لفظ ہے جو ولبھی (Valabhi) کے میترک (Maitraka) خاندان کے دھارسین کے مالیہ تانبہ کی پلیٹ میں ملتا ہے۔ ہلیکا کار (Halikakara) لفظ سرونا تھ کی کھوہ تانبہ کی پلیٹ میں ملتا ہے۔ دھانیہ اور ہلیکا کار (Hlikkakara) ممکن ہے کسانوں پر لگنے والے ٹیکس تھے۔ ہرنیہ کچھ خاص فصلوں میں راجا کا حصہ تھا جس کی نقدی میں ادائیگی کی جاتی تھی۔ کتبات سے اشارہ ملتا ہے کہ معاشیات کے غیر زراعتی علاقوں کے مقابلے زراعتی ٹیکسوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ شلک یا چنگی اور ساحلی ٹیکس تجارتی علاقے پر لگنے والا ایک اہم ٹیکس تھا جس کا ذکر امرکوش میں آیا ہے۔ ٹیکسوں کی وصولی کرنے والے افسر شلکیکا (saulkika) کا ذکر متعدد کتبات میں ملتا ہے۔ بیگار یا وشٹی (Vishti) کا بڑھتا رواج اس عہد کے محصول نظام کی ایک خصوصیت تھی۔ واتسایان (Vatsayana) کی کام سوتر (Kamasutra) سے پتہ چلتا ہے کہ گاؤں کا زمین مالک، کسان کی بیوی کو کوئی مزدوری دیئے بغیر فصلوں کی گہائی یا اناج کے ذخیرہ کی بھرائی جیسی مختلف خدمات حاصل کرنے کے لئے مجبور کر سکتا تھا۔ تانبہ کی پلیٹوں پر لکھے لگان سے متعلق مختلف الفاظ اشارہ دیتے ہیں کہ عام عوام پر مالی بوجھ کافی زیادہ ہوتا تھا۔

گپت سلطنت کی معاشیات کے مندرجہ بالا سروے سے ابھرنے والی تصویر ایسی معاشیات کی ہے جس میں زمینی عطیہ کے اگرہارا (Agrahara) نظام نے اہم کردار نبھایا ہے۔ اس نے دیہی زراعتی بستیوں کی توسیع میں تعاون دیا۔ لیکن اس نے زندہ شہری سماج، معاشی ماحول میں رکاوٹ نہیں ڈالی واتسایان کی کام سوتر میں نگرک کا ذکر اس عہد کے محرک شہری زندگی کا اہم ثبوت ہے۔

7.6 خلاصہ

مندرجہ بالا سروے ان شاہی خاندانوں کے معاشی ڈھانچوں کی، علاقہ اور بدلتے وقت، دونوں ہی نقطہ نظر سے دلچسپ اختلافات اور یکسانیت کی بھی ایک تصویر پیش کرتا ہے۔ دستیاب ماخذوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ موریہ معاشیات اصل میں ریاست کے ذریعہ کنٹرول معاشیات تھی جس کی زراعتی علاقہ میں ایک مضبوط بنیاد تھی۔ لیکن کشانوں نے ایک الگ معاشی پالیسی اپنائی۔ ریاست کے کنٹرول میں کمی اور بڑھتی مہم جوئی (صنعت) ان کی حکومت کی خاصیت تھی۔ شہنشاہوں نے غیر زراعتی علاقہ سے اور خاص طور پر تجارت سے زبردست وسائل کو جمع کیا۔ انہوں نے پوری سلطنت میں ناپ تول کا مساوی معیار چلانے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ دوسری طرف ساتواہنوں نے معاشیات کے زراعت اور غیر زراعتی علاقوں پر کم و بیش برابر زور دیا۔ انہوں نے ایک خوشحال زراعتی حلقہ کی شکل میں اپنے علاقہ کی امکانی قوتوں پر عمل کیا اور ساتھ ہی، کشانوں کی ہی طرح، رومن سلطنت کے ساتھ لمبی دوری کی تجارت میں بھی دلچسپی لی۔ جہاں تک گپت راجاؤں کا تعلق ہے ان کی معاشیات کی بنیاد زراعت ہی تھی۔ انفرادی یا جماعتی عطیہ کے گذشتہ دستور کی جگہ اب اگرہار کے نئے دستور نے لے لی۔ لیکن معاشیات کے غیر زراعتی علاقہ کے زوال کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ سکوں کا رواج ان سبھی سلطنتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ موریہ عہد کے معمولی مہری سکوں کی جگہ کشان عہد میں سونے کے سکوں نے لے لی۔ لیکن ساتواہنوں کے پاس سونے کے سکے نہیں تھے۔ حکمرانوں کے ذریعہ سکوں کا استعمال تشہیر کے ذرائع کی شکل میں کیا جانے لگا۔ گپت حکمرانوں نے مختلف قسم کے سکوں کو جاری کرنے کا رواج قائم رکھا۔ پہلے سونے کے، پھر چاندی اور تانبہ کے بھی۔ ان چاروں شاہی خاندانوں کے عہد حکومت میں مختلف علاقوں میں شہری مرکزوں کی ترقی ہوئی۔

7.7 فرہنگ

اودان (Avadana)	بودھ روایت میں اودان وہ ادب ہے جو ماضی کے بودھوں کے کارنمایاں سے متعلق کہانیوں پر مشتمل ہو۔ اسے اپادان بھی کہا جاتا ہے۔
برہمی رسم الخط (Brahmi Script)	وہ رسم الخط جو ہندوستان میں تقریباً چوتھی، تیسری صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ اشوک کے زیادہ تر کتبات برہمی رسم الخط مبنی ہی ہیں۔
بازنطینی سلطنت (Byzantine Emprie)	اسے بعد یا مشرقی رومن سلطنت بھی کہتے ہیں۔ پہلے عیسائی راجا کانسٹینٹائن (Constantine) کے عہد حکومت (312 عیسوی) سے بازنطینی سلطنت کی ابتداء مانی جاتی

ہے۔ یہ سلطنت 1453 تک باقی رہی جب قسطنطنیہ (Constantinaople) آخر کار عثمانی ترکوں کے اختیار میں آ گیا۔

دوآب (Doab)

دوندیوں کے بیچ کا علاقہ۔

گپت تقویم (Gupta Era)

تقریباً 20-319 عیسوی میں چندر گپت اول کی تاج پوشی سے گنا جانے والا سن۔

ہندوستانی پارتھیائی (Indo-Parthians)

ایک شائی تھین (Scythian) قبیلہ۔ پہلے ہندوستانی۔ پارتھیائی حکمراں گونڈو فریز (Gondophares) تھا جس نے عیسوی سن 20 میں پارتھیائی اقتدار سے اپنے آپ کو آزاد اعلان کر کے جنوب۔مغربی افغانستان میں آزاد ریاست قائم کی۔ تاریخ میں وہ ہندوستانی پارتھیائی کہلائے۔

کنشک تقویم (Kanishka Era)

کنشک اول کے عہد حکومت کے اول سال سے گنا جانے والا سن۔ اس کی پہچان عام طور پر 78 عیسوی میں شروع ہونے والے ساکا سن سے کی جاتی ہے۔

قراقرم شاہراہ (Karakoram Highway)

قراقرم پہاڑی سلسلہ ہمالیہ پہاڑی سلسلہ کا مغربی کنارہ ہے۔ زمین پر سب سے زیادہ تعداد میں اونچی چوٹیاں یہیں ہیں اور قطبی علاقوں سے باہر سب سے زیادہ گلیشیئر بھی یہی ہیں۔ ان پہاڑوں پر سردی کی برف پگھلتی ہے تو اس عظیم سندھ ندی کو پانی حاصل ہوتا ہے جو تبت سے شروع ہونے کے بعد قراقرم کو کاٹتی ہے۔ قراقرم درّہ وسط ایشیاء میں یارقند جانے والے راستہ پر واقع ہے جو دنیا کے سب سے اونچے تجارت کے راستوں میں سے ایک ہے۔ یہ راستہ لداخ میں تولیم پتی لا Tulimpati La, سے اوپر نیوبرا وادی سے اور سیسر لا (Siser La) سے شروع ہو کر درّہ تک جاتا ہے۔ قراقرم شاہراہ سے گل جٹ (Gilgit)، چلیس (Chilis) وغیرہ علاقوں میں کافی قدیم باقیات ملے ہیں۔

خروشتی (Kharoshti)

خروشتی رسم الخط ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں میں رائج تھا۔ یہ دائیں سے بائیں طرف کو لکھا جاتا تھا۔ شہباز گڑھ مان (مردان سے 8 میل مشرق، سوابی) میں اشوک کے کتبے خروشتی میں ہی ہیں۔

سنگ کلاں تہذیب (Megalithic Cultre)

میگالتھ (سنگ کلاں) (یونانی میں میگا کے معنی بڑا/کلاں، لیتھو کے معنی پتھر) بڑے بڑے پتھروں سے بنی قبروں کو کہا جاتا تھا۔ یہ تہذیب جزیرہ نما ہندوستان میں خاص کر آندھرا پردیش، کرناٹک، تمل ناڈو اور کیرل میں پہلی ہزار سالہ صدی قبل مسیح میں اور عیسوی سن کی ابتدائی صدیوں میں پھلی پھولی۔

پرساستی (Prasasti)

راجاؤں یا دوسرے دیگر افراد کی تعریف میں لکھا گیا دستاویز یا شعری مجموعہ۔

گھماؤدار شکل کے ظروف (Rouletted Ware)

چاک پر بنے مٹی کے ایسے برتن جن کے بیچ میں گھماؤ کی وجہ سے معاون مرکزی گولے بنے ہوتے تھے۔ یہ ہندوستان کے مشرقی ساحل سے لگے مقامات سے بڑی تعداد میں پائے گئے ہیں۔

شائی تھو پارتھیائی (Scytho-Parthians)

پارتھیائی لوگوں نے سکندر عظیم کے جانشین سیلیوسڈس (Seleucids) کو ہرایا۔ وسطی مشرقی اور جنوب مغربی ایشیا کے زیادہ تر حصہ کو جیتا اور شاہراہ ریشم کو کنٹرول کیا۔ ایک وقت میں پارتھیائی حکمرانوں کا جدید ایران، عراق، ترکی، آرمینیا، جارجیا، آذربائجان، ترکمانستان، افغانستان، تاجکستان، پاکستان، سیریا، لبنان، جارڈن، فلسطین اور اسرائیل پر مشتمل علاقوں پر کنٹرول تھا۔

ساکا چھترپ (Saka Kshatrapa)

ایک ساکا شاہی خاندان جس کی دو شاخیں تھیں۔ ایک شاخ نے کچھ وقت تک متھرا سے حکومت کی اور دوسری نے چوتھی صدی عیسوی تک مغربی ہندوستان میں حکومت کی۔

ساسانی سلطنت (226-651A.D.) Sasani Empire

ساسانیوں نے تقریباً اکیمینڈس Achaeminids کے ذریعہ قائم سرحدوں کے اندر ایک سلطنت قائم کی اور اس کی راجدھانی تیسی فون (Ctesiphon) تھی۔ اس شاہی خاندان کی بنیاد بادشاہ اردشیر اول نے رکھی جو پارتھیائی راجا کا تابعدار رہ چکا تھا۔ شاپور اول (241-272ء) نے رومن فوج کو دو بار بری طرح شکست دی۔ بعد میں اس نے کشانوں پر بھی حملہ کیا اور ان کے ایک اہم مرکز پیشاور پر قبضہ کرلیا۔ آخر ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم (632-636ء) تھا۔ عربوں نے تیسی فون پر قبضہ کرلیا اور 651ء میں آخری ساسانی بادشاہ ایک بھگوڑے کی حیثیت سے مارا گیا۔

سیلیوکس اور سیلیوسڈ کی سلطنت Seleucus and Seleucid Empire

سیلیوکس اس سیلیوکسی سلطنت (312-65 قبل مسیح) کا بانی تھا جس نے 312 سے 280 قبل مسیح تک وسط ایشیا اور سیریا پر حکومت کی۔ سکندر اعظم کے مشرقی مہموں میں سیلیوکس اس کے ساتھ تھا۔ سکندر کی وفات کے بعد اس نے اپنے حصہ کے طور پر بے بی لون صوبے (جدید افغانستان، ایران، عراق، سیریا، لبنان، اور ترکی کے کچھ حصوں، آرمینیا، ترکمانستان ازبیکستان اور تاجکستان) حاصل کئے۔ 64 قبل مسیح میں رومن سپہ سالار پومپی عظیم نے سیلیوکسی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔

اسٹیڈیا (Stadia)

لمبائی ناپنے کی قدیم یونانی اکائی جو 607 سے 738 فٹ تک لمبی ہوتی تھی۔

سلائی تکنیک پر مشتمل روایتی ہندوستانی آمدورفت (Stiched Variety of Traditional Indian Transport)

ایسے جہاز یا ناؤ جن میں کیلوں کی جگہ تختوں کو جوڑنے کے لئے سلائی کی تکنیک کا استعمال کیا جاتا تھا۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU * HYDERABAD *
Accn No. MA-035
Date 03.08.2015

7.8 مشقیں

(1) جونا گڑھ پر ساتی سے حاصل اطلاعات کا تنقیدی تجزیہ کیجئے۔ اس عہد کی زراعتی معاشیات کو سمجھنے کے لئے یہ کہاں تک مفید ہے؟

(2) رومن دئی (Rumindei) کے کتبے سے دستیاب اطلاعات کی بنیاد پر موریہ عہد میں زراعت پر مبنی ٹیکسوں کی نوعیت کا تجزیہ کیجئے؟

(3) یونانی رومن اور چینی مصنفوں کی تحریروں کی بنیاد پر 300 ق م سے 600ء تک کے بیچ ہندوستان میں تجارتی سرگرمیوں کا تجزیہ کیجئے؟

(4) تجارتی سرگرمیوں سے شہر کاری کس طرح سے متعلق تھی؟ 300 ق م سے 600 عیسوی کے درمیان شہروں کے عروج و ترقی کے تناظر میں اس سوال پر بحث کیجئے۔

(5) سکّوں کے مطالعہ کی بنیاد پر سلطنتوں کی معاشیات کا تجزیہ کیجئے؟

7.9 معاون کتب

آلچن، ایف۔ آر۔ (1995)، دی آرکیالوجی آف ارلی ہسٹارک ساؤتھ ایشیاء، دی ایمرجنس آف سٹیز اینڈ اسٹیٹس، کمبرج۔

بیگلے، وملا اور ڈی پوما (1992)، روم اینڈ انڈیا۔ دی اینشینٹ سی ٹریڈ، دہلی۔

چکرورتی، رنبیر (مرتبہ) (2001)، ٹریڈ ان ارلی انڈیا، نئی دہلی۔

چکرورتی، رنبیر (2002)، ٹریڈ اینڈ ٹریڈرس ان ارلی انڈین سوسائٹی، نئی دہلی۔

چٹوپادھائے، بی، ڈی۔ (مرتبہ) (1987)، ایسیز ان اینشینٹ انڈین اکنامک ہسٹری، نئی دہلی۔

چٹوپادھائے، بی۔ ڈی۔ (1995)، اسٹیٹ اینڈ اکنامی ان نارتھ انڈیا: فورتھ سینچری ٹو ٹویلفتھ سینچری، ان رومیلا تھاپر (ایڈیشن)، اینشینٹ پرسپیکٹوس آف ارلی انڈین ہسٹری، بمبئی صفحہ 46-308 دیکھیں۔

داس، ڈی۔ آر۔ (1969)، اکنامک ہسٹری آف دی دکن، دہلی۔

گھوش، اے۔ (1973)، دی سٹی ان ارلی ہسٹاریکل انڈیا، شملہ۔

گھوش، اے۔ (مرتبہ) (1989)، این انسائیکلوپیڈیا آف انڈین آرکیالوجی، دو جلدوں میں، نئی دہلی۔

گھوشال، یو۔ این۔ (1972)، کنٹری بیوشنس ٹو دی ہسٹری آف ہندو ریونیو سسٹم، کلکتہ، دوسرا ایڈیشن۔

جھا، ڈی۔این۔(1967)، ریونیو سسٹم ان دی پوسٹ موریہ اینڈ گپت ٹائمس، کلکتہ۔

کوسامبی، ڈی۔ڈی۔(1956)، این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری، بمبئی۔

میتی، ایس۔کے۔(1957)، اکنامک لائف آف نارتھرن انڈیا ان دی گپت پیریڈ(300-550AD)، کلکتہ۔

موتی چندر،(1977)، ٹریڈ اینڈ ٹریڈ روٹس ان اینشینٹ انڈیا، نئی دہلی۔

مکھرجی، بی۔این۔(2000)، دی کریکٹر آف دی موریا ایمپائر، کلکتہ۔

مکھرجی، بی۔این۔(2002) دی اکنامک فیکٹرس ان کشان ہسٹری، کلکتہ، دوسرا ایڈیشن۔

شرما، آر۔ایس۔(1965)، انڈین فیوڈل ازم، کلکتہ۔

شرما، آر۔ایس۔(1983)، پرسپیکٹو ان دی سوشل اینڈ اکنامک ہسٹری آف ارلی انڈیا، نئی دہلی۔

رے، ایچ۔پی۔(1986)، مونیسٹری اینڈ گلڈ، کامرس انڈر دی ساتواہناز، نئی دہلی۔

تھاپر، روملا(1987)، دی موریاز، ری وزیٹیڈ، کلکتہ۔

تھاپر، روملا(مرتبہ)(1995)، ریسینٹ پرسپیکٹوس آف ارلی انڈین ہسٹری، بمبئی۔

تھاپر، روملا(2002)، ارلی انڈیا فرام دی اوریجنس ٹو اے ڈی 1300، پینگوئن۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY Hyderabad

MHI-05

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد

ہندوستان کی معاشی تاریخ

History of Indian Economy

MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU
MA-026
03.08.2015
HYDERABAD

بلاک

3

ابتدائی عہد وسطی کی معیشت اور اس کا تسلسل

EARLY MEDIEVAL ECONOMY AND ITS CONTINUITIES

اکائی 10

ہندوستانی تاریخ میں جاگیردارانہ نظام پر بحث ومباحثہ

The Feudalism Debate in Indian History 5

اکائی 11

زرعی اور دستکاری پیداوار کی تنظیم: شمالی ہند 550 عیسوی سے 1300 عیسوی تک

Organisation of Agricultural and Craft Production: North India, c. AD 550 - c. AD 1300 15

اکائی 12

درجہ بندی کی نوعیت اور ابتدائی عہد وسطی میں شمالی ہند کی علاقائی تصویر، 550 عیسوی سے 1300 عیسوی تک

Nature of Stratification and Regional Profiles of Agrarian Society in Early Medieval North India, c. AD 550 - c. AD 1300 32

اکائی 13

زرعی اور دستکاری پیداوار کی تنظیم، زرعی معاشرہ کی علاقائی تصویر، درجہ بندی کی نوعیت: جنوبی ہند

Organisation of Agricultural and Crafts Production, Regional Profiles of Agrarian Society, Nature of Stratification: South India 47

اکائی 14

تجارت، تجارت کا جال اور شہرکاری: شمالی ہند، 300 عیسوی سے 1300 عیسوی تک

Trade, Trading Networks and Urbanisation: North India, c. AD 300 - c. AD 1300 74

اکائی 15

مبادلہ کے نیٹ ورک، تجارتی تنظیمیں اور شہرکاری: جنوبی ہند

Exchange Networks, Merchant Organisation and Urbanisation: South India 101

MEDIA CENTRE MANUU LIBRARY

REFERENCE ONLY

مجلس ماہرین

پروفیسر بی۔ ڈی۔ چٹوپادھیائے
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

پروفیسر آر۔ چمپک لکشمی
سابق پروفیسر تاریخ
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

پروفیسر ایم۔ جی۔ ایس۔ نارائنن
سابق پروفیسر تاریخ
کالی کٹ یونیورسٹی، کالی کٹ

پروفیسر ہربنس مکھیا
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔

پروفیسر دلباغ سنگھ
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

پروفیسر کے۔ کے۔ ترویدی
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

پروفیسر نیلادری بھٹاچاریہ
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

پروفیسر دویجیندر ترپاٹھی
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ
احمد آباد

پروفیسر کپل کمار
ڈائریکٹر
اسکول آف سوشل سائنسز، اگنو، نئی دہلی

پروفیسر اے۔ آر۔ خان
فیکلٹی آف ہسٹری
اسکول آف سوشل سائنسز
اگنو، نئی دہلی

ڈاکٹر آبھا سنگھ (کنوینر)
اسکول آف سوشل سائنسز
فیکلٹی آف ہسٹری، اگنو، نئی دہلی

پروگرام کوآرڈینیٹر : پروفیسر اے۔ آر۔ خاں

کورس کوآرڈینیٹر : ڈاکٹر آبھا سنگھ

بلاک ایڈیٹر : پروفیسر بی۔ ڈی۔ چٹوپادھیائے

بلاک پری پیریشن ٹیم

اکائی نمبر		ریسورس پرسن	اگنو فیکلٹی
اکائی	10	پروفیسر ہربنس مکھیا سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔	ڈاکٹر آبھا سنگھ (فارمیٹ اینڈ کنٹینٹ ایڈیٹنگ)
اکائی اور	11	ڈاکٹر ویشوا موہن جھا آتما رام، سناتن دھرم کالج	
اکائی	12	دہلی یونیورسٹی، دہلی	
اکائی	13	پروفیسر آر۔ چمپا کالکشمی صابق پروفیسر آف ہسٹری، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز جے، این، یونی دہلی	
اکائی	14	پروفیسر رنبیر چکرورتی سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیزیز جے، این، یونی دہلی	
اکائی	15	پروفیسر آر۔ چمپا کالکشمی سابق پروفیسر آف ہسٹری، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جے، این، یونی دہلی	

میٹریل پروڈکشن
جناب جتیندر سیٹھی
جناب منجیت سنگھ
پرتل وسشٹ (مسودہ تیاری)

سیکریٹیریل اسسٹینس
رشمی سر پال صاحبہ
سنیتا صاحبہ
جناب سنیل پٹوال

ستمبر-2004

(C) اندرا گاندھی نیشنل یونیورسٹی ۲۰۰۴

IS BN 81 266-1402-1
زیر اہتمام: ٹرانسلیشن ڈویژن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
طبع اول: مئی 2005ء

کاپی رائٹ (c) اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، 2003، طباعت ثانی

مزید معلومات کے لیے ڈائرکٹر فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032 سے ربط پیدا کریں۔

مترجم : شبنم ادریس
مدیر : ڈاکٹر محمد تعظیم
کمپوزنگ : تہامی آرٹ اینڈ کرافٹس

RCL TECHNOLOGIES LIMITED, HYDERABAD 2014

ابتدائی عہد وسطی کی معیشت اور اس کا تسلسل

معیشت کی شکل جو پہلی ہزار سالہ صدی قبل مسیح اور تیسری صدی عیسوی کے درمیان ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پروان چڑھی، کو اب بہتر سمجھا جا سکتا ہے اس معیشت کی اہم خصوصیات زراعت پر منحصر گاؤں جہاں ملک کی آبادی کی اکثریت رہتی ہے، قصبوں اور شہروں کی بامعنی موجودگی جو زراعت سے کچھ زیادہ سرگرمیوں کو انجام دیتے تھے۔ گاؤں اور شہروں میں دستکاری کا وسیع سلسلہ اور تجارتی سرگرمیوں کا ایک وسیع نیٹ ورک جس کے ذریعے سے تجارتی سرگرمیاں انجام دی جا سکتی تھیں۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ڈھالے گئے سکّے اس بات کا بہترین ثبوت ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ معمول جس پر انسانی سماج اپنی بقاء کے لئے صدیوں سے منحصر رہا اس کو موقوف کر دیا گیا۔ ابھی بھی شکار کے ذریعے غذا اکھٹی کرنے والے سماج موجود تھے، قبائلی سماج بھی تھے، جو آسان زراعت اور جنگلات سے اپنے وسائل اکھٹا کرتے تھے۔ تمام ساحلی علاقوں میں مچھواروں کے سماج بھی تھے یہاں تک کے شاہراہوں پر لٹیرے بھی ہوتے تھے۔ جن کا کام مال کو لوٹنا تھا۔ آسان معاشی معمولات کے علاوہ پیچیدہ معاشی نظاموں کے واضح شکل اختیار کر لینے کا مطلب تھا کہ انسانی سماج غیر مساوی گروہوں میں واضح طور پر تقسیم تھا۔ کچھ کے پاس وسائل کی بہتات تھی، اور دیگر، اور اکثریت، کے پاس زندگی کی بقاء کے لئے بہت تھوڑا سا تھا۔ ریاست کے ظہور کے ساتھ جس کا سربراہ راجہ یا شہنشاہ، مختلف سطح کے افسران یا عہدیداران، پروہت اور برہمن تھے۔ وہ عام طور پر اشراف طبقے سے متعلق تھے، اور یہ سماج کے لئے وسائل کے پیداواری کاموں میں مشغول نہیں تھے۔ مالگزاری نظام کے ذریعے یہ یقینی کیا گیا کہ ان وسائل کا ایک بڑا حصّہ جو پیدا کیا جاتا تھا ان کے پاس پہنچے۔ وہ جو پیدا کرتے تھے یا مختلف اشیاء کا لین دین کرتے تھے، خود مختلف گروہوں سے وابستہ تھے۔ سب سے نچلی سطح پر داس یا غلام، کرم کار یا مزدور جو تھوڑی سی اُجرت پر کام کرتے تھے چنڈال یا اچھوت، شودر یا خادم یا چھوٹے کاشتکار، جبکہ بڑے کاشتکار (بشمول برہمن کاشتکار) اور بڑے تاجر (شریشٹھی) زیادہ دولت مند تھے، کاشتکاروں کی اکثریت، لوہار، کمہار، چرم کار، چاہے وہ شہروں میں تھے یا گاؤں میں بھی غریب تھے۔

کیا معیشت کے اس نمونے میں جس میں بہت سارے معمولات اور بہت سارے معاشی طور پر مختلف انسانی گروہ ہم آہنگ تھے، 300 عیسوی کے بعد اس میں کوئی بڑی تبدیلی آئی؟ ابتدائی ہندوستان کی معاشی تاریخ کے طلباء کے لئے اس سوال کا جواب بہت اہم ہے۔ کیونکہ کچھ مشہور مورخوں کا ماننا ہے کہ 300 عیسوی کے بعد ہندوستان کی معیشت یقینی طور پر بڑی تبدیلیوں سے گزری۔ اور واقعتاً اس سوال کے جواب نے ایک بحث کی شکل لے لی۔ اس بلاک کی اگلی کچھ اکائیوں میں آپ جو مطالعہ کرنے جا رہے ہیں اندازاً 1300-300 عیسوی کا عہد اس مباحثے سے شروع ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو لگ بھگ 300 عیسوی کے بعد معیشت کے نمونے میں تیز تبدیلی کی وکالت کرتے ہیں ان کی دلیل ہے کہ زمین، جو سماج کے لئے وسائل اور ریاست کے لئے دولت پیدا کرنے کے لئے بنیادی ضرورت تھی۔ مختلف اسباب کی بنا پر سماج میں انسانی گروہوں کے درمیان سختی سے مختلف رشتوں کی بنیاد بن گئی۔ زرعی تعلقات کے اس نئے نمونے کو ''ہندوستانی جاگیریت'' کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ بہت سے مورخوں جیسے ڈی ڈی کوسامبی، ''ہندوستانی جاگیریت'' کا استعمال نہیں کرتے۔ اس جاگیریت کی بہت سی خصوصیات، یہ گاؤں پر منحصر تھی، اس کا کردار مقامی تھا، قصبوں اور شہروں کو جوڑتے ہوئے وسیع تجارتی نیٹ ورک اور دھات کی کرنسی کا وسیع استعمال کا اس میں فقدان تھا۔ چونکہ اب مقامی زمینداروں اور زمین مالک مذہبی اداروں کا ہی زرعی معیشت پر کنٹرول تھا، اس سے ریاست کی طاقت کمزور اور ان عناصر کے تعاون پر منحصر ہوگئی تھی۔

بہت سے مورخ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی عہد وسطی کی معیشت کئی طرح سے ابتدائی تاریخی عہد سے مختلف تھی۔ جاگیریت کے تصور کی مورخوں کے ذریعے جس طرح تشریح کی گئی ہے اس کی وجہ سے وہ اس تصور کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ یہ محض تاریخی شواہد کی اہمیت سے جڑا سوال نہیں ہے زمین چونکہ بھی ابتدائی زرعی سماجوں کی دولت کا اہم ماخذ تھی۔ یہ سوال صرف شہری، سکّے کے طور پر چلنے والی معیشت کا دیہی معیشت میں منتقلی سے ہی متعلق نہیں تھا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ زمین پر کنٹرول سے حقیقت میں آپسی رشتوں میں کوئی بنیادی تبدیلی آئی؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس عہد میں زراعی میدان میں واضح توسیع ہوئی۔

REFERENCE ONLY

مصنوعی سینچائی زراعت کے ضمن میں خصوصی طور سے اہم نظر آتی ہے، اور ابتدائی عہد وسطیٰ میں مختلف طرح کے مبادلہ نیٹ ورک اُبھرے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ یہ سبھی تبدیلیاں جو اس وقت کی معیشت کی اہم خصوصیات، مختلف مقامی، ماتحت علاقائی اور علاقائی سطحوں پر ہو رہی اہم تبدیلیوں کا نتیجہ تھیں۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کی معیشت پر ہوئے مطالعات میں واضح طور سے علاقائی معیشت کی سست منتقلی پر توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اسے معیشت کی تبدیلی کی اہم بنیاد مانا گیا ہے۔ آنے والی اکائیوں میں زیادہ اہمیت ''ہندوستانی جاگیریت'' سے متعلق مباحثے پر دی گئی ہے، اور آپ سمجھ سکیں گے کہ کسی معیشت کو ''جاگیری'' یا غیر جاگیری کے طور پر تشریح کرنا کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے، یہ اکائیاں آپ کے سامنے ایک ایسا امتزاج پیش کرنے کے لئے لکھی گئیں ہیں جو دکھائیں گی کہ ابتدائی عہد وسطیٰ کی معیشت سے متعلق ماخذی مواد وافر مقدار میں موجود ہے، اور معاشی سرگرمی پر مشتمل مختلف میدانوں کا مکمل نمونہ کیا ہے۔ ان اکائیوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ کو مختلف علاقوں کی معیشتوں کے امتیازی وصف کا ادراک ہو جائے۔

INSTITUTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD
Acc. No MA-0267
Date 03.08.2015
INSTITUTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad-32

اکائی 10 ہندوستانی تاریخ میں جاگیردارانہ نظام پر بحث ومباحثہ

ساخت

10.1 تعارف

10.2 ہندوستانی جاگیرادارنہ نظام: مختلف زاویۂ نگاہ

10.3 کیا ہندوستان میں جاگیرداری تھی؟

10.4 جاگیرداری نظام پر دوبارہ غور وخوض

10.5 جاگیرداری، تجارت اور شہریت

10.6 مشکلات

10.7 خلاصہ

10.8 فرہنگ

10.9 مشقیں

10.10 معاون کتب

10.1 تعارف

جاگیرداری کا تصور ایک یوروپی تصور ہے۔ بے شک یوروپ میں بھی اس کی تاریخ نئی ہے حد سے حد ستر ہویں صدی سے۔ حالانکہ جاگیرداری نظام اس سے بہت پہلے دم توڑ چکا تھا۔ یہاں سے یہ تصور، اس کے علاوہ بہت سے تصورات دنیا کے دوسرے حصہ میں پہنچے، یوروپ پھیل رہے تھے۔ اغلب گمان یہی ہے کہ جس طرح یوروپین تاریخ نویسی میں اس تصور میں تنوع اور بدلاؤ آیا۔ اس کی شکل بھی دنیا کے دوسرے حصہ میں بدلتی گئی۔

شروع شروع میں یوروپ میں جاگیرداری کو امراء اور منصبدار کے روایتی قانون کے دائرے میں رکھنے سے، سمجھا جاسکتا۔ اس کو ایک تنگ نظر سخت اور دھیمی رفتار نظام کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے اس نظریہ سے بدلاؤ آیا جس میں جاگیرداری نظام میں حکومت داخل ہوئی جس میں طاقت کو عدم مرکزیت حاصل تھی۔ جو جاگیردار آقاؤں کے ہاتھ میں تھی جہاں ایک معمولی حاکم ایک مقتدر کی حیثیت رکھتا تھا۔

یہ عرصہ کوئی لمبا عرصہ نہیں تھا جس میں جاگیرداری تصور امراء اور منصب دار کی حد تک محدود تھا۔ دھیرے دھیرے مطالعہ کا دوسرا پہلو بھی اس میں شامل ہوگیا۔ مارکسیو نے خاص طور سے اس میں پیداوار کے سوال کی طرف توجہ مبذول کرائی یعنی زمین اور مزدور کے بیچ رشتہ، امراء اور منصب دار رشتہ سے یہ تصور، امیر اور کسان کے رشتہ میں منتقل ہوگیا۔ معاشیات میں ٹکنالوجی، تجارت اور پیشہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

اینالس (Annales) اسکول کی تاریخ نویسی نے خاندان کی تاریخ، مرد عورت کے رشتہ، تصورات اور ذہنیت کی تاریخ کے دروازے کھول دئے۔

10.2 ہندوستانی جاگیرداری نظام: مختلف زاویہ نگاہ

ہندوستان کے تعلق سے جاگیرداری نظام کو سب سے پہلے کرنل جیمس ٹوڈ نے اجاگر کیا جنہوں نے انیسویں صدی کے شروعات میں راجستھان کی تاریخ کے وقائع نگار۔ کے مشہور مدون ہیں۔ ٹوڈ کی نظر میں جس طرح ان کے وقت میں یوروپ کے بیشتر یوروپین مورخین کی نظر میں امراء اور منصب دار کے تعلقات ہی

NATIONAL MEDIA CENTRE • MANUU • MAC LIBRARY • Hyderabad

جاگیرداری کی بنیاد ہیں۔عہد وسطی کے یوروپ میں امراء اپنے منصب دار کی ضروریات اوران کی حفاظت پر نظر رکھتی تھی اوراس کے بدلہ میں منصب دار اپنے امراء کی فوجی اوردوسری خدمات انجام دیتا تھا۔ منصب دارکوامیر سے باندھے رکھنے میں وفاداری کواہمیت حاصل تھی۔ ٹوڈ کواپنے زمانے میں راجستھان میں یہی چیز اوریہی طریقہ کارائج ملا۔

جاگیرداری اصلاح کاہندوستانی تاریخ کی کتابوں میں کسی نہ کسی انداز سے ذکرضرور مل جاتا ہے۔بسااوقات اس کامفہوم غیرواضح اورگنجلک دکھائی پڑتا ہے۔ یہ دین ہے 1950 اور 1960 کے درمیانی عرصہ میں ہندوستان میں تاریخ نویسی پر پڑھتے ہوئے مارکسی اثرورسوخ کی کہ یہ لفظ اپنے پرانے معنی امیراور منصب دار تعلق سے آزاد ہوسکا اوراس کوایک معاشی معنی پہنایا گیا۔یایوں کہیے کہ ہندوستانی طبقاتی ساخت کے وجود پذیر ہونے کے تعلق سے سمجھا گیا۔ ہندوستانی جاگیرداری نظام کی تشکیل میں ایک بڑا تناقص دکھائی پڑتا ہےاوروہ ہےخود مارکسی مورخین کا مارکس کے خیال سے اختلاف کرنا۔جس میں انہوں نے ماقبل استعماری ہندوستانی تاریخ کو Asiatic mode of production کے زمرے میں رکھا ہے۔گوکہ مارکس خوداس زمرے موجد ہے۔پھربھی جن وجوہات کی بنیاد پراس خیال کوتقویت ملی وہ اٹھارہویں اورانیسویں صدی کے مغربی مفکرین کے درمیان عام طور پر پایا جاتا تھا۔تاریخ کے عام رجحان میں مارکس کو Asiatic mode of production ایک استثناء کے طور پردکھائی دیتا ہے طبقاتی جدوجہد کے راستے سے ایشیا کے بارے میں وہ خوداوردیگر بہت سے مفکرین یہ سمجھتے تھے کہ وہاں کوئی درجہ بندی نہیں تھی۔کیونکہ تمام جائداد یا تو راجہ کی تھی یاپورے گروہ کی اس لئے وہاں کوئی طبقاتی کشمکش نہیں تھی اورنہ ہی اس میں وقت کے لحاظ سے کوئی بدلاؤ آیا۔اس کے اس خیال کے حامی مشہور مفکرین بیرن ڈی مونٹیسکو۔جیمس مل،فریڈرک ہیگل وغیرہ ہیں۔ان لوگوں کے مطابق اصل تحریک استعماری قوت کے وجود میں آنے کے بعد سے آئی جس سے بدلاؤ کا تصور یوروپ سے مشرق میں آیا۔ہندوستانی مارکسی مورخین 1950 اور 1960 کے عرصہ میں اس بات کو ماننے کے لئے رضامند نہیں کہ انسانوں کا اتنا بڑا طبقہ جیسے کہ ہندوستان بلکہ پورا ایشیاء بغیر کسی بدلاؤ کے اتنے لمبے عرصہ تک رہ گیا ہو۔انہوں نے Asiatic mode of production کے تصور پرغیراطمینانی ظاہر کی ہےاس کے بدلے ان میں سے بعض نے جاگیرداری نظام کواپنایا اورہندوستان کواس نظریہ سے دیکھا۔عرفان حبیب جیسے مارکسی مورخ نے نہ صرف ہندوستانی جاگیرداری سے دوری بنائے رکھی ہے بلکہ Asiatic mode of production بھی کھل کرتنقید کی ہے۔

ڈی ڈی کوسامبی نے جاگیرداری نظام کومعاشرتی ومعاشیاتی تاریخ کے تعلق سے خاص مقام دیا ہے۔وہ جاگیرداری نظام کی ترقی کو ہندوستان کی تاریخ میں دوہرے طریقے سے دیکھتے ہیں اپنی مشہور کتاب ''این انٹروڈکشن ٹودی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری میں اوپر سے اور نیچے سے دیکھتے ہیں۔جو پہلی بار 1956 میں چھپی۔اوپر سے جاگیرداری ساخت جوریاست کے ذریعہ وجود میں آئی جس میں زمین اوراختیارات برہمن اورافسر شاہی کودئے گئے۔اورنیچے سے بےشمار انفرادی طور پراورچھوٹے گروہ گاؤں کی سطح سے قوت پاکراٹھے یہاں تک زمین داراور بادشاہ کے منصب داربن گئے۔

کوسامبی نے اپنے مخصوص انداز میں جاگیرداری نظام کے تصور کوایک فارمولہ کے طور پرپیش کیا ہے چہ جائیکہ تفصیلی انداز سے علم وہنر کی بنیاد پر۔اس بڑے کام کوآر۔ایس۔شرمانے اپنی کتاب انڈین فیوڈلزم (1965) میں اٹھایا۔آر،ایس،شرمانے کوسامبی کے فارمولہ فیوڈلزم اوپر سے نیچے سے نہیں اپنایا بلکہ وہ جاگیرداری نظام کے عروج کوہندوستانی تاریخ میں بالکلیہ ریاست کے عمل کانتیجہ یعنی اوپر سے دیکھتے ہیں۔اوراب آخرکارانہوں نے اپنی توجہ دوسری وجوہات کی طرف مبذول کی ہے۔

آر،ایس،شرمانے جاگیردارانہ نظام کے عروج وزوال کے ماڈل کویوروپ میں 1920 اور 1930 میں بیلجیئن کے مورخ ہیزی پائرین کے ذریعہ بڑی تفصیل سے تیار کئے گئے ماڈل سے ہمسری کرنے کی کوشش کی ہے۔پائرین گھسے پٹے یوروپین جاگیرداری نظام کوبطور زمین کے مالک اورمنصب دار کے تعلق سے دیکھنے کے بجائے اس کوایک ایسے نظام کے طور پردیکھتے ہیں جوبہت زیادہ وسعت لئے ہوئے ہےاورسماج میں پیدا ہونے والے گہرے نتائج سے جڑا ہوا ہے۔انہوں نے عظیم تجارت یعنی یوروپ کی طویل دوری کی تجارت جوپورے مجیرۂ روم میں پھیلی ہوئی تھی جس سے یوروپین معاشیات،معیشت اورتہذیب وثقافت قرون سابقہ میں تب تک پھلتی پھولتی رہی تاآنکہ ساتویں صدی میں یوروپ پرعرب حملہ سے سب کچھ درہم برہم ہوگیا۔تجارت میں گاؤں

سے معاشیات کو دیہات کاری (Ruralisation) کی طرف موڑ دیا جس نے اس کے رخ کو نیچے کی طرف موڑ دیا بجائے اوپر کی طرف اٹھنے کے۔ اس کا نتیجہ جیسا کہ پائرین کہتا ہے The closed estate economy کی شکل میں ہوا۔ کلوزڈ اسٹیٹ کا مطلب ہوتا ہے زمین کی یونٹ جس پر امیر کا قبضہ ہے (اوسطاً 10,000 ایکڑ) اور کاشت کیا جاتا ہے کسان کے ذریعہ جہاں تجارت اپنی اہمیت کھو چکی تھی اور ہر وہ چیز جس کی وہاں کے باشندگان کو ضرورت ہوتی ہے وہ سب اسی میں پیدا کی جاتی ہے۔ یہ جائداد دوسرے لفظوں میں معاشی طور پر خودکفیل اکائی بن گئی ہے۔ 11ویں صدی میں یہ صورتحال ایک بار پھر بدلتی ہے جب صلیبی جنگ کی وجہ سے عرب پھر واپس مشرق قریب پہنچ گئے۔ اس سے تجارت اور شہروں کا پھر سے احیاء ہوا اور جاگیرداری نظام کا زوال ہوا۔ چنانچہ پائرین، تجارت اور شہریت ایک طرف اور جاگیرداری دوسری طرف کے درمیان نہ ختم ہونے والا تضاد کی طرف انگلی اٹھاتا ہے۔

آر۔ایس۔ شرما نے اسی موڈل کو من وعن اپنایا ہے یہاں تک کہ اس کی اصطلاحات تک کو اپنا لیا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے مناظر میں وہ ہندوستان کی باہر کی دنیا سے تجارت کے زوال کو گپتاؤں کے زوال کے بعد سے دیکھ رہے ہیں۔ شہرکاری بھی اس کی وجہ سے متاثر ہوئی جو معیشت کے دیہاتی پن کی وجہ بنی اور تب ایک ایسی حالت پیدا ہوگئی جب معاشی ذرائع کم نہیں ہوئے بلکہ کرنسی کم پڑ گئی۔ چونکہ سکے نہیں تھے تو ریاست نے زمین کو اپنے ملازمین کو اور عطیہ پانے والوں جیسے کہ برہمن کو قیمت چکانے کے طور پر استعمال کیا۔ زمین دینے کے ساتھ ساتھ ریاست کے زیادہ سے زیادہ اختیارات کھیتی کرنے والے کسانوں کے اس نئے طبقہ کو یعنی 'بچولیوں' کو دئے۔ کسانوں کے اوپر بچولیوں کے ذریعہ بڑھتے ہوئے دباؤ کے چلتے ان کو غلاموں (Serf) کے مقام تک پہنچا دیا جو عہد وسطی کے یوروپ میں جانے جاتے انٹرمیجری (بچولیا) کلاس کے عروج کی وجہ، ریاست کے ذریعہ ان کو گرانٹ دینے کو آر۔ایس۔ شرما ہندوستانی جاگیرداری نظام کے تانے بانے میں اہم کڑی مانتے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اپنی کتابوں میں اس بنیاد کے اوپر دوسری بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کردیں جیسے کہ لکھنے پڑھنے والے کلاس کا وجود میں آنا۔ جو کائستھ کی ذات بن کر مستحکم ہوئے۔ کیونکہ سرکاری گرانٹ کو ریکارڈ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ انٹرمیجریز کو عطیہ اراضی کا سلسلہ گیارہویں صدی تک جاری رہا جب تجارت کے احیاء سے شہرکاری کے سلسلہ کا دوبارہ چلن پڑا۔ جاگیرداری نظام کے زوال کی وجہ اس کی احیاء میں دیکھتے ہیں گوکہ آر۔ایس۔ شرما اس پہلو پر بہت زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں۔ ایک عنصر جو اس تصویر سے غائب ہے وہ ہے ہندوستان کا مدمقابل عربوں کا یوروپ کے اوپر حملہ۔ بہرکیف پروفیسر بی۔این۔ایس یادو ہندوستانی جاگیرداری نظریہ کے ایک اور مشہور دعویدار نے ہندوستان پر ہنوں کے حملہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو بالکل مطابقت رکھتا ہے، یہاں جاگیرداری نظام کی شروعات سے یوروپ میں جاگیرداری نظام کے بڑھتے ہوئے ظلم وستم کی وجہ سے یوروپ میں کسانوں کی بڑے پیمانہ پر بغاوت شروع ہوگئی۔ ہندوستان میں آر۔ایس۔ شرما اسی طرح کی بغاوت کے ثبوت ڈھونڈتے ہیں لیکن ان کو صرف ایک ہی ایسی مثال ملتی ہے جو کیورتاؤں کی ہے جو مشرقی بنگال میں ملاح تھے اور ساتھ ساتھ کاشتکاری سے بھی جڑے ہوئے تھے جنھوں نے گیارہویں صدی میں بغاوت کی۔

یہ نظریہ جو مکمل طور پر 1965 میں منظر عام پر آیا ہندوستان میں اس کے بعد کی تاریخ نویسی پر اس کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ دیگر حضرات نے اسی نظریہ کو بس اتنا ہی سراہا ہے کہ کسی نے کسی بات کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا کسی اور نے کسی بات کی اور زیادہ وضاحت کی۔ مگر کسی نے جاگیرداری موضوع کے کسی اور پہلو کی کوئی وضاحت نہیں۔ کی مثال کے طور پر معاشرتی اور ثقافتی پہلو۔ بی۔این۔ایس۔ یادو اور ڈی۔این۔ جھا جاگیرداری نظریہ پر مستعدی سے قائم ہیں۔ اس موضوع کی بازگشت جنوبی ہند کی تاریخ نویسی میں بھی دکھائی پڑتی ہے۔ ایم۔جی۔ایس۔ نارائن اور نوبورو کرشما جیسے معروف ومشہور مورخین نے بھی اسی بات کی تصدیق کی ہے۔ البتہ پڑھے لکھے طبقوں میں اس پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ ان میں ایک مشہور نقاد، ڈی۔سی۔ سرکار ہیں۔ 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں ہندوستان میں تاریخ نویسی میں نظریاتی اختلاف صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ ڈی۔ڈی۔ کوسامبی، آر۔ایس۔ شرما، بی۔این۔ایس۔ یادو اور ڈی۔این۔ جھا جہاں ایک طرف مارکسی مورخین کے طور پر اپنی پہچان رکھتے ہیں وہیں دوسری طرف ڈی۔سی۔ سرکار مارکسی نظریہ کے دوسرے کنارے پر نظر آتے ہیں۔ بہرکیف جاگیرداری تصور کی نہ تو حمایت اور نہ مخالفت۔ اس تصور کے بنیادی پہلوؤں پر 1970 کی دہائی تک مزید غور وفکر کے دروازے کو نہیں کھول سکا یہ دروازہ بھی مارکسی تاریخ نویسی کے اسکول کے اندر ہی کھلا۔ ہم اس موضوع پر تھوڑی دیر میں لوٹیں گے۔

1946ء میں کیمبرج یونیورسٹی یو۔کے۔ کے بہت ہی معروف ومشہور مارکسی ماہر معاشیات مورس ڈوب کی کتاب اسٹڈیز ان دی ڈیولپمنٹ آف کیپیٹلزم، چھپی جس میں انہوں نے سب سے پہلے بہت ہی سنجیدگی سے سوال کھڑا کیا ہے: پائرین کی تجارت اور جاگیرداری کے بیچ میں اختلاف کو اور اینجلز کی دقت نظر کی

پیروی میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مشرقی یوروپ میں تجارت کی احیاء دوسری غلامی (Second Serfdom) کو وجود بخشا یعنی جاگیرداری نظام۔ لہذا انہوں نے اس خیال کو سچ تسلیم کرلیا ہے کہ جاگیرداری نظام مغربی یوروپ میں بھی زوال پذیر نہیں ہوا تھا۔ تجارت کی احیاء کی وجہ سے بلکہ کسانوں کا گاؤں کے اندر امراء کے ذریعہ بڑھتی ہوئی ظلم وزیادتی اور غیر معمولی استحصال کی وجہ سے شہروں کی طرف کوچ کر گئے۔ اس نظریہ نے 1950 کی دہائی میں مارکسی ماہرین معاشیات اور مورخین کے درمیان بین الاقوامی بحث ومباحثہ کو جنم دیا ہے یہ بحث اب بھی اس سوال کے اوپر مرکوز تھی کہ کیا جاگیرداری اور تجارت آپس میں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اسی لیے دوسری جگہوں پر بھی، خاص طور سے فرانس میں جہاں تاریخ نویسی کا ایک متوازی ماڈل جس کو Annals Paradigm کہتے ہیں وجود پذیر ہورہا تھا۔ نئے نئے سوالات اٹھ رہے تھے اور مسائل کے نئے نئے زوایئے تلاش کئے جارہے تھے۔ بعض سوالات نے ہندوستان تک کا سفر طے کیا۔

10.3 کیا ہندوستان میں جاگیرداری تھی؟

1979ویں انڈین ہسٹری کانگریس میں میڈیول انڈیا سیکشن کے چالیسویں سیشن کے صدارتی خطبہ کا موضوع تھا ''کیا ہندوستانی تاریخ میں جاگیرداری تھی''؟ ہربنس مکھیا جو اس کے لکھنے والے تھے ایک جو مارکسی تاریخ نویس کے طور پر اپنی پہچان رکھتے ہیں انہوں نے عہد وسطی کے ہندوستان کے تناظر کی کو عہد وسطی کے یوروپ کے تناظر میں موازنہ کرتے ہوئے نظریاتی بنیاد پر اور پھر حقائق کی سطح پر ہندوستانی جاگیرداری کے نظریہ پر سوالات اٹھائے ہیں۔

نظریاتی پہلو کا تعلق اس بات سے تھا کہ کیا جاگیرداری کو ایک ہمہ گیر (Univers) نظام کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے قوت محرکہ نے زیادہ پیداوار اور بازار کے پھیلنے کے ذریعہ سرمایہ داری کی طرف تبدیل کیا تا آنکہ پوری دنیا کو اپنے میں سمیٹ لے۔ جیسا کہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور اگر یہی سرمایہ داری کی خصوصیات ہے کہ پیداوار کے واحد نظام کے اندر ایک عالمی نظام قائم ہوسکے تو عقلاً کسی ماقبل سرمایہ دارانہ نظام میں اس اونچائی کو پہنچنا ناممکن تھا کہ جس کو عالمی نظام کا نام دیا جاسکے۔ کیونکہ کھپت کی طاقت زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی ہے۔ ماقبل سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی بنیاد بھی اور اس نے مارکیٹ کو لوکل اور علاقے کی بندش میں محدود کر رکھا تھا۔ لہذا جاگیرداری ایک علاقائی نظم تھا نہ کہ کوئی عالمی نظام۔ یہ مسئلہ مختلف جگہوں جیسے، یوروپ، چین، جاپان، ہندوستان وغیرہ پر مختلف اقسام کی جاگیرداری نظام کی سچائی کو جاننے کے بعد لاینحل رہتا ہے۔ گوکہ مورخین نے بارہا اس کو حل کرنے کی جانب قدم اٹھایا ہے۔ کیونکہ جاگیرداری کی تعریف یا تو اتنی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے کہ وہ ہر ماقبل سرمایہ دارانہ نظام سے ہم آہنگ نظر آتی ہے اور اس وجہ کر ایک جگہ کی جاگیرداری دوسری جگہ کی جاگیرداری میں حد بندی نہیں ہوسکی اور بس یہ لایعنی چیز ہوگئی۔ اور اگر اس کی تعریف میں جامعیت ہے جو عملی جامہ پہن سکے تو اختلافات اتنے گہرے نظر آتے ہیں کہ تب یہ بے معنی لگنے لگتا ہے۔ بلاشبہ یہاں تک کہ ایک ہی علاقے میں اختلافات اتنے واضح ہیں کہ بعض قابل قدر عہد وسطی کے یوروپ کے مورخین جیسے جورجیز ڈوبی اور جیکس لی گوف، جاگیرداری لفظ کو سرے سے استعمال کرنے پر ہیز کرنے لگے۔ اور جاگیرداری کی تقریباً سبھی تعریفیں ان کی نگاہ میں مشکوک ہوگئی ہیں۔

1979ء کے صدارتی خطبہ میں ہندوستانی جاگیرداری پر تجزیہ کے بنیاد پر اٹھنے والے سوال عہد وسطی کے مغربی یوروپ اور ہندوستان کی تاریخوں کے تقابل سے متعلق ہیں۔ جس کا تین زوایوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ماحولیاتی حالات، ٹکنالوجی کا پایا جانا اور دونوں جگہوں پر زراعت میں مزدوری کی قسموں کی سماجی تنظیم۔ اس مداخلت کے ساتھ یہ بحث صرف جاگیرداری اور تجارت کی دو اصطلاحوں تک محدود نہیں رہ گئی تھی بلکہ خود اپنے ہی سرزمین پر سوالوں کے نرغے میں گھر گئی۔

متضاد دلائل اس پس منظر میں دئے جانے لگے کہ مغربی یوروپ کی آب وہوا میں ایک سال میں چار مہینے گرمیوں کے ہوتے ہیں۔ تمام تر زرعی عمل کھیت جوتنے سے لے کر بونے تک، فصل تیار ہونا اس کو کاٹنا پھر جمع کرنا یہ سب کام اسی چار مہینے میں پورے ہوجاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ٹکنالوجی پوری طرح مزدوروں کے اوپر منحصر تھی۔ اور زمین اور مزدور دونوں کی پیداواری قوت مایوس کن تھی بیج پیداوار کا تناسب زیادہ سے زیادہ 1:2.5 تھا۔ نتیجتاً مزدور کا کی مانگ ان چار مہینوں میں شدید تھی۔ ایک دن بھی مزدور نہ ملنے کا مطلب پیداوار میں کمی تھی۔ اس مسئلہ کا حل مزدور سے منسلک کرنے یا Serfdom میں ڈھونڈھا گیا۔ اس کی وجہ

سے مالک زمین اور غلام کے درمیان پیداوار کو لے کر زبردست تناؤ بنا رہتا تھا۔ مالک زمین کسان مزدور پر اپنی مضبوط پکڑ بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ جبکہ کسان باوجود بے حد شریف النفس ہونے کے، تھوڑا وقت نکال کر اپنا کھیت کاشت کرنا چاہتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان یہ جدوجہد، جو کہ پرسکون مگر تناؤ والی نے، ٹکنالوجی کو بڑھاوا دیا۔ اور بارہویں صدی میں پیداوار 1:4 کے تناسب تک پہنچ گئی۔ آبادی میں خاطرخواہ اضافہ اور نتیجہ مزدور کا زمین سے انقطاع، زراعت میں وسعت اور تجارت اور شہرکاری کا وجود یہ سارا سلسلہ 51-1348 کے درمیان کالی موت (black death) کی وجہ سے درہم برہم ہوگیا جس سے ایک چوتھائی آبادی نیست و نابود ہوگئی جس سے مزدور کی قلت پیدا ہوگئی۔ مالک زمین نے پرانے طریقہ پر مزدوروں سے جڑنے کا سوچا۔ کسان جنہوں نے 11ویں اور 12ویں صدی میں خوشگوار ایام دیکھے تھے، وہ 14ویں صدی میں پورے یوروپ میں بغاوت پر اتر گئے۔ یہ بغاوت خوشحال کسانوں نہ کہ غریب کسانوں کے ذریعہ عمل میں آئی۔ اور اسی صدی کے اختتام تک جاگیرداری نیست و نابود ہو چکی تھی۔

ہندوستانی فضا میں اس کے برعکس تقریباً دس مہینے دھوپ ہوتی ہے جو زراعت کے لئے خوشگوار ہے۔ سخت گرمی کے ساتھ بارش کی وجہ سے زمین کا اوپری حصہ زرخیزی سے بھرا ہوتا تھا۔ اس لئے زمین کو گہرائی تک کھودنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہندوستانی بیلوں کے اوپر کوہان سے ہندوستانی کسانوں کو بیل کی پیاس کی قوت برداشت کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کا موقع ملا کیونکہ اس سے ہل کو بیل کے کندھے پر رکھنا آسان ہوگیا۔ جبکہ اس کے برخلاف یوروپی بیلوں کے سپاٹ کندھوں کی وجہ سے ہل اس کے کندھے سے نیچے اتر جاتا تھا جیسے ہی وہ اسکو کھینچتا تھا۔ بیلوں کے کھینچنے کی طاقت کو مکمل استعمال میں لانے میں عہد وسطی کے یوروپ کو ٹکنالوجی میں ترقی حاصل کرنے میں صدیاں گذر گئیں۔ زمین کی پیداواری قوت عہد وسطی کے ہندوستان میں بہت زیادہ تھی۔ تقریباً 1:16 کے تناسب میں۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں ہر کھیت میں سال میں دو فصل لازماً ہوتی تھی۔ جو شاید 19 صدی تک یوروپ میں نہیں ہوتی تھیں۔ ہندوستان کے حالات کا یوروپ کے حالات سے مقابلہ کرنے پر جو بنیادی فرق نظر آتا ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ زراعت میں استعمال آنے والے مزدور کی قسم بھی الگ طریقہ پر منحصر ہوگئی۔ بیگار، یا بندھوا مزدور، مزدوری یا بغیر مزدوری کے مزدور ہندوستان میں شاید ہی پیداوار سے جڑے ہوتے تھے۔ اس کا بیشتر استعمال غیر مرئی ضروریات کے لئے ہوتا تھا جیسے کہ زمیندار کے بوجھ کو مزدوروں کا اپنے سر پر لے کر چلنا یا دودھ، تیل، وغیرہ زمیندار اور جاگیردار کو خاص خاص موقعوں پر پہنچانا۔ دوسرے لفظوں میں کسان اور زمیندار یا جاگیردار کے درمیان تناؤ پیداوار کے زمرے سے باہر محصولی کے تعین کے سوال پر ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے عہد وسطی کے ہندوستان میں ہم کو اس سطح کا ٹکنالوجی میں عروج اور پیداوار کے عمل میں بدلاؤ نہیں نظر آتا ہے جیسا کہ ہم عہد وسطی کے یوروپ میں دیکھتے ہیں۔ گو کہ یہ بات بڑی قوت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں نہ تو ٹکنالوجی اور نہ زرعی پیداوار کا عمل میں جمود تھا اور نہ ایسا تھا کہ اس میں کوئی بدلاؤ نہیں آرہا تھا۔

1979 کے خطبہ میں عہد وسطی کے ہندوستانی نظام کو آزاد کاشت کار معیشت (Free peasant economy) کے نام سے مختص کیا ہے۔ Free peasant عہد وسطی کے یوروپ کے سرف (Serf) سے بالکل علیحدہ طور پر دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ زرعی پیداوار کے کاموں کے لئے یوروپ میں سرف کے مزدور (Serf's Labour) پورے طور پر مالک زمین کے ماتحت ہوتے تھے۔ جبکہ ہندوستان میں اس کے برخلاف مزدور زمیندار یا جاگیردار کے ماتحت نہیں ہوتے تھے۔ جس بات کو ریاست کے کنٹرول سے متعلق سمجھا تھا وہ تھی محصول کی شکل میں زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کی مقدار۔ یہاں بنیادی فرق یہ دکھائی دیتا ہے کہ لیبر کنٹرول کو لے کر پیدا ہونے والے تناؤ کو حل کرنے کی کوشش نے پیداواری نظام کو بارہویں صدی اور اس کے بعد کے یوروپی زراعت کو جاگیرداری سے سرمایہ داری Capitalist میں بدل دیا۔ ہندوستان میں مالگزاری کی وجہ سے جو تناؤ تھا اس سے پیداواری نظام پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور یہاں بدلاؤ کی شروعات بیسویں صدی میں بالکل مختلف وجوہات کی بنا پر ہوئی۔

کیا ہندوستانی تاریخ میں جاگیرداری تھی؟ یہ مضمون 1981 میں ایک برطانوی جرنل The Journal of Peasant Studies میں دوبارہ چھپا۔ چند ہی سالوں میں بین الاقوامی سطح پر اس موضوع پر اتنی زیادہ دلچسپی دکھائی پڑی کہ 1985 میں اس جرنل کے دو خصوصی شمارے آگئے۔ جو اس موضوع پر خاص تھا، جس میں دنیا بھر سے آئے 8 مضامین تھے اور مولف کا ان آٹھوں مضامین پر تبصرہ تھا جس کا عنوان تھا Feudalism and Non-European Societies جو مشترکہ طور پر، لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے T.J. Byres اس جرنل کے ایڈیٹر اور اس مضمون کے

مصنف کے ذریعہ ایڈیٹ کیا گیا تھا۔ یہ ایک کتابی شکل میں بھی اسی وقت چھپا۔ اس کا نام اس بحث کو مدنظر رکھ کر رکھا گیا جو یوروپ اور ہندوستان کی حدوں کو پار کر کے چین، ترکی، اور ایران تک پہنچ گیا تھا۔ اس خاص شمارے کے چھپنے سے یہ بحث ختم نہیں ہوئی بلکہ تین اور مضامین اس جرنل میں 1993 تک چھپے۔ بحث کا دائرہ عام طور پر جاگیرداری مباحثہ Feudalism Debate تھا۔ متعلقہ مضامین کا ایک مجموعہ 1999 میں نئی دہلی سے جاگیرداری مباحثہ Feudalism Debate کے عنوان سے چھپا ہے۔

10.4 جاگیرداری نظام پر دوبارہ غور وخوص

جاگیرداری کے موضوع پر بحث میں جاگیرداری تصور پر نظریاتی پہلو کی ہمہ گیریت کا باریکی سے تجزیہ کیا گیا۔ یہ مورخ کا اپنا منفرد خیال تھا۔ ہندوستانی تاریخی ثبوت کے سوال پر آر۔ ایس۔ شرما جو ہر طرف سے نشان ہدف تھے۔ اپنے بعض ابتدائی خیالات پر نظر ثانی کی اور ہندوستانی جاگیرداری نظام پر اپنے مقالے پر غور وخوض کیا۔ انہوں نے پورے زور وشور سے اپنے نظریہ کی اپنے ایک How Feudal was Indian Feudalism? میں تائید کی۔ ان کو اس بات کے لئے تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ ہندوستان میں جاگیرداری نظام کے وجود پذیر ہونے کے پیچھے مکمل طور پر ریاستی عمل زمین کو انٹرمیجریز کے سپرد کرنے سے جڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ میں تصحیح کی اور اس کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے جاگیرداری نظام کو بطور معاشی بدلاؤ کے طور پر دیکھنے میں لگے جو سماج میں معاشی اور معاشرتی بحران کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا جو لوگوں کے ذہن میں کل یگ کی ابتداء کی طرف اشارہ تھا۔ نہ کہ مکمل طور پر ریاستی عمل کا نتیجہ۔ بی۔ این۔ ایس۔ یادو نے بھی ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستانی ادب میں موجود کل یگ کے تصور کا گہرہ مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس تصور کا تعلق ایک تغیر سے تھا۔ معاشرتی تغیر کا پس منظر سماج کا ایک سطح سے دوسری سطح پر منتقلی تھی۔ ان تمام خیالات کو ہندوستانی جاگیرداری نظام پر دلائل سے تقویت ملی۔ آر۔ ایس۔ شرما کو کسانوں کے ذریعہ کشمکش کی اور بھی بہت سی مثالیں تلاش کرنے میں مدد ملی بمقابلہ اس ایک مثال کے جو انہوں نے 1965 میں اپنی کتاب میں پیش کی ہے۔ اس سے بھی ان کے خیال کو تقویت ملتی ہے۔ آر، ایس، شرما نے بعد میں جاگیرداری طبقہ میں نظریاتی اور ثقافتی پہلوؤں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ انہوں نے اپنے تازہ ترین مضامین کے مجموعے میں جو Early Medieval Indian Society: A Study in Feudalisation نام سے کے نئی دہلی سے 2001 میں چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے بہت پرانے خیالات میں ترمیم کی ہے اور اس بعض نئے خیالات کو جیسے کہ جاگیرداری ذہن The Feudal Mind کو جگہ دی ہے جہاں وہ ایسے مسائل جو علم وفن میں جاگیرداری مراتب کی عکاسی کرتے ہیں جیسے شکرگذاری اور وفاداری پر مبنی تصورات جس پر جاگیرداری سماج کی بنیاد پڑی ہے۔

ثقافتی پہلو سے جوڑنے کا جوکھم دیگر مورخین نے بھی لیا ہے۔ وہ جاگیرداری تصور میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ 16 مضامین کے ایک مجموعہ میں جس کا عنوان تھا دی فیوڈل آڈر۔ اسٹیٹ سوسائٹی اینڈ آئڈیالوجی ان اری میڈیول انڈیا، جو 1987 اور 2000 میں چھپا۔ اس مجموعے کے ایڈیٹر ڈی۔ این۔ جھا۔ نے ایسے مضامین کو اس میں شامل کرنے کی طرف دھیان دیا ہے جس میں ثقافتی اور نظریاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جس کو فیوڈل آرڈر کہتے ہیں۔ جو خود اپنے آپ میں ایک جامع لفظ ہے۔ ایک قابل لحاظ پہلو جو اجاگر ہوا ہے وہ مذہب ہے خاص طور سے مشہور مذہب یا بھکتی۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں اور ہندوستان کا علاقائی کلچر اور زبان کا ارتقاء ہوا۔ جس طرح سے بہت سے مورخین بھکتی مذہب کے وجود پذیر ہونے کی وجہ بڑھتے ہوئے برہمنی تعصب کے خلاف شدید مخالفت دیکھتے ہیں۔ جاگیرداری نظام کے دعویداران چیزوں کو برہمن غلبہ کے سہارا کے طور پر دیکھتے ہیں جوان کو دیوی، دیوتاؤں سے وفاداری اور ان کے آگے مکمل سپردگی کے ذریعہ سے حاصل ہو رہی تھی۔ اس سپردگی اور وفاداری کو بڑی آسانی سے جاگیرداری آقاؤں کو منتقل کیا جاسکتا تھا۔

ہندوستانی فیوڈلی ازم اسکول کے مورخین کے خیالات میں بسا اوقات اختلافات نظر آتے ہیں۔ ڈی۔ این۔ جھا مثال کے طور پر غیر ہم آہنگی دیکھتے ہیں۔ کل یگ تصور کے ثبوت کے پائے جانے میں اور جہاں بحران پیش آیا جس کے بارے کل یگ نشاندھی کرتا ہے۔ اس کے ثبوت جزیرۂ ہند میں ملے ہیں۔ جبکہ اصل بحران شمالی برہمن علاقہ میں ہونا تھا۔ بی، پی ساہونے میں شبہ ظاہر کیا ہے کل یگ کو بحران کے طور پر نشاندھی کرنے کے ثبوت پر۔ بجائے اس کے وہ اس کو بادشاہت کی از سر نو تعریف کر کے دیکھتے ہیں اور اس لئے برہمن نظریہ کو وردار طریقے سے پیش کر کے، نا یہ کہ اس کے اندر ہی بحران تلاش کریں۔

10.5 جاگیرداری، تجارت اور شہریت

بہر حال ہندوستانی جاگیرداری مضمون کی بنیادی ساخت یعنی تجارت اور شہرکاری ایک طرف اور جاگیرداری دوسری جانب، کے درمیان دوری ابھی تک نہیں پاٹی جاسکی ہے اور یہ بنا سبب نہیں ہے۔ تاریخ نویسی کے موجودہ طرز عمل کو دھیان میں رکھتے ہوئے یوروپی تاریخ نویسی میں مورخین میں ایک موزوں اور عام بدلاؤ نظر آتا ہے۔ اگر ہینری ہیرین نے شہری/ دیہی کے درمیان۔ تجارت/ جاگیرداری کے درمیان اور قدرتی یا خودکفیل/ مالیاتی معیشت کے درمیان غیر مناسب تقسیم کا دعویٰ 1930 کی دہائیوں میں پیش کیا تو بعض مورخین کے اس خیال کے برخچے اڑا دئے ایک دوسرے کے درمیان مکمل ہم آہنگی دکھا کر۔ فرانس کے مشہور مورخ مارک بلوک نے اپنے ایک مضمون کا نام قدرتی معیشت بمقابل مالیاتی معیشت ایک دقیانوسی کیفیت، دے دیا۔ ایک دوسرے فرانس کے مورخ گے بوئس اپنے ایک حالیہ مضمون میں جاگیرداری معیشتی تعلقات کے ارتقاء کو مغربی یوروپ میں 1000ء میں ان جگہوں پر دیکھنے کی کوشش کی ہے جہاں تجارت اپنے عروج پر تھی۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے تجارت اور جاگیرداری کے درمیان لازم، ملزوم جیسا براہ راست تعلق دکھا دیا ہے۔ لہذا تجارت/ جاگیرداری کی تقسیم خود اسی جگہ دم توڑ گئی جہاں اس کا جنم ہوا تھا۔ قدرتی یا خودکفیل معیشت کے وجود کے تصور پر ہی سوالیہ نشان کھڑا ہو گیا ہر جگہ بحیثیت نظریہ تجرباتی مفروضات کے۔ واضح ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی اپنی ضروریات زندگی کے لئے تھوڑی بہت تجارت ضرور کرتا ہے خواہ نمک ہی خریدنے کے لئے یا کپڑا یا کچھ برتن، چیزیں خریدنا اور اس کے لئے پیسہ کا استعمال کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے ہم سماجی زینہ پر اوپر چڑھتے جاتے ہیں تجارت کسی نہ کسی شکل میں معاشی زراعت میں ضرور گھسی ہوئی ہے۔ کیونکہ مٹی کی نوعیت مختلف علاقہ میں مختلف قسم کے کاشت کی متقاضی ہوتی ہے جو وہ اپنی پیداوار کا تبادلہ اپنی ضروریات کو سامنے رکھ کر کرتے ہوں گے۔

تجربات کی بنیاد پر بہت سے مورخین کئی علاقہ میں تجارت کے زوال پذیر ہونے اور پیسہ کی قلت اور ہندوستانی جاگیرداری نظام کی مدت کے تصور کو صحیح نہیں مانتے ہیں۔ ڈی۔ این۔ جھا نے آر۔ ایس شرما کو دور دراز کے ملکوں سے بیرونی تجارت کے ناپید ہونے کو ہندوستان میں جاگیرداری نظام کے آغاز سے جوڑ کر دیکھنے کو اور اسی کو بنیادی وجہ مان لینے پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ بلکہ اصلاً ہندوستان کے بعض علاقوں میں تجارت پورے شباب پر دکھائی دیتی تھی، اس متعینہ مدت سے بہت پہلے جو جاگیرداری نظام کے طرفدار جاگیرداری کے احیاء کی تاریخ 1000ء، یوروپ کے بالکل متوازی طے کرتے ہیں۔ پی ڈی چٹوپادھیائے نے کم از کم سو سال پہلے کی مدت طے کی ہے۔ حال میں رنبیر چکرورتی اپنی دو کتابوں میں ٹریڈ ان ارلی انڈیا، 2001 اور ٹریڈ اینڈ ٹریڈرس ان ارلی انڈین سوسائٹی، 2002، اس بات کے پکے ثبوت دئے ہیں کہ متعلقہ مدت میں تجارت پوری طرح سے سرسبز و شاداب تھی (مزید دیکھیں اسی بلاک کا یونٹ 14)۔ نظام زر کے فقدان کا نظریہ جو کہ ہندوستانی جاگیرداری نظام کے وجود میں لانے والی بنیادی وجہ کو بھی بی ڈی چٹوپادھیائے اور پی ایس مکھرجی کے حالیہ تحقیقات نے کھٹائی میں ڈال دیا ہے۔ جون۔ ایس۔ ڈیئل نے اپنی کتاب لیونگ ود اؤٹ سلور 1990 میں قلت زر کے مفروضہ کو پوری طرح خارج کر دیا ہے یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ عہد وسطی میں سونا، چاندی یا تانبہ دھات ہی میں زر کی قسم میں نہیں آتے تھے۔ مارک بلوک نے لکھا ہے کہ عہد وسطی کے یوروپ میں کوئی بھی چیز زر مبادلہ یعنی پیسہ کے طور پر کام آسکتی تھی۔ جیسے مخصوص قسم کے مسالوں کی مخصوص مقدار، خاص قسم کا کپڑا، خاص قسم کے اناج کی خاص مقدار، ہندوستان میں بھی کوڑی کے استعمال نے زر مبادلہ کے طور مورخین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کوڑی حاصل کرنے کے پیچھے لمبی دوری کی تجارت شامل ہوتی تھی۔ کیونکہ کوڑیوں کے خول مالدیپ جیسے دور دراز علاقوں سے حاصل ہوتے تھے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

10.6 مشکلات

قاعدے سے دیکھا جائے تو کچھ اور بھی مشکلات ہیں۔ اگر 300ء سے 1100ء کے بیچ کی مدت کو ہندوستانی جاگیرداری کی مدت کہا جاتا ہے تو اس کے بعد کے زمانے کو جس کو عرف عام میں عہد وسطی کا ہندوستان کہا جاتا ہے ماقبل استعماری طاقت کے قیام کے، کس طرح پہچانا جائے گا۔ علاوہ ازیں پورے زمانے کو کوئی ایک نام دے سکتا ہے۔ اس خیال سے کہ پورا زمانہ اکائی ہے جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر مارک بلوک نے یورپ میں جاگیرداری کے وقفہ کو پہلا جاگیرداری زمانہ اور دوسرا جاگیرداری زمانے کے درمیان بانٹا ہے۔ اندازاً 1000 سال کے اوپر۔ ان کے خیال میں تبدیلی اتنی واضح تھی کہ ایک زمانے کا آدمی دوسرے زمانے میں بالکل اجنبی بن گیا ہوگا۔ جاگیرداری کے ساخت میں یہ گہری تبدیلی آج کے زمانے کی یوروپی تاریخ نویسی

میں ایک روایتی خیال کے طور پر دیکھی جاتی ہے۔ اگر کسی مورخ نے یہ محاورہ استعمال بھی کر لیا تو کسی وقت اس سے اختلاف کر جاتا ہے۔ بعض مورخ پہلے اور دوسرے جاگیرداری زمانے کے بجائے اس کو نیچا اور اونچا درمیانی (Low and high middle ages) زمانہ کہنا پسند کرتے ہیں۔ اس بات پر بھی لوگوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ یوروپ میں جاگیرداری کے اختتام پر سرمایہ داری کے آغاز اور اس میں استحکام کا زمانہ آیا۔ استعماری نظام سرمایہ داری نظام کا ہی ایک رخ ہے۔

ہندوستانی جاگیرداری میں آٹھ سو سال کی طویل مدت میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے؟ اور 1100ء یا اس کے بعد کیسا زمانہ آیا۔ یقیناً وہ سرمایہ داری نظام نہیں تھا۔ جاگیرداری کے طرفداروں نے ان سوالوں سے چھیڑ خانی نہیں کی ہے۔ ڈی ڈی کوسامبی نے جاگیرداری کی مدت کو بڑھا کر 17ویں صدی تک پہنچا دیا۔ بالکل عقلی دلیل کے طور پر اگلے چھ سو سال تک اس کی مدت بڑھا دینے سے اور تقریباً 1400 سال کے لمبے عرصہ کو ایک ہی طرح کا مان لینے سے تو مسئلہ اور الجھ جائے گا۔ جو کہ آج مورخین کے لئے تسلیم کرنا ناممکن بات ہے۔ کیونکہ تبدیلی ڈھونڈنا، خواہ معمولی سی بھی، ایک چھوٹے سے وقفہ میں بھی ان کی بنیادی کوشش ہے۔

مشکلات جو بھی ہوں جاگیرداری نظام پر بحث نے ایک لمبی مسافت طے کی ہے۔ علمی انداز کی بحث ہی اپنے آپ میں خوش آئند بات ہے۔ اس میں ذاتی دشمنی کا شائبہ تک نہیں آتا۔ اس بات کو سان رینولڈس نے اپنے ریویو (تجزیہ) میں درج کیا ہے جو خود انگلینڈ کی ایک معروف عہد وسطی کی مورخ ہیں۔ خصوصاً اپنے ہی گھر کے آس پاس کے علمی مجالس میں اس طرح کے حالات پر ماتم کناں ہوتے ہوئے یہ بحث بہت معتبر تھی۔ اس لئے کہ اس سے ہر کسی کو اپنے ہی گریباں میں جھانکنے کا موقع ملا تا کہ اپنے خیال میں تبدیلی لا سکیں، خواہ اپنی دلیل کی مدافعت ہی میں سہی۔ خلاصۃً کوئی حتمی جواب اس سوال کا نہیں مل سکا۔ لیکن یہ سب کچھ قاعدے قانون کے دائرے میں ہوا۔ خود اپنے آپ سے سوال کر کے اس میں جدیدیت ڈھونڈنے کی کوشش جاری ہے۔

10.7 خلاصہ

ہندوستانی جاگیرداری کی ترقی کو ڈی۔ ڈی۔ کوسامبی کو دورخی تسلسل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جاگیرداری اوپر سے اور جاگیرداری نیچے سے Feudalism from above and Fedalism from below جبکہ آر۔ ایس۔ شرما جاگیرداری کو ریاست کے عمل کا نتیجہ بتاتے ہیں یعنی اوپر سے۔ شرما کے خیالات کو بی۔ این۔ ایس۔ یادو اور ڈی۔ این۔ جھا سے مزید تقویت دی اور اس کو پروان چڑھایا۔ 1975 میں ہربنس مکھیا نے یہ سوال اٹھایا ''کیا ہندوستانی تاریخ میں جاگیرداری تھی''؟ مکھیا کو آر۔ ایس شرما نے اپنے مضمون ''جاگیرداری کس طرح ہندوستانی جاگیرداری تھی'' میں اس کا جواب دیا۔ جس میں انہوں نے ایک بار پھر سے ہندوستانی معیشت میں جاگیرداری خصوصیت پائے جانے کی طرف اور زیادہ باریکی سے دکھایا ہے۔ حال فی الحال ایک نیا زاویہ نگاہ بھکتی، کو اس سے جوڑ کر جاگیرداری خصوصیت کو مزید ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں بھکتی کو مالک زمین اور منصبدار کے تعلق کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ بہر کیف سب سے آخر میں ہندوستانی جاگیرداروں کی بنیادی خصوصیت، تجارت، شہر کاری کا زوال، پر بی۔ ڈی۔ چٹوپادھیائے، رنبیر۔ چکرورتی اور جون۔ ایس۔ ڈیل کے ذریعہ سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔

10.8 فرہنگ

وقائع (Annels)	ابتداً یہ ایک فرانسیسی جرنل جس کو مارک بلوک اور لوسین فیبرے نے ایک ساتھ مل کر جاری کیا تھا سے منسلک تھا۔ اینالس اسکول کے تاریخ نویس طویل مدتی حالات کے اوپر نہ کہ واقعات پر نظر رکھتے ہیں۔ فرڈینینڈ براوڈل اور مارک بلوک اس اسکول کے مشہور شارح ہیں۔ ان لوگوں نے نئی راہیں دکھائیں جیسے کہ تقابلی تاریخ، رجحانات/ ذہنیت کی تاریخ، کمیت کی تاریخ وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں نے روایتی واقعہ نگاری اور طبقاتی تاریخ کو چیلنج کیا۔ ان لوگوں نے قاعدہ قانون کی بندشوں کو توڑ دیا اور سوشل سائنس میں بین الفن (Interdisciplinary) رجحان کو جگہ دی۔

ایشیائی طریقۂ پیداوار (Asiatic Mode of production)

ابتدائی طور پر اس تصور کو کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے جنم دیا۔ پھر بھی اس میں بہت سے عنصر جو ایشیاء کا عام یوروپی تصور تھا اور جو یوروپ کی صنعت تضاد Anti-Thesis تھی اس میں شامل ہو گئے۔ اس تصور میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یوروپی ترقی کے فاتحانہ راستے پر گامزن ہے بوجہ عقلیت، سائنس اور ٹکنالوجی کے جبکہ ایشیاء اب تک جمود، غیر بدلاؤ اور تاریخ میں پچھڑا ہونے کے طور پر جانا جاتا تھا۔ مارکس نے ایشیا میں اس عدم تبدیلی کو ذاتی جائداد کے نہ ہونے کو بتایا۔ نتیجتاً یہاں طبقاتی کشمکش Class struggle نہیں ہے جو ان کے خیال میں ترقی کا زینہ ہے۔ پیداوار کے ایشیائی طریقے، کو خاص طور سے چین اور ہندوستان کے مارکسی مورخین نے زبردست تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

صلیبی جنگیں (Crusades)

الیکسئیس کومنینس Alexiuscomnenus بازنطینی حکمراں جو قسطنطنیہ سے حکومت کر رہا تھا، اس کو ترکوں سے شدید مزاحمت کا سامنا تھا۔ وہ لوگ عیسائی زائرین یروشلم آنے جانے کے راستے میں حملہ کرتے تھے اور ان کو نقصان پہنچاتے تھے۔ پوپ اربن دوم نے اس بنیاد پر ایک مقدس جہاد کا اعلان کیا تاکہ وحشی ترکوں سے مقدس زمین واپس لی جاسکے۔ لہٰذا پہلی جنگ 1096ء میں شروع ہوئی۔ اس جنگ کا مرکز لیوانت (Levant) تھا (موجودہ اسرائیل کچھ حصہ شام، لبنان اور جنوبی مشرقی ترکی)۔ یہ جہاد 250 سالوں تک جاری رہا۔ کلی طور پر چھ بڑے جہاد 176 سال کے عرصہ میں (1271۔1095) ہوئے۔

جاگیرداری

نقد رقم کے عوض دی جانے والی مالگذاری کی تفویض کو جاگیر کیا جاتا تھا اور اس کے پانے والے کو جاگیردار کہا جاتا تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ زمین نہیں تھی بلکہ زمین سے حاصل ہونے والی مال گذاری تھی جو جاگیردار کو دی جاتی تھی۔

زرعی غلام/کمیرا (Serf)

عہد وسطیٰ کے یوروپ میں رعیتی کاشتکار طبقہ۔ یہ لوگ اس زمین سے بندھے ہوئے تھے جس پر وہ کھیتی کرتے تھے بدلے میں وہ مالک زمین کی زمین پر مزدور کی طرح کام کرتے تھے یا پیداوار کا ایک حصہ اس کو دیتے تھے اس کے علاوہ دوسرے اور کام (Obligations) بھی مالک زمین کے لئے انجام دیا کرتے تھے۔

زمیندار

لفظی معنی ہے زمین والا یا زمین کو کنٹرول کرنے والا۔ مغلوں کے دور میں اس سے جائیداد پر اختیار مراد نہیں لیا جاتا تھا بلکہ اس کا مطلب کسان کی پیداوار پر موروثی حق تھا۔ یہ عام طور پر مال گذاری کا دسواں حصہ ہوتا تھا۔

10.9 مشقیں

(1) کس حد تک جاگیرداری کا یوروپی ماڈل ہندوستانی تناظر سے مطابقت رکھتا ہے؟

(2) جاگیرداری کے تعلق سے مباحثہ میں حالیہ انکشافات کا تجزیہ کیجئے۔

10.10 معاون کتب

چکورتی، رنبیر (2002)، ٹریڈاینڈ ٹریڈرس ان ارلی انڈین سوسائٹی، نئی دہلی۔

ڈینئیل، جون (1990)، لیونگ وداوٹ سلور: دی مونیٹری ہسٹری آف ارلی میڈیول نارتھ انڈیا، نئی دہلی۔

جھا۔ڈی۔این، (مرتبہ) (2000)، دی فیوڈل آرڈر: اسٹیٹ، سوسائٹی اینڈ آئیڈیالوجی ان ارلی میڈیول انڈیا، نئی دہلی۔

کوسامبی۔ڈی۔ڈی (1956)، این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری، بمبئی۔

کلکے۔ہرمان۔(مرتبہ) (1994)، دی اسٹیٹ ان انڈیا، 1700-1000 اے۔ڈی، نئی دہلی۔

مکھیا، ہربنس، (مرتبہ) (1999)، دی فیوڈل ازم ڈبیٹ، نئی دہلی۔

شرما۔آر۔ایس (1965 اور 1980)، انڈین فیوڈل ازم، نئی دہلی۔

شرما، آر۔ایس۔(2001)، ارلی میڈیول انڈین سوسائٹی: اے اسٹڈی ان فیوڈالائزیشن، اورینٹ لونگ مین، کلکتہ۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU
Accn. No MA-026
Date 03.08.2015
HYDERABAD

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU
IMC LIBRARY
Hyderabad-32

اکائی 11 زرعی اور دستکاری پیداوار کی تنظیم: شمالی ہند

550 عیسوی سے 1300 عیسوی

ساخت

11.1 تعارف

11.2 زراعت کا رقبہ اور توسیع

11.3 سینچائی

11.4 فصلیں

11.5 دستکاری پیداوار

11.6 دستکاری پیداوار کی تنظیم

11.7 خلاصہ

11.8 مشقیں

11.9 معاون کتب

11.1 تعارف

ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں زراعتی تاریخ کے مطالعہ میں زرعی معاملات کے مختلف موضوعات، زرعی پیداوار کے پہلوؤں جس سے ہم اس یونٹ میں بحث کرنے جا رہے ہیں پر نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔ یو۔این۔گھوشال کی اولین تحقیق ''کنٹری بیوشنز ٹو دی ہسٹری آف ہندو ریوینو سسٹم'' سے لے کر آر۔ایس۔ شرما کی انڈین فیوڈل ازم تک اور اس کے بعد ہماری سوچ وفکر کے مرکز پر زرعی تعلقات کی تاریخ سے جو اضافی زرعی پیداوار کو مالکوں سے علیحدہ کرنے کے طور طریقہ (بطور محصول) اور اس کی تقسیم، اس کے علاوہ وہ تمام طریقہ جس سے زمین کے اور اس کے مالکوں پر کنٹرول دکھایا گیا ہے (زمین کی ملکیت)، زرعی پیداوار سے متعلق کوئی تقابلی توجہ نہیں دی گئی ہے جیسے کہ زمین اور اس کی پیداواری قوت، فصلیں، پیداوار کی ٹیکنالوجی وغیرہ۔ بعض اہم مقالے اس موضوع پر ضرور لکھے گئے ہیں لیکن کوئی باقاعدہ کوشش زرعی پیداوار کی تاریخ لکھنے پر نہیں کی گئی ہے۔ ہاں محصول کے نظام یا جاگیرداری زراعت کے تانے بانے پر۔ بلاشبہ تفصیلی بحث ومباحثہ کی تاریخ موجود ہے کہ کیا وہ تانا بانا جاگیردارانہ یا کوئی اور نظام تھا۔ زرعی پیداوار پر تفصیلات جمع کرنا، جیسا کہ اس دور کے معاشی تاریخ میں عموماً دکھائی پڑتا ہے مگر اس کا تاریخی تجزیہ نہیں ہو سکا ہے۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کے معدنیات اور دستکاری صنعت وحرفت کی تاریخ، جو اس یونٹ میں ہمارا دوسرا پڑاؤ ہے اس کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہے بوجہ تقریباً مکمل غیر زرعی معاشی تاریخ کے مکمل تسلط سے جو شہریت اور تجارت جیسے دو مطمع نظر کی وجہ سے۔ درحقیقت چند ہی مستقل مطالعہ نظر آتے ہیں جو زرعی پیداوار کے علاوہ ہیں جو شہری یا تجارت کی تاریخ سے ملحق ہیں۔

تاریخی تحقیقات میں مذکورہ بالا طریقہ کار کی مؤرخوں کے ذریعہ بعض موضوعات کو ترجیحی بنیاد پر اختیار کرنے سے اور دوسرے موضوعات کو ناقابل توجہ سمجھ کر چھوڑ دینے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب، عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے تاریخ داں کو مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جنہوں نے ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں دستکاری کی صنعت کی ٹیکنالوجی میں حد درجہ رجحان کو اس دور کے ماہرین تاریخ داں جو خاطر خواہ، اہمیت نہیں دی ہے۔ برعکس اس کے

حبیب صاحب نے ابتدائی عہد وسطیٰ کے دور میں زراعت کے پھیلاؤ میں کم توجہ مبذول کی جو کہ دوسروں کے یہاں بالکل ناگزیر ہے۔

دوسری وجوہات جو مورخوں کے ترجیحات کی بنیادی وجہ سے الگ ہیں۔ پہلی اور سب سے اہم وجہ کتباتی ماخذوں کی نوعیت جس پر تاریخی تعمیر نو کی اہم بنیاد ہے۔ اس دور کے کتبات جن کو عطیہ اراضی کے کتبات کہا گیا ہے جس میں بے ضابطگی کے اور خال خال حوالے میں زرعی اور غیر زرعی پیداوار، ایک چھوٹا سا لیکن انتہائی اہم کتبات کا مجموعہ غیر زرعی پیداوار کی تقسیم سے متعلق ہے اور ان کا بھرپور استعمال شہری اور تجارتی تاریخ نویسی میں کیا گیا جس میں جیسا کہ اوپر بتایا گیا، معدنیات اور دستکاری پیداواروں سے برائے نام بحث کی گئی ہے۔

کتبات پر مکمل انحصار کی دو وجہ سمجھ میں آتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو سچائی ہے اور دوسری (غلط) یقین۔ سچائی یہ ہے کہ آثار قدیمہ کی ناقص تفصیلات جو کہ عہد وسطیٰ میں آثار قدیمہ سے جڑے اکثر و بیشتر محققین کی عدم دلچسپی۔ اور ہر چہار جانب ایک ایسا یقین کہ تاریخ نویس ادبی ماخذوں سے کچھ خاص نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ ہے کہ ان ماخذوں کا جتنا استعمال ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب مزید اس میں کچھ نہیں بچا۔ اب جو کچھ حاصل ہونا ہے وہ دوسرے ذرائع سے بشمول ان ادب ماخذوں کے جن کا ابھی تک انکشاف نہیں ہو سکا ہے۔ سچائی اس سے بالکل جدا ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے ادبی ماخذوں کے عظیم ذخائر میں سے صرف ایک معمولی سا حصہ سماجی اور معاشی تاریخ کی تعمیر نو میں استعمال ہوا ہے جیسے کہ راج ترنگنی اور مارکو پولو کی (تیرھویں صدی) تصنیف اور عرب جغرافیہ دانوں کی تصنیفات (851 عیسوی کے بعد) یہاں تک Xuan Zang کی تصنیف کا زیادہ تر حصہ کھنگالا جانا باقی ہے۔ یہاں تک ساتویں صدی عیسوی میں زرعی پیداوار کی توسیع اور اس کے طور طریقے سے متعلق علم درکار ہے۔ یہاں تک کہ تھوڑا بہت حوالہ ابھے کانت چودھری جیسے اسکالروں کے ذریعہ ادبی ماخذوں کے جم غفیر میں سے دیا گیا ہے (ارلی میڈیول ولیج نورتھ ایسٹرن انڈیا)۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ماخذ معاشی مورخین کے استعمال کے لئے ہیں۔

جب آپ ہماری معلومات جو ہم نے ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں زرعی اور دستکاری پیداواروں کے متعلق سروے سے کر کے دی ہے تو اس سے آپ کے ذہن میں وہ بات جو ہم نے اوپر کہی ہے، مستحضر ہو جائے گی اس گنجائش کے ساتھ کہ ابھی اس میں بہت کچھ جاننا باقی ہے۔

11.2 زراعت کا رقبہ اور توسیع

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور میں زرعی زمین کی منظر کشی بطور عطیہ دی گئی زمینوں کے کتبہ میں بہت ہی انوکھے ڈھنگ سے کی گئی ہے۔ گو کہ اس کا چلن ابتدائی صدیوں میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن مؤثر انداز سے اس کا تذکرہ اسی دور میں ملتا ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ میں شمالی ہند کے طول و عرض سے ہمیں سیکڑوں ایسے کتبے ملے ہیں۔ گو کہ ان کی تعداد اور ان کے مضامین میں زمانہ اور وقت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ پھر بھی مؤرخین ان حقائق سے اتنے متاثر نظر آتے ہیں کہ انہوں نے اسی کو زرعی تاریخ مان لیا ہے۔

تاریخی دستاویز میں پہلی بار بہت سے گاؤں کے ایک ساتھ ظہور پذیر ہونے سے یہ مان لیا گیا کہ زرعی محرکات پر سب سے زیادہ اثر اسی بات کا ہے جیسا نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کے دور میں دکھائی پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر عہد موریہ کا معاشی اسٹیٹ کنٹرول اور اسٹیٹ پیش قدمی کا نتیجہ مانا جاتا ہے۔ اسی طرح عہد کشان کی معیشت تجارتی اور شہری فروغ کا ذریعہ مانی جاتی ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کی معیشت پر زمین بطور عطیہ دئے جانے کو ہی زرعی وسعت کی بنیادی وجہ سمجھا جاتا ہے۔ سینٹرل انڈیا، اڑیسہ اور مشرقی بنگال میں زمین کا عطیہ ہی خصوصی محرک تھا غیر کاشت زمین کو لائق کاشت بنانے کا۔ جنوبی ہند کے بارے میں بھی یہی سچ ہے، (شرما 1980)۔ زمین کا عطیہ، سیاسی معیشت کو بتدریج کاشتکاری معیشت میں تبدیل کر دیا۔ غیر مزروع زمین جو کہ نظریاتی طور پر اسٹیٹ کی ملکیت ہے۔ اور جو کہ گھاس گھر اور جنگل پر مشتمل ہوتی ہے ان زمینوں کو بطور عطیہ دینے کے پیچھے عطیہ دینے والے کے پیش نظر اس کی صفائی، ستھرائی مقصود ہوتی ہے۔ تاکہ مابعد اسے کھیتی باڑی کے لائق بنا کر اس سے مالگزاری وصول کی جا سکے (رومیلا تھاپر 2002)۔ زیر بحث دور (ابتدائی عہد وسطیٰ) میں زرعی معاشرہ میں زبردست پھیلاؤ اور وسعت دکھائی پڑتی ہے۔ شاہی کوپر پلیٹ کے ذریعہ مذہبی اداروں کو دئے جانے والے زمین کے عطیہ سے اب تک غیر کاشت اور غیر آباد جگہوں میں زراعت کے پھیلاؤ کے طور طریقے کی وجہ سے پیچھے پوشیدہ راز کو سمجھا جا سکتا ہے۔ (رنبیر چکرورتی 1997)۔

یہی وجہ ہے کہ جن علاقوں سے متعلق زمینی عطیہ کے کتبے موجود نہیں ہیں ان علاقوں کی زراعتی تاریخ بھی نامکمل ہے۔ مثال کے طور پر پنجاب کا علاقہ، ان علاقوں سے متعلق زمینی عطیہ کے ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے اور دوسرے ثبوتوں کے ناپائے جانے کی وجہ سے اس علاقے میں عہد سلطنت سے پہلے پیشہ زراعت کی اہمیت سے انکار کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 'پنجاب ابھی تک (لگ بھگ 1300 عیسوی) زرعی پیداوار کا اہم مرکز بن کر نہیں ابھرا تھا، جیسا کہ بعد میں بنا۔ لیکن اس کی کشش گنگا کے میدانوں اور شمال مغرب اور اس کے پار کے علاقوں کو جوڑنے والے راستوں کے مرکزی نقطہ کے تانے بانے میں تھا (رومیلا تھاپر 2002)۔

زمینی عطیہ ہی کو ابتدائی عہد وسطیٰ میں زمین کو زیر کاشت لانے کی بنیادی وجہ تصور کر لینا بہت بڑی بھول ہے۔ یہ اس حقیقت کے منافی ہے کہ زیادہ تر زمینی عطیہ ان گاؤں سے متعلق ہیں جو پہلے سے آباد ہیں اور ان زمینوں کے ہیں جو بذات خود زیر کاشت ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زراعت خود بخود پھیل رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں وجود پذیر ہو رہے تھے زمینی عطیہ کے کتبے جو پائیدار مادہ جیسے کہ پتھر اور تانبے کے ہیں اور بطور تاریخی دستاویز کے پچھلے ہزار ہا سالوں کے مل رہے ہیں یہ صرف چند ایک جگہوں اور علاقوں سے متعلق ہیں۔ پس یہ بات واضح ہوگئی کہ زمین کا بطور عطیہ دیا جانا زراعت کے پھیلاؤ میں کوئی رول ادا نہیں کرتا ہے۔

یقیناً ہمارے پاس ایسی مثالیں موجود ہیں جو زمینی عطیہ کے زمرے سے الگ ہیں۔ چند ایک مثالیں، جس پر ابھی گفتگو کی جائے گی۔ کہ اسٹیٹ نے غیر کاشت شدہ پلاٹ یا اجڑے گاؤں کو بطور عطیہ دیکر اس کو لائق کاشت بنانا چاہا اور جب عطیہ پانے والے کو آباد ہونے پر مجبور کیا تا کہ وہ گرانٹ سے فائدہ پا سکے۔ اس کے برعکس ایسی مثالیں اس سے کہیں زیادہ ہیں جس میں انفرادی نوعیت کے عطیہ سے غیر مزروع زمین جو کبھی لائق کاشت تھی اس کو پھر سے کاشت کے لائق بنایا گیا۔ پھر بھی یہ سب یکجا کر دینے کے باوجود تمام زمینی عطیہ کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جیسا کہ یہ بات واضح ہوگئی کہ زمینی عطیہ کے کتبے اس بات کو ثابت نہیں کر سکتے ہیں کہ عطیہ پانے والے محرک تھے زمین کو زیر کاشت لانے کے۔ جیسا کہ سیکڑوں آباد گاؤں کو دیکھنے سے اس کے برخلاف نظر آتا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ بیرون شہر کا علاقہ پھیلنے لگا، جنگل کاٹ دئے گئے، بنجر زمین آباد ہوگئی اور یہ سب کچھ عطیہ دینے والوں کے کسی رول کے ادا کئے بغیر ہو رہا تھا۔

ہندوستان کے ابتدائی عہد وسطیٰ میں زراعتی نقشہ کا ایک بہت ہی انوکھا خاکہ ہے جو کہ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل سے تعلق رکھتا ہے اور جسے Xuan Zang چائنا کے زائر سیاح نے تیار کیا ہے۔ انہوں نے مثال کے طور پر پنجاب کے میدانی علاقوں سے متعلق بتایا ہے کہ وہاں بہت ساری ریاستیں تھیں جو بہت بڑے بڑے حلقوں کی مالک تھیں۔ جیسے تکا (Takka) چیناپٹی۔ جالندھر اور شتادرو یا ستلج۔ ان ریاستوں میں زمین کی زرخیزی، اجناس خوردنی اور پھلوں کے پیڑوں سے متعلق حوالہ جات ملتے ہیں۔ یہ سب اس بات کے ثبوت ہیں کہ پنجاب ساتویں صدی عیسوی میں کاشت کے میدان میں بہت آگے تھا نہ یہ کہ وہ صرف تجارتی راستوں میں واقع مراکز تھے (جیسا کہ تھاپر اور شرما کا خیال ہے)۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غیر کتباتی ماخذ ایسے خیالات کو درست کر سکتے ہیں جو زمینی عطیہ کے کتبوں سے پیدا شدہ منفی خیال پر مبنی ہے۔

Xuan Zang کا اکاؤنٹ بھی زرعی پیداوار کے پھیلاؤ کا لیکن زیادہ مکمل تصویر پیش کرتا ہے جتنا کہ انفرادی کتبوں (شمالی ہند کے تمام وقوع) کے ثبوتوں کے یکجا کر دینے سے جانا جا سکتا ہے۔ اس کے ہندوستان آنے کے وقت زرعی خطوں کا بہت بڑا علاقہ وجود پذیر ہو چکا تھا جیسے کہ شلا اور شمال مغرب میں کشمیر، متھرا، استھان وشورا، کنیا کبجا، ایودھیا کوشامبی، شراوستی اور وارانسی: ویشالی وریجی، مگدھ، مونگیر گنج گالا، پندرور دھن، تمرالپتی، کرنا سورنا اور کامروپ مشرق اور شمال مشرق میں مالوہ، جھوتی، انند پورا کھیدا اور ولابھی سینٹرل اور مغرب ہند میں۔ یہ بات کہ کوئی جگہ جب کسی مخصوص علاقہ سے پہچانی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے وہ علاقہ بالکل آباد ہے اور اس کی ایک پہچان بن چکی ہے۔ درحقیقت Xuan Zang ایسے بیشتر علاقوں کے بارے میں اپنا تخمینہ پیش کرتا ہے جو اس کے آباد شدہ کردار کو بتلاتا ہے۔ مثال کے طور پر جالندھر کا علاقہ 1000li مشرق سے مغرب تک اور 800li شمال سے جنوب اور ملتان کا علاقہ 4000li کے حلقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ ان علاقوں کی زرعی خصوصیت کو مختلف طریقوں سے بتایا گیا ہے بعض علاقوں (استھان وشورا اور ملتان) کی زمین کو بہت عمدہ اور زرخیز بتائی گئی ہے اسی طرح بعض علاقوں کو کنیا کبجا، ملتان کو مستقل پیداواری علاقہ بتایا گیا ہے اسی طرح بعض کے بارے میں اچھی یا بری فصل کے تعلق سے بتایا ہے۔

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ Xuan Zang کا اکاؤنٹ محتاط مشاہدوں اور خالی خولی بیان بازی سے ہٹ کر ہے۔ ان کی باریک بین نگاہ نہ صرف زراعت تک محدود ہے بلکہ ہر چیز کو بہت باریکی سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ جنگل کے تسلسل کو بھی اس انداز سے بیان کیا ہے جو اپنے آپ میں جاذب نظر اور دلکش ہوگیا ہے۔ پنجاب میں جالندھر کے علاقہ میں درختوں کے جال کی خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے۔ اور اڑیسہ میں خشکی کے مناظر کو جنگلوں سے گھرا ہوا دکھایا ہے۔ ادھر کونگوڈا علاقہ میں جنگل ہی جنگل نظر آتا ہے جس کو آگے چل کر کلنگ علاقہ میں پھیلے جنگل سے علیحدہ دکھایا ہے۔ اسی طرح کالنگا اور جنوبی کوشالہ (چھتیس گڑھ کا علاقہ) کے بیچ میں پہاڑوں اور جنگلوں کو دکھایا ہے۔ جبکہ اسی جنوبی کوشالہ کے بارے میں گھنی لکڑیوں والا اور دلدلی علاقہ بتایا ہے۔ کونکن اور مہاراشٹرا بھی جنگلوں سے پُر دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح کوسامبی اور پریاگ کا درمیانی حصہ، وارانسی اور کوشی نگر کا درمیان حصہ اور مگدھ اور مونگیر کا درمیان حصہ بھی وسیع وعریض جنگلوں کا علاقہ بتایا ہے۔

پھر اس کے علاوہ ایسے علاقوں کا ذکر ہے جس میں زراعت کا پیشہ کم اہمیت رکھتا ہے، چنانچہ وادی سندھ کے نچلے حصہ کا بہت بڑا علاقہ مویشیوں کی چراگاہ تھا اور وہی وہاں کے لوگوں کا ذریعہ معاش تھا۔ گجرات کے بعض علاقوں کے بارے میں بھی زرعی قلت کا علاقہ بتایا ہے اور وہاں کی تجارت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ پنجاب کے بارے میں انہوں نے کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ کپل وستو اور رام گرام جیسے علاقوں کے بارے میں جس کو سنسان اور غیر آباد یا کم آباد علاقہ بتایا ہے وہاں زراعت کا پیشہ نا قابل توجہ بتایا ہے۔

چائنا کے اس صاحب ادارک مشاہد کے وسیع تر مشاہدے کے سامنے عطیہ میں دی گئی زمین کے کتبوں کی اہمیت نہ کہ برابر رہ جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں Xuan Zang کی غائرانہ نظر کو کتبوں پر ابھرنے والے لکیروں سے تقویت ملتی ہے۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتبے زیادہ تر حالات میں اس بات کے ثبوت ہیں کہ زرعی وسعت ماقبل گرانٹ ملنے کے عمل ایک تمام شدہ عمل ہے۔ نہ کہ ایک ایسا عمل جو مابعد عطیہ شروع کیا جائے گا۔ یقیناً کچھ مثالیں ایسی ضرور ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ گرانٹ غیر کاشت زمین کی دی گئی جس کے پیچھے دینے والے کا مقصد اس زمین کو قابل کاشت بنانا تھا۔ ان حالات میں زمین کے عطیہ کو بطور زمین کی صفائی کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال ہے وسط ساتویں صدی عیسوی کے بنگلا دیش کے لوکا نتھا کو پر پلیٹ کے کتبے کی جس میں سو سے زیادہ برہمنوں کو جنگل پر مشتمل زمین کا ایک بہت بڑا خطہ دیا گیا، اس خطہ کی قدرتی یا مصنوعی کوئی اہمیت نہیں تھی صرف گھنی جھاڑیوں اور بیلوں سے گھرا ہوا جہاں ہرن، بھینس، بھالو، چیتا اور سانپوں کا گڑھ تھا، برہمن عطیہ داروں نے یقیناً اس خطے کی آبادکاری پر توجہ دی ہوگی۔

مشرقی ہندوستان کی بہت سی دوسرے اقسام کی زمینوں کا تذکرہ ملتا ہے جہاں عطیہ داروں کو غیر مزروع Fallow land زمین دی گئی۔ Fallow land وہ زمین تھی جو کبھی زیر کاشت تھی مگر بعد میں لائق کاشت نہیں رہی۔ اس طرح کی قسم کی زمین کو خلاء (Khila) کہتے ہیں۔ جنوبی ایشیا اور دوسرے علاقوں کی زراعت کی تاریخ ہمیشہ پھیلاؤ اور تسلسل کی تاریخ نہیں رہی ہے۔ وہاں جمود اور انضباط کا دور بھی گذرا ہے جب آبادی سکڑ گئی تھی قحط کی وجہ سے یا جنگ کی وجہ سے۔ ان حالات میں آبادکاری رک جائے گی اور زمین بنجر ہوجائے گی (جس کو خلاء (Khila) کہا گیا ہے۔ ایسی خلاء زمینوں کا مطلب ہے سرکار کو مالگذاروں کا نقصان جس نے اس پر سرکاری جائداد کے طور پر اپنا قبضہ رکھا اور جن کا مطمح نظر تھا اس میں خزانہ ادا کرنے والے کسانوں کے ذریعہ اس میں کاشت کو بحال کرنا۔ اس قسم کے کام یقینی طور پر ضابطے کے مطابق انجام پاتے رہے ہوں گے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ان چیزوں کے تذکرہ پتھر یا تانبے کے پلیٹوں پر ملے۔

جو کچھ ہم کتبوں پر لکھتے ہیں وہ مخصوص نوعیت کا ہے۔ جب کسی شخص واحد نے کچھ مذہبی مراعات حاصل کرنے کی غرض سے سرکاری مشینری سے خلاء زمین کچھ فیصد کے عوض میں عطا کرنے کی درخواست کی ہے اور جس نے بعد میں اسی زمین کو کسی برہمن کو یا کسی مذہبی ادارے کو بطور ہدیہ دے دیا ہو۔ عطیہ پانے والے نے یقیناً اس زمین کو لائق کاشت بنایا ہوگا اور اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کو سرکار کو کوئی خزانہ ادا کئے بغیر اپنے مصرف میں لایا ہوگا اس نوعیت کی کاروائی

زرعی غلبہ کی نشاندھی کرتی ہے جو ذاتی پیش قدمی کا نتیجہ ہوسکتا ہے سرکاری مداخلت کے بغیر۔ مزید براں اس طرح کی ہر ایک مثال یہی دکھاتی ہے کہ پہلے اس زمین کو لائق کاشت بنایا بعد ازاں اس کو اس کی پہلی حالت پر واپس لانا کسی بھی گراف پہ یہ واقعات خط منحنی نہیں دکھائیں گے بلکہ ایک سطح لائن پر انگریزی حرف v کی شکل ہی دکھائیں گے۔

عقل اس کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ اس طرح کے آباد گاؤں میں کچھ بنجر زمین بھی رہی ہوگی اور اس کے علاوہ دوسرے اقسام کی بھی جو کسی وجہ سے لائق کاشت نہ ہو، خواہ گاؤں کے اندر ہو یا گاؤں سے باہر۔ حتی کہ ایسی زمین بھی جو مویشیوں کے لئے بطور چراگاہ استعمال ہوتی ہو یا کوئی ایسا خطہ بھی جو جنگل کے زمرے میں آتا ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تک کہ آباد گاؤں کے اندر بھی ایسی زمینوں کا ہونا ناگزیر ہے جو مختلف وجوہات کی بنا پر زیر کاشت لائی جاسکتی ہے۔ 14-1213 عیسوی کی کانکیر کوپر پلیٹ پر مندرج کتبہ جو سینٹرل انڈیا سے دستیاب ہوا ہے اس میں گاؤں سے حاصل ہونے والے مال گذاری (Ravenue yield) میں اضافہ کو دکھایا گیا ہے۔ مالگذاری میں اضافہ کا مطلب ہے کم کاشت کے دائرے میں وسعت، جس سے خود بخود اس کی حد بندی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہوگا۔ اسی طرح کے اضافہ ہم کو دوسرے گاؤں کے ریکارڈ کو دیکھنے سے پتہ چلتے ہیں۔

اس کے لئے ثبوت ملتے ہیں (زمین کو کاشت میں لانا یا اس میں کاشت کرانے کا حق Krsatah/karsayatah) جس میں آباد (Settled) گاؤں کے عطیہ پانے والے کو اختیار دیا گیا ہے کہ اس بنجر اور بیکار زمین کو زیر کاشت لانے یا کرانے کا خواہ جو پہلے سے موجود ہوں یا جو بعد میں وجود پذیر ہو۔ عطیہ دہندہ کے پیش نظر ایسی زمینوں کو زیر کاشت لانے کے پیچھے یقیناً یہی مقصد پوشیدہ رہتا ہوگا کہ اس سے آمدنی میں اضافہ ہو۔ اس کے برعکس غیر کاشت زمین کا عطیہ دینے کی صورت میں آباد گاؤں کے عطیہ پانے والوں سے اس کا تقاضہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسے زیر کاشت اور لائق کاشت بنائیں۔

11.3 سینچائی

اگر زمینی عطیہ کے کتبے ہمیں زرعی پیداوار کو بڑھاوا دینے میں ریاست کے کردار کے بارے میں خاموش ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ریاست نے اس سمت میں کوئی رول ہی نہیں ادا کیا۔ کلہن کی راج ترنگنی بارہویں صدی عیسوی کا ایک غیر مکتوبہ (Non-epigraphic) ماخذ ہے اس میں قدرے تفصیل سے بتایا ہے کہ ابتدائی عہد وسطی کی ریاست نے مذہبی رہنماؤں اور اداروں کو غیر کاشت زمینوں کے لئے پتھر اور تانبے کے کتبے جاری کرنے کے ماسوا کتنے وسیع پیمانے پر دیگر ذرائع سے زراعت کے پیشے میں معاونت کی اس ماخذ کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی میں راجہ للیتا دیتا مکتا پیڈ انے وتاستا (جھیلم) ندی کے پانی کو خاص مقام پر منقسم کیا اور بڑی تعداد میں گاؤں کے لوگوں میں پن چکی (araghattas) تقسیم کی۔ بعد کی صدیوں سیلاب کو روکنے کے طور طریقے سے متعلق میں ریاست کا اور بھی زیادہ انہماک نظر آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ زمین زیر کاشت لانے سے متعلق اور سرکاری مشینری سویا (Suyya) کے ذریعہ نہروں کا جال بچھا دینے سے متعلق۔ کلہن نے Suyya کے تدابیر کے گہرے اثرات پر خاص روشنی ڈالی ہے۔ جہاں پہلے کبھی افراط کے زمانے میں چاول کے ایک کھری Khari کی خرید قیمت دوسو دینار تھی، ٹھیک اسی زمانے میں کشمیر میں چاول کے ایک کھری Khari کی خرید قیمت 36 دینار تھی۔

سندھ کے علاقے میں بھی سینچائی کی سہولیات کے متعلق آٹھویں صدی عیسوی میں تفصیلات ملتی ہیں جب عربوں نے سندھ کو فتح کیا۔ ایسا پتہ چلتا ہے کہ ریاست کے ذریعہ چلائی گئی نہروں کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور انفرادی طور پن چکی جیسی سہولیات فراہم کی گئیں۔

راج ترنگنی میں اراگھٹا (پن چکی) کا جو ذکر ملتا ہے اور جس کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔ وہ ندی کے پانی کو منقسم (Diversion) سے متعلق ہے۔ راج ترنگنی میں کنوؤں پر اراگھٹا (پن چکی) بنائے جانے کا خصوصی ذکر ہے (راج ترنگنی 48، VI، 1.284)۔ ندی اور کنوؤں کے ساتھ اراگھٹا (پن چکی) کے اجتماع سے فارسی پہیہ یا ہندی میں رہٹ (اراگھٹا یا اراہٹ سے ماخوذ) سے تین درجوں کی تاریخی حیثیت والے آلے کی شروعاتی دو مرحلہ کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے مرحلہ میں ڈول کو پہیہ کے حلقہ سے جوڑا گیا جس کو سطح آب پر متعین کیا گیا جیسے جیسے پہیہ گھومتا تھا پانی سے بھرا ڈول یکے بعد دیگرے گرتا رہتا، یہ اس آلہ کا پہلا مرحلہ تھا جس کو انگریزی میں نوریا (Noria) کہا جاتا ہے۔

دوسرے مرحلہ میں ڈول کو پہیے کے حصّہ سے نہیں جوڑا گیا بلکہ ایک لمبی رسی سے جوڑا گیا جس کو بطور چین استعمال کیا اور جس کو پہیہ کے اوپر ہار کی مانند لٹکا دیا گیا۔ ڈول کے ساتھ اس رسی کی چین کو بجا طور پر ڈول کا ہار کہا گیا ہے۔ جب پانی کے پہیہ کو کنویں کے اوپر ایک مناسب اونچائی پر رکھا جائے گا تو لٹکتے ہوئے ڈول کی مالا کا نچلا ڈول کنواں کے پانی میں ڈوبا رہے گا۔ اب کنواں کا استعمال سینچائی اور دوسرے کاموں کے لئے چکی کو گھما کر کارگر طریقہ پر ممکن ہو سکا۔

اراگھٹا کی دوسرے مرحلہ کی تاریخ کی صرف ہند کے ابتدائی ادب سے تصدیق ہوتی ہے (جیسے پنچ تنتر میں)۔ بلکہ گجرات اور جنوبی راجستھان کے ابتدائی عہد وسطی کے کتبوں سے بھی اس کی تصدیق وتوثیق ہوتی ہے۔ کنوؤں کے اوپر ان اراگھٹوں کو عملاً ہاتھ سے یا پاؤں سے چلایا جاتا تھا اور جب اس کو جانوروں کے ذریعہ Gearing تکنیک سے چلایا جانے لگا تو پانی کے پہیہ کی تاریخ تیسرے مرحلہ میں داخل ہوئی بابر نامہ میں اس کی بڑی تفصیل ملتی ہے۔ دسویں صدی کے ہندوستان میں اس کے وجود کے بارے میں کئے گئے دعوے کو حبیب صاحب نے تردید کی ہے۔ اور اس تردید کی آج تک کسی کے جھٹلانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

کنوؤں اور ٹینکوں سے متعلق مختلف علاقوں کے کتبوں سے بہتر ے حوالے جات ملتے ہیں، خاص طور سے گجرات سے مخصوص قسم کے سیڑھی نما بڑے کنوؤں کا۔ جس کو واپی (Vapi) یا سیڑھی دار کنواں (Step well) کہا گیا ہے، کتباتی ثبوت ملتے ہیں۔ البتہ یہ تمام کنوئیں اور ٹینک سے فصلوں کو پانی دینے کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ عام طور سے مورخوں نے بغیر چھان بین کے لکھ مارا ہے۔ تمام کے تمام واپی (Vapis) جس کے ثبوت کتبوں میں ملتے ہیں اس کو زرعی پہیئے سے جوڑا گیا۔ یہاں تک کہ واپی (Vapi) کا ترجمہ بھی سینچائی کے کنوؤں سے کر دیا گیا۔ جیسا کہ گجرات کے متیرا کا حکمراں کے ایک کتبے کو بطور ثبوت پیش کیا ہے (Epigraphia Indica, XI p108)۔ حالانکہ واپی (Vapi) کا استعمال غیر زرعی مقاصد کے لئے بہت عام تھا۔ بالکل اسی طرح یہ خیال بھی غلط ہے کہ مالوہ میں بھوجپور جھیل کو زرعی پیداوار کو بڑھاوا دینے کے لئے بنایا گیا تھا۔

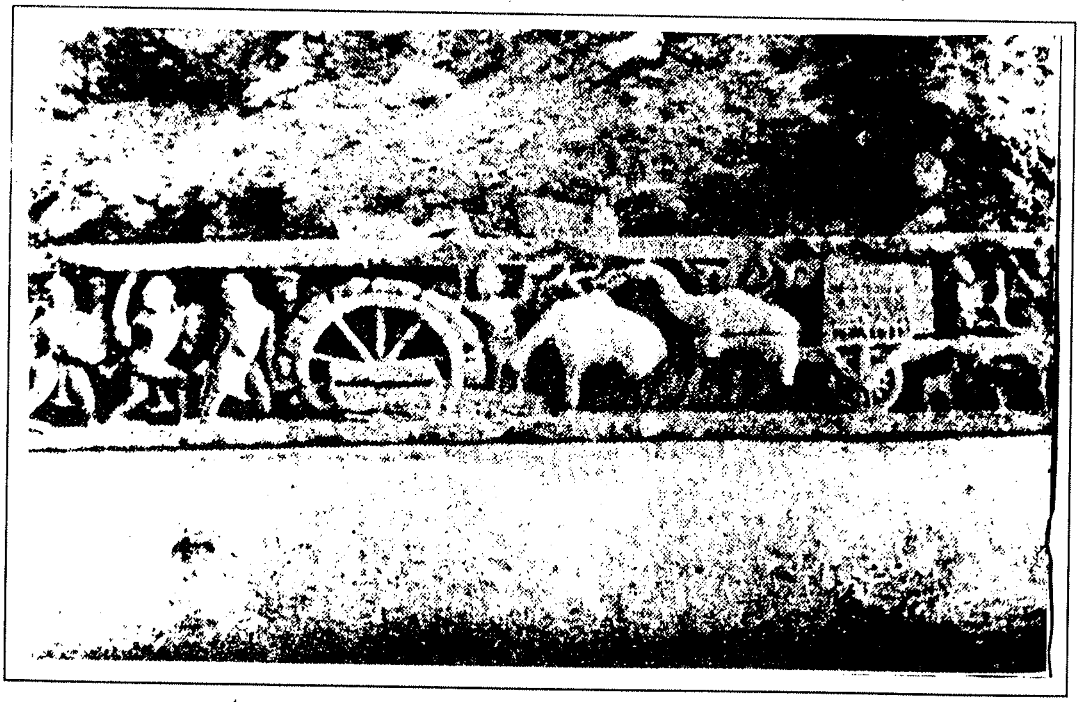

اراگھٹا: منڈور درگاہ کی اوپری منزل کے شمال جانب کا ایک نقشہ، 1200A-D ایس۔ پی۔ ورما۔ انڈیا ایٹ ورک ان اسکلپچر اینڈ پینٹنگ، علیگڑھ۔ 1994

عام طور پر پانی کے ذرائع کا زرعی استعمال کتبوں کے سیاق وسباق میں تجزیہ کر کے واضح کیا گیا ہے جو کہ معمولی شک کے دائرے سے بھی باہر ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا متیر کا ریکارڈ کے مطابق دو واپی (Vapi) بھی عطا کئے گئے علاوہ 240 تخمینۂ اراضی عطیہ بطور برہما دیا (Brahmadeya)، دو برہمنوں کو مزید عطیہ شدہ اراضی کی کاشت کا حوالہ بھی موجود ہے۔

مغربی ہند کے نیم خشک علاقوں میں بھی سینچائی کے ان آلوں کے استعمال نے یقیناً کاشت کو محفوظ بنا دیا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر دو حصوں کی کاشت کو ممکن بنایا جیسا کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہو رہا ہے۔ میواڑ کے ساتویں صدی عیسوی کے ایک کتبے میں قابل کاشت زمین کی حدود میں اراگھٹا اور ٹینک کا حوالہ ملتا ہے اس میں سے کچھ کے بارے میں سال میں دو فصلوں کی پیداوار کا بھی پتہ بھی ملتا ہے۔

اڑیسہ کے ابتدائی عہد وسطی کے کچھ کتبوں میں سینچائی کے بہترین نظم کو دکھایا گیا ہے۔ ایک ایسے ہی کتبہ میں ایک ہالہ (Hala) قابل تخمینہ اراضی کے عطیہ کا حوالہ ہے (اراضی جو ایک ہل سے ایک دن میں جوتی جا سکے)۔ جس میں سے اس کا اختیار ہے کہ تنکنا ٹینک سے سینچائی تب تک کرتا رہے جب تک فصل پک نہ جائے۔ ایک دوسری مثال ملتی ہے جس میں ایک برہمن کو بطور عطیہ اراضی کے ساتھ چشمہ بھی دیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ گرمیوں میں خطہ کے دوسرے کنبوں کو بھی پانی لینے دیا جائے۔

اگر کہیں پانی کے ذریعہ کا حوالہ ہمارے ماخذوں میں نہ بھی ملے تو سینچائی کے دوسرے طریقوں کے حوالوں کے ملنے کا امکان موجود ہے۔ ابتدائی عہد وسطی کے مختلف قسم کے ماخذوں، کتاب اور کتبوں دونوں میں شمالی ہند میں گنّے کے کاشت کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ جیسا کہ وسط گنگا کے میدانی حصے کے باہر (بہار اور اتر پردیش) گنّے کی سینچائی ضرور ہوتی ہوگی۔ گنّے کی کاشت سینچائی کی موجودگی کو واضح کرتی ہے۔ مثال کے طور پر چندیلا راجاؤں کے کتبے ایسے حوالوں سے بھرے پڑے ہیں کہ جس میں ابتدائی عہد وسطی میں بندیل کھنڈ میں گنّے کی کھیتی ہوتی تھی۔ اس خطہ کی طبعی ساخت ٹینک کی سینچائی کی متقاضی ہے بغیر کسی ادنی جدوجہد کے چونکہ مختلف اوقات میں برسات کا پانی کی ضرورت ہی رہتی ہے۔ ٹینک سے سینچائی کے متعلق کھدائی سے ملنے والے ثبوت جو کہ روایتی طور پر عہد وسطی سے متعلق ہیں وہ ہمارے علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

سینچائی کی تمام تر اہمیت کے باوجود سینچائی کے طور طریقوں سے جملہ فصل کے کھیتوں کی صرف تھوڑے سے حصہ کی آبیاری ہو پاتی ہوگی جیسا کہ یہ صورتحال بہت بعد کے دور تک جاری رہی۔ زمین کا بہت بڑا حصہ نہ صرف بارش پر منحصر رہتا تھا بلکہ سیلاب کے پانی کے ذریعہ زیر آب ہو جانے پر بھی منحصر رہتا تھا۔ اس وقت یقیناً سیلابی پانی کے تحت آنے والا علاقہ بہت بڑا علاقہ رہتا ہوگا جو کہ اب موجودہ دور میں مختلف وجوہات کی بنا پر جیسے کہ ریلوے کی آمدورفت، ندیوں کے اوپر بڑے بڑے بند باندھ دینے سے اس میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے۔ سندھ ندی سے اس کے میدانی علاقہ کا سال میں ایک بار زیر آب ہونا اس لئے بھی ضروری تھا تا کہ علاقہ کا نیم بنجر پن دور ہو سکے اور دوسرے ایک بڑے حصہ تک سیلاب کا پانی پھیل سکے۔ لیکن اس طرح کے سیلاب کی اہمیت کو عہد وسطی کے اواخر کے تاریخ نویسوں نے روشنی ڈالی ہے ساتھ ساتھ اچھی بارش کی اہمیت پر بھی جیسے کہ مشرقی اتر پردیش۔ ماخذوں میں اس کی تقسیم دیوامترکا (Deva-matrka) (بارش کے پانی پر انحصار) اور ندی مترکا (Nadi-matrka) (ندی کے پانی پر انحصار) کے نام سے کی ہے۔ جس میں زراعت کے لئے بارش اور ندی کے ذریعہ سیلاب کے پانی آنے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

11.4 فصلیں

اگر تمام حوالہ جات کو جو ادبی اور کتباتی ماخذوں میں اتفاقاً اور کبھی کبھار ملے ہیں یکجا کر دیئے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ شمالی ہند کے ابتدائی عہد وسطی میں بہت سی اقسام کی فصلیں اگائی جانے لگی تھیں جیسے کہ گیہوں، جو مختلف قسم کے چاول، باجرہ کودون، چینا اور راگی جیسے موٹے اناج اور طرح طرح کی دالوں اور تلہن جیسے تل، سرسوں اور ارنڈی۔ اس عہد کے ماخذوں سے نقدی فصلوں کی مختلف قسموں کے پیداوار کے حوالے ملتے ہیں جیسے زعفران، گنا، پان، سپاری، کپاس، سن، تیل، ناریل اسی طرح مختلف قسم کی ساگ سبزیاں اور مسالے جات۔ اسی طرح پھل کھانے کا لازمی جز تھا۔

ان ذرائع اور مابعد کے ذرائع سے ہمیں ان پیداواروں کے مکانی تقسیم کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ماخذوں میں کچے چاولوں کی پیداوار کا ذکر ہے لیکن جیسا کہ Xuan Zang سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اونچے علاقے میں چاول کی کھیتی شمال اور شمال مغربی ہند کے علاقوں جیسے جالندھر، پری یاترا، کوٹاکا اور تنکا (پنجاب) میں کم ہوتی تھی۔ کپاس کی کھیتی نہ صرف مالوہ اور بندیل کھنڈ میں ہو رہی تھی بلکہ زمانہ حاضر کے مشاہدین کو بنگال میں بھی کپاس

NATIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad-32 IMC LIBRARY

کی کھیتی ملتی ہے۔ بہت سے ادبی ماخذوں، ملکی اور غیر ملکی دونوں کی ساتھ ساتھ کتباتی ماخذوں سے گنے کی کھیتی ابتدائی عہد وسطیٰ میں تمام علاقوں گندھارا اور کشمیر سے شمال مغرب میں راجستھان، مالوہ، بندیل کھنڈ، اتر پردیش، بہار اور بنگال تک ہوتی تھی۔ زعفران کی کھیتی کے لئے شمال مشرق کا علاقہ خاصہ مشہور تھا یہاں تک کہ ادیانا، داریل، کشمیر اور افغانستان میں کاپیشا تک زعفران کی کھیتی کے لئے مشہور تھا۔

مختلف علاقوں میں مختلف قسم کی فصلوں کی پیداوار کے تذکرے سے کسی کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ان ماخذوں سے حتمی مفروضے حاصل ہوسکیں گے۔ پھر بھی یہ تو ممکن ہے کہ کسی علاقہ میں کسی مخصوص قسم کی فصل کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ چنانچہ چینی سیاح آئی زنگ (I-zing) شمال مغرب میں گیہوں کی فراوانی کی بات کرتا ہے اور ابتدائی عہد وسطیٰ کے آسام کے کتبوں میں زمین کے تخمینہ کے وقت صرف چاول کا شمار اس علاقہ میں ان فصلوں کے غالب ہونے سے انکار نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح کاہن کی راج ترنگنی سے کشمیر میں چاول کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ نیل ماتا پرانا (Nilamata Purana) اسی علاقے کے ایک دوسرے ماخذ سے جو کی دوسرے درجہ کی فصل کی اہمیت کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے۔ مغربی علاقوں میں بھی جو کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ ماخذوں سے مشرق ہند میں چاول کے غلبہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے جو بدقسمتی سے اس ضمن میں گیہوں کے تعلق سے خاموش ہیں۔ اس کے علاوہ موٹے اناجوں جیسے جوار، باجرہ وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں بتاتے۔ ایک چینی کی شہادت بتاتی ہے کہ ہمارے عہد کے اختتام پر مالوہ کی اہمیت کپاس کی کھیتی میں آج جیسی ہوگئی تھی۔ ایک دوسرے چینی مشاہد (Xuan Zang) کے مطابق پیاز اور لہسن کے خلاف مذہبی تعصب کا اثر ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ان دونوں فصلوں کی پیداوار پر دکھائی پڑتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں مخصوص علاقوں میں مخصوص پیداوار کا پتہ چلتا ہے جیسے کہ مگدھ بہترین قسم کے چاول کے لئے مشہور تھا۔ اسی طرح ویشالی آموں اور کیلوں کے باغات کے لئے مشہور تھا یہ خصوصیت اب تک باقی ہے۔ بہر حال بدلاؤ کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مثال کے طور پر چاول کی مختلف قسمیں ہمارے دور میں وجود میں آگئیں۔ صرف بنگال میں پچاس سے زیادہ قسموں کے چاول ملتے ہیں۔ ناریل اور چھالی جس کا وجود شروعاتی دور میں نہ کے برابر تھا بارہویں اور تیرہویں صدی میں ایک اہم نقدی فصل کے زمرے میں آگیا اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان کا زرعی نقشہ مغل دور میں بہت حد تک بدل گیا۔ ہمارے عہد میں مکا کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا جیسا کہ آسام کے ایک کتبے کی بنیاد پر اسے مانا جاتا رہا ہے۔

11.5 دستکاری پیداوار

اس موضوع پر ہم اپنا سروے اسپات کے زمانے کی دستکاری یعنی لوہے کے کارخانوں سے شروع کرتے ہیں۔ چونکہ اور بھی دوسرے قسم کے دستکاری اس زمانے میں موجود تھی اس لئے دستکاری سے متعلق ماخذوں میں سرسری تذکرہ سے زیادہ کچھ نہیں ملتا ہے۔ کبھی ہم کو لوہاروں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، خواہ مغربی ہندوستان کے گاؤں میں، جہاں ان کو فصل کی کٹائی کے وقت اس میں سے اپنا حصہ پاتے ہوں جیسا کہ لیکھا پدھتی میں مذکور ہے۔ یا دیہی معاشرے کے آخری سرے پر ان کا وجود ملتا ہے یا شمالی ہندوستان کے جنگلات کے نو آباد میں ان کا وجود ملتا ہے جیسا کہ ہرش چرت میں تذکرہ ہے۔ عطیہ اراضی کے کتبوں چندیلا چارٹرا ور ابتدائی عہد وسطیٰ کے کمایوں، گڑھوال کے کتبے سے (جو کرمانتا۔ استھل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاید اس سے کاریگروں کے کام کرنے کا جگہ مراد ہے) ہم کو حتمی طور سے ان کے درمیان لوہاروں کی موجودگی کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ کبھی تو کتبوں کی پوری کھیپ میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے جیسا کہ ابتدائی عہد وسطیٰ میں اڑیسہ کے کتبوں کا معاملہ ہے۔ اڑیسہ سے ہی ہم کو بہت بڑے پیمانہ پر عمدہ قسم کا مادہ (لوہا) کے مندروں میں بیم کی شکل میں استعمال ہونے کے اس وقت میں ٹھوس ثبوت ملے ہیں۔ جب لکڑی کے بیم کو بالکل ناکارہ دیا گیا تھا۔ مالوہ کے دھار کے مشہور لوہے کے کھمبے سے بھی اسی قسم کے ثبوت ملے ہیں۔

لوہے کے دستکاروں کی عمدہ کارکردگی سے متعلق تفصیلات بیرون ملک ہندوستانی تلواروں کی شہرت اور اندرون ملک ادبی ماخذوں میں ایسے کارخانوں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔ اس قسم کی تلوار جس میں خوبصورت پلیٹ لگی ہوئی تھیں جو ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور اس کو 'دمشق' کی تلوار کہا جاتا تھا۔ اس سے ہندوستان اور اسلامی دنیا کے درمیان بہتر تکنیکی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ احمد، وائی الحسن اور ڈونالڈ آر ہل نے اپنی کتاب Islamic

Technology میں بتایا ہے۔' اس بات کوتسلیم کرنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ جہاں تک دمشق کے اسپات کا تعلق ہے اسلامی دنیا اور ہندوستان میں ثقافت کے میدان میں بڑی یکسانیت تھی۔

ابتدائی دور میں خام لوہے کے لئے جن علاقوں میں کانکنی کی گئی اور جو بعد کے دور میں بھی اس کام کے لئے استعمال ہوئے وہ یقیناً آج کے دور میں بھی اسی کام کے لئے استعمال ہورہے ہیں جیسے کہ جھارکھنڈ کے علاقے۔ اڑیسہ میں تلچر سے خام مال وہاں کے لوہا پگھلانے والوں کو پہنچتا تھا جو آج تک بھی جاری ہے۔ ہم کو اسپات کے پیداوار کے حوالے کے ساتھ ساتھ دوسرے مادوں جیسے چاندی اور تانبے کا بھی پتہ ملتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے مغربی پنجاب میں جس کے بارے میں بعد کے دور میں کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ ان مادوں کا ... یہ شوالیک اور سالٹ رینج (Salt-Range) میں قلیل مقدار میں ہونا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ان کی کانکنی تھوڑی مدت کے لئے ہی ہوسکتی تھی۔ یہی وجہ کہ بعد کے دور کے کتابوں میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ان جگہوں سے اس کا اختتام دوسرے علاقوں میں اس کے ہونے کے امکان کا احساس دلاتا ہے۔ اسی طرح کلہن نے آٹھویں صدی میں جنوبی کشمیر کے پہاڑوں میں ریاست کے ذریعہ تانبے کی زبردست کانکنی کا بارے میں بتایا ہے۔ لیکن نہ تو اس سے پہلے اور نہ بعد کے دور میں اس کا کوئی حوالہ ملتا ہے۔

شمالی افغانستان میں مشہور پنجھیر (جسکو بعد میں پنج شیر کہا گیا ہے) میں (غیر لوہا دھاتیں) چاندی کی کان کا وسیع میدان ملا تھا جہاں بتایا جاتا ہے کہ دسویں صدی میں دس ہزار کانکن کام کرتے تھا جیسا کہ ابن الحوقل نے اس کی وضاحت کی ہے کہ بڑی تعداد سے مراد چاندی کے ذخیروں کی بہتات کے مقابلے لوگوں میں چاندی کے تیئں زبردست طلب کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ پنجھیر کے لوگوں نے پہاڑ اور بازار کو ایک چھلنی بنادیا تھا جہاں بہت سے گڈھے ہوگئے تھے۔ اس کاروبار میں آپ دیکھیں گے کہ ایک آدمی دن کی شروعات کرتا ہے جب اس کے پاس ایک ملین (دس ہزار روپے) ہوتے ہیں اور شام ہوتے ہوتے وہ بالکل کنگال ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک آدمی صبح میں بالکل غریب ہوتا ہے اور شام کو اس کے پاس بے شمار اور بے حساب دولت آجاتی ہے۔

المسعودی کے مطابق دسویں صدی عیسوی میں کنابار، پارہ کا واحد اہم خام مادہ کی کانکنی گجرات کے بڑوچ میں ہوتی تھی۔

شمال ہند میں سونے کا ایک بڑا ماخذ ندیوں کے ذریعہ سونا بہا کر لانے والی ریت تھی۔ اور اس میں سب سے زیادہ اہم سندھ ندی تھی جس کی تصدیق ابوالفضل نے کی ہے۔ گیارہویں صدی میں سونا کس طرح سے حاصل کیا جاتا تھا اس کا تذکرہ البیرونی کی معدنیات پر کتاب الجماہیر فی معارفۃ الجواہر میں کیا ہے۔

''دولوگ پانی کے اندر اپنے ذرائع کے مطابق معلوم جگہوں پر چھوٹے چھوٹے گڈھے کھودتے تھے۔ وہ ان گڈھوں کو پاروں سے بھر دیتے تھے اور تھوڑی دیر چھوڑ دیتے تھے۔ اور تب واپس آتے تھے جب یہ پارہ سونا بن جاتا تھا ایسا اس لئے کہ ابتدا میں پانی پارہ کے اوپر سے ذرات کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے جو سونے کو اخذ کرلیتا ہے اور ریت بہہ جاتا ہے''۔

نیپال تانبے کا ایک اہم ماخذ تھا جو قبائلی اور دوسرے علاقوں سے حاصل ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر کانوں کا وجود اور ساتھ ساتھ مادوں کے پائے جانے کے امکان کا چوریوں اور گہودوالوں کے کتبوں میں صاف صاف دکھائی پڑتا ہے۔ حقیقتاً تلاش کے علاوہ اس کے کتبیانی اور ادبی حوالے غیر اسپاتی مادہ کے پیداوار کا مختلف طریقے اور مہارت کے ساتھ اس کو انجام دینے کے بارے میں موثر مواد فراہم کرتا ہے۔

پتھر، مٹی اور لکڑی بہت سے انواع واقسام کی دستکاری کے کام میں آتے تھے۔ جیسے کہ پتھر کی عمارتیں، مجسمہ سازی۔ کندہ کاری، برتن بنانا، اینٹ بنانا اور بڑھئی گیری۔ مختلف علاقوں سے ان چیزوں کے بارے میں تفصیلات کم وبیش ملتی ہیں۔ ہندوستان کے ابتدائی عہد وسطیٰ میں حرفت اور فن تعمیر کے ایک نئے دور کا پتہ چلتا ہے جو علاقائی خصوصیت بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ جیسے کہ مشرقی ہند کے پالا دور میں سیاہ بسالٹ پتھروں کے مجسمے مثال کے طور پر، مغربی اور وسطی ہندوستان سے جو سنگ مرمر اور Sand stone سے بنائی گئی مورتیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اور ان سب کو ایک ساتھ دیکھنے سے ابتدائی عہد وسطیٰ کا

ہندوستان تاریخ ہند میں ماضی کے ہندوستان سے ممتاز اور مختلف نظر آتا ہے۔ یہ دور جو بہت وسعت رکھتا ہے یہ نہ صرف دستکاروں میں اہم جدت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ان کے اندر اس میدان میں اعلیٰ درجہ کی مہارت کا بھی پتہ دیتا ہے۔

غیر زرعی معیشت میں نمک کی پیداوار بھی ایک اہم پیداوار ہے۔ نمک سمندری پانی سے مشرق اور مغرب کے ساحلی علاقوں میں بنایا جاتا تھا۔ نمک راجستھان کی سامبھر جھیل اور سالٹ رینج سے حاصل کیا جاتا تھا۔ نمک کے گڑھوں کے بارے میں جہاں نمک شورے دار مٹی سے پیدا کیا جاتا تھا، کی کلاچوری، چنڈیلا اور گہڈوالا کے کتبوں سے خصوصیت کے ساتھ تصدیق ہوتی ہے۔ سندھ میں سرن دیلیا رذخائر کو ممکن ہے اسی مقصد سے کام میں لایا جاتا تھا۔ مقامی نمک کی سپلائی کی اہمیت کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے اگر اس کا موازنہ نمک کی منتقلی پر آنے والے خرچ کو مدنظر رکھ کر کیا جائے۔

علاوہ ازیں دوسری دستکاریاں جو اندرون ملک کی بنیادی پیداوار سے حاصل کی جاتی تھیں۔ جیسے ٹیکسٹائل، تیل نکالنا، شکر بنانا، شراب کی پیداوار اور چمڑے کا کاروبار۔ یہ تمام دستکاریاں جو زراعت اور مویشی پالن پر منحصر ہونے کی وجہ سے، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہ سب دستکاریاں وسیع پیمانے پر اپنائی جاتی ہونگی۔ ٹیکسٹائل دوسری دستکاری کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور تمام ذرائع میں یہ زیادہ نظر آتی ہے۔

ہمارے دور میں کپاس ٹیکسٹائل کی ٹیکنالوجی میں زبردست ترقی ہوئی۔ چھٹی اور دسویں صدی کے درمیان (Cotton gin) کپاس بیلنے والی مشین وجود میں آئی جس میں کرینک ہینڈل (Crank handle) اور وارم گیئر (Worm gear) لگا تاکہ اس کے ذریعہ سے کاٹن فائر کو اس کے بیج سے اور دیگر فضلے سے کارگر ڈھنگ سے علیحدہ کیا جاسکے۔ چنانچہ لباس کو کنگھا کرنے کے بارے میں کئی دہائیوں یعنی جہاں تک دھنائی کی بات ہے 1969 کے بعد کئی دہائیوں سے یہ دلیل دی جارہی ہے کہ دھنیئے کی کمان (Carder's-bow) گیارہویں صدی کے ہندوستان میں متعارف ہوئی۔ اور پرانے خیال کی اب تصدیق کردی گئی ہے کہ ہندوستان میں ماقبل گپتا دور سے ہی کمان کا استعمال ہورہا ہے بہرحال کتان کرنے والے کو کتائی کے پہیوں کا فائدہ اب تک نہیں ہوا کیونکہ کتائی کے پہیوں کا پہلے پہل استعمال ہندوستان میں 1350 میں ہوا (ان ٹیکنیکل اصلاحات کے بارے میں مزید معلومات کے لئے دیکھیں اکائی 23 بلاک 5)۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کی ذرائع سے ہمیں ٹیکسٹائل کی مختلف قسموں کے بارے میں پتہ چلتا ہے جیسے کہ سوتی، اونی، sann-hemp، ریشمی اور رنکو ہرن کے بالوں سے بنے ہوتے تھے۔ غالباً ان چیزوں کی اس سے پہلے کے دور کے ماخذوں میں، مذکورہ چیزوں کا جہاں تک ہم سمجھتے کی کوئی باقاعدہ موازنہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن پی۔ کے۔ گوڈے (P.K.Gode) نے مشک ہاری، بستر کے پردے اور مچھردانی، کو اس زمانے کے پیداوار بتایا ہے۔ اور اسی طرح چند اور چیزیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اور مشہور ٹائی اور ڈائی تکنیک (Tie and Die Technique)۔ جس کا اولین حوالہ حبیب صاحب بان بھٹ کے ہرش چریتا میں پاتے ہیں، ابتدائی عہد وسطیٰ کی یہ دوسری جدت ہوسکتی ہے۔

منوسمرتی اور مہابھارت میں لفظ چکر (پہیہ) کا تیل کے کولھو کے لئے استعمال ملتا ہے۔ جس میں گھومنے کی حرکت ہوتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ پہلی ہزار سالہ صدی سے استعمال میں آرہا ہوگا۔ بھگوت پران، عہد وسطیٰ کے ماخذ میں تیل ینتر چکر جیسے بامعنی لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ عام آدمی کی زندگی سے تیل کا مل اس طرح سے جڑا ہوا تھا کہ اس کے لئے مشین یا ینتر سے تیل مل کو تعبیر کیا گیا لیکسیکون نے ینتر گرہ (مشین گھر) اور ینتر سدمان (سدمان کے معنی گھر) جیسے لفظ سے تیل مل یا تیل کے کارخانہ کے معنی مراد لیا ہے اور اسی وجہ سے چھٹی صدی عیسوی کے آواخر کے گجرات کے کتبوں میں ینتر کئی اصطلاح سے تیل مل تیل کا کارخانہ مراد لیا گیا ہے۔ 804 عیسوی کے ہماچل پردیش کے ایک کتبے میں تیل اوت پیٹرن کہا گیا ہے۔ اتپیٹرن (پیس کر یا دبا کر) کا یہ طریقہ ماضی میں بیجوں کو پیس کر تیل نکالنے کے طریقہ سے بالکل جداگانہ تھا جس کو پتنینی کے گرامر میں تیل پیشم جیسے اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ بہرکیف ابتدائی عہد وسطیٰ کے سنسکرت کے کتبوں میں تیل مل کے لئے مستعمل لفظ ینتر یا چکر نہیں بلکہ ایک نئی اصطلاح جو کہ بظاہر مقامی اصطلاح ہے وہ گھنک جسکو گھانا یا گھنکا بھی کہا گیا ہے۔ ایک نئی اصطلاح جو کہ عام طور سے تیل نکالنے کے لئے زیر استعمال ہے وہ ہے گھانی۔ جو گھنک سے جڑا ہوا ہے نہ کہ چکی سے جو کہ چکر سے ماخوذ

ہے۔ تیل مل کے لئے دوسرا مستعمل لفظ کولہو ہے جونویں صدی عیسوی کے گوالیار کے سنسکرت کے کتبوں میں کولہوکا کے مترادف ہے۔ علمی اصطلاح میں اس بدلاؤ۔ چکر یا ینتر سے گھنک یا کولہوکا۔ تیل اخذ کرنے کی ٹیکنالوجی کی تاریخ میں اس کی بالکل ٹھیک ٹھیک اہمیت کا اندازہ لگانا ابھی باقی ہے۔ جو بات یقین سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ شکل میں گھانی بنانا بالکل ہی ہندوستانی تصور ہے کیونکہ جنوبی ایشیا کے گھانی کا طریقہ دوسری جگہ مروج تیل اخذ کرنے کے طریقے سے بالکل جدا تھا۔

بارہویں صدی عیسوی کا مشہور جین اسکالر (عالم) ہیم چندر نے اپنی ڈکشنری (لغت) جس کا نام انہوں نے دیشی نام مالا (Deshinammala) رکھا ہے، اس میں کولہو کے معنی گنے کو پیینے کے دئے ہیں اور اس پوری کاروائی کو نی پیڑن (Nipidana) یعنی کسی چیز کو پیسنا، دے رکھا ہے۔ الفاظ کی یکسانیت کو لہو اور گنا پرائی ینتر کے کام کرنے کے طریقے میں یکسانیت دکھاتی ہے۔ پورے شمالی ہندوستان میں گنا پرونے کے کاروبار میں روز افزوں ترقی کو گنا پیداوار سے متعلق مختلف حوالہ جات جیسے کہ گنا کی پیداوار اس کا پرونا اور عملہ جو اس کو تیار کرنے سے لیکر تقسیم کرنے تک لگے ہوئے ہیں دکھائی پڑتے ہیں۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ گنے کا کارخانہ بشمول گنا کی کھیتی کرنے جو اس برصغیر سے بھی بڑے علاقوں ایران سے ہوکر مغربی ایشیا کے ممالک اور شمالی افریقہ سے اسپین اور سسلی تک ہمارے اس دور میں پھیل چکی تھی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چینی تیار کرنے کا علم چین میں ہندوستان سے ساتویں صدی کے وسط میں تنگ (Tang) بادشاہ کے ایک سفارت کار جو چین سے ہندوستان اسی خاص مقصد سے بھیجا گیا، پہنچا۔ ثبوتوں کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ درحقیقت ہندوستانی بدھ مذہب کے راہب اور مگدھ کے دو کاریگر 648-647 عیسوی میں اس ٹیکنالوجی کو ہندوستان سے لیکر چین پہنچے۔ یوں تو چین کے لوگ بہت پہلے سے چینی بنانے کے بارے میں جانتے تھے لیکن ہندوستان سے انہوں نے جو سیکھا وہ تھا کھانڈ اور شرکر بنانے کے طور طریقے جو صدیوں سے لبھانے والی ہندوستان کی دو خاص قسمیں تھیں۔

ان دونوں طریقوں کی تفصیلات سے شکر صنعت کے مورخین لاعلم تھے کہ اچانک نویں دسویں صدی کی چین کی حال ہی میں دستیاب ہونے والی دستاویز سے پتہ چلا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ بیلوں کے ذریعہ گنا پیینے کے بارے میں حوالہ ہے جس کو عرف عام میں کولہو کہا جاتا ہے۔

مختلف قسم کے الکوحل (شراب) اور الکوحل تیار کرنے والوں کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ الکوحل کی تیاری ایک عام دستکاری تھی۔ ساتویں صدی عیسوی کا Xuan 2006 کا بیان اور بارہویں صدی کا ڈرامہ موہراج پراجیہ بتلاتا ہے کہ الکوحل سرکاری محصول کا ایک اہم ذریعہ تھا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ الکوحل بڑے پیمانے پر پیدا کیا جاتا تھا۔ جہاں تک اس کو تیار کرنے کا عمل کا تعلق ہے تو بیشتر ہندوستانی مورخین اس بنیادی سوال کا جواب دینے سے ابھی کوسوں دور ہیں کہ آیا الکوحل کا صرف خمیر تیار کیا جاتا تھا یا دونوں، خمیر تیار کرنا اور اس کو کشید کرنا۔ اگر ان لوگوں کے مواد کو کھنگالا جائے جنہوں نے اس سوال پر غور وخوض کیا ہے جیسے کہ جوزف نیدھم جنہوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں بہت قدیم زمانے سے کشید کرنے کا طریقہ رائج تھا اور یہ کہ ابتدائی عہد وسطیٰ میں غیر نشہ آور الکوحل کے ساتھ ساتھ کشید الکوحل بھی تیار کیا جاتا تھا۔

چمڑے کے کاروبار سے متعلق ہمارے ماخذوں میں خال خال تذکرہ ملتا ہے۔ وسطی ہندوستان کے ایک کتبہ میں ایک جوتا بنانے والے (موچی) کا حوالہ ہے جبکہ دوسرا حوالہ راج ترنگنی میں ملتا ہے۔ دسویں صدی کے مشرقی ہندوستان کے پشچھم بھاگ کتبے میں درجنوں چرم کاروں (چمڑے کا کام کرنے والے) کا ایک خانقاہ سے تعلق کا حوالہ ملتا ہے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ وہ لوگ زرعی کام کرنے والوں کی طرح ادارے سے جڑے ہوئے تھے۔ نہ کہ چمڑے کا کام کرنے والے کی حیثیت سے جیسا کہ ان کے ذات سے پتہ چلتا ہے وہ چمڑے کے کاروبار کرنے والوں کی مخصوص ذات سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ حقیقت کہ چرم کاروں کا استعمال زرعی مزدور کی شکل میں کیا جانا آج بھی ہندوستان کے گاؤں کی ایک اہم خصوصیت ہے کیونکہ ان کی دستکاری کوئی مستقل روزگار نہیں ہے۔ اس لئے ان کی دستکاری ان کی ضروریات زندگی کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔ لیکن چمڑے کے کاروبار کرنے والے جو اپنی انجمن بنا کر منظم ہو گئے تھے جیسا کہ ابتدائی عہد وسطیٰ کے قانونی کتابوں میں دکھائی پڑتا ہے فنی مہارت اور مشغولیت کے ایک اعلیٰ درجہ کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک قسم اس سے ہٹ کر گجرات کے چمڑے کے کام کرنے والوں کی ہے جن کی پیداوار کو دنیا میں سب سے اچھی اور سب سے مہنگا سمجھا جاتا تھا۔ غیر ملکی مشاہدین المسعودی اور مارکو پولو نے ان کی تعریف

کے پل باندھے ہیں۔

کھالیں غالب گمان یہی ہے کہ گھریلو جانوروں کی ہوتی تھیں۔ بہر کیف کچھ حوالوں جیسے (ہرش چرت) سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جنگلی جانوروں کی کھال بھی چمڑے کے کام میں عام طور سے استعمال ہوتی تھیں۔ اس کام کے لئے اور دوسرے کاموں کے لئے خاص طور سے لکڑی کا کام (بڑھئی گیری) اورٹوکریاں بنانے کے لئے جنگل کا استعمال اس کا کاروبار کرنے والوں کے لئے خام مال کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ اڑیسہ کے جنگل کے ہاتھی کے دانت کی تسکری کی شہرت ماضی میں بھی تھی اور ابتدائی عہد وسطیٰ میں بھی جیسا کہ حدود العالم میں تصدیق کی گئی ہے۔ وسط ہندوستان اور مغربی ہندوستان سے بھی ابتدائی عہد وسطیٰ کے جین ماخذوں میں قبائیوں (پلنداس) کے ذریعہ ہاتھی کے دانت کا کاروبار کا ذکر کیا گیا ہے۔

11.6 دستکاری پیداوار کی تنظیم

دستکاری پیداواروں کی بنیادی اکائی گاؤں میں انفرادی طور پر دستکار کی اپنے کنبہ کے ساتھ ہوتی تھی جو کہ زراعت کے پیشہ سے جڑے دوسرے گروہوں کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اکثر وبیشتر دوسرے کاروبار کرنے والے کنبوں کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ کتباتی اور دوسرے مختلف حوالوں سے مختلف قسم کے دستکاروں جیسے برتن بنانے والے، کپڑا بننے والے، لوہار، بڑھئی، گڑ بنانے والے، تیل نکالنے والے، چمڑے کا کام کرنے والے، شراب بنانے والے وغیرہ وغیرہ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

کچھ تو میں ایسی تھی جن کو اچھوت سمجھا جاتا تھا اور علیحدگی کی سزا جھیلتے تھے اور گاؤں (یا شہر) کے باہر رہتے تھے۔ ان لوگوں کی شناخت ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں الگ الگ تھی۔ چنانچہ البیرونی نے کپڑا بنانے والوں کو اچھوت دستکاری کے طور پر گردانا ہے جو بنیادی آبادی سے دور رہتے تھے۔ لیکن جین متن حوالے میں ان کو مخصوص پیشہ ور کے طور پر شمار کیا ہے جس کو نروا (Narua) کہا جاتا تھا جو کہ اچھوت نہیں تھے جو کروا (Karua) گروہ سے الگ تھے جو کہ اچھوت سمجھے جاتے تھے۔ ان پیشہ وروں کی نرو (Naru) اور کرو (Karu) دو قسموں میں تقسیم آج بھی پائی جارہی تھی۔ اسی طرح اور دوسرے گروہوں کے درجوں میں تضاد ہم عصر ماخذوں میں دیکھنے کو ملتا ہے باستثناء چمڑے کے کام کرنے والوں کے، جو ہر جگہ اچھوت ہی سمجھے جاتے تھے۔ کاریگروں اور دستکاروں کی نرو اور کرو میں تقسیم کے باوجود کاریگر عام طور سے کرو ہی سمجھے جاتے تھے۔

ان دستکاروں اور ان کے دیہی گاہکوں کے بیچ ایک مخصوص قسم کا نظم تھا جس کو بعد میں ججمانی نظام کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دستکار اپنے کسان خاندان کو اس نظم کے تحت مخصوص خدمتیں انجام دیتا تھا بدلے میں کسان خاندان کی فصل میں اس کا مخصوص حصہ ہوتا تھا۔ لیکھ پدھتی جو کہ مغربی ہندوستان کا ایک ماخذ ہے اس کے ایک دستاویز میں پانچ کروکاؤں (کرو کی بدلی ہوئی شکل) کے حوالے سے اس طریقہ کے رائج ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے علاوہ چند ایک کتبات میں کاریگروں کے اپنے کھیت کے بارے میں بھی جیسے کہ میتر یکا چارٹر میں بڑھئی کے کھیت کے حوالے ملتے ہیں۔ بعد کے زمانے میں ایسا بھی نظم پایا گیا کہ جس میں کاریگر کو لائق کاشت کوئی زمین بھی دے دی جس میں وہ کھیتی کرتا تھا اور اس کی فصل کو اپنے استعمال میں لاتا تھا اور بیج کے نام پر اگلی فصل اگانے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا جو اس کو اس کا کسان مہیا کراتا تھا جو بیج کے نام پر اس کی فصل میں سے ایک معمولی سا حصہ لے لیتا تھا۔

وقت اور زمانے کے لحاظ سے اس صورتحال میں اختلاف کا پایا جانا لازمی تھا۔ لیکن ایک بات بالکل واضح تھی کہ یہ نظام نہ تو تمام دیہی دستکاروں اور نہ ہی کسی دستکار کے ذریعہ تیار کئے گئے تمام قسم کی پیداوار (اور مرمت) پر محیط تھا۔ ہم نے ابھی اوپر لیکھا پدھتی میں پانچ کروکاؤں کے حوالے سے اس نظام کے بارے میں دیکھا ہے جس میں تین یہ ہیں لوہار بڑھئی، کمہار، دو دوسرے اور کون ہو سکتے ہیں (وہ دونوں نائی اور دھوبی ہو سکتے ہیں)۔ گاؤں والوں کی اور دوسری ضروریات (کپڑے بننا، تیل نکالنا، شراب بنانا) یقیناً پانچ کروکاؤں کی خدمات سے ہٹ کر تھی۔ اسی طرح خاطر خواہ تقابلی ثبوتوں کے تجزیہ سے اس سے کہیں زیادہ برتنوں، درانتی (ہسوا)، مرمتی کام وغیرہ کی مانگ تھی جس کا ججمانی نظام کے تحت ذکر ہوا ہے۔ یہ بڑھی ہوئی مانگ ججمانی نظام سے ہٹ کر بازار سے خرید وفروخت کے ذریعہ پوری ہوتی ہوگی۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کاریگروں کے کھیتوں کے حوالے سے جیسے کہ چمڑے کے کام کرنے والوں کا زرعی مزدور کے طور پر کام کرنا، اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ یہ کاروباران پیشہ وروں کا مستقل کام نہیں تھا۔ درحقیقت ان کی اشیاء کا خاطر خواہ مطالبہ نہ ہونے (قدیمی روزگار کے تحت) سے یہ ماہر پیشہ ورلوگ بڑے گاؤں میں جا کر بسنا پسند کرتے تھے اور یہاں سے وہ ججمانی معاہدہ کے تحت وہ اپنے تعلقات چھوٹی بستیوں سے بنانے کے خواہش مند تھے۔

گاؤں کے اندر ججمانی اور بازار کے بیچ دستکاری صنعت وحرفت کا ملے جلے کلچر پر ریاست کے ذریعہ مذہبی اداروں یا محکموں کو ان میں سے کچھ گاؤں بطور عطیہ دینے سے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ نظریاتی طور پر دستکاری کی ذمہ داری، ریاست سے عطیہ پانے والوں کی طرف منتقلی تھی۔ اس طرح کے تمام بنیادی سوالوں جیسے کہ عطیہ پانے والوں نے ان کاریگروں اور ان کے ساتھ اس نئے بدلاؤ کے تحت کیا سلوک کیا (جن کی تعداد گاؤں کی آبادی کے بڑھنے کے تناسب سے بڑھ رہی ہوگی) اس بارے میں براہ راست بالالفاظ دیگر مناسب ثبوت نہیں مل سکے ہیں۔

بعض مذہبی مقامات پر دستکاری صنعت کا اپنے مخصوص انداز سے انتظام کیا گیا تھا۔ یہ ججمانی نظام سے مشابہت تو ضرور رکھتا تھا لیکن اس میں ججمانی نظام کے تانے بانے سے کہیں زیادہ جامعیت تھی۔ اڑیسہ کے بارہویں صدی کے ایک کتبہ میں اس کا اشارہ ملتا ہے، جب ایک کمہار کو دو قطعہ زمین اس شرط کے ساتھ دی گئی کہ وہ روزانہ مندر کو مذہبی خدمات کے تحت پکانے کی ہانڈی مہیا کرائے گا۔ دسویں صدی میں پچھم بھاگ تانبہ پلیٹ کتبے میں بنگلہ دیش کے سلہٹ کے علاقہ میں کئی ایک مندروں میں اس طرح کے نظم کے بارے میں تفصیل سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایسے ہی ایک مندر ہیں دو تیلی، دو کمہار، دو بڑھئی اور دو معمار کے علاوہ، درجنوں دوسرے پیشہ وروں کے نام تھے جن میں سے ہر ایک کو خاطر خواہ زمین (کم از کم 7.5 ایکٹر) دی گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ ان کی خدمات کے بدلہ میں دی گئی ہوگی۔ یہ خدمات واضح نہیں تھی۔ خاطر خواہ زمین دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تمام تر خدمات اب مندر کے ماتحت ہوں گی۔ مطلب یہ کہ دستکار (اور دوسرے کاریگر) مندر سے متعلق تمام ضروریات پوری کرینگے (نہ کہ چند مخصوص خدمات)۔

گاؤں کے اندر کاریگروں کے خال خال وجود کے مقابلے میں ان کا کسی خاص مقام پر بڑے گروہ کے طور پر جمگھٹا تھا۔ بڑی تعداد میں ان موجودگی ان کے سامانوں کے زیادہ مطالبہ کا پتہ دیتی ہے اور یقیناً یہ جگہیں اپنے آپ میں خاص اہمیت رکھتی ہوں گی۔ مطلب یہ کہ وہ بستیوں کے نیٹ ورک کے ایسے نقطے ہوتے تھے جو آمدورفت (خشکی اور پانی کے راستے) کے لحاظ سے اہمیت کے حامل رہے ہوں گے جہاں فاضل غلہ بھی پہنچتا تھا اور جہاں قانون کی بالادستی بھی دکھائی دیتی تھی۔

ایسی جگہوں کی ایک قسم کی پہچان کروٹ (karvata) اور کھروٹ (Kharvata) کے طور پر کی گئی ہے۔ ایک ہم عصر ماخذ میں اس کو گرام (گاؤں) سے بڑا اور نگر (شہر) سے چھوٹا بتایا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے کی نظر میں وہ ایک ایسا گاؤں ہے جہاں کاریگروں اور زرعی پیشہ کے لوگ بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ کھروٹ ایک بڑے گاؤں کے طور پر امتیازی حیثیت رکھتا تھا جس میں دستکاری ساز وسامان کی بہتات تھی مگر وہ شہری مرکز بالکل نہیں تھا۔ درحقیقت جیسا کہ ایک وضاحت یہ بتاتی ہے کہ وہ ایک گاؤں ہی تھا جبکہ دوسری وضاحت کے مطابق وہ ایک شہری بازار تھا۔ ایک ایسا مقام جہاں بازار یا ہاٹ برابر لگتا رہتا ہو۔ بلاشبہ اس سے مراد شہر کا بازار تھا جس کے لئے کتبات میں کروٹ اور کھروٹ کا محاورہ استعمال ہوا ہے۔

کسی خاص شہری معیشت میں دستکاروں کا بڑی تعداد میں یکجا ہونا دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر دسویں صدی میں سیادونی جو کہ للت پور کے پاس، مالوہ کو شمال ہندوستان سے اور مغرب سے جنوبی ہندوستان کو جوڑنے کے مقام پر واقع ہے ایک ترقی یافتہ شہر (Pathana) تھا۔ اس شہر میں کاریگروں کی بڑی تعداد میں موجودگی دیکھی جا سکتی ہے جس میں کمہار، شراب نکالنے والے، کپڑا بننے والے، چینی بنانے والے، پتھر کاٹنے والے، تیلی اور سنگ تراش سب طرح کے پیشہ ور شامل تھے۔ یہاں بھی جیسے اور جگہ پر (جیسے راجستھان میں ارتھونا) یہ کاریگر مذہبی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لئے تمام قسم کی دستکاری کی نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے جو شہر کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ مثال کے طور پر، بارہویں صدی کے آخر میں مارواڑ میں سندرا کا جو جینیوں کا مقدس مقام ہے اس مقام کی پہچان اسی انداز سے ہے جہاں شاہی اور دوسری عطیات دی جاتی تھی جہاں عطیہ میں دئے گئے ایک گھر سے اس میں رہ رہے کرایہ دار سے سالانہ

آمدنی آتی تھی اور جہاں سوداگروں کی بڑی تعداد تھی اور جن کی اہمیت ان کی اپنی گھوشٹی کی تنظیم سے بھی ہوتی ہے۔ سات چھکڑوں کو بنانے والے (رتھ کار) جو اس جگہ کے باشندے تھے ان کی بھی پہچان عطیہ دینے والے کے طور پر ہے اور اسی بنیاد پر ہم اس مقام کو چھکڑا بنانے کے ایک اہم مقام کے طور پر جانتے ہیں۔ اس مقدس شہر میں دوسری دستکاری بھی ضرور ہوتی ہوگی۔ اور جس طرح سے پیسوں کا لین دین ہوتا ہوگا جس کا ذکر کتبات میں ملتا ہے لیکن ہم کو اس کا کوئی علم نہیں ہے۔

ایک زمانہ میں شہری معیشت میں ان کاریگروں کی خدمات شامل تھیں جو پاس کے گاؤں میں رہتے تھے جیسا کہ پرانے وقت کا وارانسی۔ چنانچہ چھتیس گڑھ کے علاقے میں تیرہویں صدی کی ابتداء میں کتبوں پر کندہ کاری کرنے والا شہر کا رہنے والا تھا جس کا نام پڑی تھا اور دوسرے کاریگر جنہوں نے مہیپالا اور وگرہ پالا، پالا راجاؤں کی امگاچی پلیٹوں کو کندہ کیا وہ ایک گاؤں میں رہتے تھے جس کا نام پوشالی تھا۔ گاؤں کا شہر سے رشتہ تو غالباً موجودہ دور کے گاؤں پوسیلا سے پہچانا جاتا ہے جو کہ مشہور شہر منگل کوٹ کے پہلو میں واقع ہے۔ ایسی ہی صورتحال آسام میں شبنکر پٹا کا بستی کی مثال میں نظر آتی ہے جہاں کپڑا بننے والوں کے دو گروہ بھی اس کے ساتھ جڑے تھے۔

یہ بات ان پیداواروں کے تعلق سے ہے جو ججمانی نظام سے ہٹ کر مندروں کا نظام اور اسی طرح کے دوسرے دستکار گلڈوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان گلڈوں (Guilds) کے لئے ایک عام اصطلاح شرینی (Shreni) (جیسے گوالیار کے علاقہ گوپا گیری میں تیلیوں کی شرینی) ان کو بھی دوسرے ناموں سے جانا جاتا ہے جیسے دیشی۔ (جیسے وسط ہندوستان کے کری تلائی کتبے میں شراب بنانے والوں کی دیشی) اور گوشٹھی (جیسے بنگال کے ورندرا علاقہ میں Shilpins کی گوشٹھی) ملتی ہے جب ایک ہی پیشہ سے جڑے ہوئے بہت سے لوگ مذہبی تعلق سے ایک ساتھ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں (جیسے شراب بنانے والے اور سنگ تراش، سیادونی میں) یا جب ان کو ایک یونٹ کے طور پر ٹیکس دینا پڑتا ہے (راجستھان میں اٹھاپنا کا اور ارتھونا کے شہر میں ٹھٹھیرے اور شراب بنانے والے) تو اس سے کوئی بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ وہاں پر ایک گروہ کا پیشہ ورانہ گروہ یا تنظیم ہوتی تھی۔ گوکہ ریکارڈ میں اس طرح کی اصطلاح کا کوئی استعمال نہیں نظر آتا ہے۔

ان پیشہ ورانہ گروہ (Guilds) کے کردار کا علم قانون کے مجموعوں، کتبوں اور دوسرے ماخذوں میں موجود تمام ثبوتوں کے تنقیدی تجزیہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے جو ان کے کام کاج اور ان کی تشکیل سے متعلق مختلف طریقوں سے متعلق تھے۔ ایک دستکاری پیشہ ور گروہ (Guilds) سے متعلق تمام لوگ ایک ذات برادری کے ہوتے تھے۔ دستکاری علم و ہنر ایک ہی خاندان کے اندر نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا تھا اور شادی بیاہ ان کنبوں کو بطور ایک ذات، ایک ساتھ جوڑنے کا کام کرتا تھا۔ مگر ان میں فن مہارت کے مختلف درجوں کو پہنچنے والوں کو استاد کی حیثیت سے بطور اچاریہ کے شناخت ہوتی تھی۔ جن کے ارد گرد دوسرے لوگ کار آموز کے طور پر جمع ہوتے تھے۔ کسی فن میں مہارت کے درجے کو پہنچنے کے چار درجات متعین کئے گئے ہیں اور سیکھنے والے حقیقت میں، فن کے سیکھنے کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

گلڈوں کے تمام تر معاملات ان ہی میں سے موثر لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروہ انجام دیتا تھا۔ گوپا گیری یا گوالیار میں تیلیوں کی ایک شرینی میں دس سرکردہ لوگ تھے جن کو مہتا کا س کہا گیا ہے۔ جبکہ مالیوں کی ایک شرینی میں سات سرکردہ لوگ تھے جن کو مہاراس کہا گیا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ گلڈ کے معاملات کو چلانے والوں کی تعداد اور اس کا نام ایک ہی جگہ پر بھی ایک دوسرے سے الگ الگ ہوسکتا تھا یہاں تک کہ ایک ہی علاقے میں یہ اختلافات شاید اور زیادہ رہے ہوں گے۔

یہ گلڈیں آپس میں ایک دوسری کی مدد کے لئے بنی ہوئی انجمنیں ہوتی تھیں۔ جن کا مقصد اپنے ممبروں کو کسی ناگہانی کے وقت یا قدرتی آفات اور ظلم وزیادتی کے وقت مدد پہنچانا ہوتا تھا۔ گلڈوں کی مجموعی ذمہ داری میں عمومی معاشی فائدے کو بڑھاوا دینا تھا۔ جس سے اندرونی اور باہری مقابلہ سے حفاظت ہوسکے۔ ان کی مشترکہ خصوصیت کی جھلک ان کے اجتماعی کاموں اور امانتوں کو سنبھال کر رکھنے میں بخوبی دکھائی پڑتی ہے لیکن اس بات کے واضح ثبوت نہیں ہیں کہ گلڈس

نے اس دور میں ایک اکائی کے طور پر پیداوار کو منظم کرنے یا کوئی معاشی مہم چلانے کی جانب کوئی پیش قدمی کی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایسی مثالیں ملتی ہیں جس میں گلڈس کو کسی باہری آدمی سے ایک بڑی رقم موصول ہوئی جس کے عوض میں گلڈ کے ممبران اس بات پر رضامند ہوئے کہ وہ ان کو انفرادی طور پر مستقل تعاون (خواہ نقدی یا جنس میں) دیں گے جمع شدہ رقم بظاہر گلڈ کے فنڈ میں جمع ہوتی ہوگی۔ جس کا خود اپنا کوئی اشتراکی ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے ممبران کے ذریعہ دئے گئے چندوں پر انحصار تھا۔ اس بات کا امکان ضرور ہے کہ یہ گلڈیں اپنے فنڈ کو بڑھانے کی غرض سے رقم بطور قرض سود پر دیتی ہونگی، جو ہر کوئی کرتا تھا۔ مثال کے طور پر تیرہویں صدی عیسوی میں راجستھان کے بھینمال میں جگت سوامین کا سورج مندر (جیسا کہ اودیا سمہادیوا وکرم سمت 1306/ 1249 عیسوی کے بھینمال پتھر کے کتبوں میں دکھایا گیا ہے)۔ یہ بہر حال ایک بینکری کی شکل میں کام کر رہی گلڈ (یا مندر) سے بالکل مختلف صورتحال تھی۔

اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ بہت سے کاریگر ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں کام کے لئے تاجروں پر منحصر رہتے تھے۔ گوکہ اس طرح کے انحصار کی کوئی مثال بیشتر کاریگروں اور ان کے گروہوں کی نہیں ملتی ہے۔ آٹھویں صدی کے نرداسمرتی پر تبصرہ کرتے ہوتے اسہائے نے شرینی کو ان دستکاروں کے معنی میں استعمال کی ہے جو ان سے منسلک تھے یعنی بڑے تاجروں پر منحصر تھے۔ ہمارے عہد کے اختتام میں شمالی ہند میں لکھے قانون کے مجموعے کرتیا کلپترو میں واضح طور پر دستکاروں کے دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو منحصر تھا (آشرت) اور دوسرا جو آزاد تھا (ان آشرت)۔ اس مین تاجروں کے درمیان کاریگروں کے بارے میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس کی مزید وضاحت ہیم چندرا نے سریشٹھن یا تاجر۔ ماہر مالیات کے طور پر کی ہے جو اٹھارہ گلڈوں اور جزوی گلڈوں کے قلعہ کا گورنر (درگ پالک) ہوتا تھا۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے چھٹی صدی کے آخر اور تیرہویں صدی کی ابتدا تک تاجروں کی گرام، نگر یا کوٹ (قلعہ) کے ناموں سے، مختلف کتباتی حوالوں سے عجیب وغریب انداز سے تاجروں کی بستیوں کی تصدیق اور توثیق ہوتی ہے۔ مغربی ہندوستان کے میترک حکمراں و شنوسین کے ایک چھٹی صدی عیسوی کے چارٹر میں مثال کے طور پر تمام کاریگروں کو تاجروں کے درمیان اقتدار کے ماتحت دیا گیا جیسے چینی بنانے والے، نیل کی رنگائی کرنے والے، شراب بنانے والے، ٹھٹھیرا، تیل نکالنے والے سرکہ تیار کرنے والے یا کڑوی شراب تیار کرنے والے۔ درزی، کپڑا بننے والے، جوتا بنانے والے، لوہا، آرہ کشی کرنے والے اور کمہار۔ ایک تاجر سردار (یا نائب رئیس بلدیہ) کا لوہار، آرہ کش، نائی، کمہار اور اس جیسے دوسروں کو بیگار کرنے پر مجبور کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ ان کاریگروں کے گروپوں میں سے کچھ کی ماتحتانہ پوزیشن کے بارے میں تفصیل سے جاننا ابھی باقی ہے۔

11.7 خلاصہ

ہمارے موضوع پر نسبتاً کم مطالعہ ہوا ہے۔ پھر بھی جو کچھ مواد اس موضوع پر موجود ہے۔ ان کتابوں سے جن کے مطالعے کے لئے نیچے مشورہ دیا گیا ہے اس میں بہت کچھ موجود ہے۔ اس سے ہمارے لئے شمالی ہندوستان میں سات صدیوں میں جو گپتا دور کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس میں معاشی پیداوار کے تسلسل اور اس میں بدلاؤ کے بارے میں جاننا ممکن ہے۔ جیسا پہلے سے چلا آ رہا تھا زرعی پیداوار کی پیش رفت ہنوز جاری رہی گوکہ کبھی کبھار کچھ نہ کچھ رکاوٹ ضرور آتی رہی ہے۔ عطیہ اراضی کے چارٹروں کے علاوہ، دوسرے ماخذوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ایسا سوچنا غلط ہے کہ عطیہ اراضی زرعی پیش رفت کے لئے ذمہ دار تھی۔ سینچائی کے مختلف ذرائع نے زراعت کو بلندیوں تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا تھا خاص طور سے کشمیر راجستھان اور گجرات کے علاقوں میں ہے اور جزیرۂ ہندوستان میں بھی۔

ایسی ہی ترقی دستکاری پیداوار میں بھی دکھائی پڑتی ہے۔ جس میں مختلف قسم کی ایجادات ہوئیں اور جو یادگاری فن تعمیر اور دیگر میدانوں میں نظر آتی ہیں۔ آر۔ ایس۔ شرما نے مثال کے طور پر ابتدائی عہد وسطیٰ کے تعلق سے بہار (اور جھارکھنڈ) کے سلطنت دور پہلے کے مادی باقیات کے اپنے سروے میں بہت زیادہ پایا ہے۔

ابھی ایسی کوشش کی مزید ضرورت ہے۔ جس سے عہد وسطیٰ کی معیشت کی پیش رفت کو واضح کیا جا سکے۔ لیکن جو کچھ معلومات ہمیں ہیں ہے اس سے اس خیال کا باطل ہونا بالکل واضح ہے جو مشرق یا عہد وسطیٰ کے جمود اور بغیر کسی بدلاؤ والا افسردہ تصور تھا۔ معیشت کے عروج کی کوئی بھی تلاش میں یقیناً رجعت، بندش اور

بحران کے مسائل سے بھی متعلق ہوگی۔

آخر میں آپ پھر یہ نوٹ کر سکتے ہیں۔ کہ جب آپ اپنی مشق کرنے کے لئے دوبارہ پڑھیں گے، اس اکائی میں زرعی اور دستکاری پیداواروں کی نہ صرف تفصیلات دی گئی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان طریقوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے ذریعہ ان تفصیلات کو مختلف ماخذوں سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ اور اس دوران ہمارے علم میں جو خلاء نظر آتا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

11.8 مشقیں

(1) اراضی عطیہ کتابات کو آپ کس طرح زرعی توسیع کے عمل سے وابستہ کریں گے؟

(2) ابتدائی عہد وسطی میں مستعمل سینچائی کی تکنیکوں کا اختصار کے ساتھ تجزیہ کریں۔

(3) ابتدائی عہد وسطی میں کھیتوں کی سینچائی کے لئے کون سے روایتی طریقے استعمال کئے جاتے تھے؟

(4) چھٹی سے تیرہویں صدی کے دوران شمالی ہند میں فصلوں کے نمونے (pattern) کیا تھے؟

(5) چھٹی سے تیرہویں صدی کے دوران شمالی میں دستکاری پیداوار کی تنظیموں کی ہیئت کا تنقیدی تجزیہ کیجئے؟

(6) کن معنی میں چھٹی سے تیرہویں صدی کے دوران دیہی علاقوں میں دستکاری پیداوار کی تنظیم شہری مراکز میں موجود پیداواری تنظیم سے مختلف تھی؟

11.9 معاون کتب

چکرورتی، رنبیر، (2000)، اپینڈکس ان بی، ڈی، چٹوپادھیائے (مرتب)، اے سورس بک آف انڈین سویلائزیشن، کلکتہ۔

چکرورتی، رنبیر، (1990)، آسپیکٹس آف رورل سیٹلمینٹس اینڈ رورل سوسائٹی ان ارلی میڈیول انڈیا، کلکتہ۔

چٹوپادھیائے، بی۔ ڈی، (1990)، آسپیکٹس آف رورل سیٹلمینٹس اینڈ رورل سوسائٹی ان ارلی میڈیول انڈیا، کلکتہ۔

چٹوپادھیائے بی۔ ڈی۔ (1994)، دی میکنگ آف ارلی میڈیول انڈیا، نئی دہلی۔

چودھری، اے، کے (1971)، ارلی میڈیول ولیج ان نارتھ، ایسٹرن انڈیا (1200-600 اے، ڈی)، کلکتہ۔

گھوشال، یو، این، (1955) اکنامک کنڈیشن، ان آر، سی، مجمدار (مرتب)، دی ایج آف امپیریل قنوج، بمبئی۔

گھوشال، یو، این، (1957)، اکنامک لائف، ان آر، سی، مجمدار (مرتبہ) دی اسٹرگل فار ایمپائر، بمبئی۔

گوپال، ایل، (1980)، آسپیکٹس آف ہسٹری آف ایگریکلچر ان اینشینٹ انڈیا، وارانسی۔

حبیب، عرفان (1992)، پرسوئنگ دی ہسٹری آف انڈین ٹیکنالوجی، شوشل سائنٹسٹ، نمبر 226-27، صفحات 1-21۔

حبیب، عرفان (2000) انڈیا، ان ہسٹری آف ہیومینیٹی: سائنٹیفک اینڈ کلچرل ڈیولپمینٹ، جلد V، فرام دی سیونتھ ٹو دی سکس ٹینتھ سینچری، یونیسکو، صفحات 398-410۔

حبیب، عرفان (2000)، جوزف نیدھم اینڈ دی ہسٹری آف انڈین ٹیکنالوجی، انڈین جنرل آف ہسٹری آف سائنس، 35.3، صفحات 245-74۔

جھا، وشوا موہن، (فورتھ کمنگ)، اکنامی آف نارتھ انڈیا، ان آر، ایس شرما (مرتب)، کمپریہنسیو ہسٹری آف انڈیا، جلد IV، صفحہ 2، ch.XX(c)، نئی دہلی۔

کوسامبی، ڈی۔ ڈی۔ (1975)، این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری، دوسرا ایڈیشن، بمبئی۔

نیوگی، پشپا (1962)، کنٹربیوشنز ٹو دی اکنامک ہسٹری آف نارتھرن انڈیا، کلکتہ۔

ساہو، بی، پی، (1997)، لینڈ سسٹم اینڈ رورل سوسائٹی ان ارلی انڈیا، نئی دہلی۔

شرما، آر، ایس، (مرتب) (1980) انڈین فیوڈل ازم، دہلی۔

شرما، آر، ایس، (1987)، اربن ڈیکے ان انڈیا، نئی دہلی۔

تھاپر، رومیلا (2002)، ارلی انڈیا، پینگوئن۔

یادو، بی۔ این، ایس، (1973)، سوسائٹی اینڈ کلچر ان نارتھرن انڈیا ان دی ٹولفتھ سینچری، الہ آباد۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY * MANUU * HYDERABAD
Accn. No MA-026
Date 03.08.2015

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad-32
IMC LIBRARY

اکائی 12 درجہ بندی کی نوعیت اور ابتدائی عہد وسطی میں شمالی ہند کی علاقائی تصویر: 550 عیسوی سے 1300 عیسوی تک

ساخت

12.1 تعارف

12.2 زمین کی ملکیت

12.3 زرعی معاشرے پر ریاست کا دعویٰ

12.4 ریاست اور درجہ بندی۔1

12.5 ریاست اور درجہ بندی۔2

12.6 کاشتکار، بٹائی دار اور زمین دار: زرعی معاشرہ نیچے سے

12.7 خلاصہ

12.8 مشقیں

12.9 معاون کتب

12.1 تعارف

ابتدائی ہندوستانی معاشرہ کچھ بھی تھا لیکن ایک جیسا نہیں تھا۔ اس وقت لوگوں میں تمام طرح کے اختلاف تھے۔ اور اس اختلاف کی بنیاد طبقات پر تھی۔ ذات پات اس کی ایک عام فہم مثال ہے۔ کسی بھی ایک علاقہ میں متعدد ذات کے لوگ رہتے تھے۔ جو آپس میں مراتب کی بنیاد پر منظم تھے۔ کوئی بھی دو مختلف ذات کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے برابر نہیں تھے دوسرے لفظوں میں یہ سماج ذات کی بنیاد پر طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی سماج کی دوسرے نمونوں پر درجہ بندی کی گئی تھی۔ ہم اس یونٹ میں اسی درجہ بندی پر گفتگو کریں گے جس کی زندگی کا دارومدار زرعی معاشرہ پر تھا۔

ابتدائی عہد وسطی کے شمالی ہندوستان میں زمین ہی سب سے اہم ذریعہ معاش تھی جیسا کہ تمام ماقبل صنعتی اشیائے خوردنی معاشرہ میں پایا جاتا تھا۔ لوگوں کی کثیر تعداد۔ جیسا کہ تقابلی ثبوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً 90 فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کی زندگی کا دارومدار زراعت پر تھا۔ اس کے ساتھ مچھلی پالن اور مویشی پالنا بھی اس سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی جو زرعی پیداوار سے جڑے ہوئے تھے مختلف قسمیں تھی۔ جس کی بنیاد زمین کی غیر مساوی تقسیم پر تھی۔ زرعی پیداوار میں ملوث عوام کے بیچ۔ زمین کی غیر مساوی تقسیم کی بنیاد پر۔ اہم درجہ بندی تھی۔ اور پیدا آوروں سے وصولی گئی زائد پیداوار کی غیر مساوی تقسیم کی بنیاد پر (کافی کم لوگ کے درمیان) ممکن ہے اور بھی بڑی درجہ بندی تھی۔ اس زائد پیداوار کے ایک حصہ کے دعوے کی بنیاد پر زمیندار کا حق مالکانہ تھا (وہ مالکان زمین جو خود سے کاشت نہیں کر سکتے تھے) اور مالدار کسان (وہ کسان جن کے پاس اتنی زمین تھی کہ وہ خود سے تھوڑی سی زمینوں پر کاشت کر سکتے تھے اور باقی زمین پر دوسروں سے کاشت کراتے تھے)۔ بہرحال تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ریاست کا اہم کردار تھا اور اس کا زمین، اس کی پیداوار پر اور مزدور طاقت پر بھی دعویٰ ہوتا تھا۔

جیسا کہ ہم نے پچھلی اکائی میں دیکھا ہے کہ زرعی تعلقات سے متعلق اسکالروں نے خاص توجہ اس طرف کی ہے۔ زرعی سماجوں سے متعلق شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے سیکڑوں آراضی عطیات کتبوں سے اطلاعات ملتی ہیں۔ لیکن زرعی درجہ بندی سے متعلق تمام زرعی پہلوؤں پر یکساں معلومات کا فقدان

ہے۔زیادہ تر معلومات مالکان زمین کے وجود پذیر ہونے سے وابستہ ہیں۔مختلف علاقوں سے ملی کتباتی تفصیلات کا جائزہ اس پہلو سے لیا گیا ہے کہ جس سے زرعی معاشرہ میں تبدیلی کا ایک عام سلسلہ زمین سے جڑے درمیانی گروہ، انٹرمیجریز (Intermediaries) کے وجود پذیر ہونے کی وجہ سے شروع ہوا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے زرعی گروپوں اور درجہ بندی کے دوسرے طریقے جو اراضی عطیات کے باعث ہیں، کو بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔علاقہ اور خطہ، ان دوسرے طبقات کے متعلق مخصوص معلومات بھی تقریباً ان ہی اراضی عطیات کے کتبات سے حاصل ہوتے ہیں جو زمین کے متعلق انٹرمیجریز کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔اس کا نتیجہ میں ان علاقوں اور ادوار میں زرعی معاشرت کے بارے میں شمالی ہندوستان میں ابتدائی عہد وسطی میں جس کے لئے ہمارے پاس زمینی عطیات کے کتبات ہیں، بیش قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

چنانچہ ان کتبات کی عدم دستیابی کا مطلب زرعی ساخت اور حیثیت سے متعلق ہماری معلومات میں خلا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ابتدائی عہد وسطی میں پورے کے پورے پنجاب میں اور تقریباً چار سو سال تک مابعد گپتا اور مابعد پرمارا مالوہ علاقے میں۔جو کہ زرعی پیداوار کے لحاظ سے وسط ہندوستان کا بہت ہی وسیع کاشت کا علاقہ تھا اور اس سے بھی زیادہ ابتدائی تاریخی دور میں، ہم تقریباً تاریکی میں ہیں، زرعی نظام کو جاننے اور سمجھنے کے لئے کیونکہ ہمارے پاس اس علاقے سے متعلق زمینی عطیات کے کتبات ناپید ہیں۔سوائے راج ترنگنی کے۔ادبی ماخذوں کو علاقائی زرعی ساخت کو از سر نو تعمیر کرنے کی غرض سے نہیں کھنگالا گیا ہے۔

ابتدائی عہد وسطی میں زرعی درجہ بندی کے متعلق ایک عام تصور کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔جو کہ جاگیرداری نظام پر بحث کا موضوع ہے جس کے بارے میں ہم تفصیل سے علیحدہ اکائی 10 میں پڑھ چکے ہیں۔

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ایک پہلو جس کی اہمیت پر تمام اسکالر متحد ہیں اور جس پر کافی زور دیتے ہیں، لیکن اس پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔تمام مورخین خواہ وہ کسی مکتب فکر کے ہوں، ان کو عرصہ سے اس بات کا قائل کیا گیا ہے، اور بالکل صحیح ہے، کہ ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستان کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے علاقائی سیاق وسباق کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔شمالی ہندوستان کے ابتدائی عہد وسطی میں علاقائی تصورات ایک مطلوبہ چیز ہے، موضوع اور عہد میں بھی، جہاں اس کے امکان کو بہت واضح انداز میں پہچانا گیا ہے۔لہذا 1965 میں آر۔ایس۔شرمانے۔ایک مکمل علاقائی سروے ان گاؤں کا کیا ہے جو مذہبی پیشواؤں، مندروں، منصب داروں اور نوکر شاہوں کو دیئے گئے۔جس کو ترکوں کی فتح سے دوصدی قبل دستیاب اراضی چارٹروں کی بنیاد پر کوشش کی جاسکتی تھی۔جو زمین سے متعلق موجود چارٹر کی بنیاد پر ضروری ہے۔(شرما 1965، صفحہ 10 2)۔ایسی کوئی کوشش اب تک نہیں کی گئی، جیسا کہ آپ اس اکائی میں منتخب کتابوں کے مطالعے سے اور اس میں دئے گئے حوالات سے جان سکے گے۔

علاقہ جاتی زرعی ساخت میں یکسانیت کے متعلق ہم بہتر معلومات رکھتے ہیں بمقابلہ علاقائی زرعی معیشت میں اختلافات کے۔کسی جگہ کی دولت کے بیچ خصوصی تفصیلات (شاید ہی کوئی کتباتی مفروضہ ہے جو صحیح مکانی حوالے کے بغیر ہو) اور کچھ علاقائی مطالعوں کے باوجود (جیسے کہ بی۔ڈی۔چٹوپادھیائے نے اور مارلین، نیاماش کے ذریعہ کئے گئے مطالعے) زرعی درجہ بندی کی علاقائی پہچان۔جس کی بنیاد کسی مخصوص علاقے سے متعلق، مخصوص خصوصیات کے گہرائی سے موازنہ پر منحصر ہیں۔واقعی شمالی ہندوستان کے ابتدائی عہد وسطی میں زرعی مناظر کی تصویر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی ہے۔

زرعی تصور کی علاقائی رنگارنگی سے متعلق ہماری معلومات محض پیش نامے سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔اس کی وجہ بتانا آسان نہیں ہے۔شاید زرعی درجہ بندی کے معاملہ میں کچھ فائدہ کو بہت دخل رہا ہوگا۔جس کو جاگیرداری بحث نے دوبارہ منظر عام پر لا دیا ہے، جس میں بہت اہم نکات سامنے آئے اور اس کی وضاحت کی گئی جیسے کہ بیگار اور کرایہ مزدوری کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا (اگر کاشتکار ہفتہ میں چند روز یا مہینہ بھر مالک زمین کی زمین پر کام کرتا ہے جو اس زمین کے عوض میں جو اس کو دی گئی ہے تو مالک زمین ان کو اس کام کی مزدوری دیتا ہے۔بیگار جس کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا ہے اور لازمی خدمات ہوتی ہیں جو الگ سے اپنے سیاسی آقاؤں کے لئے انجام دیتے ہیں خواہ وہ راجہ ہو یا اس کا ماتحت)۔بہرحال بعض صف اول کے مورخین اور ابتدائی ہندوستان کے مورخین کے لئے ایک تعطل پیدا ہوگیا ہے۔یہاں تک کہ ہرمان کلکے نے اپنی عام تاریخ ہندوستان میں زرعی تاریخ کو سرے سے فراموش کردیا جس میں وہ ابتدائی عہد وسطی میں

سیاسی ساخت پر تفصیلی بحث کر رہے ہیں۔ دیگر مورخین پورے جوش میں تمام طرح کے اختلافات حقیقی اور مصنوعی (Putative)، میں الجھ گئے۔(تجارت ،سکہ سازی، شہریت، برہمن بستیوں کی اہمیت جاگیرداری سیاست)۔ لیکن انہوں نے اپنی کتابوں میں زرعی تاریخ کے مباحثہ سے گریز کیا۔ (بی پی ساہو 1997 اور رنبیر چکروتی 2000) بطور جائزہ اس نتیجہ سے بچنا ناممکن لگتا ہے کہ ابتدائی عہد وسطی کے زرعی ساخت کی تحقیق پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

12.2 زمین کی ملکیت

ہندوستان میں ابتدائی زمانے میں زمین کی ملکیت کا سوال پر بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے یہ شاہی ملکیت تھی۔ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ انفرادی یا ذاتی ملکیت تھی جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ فرقہ کی ملکیت تھی۔ ان سارے دعووں کے پیچھے ماخذوں میں اس کے ثبوت ملنے کا امکان بھی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی Xuan Zang (ساتویں صدی عیسوی) کو بنیاد بنا کر ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستان کے بارے میں یہ دعوی کرسکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ریاست اگر قانوناً نہیں تو زمین کی مالک تھی (یو، این گھوشال 1929، صفحہ 303) اس بات کا پورا پورا امکان موجود ہے کہ اس طرح کے ثبوتوں کی سچائی کے اوپر مباحثہ کیا جائے اور اس طرح سے دلیل دی جائے کہ Xuan Zang نے ہندوستان کے حالات کا صحیح ڈھنگ سے اندازہ نہیں لگایا کیونکہ وہ چین کے پس منظر میں چیزوں کو دیکھنے میں صحیح راستہ سے بھٹک گیا (گھوشال 1929)۔

بہر حال ثبوتوں کی یہ الجھن اور پھر ان کی ترجمانی لاتحل نہیں ہے۔ یہ پوچھنا صحیح نہیں ہے کہ کیا ریاست یا فرد/گروپ زمین کا مالک تھا۔ کیونکہ درحقیقت دونوں ہی متوازن طور پر زمین کے مالک تھے لیکن فرق کے ساتھ۔ جیسا کہ پی، وی کانے نے اپنی یادگار کتاب ہسٹری آف دھرم شاشتر میں واضح کیا ہے کہ ''ایسا لگتا ہے کہ ریاست تمام زمینوں کی ایک عام فہم زبان میں مالک تھی۔ لیکن فرد اور گروپ جو اپنے قبضہ کی زمین کی کاشت کرتا تھا وہ اصولاً اس زمین کا مالک تھا۔ بشرطیکہ وہ زمین کا ٹیکس ادا کرے اور ریاست کے اس حق کو بھی تسلیم کرے کہ ٹیکس ادا نہ کرنے کی صورت میں ریاست زمین کو بیچ بھی سکتی ہے''۔

لہذا یہ ایک قسم کا ہم زمان حق تھا۔ درحقیقت کانے کے ذریعہ اس سوال کا مستند جائزہ (Magisterial Survey) سے پہلے سرکردہ اسکالروں کے جیسے ولکس، ڈوبوئس، الفنسٹن، پیٹن، چیمبیئر اور ولسن نے بھی اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے لفظ ''مالکانہ'' (owned) کو اوپر کو ما کے اندر دیا ہے کیونکہ ہندوستان میں ابتداً جائداد (سواتو) کے عجیب وغریب تصور کی وجہ سے جہاں زمین پر تمام طرح کے حقوق کو مختلف سیاق وسباق میں دیکھا گیا جو جائداد کے دائرے میں آتے ہوں یہاں تک کہ ذیلی رہن کا حق بھی۔ لہذا زمین کو کبھی راجہ کے سواتو فرد کا یا کاشتکار کسان کا (سواتو) کے طور دیکھا گیا ہے۔ غالباً زمین کو اس انوکھے انداز سے دیکھنے میں ناکامی ہی بنیادی وجہ رہی ہوگی، زمین کی ملکیت پر بحث کے علاوہ اس کے متوازی حقوق کے تصور کو نہ ماننے کی وجہ سے بھی۔

ان مختلف النوع مالکوں کے بیچ ایک وہ بھی ہوتا تھا جو بطور مالک کی تمام حقوق اپنے پاس رکھتا تھا۔ یہ لوگ جیسا کہ کانے کہتا ہے، فرد اور گروہ تھے جو اپنے قبضہ کی زمین کی کاشت کرتے تھے یعنی کاشتکار عوام اور مالک زمین جو اصولاً مالک (Owner) کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کا لقب (اگم لفظی معنی قانونی حصول) آگم تھا۔ اپنی زمین پر جو مول سوامی (بنیادی مالک) کہے جاتے تھے جو دیگر سوامی سے مختلف ہوتے تھے۔ یا بھومیکا یعنی جن کے پاس اپنی زمین ہوتی تھی۔ یہی لوگ تھے جو زمین کا لگان دیتے تھے۔ اس کے کاشت کے طریقے کے متعلق فیصلہ لیتے، جو اس کو مکمل یا حصہ بھر ہدیہ دینے کی پوزیشن میں ہوتے تھے اور جن کے بچے اس کو ورثہ میں اس کے تمام حقوق پانے کے مستحق ہوتے تھے (قانونی 'واقعہ' کا مطلب استحقاق، بوجھ اور حق جو زمین سے متعلق ہوتا ہے)۔

رعایا کا زمین ملکیت سے متعلق حق راجہ کے لئے بھوپتی زمین کا مالک اور بھوا سوامن، زمین کا مالک جیسے لفظ سے بے ادبی مراد نہیں ہے۔ یہ الفاظ ریاست کے بین اور واضح حقوق کی نشاندھی کرتے ہیں۔ یہ حقوق سلطنت کے زمین پر مالکانہ حقوق کے مخالف نہیں ہے جو ان کو مزارع یا لگان دار بناتا ہے، اسی طرح جیسے راجا کے لئے دوسرے لفظ نرپتی، لوگوں کے آقا جو رعیت کی آزادی کو نہیں چھنتا ہے اور نہ ان کو غلام بناتا ہے۔

12.3 زرعی معاشرے پر ریاست کا دعویٰ

یقیناً بھوپتی اور نرپتی جیسے لفظ سے زمین اور لوگوں پر ریاست کے چند حقوق کی ضرور نشاندھی ہوتی ہے۔ ان حقوق کے متعلق تفصیلات قانونی اور کتابتی ادب میں کثرت سے ملتی ہیں۔ بہرکیف شاہی بنام انفرادی ملکیت زمین کی بحث میں خاص طور سے ابتدائی عہد وسطی کے زرعی ساخت کے اوپر بحث کے تناظر میں ان حقوق کے دعوؤں کی صحیح صحیح نشاندھی نہیں ہوسکی ہے۔ شاہی ملکیت کی طرفداری کا مطلب کسانوں کے زمینی حقوق سے مکمل انکار نہیں ہے۔ اس کے برعکس انفرادی حقوق کے دعوی سے ریاست کا حق صرف پیداوار پر بقدر ٹیکس کے رہ جاتا ہے۔

ریاست صرف محصول کی حصولیابی کی حیثیت سے اٹھ کر زرعی معاشرے میں اپنے وجود کا، اپنے تمام تر حقوق کو اپنے دائرے اختیار میں لاکر احساس دلاتی ہے۔ چنانچہ زمین کی پیائش یعنی ٹیکس کے لئے زمین کی قدر و قیمت کا ندازہ لگانا ہے، کی حقیقت پر ریاست ہر کھیت سے پیداوار کے ایک مخصوص حصہ کا دعویدار ہوتی تھی اور اسی کے مطابق اس پر ٹیکس لگاتی تھی۔ مثال کے طور پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ نویں صدی میں آسام میں زمین کا ایک حصہ بطور گرانٹ دیا گیا تو اس کے بارے میں دھان کے پیداوار کا تخمینہ دو ہزار کے برابر لگایا گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ریاست کے ذریعہ اس کا اس طرح تخمینہ لگایا گیا۔ قانون کی کتابوں میں ان مالکان زمین پر جرمانہ لگایا ہے اگر وہ زمین کی باقاعدہ کاشت نہ کریں اور امید سے کم پیداوار کرتے ہوں اور اس طرح خزانے کو نقصان پہنچاتے ہوں۔ پیداوار کی کمی کا مطلب تھا کچھ وقت بعد زمین کی ملکیت کا حق چھننا اس معنی میں حقیقتاً زمین ریاست کی ہی تھی۔

افراد (اور گروپ) زمین کے مالک اسی صورت میں رہ سکتے تھے کہ وہ اسکو قابل لحاظ حد تک قابل کاشت رکھیں۔ باقی تمام علاقہ راجہ کے براہ راست قبضہ میں ہوتا تھا جس کی ہر ممکن کوشش اس زمین کو کسی نہ کسی لائق بنانے کی ہوتی تھی۔ لوگوں کو نجی خطابات کے تحت ان زمینوں کو نوآباد کرنے کے لئے ابھارا جاتا تھا جیسا کہ ہم پچھلی اکائی میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ابتدائی عہد وسطی میں ریاست بذات خود اس طرح کا نظم کرتی تھی جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے۔

راجہ بحیثیت بھوپتی، تمام علاقہ پر اس کی عام ملکیت ہونے کی وجہ سے وہ اپنی زمین (بشمول جنگلاتی دولت) سے ہر طرح کی پیداوار سے ایک حصہ کا دعویدار ہوتا تھا نہ کہ صرف مخصوص فصلوں کے حصہ پر۔ پھل، پھول، سبزی، تیل، گھی، ایندھن، ہر چیز جو ریاست کی زمین پر پیدا ہوتی خواہ وہ زمین کے اوپر یا زمین کے نیچے، اس کے دائرہ دعویداری سے باہر نہیں تھی۔

راجہ کے نرپتی ہونے کی حیثیت سے ریاست مزید دو قسم کے مطالبے رعایا کے اوپر اپنی مکمل ملکیت دکھاتے ہوئے کرتا تھا۔ وہ سب کے سب واضح طور سے ان کے تابعدار اور ماتحت ہوتے تھے۔ جو کہ قانونی طور پر (شاستروں کی بنیاد پر) پر تسلیم شدہ تھا۔ اگر کسی سے قانون کی خلاف ورزی سرزد ہوتی ہے تو اس پر جرمانہ کیا جاتا تھا۔ دوسری قسم کا مطالبہ عمومی خدمت سے جڑا ہوا تھا۔ جو مزدوری ٹیکس سے علیحدہ ہوتا تھا جو مخصوص آبادی خاص طور پر کاریگروں پر لگایا جاتا تھا۔

ایک کتبہ میں ایک مقولہ اس طرح سے درج ہے راجہ کو یہ زیب نہیں کہ وہ اسی زمین کو ضبط کرے جو اچھے یا ایماندار لوگوں (Sadbhih) کے ذریعہ عمدہ طریقہ سے جس کی کفالت (Pripalitam) کی جاتی ہو۔ آپ کو پہلے ہی یہ سمجھ میں آچکا ہے کہ اچھے طریقے سے زمین کی کفالت کرنے (Proper Maintenance) کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن لوگ بھی اچھے اور ایماندار Good /honest ہونے چاہئے۔ اگر لوگ ٹھیک ٹھیک ڈھنگ سے اپنے کام کو انجام نہیں دیں گے تو اس صورت میں ریاست عام طور سے ان سے زمین واپس نہیں لیتی ہے بلکہ ان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی وجہ سے ان پر جرمانہ عائد کریگی۔ جرمانے سے حاصل ہونے والی رقم ریاست کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھی کیونکہ اس کا استعمال سماجی کاموں رکھ رکھاؤ میں ہوتا تھا۔ درحقیقت سنسکرت میں لفظ ڈنڈ کے معنی جرمانہ اور سزا دونوں ہیں جیسا کہ اس کے یہی معنی ہندی میں بھی دوسری ہندوستانی زبانوں میں سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدائی عہد وسطی میں ریاستی ریکارڈوں میں ایک عام فہم محاورہ ''ڈند دشا اپرادھ'' جس میں 10 جرائم کے لئے سزا جرمانے کی شکل میں بیان کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ اس سے 10 جرائم مراد ہیں بلکہ اس سے مراد دس قسم ہیں جس کا تذکرہ قانون کی کتابوں میں ہے جو تقریبا ایک ہی زمرے میں آتے ہیں ڈنڈ۔ دشا اپرادھ عدالتی جرمانہ معلوم پڑتا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال درج ذیل اقتباس میں ملتی ہے جو گجرات کے میتر یکا راجہ کا 592ء کا ہے۔

کسی کو مارنے (دوسرے شخص کو) اور گھسیٹنے یا ایک کان کاٹنے پر 27 روپک کا جرمانہ ہے۔تشدد کے ذریعہ زبانی چوٹ یا زخم پہنچانے پر جرمانہ 6 1/4 روپک کا ہے۔اگر (مستقل) زخم کا نشان نظر آتا (پٹائی کے نتیجے میں) ہے تو جرمانہ کی رقم 48 روپک ہے۔

اپی گرافیا انڈیا، جلد 30، صفحہ 81-163، ڈی۔ڈی۔کوسامبی کا ترجمہ (روپک ایک طرح کا چاندی کا سکہ تھا)

عوام پر اپنی بادشاہت کے زعم میں ریاست ان سے بہت سی قسم کی خدمات کا حق بھی رکھتی تھی۔اس طرح کی بیگار کا رواج ہر جگہ تھا اور اس کو عام طور سے وشتی (Vishti) یا پیڈا (Pida) کہا جاتا تھا۔کشمیر میں اس کو بھروڈھی (Bharodhi) (روڑھ بھروڈھی) آسام میں اکھیتن سے غالباً یہی مراد تھا۔بیگار بہت طرح کی ہوسکتی تھی جس کا انحصار کام کی نوعیت پر تھا۔جیسا کہ لفظ بھروڈھی سے پتہ چلتا ہے کشمیر میں بیگار سے مطلب سامان ڈھونا تھا اس کے باوجود کلہن نے 13 قسم کے بیگار گنوائے ہیں۔کتبات عام طور پر تمام (سرو) قسم کے بیگار یا مخصوص موقع پر لی جانے والی بیگار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔لیکن نیپال کے بارے میں مخصوص قسم کے بیگار کا ذکر ملتا ہے۔ایک دلچسپ (اور قابل فہم) مثال بھوٹا وشٹی کی ہے یعنی وشٹی جس میں تبت کی طرف مال ڈھونے والے شامل تھے۔بیگار لئے جانے کے سلسلے میں اس بات کا دھیان رکھا جاتا تھا کہ وہ ایک زائد پیداوار سے جڑے ہوئے نہ ہوں تاکہ اس کا اثر عوامی پیداوار پر نہ پڑے جس سے محصول میں فرق آئے جیسے کہ بیج بونے کا وقت ہو یا فصل کاٹنے کا وقت ہو۔

12.4 ریاست اور درجہ بندی-1

ریاست کے ذریعہ گاؤں کے وسائل گاؤں سے باہر لے جانے کی وجہ سے گاؤں میں غریبی اس قدر عام ہوگئی کہ اس کی وجہ سے زرعی معیشت کی درجہ بندی پر شاید ہی کوئی اثر پڑا ہوگا۔بہر حال، اگر رجعت پسندانہ محصول کا بوجھ بہت زیادہ تھا، جیسا کہ اندازہ ہوتا ہے، تو یقیناً اس سے شگاف اور بڑھ گیا ہوگا۔رجعت پسندانہ Regressive taxation کا مطلب ہے ریاست مطالبہ غیر متوازن ہو یعنی زیادہ بوجھ ان لوگوں پر ہو جو کم حیثیت ہوں بامقابلے ان کے جو مراعات یافتہ باحیثیت اور دولتمند ہوں۔جیسا کہ آپ ابتدائی عہد وسطی کے نظام سیاست کی اکائی میں دیکھیں گے۔مقامی شخصیات جیسے مہترا اور پٹاکل ریاست کے نظم ونسق جڑے ہوئے تھے۔اس براہ راست مداخلت اور اثر ورسوخ کی وجہ سے ان لوگوں نے محصول کو اپنے موافق بنانے کی ہر ممکن اور کامیاب کوشش کی۔

اس کے علاوہ ایسے لوگ اور ایسے ادارے بھی تھے جن کی زمین سرکاری طور پر یا تو ٹیکس سے مستثنیٰ تھی یا بہت ہی رعایتی در پر ٹیکس لگایا جاتا تھا۔بہت سے ریکارڈ مندروں اور برہمنوں کی زمین سے متعلق ہیں جو ٹیکس سے مستثنیٰ تھے (دیوا برہمانا۔بھکتی ورجم) یہ ایک طرح کی خصوصی رعایت تھی جو مجموعی طور پر تمام مندروں کے اخراجات کے لئے اور تمام برہمنوں کی ضروریات کے لئے نہیں ہوتی تھی۔درحقیقت زمینی عطیہ کی ایک خاص قسم تھی جس کو کرشاسن کہا جاتا تھا۔جس میں ٹیکس کے لوازمات جاری رہتے تھے خواہ رعایتی در پر ہی سہی۔برہمنوں کا منتخب طبقہ جس کو برہموتر کہا جاتا تھا انکے بارے میں کتباتی ثبوت اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ لوگ ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔دو قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ زمین جن کو برہموترا اور دیوتر علی الترتیب کہا جاتا تھا، اس کا وجود موجودہ دور تک پایا جاتا ہے برہموترا، برہموتر کی بھی بدلی ہوئی شکل ہے (جس کا مطلب ہے برہموتر کی زمین)۔

گاؤں سے ریاست کی حصہ داری نکال دینے کے بعد باقی حصہ کی کھپت گاؤں کے اندر ہی ہوتی تھی۔کیونکہ اس وقت کی صورتحال بھی کچھ ایسی تھی جو اس کی متقاضی تھی۔ریاست کی مسلح فوج اور ریاست کے ملازمین کی تنخواہ جس کی ذمہ داری ریاست کی تھی۔یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ان کو مقامی آمدنی سے ہی تنخواہ دی جاتی تھی۔علاوہ ازیں، گاؤں کے اور بہت سے وسائل میں جیسے سبزی، مچھلی اور دودھ وغیرہ جس میں سرکار کی حصہ داری ہوتی تھی اور جس کو نقد بیچنے کے لئے شاید ہی وہاں کوئی بازار ہوتا تھا۔اور جن کے سڑنے گلنے کا بھی ڈر رہتا تھا۔ان چیزوں کو طویل وقت تک سنبھال کر رکھنا یا کہیں دور دراز علاقہ میں لیجانا ایک مشکل کام ہوتا تھا۔آخر میں جنگی ساز وسامان اور سرکار کے غیر پیداواری کاموں کے لئے لوگوں کی مستقل ضرورت تھی، جس کے لئے لوگوں کو اپنا مقام چھوڑے بغیر تیار رہنا پڑتا تھا۔

ایک زندہ جاوید مثال اچھاٹا بھاٹا پرویشیہ 'a-chata-bhata-praveshya' چھاٹا اور بھاٹا کا داخلہ ممنوع، اس زمانے کے ریکارڈ میں اس کا مطلب بڑی رعایت کے ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آنا گاؤں والوں کے لئے خاص پریشانی کی بات تھی۔ چھاٹا بھاٹا ریاستی اہلکاروں پر مشتمل دوطرح کے لوگ تھے۔ اور عام طور سے اس محاورے سے اسی دوقسم کے لوگ مراد تھے۔ بہرحال، اڑیسہ میں سونپور سے ملے سوماوامشی رجاؤں کے دوتا بنے کے پلیٹوں کی کتبات کو ایک ساتھ تجزیہ کرنے سے معلوم پڑتا ہے کہ چھاٹا بھاٹا سے مراد عموماً سرکاری مشینری ہوتی تھی یہ ان دو ریکارڈوں میں بڑی یکسانیت ہے۔ ان میں سے ایک میں سرکاری اہلکاروں کو اسی سے ملتے جلتے لفظ راجا۔ پد، اپا جیونس استعمال کیا ہے جبکہ دوسرے میں چھاٹا بھاٹا جاتی کہا گیا ہے۔ (چھاٹا بھاٹا جاتیان اپی گرافیا انڈیکا، XI، نمبر 8، اے، عبارت کی لائن B:7-8 عبارت لائن 9) اسی طرح کا حوالہ چند یلا چارٹروں میں چھاٹاؤں کے داخلہ پر پابندی (نشدھ چھاٹا پروش) سے متعلق ہے جس کا نتیجہ یہ دیکھنے کو ملتا تھا کہ راجا راج پروش، چھاٹا اور دوسرے دیگر کو اس علاقے میں اپنے مخصوص حقوق چھوڑ دینے پڑے تھے۔

گاؤں اور ریاستی عملہ کی موجودگی اور بھی کئی طریقے سے دیکھی جاسکتی ہے۔ متیریکا اور راشٹرکٹا چارٹر میں اس اس کی نشاندہی راکینم آہست پر کشینیا (شاہی افسروں پر انگلی (مراد ہاتھ) بھی نہیں اٹھانی چاہئے) جو اپنے واضح مفہوم کے لئے ایک آسامی کتبہ میں درج ذیل تفصیلات سے بہت حد تک مشابہت رکھتا ہے۔

> یہاں داخلہ ایسے ظالموں کے لئے ممنوع ہے جس میں بشمول، دیگر کے علاوہ، رانی شاہزادہ، شاہی مصاحب ہیجڑے (خواجہ سرا) وہ لوگ جو ہاتھیوں کی نگہبانی اور جو کشتیوں کی لنگر اندازی پر معمور ہوتے ہیں، وہ افسران جو چوروں کا پیچھا کرتے ہیں اس کے علاوہ جو اپار یکار اٹیکس اور اتھیتن محصول لگایا گیا ہو۔
>
> (یو، این، گھوشال 1929، صفحہ 329)

دو باتیں دھیان دینے کی ہیں۔ یہ حوالہ زمین کے ایک ٹکڑے کا ہے نا کہ پورے گاؤں کا جس سے صاف ہے کہ داخلہ کا مطلب بغیر اجازت داخلہ سے نہیں ہے بلکہ اس سے وہ پریشانیاں مراد ہیں جو آنے والے ظالموں کو دی جانے والی خدمات کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ دوسری چیز ہے، اس طرح کی ذمہ داریاں جیسے ایک یا دو ہاتھیوں کی خبر گیری کرنا جس کا تقاضہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کو مہیا کرادیا جائے بلکہ اس سے جڑی خدمات بھی تھیں۔ مہابھارت پر ایک بعد کا تبصرہ اس کو بالکل واضح کردیتا ہے جو راجاؤں کی پسند ہے اور جو اپنے ہاتھیوں کو رعایا پر تھوپ دیتا ہے۔ اس سادہ لوح کو پرمعنی انداز میں وشتی کہا جاسکتا ہے۔ شاہی ہاتھیوں کی خبر گیری کرنے کی ذمہ داری بغیر خدمت کی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ کہ جنس میں ادائیگی سے۔

زرعی معاشرت میں حد درجہ بندی کی ایک خاص صفت اسٹیٹ کلاس اور دیہی آبادی کے درمیان دوری کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ (اسٹیٹ کلاس سے مراد وہ سماجی گروہ ہیں جو ریاستی آلات بنتے ہیں) اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس اسٹیٹ کلاس کا دارومدار زرعی طبقات کے اوپر بھاری لیکن غیر مناسب طریقے پر پڑتا تھا۔ عام کسانوں ہی کو اپنے پڑوسی سرکاری عملہ کے مطالبات کو جھیلنا پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر صرف وہی برہمن جن کی حیثیت شودر سے بہتر نہیں ہوتی ہے عموماً ان کو ہی بیگار کرتے ہوئے دیکھا جاتا۔ پہاڑی علاقوں جیسے کشمیر اور نیپال کے متعلق سچائی یہ ہے کہ اصولاً کوئی بھی یہاں تک کہ برہمن بھی اس بیگار سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ صرف کثرت سے پیسے دینے کے عوض میں اور بھوک ہڑتال کی صورت میں کشمیری راجاؤں نے چند ایک مذہبی پیشواؤں کو اس بیگار سے علیحدہ کردیا تھا۔ بہرکیف کام نہ کرنے کی صورت میں ان دونوں علاقوں میں جرمانے کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ وشتی رودھا بھرودھی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے دولتمند لوگ پیسے کا استعمال کرتے تھے۔ زرعی معاشرے میں پہلے سے موجود تقسیم کو اسٹیٹ کلاس کی موجودگی کی وجہ سے اس کو اور مزید بڑھاوا ملا۔

بہت مختصر حوالے شاہی (راجکیئے) زمین کی کتبات میں ملتے ہیں جس میں دکھایا ہے کہ سرکار کے پاس اپنی زمین تھی جس پر سرکار ویسے ہی کاشت کراتی تھی جس

MEDIA CENTRE ... LIBRARY ... Hyderabad

طرح مالک زمین کراتے ہیں۔ یہ اس سے تھوڑا الگ قسم کا تھا جس میں لوگوں سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔ ریاست کا اس طرح کا کردار بنگال کے دیوی پران کی نویں صدی کی عبارت میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے جس میں صلاح دی گئی ہے کہ راجا کو قلعہ سے ملے ہوئے نشیبی علاقہ میں خود ہی کاشت کرانا چاہئے اور اس کام کے لئے راجہ کے قریبی گاؤں کے رہنے والے (کھیتک) لوگوں کی خدمات (سیون کاریہ) اپنے لئے لینا چاہئے (یادو 1981، صفحہ 264) کشمیر میں جہاں ریاست کی عمدہ قسم کی زعفران کی فصلوں پر اجارہ داری تھی ایسے میں ریاست کا اس طرح کے کردار میں ہونا بالکل واضح نہیں ہے۔

زمینی عطیات کے کتبات کی وی، وی مراشی اور للن جی گوپال جیسے مشہور اسکالروں کے ذریعہ پیش کی گئی توجیہہ سے ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستان میں شاہی زمینوں کی ایک وسیع تصویر سامنے آتی ہے۔ جن میں راجہ کے ذریعہ عطا کئے گئے زمینوں کے عطیات کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے جو افراد کو دی گئی تھی۔ اسی طرح سے راجاؤں کے ذریعہ سینچائی کے وسائل بھی دینے کے متعلق مثالیں ملتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ راجا ایسی کوئی چیز کیسے دے سکتا ہے جس کا نہ وہ مالک ہے اور جو نہ اس کے قبضہ میں ہے؟ اس عقلی بنیاد پر ریاست کے ذریعہ زراعت کے انتظام کو ثبوت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس توجیہہ کی نبیاد اس خیال پر ہے کہ زمین کی ملکیت مخصوص اصطلاح میں یا تو ریاست کی تھی یا افراد کی تھی۔ اس توجیہہ کی مخالف توجیہہ بھی دی گئی ہے جو انہی ثبوتوں کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ ڈی، سی، سرکار کا مثال کے طور پر یہ خیال ہے کہ راجہ کسی فرد سے زمین خریدتا تھا تا کہ اسکو خرید کر بطور مقدس تحفہ پیش کیا جا سکے۔ درحقیقت اس قسم کی خرید کے کوئی ثبوت موجود نہیں ہیں نا ہی افراد کے عارضی طور پر کاشت کار ہونے کے۔

یہ موضوع زمین کی شاہی یا انفرادی ملکیت تھی، کے خیال سے مبہم ہو گیا ہے جو ہم کو بالکل بے سہارا بنا دیتا ہے۔ اگر ہم اس خیال کو چھوڑ دیں اور دوسرے متعلقہ ثبوت تلاش کئے جائیں تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ زمین پر مع وسیع حقوق تھے جو زمین بادشاہ بطور بھومی دا (زمین عطا کرنے والا) دیتا تھا۔ یہ ریاست کا دعوی تھا اس زمین پر جس کے مالک کسان تھے سوائے اس کے جو میتر کا راجہ شیلا دتیہ اول کے جیسر پلیٹ میں دکھائی دیتا ہے جب زمین کا کوئی حصہ کسی گم شدہ (اتسنا) کسان کا تھا۔ لہذا وہ پوری طرح ریاست کی چیز بھی جو بطور گرانٹ دی گئی تھی۔

زمین کے اوپر محصول اور زمین پر دیگر اختیارات اور زرعی درجات کو لوگوں کی ملکیت کی منتقلی کی اہم وجہ جس سے ریاست نے ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستان میں زرعی معاشرے کے کردار کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ اس پر مزید غور و خوض آگے کے سیکشن میں کیا جائے گا۔

12.5 ریاست اور درجہ بندی-2

شمالی ہندوستان سے متعلق اراضی عطیہ کے کتبات جو ہم کو دریافت ہوئے ہیں اس سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ زیادہ تر مذہبی لوگوں اور اداروں کو ریاستی دعووں کی منتقلی سے متعلق ہیں۔ ان عطیات سے زرعی ساخت پر مرتب ہونے والے اثرات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیکہ ہم ان دعووں کی تفصیلات میں جائیں جو عطا کی جا رہی تھی اور ساتھ ہی وہ شرائط جن کے تحت منتقلی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ہم ان عطیات کے بنیادی ڈھانچے کو سمجھ لیں گے اس سے متعلق دوسرے سوالات بشمول اس کے میزان کے سوال پر غور کریں گے۔

ان سیکڑوں ریکارڈ میں منتقلی سے متعلق تفصیلات کو یقیناً ہر جگہ یکساں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ ایک ہی طرح کی فرائض مختلف انداز سے بتائے گئے ہیں اور نہ تمام کے تمام ریاستی دعوے ان تمام ریکارڈوں میں جگہ پا سکے ہیں۔ مثال کے طور پر بھاگ اصل لگان یعنی وہ جو خاص پیداواروں پر لگائے جاتے ہیں، کے لئے بہت ہی عام قسم کا لفظ تھا۔ لیکن دانی اور ادرنگ (جو دیگر مقامات کے ساتھ ساتھ اتر پردیش میں ہرش وردھن کے مدھوبن کتبے میں موجود ہے) اس کے اہم اختلافات۔ عطیات کے طریقوں میں فرق کو مختلف حکومتوں کے چارٹر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے ہی تضاد کو آر، ایس شرما نے درج کیا ہے۔

> پالاوں اور پرتیہاروں کے زمانہ میں تمام زرعی حقوق جیسے کہ چراگاہوں، پھل دار درخت، پانی کے ذخائر، جھاڑیاں اور گھنی جھاڑیاں، جنگل، بنجر زمین، کمتر زمین، سیلاب زدہ ہونے والی زمین وغیرہ کے استعمال کرنے کا حق عطیہ پانے والے کو منتقل کیا جاتا تھا۔

بہرحال راشٹر کٹاؤں کے زمانے میں سوائے درختوں کی قطاروں کے، جس کا بھی ذکر بعد کے عطیات میں آیا ہے، گاؤں کے کوئی اور وسائل عطیہ پانے والے کو مخصوص طور پر منتقل نہیں ہوتے تھے۔

(شرما، 1980، صفحہ 94)

شرما بھی جوان ماخذوں کو بے حد اہمیت دیتے ہیں اس بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ تضاد متعلقہ حکومتوں کے نظام میں واقع اختلاف کا نتیجہ ہے۔ اختلافات ایک ہی علاقے اور حکومت کے چارٹر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نہ کہ صرف ایک دوسرے میں، آسام کے گاؤں پر ظالموں کی تفصیلات جو او پر دی جاچکی ہیں وہ اس علاقے میں دئے گئے دیگر عطیات سے غائب ہیں۔ اس سے ہم کو یہ نتیجہ نہیں اخذ کر لینا چاہئے کہ دوسری جگہوں پر ان ظالموں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ مالوہ کے پر ماروں (13 ویں عیسوی) کے ریکارڈ کے مطالعہ سے 9 سے زائد طریقوں سے گرانٹ کے وسائل کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ باوجود گنتی کے فرق کے ہر ایک معاملہ میں ریاست جس کا مطالبہ کرتی تھی اس کی بھرپائی عطیہ پانے والوں سے کی جاتی تھی۔

اس قسم کا تجزیہ دیگر اور حکومتوں کے ریکارڈوں کا ابھی ہونا باقی ہے۔ اس سب کے باوجود ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو ہمیں مابعد گپتا عہد کے کتبات میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بہت سے مختلف طریقے تھے جس کے پیچھے مقصد صرف ایک تھا یعنی ریاست عطیہ پانے والوں کو تمام مطالبات کا تمام تفصیلات کے ساتھ مالک بنا دیتی تھی اور باخبر کرتی ہے کہ اس علاقے پر جو کہ بطور تحفہ دیا جا رہا ہے اس پر ان کے تمام حقوق صرف عطیہ میں حاصل علاقوں پر لاگو ہونگے۔ اس مشترکہ پوائنٹ (Common Point) کا مطلب بالکل غیر متبادل یکسانیت نہیں تھا۔ بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یکسانیت اور تضاد دونوں ہی چیزوں کا ثبوتوں اور سیاق وسباق کو مدنظر رکھ کر، اس کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہئے نہ کہ اس کو جوں کا توں قبول کر لینا چاہئے۔

تضاد، علاقے اور علاقے کے باہر بھی جیسا کہ موجود ہے اس کو جاننا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال ہے Step-wells (واپی) اور رہٹ (ارگھٹ) کی جو مشرقی ہندوستان میں ٹیکس کے ذرائع کے طور پر نہیں جانا جاتا تھا جیسا کہ صرف امید کی جاتی۔ باوجود اس کے بہت سے ایسے الفاظ ہیں جس کا مطلب ٹیکس یا ٹیکس کے ذرائع سے ہے۔ اگر چہ وہ وقت اور مقام کے مطابق اتنے اہم تھے کہ ان کے معنی سے ہم گریز کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک لفظ میوتا ہے جو دسویں صدی میں راجستھان کے الور کے علاقے میں راجور کتبے میں ملتا ہے۔ ایف، کیلہورن، جو ان ریکارڈوں کا مرتب کردہ ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ان الفاظ کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہے کیونکہ کتبات بہت ہی احتیاط کے ساتھ لکھا اور کندہ کیا ہوا ہے۔ اس کے باوجود گھوشال نے اس کو غلط ڈھنگ سے پڑھا ہے ان کی اتباع سرکار نے بھی کی ہے اور غلطی سے اس کو بھوگ جیسا قرار دیا ہے (درحقیقت بھوگ اور میوتا ریکارڈ میں بطور جڑواں عنصر کے دوہرے اظہار بھوگ، میوت، ادایا، بھیم کے لئے آیا ہے)۔

مطالبوں کے انداز میں بھی وقت اور زمانے کے لحاظ سے تضاد کو دیکھا جاسکتا ہے ساتھ ہی ساتھ ٹیکس کے بوجھ کو بھی۔ اڑیسہ اور مغربی ہندوستان کے بعض ابتدائی ریکارڈوں سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی ٹیکس کا مطالبہ نقد کیا جاتا تھا۔ یہی چیز بنگال میں بھی ہمارے دور کے بعد کی صدیوں میں دکھائی پڑتی ہے۔ یہ صورتحال تھوڑے ہی عرصہ تک قائم رہی۔ مورخین کا عام خیال یہی ہے کہ محصول کی تعداد غیر معمولی طریقے سے ابتدائی عہد وسطی کی صدیوں میں بڑھ گئی جس سے ٹیکس کا بوجھ کافی بڑھ گیا۔ محصول کی تعداد کی زیادتی کا خیال بھی چند ریکارڈوں کا من مانے انداز سے انتخاب کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ سب سے پہلے ان ریکارڈوں کی تصدیق کرنے کی ضرورت ہے اور پھر ان کا ابتدائی عہد سخت منی بر اصول (Benchmark) ٹیکس یعنی کوٹلیا کے ارتھ شاستر سے موازنہ کیا جائے جس میں کوسامبی کے مطابق شام شاستری کے انگریزی ترجمہ میں انڈیکس کے پورے 9 کالم میں ذکر آیا ہے (کوسامبی 1975، صفحہ 216)۔ نکتہ کی بات یہ ہے کہ محصول کی تعداد میں اضافہ کو ٹیکس کی زیادتی پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ دہلی سلطنت کے دور میں بھی ٹیکسوں کی فہرست بہت مختصر ہونے کے باجود ٹیکس کچھ کم نہ تھا۔ ٹیکسوں کی تعداد شمار کا مختلف ریاستوں سے موازنہ کرنا صحیح نہیں ہوگا بلکہ اس کا شمار کسی مخصوص حکومت کے اندر ہی ہوسکتا ہے۔

ہم ماخذوں میں ایک مختلف قسم کے اشاروں پرغور کریں تو پتہ چلے گا کہ ہمارے زیر مطالعہ عہد میں یہ روز بروز بڑھتے ہوئے ٹیکس کے واقعات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا راجور کتبہ میں روایتی (اچت) اور غیر روایتی (انوچت) ٹیکسوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تقسیم پرانے ٹیکسوں میں نئے ٹیکس کے اضافہ پر دلالت کرتی ہے۔ (شرما نے اس سے مناسب اور غیر مناسب ٹیکس کے معنی مراد لئے ہیں۔ لیکن تب تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ راجہ خود ہی اپنے ٹیکس کو غلط قرار دے رہا ہے۔ خواہ تھوڑا ہی سا، ایک نیک عطیہ دینے کے کام میں۔ ایک غیر پسندیدہ منظر) ٹیکس میں اضافہ کے ایک عام رجحان کو اس مخصوص تعریف میں چالو کیہ سلطنت کے بانی راجہ مول راج کی ایک خاص مدح میں دیکھا جاسکتا ہے جنہوں نے گجرات کے چاپاس کو بھگایا۔ لفظ بالی کو شاعرانہ تخیل میں پیش کرتے ہوئے راجا کی نیک نامی مزاحمت سے جڑی ہوتی ہے یعنی ٹیکس اور ایسا اس کے ذریعہ بھگوان وشنو کی طرح ہی کیا گیا تھا جنھوں نے اپنے دامن اوتار میں دیو راجہ بالی کو قید کیا تھا۔ تاہم چالکیوں نے خود بھی بعد میں تازہ تخمینہ (نوندھان) کرایا جو بالی کی مزاحمت کی سے الگ تھا۔ آخر میں ہم کلہن کے ثبوتوں کو دیکھتے ہیں جنہوں نے اس کی تمام تفصیلات دی ہیں کہ کس طرح کشمیر کے راجا ہرش نے ٹیکسوں کو غیر معمولی حدوں تک بڑھا دیا تھا۔

لہذا اس بات کے تمام تر ثبوت موجود ہیں جو ریاست کے دعووں کے بڑھتے ہوئے بوجھ پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں لگتا ہے کہ یہ سب کچھ زمینی عطیات کے ذریعہ عطیہ پانے والوں کو غیر معمولی طاقت دیکر کہ جس سے وہ لوگوں کے کھال جس طرح چاہیں اتار سکیں۔ ریاست نے اپنے حصہ کے تمام اختیارات عطیہ پانے والے کو دے دئے جن کو اس کا اختیار تھا کہ وہ اس کا استعمال بالکل ٹھیک ٹھیک کریں نہ زیادہ نہ کم۔ یہ مثبت انداز میں (جو منفی ثبوتوں کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کیا جانے سے منفرد ہے) ایسے محاوروں سے جیسے 'یتھا دئے مان' سے بالکل واضح ہے۔ لوگوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ اتنا ادا کریں جیسا کہ اب تک وہ ادا کرتے تھے۔ ریاست کے دعووں کو منتقل کیا جا رہا تھا جس میں یقیناً مستقبل میں اضافی آمدنی کا امکان شامل تھا۔ جیسے غیر مزروعہ زمین لائق کاشت بنا کر۔ راجور کتبے میں بھی نبدھ آمدنی اور ساتھ ہی انی بدھ آمدنی کا حوالہ ملتا ہے نبدھ کا مطلب ہے جو مندرج ہو، یعنی وہ آمدنی جو سروے میں آچکی ہے اور تخمینہ شدہ ذرائع آمدنی ہے۔ اس کے علاوہ ذرائع انیدھ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس طرح کے اضافے ضروری نہیں کہ جس کے لئے عطیہ پانے والے کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ٹیکس کے ریٹ بڑھا سکتے تھے۔

مذکورہ بالا باتوں کی روشنی میں چارٹر میں شاید ہی ایسا کوئی ثبوت ملتا ہے جس میں شاہی گرانٹ کے ذریعہ لوگوں کے فرقہ وارانہ زرعی اختیارات پر پہلی بار ہی سہی، کوئی اثر پڑا ہو۔ ایک بار ایسا دیکھا گیا کہ جو وہ ریاست کو دیتے تھے، عطیہ پانے والوں کو دینے کے لئے کہا گیا ہے۔ اور یہ کہ وسائل ٹیکس کے زمرے میں چراگاہ، تالاب، جنگل، مچھلی پالن کی جگہ اور دوسری چیزیں آتی تھیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ مخصوص وسائل ریاست میں ٹیکس کے زمرے میں آتے تھے۔ برخلاف اس کے کہ جس پر کبھی دلیل وحجت بھی ہوئی ہو یہ وسائل فرقہ وارانہ کنٹرول کے وسائل نہیں تھے کہ جس پر ریاست کوئی دعوی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ان کی منتقلی کی صورت میں مستقبل میں عطیہ پانے والوں کے ذریعہ ٹیکس لگانے کی گنجائش تھی۔

بعض بنیادی الفاظ کے وقوع پذیر ہونے سے شرما نے دو بنیادی نقش تلاش کئے ہیں جن کو دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک لفظ وشٹی یا بیگار ہے جو عملاً پرماروں، چالوکیوں اور چھمناؤں کے ریکارڈ سے غائب ہے بدیہی طور پر یہ طریقہ خود اپنے ہی دائرہ حکومت میں دم توڑ چکا تھا۔ اسی طرح گہڈ والا اور چنڈیلا ریکارڈوں میں بیگار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (شرما 1980، صفحہ 196) دوسری چیز جو دکھائی پڑتی ہے وہ یہ کہ چند ایک ابتدائی چارٹر میں باشندگان کا بھی ذکر ہے جن کو زمین یا گاؤں کا عطیہ دیا گیا تھا۔ اس طرح کے عطیات سے باشندگان کو حرکت پذیری کی آزادی سے محروم کر دیا جاتا تھا یہ عطیات بعد کے دور میں کئی گنا بڑھ گئے تھے۔ اسی بنیاد پر وہ گرانٹ جو کاشتکار اور دیگر باشندگان کو اس انداز میں دی گئیں ہیں ان کا تعلق زمین سے نہیں ہے ایسا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر بنگال سے ملے کتباتی ریکارڈ میں کاشتکاروں کے عطیہ پانے والوں کی منتقلی کا حوالہ 12 ویں صدی کے اواخر تک نہیں ملتا ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ عمل ملک کے اس حصہ میں بھی پہنچ گیا (شرما 1980، صفحہ 189)۔ بہرحال شرما نے گیارہویں صدی کے وسط میں گذشتہ پیداوار گراف میں بنگال میں ایک ایسی منتقلی کی مثال پیش کی ہے۔

بعض ماہرین کو پہلے نمونے کو من وعن بغیر کسی تبدیلی کے قبول کرنے میں تردد واقع ہوا ہے۔ دوسرے نمونے میں، یعنی گرانٹ کے کتبات میں باشندگان کے

تذکرہ کے حوالے کو ناقدین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی ۔ بلکہ یہ صرف محصول گرانٹ کی ایک اور قسم ہے جس میں باشندوں کی شمولیت ان وسائل میں ہے جو زمین کے ساتھ منتقل کیئے گئے ۔ اب سمجھا جاتا ہے کہ ان کو اس کے علاوہ کہ وہ عطیہ پانے والوں کو ٹیکس دیا کریں دوسری کوئی ذمہ داری ان پر عائد نہیں کی گئی تھی ۔ خیالات میں یہ اختلاف آپ دیکھیں گے اس کتبہ پر ہے جس میں باشندگان (یا ان کے گھر) کو زمین یا گاؤں جو کہ عطا کیا گیا ہے کہ ضمن میں حصہ کے وضاحت کے طور پر ذکر ہوا ہے ۔ مغربی ہندوستان میں خاطر خواہ ریکارڈ ملے ہیں جس میں چند کاشتکاروں کا خود اپنے ایک طبقہ کے طور پر ۔ گرانٹ کی ایک مد کے طور پر ذکر ہوا ہے ۔ ان کاشتکاروں کے ماتحت ہونے پر کوئی اختلاف نہیں ہے ایسے ہی برابر کے لوگوں کا حوالہ ادبی ماخذوں میں [illegible] ہے ۔

ہمارے خیال میں ان نمونوں کو ٹھیک ڈھنگ سے سمجھنے کے لئے ماخذوں کا مکمل تنقیدی جائزہ اور ساتھ ساتھ ریاستی مطالبوں (جو شاید کبھی محصول کی حد تک محدود ہوتے تھے ۔ بغیر کسی مطالبے کے) کو بڑے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے ۔ اگر ہم مطالبوں کے تین بڑے عنصر کو ذہن میں رکھیں (ٹیکس، جرمانہ، او رعمومی انداز کی خدمات) اور تب ثبوتوں پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالیں، کسی دئے گئے ریکارڈ کی پوری ساخت کے ثبوت نہ کہ ان میں سے چند الفاظ کے اور اسی طرح تمام تر موجود ریکارد پر نا کہ ان میں سے چند ریکارڈ پر، تو ہم ان باتوں کو صحیح پائے گیں جو ہم نے پہلے کہی ہیں ۔ ان ہی تین قسم کا ریاستی مطالبہ ہر جگہ منتقل ہو رہا تھا (ایک ہی قسم کے اندر اختلاف کی گنجائش کے ساتھ) ۔ خدمت گذاری لوگوں پر ضروری تھی اور عطیہ پانے والوں کے احکام کے پابند تھے ۔ یہاں تک کہ وہاں پر بھی جہاں اس مخصوص لفظ کا استعمال نہیں تھا ۔ یہی اشارے مختلف طریقوں سے اس وقت بھی استعمال میں تھے جب وشٹی جیسے لفظ کا وجود نہیں ہوا تھا اور اسی طرح وہاں بھی جہاں ساکنان کو ان وسائل کے ساتھ شمار کیا گیا ہے جو زمین سے جڑے ہوئے تھے تو بھی تمام حالات اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ لوگ عطیہ پانے والوں کے دائرے اختیار سے باہر نہیں تھے ۔ یہ بات مندرجہ ذیل بحث میں دیکھی جاسکتی ہے جو تمام معلوم چنڈیلا زمینی عطیات کے کتبات سے متعلق ہیں جو کورپس انسکرپشنم انڈی کیوم، جلد VII، حصہ، 3، میں یکجا کردی گئیں ہیں ۔

چنڈیلا چارٹر جیسا کے ہم نے اوپر دیکھا وشٹی کے متعلق کوئی حوالہ نہ ہونے کے ساتھ ساتھ گرانٹ میں باشندوں، دستکار، کاشتکار، تاجر (کرو۔کرشک وانج) جو زمین کے ساتھ ساتھ منتقل کیئے جانے والی ذرائع میں شامل ہوتے تھے، کو شامل کیئے جانے کے لئے بھی جانے جاتے ہیں ۔ یہ ذرائع کی طویل فہرست کے لئے بھی جانے جاتے ہیں ۔ چنڈیلا چارٹر تحفہ پانے والوں کو دیئے گئے گاؤں اور اس کے پیداوار کی بھی بہت ہی تفصیلی معلومات فراہم کراتا ہے ۔ (شرما، صفحہ 183) بہر حال ہم پاتے ہیں کہ گو کہ کے چنڈیلوں کے زمینی عطیات کے سبھی دستاویز ایک جیسے ہیں ۔ صرف دو دستاویزوں میں باشندوں کی منتقلی کی معلومات ملتی ہیں ۔ باقی میں ایسا تذکرہ نہیں ہے ۔ اور ان دو میں سے ایک میں کاروکمپ وانج کا ذکر ہے ۔ جن کا مطب بسا اوقات کرو ۔ کارو ۔ کمپ ۔ وانج لیا جاتا ہے ۔ یا بطور کروکا ۔ پمکا وانج ۔ لیکن یہ ایک بھول ہے جیسا کہ شرما نے لکھا ہے ۔ کرو ۔ کرشک وانج ۔ اسکے علاوہ ہم گرانٹ سے متعلق تفصیلات نکالیں تو کافی اختلاف پایا جاتا ہے ۔ ایک دستاویز میں گاؤں کے ذرائع کے متعلق صرف ایک ہی جملہ ملتا ہے ۔ بعض لوگوں سے بہت ہی مختصر انداز میں ادا کرنے کے لئے کہا گیا ہے ۔ بھاگ بھوگ وغیرہ (بھاگ بھوگ آدیکا) دوسرے دستاویز میں وغیرہ سے پہلے پشو ۔ ہرینا ۔ کرا ۔ شلکا بڑھایا گیا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ ہم یہ نہیں پتہ لگا سکتے ہیں کہ چنڈیلا راجہ جرمانوں سے حاصل شدہ آمدنی بھی بطور عطیہ دیتے تھے ۔ لیکن دو دستاویزون کو چھوڑ کر جس کی لسٹ میں ڈنڈ کا ذکر ملتا ہے، باقی دستاویزوں میں ٹیکس کی دوہری تقسیم روایتی اور غیر روایتی کے طور پر ذکر کی گئی ہے ۔

اگر ہم صرف تضاد کو ہی لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچے گے کہ ان دو استشناؤں کو چھوڑ کر عطیہ میں دئے گئے گاؤں میں باقی باشندگان اپنی مرضی سے رہتے یا وہاں سے کوچ کرنے کے لئے آزاد ہوتے تھے ۔ عام طور پر عطیہ پانے والوں کو لوگوں سے جرمانہ وصول کرنے کا حق نہیں ہوتا تھا ۔ جس میں ان دو گاؤں میں رہنے والے وہ لوگ بھی شامل تھے، جہاں وہ زمین کے ساتھ ہی منتقل کئے جاتے تھے ۔ غیر رسمی ٹیکس کا لاگو ہونا ایک استشنائی بات تھی نہ کہ کوئی قاعدہ قانون ۔ لیکن اگر ہم ان دستاویزوں کی مکمل تصویر دیکھیں اور ساتھ ہی محاورے اور جملے دیکھیں تو یہ بالکل واضح ہو جائے گا اور ہم نتائج الگ الگ نکال پائیں گے ۔ ایک چنڈیلا ریکارڈ، بھاگ بھوگ وغیرہ میں لفظ 'وغیرہ' میں دیگر چنڈیلا ریکارڈوں میں خصوصی ٹیکس بھی شامل تھے ۔ جیسے جرمانے ۔ پشو ہرنیا ۔ کرا ۔ شلک، ساتھ ہی دوسرے ٹیکس بھی جو اس وقت لاگو تھے، لیکن موجودہ ثبوتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جو اتفاق سے رسمی اور غیر رسمی ٹیکس کے درمیان تقسیم کے طریقے کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کرتے ہیں ۔ جب تمام سرکاری مانگوں (نی شیش ادائے) کی کل جمع بطور تحفہ دی جا رہی ہوتی تھی تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ذرائع پوری طرح سے

فہرست وار ہیں یا جزوی ہیں۔ اگر لوگوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ عطیہ پانے والے کے حکم (شرون) کو غور سے سنیں اور مانیں (ویدھے) تو عطیہ کی تفصیلات میں باشندگان کا تذکرہ نہ ہونے کی وجہ سے چیزیں مادی طور پر نہیں بدلتی تھیں۔ زمین کے ساتھ لوگوں کی منتقلی یا عطیہ پانے والے کے حکم کا پابند بناتے ہوئے لوگ ان کو حتی الامکان ان کی خدمت کو منع نہیں کر سکتے تھے۔ اگر چہ ہمیں ایسے کسی ابتدائی ہندوستانی ریاست کا علم نہیں ہے جو اپنی رعایا سے عمومی انداز میں خدمات کا مطالبہ نہیں کرتی تھی۔ ہمارے لئے چنڈیلا حکومت میں اس رواج کا ناپید ہونا مان لینا درست نہیں ہوگا۔

وہ شرائط جن پر ریاستی مطالبوں کو مذہبی عملہ اور اداروں کو منتقل کیا گیا اس سے ایک قسم کی زرعی جائداد وجود میں آئی۔ یہ عطیات جب تک سورج چاند رہے گا، محاورے کے طرز پر مستقل طور پر دیئے جاتے تھے۔ یہ دیوتا پر پانی (شراب) چڑھانے کی رسم (Libation of water) کے طور پر کیا جاتا تھا۔ یہ محاورہ جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

ادبھیر = دتم تری بھیر = بھگتم سدبھیس = کاپری پالیتم۔

اتانی نانوارتنتے پرو = راجا کرتنی کا۔

(ترجمہ) 'زمین' جو پانی کے چڑھانے (libation of water) کے ذریعہ عطیہ میں دی گئی ہے، تین (نسلوں) کے ذریعہ اچھے قسم کے لوگوں کے ذریعہ بہتر ڈھنگ سے اس کی حفاظت کی گئی اور ماقبل کے راجاؤں کے ذریعہ عطیہ میں دی گئی۔ ان کو (ریاست کے ذریعہ) ضبط نہ کیا جائے۔

پچھلے راجاؤں کے ذریعہ گرانٹ دینے کا حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا آئیٹم موجودہ راجہ کے ذریعہ دیئے جارہے عطیات کے حوالے سے دوسرے زمرے بھج (قبضہ محفوظ ہونا) اور اگم (لقب) کے درمیان فرق کو سمجھا سکتا ہے۔ یہ ابتدائی سمرتی کے نظریہ کا حوالہ دیتا ہے جس کے مطابق تین نسلوں کے ذریعہ زمین کے استعمال سے زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہوجاتا تھا (یہ مدت بعد کی قانونی کتابوں میں بہت دراز کردی گئی)۔ تیسری قسم، جس کا تعلق باقاعدہ دیکھ بھال اور اچھے لوگوں سے ہے، کہ بارے میں ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں۔

اس مقولے کی اہمیت کا اندازہ مذہبی زمینی عطیات کے زرعی اثاثہ کا ایک تسلیم شدہ شکل کے طور میں آنے سے لگایا جاسکتا ہے جو پرانی شکلوں کی مانند ہی ہے۔ پانی کا چڑھاوا چڑھانے سے گرانٹ اس شکل کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن کتبات میں یہ ایک سے زیادہ طریقوں سے دکھایا گیا ہے۔ تری پوری کے کلاچوری کے دستاویزوں میں پانی کے چڑھانے کو شاسناتوین، سے عام طور سے بدل دیا گیا ہے۔ شاسنتو کے ذریعہ لفظ کا ترجمہ حالانکہ کچھ غیر اطمینان بخش طور پر عطیات کے ذرائع سے کیا گیا ہے۔ زیادہ عمومیت سے پانی کے چڑھاوا کے حوالہ کے علاوہ جائداد پر حقوق کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے: زمین پر قبضہ، اسکی کاشت، اس پر کھیتی کراؤ اور اسے دوسرے کے حوالے کرو۔ عطیہ پانے والے کو ان اختیارات کا استعمال اپنے طریقوں سے کرنا ہوتا تھا۔ جیسا کہ ریاست اب تک کرتی آئی تھی۔ یہ بھی ضروری بھی تھا کہ عطیہ پانے والے کو لوگوں کے موجودہ زرعی اختیارات کا احترام کرنا ہوگا۔ جیسا کہ ریاست اب تک کرتی آئی تھی۔ عطیہ شدہ زمین کے متعلق سب سے واضح بیان جیسا کہا جاتا ہے کہ چنڈیلا چارٹر میں ملتا ہے۔ جہاں عطیہ پانے والے کے اختیارات کو تحفہ، رہن اور فروخت (دان، ادھانا، وکرے) بتایا گیا ہے۔ جو استعمال، کاشت اور دوسرے استعمال وغیرہ اختیارات کے علاوہ ہیں۔

زرعی اثاثہ کی اس ممتاز شکل کے وجود میں آنے سے شمال ہند میں ابتدائی عہد وسطی میں مالکان زمین کی ایک ممتاز کلاس ابھر کر سامنے آئی۔ وہ اپنے علاقے میں سبھی قسم کی پیداوار کی حصہ داری کا دعویٰ رکھتے تھے اور لوگوں پر مزید معاشی اختیارات رکھتے ہوئے ان کے مالک بن گئے۔

اس ملکیت زمین کی بہت سی اکائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سب سے نچلے سطح پر کاشت شدہ زمین کا ایک چھوٹا سا حصہ کسی برہمن کو سونپ دیا جاتا تھا۔ دیگر معاملات میں ان میں سے درجنوں کبھی زیادہ کبھی کم، مجموعی طور پر کوئی ایک گاؤں یا بہت سے گاؤں تحفہ دیئے جاتے تھے۔ عام طور سے ایک گاؤں ایک شخص کو دیئے جانے کا رواج تھا۔

لیکن بہار کی نالندہ یونیورسٹی کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ جس کے پاس دوسو گاؤں تھے اور گجرات میں سومناتھ کے مندر کی بھی مثال ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس دو ہزار گاؤں تھے۔ ہمارے اس عہد میں تحفہ دینے کا کیا پیمانہ تھا۔ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا ناممکن ہے۔ بہر حال اس بات کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں کہ اس طرح اچھی خاصی تعداد میں مالکان وجود میں آئے۔

عام طور پر شمالی ہند کے ابتدائی عہد وسطی میں راجا اپنے افسران کو اس طرح کے تحائف دینے سے پرہیز کرتے تھے۔ سرکاری ملازمین کو بلاشبہ ان کی خدمات کے لئے زمین کا لگان دیا جاتا تھا۔ لیکن کسی نسلی بنیاد پر ان کو زمین سے متعلق ریاستی مطالبوں کا حق دار بنانا بالکل بھی معروف نہیں تھا۔ اس قسم کی ایک غیر معروف مثال ایک چندیلا کتبہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب ایک شخص کو اسکے والد کے جنگ میں مارے جانے کے بعد اس طریقہ پر زمین عطیہ میں دی گئی تھی۔ سرکاری ملازمین اپنی خدمات سے جڑے مخصوص حقوق اور عطیات کے ساتھ یقینی طور پر زرعی سماج میں ریاستی درجات کے ممبر کے طور پر نمائندگی کرتے تھے۔ ریاستی مشینری کے کمزور پڑنے پر وہ مقامی طور پر اپنا قبضہ کر لیتے تھے۔ اور نسلی آقا بن جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ سرکاری عملہ کے لئے نسلی طور پر ملکیت زمین سے متعلق کوئی مستقل ریاستی پالیسی وضع کی گئی ہوگی برخلاف اس کے، ریاستی پالیسی مذہبی لوگوں اور اداروں سے متعلق پائی جاتی تھی۔

تاہم اس وقت مذہبی بنیاد پر دیے گئے عطیہ مالکان زمین کے ساتھ ساتھ غیر مذہبی عطیات پانے والے بھی بڑی تعداد میں موجود رہے ہوں گے جن کا زمین اور رعایا پر مطالبہ پورے زور وشور سے رہا ہوگا۔ یہ لوگ خود ساختہ مالکان تھے نہ کہ ریاستی عطیات سے مستفید ہونے والے۔ کتبات اور ادبیات میں بہت سے الفاظ سے ان کو وجود کو ایک مشکل شکل میں پیش کرتے ہیں، جو ان کی واضح تفصیلی تحقیقات کی منتظر ہے۔ پی۔ این۔ ایس۔ یادو نے ادبی ماخذوں میں بھوگیوں کی عام کیٹیگری کا حوالہ دیا ہے جن میں سے ایک میں بھوگیوں کو گاؤں پر طاقت کے بل پر حکومت کرنے کا حوالہ ملتا ہے۔ (یادو، 1981 ،صفحہ 81-250) ایسے بھوگیوں کی ایک علاقائی مثال کشمیر کے ڈامروں کی ہوسکتی ہے۔ راج ترنگنی میں ایک سے زیادہ حوالے یہ بتاتے ہیں کہ ڈامری خوشحال کسانوں کی سطح سے اوپر اٹھ کر انفرادی طور پر گاؤں پر چھا گئے (ان کے پاس قلع بھی ہوتے تھے) اور وہ اجتماعی شاہی طاقت کے لئے خطرہ بن گئے تھے۔ اور ریاست کے ذریعہ وجود پانے کے بجائے وہ خود طاقت بن کر ابھرے اور ریاست میں حصہ پانے کے لئے مرکزی طاقت کے ساتھ یعنی شاہی طاقت کے ساتھ کوشش میں لگ گئے۔ اس طرح کے گروہوں کے طاقتور بننے سے روکنے کے لئے باقاعدہ پالیسی تیار کی جاتی تھی۔ ان کی حیثیت بطور مالکان زمین کے، ان مالکان زمین جیسی ہی تھی جو ریاست کے ذریعہ وجود میں آتے تھے۔ اس معنی میں زرعی طبقات پر ان کے دعوے ایک جیسے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈامری اپنے بل پر جیتے اور طاقتور ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ جبکہ مذہبی عطیات پانے والے مستقل طور پر راجا کی مدد پر منحصر رہتے تھے۔ جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کو کبھی کسی فائدہ کے بدلے دوسرے فائدہ دیا جاتا تھا عطیہ یا کوئی چیز کے عوض دیا جاتا تھا۔ یا اسے بالکل ضبط کر لیا جاتا تھا۔ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہی عملہ عطیہ پانے والوں کا جینا دشوار کر سکتے تھے۔

12.6 کاشت کار بٹائی دار اور زمین دار: زرعی معاشرہ نیچے سے

یہ سیکشن تاریخی تحقیقات کے حساب سے بہت کم معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہاں مواد کی کم مائیگی کا احساس زیادہ ہے بہ نسبت اس کے کہ اس میں جو دلچسپی لوگوں نے دکھائی اور جو طریقے اس میں اپنائے گئے ہیں۔ گو کہ حال کے دنوں میں تحقیقات کا جھکاؤ زرعی گروہوں کی طرف زیادہ دکھائی پڑتا ہے بمقابلہ اراضی عطیات پانے والوں land grantees کے۔

اس میدان میں زیادہ تحقیقات اصطلاحات کی تشریح تک محدود رہی ہیں۔ بہت سی اصطلاحات، چونکہ مختلف زرعی گروہوں کی نشاندہی کرتی ہیں، کو نوٹ کیا گیا ہے اور تفصیل سے اس پر بحث کی گئی ہے۔ یادو (1993) نے بمقابلے اوروں کے اپنے علمی انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس موضوع پر گہرا مطالعہ ہونا باقی ہے۔

کٹمبن/کٹمبیکا، کاشت کاری کے لئے ہمارے عہد اور ہمارے علاقے میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ ملتا ہے۔ میتریکا (پانچ سے آٹھویں صدی

MEDIA CENTRE LIBRARY Hyderabad

عیسوی) کتبات میں اس کی خاصی تفصیل ملتی ہے۔ ان کے نام اور ان کے کھیتوں کا رقبہ۔ بالترتیب ان کے کھیتوں کا صحیح مکانی رقبہ، زمانی اور معاشی سیاق وسباق میں بالتفصیل درج ہے۔ ان کتبات کا باقاعدہ اور تفصیلی مطالعہ ہونا باقی ہے بالخصوص انگریزی میں۔ لیکن زمین کی مقدار جو کہ انفرادی کٹمبوں کے اندر ہوئی اس میں پانے والے قابل لحاظ تضاد سے یہ خیال آتا ہے کہ یہ لفظ عام کاشت کاروں کے علاوہ خوشحال لوگ یعنی امیر کاشت کار بھی اس زمرے میں آتے تھے، یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ مشرقی ہندوستان میں پردھان یا پیشر و کٹمبوں اور وہ لوگ جو معمولی حیثیت کے تھے، (شوردر پرکرتی) کے حوالوں سے عام انداز میں اور خاص انداز میں کٹمبوں کے حوالے سے زمین کا عطیہ کا مطلب ہے اس کے پاس اپنی ضروریات سے فاضل زمین تھی۔

نچلی سطح پر ہم کٹمبیکاز کا ذکر کو ماتحتی کے طور پر پاتے ہیں جب انفرادی کٹمبیکاز کو بطور تحفہ کی چیز کے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے الفاظ ماخذوں میں ملتے ہیں جو بے سہارا ماتحت کاشت کاوروں کے طبقہ کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے بدھا حالیکا (ہل جوتنے والا) پرتی بدھینا یو جیتا (بزور جوا جوتنا جیسے کوئی جانور)۔

کٹمبوں کے اوپر زمینداوروں کی ایک قسم تھی جسکو مہاتراز کہا گیا ہے۔ ان کی تعداد بہت کم بتائی گئی ہے بمقابلہ گاؤں کے کٹمبوں کے جو مقامی سطح پر ریاست کے انتظام کے لئے تھے۔ جن کی گاؤں میں اپنے دبدبہ کی وجہ سے پہچان تھی اور یہ لوگ راجا کو اپنی انفرادی حیثیت میں زیادہ طاقت اور وسائل کے حصول کے لئے رشوت دیتے تھے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کٹمبن امیر کاشت کاروں کے ایک طبقہ پر مشتمل تھا۔ اس کا کافی امکان ہے کہ ان کے درمیان مہاترا بحیثیت زمینداروں کے شمار ہوتے ہوں۔ مغربی ہندوستان میں پٹا کیلا ان کے متوازی ہوسکتا ہے۔

امیر کاشتکاروں اور زمیدار جو اپنی زمین دوسریسے کاشت کراتے تھے کی قابل لحاظ موجودگی، محنت مزدوری کرنے والوں یعنی بٹائی داروں اور کسان اسامیوں کے ثبوت سے ملتی ہے۔ آئی سانگ (ساتویں صدی عیسوی) نے نالندہ کے بدھوں کے عبادتگاہوں کا حوالہ دیا ہے جو اپنی زمین بٹائی داروں سے کاشت کراتے تھے۔ جو بٹائی دار قانونی کتابوں میں بطور ذات کے اہم ترین اہمیت کے حامل تھے۔

کیا یہ بٹائی دار بغیر زمین کے لوگ تھے یا وہ لوگ چھوٹے کاشکار تھے۔ یعنی ایسے لوگ جو کہ اتنی زمین کے مالک تھے کہ ان کو کسان اسامی Farm Tenancy کرنی پڑتی تھی۔ یہ بات کہ ان کے درمیان کچھ اختلافات تھا ارتھ شاتر کے ایک سے زیادہ قسم کی بٹائی دار نظام کے حوالے سے سمجھ میں آتی ہے۔ مورخین نے عام طور سے یہ سمجھا ہے کہ ہندوستان میں اچھوت ذاتوں کا مطلب بغیر زمین کے تھا۔ اس موضوع پر تحقیقات کے فقدان کو ہربنس کھیا نے جاگیرداری بحث کے دوران اجاگر کیا ہے۔

> کوئی ہم عصر ثبوت (کھیا لکھتے ہیں) اس بات کے نہیں دے گئے ہیں کہ ذات پات کا نظم (یا ریاست) ان کو زمین کے مالک ہونے کی حیثیت کو روکتی تھی۔
>
> چونکہ ماضی کی تاریخ ہند کے متعلق میری آشنائی ثانوی درجات کے ماخذوں پر ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں میں تین ساتھیوں بی۔ ڈی۔ چٹو پادھیادے، سویرا جیسوال اور رومیلا تھاپر سے گزارش کہ یہ وہ اس موضوع پر بنیادی اور ابتداؤں ماخذوں کے ذریعے ہماری مدد کریں۔ ان میں سے ہر ایک نے نفی میں جواب دیا۔
>
> (کھیا، 1985 صفحہ 253، 261-62، 15n)

اس موقعہ پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ راج ترنگنی میں راجہ ایک اچھوت زمین والے سے (موچی سے) درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنی زمین راجہ کو بیچ دے تا کہ اس زمین پر ایک مندر تعمیر ہو سکے۔

12.7 خلاصہ

آخر میں ہم نے زرعی معاشرے کی تصوراتی بنیادوں سے متعلق گزشتہ چیزوں کے بارے میں ہوئی گفتگو کو شمالی ہندوستان کے ابتدائی عہد وسطی میں زرعی ساخت کو تہہ در تہہ درجات کے نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ تہہ در تہہ درجات کا مطلب مختلف گروہوں سے ہے (ہر گروہ ایک طبقہ) جو کئی تہوں پر مشتمل خاندان چلا آرہا ہے۔

یہ پرت ایک ہی طرح کی نہیں تھی اور نہ ہی اس میں ایک ہی طرح کی Hierarchy ایک دوسرے کے تعلق سے دکھائی پڑتی ہے مثال کے طور پر وہاں مختلف قسم کے کسان آسامیوں کی مثال ملتی ہے (ان کے بہت سے طبقات) جنکی مالک زمین کے ساتھ فصلوں کے حصہ کے نظام پر ایک قسم کی Hierarchy بنی تھی۔ اسی طرح کاشت کاروں کے بھی مختلف گروپ تھے۔ امیر، درمیانی اور چھوٹے زمیندار۔ یقیناً اسی طرح زمیندار کے پاس زمین کی مقدار بھی مختلف رہی ہوگی۔ کسانوں کا آپس میں ایک دوسرے میں فرق تھا۔ وہ لوگ یقیناً زمینداروں سے اپنے مختلف انداز کی وجہ سے الگ رہے ہوں گے۔ ریاست اور اس کے لوگوں کا داخلہ بھی مختلف انداز سے ہوا ہوگا۔ لہٰذا طبقہ اور اس میں Hierarchy کا تصور با معنی لگتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ موزوں نہیں کہ جس کے مختلف زرعی طبقوں کے مخصوص کردار کے بارے میں جانا جا سکے اور جس سے زرعی ساخت کی پوری تصویر اجاگر ہو سکے۔

لہٰذا یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان کے درجات کی قسم کو سامنے لایا جائے جس سے زرعی معاشرے کی قطعی تقسیم کی واضح پہچان کے لئے کوئی یکساں پیمانہ بنایا جا سکے۔ زرعی درجات کو اصولی طور پر مالک زمین، مزدوری کی ہیئت اور فاضل مزدوری کے استعمال کے طریقہ کار کے ذریعہ واضح کیا جائے۔ بٹائی دار کسان زمیندار اور ریاستی طبقہ، جیسا کہ اوپر خلاصہ کیا گیا ہے، ایسے ہی طبقات ہیں۔

ہماری زرعی معاشرے کی مخصوص حیثیت اس میں موجود زمیندار کلاس کی موجودگی ہے۔ یا تو اپنے بل پر، ریاست کے توجہ پر، زمین پر اور وہاں کے لوگوں کے اوپر ریاست کے دعوے کو اپنے ذاتی دعووں میں تبدیل کر کے اور اس کو مستقل حیثیت دے کر، یہ لوگ وجود میں آئے۔ زرعی جائداد کی ایک نئی قسم کا وجود ہوا جہاں پہلے سے موجود تمام زرعی طبقات، زمین سے محروم مزدور سے لے کر بڑے زمینداروں تک، نئے زمینداروں کی مانگوں اور اختیار کے تحت ہوتا تھا۔ کیا یہ آپ کو یوروپ کے عہد وسطی کے جاگیردار زمینداروں کی یاد دلاتا ہے؟

12.8 مشقیں

(1) ابتدائی عہدِ وسطیٰ کی زرعی ساخت کے بارے میں ہماری معلومات کے علاقائی حجم پر تنقیدی بحث کیجئے۔

(2) ریاست کن طریقوں سے زمین کی مالک تھی؟

(3) کس طرح راجہ نے لوگوں سے اپنے مطالبات کی وصولی کے عمل میں دیہی معاشرہ میں درجہ بندی کو متاثر کیا؟

(4) مختلف قسم کے زمینی عطیات سے دیہی معیشت پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیجئے۔

(5) ان زمینداروں پر ایک مضمون لکھئے جو شاہی مذہبی عطیات کے ذریعہ وجود پذیر ہونے والوں کے ماسوا تھے۔

(6) شمالی ہندوستان میں مابعد گپتا عہد میں زرعی پیداوار سے جڑی عوامی ساخت پر بحث کیجئے۔

12.9 معاون کتب

چکرورتی، رنبیر، (2000)، اپینڈکس ان بی، ڈی، چٹوپادھیائے (مرتب)، اے سورس بک آف انڈین سویلائزیشن، کولکتہ۔

چٹوپادھیائے، بی، ڈی، (1990)، آسپیکٹس آف رورل سیٹلمینٹس اینڈ رورل سوسائٹی ان ارلی میڈیول انڈیا، کلکتہ۔

چٹوپادھیائے، بی، ڈی، (1994)، دی میکنگ آف ارلی میڈیول انڈیا، او، یو، پی، نئی دہلی۔

گھوشال، یو، این، (1929)، کنٹری بیوشنز ٹو دی ہسٹری آف دی ہندو ریوینو سسٹم، کلکتہ۔

جھا، وشوا موہن، (1994)، سیٹلمینٹ، سوسائٹی اینڈ پولیٹی ان ارلی میڈیول رورل انڈیا، دی انڈین ہسٹوریکل ریویو، جلد 20، صفحات 64-35۔

کوسامبی، ڈی، ڈی (1975)، این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری، دوسرا ایڈیشن، بمبئی۔

کلکے، ہرمان اینڈ ڈی، روتھرمنڈ، (1986)، اے ہسٹری آف انڈیا، دہلی۔

مکھیا، ہربنس (مرتب) (1999)، دی فیوڈل ازم ڈیبیٹ، دہلی۔

نجماش، مارلین، (1992)، شوشل اسٹرکچر آف دی ولیج ان کاٹھیاواڑ ان دی سکستھ۔ سیونتھ سینچری اے، ڈی، شوشل سائنس پروبنکس۔

رائے، جی، کے، (1981) ان وولنٹری لیبر ان اینشینٹ انڈیا، الہ آباد۔

ساہو، بی، پی، (1997)، لینڈ سسٹم اینڈ رورل سوسائٹی ان ارلی انڈیا، دہلی۔

شرما، آر، ایس (1965/1980)، انڈین فیوڈل ازم c300-1200، کلکتہ/ دہلی۔

سرکار، ڈی، سی، (1969) لینڈ لارڈ ازم اینڈ ٹیننسی ان اینشینٹ اینڈ میڈیول انڈیا ایز ریویلڈ بائی اپی گرافک ریکارڈ لکھنؤ۔

یادو، بی، این، ایس، (1981)، دی پرابلم آف دی امرجینس آف فیوڈل ریلیشنز ان ارلی انڈیا، ان ڈی، این، جھا (مرتب)، دی فیوڈل آرڈر: اسٹیٹ، سوسائٹی اینڈ آئیڈیالوجی ان ارلی میڈیول انڈیا، دہلی۔

یادو، بی، این، ایس، (1993)، پریسیڈینشیل ایڈریس، پروسیڈنگس انڈین ہسٹری کانگریس۔

اکائی 13 زرعی اور دستکاری پیداوار کی تنظیم، زرعی معاشرہ کی علاقائی تصویر درجہ بندی کی نوعیت-جنوبی ہند

ساخت

13.1 تعارف
13.2 جنوبی ہند: خطہ
13.3 عطیات اراضی کا نظام: برہمدیا اور زراعت کی توسیع
13.4 تمل علاقہ: پلوو (ٹونڈئی ناڈو-شمالی تامل ناڈو) چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی تک
13.4.1 برہمدیا گرانٹ کی نوعیت: پریہارا زیا ٹیکس کی معافی
13.4.2 ناڈو/کرم اور کوٹم میں برہمدیا کی توسیع
13.5 تمل علاقہ: پانڈیا (تامل ناڈو کے جنوبی اضلاع) چھٹی صدی سے دسویں صدی عیسوی تک
13.5.1 زمین کے حقوق
13.5.2 سینچائی: چھٹی صدی سے دسویں صدی عیسوی تک
13.6 زرعی نظم اور محصول کی تنظیم: نویں صدی سے تیرہویں صدی تک
13.6.1 تامل ناڈو-چولا
13.6.2 کیرالا
13.6.3 کرناٹک: بادامی کے چالوکیہ اور راشٹر کٹا
13.6.4 آندھرا کا علاقہ: مشرقی چالوکیہ
13.7 خلاصہ
13.8 فرہنگ
13.9 مشقیں
13.10 معاون کتب

13.1 تعارف

ابتدائی عہد وسطی کی معیشت ابتدائی تاریخی عہد سے کئی معنوں میں مختلف تھی اس تبدیلی کو تجارت اور کاروباری معیشت میں زوال اور کاروبار میں گراوٹ کی وجہ اور روپے پیسوں میں لین دین ناپید ہونے سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس تبدیلی سے ایک زرعی نظام وجود میں آیا جو عطیہ اراضی نظم پر منحصر تھا (برہمنوں اور مذہبی اداروں کو عطیہ اور ساتھ ساتھ سیکولر عطیات بھی جو شاہی منتظمین کار کو دئے جاتے تھے)۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اس نے جاگیرداری معاشرہ اور نظام حکومت کو وجود بخشا گو کہ نظریہ جاگیرداری خود مغربی یوروپ کے عہد وسطی کے زرعی نظام سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس میں مغربی یوروپی ماڈل کے مقابلہ میں اہم فرق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں ہندوستانی زرعی تنظیم کی خصوصیات کو ہندوستانی جاگیرداری کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ہندوستانی جاگیرداری نظریہ پر مستقل بحث ہو رہی ہے اور پورے ہندوستان میں ابتدائی عہد وسطی کی معیشت کی خصوصیات کی جھلک دیکھنے پر بھی سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ وجہ ہے زرعی غلامی کا نہ ہونا اور انٹر میجریز کی نوعیت، مذہبی اور سیکولر دونوں اور ساتھ ہی زرعی ساخت میں علاقائی اختلاف بھی تھے (جاگیرداری بحث کے لئے دیکھئے اس بلاک کی

اکائی 10)۔ابتدائی عہد وسطی کی زرعی معیشت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ گپتا عہد (چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی) اور مابعد گپتا عہد (ساتویں سے تیرہویں صدی عیسوی) میں اراضی عطیات کے نظام کو سمجھا جائے جب عطیات اراضی کا نظام پورے برصغیر پر محیط ہو چکا تھا اور جس وقت بہت سے علاقے خصوصاً وہ علاقے جو وادیٔ گنگا سے ملے ہوئے ہیں اور مخصوص سیاسی اور ثقافتی علاقے کے طور پر وجود پذیر ہونے لگے تھے۔ جب کہ عطیات اراضی کا نظام حیرت انگیزی کے ساتھ تمام علاقوں میں پھیل رہا تھا۔ اس میں غیر معمولی اختلافات تھے ان طریقوں کے بارے میں جس سے زراعت میں توسیع اور علاقوں میں وحدت ساتویں صدی سے تیرہویں صدی کے عرصہ میں حاصل ہوئی۔

13.2 جنوبی ہند: خطہ

جنوبی ہند سے مراد وہ علاقہ سے جو وندھیا کے جنوب میں ان خطوں تک پھیلا ہوا ہے جہاں دڑاوڑ زبانیں بولی جاتی ہیں باستثناء شمال کا علاقہ، جو اب مہاراشٹر کا حصہ ہے یعنی پورا جزیرہ نما ہند نہیں۔ اس حصہ کی جغرافیائی ہیئت کی دو بڑی تقسیم دکھنی سطح مرتفع اور ہموار زمین کے ساتھ دلچسپ مطالعہ کی چیز ہے۔ دکنی سطح مرتفع (Plateau) اب شمال جنوب کرناٹک اور آندھرا کا حصہ یعنی تلنگانہ اور رایالا سیما جو پلیٹو کا مشرقی کنارہ ہے اور آندھرا کا ساحلی میدان جو گوداوری اور کرشنا کی وادیوں (ڈیلٹا) سے سیراب ہوتا ہے، جہاں زراعت کا پیشہ شروع زمانے سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ زرعی توسیع یعنی زراعتی عمل میں توسیع ایک لامتناہی سلسلہ تھا اور زرخیز ندی کی گھاٹی سے شروع ہو کر سرحدی حدوں تک پہنچ گیا۔ جنگل اور پہاڑ کا خطہ دیہی زندگی اور شکار پر مشتمل معیشت دکن اور آندھرا کے علاقوں میں گوداوری اور کرشنا کے ڈیلٹا علاقے میں ابتدائی زرعی آبادی کے ثبوت ملے ہیں اور دکن پلیٹو کے بڑے علاقے میں چھوٹے چھوٹے زرعی پاکٹ گوداوری اور کرشنا کی وادیوں اور اسکی معاون ندیوں (تنگ بھدرا اور ماند پربھا وغیرہ) کے وسط اور اوپری حصوں سے اور جنوبی دکن یا کرناٹک میں کاویری کے اوپری حصوں میں ملتے ہیں۔

جنوبی ہندوستانی علاقے کا تامل کا علاقہ جن کا زرعی نظام اور ریاست کے عنوان پر وسیع مکالعہ کیا گیا ہے، یہاں اس بات کے خاصے ثبوت ملے ہیں۔ اگرچہ دکن اور آندھرا کا علاقہ جن کے مطالعہ پر کم توجہ دی گئی ہے، یہاں بھی اسی طرح کے اہم ثبوت ملے ہیں جو زرعی نظام اور پیداوار کے اداراتی عمل پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن ماقبل برہمدیا (برہمنوں کو دیئے گئے لگان معاف زمینی عطیات) کے زرعی نظام کے طور طریقہ کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں جو تھوڑی بہت جانکاری ہمیں ملتی ہے وہ ندی گھاٹیوں میں قدیم زراعتی طریقے یا معاش کی سطح والی بستیاں اور جنگلوں اور پہاڑوں جیسے، سرحدی علاقوں میں چرواہی اور شکار کر کے زندگی گذارنے والوں (خانہ بدوشوں) کی بستیاں ملتی ہیں۔ آندھرا ڈیلٹا میں بھی برہمدیا ملے ہیں لیکن ابتدائی تانبے کی پلیٹ پر درج (چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی) ریکارڈ، عطیات چھوٹی اور بغیر کسی تفصیل کے ہیں جب کہ بعد کی کتابات میں زیادہ تفصیلات ملتی ہیں۔ آندھرا (ڈیلٹا) کے چھٹی سے آٹھویں صدی عیسوی کے برہمدیا کا اس نہج سے مطالعہ نہیں کیا گیا ہے کہ اس کا زراعتی وحدت میں کیا رول رہا ہے۔ جس قسم کی منظم زراعت کے چھوٹے علاقے (جیسے ناڈو) جو تامل کے علاقے میں تھے، زیادہ تسلسل واضح زرعی قطعوں کے ساتھ ہے۔ بڑی ندیوں کی وادیوں میں جیسے کاویری (وسطی اور نچلا حصہ) ویگئی اور تمر پارنی وادیوں میں اور دو چھوٹی ندی کی وادیوں جیسے پالار اور پینیار، یہاں تک کہ ابتدائی تاریخی ریکارڈ سے (تیسری صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی) جس کو بعد میں جدید زرعی نظام میں برہمدیا اور مندر جیسے اداروں کے ذریعہ سے تشکیل دیا گیا۔ تمل ناڈو سے ابتدائی تمل ادب کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے (عیسائی عہد کی ابتدائی صدیوں کے سنگم کلاسک)۔ جس میں مروتم (ہموار) کا ثبوت ملتا ہے جو ملائی (جنگل) اور کرونسی (پہاڑی) سے الگ جہاں مختلف قسم کے معاشیاتی عمل جیسے زراعت، چرواہی اور شکار (خانہ بدوش) ہو رہے تھے، یہ زراعتی عمل کی مروتم اور اس سے باہر دوسرے eco-zone کے علاقے میں پھیل رہا تھا جو زرعی قطع کی ابتداء اور ان کا برہمنی اداروں کے ذریعہ چھٹی صدی عیسوی سے ان میں وحدت کو دکھاتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زرعی قطعات کی اسی طرح کی شروعات کا سلسلہ آندھرا اور کرناٹک کے علاقوں میں بھی ہو چکا ہو، زرخیز ندی کی وادیوں سے شروع ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں کی انتہا تک۔ لہٰذا ابتدائی برہمدیا اور مندر سیٹلمینٹ آندھرا کے ہموار ساحلی علاقوں میں (گوداوری اور کرشنا وادیوں کے نشیب میں ڈیلٹا علاقوں میں) چھوتھی سے دسویں صدی عیسوی میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ اور تلنگانہ اور رایالا سیما کے خشک علاقوں میں ایک جدید زرعی نظام کی شکل میں، گیارہویں سے چودھویں صدی عیسوی میں جنم لیا تھا۔ کرناٹک میں کرشنا اور کاویری کے اوپری اور وسطی حصوں میں (تنگ بھدرا اور مال پربھا) تنگ میدان والی اپنی معاون ندیوں کے ساتھ چوتھی سے نویں صدی میں پہلے ہی آبادکاری ہو چکی تھی اس کے بعد جدید زرعی نظام ساحلی علاقوں تک پھیل گیا۔

اس سلسلہ کی شروعات کو چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی کے عرصہ میں دکن اور آندھرا کے علاقوں میں دیکھا جاسکتا ہے جب برہمن اور چھتری ایک ساتھ حکومت میں تھے یعنی نئی قائم ہوئیں برہمن سلطنتیں جیسے وکاٹکا۔ (چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی)، کادمباس (چوتھی سے ساتویں صدی عیسوی)، مغربی گنگا (چوتھی سے دسویں صدی عیسوی) اور وشنوکنڈلیس (475-615 عیسوی) نے برہمدیا اور مندر کا استعمال زرعی اداروں کے پھیلانے اور اس کو متحد کرنے کے لئے کیا۔ ابتدائی پلوو (چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی) ماقبل آندھرا علاقوں سے تمل ملکوں میں جانے کے اس سلسلے کی ایک کڑی تھے۔ ساتویں سے نویں صدی عیسوی میں بادامی کے چالوکیہ اور مانیا کھیٹا کے راشٹر کٹاؤں کے زمانے میں گوداوری اور مالا پربھا۔ تنگ بھدرا یعنی کرشنا کی معاون ندیوں کے اوپری حصوں میں زرعی وسائل کی بنیادیں ڈالی گئیں۔ ان سلطنتوں کی ماتحت اور جنوبی دکن کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے کاویری وادی کی اوپری حصہ میں ایک زرعی ماخذوں کی بنیاد کو پیدا کیا۔ بعد میں مغربی چالوکیہ اور ہوئے سالاؤں نے دسویں سے تیرہویں صدی میں اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ جس سے جنوبی ہندوستان میں بہت سے سیاسی اور ثقافتی علاقے زرعی وسائل کی وسیع بنیادوں پر وجود میں آئے۔

13.3 عطیات اراضی کا نظام: برہمدیا اور زراعت کی توسیع

برہمدیا (اور اگرہارا) گرانٹ کو سب سے اونچا دان سمجھا جاتا تھا اور اس کی تعریف کرنے والوں سے حکم امتناعی اور دوسرے حریفوں کے ذریعہ حفاظت کی جاتی تھی۔ دھرم شاستر کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے حکمراں طبقہ برہمنوں کو زمین کی عطیات کسی خاص موقع جیسے جنگ میں فتح کے بعد یا کسی فلکیاتی کیفیت جیسے گرہن کے وقت دیا کرتا تھا۔ زرعی اہلیت کے علاقوں میں پہلے سے چلا آرہے سیٹلمینٹ کے ساتھ یا نئے علاقوں میں زراعتی عمل کو بڑھاوا دیتے ہوئے۔ ان مواقع پر برہمنوں کو پر یہارایا بہت سے فرائض بشمول راجہ کو محصول دینے سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا تھا اور زمین پر اور اس کی پیداوار پر اختیار کلی دے دیا جاتا تھا۔ استثناء کا مطلب عام طور سے شاہی یا سرکاری عمل سے اور فوج کا ان علاقوں میں عدم مداخلت تھا۔ جب کہ بعض اوقات محصول کے نام پر مخصوص محصول کی رقم سالانہ یا کل وقتی لگائی جاتی تھی۔ جنگلوں کی کٹائی اور کاشت کو غیر کاشت زمینوں تک بڑھانا اور اصل کاشتکار/ زرعی مزدوروں کا انتظام کا مطلب تھا کہ زراعتی حلقہ بڑھ گیا تھا اور راجہ کے اختیارات کو پہلی بار مستحکم کر رہا تھا جو اس سے پہلے نہیں پائے جاتے تھے۔ لہٰذا برہمدیا کا سیاسی اور معاشی رول زرعی وسعت میں اہم حیثیت رکھتا تھا۔

برہمدیا صرف برہمنوں ہی کے ذریعہ آیا نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ غیر برہمن کاشتکاروں یا سرکاری ملازمین جو گاؤں کے لئے بالعموم کام کرتے تھے اور اس زمین کے لئے جس کو برہمن کنٹرول کرتے تھے۔ چنانچہ ایک قسم کا زمیندار اور کاشتکار رشتہ یا خدمت گاری رشتے کا وجود ہوا۔ برہمدیا نظام کے اندر ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جو ماقبل موجودہ چرواہی مع زراعتی انتظام کو ظاہر کرتی ہیں جن کو ایک ساتھ جمع کردیا گیا اور برہمدیا کے طور پر گرانٹ میں دیا گیا۔ مندر یا تو برہمدیا کے ساتھ ساتھ یا بذات خود وجود میں آئے جن کو زرعی اتحاد میں برابر برابر اہمیت ہے۔ تاہم مندر کی اہمیت ایک اتحادی ادارے کے طور پر دسویں صدی میں زیادہ ہوگئی جو بتدریج پورے جنوبی ہندوستان کے علاقوں تک پھیل گئی۔ مندر کی زمین اور دوسری چیزوں کے عطیات کو بااثر مقامی لوگوں کے ذریعہ زمین سے متعلق انتظام دیکھنے والے گروہوں جیسے برہمن کی دیکھ ریکھ میں ہوتی تھی اور باحیثیت زراعتی گروہوں کے ذریعہ بھی جو برہمنوں کے علاوہ ہوتے تھے۔

عطیات اراضی یا تو کسی ایک برہمن (ایکا بھوگا برہمدیا) یا برہمنوں کے ایک گروپ کو یا برہمنی تعلیمی اداروں کے رکھ رکھاؤ کے لئے (ودیا استھان اور گھاٹیکا) ہوتا تھا۔ ہر ایک برہمدیا اور مندر سیٹلمینٹ سے ایک سینچائی کا نظام بھی بالعموم جڑا ہوا تھا۔ خواہ ٹینک (ٹاکا اور اری) کی شکل میں، نہر اور کنوئیں کی شکل میں (جیسا پلوو پانڈیا علاقوں میں)۔ اس قسم کے زیادہ تر پروجیکٹ کی شروعات حکومتوں کے ذریعہ کی گئی لیکن اس کی دیکھ بھال مقامی لوگوں کے ذریعہ ہوتی تھی جیسے کہ سبھاؤں یا برہمدیا کی اسمبلیوں یا مہاجنوں کے ذریعہ۔ ان اسمبلیوں کے ذریعہ سینچائی کے کاموں سے متعلق عمدہ انتظامات کئے گئے۔ جن میں اس کی نگرانی، مرمت، صفائی اور پانی کی سپلائی پر کنٹرول، ٹیکس کے ذریعہ اور مخصوص کمپنیوں کے ذریعہ (وری یام) جیسا کہ تمل علاقے کے برہمدیا میں ان کی نگرانی اور انتظام کو چلانے کے لئے تھا۔ لہٰذا موثر انتظام ہی ابتدائی تاریخی اور ابتدائی عہد وسطیٰ کے دور میں کاشتکاری سے جڑی سوسائٹیوں کے درمیان فرق کی بنیادی وجہ تھی۔

13.4 تامل علاقہ، پلوو: (ٹونڈئی ناڈو-شمالی تامل ناڈو) چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی تک

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * IMC LIBRARY * Hyderabad

تمل علاقے میں اس صورتحال کی تاریخ چھٹی صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی ہے جس کو مزید دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا حصہ چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی تک اور دوسرا حصہ دسویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک۔ بالآخر اس نے مختلف درجات کے پیچیدہ زمین کے اختیارات، اعلیٰ بھی اور ماتحتانہ بھی اور درجاتی معاشرہ بھی معیشتی حیثیت کی بنیاد پر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ (ورن) نظریہ کی بنیاد پر مع ذات پات کی خصوصیات کے ساتھ پیشہ ورانہ انحرافات میں اضافی وجود بخشا اور اس عمل میں مندر، درجات کی تمام خصوصیات خاص طور سے مذہبی خصوصیات کے ساتھ حوالہ جاتی نقطہ بن جاتے ہیں۔

پراکرت اور سنسکرت کے ابتدائی پلو وعطیات (چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی) کرشنا اور گنتور ضلعوں اور اس سے بھی جنوب میں نیلور ضلع کے گاؤں کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہاں برہمدیا وجود میں آچکا تھا تا آنکہ پلو و نے تمل ملک کے شمالی علاقے میں اپنے پاؤں جما لئے تھے اور کانچی پورم ان کا پایہ تخت تھی۔ دو زبانوں سنسکرت اور تمل میں تانبے کے پلیٹ پر برہمدیا زمین کے عطیات کے ریکارڈ ملتے ہیں جن میں نئے علاقوں کے ساتھ ساتھ پہلے سے کاشت میں رہے پالار چے یار گھاٹی اور اس سے آگے بھی جنوب میں پینیار اور کاویری علاقوں کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ دستاویز مختلف ادوار میں زرعی معیشت اور زرعی انتظام کی بالیدگی کی ازسرنو تعمیر کرنے کے لئے غیر معمولی اہم دستاویز ہیں۔ برہمدیا اور مندروں کو ترقی یافتہ کاشت کے طریقوں جیسے سینچائی کی ٹیکنالوجی اور موسمی پیداوار کے طریقے، کے ہراول دستے کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات پلو و پانڈیا دستاویزوں سے پوری طرح ثابت ہوتی ہے جب ان کو ان کے جغرافیائی اور ماحولیاتی پس منظر میں دیکھا جاتا ہے، یہ اس لئے بھی کارآمد ہیں کہ اس میں زرعی اور تجارتی دونوں قسم کی پیداوار کے نظم کے طور طریقے سے متعلق بھی تفصیلی حوالے ملتے ہیں جو عام طور سے زرعی عمل کا ضمیمہ ہے۔

برہمدیوں میں برہمن ہی پیداوار کے منتظمین اور ناظم ہوا کرتے تھے جبکہ غیر برہمدیا (ار) بستیوں میں ویلالاؤں یا زمین والے (قبضہ دار) کسان ہوتے تھے۔ جس میں مطمع عمل برہمنوں کے مندر ہوتے تھے۔ برہمدیا میں، برہمنوں نے نجوم فلکیات میں مخصوص علم کی وجہ سے پیداوار کے متعلق پیشن گوئی کا عنصر داخل کر دیا ہوگا جو موسمی بوائی، فصلوں انتخاب اور ساتھ ساتھ آبی وسائل کے موثر انتظام کی بنیاد پر رہا ہوگا۔ چنانچہ اس عہد کے ریکارڈوں میں حدود بندی حق ملکیت یا حقیقت اختیارات، زمین کی قسم اور اس کی طبعی حالت، بوئی جانے والی فصلوں کی تعداد وغیرہ، کی تفصیلات جاننا اہم سوال تھا۔

زیادہ تر حالات میں برہمدیا کا مطلب عطیہ پانے والوں کو معاشی اور انتظامی اختیارات سونپنا ہوتا تھا۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ راجہ کو لگان ادا کرنے سے پوری طرح سے آزاد نہیں تھے۔ اس کا اصل فائدہ یہ دکھائی پڑتا ہے کہ پرانی قوت لایموت جیسی صورت حال اور غیر برہمدیا گاؤں (ار) کو نئے زراعتی نظام میں بدلنا اور بنجر زمین اور جنگلوں سے گھری زمینوں کو زیر کاشت لانا اور ان کو زائد پیداواری surplus oriented بنایا جانا تھا۔ موجودہ بستیوں سے ماقبل کے متعلق بھی مثالیں ملتی ہیں جس کو ایک نئے برہمدیا سے جوڑا گیا ہے یا اس کے ساتھ متحد کر دیا گیا ہے (مثال کے طور پر نندی ورمن II کی آٹھویں صدی کی ادیندرم پلیٹ، پٹل منگلم پلیٹ)۔ برہمدیا کو دئے گئے ٹیکس سے چھوٹ کا اطلاق ان گاؤں پر نہیں ہوتا تھا جس کو اس نظم کے اندر لایا گیا تھا، جب تک کہ اس طرح کی وضاحت نہ کر دی گئی ہو۔

وسائل کی تقسیم ناڈو یا کرم کے ذریعہ ہوتی تھی جو کہ موجود اور خندق سے محصور (entrenched) کاشتکاروں کا علاقہ تھا۔ جس کو ابتدائی عہد وسطیٰ کی ریاستوں پلوو (چھٹی سے نویں صدی عیسوی)، پانڈیا (ساتویں سے دسویں اور تیرہویں صدی) اور چولا (نویں سے تیرہویں صدی) نے محصول کی اکائیوں میں بدل دیا۔ وسائل کی تقسیم مندروں کے ذریعہ بھی عمل میں آئی پرانا قوت لایموت پر منحصر نظام ناڈو کا حصہ تھا اور ان میں سے بہت سی بستیوں کو نئے زرعی طریقے میں برہمدیا کے ذریعہ متحد کیا گیا۔ لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا (کتنی ایسی بستیاں ہو سکتی ہیں؟) مشکل کام ہے۔ اس تقسیم کے ذریعہ محصول شاہی بھنڈاروں (خزانہ) میں مسلسل پہنچ رہا تھا۔ تاہم مقامی سطح پر تقسیم نو کے نظام سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے مقامی باحیثیت لوگ مندر اور برہمن تھے۔ جو مندر کے کارکناں اور کاشتکار کے علاوہ تھے۔ پیداوار اور اسکی تقسیم کی نگرانی سبھا (برہمن اسمبلی) اور ار (غیر برہمن/ ویلالا اسمبلی) کے ہاتھوں میں تھی۔ ار عام حالات میں برہمن سبھا کے ساتھ مل کر یا ان کی مدد سے یا ان کی رہنمائی میں اور اکثر و بیشتر نظار کے طور پر یا بطور رکن ناڈو اسمبلی، اس کام کو انجام دیتے

رہے۔جن کا زرعی ذرائع پیداوار اور اس کے نظم میں انتہائی اہم رول تھا۔خاص طور سے عام زرعی مسائل کے حل کے لئے جیسے کہ سینچائی کا اور مزدوروں کا مسئلہ پیداوار اور اس کی تقسیم کا انتظام برہمدیا کا دائرہ حکم ناڈو کے دائرہ سے الگ تھا اور اس لئے کتباتی ریکارڈوں میں ازمبہم اور غیر واضح ہے، جب کہ ناڈو اور برہمدیا کی تفصیلی وضاحت ملتی ہے۔

لہٰذا انہی دو اداروں یعنی برہمدیا اور مندر مراکز کے اردگرد ہی زمین سے رشتہ سمٹ گیا جہاں تین قسم کے مالکان زمین تھے۔ برہمن، ویلالا اور مندر (برہمنوں اور ویلالا کے ذریعہ چلایا جاتا تھا)، جو مقامی طور پر تھے۔تمام کے تمام پیشہ ورانہ طبقوں کو مذہبی طبقات میں مندر کے اردگرد ''ورن خاکہ'' کے دائرے میں ان کے پیشہ اور مندر سے ان کے رشتوں کو خدمات کی بنیاد پر جگہ دی گئی تھی۔

ٹیکس عام طور پر جنس کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا جو اس دور میں قلت زر کی علامت کا پتہ دیتا ہے۔اس وقت نمک بنانے، کرگھوں، بازار اور کولہوؤں وغیرہ پر بھی ٹیکس لگایا جاتا تھا۔نہ صرف سامان بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خدمات پر بھی جو عطیہ پانے والوں کو مہیا کرائی جاتی تھیں، جیسا کہ کمہاروں، بنکروں لوہاروں اور دوسروں پر لگائے گئے ٹیکس سے پتہ چلتا ہے۔اس میں تھوڑا اختلاف ہے کہ کیا برہمدیا پوری طرح سے ٹیکس سے آزاد تھا۔مثال کے طور پر پولور پلیٹ پٹی رٹینک کرئی یرم ام جس کا ترجمہ 12 سال تک ٹیکس نہ دینا کیا گیا ہے۔دوسرے لفظوں میں ان عطیات کا مطلب زراعت کو بڑھاوا دینا تھا اور ابتداء میں کاشت کے دائرے کو بڑھانا تھا اور چند سالوں کے بعد اس کو ٹیکس کے دائرے میں لانا تھا۔

13.4.1 برہمدیا گرانٹ کی نوعیت پر یہارایا ٹیکس کی معافی

بہتر ہوگا کہ دھرم شاستر کی بنیاد پر یہاں مدافعت کے ابتدائی حوالوں سے پیش کرنا فائدہ مند ہوگا۔یہ پریہار تعداد میں 18 تھے۔اس سے ہم کو یہ پتہ چلے گا کہ کس طرح کاشت اور اس سے متعلق دستکاری پیداوار ساتھ ہی غیر زرعی عمل کے انتظام کو جدید زمین کے اختیارات، بطور عطیہ پانے والوں کے کنٹرول میں لائے گئے۔اس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ کس طرح سے زمین پر اختیارات دیکھنے والوں اور بے زمین کاشکاروں اور دستکاروں کے مابین ایک طرح کی انحصاری گاؤں کے اندر پیدا ہوگئی تھی۔کیونکہ یہ گاؤں کے دستکار کی زمین کی پیداوار سے ادا کیا جاتا تھا یا اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے ان کو زمین دی جاتی تھی۔چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی کے پراکرت اور سنسکرت میں پلو کی تانبہ پلیٹ کے گرانٹ میں گنتور، کرشنا اور نیلور ضلعوں میں اس طرح کے برہمدیا کا حوالہ ملتا ہے۔تمام 18 پریہارایا ٹیکس کی معافی کا تذکرہ ان عطیات میں نہیں ہے، لیکن اشارہ اس بات کا ملتا ہے کہ جہاں کہیں اس طرح کے ٹیکس یا ابواب تھے وہاں ان کو یہ ٹیکس بادشاہ یا اس کے نمائندے کو نہیں دینا تھا بلکہ عطیات پانے والوں کو دینا تھا جن کو اس کے علاوہ خدمات بھی بہم پہونچاتی تھیں (یعنی تمام ٹیکس کی معافی سرو پریہاریہی پریہار تا پریہارتا)۔

پریہارایا ٹیکس معافی

الونا کھد کم	۔	نمک پیداوار سے آزاد، 1 یک شاہی اختیار یا اجارہ داری۔
ارتھ سمو ینائکا	۔	حکومت کے دائرے اختیار سے آزاد۔
ایرم پر بلیوادم	۔	شاہی عملہ کو بیلوں کی فراہمی سے آزاد۔
ابھادا پاچیسم	۔	ٹیکس جمع کرنے کے لئے فوج کے داخلے سے آزاد۔
اکوراچولا کوینا سیکھا تا پاواسا موسا	۔	ابلے چاول، برتن، چارپائی اور گھر فراہم کرنے سے آزاد۔

ابرداھی گھانم	۔	میٹھے اور کھٹے دودھ سے آزاد۔
اکاراوٹھی کوم جالم	۔	ٹیکس، بیگار اور کھٹے دلیا کی فراہمی سے آزاد۔
اتنا کٹا گھپلم	۔	گھاس اور لکڑی لینے سے آزاد۔
اہریتا کسک پو پھا گہنم	۔	سبزیوں اور پھولوں سے آزاد۔

عطیہ پانے والوں کو پیداوار کا آدھا حصہ پانے والے مزدوروں سے خدمات بھی حاصل کرنے کا حق تھا۔ بڑے مزے کی بات یہ کہ چھٹی سے نویں صدی عیسوی میں زیادہ تر عطیات ایک وجنا پتی (وہ شخص جو راجہ کی نمائندگی کرے) کی درخواست پر دیے جاتے تھے بلا اختلاف ایک مقامی سردار یا ایک شاہی عملہ کے ذریعہ اور ایک انجا پتی (یہ بھی کوئی ایک مقامی سردار یا عملہ) کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا۔ اس سچائی کو بتاتے ہیں کہ زرعی پیداوار کی تنظیم نو اور اس پر کنٹرول عام ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ چھوٹے سرداروں جنھوں نے نئے خاندان کی زمینداری کو قبول کرلیا تھا، نے بھی اس کو اپنا لیا تھا۔

چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی کے پراکرت اور سنسکرت میں زمین کے عطیات میں پریہارا کی تفصیلات ملتی ہیں جو کہ دھرم شاستر قانون کی بنیاد پر ہیں۔ اکثر ایک پورا گاؤں بشمول باغ عطیہ کردیا جاتا تھا اور شاہی شاسن (فرمان)، گرام بھوجکا گرامیا کان دھیکریتا (نوکر شاہی) ضلع کا سرودھیا کشا (؟)، (اورسیئر)، آیوکت اور نیوگیگا اور ضلع کے راجہ ولبھ، ساشن سنچارن (سرکاری پیغام رساں)، گوولبھ، ارانادھتکو (جنگل کے افسران) اور دوسرے کارکنان کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ گاؤں کو برہمدیا میں بدل دیا جاتا تھا (یعنی وسنت) 18 پریہارا کے ساتھ باستشناء دیو بھوگہالا (مندر کی زمین) کے۔ چنانچہ جب ایک گاؤں بطور عطیہ دیا جاتا تھا تو اس کے ساتھ تمام طرح کی زمین باستشناء دیو بھوگہالا (وہ زمین جو موجود مندر کے ماتحت ہوتی تھی) دے دی جاتی تھی۔ لفظ وسد بھوگ مریادا ساکنان (صرف) یا پٹہ دار کے قبضہ داری کے حقوق جس کی گارنٹی دی جاتی تھی جو ٹیکس لوہا چرم کارا (اسپات اور چمڑے کا کاریگر) کے ذریعہ اپن پٹہ کار (کپڑا بیچنے والے دوکاندار) کے ذریعہ پرورنچارا (لائسنس دار جاسوس یا وہ نقاب پوش) کے ذریعہ جو پرتیہارا (رسی پر چلنے والے نٹ) کے ذریعہ اپن اجیویکا نہالا۔ ٹیکس جو ادا کیا جاتا تھا۔ غیر مذہب اور اچھوتوں کے ذریعہ مکھ دھارک (بہروپیے یا تپسیہ کرنے والے)، کپ درشک (پانی کی پیشن گوئی کرنے والا Diviners) کہیں یہ تنز دیاتی تو نہیں جس کے معنی بنکر ہوتے ہیں)، دویوتا (قمار باز)، پنپتا (نائی) اور وواہ (شادی) پر دیے جانے والے ٹیکس۔ سرو پریہار کا اٹھانے والے دستکاروں کے ذریعہ دیے جانے والے ٹیکس اور مذہبی ٹیکس سے بھی کسی بستی میں صنعت وحرفت اور مختلف پیشوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اس کی خصوصیات کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ حقیقتاً ان ٹیکس کی معافی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گاؤں میں کس قسم کی دستکاری چل رہی تھی اور وہ لوگ کس طرح سے گاؤں میں رہتے ہوئے بڑی تعداد میں کسی پیشہ ور گروہ کا حصہ بن گئے تھے۔ جن کا دارومدار عطیہ پانے والوں پر تھا، جن کو زمین پر اعلیٰ اختیار حاصل تھے۔ ان کو ان کا محنتانہ زمین کی شکل میں یا اس کی پیداوار سے گاؤں کے اندر ہی دیا جاتا تھا جہاں ان کے لئے علیحدہ سے رہنے کا بندوبست ہوتا تھا۔ بعد کے عطیات میں یا تو پریہار کا حوالہ عمومی انداز سے ملتا ہے یا ٹیکس اور ابواب کی بڑھتی ہوئی تعداد کا ذکر ہے، جس کا انحصار پیداواری طریقہ کار کی بڑھتی ہوئی پیچیدہ صورتحال اور کسی پھیلتی ہوئی ریاست کے انتظامی نظم ونسق پر ہوتا تھا۔ اس سے ہم کو زراعت میں توسیع کا علم بھی ہوتا ہے اور حکومتی طبقہ کی وسائل کی بنیاد کی وسعت کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ صورتحال نویں صدی عیسوی سے ہی زیادہ تر گرانٹ میں نظر آتی ہے (مابعد چولا اور پلو وعہد)۔

چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی کے زمین کے عطیات جو دونوں زبانوں سنسکرت اور پالی میں موجود ہیں میں، حدود کی وضاحت کردی گئی ہے اور زمین کی نوعیت کو ان شکلوں میں بتایا گیا ہے جیسے نیئر نیلم (تر زمین)، پن سی (خشک زمین)، کانروے پال (چراگاہ)، کادو (جنگل)، پی دیلیکائی (مقدس مذہبی مقام)، کڈانگو (گڈھا)، کنواں (کینی)، منائی (گھر کی جگہ)، منائی پی پڈپو (گھر کا باغ)، اس کے علاوہ وہ تمام زمین جہاں گوہ چلتے ہیں اور کچھوے رینگتے ہیں۔

مثال کے طور پر پلنکوئل زمین کا عطیہ وجرنندی کو، ایک جینی استاد سرمن سرامایا امن سرکئی میں ایک پلی کنڈم کو (ایک جینی ادارہ کا عطیہ)، اس طرح کے اختیارات اور مراعات کے ساتھ جو کسان کو برطرف کیا گیا (کڈی نکی) اور بادشاہ سے متعلق اختیارات اور حقوق بھی ختم کردئے گئے تھے (کدم، پوری یم مری)۔ لفظ کوڈی نکی جس کا ترجمہ موجود کسان کو ہٹائے جانے سے کیا گیا ہے، ایک بحث کا موضوع رہا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی نکالا گیا ہے کہ موجودہ کڈی (یعنی کھیتی کرتے ہوئے گاؤں والے) عطیہ میں کڈی یا پیشہ ور/ زمین پر کاشت کرنے والے یا وہ اختیارات جو پیشہ واروں کو بدل دے گا، ان کو زمین کے ساتھ باقی رکھا جائے، کو بڑی وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق قانونی بے دخلی نہیں تھا۔

برہمدیا عطیات میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس میں عطیہ پانے والے حصہ دار ہوتے ہیں مثال کے طور پر کورم پلیٹ، مندر کے پجاری کو زمین کا مالک بناتی ہے پوجا کرنے کے لئے بھی، مرمت کے لئے، مندر کے لئے اور آگ اور پانی کے لئے بھی اور (مہا) بھارت کا بطور دیوا بھوگم پڑھنا۔ گاؤں کے باقی 20 حصوں کو ایک برہمدیا 20 چتر ویدنوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ صنعت جیسے تیل پرائی (سیکو)، لوم/ بنائی (تیری) اور کولم (بازار)، لوہار خانہ (کٹی کانم)۔ لوہاروں پر؟ تذکرہ ملتا ہے۔ جب کہ اوراتچی (ار کا حصہ) ار کے انتظام کے لئے ایک ٹیکس کا حوالہ دیتا ہے۔ پلارونڈی کے پیر مبید وگوچینل پر آبی وسائل کے لئے اختیارات دئے گئے ہیں۔

نندی ورمن II (752 عیسوی) کے ادایندیرم پلیٹ میں ایک گرانٹ کا ذکر ہے جو وجناپتی کی درخواست پر دی گئی جو پوکن سردار تھا۔ جس کے مطابق پاڈوورکٹم (مبل اڈایارو ناڈو) کے پچھم سرایا ناڈو میں دو گاؤں (کمار منگلا اور ولاتور) کو ایک ساتھ کر کے برہمدیا میں اس کی تمام چھوٹ کے ساتھ بدل دیا گیا اور اس کا نام اڑایا چندر منگلم (شمال آرکوٹ ضلع کے گڈی مریتم تعلقہ میں اڈیندیرم) رکھا گیا۔ وجناپتی ایک درخواست کنندہ ہوتا ہے اکثر کوئی سردار یا کوئی افسر جو بادشاہ سے ایک عطیہ عطا کرنے کی گذارش کرتا ہے۔ لہذا لفظ میرادتا یا پردتّی، دوسرں کے ذریعہ گرانٹ کو ظاہر کرتا ہے نا کہ راست بادشاہ کے ذریعہ۔ کوراگرام میں دو جل تنتروں (پانی اٹھانے کے آلات) کے ساتھ 108 برہمن، جن کو عطیہ دیا گیا، کے پاس زمین کے 133 حصے تھے۔

کساکڈی (تنجاور ضلع سے لگے کرائی کل کے نزدیک) تانبے کی پلیٹ، 753 عیسوی، ایکا دھیرا منگلم (کڈر کولی گاؤں)، اروکٹوک کوٹم کے نظار کے نام لکھا گیا تھا جو پہلے ہی سے قائم شدہ کسان تنظیم تھی۔ یہ عطیہ نیلائی کلتار (مقامی حکام؟)، ادھیکاریکل (عملہ) اور وائی کیٹپارو (سیکریٹری) کی موجودگی میں دیا گیا۔ جو ماضی کے عطیات، جو مندروں، برہمنوں اور رعیت کو دیا گیا کے علاوہ تھا۔ زمین کی پیائش کو یہاں پٹی یا پٹی کائی کہا جاتا تھا۔ ویگاوتی اور سیارونڈیوں سے پانی کی نہر اور تیرالیا (تیریا نیری؟) کے ٹینک کا استعمال اور زمین کی قسم کا تعین بطور تیر نیلم (تر زمین)، پن سی (خشک زمین)، منی پڈپا پو وغیرہ سے سہولیات کے مدنظر اشاروں سے جس کا انتظام کیا گیا ہے، عطیہ پانے والے اور اس کی اولاد کو پکی کھپریلوں کے گھر وغیرہ بنانے کا اختیار تھا۔ یہ گرانٹ ایک بہت ہی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس سے بڑی تعداد میں ٹیکس اور ابواب کے ثبوت ملتے ہیں ٹیکس کے دائرے میں سیکو، تری، الیاک کولی، (کنواں کھودنے والوں کا بھاڑا) برہمنا اس کا نام (برہمن یا راجہ کا حصہ ایک کنم کا ٹیکس برہمنوں کے منافع پر یا ٹیکس جو ان کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے)، سینگوڈی ک کنم (سینگوڈی پودے کا حصہ)، کلال کنم، فائکس درخت پر کساکنم (کمہار پر)، کنٹوکنم؟ کیتراکنم (اناج کی بالیوں کو جمع کرنے کا حصہ) اریکوری (دھان کوٹ کر بھوسہ الگ کرنے پر)، نی ویلائی (گھی سے بیچنے پر)، یتکاوہالانی (کپڑے کی قیمت یا کپڑا بننے والے یا تنبو پر)، پٹاکا ویلائی (کپڑے کا ٹکڑا یا اس کے بیچنے یا سینچنے والے پر ٹیکس) پٹی گی کنم (کپڑے کا حصہ یا ناوَیا ناوؤں پر ٹیکس) ارامالیان۔ نیاٹیکالم۔ توتورومکنی/ تی کنم، بنپالیدو پرم، پٹکوٹیکائی ک کرتو ویوم، پلومیرا میوم (شکاری پر، خبر رسانوں پر، ناچنے والیوں پر، ہاتھی تھان، اصطبل، گھاس؟ پر ٹیکس) نیلا آ (اچھی گائے)، نیلے روڈو (اچھا بیل)، ناڈو ویگائی (ناڈو کے حصہ کا زیادہ محصول یا انتظامی اکائی)، تینکاری یوم کائی (سوت کے دھاگوں کا حصہ)، نید مبرائی (گاؤں کے ڈھول بجانے والوں پر)، پنم پاکم (پنکھیا کھجور سے بنے گڑ پر)، کرنڈا نڈم (منیم پر جرمانہ یا چھوٹی عدالت کے ذریعہ مجرم پر جرمانہ عائد کیا جانا)، ادھیکارنڈ نڈنم (عدالت عالیہ کے ذریعہ مجرم پر جرمانہ لگانا) پٹورسرو (پٹور کے تاڑی پیدا کرنے والے درخت پر یا آس پاس کے گاؤں میں ٹم ٹم بجا کر اعلان کرنے پر) اولاوئی پلی وٹو (مندر کے خداموں سے یا بستی سے جنس کی شکل میں ٹیکس یا جین مندر کے لئے مختص جگہ پر ٹیکس)، کواالا نیڈوورو (پانی کے پھول لگانے پر)، کوویلے کنم (پانی کے پھولوں کا حصہ) کل کوٹورمائی (پرانے درختوں کے تنوں کا چوتھائی حصہ جو دئے لگے ہوں، جن میں سپاری کھجور اور ناریل کے درخت شامل تھے یا نہریں کھودنے پر ٹیکس)۔ اس قسم کی تفصیلات اکثر دونوں زبانوں

(سنسکرت اور تمل) کی تانبے کی پلیٹوں میں ملتی ہیں۔

پلور (شمال آرکوٹ ضلع) گرانٹ (764 عیسوی) میں چار گاؤں شامل تھے (نیلی، پلور، اورکوڈیورکبل ویناڈو میں اورٹکارومنالانکولا ناڈو میں)۔ یہ سب کے سب پلاکنراکوٹم میں تھے اور ان کو نیا دھیر منگلم نام دیا گیا تھا جو 108 بپّا بھٹارکاز کو بطور برہمدیا گرانٹ دیا گیا تھا۔ نٹارکو مخاطب کرنے سے اس میں تمام اختیارات کی نفی کی گئی ہے بوجہ اس کے کہ اس کو تمام تر اختیاروں کے ساتھ ناڈوکپن ویاوان (مکھیا) کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا گیا ہے۔ کچھ جدید الفاظ جیسے کوئل وسال لیکو (مندر کی جگہ پر کولہو پر ٹیکس؟) ایٹا کنم (آبی وسائل پر) سدیپون (دفن کئے گئے مرتبانوں پر سونے میں دیے گئے) اور کچھ وہ جو مختلف متحدہ معیشتی عمل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ٹنڈنٹوئم (تنجاور ضلع) تانبے کی پلیٹ (789 عیسوی) تیلگو علاقہ سے آئے 308 عالم برہمنوں کو جنھوں نے تین ویدوں اور سمرتی کا مطالعہ کر رکھا تھا، جس کو برہمدیا دیا گیا، مکھ منگلم کا نام دیا ہے۔ چولا ناڈو میں تین کرائی نرائی یورناڈو میں ٹنڈنٹوئم کے مغرب میں اراضی عطیہ دینے کا حوالہ ملتا ہے۔ ان کے حصوں کی الگ الگ وضاحت کی گئی ہے سب سے بڑا حصہ 12 ہے۔ تنکرئی نرئی پورناڈو کے نٹار کو دئے گئے عطیہ میں عطیہ پانے والوں کو نہروں پر خصوصی حقوق دینا ہے۔ نئے الفاظ جیسے نٹوکیام (سوناروں پر)، الام پٹکی (تاڑی نکالنے والے پیشہ وروں پر)، ادائی پٹکی (مویشی پالنے والوں یا چرواہوں پر)، تاراگو (دلالی پر)، تیرومولکنم (راجہ سے احکام لانے والے شخص کے مختانہ کی فیس کے لئے)، اپوکوسیگائی (نمک بنانے کے لئے معاوضہ (Royality)؟) وتی نلی (بازار میں لائی گئی اناج کی ٹوکریوں پر)، کڈئی یاڈئی کیوم (دوکان پر فروخت کے لئے سپاری پر)، پرانلی نالی عطیہ پانے والوں کا نئی بستیوں پر ان کے حقیقی قبضہ عمل کو دکھاتا ہے۔

792 عیسوی کا پٹہ ٹل منگلم (تنجاور ضلع) تانبے کی پلیٹ میں چالیس ویلی زمین کا ایک نیا برہمدیا وجود میں آیا جو چولا ناڈو میں ارولاک کرم میں ایک گاؤں کے آس پاس تھا۔ اس میں دو ٹکڑے مزید جوڑ دئے گئے اور اس کو ایک نئے گاؤں جس کا نام پٹہ ٹل منگلم تھا، کے ساتھ ضم کر دیا گیا اور اس کو 16 برہمنوں کو بطور تحفہ دے دیا گیا۔ ٹینکارائی ارولاک کرم کے نٹار کو مخاطب، اس میں حسب معمول سہولتوں کے علاوہ دیگر سہولتوں کا بھی ذکر ملتا ہے جیسے منئی، منائی پڈیم، کوٹا گرام، پور، ارپالم، کاڈو، اوڈئی اور پرمبو وغیرہ گاؤں پر راجہ اور اس کے عملہ کا اختیار ختم کر دیا گیا تھا جبکہ کوڈی نکی جس کا مطلب گذشتہ قبضہ دار ہوتا ہے (کوڈی نکی)، کو بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ نئے الفاظ جیسے منروپڈو، اراتچی، ناڈوکاول، اڈوپوکو (مخلوط قسم کے اناج پر ٹیکس یا جھگڑا سلجھانے کے لئے بنا فیس یا غالباً کسی علاقے سے گذرنے کا حق)، نروپام (پانی کے استعمال کے لئے) یقیناً اس سے عطیہ پانے والے برہمنوں کو خصوصی رعایات یا ٹیکس سے چھوٹ کی بڑھتی ہوئی تعداد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

852 عیسوی کے ویلور پلائی یام (شمالی آرکوٹ ضلع) کے تانبے کے پلیٹ (نندی ورمن III) میں ٹیٹوکٹوپلی میں شیو کی پوجا سے جڑی خدمات کے لئے اتپرودیودان (تمام لائق کاشت زمین جو ٹیکس کے لئے مناسب ہے) بطور تحفہ دینے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مندر سبھا - پرادئی (پریشد کونسل) کو تخاطب تھا اور سہولیات میں نداتچی، اراتچی (ناڈواوار کا حصہ)، پراویون (زمین پر) تری ک کرائی (بنکروں پر، ایک کرگھا کپڑے کی ناپ پر)، ناڈوکاول (ناڈو کی نگرانی)، کلانا کنم (شادی پر)، پرائی کنم (عوامی تالابوں میں دھوبیوں کے ذریعہ پتھر کی کانوں یا پتھر پر)، پٹی ناسیری (مچھواروں کے ذریعہ راجا کو دینے کے لئے ٹیکس) اس کے علاوہ اور دوسری مراعات شامل تھیں۔

نراپٹنگاور میں (نویں صدی کے اواخر) کی باہور (پانڈیچری) تانبے کی پلیٹ میں تین گاؤں (چیٹوپکم، ویلنگا، ٹنکاروونور (کڈودنور، باہور سے 5 میل مغرب)، ارائی پنائی چیری) کو ملا کر واگور کے ودیاستھان کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ سب کے سب واگوناڈو میں ہیں اور کلویلی کے نٹار کو مخاطب کیا گیا ہے۔ واگوناڈو، اروناڈو کی ایک تحصیل ہے۔ کاشتکاروں کو برطرف کر کے اور باستثناء ماضی کی خیرات اور برہمدیا، دیگر تمام نیرنیلم، پن سی، ارارو کئی، منائی، منائی پڈیو، کولم، کوٹا گرام (بھنڈار گھر) میٹی پولم (چراگاہ) کھائیاں، کنویں وغیرہ عطیہ میں دئے جاتے تھے۔

باہورتانبہ پلیٹ

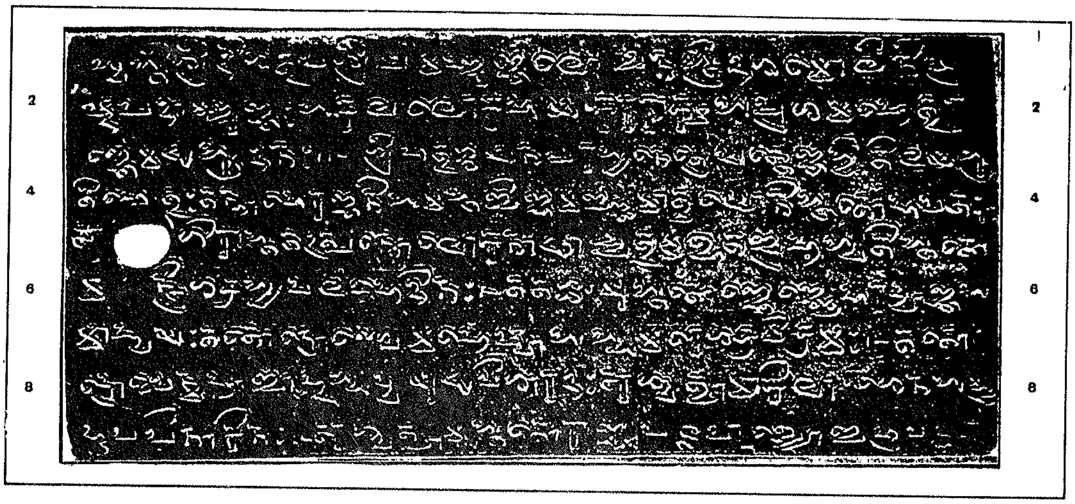

ویٹی، ویدنیائی اورایکورو۔ بیگاراوردوسرے بوجھوں سے خدمتگاروں اورچھوٹے کسانوں اورزمین سے عاری مزدوروں کی مکمل ماتحتی کا علم ہوتا ہے۔ کرائے دار کسانوں کے بیچ زمینوں کی ازسرنوتقسیم اورحدود کی حد بندی، ان الفاظ جیسے کرائی ایڈوڈال، اریسروااوراریپٹی، اریکڈی، پایل نیلم، پائیلی روورم، ادائی نیلم، اورجیسے پیداوار میں راجہ کے حصہ کی منتقلی (سرووری) اورپنم پاگو (پنئی تاڑ، کھجور، تاڑی بنانے والوں پر)، کدائی ادائی کیئے (سپاری پرمحصول) اورکپاس، ادویاتی پودے اورپھولوں پر دلالت کرتے ہیں، بینچائی عطیہ دینے والے اورعطیہ پانے والے دونوں کے لئے اہمیت کی حامل تھی۔ جیسا کہ ہمیں بندھ اور بندھ کے دروازوں (کالنگواورتنبو) کے تفصیلی حوالے جس میں خاص دروازے جیسے وی۔ ویتلائی، تلائیوے اورموگاوے جیسے لفظوں میں ملتے ہیں۔

ترجمعہ (سطر 1) خوش آمدید، خوشحالی!

(پہلاشعر) مدھوکا تباہ کار (وشنو) تم کوخوشحالی عطا کرے۔ وہ جوکمل کی آنکھوں والا ہے جس کے کمل کے پاؤں دیوتاؤں کے سروں سے ملے جاتے ہیں (ان کے آگے جھکے جاتے ہیں) وہ جو پیدانہیں کیا گیا ہے (جو بن گیا ہے) شیطانی روحوں کونیست ونابود کرنے کا ذریعہ جس نے ساری دنیا کومرعوب کررکھا ہے۔

(شعر 2) شری (وشنو) کے سوتے ہوئے شوہر کی آنکھوں میں روشنی (یعنی سورج) نے جنم لیا (جو ہے) مدت، تباہی اور پیدائش کا ذریعہ ہے اس کی (وشنوکی) ناف سے کمل کا پھول نکلا جوسب کا جرثومہ/ جراثیم ہے۔ اس (پھول) سے ہی (برہما) کا خودہی وجودہوا۔

(شعر 3) دنیا کی چاروں سمتوں کے مالک سے انگیرس کا جنم ہوا (اور) بعد میں برہیتی کا جوسکرا (اندر) کامنتری ہے (شیطانوں) کاختم کرنے والا۔

(شعر 4) اس سے سمیو کا جنم ہوا۔ اس سے، وہ جس کو بھاردواج کا نام دیا گیا۔ اس سے عظیم تیرانداز درونا جس کی طاقت کا موازنہ جنگ میں سکرا سے کیا گیا۔

(شعر 5) اس سے درونا سے، پیدا ہوا، ایسا کہا جاتا ہے: پناکن (شیوا) کے ایک حصہ سے لمبی بانہوں والا اسوتھامان جوسبھی قسم کی جنگی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔

(شعر 6) اس استھان سے ایک پلوونامی راجا کا جنم ہوا جس نے 9 براعظموں میں رہ رہے راجاؤں اورہل دھروں پرراج کیا۔

(شعر 7) اس کے خاندان میں راجاؤں کے ایک گروہ کا جنم ہوا جو وملا اورکونکنیکا سے شروع ہوا، جس کے سامنے دشمنوں کی بیویاں سرنگوں ہوئیں۔ جس نے انسانوں کے دیگر حاکموں پر بھی حکم چلایا۔ جو کافی محبوب تھا اور جو لگاتار فتح کی آواز لگاتا تھا۔

(شعر 8) پھر وملا وغیرہ کے بعد اپنے ہی طاقتوں کے نشہ میں چور، چارسمندروں سے بندھی دھرتی ہوا کے رتھوں پرسوار ہوکر جنت میں چلی گئی تھی،

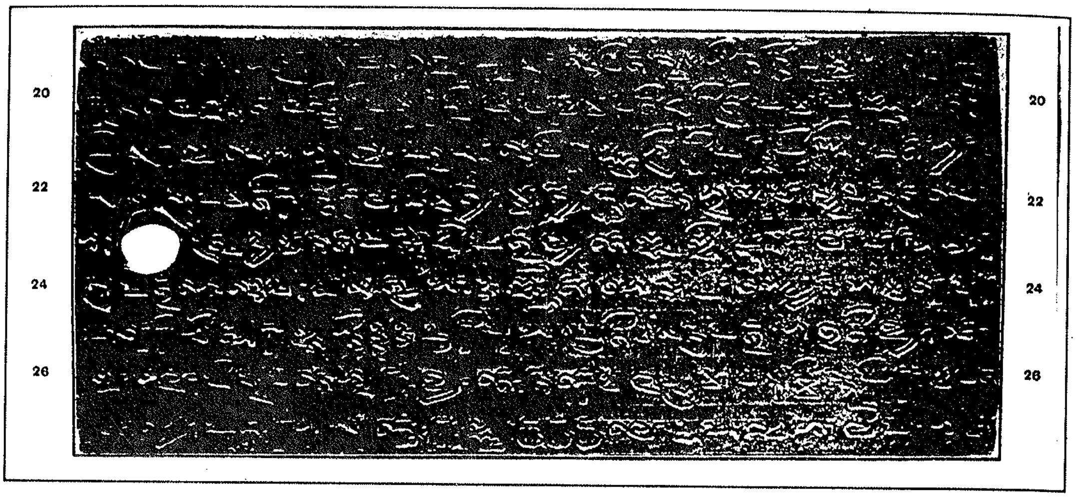

(شعر 20) وہاں لمبی بانہوں والا (راجا) دنتی ورمن تھا جو پرندرا (اندر) سے مشابہ تھا، ان سے مورا کے دشمن (وشنو) کے لئے اٹوٹ بھکتی دکھائی (اور) زمین کے حاکموں کے ذریعہ سر جھکا کر سلام کیا جاتا تھا۔

(شعر 21-23) اس لئے (عرف) نام نیلیے لانگی (یعنی دنیا کی سپورٹ) (تھا) آدمیوں کے اس حکمراں کے لئے مناسب، جیسا کہ کسی دیوتا یا کیونکہ یا اس کا اصلی نام (مارتنڈ یعنی سورج) بالکل عام تھا۔ (سب کے لئے)۔

(شعر 24-26) کورو خاندان کے اس حامی نے ایک علمی مرکز (ودیا استھان) کو اپنے ہی صوبہ (راشٹر) میں تین گاؤں عطا کئے جو (اس کی) گذارش پر ہی (اسے) حاصل ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ایک عامل (اجنپتی)، اس کے مالک نری پٹنگا سے مثلاً چیتو پکم نامی گاؤں جو پھلوں سے بھرپور تھا اس کے علاوہ ایک اور گاؤں جس کے نام میں (آتا تھا) 'ر' پر ختم ہونے والا ایک لفظ اور ودیا ولنگ سے شروع ہونے والا لفظ تھا (اور) تیسرا بہت خوشحال (گاؤں) ارئی پنائی پچیری تھا۔

(شعر 26f) ٹھیک ویسے ہی جیسے بھگوان دھرجاتی (شیو) نے (اپنے) بالو کی ایک جٹا پر ہی بہتی مندا کنی (گنگا) کو اپنا لیا جو لہروں کے اتار چڑھاؤ سے جوش وخروش میں بھی، اسی طرح علم کی گہری ندی چاروں سمتوں سے (عالموں) کی ٹولیوں سے بھرپور وا گور باشندگان کی جگہ پر کرنے کے بعد رک گئی۔ اس لئے وہ عالموں کی اس جگہ کو علمی مرکز کہتے ہیں۔

زمین کا یہ حکمران ان (عالموں) کو (پٹن) گاؤں جیسے ایک عامل کے ساتھ دیا گیا۔ دینے کے بعد اپنے آپ کو کافی برا محسوس کرتا ہے۔ ان کی سرحدوں کا ایک ہاتھ کے ذریعہ احاطہ کیا گیا اور ساتھ اس کے ساتھ بھی ٹیکس کی معافی (اور) ٹیکس سے آزاد محفوظ ہیں۔

ای۔ ہلٹ شاز، نری پٹنگا ورمن کی باہور پلیٹ، اپی گرافیکا انڈیکا، جلد XVIII (1925-26) نئی دہلی، صفحہ 14-12۔

یہ زراعت کرنے والے یا کسان (کڈی یا کڈی مکل) چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں جن کی دیواریں کچی اور چھتیں چھپروں کی ہوتی تھیں۔ لفظ اگم باڑی اڈیان جس کا تذکرہ دنتی ورمن (نویں صدی کے آخر) کے اترامیرور کتبہ میں ملتا ہے، اس سے کسانوں کے ایک اعلیٰ طبقہ کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جو شاید کبھی چھوٹے زمیندار رہے ہوں گے اور جو بڑے گروپ جیسے برہمدیا اور غیر برہمدیا گاؤں کے برہمنوں اور ویلالاؤں کی خدمت میں بھی رہتے ہوں گے۔

گاؤں کے دستکاری گروپ میں سوت کاتنے والے، بنکر، کمہار، مویشی پالنے والے، سنہار، بڑھئی، کاریگر، کولہو کے مالکان، بجولئے اور تھوک بیوپاری (سری کانت پورم کے اردئی وینی گر) شامل تھے۔ دیہی علاقوں میں ان کاریگروں اور دستکاروں کے لئے علیحدہ علاقے تھے (سیریس)۔ جب کہ کانچی پورم جیسے بڑے شہروں میں تاجروں اور سوداگروں کے بھی اپنے علاقے تھے۔ مثال کے طور پر ویدلوی دوگوکوڈی رائی سیر یار کے باشندگان (گھوڑوں؟ کے تاجر یا راجہ کے گھوڑسوار یا رسالہ؟)۔

ایک معنی ہیں نظریہ خودکفیلی یا محدود معاشیاتی گاؤں کا تصور ماقبل ساتویں صدی کے، ساتھ ساتھ ساتویں اورنویں صدی کے عہد کے ان عطیات اراضی سے ہی پیدا ہوا۔ بہرحال زرعی عمل میں توسیع جاری تھی اور علاقائی اختلافات اور زرعی بستیوں اور علاقوں کے وجود پذیر ہونے سے قبل کی صورتحال (تامل علاقوں میں کاشتکاروں کی منظّم تنظیم) کو نئے طریقوں سے منظّم کرنے کی ضرورت تھی، برہمدیا اور مندروں کے توسط سے موجودہ صورتحال کو باقی رکھتے ہوئے اور ایک نئے زرعی طریقے میں متحد کر کے۔ حقیقتاً تامل علاقوں میں ایسا ہی ہوا جہاں کسانوں کی بستیوں اور چراگاہی بستیوں کا ندی گھاٹی اور اس سے آگے وجود ہوا۔ تاریخ کے ابتدائی دور میں بھی اور ابتدائی عہد وسطیٰ کے کتبات میں بھی، کسانوں کے چھوٹے علاقوں (ناڈو اور کرّم) کے واضح حوالے ملتے ہیں۔ ناڈو یا کرّم خودساختہ علاقے تھے جس میں ایک رشتہ کے لوگ (نسل) ایک ساتھ رہتے تھے اور انہوں نے اپنے کو ایک کسان گروپ یا علاقہ کے طور پر منظّم کر رکھا تھا۔

13.4.2 ناڈو/کرّم اور کوٹم میں برہمدیا کی توسیع

شمالی تامل علاقے میں کوٹم ایک چراگاہی مع زرعی علاقہ کے، ایک مشہور مقام تھا۔ جس کا وجود ابتدائی تاریخی دور سے ہی ملتا رہا ہے۔ لیکن بطور ایک محصول کی اکائی کے پلوو اور چولا عہد میں منظّم ہوا۔ کوٹم کے اندر زرعی توسیع میں برہمدیا کا قیام اور چولا عہد میں علیحدہ سینچائی کے نظام کے ساتھ نئے ناڈوں کی تخلیق، دونوں کو عمل دخل رہا ہے۔ چنانچہ تمل کا علاقہ زرعی اور دستکاری پیداوار کی ندی کی گھاٹی اور اس سے بھی آگے تدریجی شروعات کے ساتھ تنظیم نو کے دلچسپ ثبوت کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے۔ اس علاقہ میں یہ صورتحال بالکل واضح دکھائی پڑتی ہے اور اس کے الگ روپ کو جغرافیائی اور ماحولیاتی سیاق وسباق میں دیکھا جاسکتا ہے جس میں برہمدیا اور مندروں کا وجود عمل میں آیا۔

ناڈو یا کرّم گاؤں، کنبہ نما نوآباد بستیوں کے اپنے گروہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ جس کا وجود ندی کی گھاٹیوں کے زرخیز سیلابی خطہ میں خود بخود ہوگیا، جس کی کوئی مصنوعی حد بندی نہیں تھی، جس کی بنیاد رشتوں پر تھی اور جس میں زمین پر فرقہ وارانہ قبضہ داری ہوتی ہے۔ جس میں آبادی کی توسیع اور ساتھ ہی زرعی پیداوار کی توسیع کی وجہ سے اس میں پھیلنے کی گنجائش تھی۔ ناڈو کسی بھی آباد علاقہ (یعنی ملائی ناڈو یا آباد پہاڑی علاقہ) کے لئے ایک عام فہم لفظ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ ناڈو/کرّم ایک نئے زرعی نظام کے اندر اسی وقت سمو دیا گیا جب ابتدائی عہد وسطیٰ کے حکمراں طبقوں نے برہمدیا اور مندر کو ایک متحدہ طاقت کے طور پر استعمال کیا۔ برہمدیا کو ناڈو کے دائرہ عمل سے باہر رکھا گیا اور غیر برہمدیا گاؤں (ار) کو ناڈو کے اندر بطور ویلن وگائی (لائق ٹیکس) رکھا گیا۔ نٹار۔ (ناڈو کا) شاہی فرمان کو قبول کرتے ہوئے برہمدیا کو استعمال میں لاتے ہوئے اور جدید زمین پر قبضہ دار برہمنوں کو ضروری سہولیات بہم پہنچاتے ہوئے دیکھا گیا۔ دوسرے لفظوں میں نٹار اور ار نے زرعی توسیع اور اس کے اتحاد کے طریقہ کار میں تعاون دیا۔ اس کی وضاحت خطہ نما/کسان نما ریاست اور معیشت کے نظریہ کے حاملین کے ذریعہ ایک برہمن غالب، ویلالا اتحاد کے نمائندہ کے طور پر کی گئی ہے۔ کیونکہ ناڈو یعنی کسان کے علاقے کو ایک خودمختار کسان علاقے کے (خطہ) کے طور پر جانا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس تعلق سے ایک کسان نما ریاست اور معاشرہ کی تشکیل ہوئی۔ اس نظریہ سے جنوبی ہند کی ریاست اور معاشرہ کے جاگیرداری نظریہ پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے گو کہ اراضی عطیات کا نظام انٹرمیجریز، (بچولیوں) مذہبی اور سیکولر دونوں طرح کے راجہ اور کاشتکار کے درمیان وجود میں آنے کے ثبوت فراہم کرتا ہے اور اس سے زمین پر قبضہ دار طبقہ اور کاشتکاروں میں مزدور طبقہ کے درمیان استحصالی رشتہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

13.5 تمل علاقہ: پانڈیا (تامل ناڈو کے جنوبی اضلاع) چھٹی صدی سے دسویں صدی عیسوی تک

پانڈیا علاقے یعنی تامل ناڈو کے جنوبی اضلاع میں ابتداء میں برہمدیا کے (ویلوی کڈی اور دلاوے پورم پلیٹ) عمل میں آنے کے ثبوتوں سے ان کے تاریخ کے ابتدائی دور میں بھی موجود ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم جو کچھ حقیقتاً ہو رہا تھا وہ برہمدیا کا ایک متحدہ طاقت کے طور پر قائم اور رائج کرنا تھا۔ برہمن ایک غیر پیداواری طبقہ تھا جس کا تعلق انتظامی امور سے تھا۔ اسی طرح مندر بھی غیر پیداوار کی غرض سے زمین کی مزید تقسیم تھا۔ یہ خصوصیت تمر پارنی گھاٹی میں بمقابلہ ویگائی گھاٹی کے زیادہ تھی۔ علاقہ کی دو بڑی ندی گھاٹی زیادہ شدت رکھتی تھیں (برہمدیا کی ادارہ کاری، بحیثیت ایک متحدہ طاقت کے، سے ہمارا مطلب ہے ایک ایسا ادارہ جس کے ذریعہ مختلف بستیوں کے کاشتکاروں (جو قوت لایموت کے مقام پر تھے) کو ایک زائد پیداواری نظام کے تحت آ گئے)۔ اراضی عطیات سے پیداوار سے غیر متعلق انٹرمیجری (بچولئے) مالکان زمین/کنٹرولر کا وجود ہوا جو توقیری پیداوار کا مالک ہوتا تھا۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE • MANUU • IMC LIBRARY • Hyderabad

برہمنوں کی صلاحیتوں کو بروئے کارلا کرار یانظار کے ویلالاؤں اورناڈو کے ویلالاؤں کے ذریعہ پیش رفت، زراعت کومنظم کرنے ،جس سے پیداوار میں خاطر خواہ بڑھوتری ہورہی تھی ، راجہ درحقیقت اپنے دائرہ حکومت میں پیش رفت زراعت کے دائرہ کووسعت دے رہا تھا۔ زرعی تنظیم کے برہمنی اور ویلالا طریقے سے مزدور کی اس کے معاشرتی تقسیم اور پیداوار کے ذیلی تعلق کے ذریعہ سے دیہی سماج کومتحدہ کیا۔ مندر کواراضی عطیات بطور دیودانا (کوڈی نگا دیودان، سابقہ آبادی کوبغیر ہٹائے ہوئے دیودانا برہمدیا کو) کے پیداوار اور تقسیم نو کے اسی طرح کے رشتوں کوجنم دیا۔ اس عہد کی بدلتی ہوئی خصوصیات پیداوار کی تنظیم اوراس کے انتظام میں رونما ہورہی تھی نہ کہ ٹکنالوجی کی تبدیلی میں۔ ہرطرح کی ٹیکنیک کا ادارتی اور تنظیمی سہارے اور مزدوروں کی قوت کارگردگی کے ذریعہ کہیں زیادہ اچھے ڈھنگ سے استعمال میں لایا گیا۔

برہمدیا گاؤں کا زیادہ تر وجود خاندانی بستیوں کے علاقہ میں ہوا۔ اکثر برہمدیا کے وجود سے نہ صرف کچھ اور اختیارات کا زمین پر، سابقہ خاندانی ملکیت پر نفاذ ہو رہا تھا بلکہ برہمدیا نظام کا زرعی نظام کے ان حلقوں میں پھیلنے سے پرانے زراعت کے طریقہ کا اختتام ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اس نسل کی آبادکاری میں قلب ماہیت ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ عام حالات میں یہ ایک خاموش تبدیلی نہ ہو اور اس لئے ویلوی کڈی گرانٹ میں ملکیت کے مسئلہ پر واضح دستاویز کی ضرورت کا حوالہ ہے جن پر سدر اس قبائلی سردار (کیلاواں) کے ذریعہ مخصوص کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ جس میں سابقہ عطیہ (ایکا بھوگا برہمدیا) کے ایک حصہ کوشودر آبادی میں تبدیل کیا گیا ہے۔ برہمدیا نظام کے پھیلاؤ کو درپیش غیر برہمنی مزاحمت، برہمن بحیثیت ایک طبقہ کے، ساتھ ہی بہتر انتظامی صلاحیتوں سے اور اپنی فراست اور ترقی پذیر زراعت کے ہرٹیکنیکل عمل سے اس کا مقابلہ کرتے ہوں گے۔ لیکن برہمدیا کی حفاظت کی ذمہ داری جنگجو (چھتری) طبقہ پر تھی۔ برہمدیا کا جدید اضلاع تیرونیل ویلی اور رام ناتھپ پورم (دوتہائی حصہ) کے زرخیز زمین پر زرخیز ناڈو اور کرّم میں تمر پارنی ندی کے کنارے پھیلے ہوئے ناڈوں میں مرکوز تھا (دلا ناڈوں، جیسے پرنتکا والا ناڈو، ایتا گنا والا ناڈو، ولوتی ولا ناڈو، اور کڈا ناڈو)۔ تقسیم کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ علاقہ میں نسبتاً یکساں بارش، پانی کا نکاس، مٹی کی ساخت، سیلاب زدہ یا زرخیزی سے پر لال مٹی، آب وہوا اور بالیدگی جیسے کہ تمر پارنی کا گھاٹنا شاخ، ویاپار اور ارجنا ندی اپنے معاون ندیوں کے ساتھ، گندر کی معاون ندیاں۔ ویری سولی کی دونوں شاخیں اور بیری پار کے کنارے وناڈو میں۔ چھوٹے زرعی علاقوں کا پھیلاؤ اریا کٹی۔ یا بڑے علاقے۔ ناڈو یا کرم اکائیاں جیسی بستیوں کے گروپ میں برہمدیا نظام کے ذریعہ نشوونما پایا۔ پہلا (قلب) گاؤں کے نام سے یا سینچائی کے وسائل کے نام سے (ویگائی ولا ناڈو، مگالور کلاکل وغیرہ)، یہ سینچائی کے وسائل کی صلاحیت تھی جو ہر بستی اور ہر ناڈو کے پھیلاؤ کی دوری کو معین کرتی تھی۔ ولا ناڈو، ناڈو کی مانند ایک شاہی تخلیق تھی۔ کل ملا کر 40 ناڈو 11 ولا ناڈو، 6 کرّم، تین کلاکل اور ایک مٹن کی دھان کی پیداوار کے سازگار ماحول کے علاقے میں واقع تھا۔

13.5.1 زمین کے حقوق

برہمدیا، دیودان، اور پلک کنڈم (جینی مذہبی اداروں کو گرانٹ) زمین پر اعلیٰ اختیارات کے غلبہ کو اور مالکان زمین کی ایک مشترکہ تنظم میں اداریاتی ملکیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس طرح سے زراعت کے انتظام کا نہ کہ خود کاشتکار کے۔ زمین کی کاشت یا تو اصل زرعی پیشہ وروں سے (یا ابتدائی آبادی) یا نئے کوڈی یا پیشہ وروں کے ذریعہ کرواتے تھے۔ زمین کے کسی حصہ یا حصوں (پنکو/ پنگو) کا ہدیہ یا بذریعہ خرید علیحدہ کیا جاسکتا تھا۔ جب کہ زمین کا شتکار کو پٹہ پر دینے سے مالک زمین اور کاشتکار کے درمیان بچولیہ طبقے کا وجود ہوا۔ زمین پر اعلیٰ اختیار کی منتقلی برہمدیا میں پرتی گرہا۔ کسی حصہ (پنکو) کا ہدیہ استری دھن یا جہیز وغیرہ کے ذریعہ ہوا۔ اس کا مطلب مکمل ملکیت نہیں تھا بلکہ اس کا رجحان حصہ کرنے سے تھا تاکہ زمین موروثی ہوجائے۔ برہمدیا کے معاملے میں پنکو کے سبھی لین دین باصلاحیت برہمنوں کے درمیان ہی ہوتے تھے۔ درج ذیل اختیارات سے اس میں فرق مراتب یا درجہ بندی کا پتہ چلتا ہے۔ راجہ (کونمئی) تمام زمینوں کا بطور ایک علامتی فرمانروا کے میاتکی (پیداوار کے انتظام اور اس پر کنٹرول کے اعلیٰ اختیارات) کو جنم دیا۔ جس سے عطیہ پانے والا یا تو کرنمئی (نگرانی کے اختیارات) یا زمین دوسروں کو دیکر کاشت کرانے کا اختیار پایا جاتا تھا۔ یعنی کسان جوکٹی (کٹی مٹی) کے ذریعہ زمین کی کاشت کراتا تھا۔ کرنمئی کو زمین کی مزید تقسیم سے علیحدہ کیا جاسکتا تھا۔ کل پتی کرنمئی۔ کرنمئی کا آدھا ذیلی حصہ اور میل پتی۔ میاتکی (اعلیٰ حصہ) ہے کسانوں (کرالار) کے چھوٹے اور بڑے حصہ کا پتہ چلتا ہے۔ اصل کرنمئی اتیار، بسا اوقات اپنے حقوق سے بوجہ ان حقوق کی منتقلی سے محروم ہوجاتے تھے۔ خدمت کی مدت کا ویروتی سے پتہ چلتا ہے جو مندر کی خدمت میں پانی مکل کے لئے تھا۔ دستکار جیسے بڑھئی، کمہار اور بنکر کو بھی ان کی خدمات کے لئے زمین دی جاتی تھی اور وہ لوگ کٹی میں شمار ہوتے تھے۔ سبھا اور دوسری مشترکہ تنظیم جیسے ار، زمین کی خرید وفروخت اور بطور ہدیہ دے سکتے تھے۔ ان سب وجوہات سے زمین اور اس کی حدود (ویالم کرایم) کا نقشہ کھینچنا

ضروری ہوگیا۔ چنانچہ میاتکی (اعلیٰ اختیارات) والے (عطیہ پانے والے) زمین کرالار (کاشت کے اختیارات) کے ساتھ اجارہ پر دیتے تھے جو زمین کے کاشتکار کو دے دیتا تھا اور ان دونوں کے بیچ جب زرعی پیداوار کی بنیاد پر اور پیداوار میں حصہ داری کی بنیاد پر ایک رشتہ پیدا ہو جاتا تھا۔ وقف شدہ زمین کی تقسیم نو کے ذریعہ مندر نے زراعت کے منتظین اور اصل کاشتکار کے درمیان مختلف قسم کی بچولیوں کو وجود بخشا یعنی معاشرتی تعلقات کی بنیاد پر ایک ڈھانچہ، جس کی بنیاد زمین کے اختیارات میاتکی کرنمئی اور کٹی مئی (خواہ وہ جس کے قبضہ میں زمین ہے یا وہ جو اصلاً زمین کی کاشت کرتا ہے) پر تھی۔ اصطلاحات اور ملحقات جیسے ارے یار (مقامی حکمران؟)، کیلار (مالک زمین) یا کلاور (گاؤں کا مکھیا؟) سبھے یار (سبھا کا ممبر اور ارارا (ار کا ممبر) زمین سے جڑے طبقوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ارے یا، کیلارا ور ارار میں برہمن بھی شامل تھے۔ زمین والے برہمن طاقتور طبقوں میں سب سے اہم طبقہ معاشرتی تعلقات کی کڑی میں انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بطور دیودان کے نگران کے طور پر ابھرا۔ کاریگروں، دستکاروں اور کاشتکاروں کے معاملے میں بمقابلہ ذات کے زمین پر ان کے حقوق سے ان کی سماجی حیثیت اور طاقت کا پتہ چلتا تھا۔

بہت سے کاریگروں اور دستکاروں کے علاوہ دیگر پیشوں میں مامور جیسے دھوبی (ونآ تار)، کولار (لوہار) کو ماتحتانہ زمین کے حقوق دئے جاتے تھے۔ خاص کر سبھا کے ذریعہ کٹی مئی دیا جاتا جس میں مندر کی خدمت کے ساتھ ساتھ برہمدیا اور دیودان گاؤں کی بستیوں کی بھی خدمات انجام دینا شامل ہوتا تھا۔ کچھ اور اہم دستکاری کے طبقے تھے جیسے بنکر (سلیا اور کیکولا)، بڑھئی (ٹکار) اور معمار (اکاریان) یہاں تک کہ کمہار (کوساون) بھی اپنے ہی کوڈی یا زمین کے قبضہ دار تھے۔ ویٹ کٹی (ٹیور۔ ویٹ کٹی، اور ٹالی ویٹ کٹی) سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو مفت مزدوری کرتے ہیں بلکہ ایسے دیہی لوگ ہوتے تھے جن کے ذمہ مندر میں گھی کی سپلائی ہوتی تھی اور لگتا ہے کہ وہ کرنمئی حقوق میں حصہ دار ہوتے تھے۔ کاشتکار زمین سے ایک غلامانہ گروہ کی شکل میں جڑے ہوتے تھے۔ بسا اوقات وہ لوگ زمین کے ساتھ منتقل ہو جاتے تھے۔ ویراکیتووان اور ارنا کولی کے کتبات میں ادنیٰ خدمات کے طور پر حوالہ ملتا ہے۔

اس طرح زمین پر حقوق کی ساخت کو نمئی نٹمئی کے میاتکی (ناڈو کی جماعت)، ارنمئی (ار کی جماعت)، برہمدیا کیلامئی (کیلامئی مطلب اختیارات/ملکیت)، پٹہ دار کاشتکاروں کی کرنمئی اور خدمتگاروں اور کاشتکاروں کی کٹی مئی تھی۔ زرعی نظام جو برہمدیا دیودان گاؤں میں وجود میں آیا دھیرے دھیرے غیر برہمنی گاؤں تک پہنچ گیا۔ یہ نتیجہ تھا اس کا جو غیر برہمنی گاؤں کا مندر کے ساتھ مختلف لین دین کے رشتوں سے منسلک تھے۔ یعنی زمین کے تعلقات سے متعلق برہمدیا طریقوں کا غیر برہمنی گاؤں تک پھیلاؤ (بحوالہ دلیپتی سمدرم اور اراووڈی کتبات)۔ زمینی حقوق کی ساخت بھی یکساں تھی۔ گروہی ملکیت جاری تھی اور ان کی برخاستگی ایک سلسلہ وار عمل تھا۔ زمین کے حقوق کی بڑھی ہوئی اہمیت اور ان کا وراثتی مزاج سے مختلف سماجی گروہ کا قبائلی ذات کے گروپ کو درون گوت ذات گروپوں (کاریگروں اور دستکاروں) میں بدل دیا۔ ذات پات موروثی عمل سے بندھ گئی۔ بھکتی رسومات اور مندر، فرق مراتب پر مبنی رسومات کو بڑھاوا ملا۔ شاہی دستکاروں کی بحیثیت زمین کے اور مالکان کے بطور شاہی کاشتکار کے بہتر پوزیشن میں تھے۔ اکثر ان کے رشتہ کو پرانک رشتے سے جوڑ کر دیکھنے کا جواز پیدا کیا گیا۔ لہذا نظریہ نے زرعی معاشرہ کی سماجی معاشی تنظیم کو جنم دینے میں اہم رول ادا کیا۔

حدود کی تصریح اور اس طرح زمین کی درجہ بندی اور اس کی پیمائش بھی ضروری ہوگئی، جنگل اور بنجر زمین کو لائق کاشت بنانے کی وجہ سے اور چھوٹے چھوٹے مالکان (انفرادی) برخلاف گروہی کنٹرول کے ابھرنے سے۔ پرانے چارٹروں کی تجدید کی ضرورت آن پڑی اس کی وضاحت کے ناپید ہونے کی وجہ سے، جو استفادہ اور وراثتی وغیرہ مسائل کو حل کرنے کے لئے ضروری تھے یعنی پدری رواج کے لحاظ سے کرنمئی حقوق موروثی حقوق بن گئے۔ حدود بندی ایک رسم بن گئی۔ ایک مادہ ہاتھی (کرنی بھرمن)، جو عطیہ میں دی گئی زمین کے چاروں طرف دیوتا پر چڑھائے جانے والے پانی کے ساتھ چکر لگاتی تھی جس کے مقامی مالکان زمین گواہ ہوتے تھے۔ حصہ داروں کا اپنے حصہ پر حق دائمی ہوتا تھا جس کو وہ اپنی مرضی سے بیچ سکتا تھا، گروی رکھ سکتا تھا یا ہدیہ کرسکتا تھا۔ زمین کا ٹکڑوں میں تقسیم ہونا ایک مستقل عمل تھا۔

مویشی دولت، مندر کا ایک دوسرا ذریعہ آمدنی تھا۔ گائیں اور بکریاں (بھیڑ) جو تحفہ میں دی جاتی تھیں وہ ویٹ کٹی کے حوالے کی جاتی تھیں۔ بسا اوقات ایک پٹیٹا لیاوان (کسی گاؤں کے چراگاہی گروہ کا سردار؟) کو ان اوقات کی ذمہ داری دی جاتی تھی۔

سونا بھی مندر کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ مندر میں جمع شدہ سونے کی پھر سے تقسیم ہوتی تھی۔ سونا کالنجو اور کاسو کی شکل میں زمین کے عوض دیا جاتا تھا۔ دولت کی دوسری قسم میں جیسے پالم کسو (پرانا کسو) کرشنا کسو، الاکسو اور دینار بطور تحفہ دئے جاتے تھے۔ جس کو دوبارہ کسی مصرف میں لگا دیا جاتا تھا یا اس کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سونے کے تحفہ کو عام طور سے سبھے یار کے درمیان بانٹ دیا جاتا تھا۔ منافع (پالی سی پاپول) جو مندر کو حاصل ہوتا تھا وہ دھان اور گھی کی شکل میں ہوتا تھا۔ شرح سود مختلف ہوتی تھی فی کسو کی شرح کا پیمانہ دھان کے دو کالم سالانہ تھا۔ ناپ کا پیمانہ بھی مختلف تھا۔ پیسے کا استعمال بہت معمولی تھا۔ پیسے کا استعمال صرف زمین کے لین دین اور شاہی قرض کی ادائیگی کے لئے ہوتا تھا۔ پون ٹولیپ پون، کا پلو ور یکارڈوں میں ذکر ملتا ہے (بعد کے دور کے پلو و کا سکہ؟)۔ کاوا، تیار (محاسب) ایک کرمچاری معلوم ہوتا ہے جو مندر کا حساب کتاب رکھتا تھا؟ دوسری اشیاء کا باہمی تبادلہ وزن کر کے یا ناپ کر کے ہوتا تھا یا استعمال کیا جاتا تھا۔ کلم اور نلی اناج کی ناپ تول کے لئے بہت عام تھا۔ زمین کی پیمائش کے لئے راڈ (کول) کا استعمال مخصوص تھا۔ ویلی معیاری اکائی تھی۔ مکانی اور ماہی زمین کی اکائیاں تھیں جو زمین کی بوائی کی صلاحیت پر منحصر تھی (زمین کی پیمائش، زمین کا پڈاکرم زمین کی پیمائش کا ایک دوسرا پیمانہ تھا)۔ عام طور سے دو فصلیں (اروپو) اگائی جاتی تھیں جو موسمی بارش پر منحصر تھا۔

زمین کی قسم میں پوراوو (لائق کاشت) نینسی (تر زمین) اور پنسی (خشک زمین) اور منائی اور الا والا کم (گھر کا مقام) شامل تھیں۔ زراعتی خطوں کو ناٹی، نیر نیلم، کلانی اور ویال کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے جب کہ ٹوٹم کا مطلب باغ کی زمین، بنجر زمین۔ کوموٹو نیلم یا پال نیلم کہا گیا ہے۔ پروتی نیلم کپاس کی کھیتی کی زمین کے لئے استعمال ہوا ہے۔

زرعی وسائل کی تقسیم ایک مشکل کام تھا یعنی کاشتکاروں سے کمر الارتک، کنی حقوق (کنی رتی یار) کا ملکوں کا حصہ سب سے زیادہ جو اس کو مندر اور سبھایار (کنی کٹن) کے ساتھ بانٹتے تھے۔ ریاست یا ادارہ جس کو زمین عطیہ میں دی جاتی تھی وہاں سے کٹمئی ٹیکس بچولیوں کے ذریعہ وصول کیا جاتا تھا۔ لفظ ارائی = ٹیکس ایک غیر واضح لفظ تھا۔ یک مشت یعنی ارائی کا ول یا ارائی ڈرویام مع زمین کی قیمت کے خریدار سے سبھایار کے ذریعہ لیا جاتا تھا۔ اس میں عام طور سے ہر قسم کا ٹیکس شامل ہوتا تھا۔ ویٹی اور رویٹی نئی بیگار اور بوجھ تھا؟

اہم وسائل جو سماجی تعلقات کی ہیئت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس میں حصہ داری کے طور طریقے کا اثر دیگر وسائل کی تقسیم پر بھی پڑتا تھا۔ دالوں، مالوں اور گرم مسالوں میں بھی مالکان زمین کا ایک بڑا حصہ ہوتا تھا۔ جس طرح دھان میں حصہ ہوتا، تھا اور جس کو پھر مندر کے عملہ اور دیگر جو اس سے منسلک ہوتے تھے، میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ویروٹی مندر سے جڑے مختلف قسم کے لوگوں جیسے بڑھئی کنکپ پنٹرم (محاسب)، اواکار (ڈھولکیہ)۔ مندر کے ناظم (سری کرینم ارے وان)، کمہار، اور نوکروں چاکروں کے بیچ دیودان کی مزید تقسیم کر کے زمین کی میعاد سے متعلق استعمال ہوتا تھا۔ مندر جہاں عیش و عشرت اور ذائقہ دار اشیاء کا بھی استعمال ہوتا تھا تجارتی طبقہ کو اندرون ملک اور بیرون ملک سے بھی اپنی طرف متوجہ کرتے تھے، جس سے تاجروں کی آمد و رفت کو بڑھاوا ملتا تھا۔ اور بین العلاقائی تبادلہ اور دور دراز سے تجارت دسویں صدی سے دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس عہد کے عام معاشیاتی طرز سے اونچی جگہوں اور پہاڑی ڈھلانوں پر ابتدائی زراعت (جنگلوں کو کاٹ کر اور جلا کر)، چراگاہوں کو مویشی پالن کے لئے اور اسی کے ساتھ سینچائی کے ذریعہ ترقی پذیر کاشتکاری اور صنعت و حرفت کی زرعی بستیوں کے مجموعہ کو پیش کرتی ہے۔ ترقی یافتہ دھان کی پیداوار، پیداوار کا ایک غالب عنصر تھا جو مزدور کی تقسیم اور سماجی ساخت کا مرکب تھا۔ یہ نظام مندر سماج کے غیر معیشتی بندھنوں سے بندھا ہوا تھا جس میں کاریگری، دستکاری اور مزدوری لازم تھی اور ان کو جنس کی شکل میں مزدوری یا قیمت دی جاتی تھی۔ تجارت میں لگ بھگ دسویں صدی سے ہی بازار کے نظم سے (نگرم) اور لمبی دوری کی تجارت میں غیر معمولی تبدیلی لانے کے غرض سے روزمرہ کی استعمال میں آنے والی غیر مقامی اشیاء پر زور دیا جاتا تھا (دیکھئے موجود بلاک کا تبادلہ کا نیٹ ورک اور سوداگروں کا آپس میں تعلقات اور شہر کاری کی اکائی)۔

13.5.2 سینچائی، چھٹی صدی سے دسویں صدی عیسوی تک

پلو وادر پانڈیا علاقوں میں دائمی سینچائی کی تکنیک اور سیلاب کی تکنیک دونوں ہی استعمال میں تھیں۔ ندیوں اور سوتوں سے نہریں نکالی جاتی تھیں (دیکھیں سینٹن اریکیسری (مدورائی ضلع) ساتویں صدی عیسوی کی ویگائی ندی کا کتبہ) اہم سینچائی کے کام راجاؤں اور سرداروں کے ذریعہ کرائے جاتے تھے (مثال کے طور پر ایرو پائی کٹی کپلاون، ایک ایسا ہی سردار تھا جس نے اپنے علاقہ میں بہتر ے ایری (پانی کے ذخیرے اور تالاب) کھدوائے۔ مقامی سرداران جو اپنے آس پاس کے علاقے کو اس طرح کی سہولیات پہنچانے کے لئے نامور ہو جاتے تھے ان کو اہم سیاسی حیثیت دی جاتی تھی۔ پلو وادر پانڈیا دونوں ہی علاقوں کو نہروں کا ضلع کہا جاتا تھا کیونکہ یہ دونوں ہی علاقے اسی قسم کے پانی کے ذخیرے اور مانسون کی بارش جس سے ان کی بھرپائی ہوتی تھی، پر منحصر رہتے تھے۔ ندیوں سے بھری جانے والی اری کا پتہ ملتا ہے۔ زرعی علاقوں اور ان علاقوں کے برہمدیا میں بندھ (مٹائی) اور بندھ کے دروازوں (تمپو اور کومپلی) اور کال (نہریں) کی تعمیر اور اس کی مرمت کے ذکر سے سینچائی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گاؤں کے تالابوں (ارکولم یا ایری) سے نکالے گئے، و یا کالوں سے زمین کی سینچائی ہوتی تھی۔ نٹو پر مکل، ناڈو کی بڑی نہر، ان نہروں کا پتہ دیتی ہے جس سے پورے ناڈو میں پانی پہنچایا جاتا تھا اور وہ غالباً نٹار کے قبضہ میں رہتا تھا۔ کنویں بھی کھیتوں سے سینچائی کے لئے تالابوں سے جڑے ہوئے تھے۔

تالابوں کی دیکھ بھال اور اس کی حفاظت کے متعلق معلومات پلو وکتبات میں ملتی ہیں اور دونوں علاقوں میں متعدبہ تالابوں کی حقیقت حال سے متعلق معلومات اور برطانوی استعماری حکومت میں ان کی مرمت سے متعلق معلومات ہمیں دسٹرکٹ گزٹ اور کتابوں (Manuals) میں ملتی ہیں۔ کلنکو وریم یا ایری وریم جیسی مخصوص کمپنیاں جس کا ذکر پلو وکتبات میں ملتا ہے، پانڈیا علاقہ میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ گاد ہٹانے اور رکھ رکھاؤ کے لئے کشتیوں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا جن کا پوری جھیل یا پانی کے ذخیرے کی شروع سے آخر تک کی صفائی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس طرح کا حوالہ بعد کے پلو وکتبات میں بھی ملتا ہے (کاویری پکم شمالی ارکوٹ ضلع)۔ تمل علاقہ اور سری لنکا کے درمیان سینچائی کی ٹیکنالوجی کے تبادلہ کا بھی ثبوت ملتا ہے اور یہ کہ سری لنکائی سینچائی کا نظام ابتدائی صدی عیسوی میں کافی ترقی یافتہ تھا۔

بندھ کے دروازے کا نظام

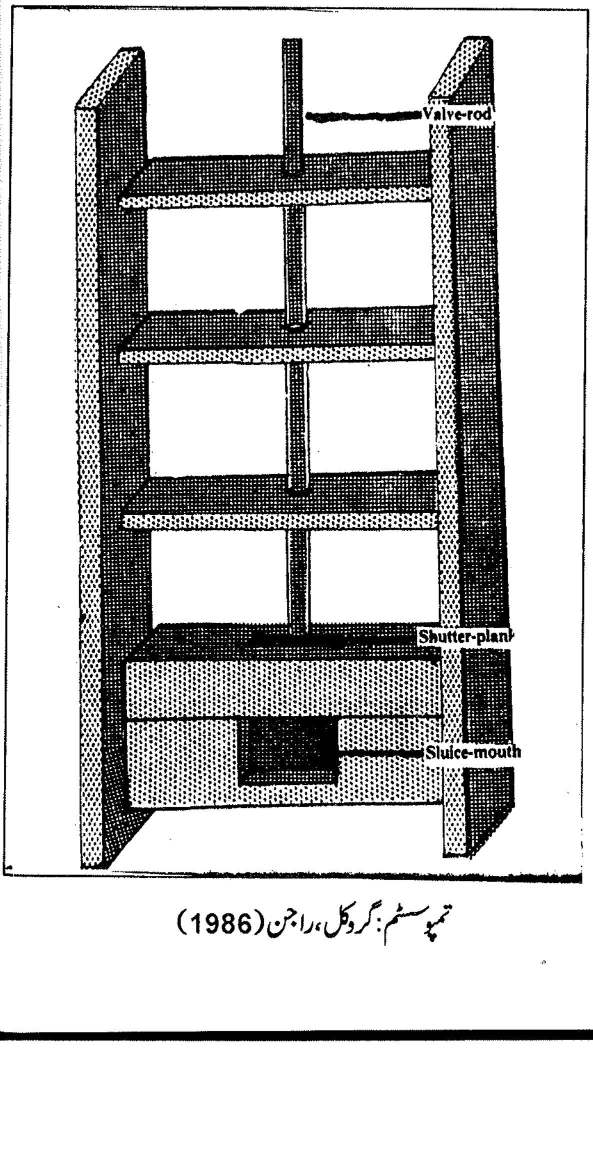

تمپو سسٹم: گرو کل، راجن (1986)

پانڈیا علاقے میں بہت سے گرینائٹ پتھروں سے بنے بندھ کے دروازے (کر تمپو) پر لکھے کتبوں پر دھیان ہی نہیں دیا گیا اور اسی لئے بطور ثبوت استعمال میں نہیں آسکا ہے (مثلاً پیریا میناکشی پورم کا تمپو کتبہ جو ایک ٹٹن کے ذریعہ بنوایا گیا تھا) تمپو واحد ایک ایسی مشین تھی جو والوو (valve) والہ سسٹم تھا جس میں کوئی آلہ نہیں لگا ہوا تھا۔ ان بندھ کے دروازوں میں دو گرینائٹ پتھر ہوتے تھے جو تالاب کے اندر ڈال دئے جاتے تھے بغیر اس کا خیال کئے کہ دروازے کا منھ اوپر ہے یا نیچے۔ کھمبے کی اونچائی تالابوں کی گہرائی کے مطابق الگ الگ ہوتی تھی۔ کھمبوں کو cross slab سے درمیان میں ایک چھڑ اوپر سے دروازے کے منھ تک ڈال دی جاتی تھی۔ چھڑ کا کنارہ سپاٹ ہوتا تھا جو پورے دروازے کے منھ کو ڈھک لیتا تھا اور جو بطور شٹر Shutter دروازے کے لئے کام آسکتا تھا۔ کھمبوں کے دوسری طرف تیر کر جایا جا سکتا تھا اور آڑی پٹیوں cross slab کا سہارا لے کر چھڑ کو اٹھا کر شٹر کو چلایا جا سکتا تھا۔

کمپلی سسٹم میں کپاٹ چھڑ shutter rod کا کنارہ جو کم وبیش گولائی

میں ہوتا تھا پتھر کے بنے گڈھے میں بنے سوراخ کو بند کر دیتا تھا۔ والو کی شکل بھی دوسری طرح کی تھی۔ یہاں پانی اوپر سے بہتا تھا جب کہ پہلے والے میں کنارے سے۔ یہ پانی تالاب کے باہر کی طرف بنے کنویں جس کو ایتی را کی نرو کہا جاتا تھا، کی طرف لے جایا جاتا تھا۔ عام کنوؤں کے برخلاف اس کی تعمیر نیچے سے اوپر کی طرف ہوتی ہے۔ اس میں نیچے کی سطح پر سوراخ ہوتے ہیں جو مختلف سمتوں میں جاتی نہروں سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس کا بہاؤ قوت کشش ثقل کے مطابق کام کرتا تھا۔ کنویں میں پکوٹا سسٹم ہوتا تھا۔ ساتویں۔آٹھویں صدی عیسوی میں زیادہ تر سینچائی کے پروجیکٹ عمل میں لائے گئے (پلن ایری کے بندھ کے دروازے کی تعمیر کے لئے چھینی سے کٹے پتھروں کا استعمال ہوا۔ رنتھا پورم کتبہ)۔ سینچائی کا نظام مشترکہ تنظیم جیسے ناڈو، سبھا اور رار کے اجتماعی انتظام کے ماتحت تھا اور اسی طرح مقامی سرداروں کے کنٹرول میں بھی۔

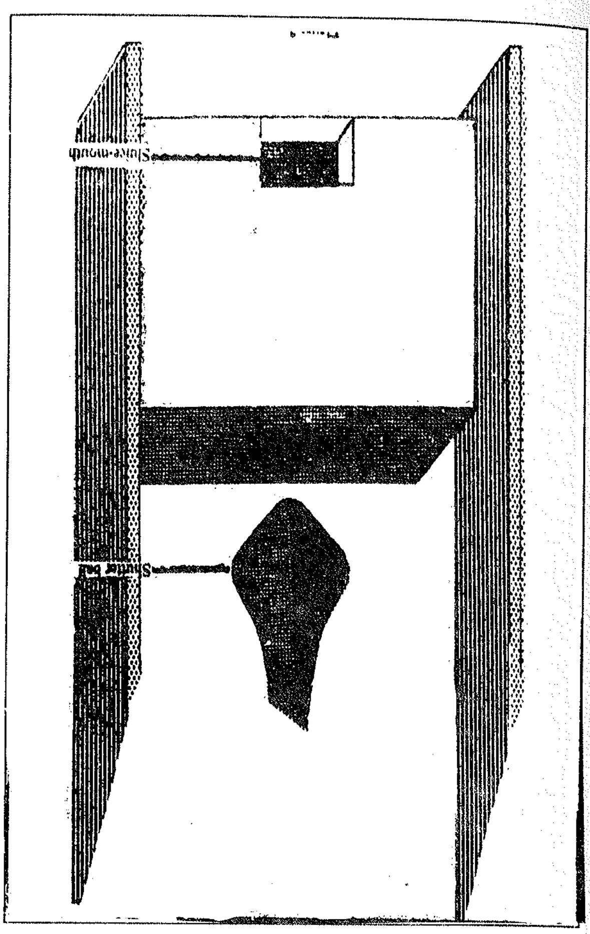

کملی سسٹم: گروکل، راجن (1986)

13.6 زرعی نظم اور محصول کی تنظیم۔نویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک

زرعی نظام کا طریقہ کار میں علاقوں میں حکومتوں کے براہ راست مداخلت سے نویں سے تیرہویں صدی عیسوی میں مزید تبدیلی واقع ہوئی۔

13.6.1 تمل ناڈو: چولا

چولا حکومت کے دور میں زرعی نظام میں زمین کے سروے اور لگان کا تخمینہ لگانے کے لئے علاقوں اور خطوں میں حکومت کی براہ راست مداخلت سے مزید تبدیلی واقع ہوئی اور ساتھ میں جدید اور بڑی محصول کی اکائیاں وجود میں آئیں۔ جو برہمدیا اور موجودہ کاشتکاری نظام کا نتیجہ تھا۔ ناڈو غیر برہمدیا گاؤں میں زرعی پیداوار اور اس کی تقسیم نو کو منظم اور مستحکم کرتا رہا۔ بہر حال والا ناڈو (محصول کے نظام کے لئے ناڈوں کا گروہ) کا وجود اور مخصوص برہمدیا کی علیحدہ محصول کی اکائی کے طور پر ترقی (تن کرو یا تنیار) جس میں آس پاس کے برہمدیا کے مندروں کے ساتھ دیگر غیر برہمدیا گاؤں پر قبضہ و کنٹرول کا مطلب تھا شاہی اختیارات کا ان اداروں کے ذریعہ زیادہ کارگر ڈھنگ سے علاقے کے اندر زرعی وسائل کی نقل وحرکت کے لئے استعمال میں لانا۔ ہر ایک ناڈو کے لئے نگرم کے بطور بازار مرکز کی حیثیت سے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ بیوپاری تنظیموں سے بھی مقامی پیداواری اور تقسیم جدید کے طریقہ کار پر موثر انداز سے دخیل ہوا۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ار میں مشترکہ ملکیت کا عمل جاری رہا۔ گوکہ چولا عہد کے اختتام میں زمین کی ملکیت کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہوگیا اور زمین کی ملکیت کی درجہ بندی غیر برہمدیا گاؤں میں بھی (ار) مسلسل جاری تھی۔ غیر برہمدیا گاؤں میں زمین پر قبضہ داری عمومیت سے جاری تھی۔ لیکن اس عہد کے اختتام میں انفرادی

تامل ناڈو میں برہمدیا کی تقسیم: تقریباً 1300 عیسوی

زمین کی ملکیت ان گاؤں کے اندر بھی پھیلنے لگی تھی۔ برہمدیا گاؤں کے اندر مالکان زمین اور کاشتکاروں کی دو علیحدہ علیحدہ قسمیں تھیں جب کہ غیر برہمدیا گاؤں بطور مالکان زمین کے خود ہی کاشتکار بھی تھے۔ انفرادی ملکیت یا حصہ داری برہمدیا گاؤں کے اندر جاری رہی جس میں زیادہ تر برہمن کے پاس ملکیت زمین تھی۔ سیکولر عطیات جو شاہی عملہ کو دی جاتی تھی اس میں بھی تیزی آ گئی اور ایسے گاؤں ان عملہ کے ماتحت ہوتے تھے جن کے ذمہ اس کے محصول کی ذمہ داری بطور جیوتم کے ہوتی تھی۔

کنی کے مالکوں اور ار کے ذریعہ مندروں کے لئے زمین کی خرید و فروخت عام رواج بن چکا تھا (اسنائی کرئی گاؤں)۔ 16 کنی مالکوں کے ذریعہ جمبوکیشو ورم مندر کو اپنے حصوں (پنگو) کی فروختگی کے ثبوت موجود ہیں (کری استان گوئی میں درحقیقت پورا کا پورا گاؤں مندر کے حوالے کر دیا گیا تھا) اور راجہ راج کرنگوڈی میں دو بھائیوں، کنی مالکوں سے 39 لوگوں کے ذریعہ خرید میں لائی گئی زمین جمبوکیشو ر مندر کو بطور عطیہ دی گئی اور ایک شخص (سیمبین کرور) جس نے

چارکلوراوران کے بھائیوں سے زمین خریدی (33 ویلی، پورے گاؤں کو دیودان میں شامل کر دیا گیا)۔ جمبوکیشورم مندر کو زمین فروخت کی۔ افراد کے ذریعہ زمین کا تبادلہ یا تو ٹکڑوں میں یا پورا گاؤں کیا جاتا تھا۔ اس طرح کے تبادلہ ار کے ذریعہ کبھی کبھار ہوتے تھے۔ جو پورا کا پورا بطور ایک مجموعی ملکیت کے ہوتا تھا۔ چولا حکومت کے اواخر میں افراد کے ذریعہ زمین کا تبادلہ غیر برہمدیا گاؤں میں بھی پھیل گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تبادلوں سے مراد پیداوار اور محصول کے اختیارات ہوتا تھا اور بیچنے والا یا عطیہ دینے والا کرنمئی مالک کے طور ہی رہ گیا یعنی کاشت کے حقوق اور کوٹی مئی (قبضہ داری)، جس کا تبادلہ ہوتا تھا۔ راجہ کو دیا جانے والا پیداوار کا بڑا حصہ (کنیکٹن) اور یا کڈمئی (لگان-پورووری)۔ بعض معاملات میں زمین پر بقایا کاشتکار کے ذریعہ عطیہ پانے والے کو دیا جاتا تھا اور ٹیکس ریاست کو ادا کیا جاتا تھا (پراووواری)۔ بہت سے زمین کے تبادلے افراد اور مندر کے درمیان واقع ہو رہے تھے۔ بورو کرشا کا ماننا ہے کہ اس قسم کے تبادلے سے کنی مالکان کی حیثیت گھٹ گئی اور وہ لوگ کاشتکار کے درجہ میں پہنچ گئے۔ جیمس ہنٹر مین نے اس سے یہ مطلب نکالا ہے کہ چولا عہد میں صرف محصول کا ہی تبادلہ کیا جاتا تھا نہ کہ ملکیت کا تبادلہ۔ جس سے عطیہ دینے والے کا کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ درحقیقت عطیہ دینے والے کی حیثیت بطور کاشتکار کے اور مالک زمین کے مستحکم تھی۔ کنامئی اب تک پورے چولا علاقہ میں تامل علاقے کی طرح ٹیکس کا روپ لے چکا تھا۔ جہاں چولا نے ایک محصول کے نظام جس کو پراووواری ٹیننکلم کہا گیا ہے، ایک علیحدہ شعبہ کو وجود دیا اور شاہی عملہ جیسے ناڈوویگائی سیگیرا ادھیکاری، ناڈو اور ولا ناڈو محصول کی اکائیوں کو منظم کر رہا تھا۔

کنی اختیارات کا اب مطلب وہ اختیارات تھے۔ جو زمین پرورشہ (انودائیا) میں ملتے تھے۔ قبضہ داری کے حقوق جس کا بیچنے والے یا عطیہ دینے والے کے ذریعہ تبادلہ ہوتا تھا (بعد کے میراث حقوق کے مساوی)۔ دوسرے لفظوں میں کنی کی قسم کے اثاثہ (بشمول مندروں میں خدمت کے حقوق) پر موروثی حق تھا اور جب اس کو زمین پر نافذ کیا گیا تو اس کا مطلب تھا قبضہ داری کے حقوق۔

کنی حقوق کے مالکان گاؤں کے اندر ایک ممتاز زندگی گذراتے تھے جس کی بنیاد زمین کی قبضہ داری پر ہوتی تھی۔ کنی حقوق کے اس وسیع معنی میں (یعنی کچھ نیشنی اختیارات کا مالک ہونا کنی اختیارات کا خلاصہ ہے) صرف اس وقت استعمال میں آ سکتا تھا جب تک کہ اس کی وحدت کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ ورنہ اس کا مطلب گاؤں میں صرف زمین کے چند خطوں پر قبضہ داری کے سوا کچھ نہیں۔ چولا عہد کے اواخر میں بڑے زمینداروں کی خاصی تعداد کا پتہ ان القاب جیسے اڈیان، کیلاون، الون یا اریان (افسران) سے پتہ چلتا ہے۔ کاویری گھاٹی کے نچلے حصہ میں معاشی ترقی چولا عہد کے وسط (گیارہویں صدی عیسوی) میں دولت کی تقسیم سے حاصل ہوئی جو دولت کہ جنگوں سے حاصل ہوئی تھی۔ اور زمین کی پیداواری کیفیت میں اضافہ ایک سینچائی نظام کی ترقی سے جڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی چولا عہد کے وسط میں افسران کو زمین کے عطیات میں اضافہ سے حاصل ہوا۔ اس کا پتہ فوجی ساز وسامان کے ظہور پذیر ہونے سے چلتا ہے۔ اور اس کو لاوار پڈائی پرو، زمین کو پٹہ پر دئے جانے سے غیر برہمنوں اور دیگر سرحدی علاقوں کے لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچا۔ نئے مالکان زمین اور بڑے بڑے خطے کاویری گھاٹی کے ذیلی علاقے میں نئے زرعی نظام سے جڑے ہوئے تھے۔

چولا عہد حکومت میں کاویری گھاٹی کا سینچائی نظام جو زیادہ تر مٹی کے باندھوں اور نہروں کے جال، ناڈوں میں آڑے ترچھے پانی کے راستوں کے توسط سے ان ناڈوں کی پانی کی سپلائی کرنے والی نہروں پر منحصر تھا جس کو ناڈوں سرداروں اور حکومتی طبقہ کے ذریعہ بڑھاوا ملا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بڑے تالاب پانی کے ذخیرے جو نئے ناڈو جن کی تعمیر تمل ناڈو کے شمالی حصہ میں حکومتوں کے ذریعہ کی گئی تھی اور سبھا اور جیسے مقامی اسمبلیوں کے ذریعہ منظم کئے جاتے تھے اور ان کو تحفظ دیا جاتا تھا۔ مٹی کے باندھوں اور نہروں کا نظام نئے متوجہ علاقوں میں بھی شروع کیا گیا جیسے تمر پارنی گھٹانا گھاٹی میں جہاں موجود ناڈوں کو وسعت دی گئی اور نئے برہمدیا دئے گئے۔ ناڈوویگائی سیگیرا ادھیکاری (ناڈوں کی درجہ بندی اور ان کی حد بندی کرنے والے اور انہیں والا ناڈوں میں از سر نو منظم کرنے والے افسران) کے ذریعہ راجہ راج اول اور کولوتنگا اول (1014-985 اور 1118-1070 عیسوی) کے دور حکومت میں زمین کا سروے اور اس کا تخمینہ لگانے کے لئے زرعی پیداوار کو بڑھاوا دیا اور ساتھ ہی لگان کے نظم کے لئے خصوصی اقدامات تھے یعنی ایک ایسا پروجیکٹ جس میں گیارہویں صدی عیسوی کے آخر تک پورا تمل علاقہ آ گیا تھا۔ درحقیقت نیا زرعی نظام اور اس میں جس کی ابتداء پلوؤں اور پانڈوں کے عہد حکومت میں ہوگئی بالآخر گیارہویں صدی عیسوی تک اس میں خاطر خواہ بڑھوتری ہوئی۔ ساتھ ہی مقامی اور علاقائی بازاروں کا پھیلاؤ جس نے گیارہویں صدی عیسوی کے آخر تک تجارتی جال اور تجارتی عمل

کو وجود بخشا۔ جس میں صنعت وحرفت اور بازاروں کی خصوصیات اور دور دراز سے تجارت بھی شامل ہوگئی (دیکھیں موجودہ بلاک کی اکائی 15)۔

13.6.2 کیرالا

روایتی طور پر کیرالا میں برہمنی بستیوں کی تعداد 32 بتائی جاتی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ کسی بھی برہمدیا کے پاس کوئی شاہی فرمان نہیں تھا جس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ بستیاں مہاجرین برہمنوں کے ذریعہ آباد ہوئی تھیں۔ وہ نئی بستیاں بساتے ہوئے، آباد بستیوں کے عناصر کو ملا کر اور ایک بڑی بستی بنانے کے لئے دو یا اس سے زیادہ بستیوں کو خلط ملط کر کے پھیلتے چلے گئے۔ پرومپولا اور کرنی کرومنپو لا ندیوں کے درمیان ایسی 9 بستیاں تھیں۔ کرومنپو لا اور کرنی کے درمیان 13 بستیاں اور کرنی اور کنیا کماری کے درمیان 10 بستیاں تھیں۔ پیرومسیلو رایسا نامنگلم، ملی کلم اور تیرووولا کچھ معروف بستیاں تھیں۔ یہ بستیاں پمپا گھاٹی میں اوپیریار گھاٹی کی زرخیز علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ زرعی پیداوار میں تیز رفتار ترقی اور اس کے پھیلاؤ کی وجہ سے معاون بستیاں یا اپا گرام مخصوص برہمنی بستیوں سے آ کر جڑ گئیں (ستھانوروی کی تیرووروولے تانبے کی پلیٹ (861 عیسوی) بہر حال لفظ برہمدیا کا استعمال ان برہمنی بستیوں کے لئے مشکل ہی سے ملتا ہے جو مندروں سے بالکل جڑی ہوئی تھیں۔

لفظ ارار اور اس جیسے لفظ جیسے ثالی - ثالی ادھیکاری کل، تلیار، سبھائی، سبھائی یار وغیرہ ان برہمنوں کا پتہ دیتے ہیں جو مندر اور بستیوں پر کنٹرول رکھتے تھے۔ تیرووروولے کا ارار نیتم پرم ثالی اور پڑک کوڈی بھی پٹی نیٹو نار، پیناروماراور اپرو پٹی لولا وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا مطلب واضح طور پر لوگوں کی تعداد سے ہے۔ پرٹی، سولا پرٹی، مندر کو چلانے والی کونسل، پوتووال اپا پوتوال، وری یار اور پرایوتوال وغیرہ الفاظ مندر سے جڑے خدمتگاروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وریام یا کمیٹی جس طرح کے تمل علاقوں میں پائی جاتی تھیں کیرالا میں نہیں پائی جاتی تھیں۔

آٹھویں صدی عیسوی کے آس پاس مندروں کے ایک نئے نظریاتی آلہ کے طور پر ابھرنے سے ایک ایسے زرعی سماج کے وجود کا پتہ دیتا ہے جس کی سرپرستی برہمن کر رہے تھے اور وہ لوگ مندر اوقاف کے آس پاس کی مندر کی زمینوں پر مرکوز تھے۔ تیرووولا تانبے کی پلیٹ اور دھان کے ہزاروں پارا (ایک پیمانہ) کا حوالہ ملتا ہے۔ مندر سے جڑے سالا (تعلیمی اداروں) کو دیے گئے عطیہ سے ان کی جانکاری ملتی ہے جن کا انتظام مندر کے منتظمین کے سپرد تھا۔ کرومن پلا اور کرینار (پیر پارندی) کے درمیان کی زرخیز زمین کا ایک بڑا حصہ 11 مندروں بشمول پراور، ارنجالکوڈا کے ایک مشترکہ گروہ کے، حوالے تھا۔ ہم عصر کیرالا کے زیادہ تر زرخیز زرعی خطے برہمنوں کے پاس تھے جو مندر کے پروپرائٹر (مالک) تھے۔

مندر کے بطور اداریاتی دیکھ بھال کے اندر زرعی عمل کی مقامی حیثیت کی وجہ سے ایک واضح زرعی نظام کی داغ بیل پڑی اور زراعت کو غیر معمولی وسعت ملی۔ مندر سینچائی کے طور طریقوں سے اور وسیع پیمانہ پر زمین سدھار اسکیموں کے ذریعہ سے بہتر پیداوار کے مختلف عمل کو بروئے کار لانے کے لئے سماج کو متحرک رکھ سکتا تھا۔ چھوٹے پیمانے پر آبادکاری اور کاشت کے طور طریقے (بشمول کھاد وغیرہ) کرالار کے ذریعہ اپنی کاشتکارانہ ذمہ داریوں کے زمرے کے طور پر انجام دیتے تھے۔ زرخیز اونچی زمین (پہاڑیاں) زیر کاشت لائی گئیں۔ ناڈو کے مکھیا کے طور پر ناڈو والی نے مندر کو جو زمین کے عطیات دیے اس پر مندر کی مکمل ملکیت ہوتی تھی کیری کل کا مطلب تھا شاہی زمین۔ جب کہ دیوسم یا کیا پوٹو سے مراد وہ زمین تھی جو مندر کو دی جاتی تھی۔ جس کے اندر کرئی حقوق شامل ہوتے تھے (جیسا کہ تمل علاقے میں تھا) اور 18 قسم کے مختلف ٹیکس جو گاؤں پر لاگو تھے وہ مندر کو دیے جاتے تھے جیسا کہ کٹوور کے گاؤں کا معاملہ تھا جو تیرووالا مندر کو دیا گیا تھا۔ مندر کارپوریشن رکھشا بھوگ دھان جس کا پیمانہ کلوم تھا اور چاول (پارایا نلی) اور گھی کی شکل میں حاصل کرتا تھا مندر کو ملنے والے سالانہ ٹیکس کا نام اٹائی کول تھا۔ مندر کی حفاظت 300,500,700 وغیرہ (آدمیوں کے گروہ- مسلح؟) کو سونپی جاتی تھی۔ جن کو بدلے میں جو زمین دی جاتی تھی اور جس کو نیلال کاول (نگہبانی) اور کیلیٹکنم، جس کا مطلب ہوتا تھا زمین پر ماتحتانہ حقوق: اٹی پیرو (زمین سے آمدنی) پنایم (گروی) وغیرہ کی شکل میں مندر کو دی گئی زمین سے مندر کو مختلف درجات کے حقوق حاصل ہوتے تھے جیسے کہ تمام حصول کا مالک ہونا، نگہبان ہونا اور محصول کی عارضی ملکیت کرنمی حقوق کے ساتھ۔ ایک واضح نظام تقسیم در تقسیم کا وجود پذیر ہوا۔ معیشتی عمل کو منظم کرنے کے لئے مندر کے مختلف گانا (گروہ) کو زمین دی جاتی تھی۔ مندر کی زمین کرالار کی تقسیم نو کی جاتی تھی (وہ جو زمین پر کاشت کراتے تھے۔ کاشتکار) اور تب کو تیکال (حقیقی قبضہ دار/کھیتی کرنے والا) مندر زمین پٹہ پر کرالار کو دیتا تھا۔ جن کی ذمہ داری

ہوتی تھی کہ مندر کے مخصوص رسومات کے موقع پر اشیائے ضرور یہ کوفراہم کرنا، جن کے لئے یہ زمین وقف کی گئی ہے۔ کرالا رکو کاشت کا حق حاصل تھا اور کیٹوں جیسے کہ کاشتکار، دستکار اور کاریگر کو قبضہ داری کا حق حاصل تھا۔ مندر کے لئے مختلف قسم کی خدمات کے لئے (یعنی کلاو نیار کمہار)، خدمت کی مدت ویروتی اور جیوتم کا حق دیا جاتا تھا۔ ویروتی میں موروثی حق شامل تھا اور جیوتم میں تاحیات حق حاصل تھا۔ ارنمئی کا حق مندر کارپوریشن کے پاس تھا جس کا مطلب تھا اعلیٰ اور ماتحتی اختیارات ارنمئی، کرنمئی، اور کٹی مئی میں اوپر سے نیچے کی طرف جانے والے نظام مراتب کی نشاندہی کرتے تھے۔ حقوق کی ایک سہ درجاتی ساخت ابھری یعنی کو نمئی ارنمئی اور کرنمئی اور ایک چوتھی قسم کٹی مئی میں زمین پر مستقل حقوق کے منافی تھا۔

سونا، مندر کے پاس جمع ایک اور وسیلہ تھا اور اکثر زمین کے بدلے میں زمین پر، قرضہ کی شکل میں تبادلہ کیا جاتا تھا مندر کا سونا ادھار دینے والے معاشی عمل نے دھان میں دلچسپی پیدا کی۔ بہر حال وہاں سکوں کا رواج نہیں ہوا تھا باوجود اس حقیقت کے کہ کلنجو، کسو، (پرانا) اور دینار (عرب) کے حوالے تحفہ کی شکل میں ملتے ہیں۔ سبھی دستکار اور کاریگر یا پیشہ ور ذات کے لوگ مندر کے آس پاس کے گاؤں میں بس گئے جو معاشی طور پر منحصر تھے اور معمولی گروپ سے لے کے اونچے گروپ تک آپس میں بندھے ہوئے تھے۔ یعنی مندر اور گاؤں کی ملکیت۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک نسبتاً خود کفیل مقامی اکائی اور خدمت کے معیار کے چلن کی نمائندگی کرتا ہے اور ایک اشیاء کے تبادلہ کے فرق کو اور سکوں کی کمی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو ایک بند معاشی صورتحال کی پتہ دیتا ہے۔

13.6.3 کرناٹک: بادامی کے چالوکیہ اور راشٹر کٹا

کرناٹک میں بادامی کے چالوکیہ (چھٹی سے آٹھویں صدی عیسوی) اور مالکھیڈ (مانیا کھیٹا) (آٹھویں سے دسویں صدی عیسوی) کے راشٹر کٹوں کے عہد حکومت میں عطیہ اراضی کے نظام نے ایک اسی طرح کے زرعی گاؤں کی تنظیم کو وجود بخشا جس میں برہمنوں کا طبقہ ایک بڑا مالکان زمین تھا جو اگر ہارا یا برہمپوری میں کاشت کے طور طریقہ کو کنٹرول کرتا تھا (کتبات میں برہمدیا کا تذکرہ اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ اگر ہارا کا تذکرہ ہے) اور اسی طرح ان علاقوں میں بھی جو ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی برہمدیا اور برہمپوری کے زیر اثر آچکے تھے۔ یہاں غیر برہمن طبقہ جن کے پاس زمین کا کنٹرول تھا اوکالو جیسے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے مراد کاشتکار ہیں جو زرعی نظام کے نئے نظم کے تحت تمل علاقوں کے ویلالا کی طرح زمین پر کنٹرول بھی رکھتے تھے اور کاشتکار کسان بھی تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر جگہوں پر برہمنوں کے ساتھ ساتھ کام کرتے تھے۔ اگر ہارا اور غیر اگر ہارا گاؤں میں سبھا یا برہمنوں کی تنظیم کی جگہ پر مہاجن لفظ کا استعمال ملتا ہے جو بڑے لوگ اور ان کی اسمبلی پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ضرورت اس علاقے کی بھی گہرائی سے مطالعہ کرنے کی ہے جیسا کہ تمل علاقوں میں پیداوار کے طور طریقوں اور زمین پر حقوق کی درجہ بندی کے طریقے کے لئے کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ اگر ہارا اور مندر سرکردہ مالکان زمین، برہمن اور اوکالو کے پاس پیداوار، نقل وحمل اور وسائل کی تقسیم در تقسیم جس میں زرعی اور غیر زرعی وسائل دونوں شامل تھے، پر تنظیمی کنٹرول حاصل تھا۔

کرناٹک میں کلیانی کے مغربی (بعد کے) چالوکیہ عہد حکومت میں (دسویں سے بارہویں صدی عیسوی) برہمنوں کو دئے گئے عطیات کو اگر ہارا، مہا اگر ہارا (جب کہ برہمپوری پورے سیٹلمینٹ یا مرکز کے لئے استعمال ہوتا تھا) کہا جاتا تھا جہاں وہ رہتے تھے اگر ہارا کی بہت سی کیری ہوتی تھیں جیسے کہ کوکانور اگر ہارا میں 48 کیری یا کالونی تھیں جو باشندگان کی علیحدہ علیحدہ جگہوں کی شناخت کرتی تھی۔ عطیہ پانے والوں کو زمین یا رہائشی جگہوں کو منتقل کرنے کا کوئی حق نہیں تھا گاؤں میں عام طور سے ایک رہائشی علاقہ، مندر، دوکانیں، کاروباری سہولتیں، دستکاری مراکز، خیراتی ادارے، بھنڈار گھر، گودام اور عارضی پناہ گاہ، خالی جگہیں، تالاب یا پوکھر، نم زمین، باغات اور جنگل، سوکھی گھاس کا ڈھیر اور کسی جگہ حصار بندی بھی ہوتی تھی۔ نائی اور دھوبی کے محلے الگ ہوتے تھے اور یہ گاؤں کے بائیں طرف ہوتے تھے۔ دستکاروں اور تجارتی طبقوں (مثال کے طور پر لوکی گنڈی کے تیل بیوپاری) کے تجارتی مراکز اور ان کے رہائشی علاقے ایک ہی لائن میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔

دستاویزوں میں برہمنوں کو بطور عطیہ زمین یا گاؤں دینے میں راجا کی مرضی کے ثبوت (مثال کے طور پر دیگا موگاؤں گوا کے راجا کدمبا کی مہارانی کے ذریعہ مہاجنوں، برہمنوں اور ہمسایوں کی موجودگی میں دیا جاتا تھا) سے نظریاتی طور پر راجا کے مکمل اختیار کا پتہ چلتا ہے (ساتھ ہی رفاہ عام کے لئے ضبط شدہ جائیداد پر بھی اختیار ہوتا)۔ عطیہ پانے والوں کو چھوٹ اور مخصوص حقوق یا اختیارات کا حاصل ہونا بھی اسی طرح تھا جس طرح سے پورے ابتدائی عہد وسطیٰ میں پایا

جاتا تھا۔ زمین کی منتقلی خرید وفروخت اور ٹیکس سے متعلق حوالے ریاستی محصول کے رجسٹر میں ملتے ہیں۔

مہاجن، زمین کا سروے اور پیمائش کرواتے تھے اور انہیں مندروں کو عطیے میں دئے گئے رسم ورواج اور ٹیکس کا نظام دیکھنا ہوتا تھا۔ جو عطیہ میں دی گئی دولت کو پاتے تھے۔ اور وہ رقم لگانے والوں کے ذریعہ بنائے گئے مقاصد کے لئے استعمال ہونے پر منافع کو استعمال میں لاتے تھے۔ تالابوں کے نہانے، مرمت کرنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری بھی ان کی ہوتی تھی۔ عام طور پر ان کی حیثیت متولی کی ہوتی تھی۔ تحفہ تحائف، ٹیکس اور محصول سے چھوٹ پر گواہ ہوتے تھے اور وہ ٹیکس لگانے کی اجازت مرحمت کرنے اور جھگڑا سلجھانے کا کام کرتے تھے۔

دیگر مقامی خصوصی لوگ راجہ کے کارندے ہوتے تھے اور گاؤں کے مخصوص لوگ جیسے برہمن، گوڈا اور جیا ہوتے تھے۔ مہاجنوں کے علاوہ دیگر غیر معمولی اہمیت کے حامل بڑے آدمی مندر کے عطیات کے انچارج کے طور پر تھے۔ استھانیکا، جو شاہی عملہ ہوتے تھے۔ ان کے ذمہ ان مندروں کے معاملات کی بہترین کارکردگی کی ذمہ داری ہوتی تھی۔

زمین کی پٹہ داری

زمین مخصوص کاموں جیسے تالاب کی تعمیر، جنگل کی کٹائی اور نئی زمین لائق کاشت بنانا یا مندر کی مرمت (نیٹا روکوڈ یگی)، مویشیوں یا عورتوں کو بچانے کے لئے، بہادری کے کاموں کے لئے اور سرحدی جھگڑوں کے سلجھانے کے لئے دی جاتی تھی۔ دیودان یا دتی۔ مندر میں پوجا پاٹ کرنے کے لئے امبالی۔ ایک دوسری پٹہ داری جو مختلف قسم کے عوامی کام کے لئے دی جاتی تھی۔ اور دیگر مذہبی اداروں یا کسی غیر مذہبی کام کے لئے مانیا دیا جاتا تھا۔ جو مکمل طور سے ٹیکس سے آزاد ہوتا تھا (سرومانیا) یا جزوی طور پر آزاد ہوتا تھا (اردھ مانیا)۔ دیگر طرح کی پٹہ داری جیسے کٹھم وریتی، کسی کو اپنے کنبہ کی دیکھ بھال کے لئے سرن وریتی۔ مذہبی پجاریوں کو کھانا کھلانے کے لئے، بٹووٹا، مخصوص قسم کی خدمات کے لئے بشمول تالابوں کی نگہبانی، رفاہی کام۔ خدمات کے زمرے میں مندر کی خدمات کے علاوہ اور دیگر خدمات جیسے فوجی خدمات بھی شامل تھیں۔ بیلووریتی، ہزیمت شدہ راجا کو تحفہ، کمارو ریتی، نابالغ شہزادہ کو پرتی ورتی، زمین کا ایک حصہ جو تبادلہ کے طور پر حاصل ہوا ہو، ڈنگاریگا وریتی، ایک مقامی پٹہ جس کا مطلب تھا نوکر کی آمدنی یا اس کی زندگی کا ساز وسامان جیسے نٹروکوڈ یگے؟ انوگا جیوتا وریتی، تحفہ، محبت کے جذبے سے شرشار یا الوم جو شاہی خاندان کے لوگوں کو دیا جاتا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ اس وقت تین طرح کی ملکیت تھی۔ 1، عمومی مکمل ملکیت۔ 2، جزوی گردش والی اور جزوی عمومی ملکیت اور 3، جزوی انفرادی غیر مشترکہ اور جزوی عمومی ملکیت وہاں مکمل اجتماعی کنٹرول تھا۔ اور فرد صرف حصہ دار تھا۔ کمیونیٹی کے پاس وقتاً فوقتاً تقسیم جدید کا اختیار حاصل ہوتا تھا جس کے اندر زمین بلاک یا ٹٹو میں تقسیم کر کے دی جاتی تھی جس میں عمومی پٹہ داری ہوتی تھی یا کنٹرول صرف اس حد تک ہوتا تھا کہ جس سے وقتاً فوقتاً تقسیم نو کا تعلق ہوتا تھا۔ صرف چراگاہی زمین پر عمومی ملکیت ہوتی تھی۔ باقی زمین انفرادی حیثیت کی ہوتی تھی جس میں ایک معاہدہ ہوتا تھا۔ اختیارات میں عمومی ملکیت ہوتی تھی۔ جس میں علیحدہ کرنا، پہلے سے معاف کر دینا اور کسی اجنبی کی دخل اندازی کی ممانعت شامل ہوتی تھی۔ تیسرے زمرے میں ہر ایک کنبہ کا مخصوص حصہ ہوتا تھا بغیر کسی عمومی کنٹرول یا قاعدہ قانون کے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا کہ یہ مشترکہ زندگی کی ایک نادر مثال تھی جس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا تھا کہ حصہ دار تالاب اور نہریں اپنے اپنے ماتحت گاؤں میں خود ہی بنوائیں گے اور سکون سے زندگی گذاریں گے۔ اس کے اندر واضح حدود بندی ہوتی تھی تاکہ غلطی اور دھوکہ سے بچا جا سکے۔ علیحدہ کرنا یا جدا کرنا اور حصوں کا تبادلہ ممنوع تھا۔ اگر ہارا کے اندر بھی عمومی ملکیت کا تصور پایا جاتا تھا (ہیر نیلور 1215 عیسوی)۔ عمومی ملکیت کا مطلب تھا اپنے اختیارات جیسے علیحدہ کرنے، کاشت کا تبادلہ، فروخت، زمین ہدیہ، ٹیکس کی معافی (برہمنوں کو؟) عمومیت میں داخل تھے اور دیکھ بھال، مرمت اور مشترکہ فروختگی کے ماسوا کسی اجنبی کو فروخت کرنے سے روکنا مراد تھا۔ پٹہ کی مدت کو سرو بھیان تر اسدھی، اچندررکرم (مسلسل) یا ایکا بھوگ (ایک باری فصل، بسا اوقات اس میں کسی فرد کے اختیارات بھی مراد ہوتے تھے۔ لہذا ایک بھوگ برہمدیا) تری بھوگا (تین بار کی فصل) اور 21 نسلوں کے لئے۔

مندر کی زمین جو کاشتکاروں کو پٹہ پر دی جاتی تھی انہیں اتم، مدھیم اور کنشٹا میں بانٹا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا زمین کی قسم اور ساتھ ساتھ کاشتکار جو کاشت کو انجام دیتا ہے ان دونوں کی درجہ بندی۔ بعض حالات میں پٹہ کی قسم طے ہوتی تھی۔ کٹوگٹاگے (متعین پٹہ کی رقم) بشمول باغ کی پیداوار سدھیایا معمولی ٹیکس دینے ہوتے تھے۔ بہر حال کاشتکار کا بیگار سے آزاد ہونے کے حوالے، بٹی سولا اور مکان کا ٹیکس سے بیگار کے چلن کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے بیشتر اپنے بلاکوں کی حدوں سے بندھے ہوتے تھے اور کاشتکار کو تالاب، مندر وغیرہ کی تعمیر میں حصہ لینا ہوتا تھا۔ پیداوار کا ایک حصہ مالکان زمین کو بھی دینا ہوتا تھا جو سرکاری حصہ کے علاوہ ہوتا تھا۔

زمین پر قبضہ داری کی حدوں میں کوئی یکسانیت نہیں تھی اور اسی لئے قبضہ داری کی نوعیت کا پتہ لگانا ایک امر محال ہے۔ چھوٹی چھوٹی قبضہ داری عام تھی مثال کے طور پر ایک متار یا دو متار تر یا خشک زمین (کوڈاگی زمین) جب کہ 16 متار کی قبضہ داری نادر تھی کہ ایسا لگتا ہے ابتدائی عہد وسطیٰ کے اواخر میں زمین کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا عام ہو گیا تھا۔

یوں تو سبھی علاقوں میں سینچائی ایک اہم مسئلہ تھا اور کرناٹک میں سینچائی کے پروجیکٹ مقامی بڑے لوگوں (مہاجن) کی اجتماعی دیکھ ریکھ میں چلتے تھے اور کیری، سمدر، اریی، کٹی، کولا کوٹائی، کٹی، سرو ورا، تیرتھ، ٹاکا کے حوالے سے پانی کی ذخائر کا پتہ دیتے تھے جو تعمیر کئے گئے تھے۔ سلوئس (Sluice) سسٹم عام تھا جیسے کہ ٹولو، سلوئس، کوڈی، وبر، اگالی جیسے الفاظ، لوہے کی چھڑ یا نیرو ٹو جس سے پانی کی سپلائی کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ہٹہ یا کلوے جس میں کوڈی کے ذریعہ تالاب سے پانی لایا جاتا تھا، سے ظاہر ہوتا ہے۔

13.6.5 آندھرا کا علاقہ: مشرقی چالوکیہ

آندھرا میں زراعت چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی کے درمیان پھیلی۔ ابتدائی ایام میں آندھرا کے ساحلی علاقوں میں زمین کا ایک بڑا حصہ، خاص طور سے ڈیلٹا کا علاقہ زمین کے بے حد زرخیز ہونے اور خاطر خواہ بارش کی وجہ سے زیر کاشت لایا گیا۔ لہٰذا آندھرا کے تمام ساحلی علاقوں میں گھنی آبادی کا رجحان تھا۔ آندھرا علاقہ میں اگرہاراجن کی تعداد 27 تھی، کی ابتدائی گرانٹ چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی کی ہیں۔ کرشنا، گنٹور، اور گوداوری ضلعوں سے متعلق ہیں (ساحلی آندھرا کا علاقہ)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ گوداوری سب سے بڑی بارہ مہینوں والی ندی کی معاون ندیوں کے نام ویدک ناموں سے ہی نکلے ہیں۔ برہمن یا رشی یا سنتوں (sages) یا گوترنسلیں جیسے گوتم، وششٹ وشومترا، وانادیوی بھاردواج، اتریئی اور جماداگنی۔ دوسرے قدرے کم اہم ندی، کرشنا اپنی معاون ندیوں کے ساتھ وامسدھارا، اور تاگاوتی (وینگی علاقے جدید آندھرا اول)۔

اگرہارا جو ایک ٹیکنیکل لفظ ہے گاؤں کا ایسا عطیہ ہوتا تھا جو کسی برہمن یا برہمنوں سے مستفید ہونے والے لوگوں کو خصوصاً اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے دیا جاتا تھا اس میں بھی ٹیکسوں سے (سرور کر پریہارا) سے چھوٹ ہوتی تھی۔ ان عطیات کو محصول اور انتظامی اختیارات سے آزاد رکھا جاتا تھا اور اس طرح سرکاری عمل دخل کے دائرے سے بھی باہر رکھا جاتا تھا۔ ویسایا اور راشٹر کے علاقے میں یہ عطیات کے گاؤں عموماً ہوتے تھے۔ گو کہ بعد کے پلو تانبے کی پلیٹ کے دوزبانی کتبات میں سنسکرت حصہ میں ویسایا یا راشٹر (جسے اڈیار وراشٹر، ادے یندرم پلیٹ میں) تمل کے علاقوں میں ناڈو کہا گیا ہے، جب کہ آندھرا علاقے میں شاید اب کوئی باضابطہ زرعی علاقہ نہیں تھا جہاں پیداوار کا نظم ہوتا ہو۔ عطیہ میں دئے گئے گاؤں کے باشندگان کو عطیہ پانے والوں کا کہنا ماننا ہوتا تھا۔

ساتویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک 53 مشرقی چالوکیہ عطیات میں سے 34 کی پہچان کرلی گئی ہے (17 کرشنا ضلع میں، 7 گنٹور ضلع میں، مشرقی گوداوری اور پرکاشم ضلع میں ہر ایک میں 4، شری کالولم میں 1 اور وشاکھاپٹنم میں بھی 1)۔ جن سے زرعی نظام کے اور وسیع تر ہونے اور منظم ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔ ابتدائی مشرقی چالوکیہ جیسے کبجا وشنو وردھن نے برہمنوں کو سرحدی علاقوں میں آباد ہونے کے لئے ہمت دلائی جیسے کہ کلنگا اور آندھرا کے درمیان

(وشاکھاپٹنم اورشری کالولم) بطور بفرگاؤں کے۔

رائل سیما اور تلنگانہ میں بستیوں کے ناپید ہونے باوجود یہ کہ مشرقی چالوکیہ جیسی حکومتوں کی سیاسی حدود میں مغرب کی جانب لگا تار بڑھتے رہنے کے، وہاں کی جغرافیائی اور آب وہوا کے فرق کی وجہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ تلنگانا (عادل آباد، نظام آباد، کریم نگر، میدک، وارنگل، حیدرآباد، محبوب نگر، نال گونڈا، اور خمام اضلاع) اور رائلسیما (کرنول، اننت پور، کڈاپا، اور چتور) دونوں ہی پٹھار پر ہیں۔ یہ دو اہم جغرافیائی خطے ہیں۔ گھاٹ اور چوکور میدان مشرقی گھاٹ) جن کی پہچان ہے۔ چٹانی خطوں کی کٹاؤ کی سطح کی قطاریں، جہاں اوسطاً 8.5 سینٹی میٹر بارش ہوتی ہے۔ بارش شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف گھٹتی جاتی ہے جیسے رائیسیما جو کم بارش والا علاقہ ہے۔ مٹی لال، سیاہ۔ لیٹرائٹ اور سیلابی ہے۔ ساتھ ہی زیادہ تر تلنگانہ میں اور کچھ رائلسیما میں کالی، کپاس کے لائق مٹی ہے اور سیلابی مٹی اس پٹھار کے طرف ایک چھوٹے سے حصہ میں پائی جاتی ہے۔ جنگلات (خطہ کے شمالی مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ پٹھار خشک اور کم بارش والے علاقے میں تر جنگلات) اور ساحلی علاقوں کے محدود جنگلات والے علاقوں کو بتدریج نئے زرعی نظام کے اندر لایا گیا خواہ جنگل کی کٹائی کر کے یا اکثر و بیشتر جنگل کے باشندوں کو مندر کی سوسائٹی میں بطور معاشی گروپ کے شامل کیا جاتا تھا۔ جو لائق استعمال بے شمار اشیاء شاہی لوگ، مندر اور دوسرے میدان لوگوں کے ذریعہ فراہم کی جاتی تھیں۔

آندھرا میں مندر کے ساتھ اگر ہارا اور برہمدیا کا تعلق شروعات میں جنوبی ہندوستان کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں دسویں صدی عیسوی تک اتنا منظم اور مستحکم نہیں تھا۔ یہاں مندر کو مرکزیت حاصل نہیں تھی جس طرح کیرالا اور تمل کے علاقے میں تھی۔ بہر حال گھاٹیکا تعلیم کے مراکز کے طور پر معلوم ہوتے ہیں۔

سومدیو 959 عیسوی کے پیتاشتلک (کمپوا) کے مطابق ایک منسٹر پر بوائی کے وقت بیگار کے مطالبہ کا الزام لگایا جاتا ہے، فصل پکنے سے پہلے ہی ٹیکس کی وصولی کرتا ہے اور یہ کہ فصل کٹائی کے موسم میں فوجوں کی بلا روک ٹوک حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے غالباً بیگار کے چلن اور فوجوں کی گھس پیٹھ کا پتہ چلتا ہے جس سے برہمنی آبادیوں کو مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ زمین کے ساتھ بٹائی داروں اور مزدوروں کی منتقلی کا پتہ چلتا ہے (ہیرے ہڈاگلی پلیٹ۔ بیلاری ضلع)۔ یہ رواج آخری دور تک جاری رہا۔

آندھرا کے اندر علاقائی اختیارات بہت اہم ہیں۔ تلنگانا اور رائلسیما کے اندرونی حصہ ہیں۔ ایک لمبے عرصہ تک ان کی زندگی چراگاہی زندگی تھی۔ کتباتی دستاویزوں سے بھرا پڑا یہ عہد جنوبی ہند کی سیاسی معاشی زندگی میں خاطر خواہ بدلاؤ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آندھرا کے اندرونی حصہ کا کالونی میں بدلنا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ بعد کے عہد میں زرعی حدود کی توسیع اور فوجی مزدوری کی مانگ نے طبعی حرکت پذیری کو جنم دیا۔ مزدور کے کھیپ مہاجرین کے ساتھ آئے جن کو بدلے میں گاؤں کے مکھیا جیسی مراعات سے نوازا گیا۔ مثال کے طور پر ریڈی تیرہویں صدی اور چودہویں صدی عیسوی میں۔

تلنگانا (کاکتیا عہد گیارہویں سے چودہویں صدی عیسوی) اور رائلسیما (وجے نگر کا زمانہ چودہویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی) کی اہم خصوصیات تھیں۔ تالابوں کے ذریعہ سینچائی اور مندر، جس میں یکسانیت یا اپنائیت نہیں تھی۔ کاکتیا عہد میں سیاسی اور فوجی تعلقات سے دولت اور طاقت کی راہ ہموار ہوئی جو ایک معاشی فائدہ کے تانے بانے کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا۔ زمین نے مزید محصول کے لئے مراعات کی جگہوں میں گھسنا آسان بنا دیا۔ راکدین مئو کے تحت زمین، راجہ پالو (حصہ) نے اگر ہارا عطیوں، راکا سنکا موو غیرہ دئے جانے میں شاہی اختیارات کو واضح کیا۔ ورتی عطیات مذہبی اداروں اور مخصوص لوگوں کو دئے جاتے تھے جب کہ جیوتا موجنگجوؤں کو دیا جاتا تھا۔ شرفاء اور افسران کے درمیان مختلف قسم کے اختیارات پائے جاتے تھے حالانکہ زمین (اس پر قبضہ داری) انتقال پذیر تھی۔

جنگلات اور بنجر زمین کو لائق کاشت بنا کر زراعت میں وسعت اور ساتھ ہی آبادی کا دباؤ دسویں صدی عیسوی کے بعد مسلسل تیزی سے بڑھا۔ گیارہویں صدی میں پہلے تلنگانا میں عطیات، کاکتیوں کے عہد میں دئے گئے عطیات کے مقابلے میں کم تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی تک حکومتوں کے علاوہ اشٹ داش پر جایا

18 قسم کے لوگ (ایک روایتی نمبر جس کا پورے جنوبی ہند کے کتبات میں زراعت اور اس جیسے دوسرے قسم کے پیشے سے جڑے لوگوں کا حوالہ ملتا ہے) بھی عطیات دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ مندروں اور تالابوں والے نئے گاؤں بھی وجود میں آئے۔ سروبھینتر سدھی میں بہتیرے اختیارات اور مراعات شامل تھے جن میں سب سے اہم تھے تالابوں پر (جن کی تعداد وارنگل اور کریم نگر ضلع میں زیادہ تھی) جیسے سینچائی کے کاموں پر اختیار سرومانیا کے تحت عطیہ پانے والا یا پانے والے لوگ سبھی قسم کے ٹیکس سے آزاد آمدنی پر حق رکھتے تھے، ساتھ ہی اور دوسرے اختیارات بھی۔ جیسے مختلف قسم کے جرمانے یا فیس۔ نیدھی، نیدان، سلک، ڈانڈا، دھن، اپابھوگیا اور تری بھوگ بھینتر اسدھی۔ وہ لوگ دوسری صنعتی پیداوار پر بھی اختیار رکھتے تھے جیسے تیل پیرائی (گنوگا۔ تیل پرائی مشین) کرمبا، بنجر زمین؟

گاؤں کا وجود بڑے پیمانے پر ہوا، خاص کر نئے علاقے برہمنوں اور مندروں کو دئے گئے۔ زمین کے عطیات (دیودان اور اگرہارا اور مہا اگرہارا) جن کے ارد گرد ہی نئی بستیاں وجود میں آتی ہوئی دکھائی پڑتی ہیں۔ برہمنوں اور عطیات پانے والوں کو دی گئی زمین کے اگرہارا حصوں میں انہیں جگہ چھوڑنے یا بیچنے کی اجازت نہ تھی۔ پرتاپ رودر دوم 1323-1290 کے عہد حکومت میں جنگلات سے مزید گاؤں نئے نظام کے تحت لائے گئے۔ ان نئی بستیوں کو خصوصی تحریک دی گئی جیسے ٹیکس سے آزادی۔ ایک اگرہارا (منتر کتا) کے برہمنوں کی دوسرے گاؤں میں زمین ہوسکتی تھی (پرتاپ رودر کے عہد میں)۔ مندر کی خدمات کے لئے ورتی کی شکل میں زمین دیودان ورتی۔ یا خدماتی پٹے کی شکل میں زمین دی جاتی تھی جیسا کہ دیگر برہمن اور مندر کے مراکز میں ہوتا تھا۔

تلنگانا میں (اور رایلسیما آخری علاقہ جہاں، تیرہویں صدی عیسوی کے بعد کے عہد میں نئے زرعی نظام کو اپنایا جاسکا) تالاب کے ذریعہ سینچائی مخصوص ذریعہ تھا۔ تالاب کی تعمیر سپت سنتان میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ مالدار لوگ اپنا فاضل سرمایہ مندروں اور تالابوں میں لگاتے تھے۔ تالاب عموماً ذاتی اثاثہ بن گئے تھے۔ پورا تلنگانا منصوبہ بند سینچائی کی سہولیات سے گھرا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر چونڈا اسمدر اور پاکھل جھیل سرکاروں کے ذریعہ جاگیرداروں اور تاجروں میں سے مالدار خاندانوں کے ذریعہ تالابوں (باندھ کلیان) کی تعمیر کی جاتی تھی۔ تالاب ندی ماترک (ندی کی ذریعہ سیراب) اور دیو ماترک (بارش کے پانی سے سیراب) دونوں ہی طرح کے ہوتے تھے۔ ان میں سے پہلی قسم خاص طور پر ندی گھاٹیوں میں ہوتی تھی۔ جبکہ دوسری قسم مانسون پر منحصر علاقوں میں ہوتی تھی۔ سینچائی کے لئے قدرتی جھیلیں جو واگو کہلاتی تھیں، بھی لائق استعمال بنائی جاتی تھیں۔ بعد میں دس باندھ مانیا۔ تالاب کے رکھ رکھاؤ کے لئے کاکتیا عہد میں وجود میں آیا۔ کسانوں کے ذریعہ پانی کے استعمال سے تالاب مالکان کو کافی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے پانی کے نکالنے کے ذرائع (جیسے رتن، پانی کی گھرنی) پر ٹیکس لگتا تھا۔ نہریں اور جھرنے گاؤں میں رہنے والوں کے قبضہ میں ہوتے تھے۔ اگرہارا سے ہوکر بہنے والی نہریں دیگر ٹیکس سے آزاد علاقوں کو چھوڑ کر، باقیماندہ نہریں ریاست کی آمدنی کا ذریعہ تھیں۔ نایک جو شاہی افسران ہوتے تھے اور جن کے پاس جاگیریں ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایسی اسکیموں پر کنٹرول کر کے سودمند ہوتے تھے۔ مختلف ذات کو لوگوں سے مختلف نرخ پر ادائیگی سے اس سسٹم کی غیر یکسانیت کا پتہ چلتا ہے۔ پانی کا ٹیکس زیادہ تر بچولیوں کے ذریعہ لگان (rent) کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔

دوہری فصلیں (دوہری فصلی - کٹائی نظام - کارتک اور بیساکھ میں) یا کبھی کبھی سال میں تین فصلوں کا ذکر بھی کتبات میں ملتا ہے۔ زمین کی قسم جیسے مرتورو، نم زمین متلو۔ خشک زمین، زمین کی پیمائش کے لئے نیورتن نم زمین کے لئے اور کھانڈی خشک زمین کے لئے حوالے ملتے ہیں۔ پٹی زمین اور اناج دونوں کی پیمائش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ نیورتن دکھن اور آندھرا علاقوں میں زمین کی پیمائش کا صدیوں پرانا پیمانہ تھا جو عہد وسطی کے آخر تک رائج تھا۔ ایک نیورتن 1/2 2 اور 1/2 4 ایکڑ کے بیچ کا ہوتا تھا۔ بیدا چینو۔ پتھریلی زمین، ریکاڈی، کالی مٹی تومتا بھومی، باغات، نیر نیلا نم زمین، ویلی بھومی، خشک زمین، کتبات سے معلوم ہونے والی مٹی اور زمین کی کچھ قسمیں ہیں۔

دھان نہ صرف ایک استعمال میں آنے والی فصل تھی بلکہ ایک تجارتی اور تبادلہ کا ذریعہ بھی تھی۔ چاول کی مختلف قسمیں (مثال کے طور پر سب سے اچھا، راجانالو) اور جوار اور باجرا بھی اگائے جاتے تھے جو کپاس اور گنے کے علاوہ تھے۔ کپاس کی پیداوار اور اس کی تجارت عملاً پورے جنوبی ہند میں بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی تک ایک سرکردہ حرفت اور تجارتی سامان بن گیا تھا۔ تلہن کی بھی کھیتی ہوتی تھی اور تیلکی ویوورو تیل کے تاجروں کا ایک گروہ (گلڈ) جو اس عہد کا

ایک منظم حرفتی طبقہ تھا۔

ٹیکس موزونیت کا ایک پیچیدہ سسٹم وجود میں آیا، جو الفاظ استعمال میں آئے وہ گنجلک اور نا قابل فہم ہیں، لیکن اتنا واضح ہے کہ زراعت پر بہت طرح کے ٹیکس تھے (جیسے سدھایا، اری اور کورو، کنیکا اور کٹمنو فصل کٹائی کی وقت، ویتو پنو پلاری، چرائی ٹیکس، سلکم، کولو چو اور اماڈیکل پنو جو اناج کی شکل میں چکائے جاتے تھے۔ پانی پر ٹیکس نیر ہری، نوہاری اور نیر منڈی، رتن وامو، ایتو بھانڈ مو، تو نیا مو۔ سنکا مو وغیرہ)۔ پنچم کلا یا زرعی مزدور بھی ٹیکس اور بقایا کے اصلی ادا کرنے والے تھے۔ ٹیکس کا نظام ایک جیسا نہیں تھا اور وہ اصلی کاشتکار کی ذات کے حساب سے ان کی علاماتی کیفیت پر منحصر ہوتا تھا۔

کاشتکاروں یا وہ لوگ جو زرعی عمل سے جڑے ہوتے تھے ان کی مختلف ذاتوں کا حوالہ بشمول زراعت سے جڑی حرفت (استدا سپراجا) کا کتبات اور ادبی کتابوں میں ملتا ہے جیسے کریدا بھیراما مو، سکالا نیتی ساتمو، مذہب کے اوپر اور ویلو گوتی وری وام سوالی وغیرہ کی سربراہی ریڈی، گونداس اور کرنام کے ذمہ ہوتی تھی جو آندھرا کے علاقے میں گاؤں کی زمین کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ سوداگر گیارہویں صدی عیسوی کی ابتداء میں معاشی طور پر آزاد اور ایک طاقتور طبقہ کی شکل میں ابھر کر آئے۔ کوماٹی اور سیلا وروا اور دیگر روپے پیسوں کی شکل میں۔ چنا، مڈا تحفہ دیتے تھے۔

دستکار طبقہ

دستکار طبقہ میں دھات کے کاریگر (پنچ لوہادھیا تولو)، بنگار مو (سونا)، وینڈی (چاندی)، راچی (تانبا)، تنگار مو (ٹن) اور سیسا مو (سیسہ)، سلیورو (بنکر)، وڈا ورو (سنگتراش)، کاسے (معمار)، وڈرانگی (بڑھئی) اور کماٹلو (لوہار)، کھاریلو (کمہار)، مسارا ورو (چھوٹی کٹھالیا بنانے والے) اور تیلگی ورو (تیل پیرائی کرنے والے) کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی تک زیادہ تر دستکار طبقے تلنگانا میں سماجی اور معاشی طور پر مستحکم ہو چکے تھے۔ ہر کسی گاؤں میں تمام کاریگروں کے سبھی طبقے نہیں ہوتے تھے۔ ان کوان کے ذریعہ تیار شدہ مال کی فروختگی سے حاصل شدہ آمدنی کے حصے کے بقدر عطیات ہوتی تھیں۔ ان دستکاریوں سے بیشتر زرعی ساز وسامان اور پانی کے ذرائع، گاڑیاں اور کشتیوں کی شکل میں ہوتے تھے۔ ان سب کو ان کی خدمات کے لئے زمین کی شکل میں ادائیگی کی جاتی تھی جو وہ خود کاشت کرتے تھے (دستکاری و تجارت پر تفصیل کے لئے دیکھیں اکائی 15)۔

13.7 خلاصہ

یہ عہد تجارت اور تجارتی عمل میں زوال کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس وجہ سے زرعی سیکٹر پر زیادہ انحصار ہو گیا۔ نویں سے تیرہویں صدی عیسوی کے عہد میں زراعت، معیشت کا خاص ذریعہ بنا رہا۔ اس سے زمینی عطیات کی معیشت کو خاص کر اگرہارا کا عام پھیلاؤ رہا۔ اس عہد کی معیشت کا ایک اور متعلق خصوصیت، گو کہ بہت زیادہ مختلف فیہ مسئلہ بنی۔ جاگیرداری نظام کا عروج ہوا۔ اس کا مثبت پہلو کے طور پر برہمدیا کو زرعی پھیلاؤ میں ایک موثر آلہ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بہر کیف اس وقت زمین پر اعلیٰ اختیارات کا عمل دخل کا بھی جنم ہوا۔ اس کے ذریعہ فائدہ مند طبقہ کوئی اور نہیں بلکہ برہمنی طبقہ ہی تھا جو اس علاقے میں زمین کے مالک کے طور پر خصوصیت کے ساتھ ظہور میں آیا۔

13.8 فرہنگ

کمپو — ایک ادبی طریقہ جس میں نثر اور نظم دونوں کو ایک ساتھ جمع کیا جاتا تھا۔

اسچیٹ (Escheat) — آنجہانی (متوفی) افسران کی دولت، جائیداد پر راجہ کا حق (اور دعویٰ)۔

فرقہ وارانہ ملکیت (Communal Ownership) — زراعتی فرقے کا زمین پر عمومی حق۔ اس زمین سے کچھ زمین برہمدیا پانے والوں کے ذریعہ اپنے قبضہ میں لانا اور کچھ بتدریج ارار اور نثار کے تحت لائی گئی ہو۔

13.9 مشقیں

(1) جنوبی ہند میں اگرہارا اور برہمدیا گرانٹ سے زرعی توسیع میں کس حد تک مدد ملی؟

(2) پریہاروں کی وضاحت کیجئے۔ برہمدیا کے سیاق وسباق میں پریہارا کا تجزیہ کیجئے۔

(3) پلوو- پانڈیا علاقے میں تالاب سینچائی کے نمونوں کا تجزیہ کیجئے۔

(4) چولا عہد میں زمین کے اختیارات کی نوعیت کا تنقیدی تجزیہ کیجئے۔

(5) چالوکیہ کے عہد میں زمین کے پٹہ کی نوعیت پر مختصر نوٹ لکھئے۔

(6) عہد وسطی کی ابتداء میں آندھرا کے علاقے میں زرعی توسیع کے نمونوں کا تجزیہ کیجئے۔

13.10 معاون کتب

اپادورائی، اے، (1936)، اکنامک کنڈیشنز ان ساؤتھرن انڈیا 1500-1000 اے ڈی۔، دو جلد، یونیورسٹی آف مدراس۔

چٹوپادھیائے، بی، ڈی، (1997)، دی میکنگ آف ارلی میڈیول انڈیا، او، یو، پی، نئی دہلی۔

گروکل، راجن، (1986)، آسپیکٹس آف دی ریسروز سسٹم آف اریگیشن ان دی ارلی پانڈیا اسٹیٹ، اسٹڈیز ان ہسٹری، این، ایس، جلد دوم، نمبر 2۔ (جولائی، دسمبر)

کرشما، نوبورو (1984)، ساؤتھ انڈین ہسٹری اینڈ سوسائٹی، او، یو، پی، نئی دہلی۔

کپوسوامی، جی، آر، (1975)، اکنامک کنڈیشنز ان کرناٹک (1336-973 اے، ڈی) دوارور: کرناٹک یونیورسٹی۔

لوڈن، ڈیوڈ (1985)، پیزینٹ ہسٹری ان ساؤتھ انڈیا، پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔

میناکشی، سی، (1977)، ایڈمنسٹریشن اینڈ شوشل لائف انڈر دی پلاوس، یونیورسٹی آف مدراس، نظرثانی شدہ ایڈیشن۔

شری مالی، کے، ایم، (1987)، اگریرینین اسٹرکچر ان سینٹرل انڈیا اینڈ دی نارتھرن دکن (500-300 اے، ڈی)، اے اسٹڈی آف وکاٹکا انسکرپشنز، دہلی۔

سری نواسن، ٹی، ایم، (1970)، اے بریف اکاؤنٹ آف دی اینشینٹ اریگیشن انجینیر نگ سسٹم ان ساؤتھ انڈیا، دی انڈین جنرل آف ہسٹری سائنس

جلد،5،نمبر2۔

اسٹین، برٹن(1980)، پیزنٹ اسٹیٹ اینڈ سوسائٹی ان میڈیول ساؤتھ انڈیا، او، یو، پی، دہلی۔

سندرم، کے،(1968)، اسٹڈیز ان اکنامک اینڈ شوشل کنڈیشنز ان میڈیول آندھرا، مچھلی پٹنم۔

ترومالی، آر،(1987)لینڈ گرانٹس اینڈ ایگرینین ری ایکشن ان چولا اینڈ پانڈیا ٹائمس، مدراس یونیورسٹی آرکیالوجیکل سیریز، نمبر6۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY
Accn No MA-026
Date 03.08.2015
MANUU
HYDERABAD

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE
MANUU
IMC LIBRARY

اکائی 14 تجارت، تجارت کا جال اور شہر کاری: شمالی ہند، 300 عیسوی سے 1300 عیسوی تک

ساخت

14.1 تعارف
14.2 ماخذ
14.3 تجارت، بازار اور شہری مراکز 650-300 عیسوی
14.3.1 سوداگر/تاجر
14.3.2 انجمن پیشہ وران (گلڈس)
14.3.3 بازار
14.3.4 تجارتی راستے
14.3.5 لمبی دوری کی سمندری تجارت
14.3.6 سکہ سازی
14.3.7 شہری مراکز
14.4 تجارت، بازار اور شہری مراکز، 650 عیسوی سے 1300 عیسوی
14.4.1 شہروں کے زوال پر بحث: زوال کی موافقت میں دلائل
14.4.2 شہروں کے زوال پر بحث: زوال کی مخالفت میں دلائل
14.5 خلاصہ
14.6 فرہنگ
14.7 مشقیں
14.8 معاون کتب

14.1 تعارف

تجارت اور شہر کاری سے متعلق لگ بھگ نو صدیوں (c600Bc-300AD) کا ہمارا سابقہ جائزہ تبادلہ سے جڑے عمل اور شمالی ہندوستان میں شہری مراکز کے تیز ظہور کے بارے میں سست رفتاری کا پتہ دیتا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کے پانچ سو سال میں تجارت، بالخصوص لمبی دوری کی تجارت اور شمالی ہند میں شہر کاری میں تیز رفتاری کا پتہ دیتی ہے۔ روایتی تاریخ نویسی سے عام طور سے اس عہد یعنی 1300-300 عیسوی میں معیشت میں معمول بدلاؤ اور سست رفتاری کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر حال کی دہائیوں میں بے شمار مشہور و معروف تاریخ دانوں کے ذریعہ سوالیہ نشان لگایا گیا ہے یقیناً اب ممکن ہے کہ معیشت کے دونوں ہی میدانوں، زرعی اور غیر زرعی میں کچھ اہم تبدیلیوں کی نشاندہی ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ہزار سالوں کی معاشی صورتحال کا بہتر ہوگا کہ بطور ایک علیحدہ اکائی کے مطالعہ کیا جائے۔ شمالی ہند میں ان ہزار سالوں کے دوران سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر 300 سے 1300 عیسوی کے اس ہزار سالہ عہد کو دو ترتیب وار حصوں سے بانٹنا عقلاً صحیح ہوگا۔ یعنی 300 ق م سے 650 عیسوی اور 650 عیسوی سے 1300 عیسوی تک (تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارا کورس EHI-03 - بلاک 1)۔

300 عیسوی سے 650 عیسوی کے عہد نے ان اسکالروں کی توجہ خصوصی طور سے اس جانب کی ہے جو عام طور پر اس عہد کو گپتا عہد یا ہندوستانی تاریخ کے کلاسیکل عہد کی شکل میں پہچان کرتے ہیں۔ اس عہد میں دراصل شمالی ہند (570-328 عیسوی) کے زیادہ تر حصوں پر عظیم گپتا خاندان کے سیاسی اقتدار کے عروج کی شہادت دیتا ہے۔ ساتویں صدی کا نصف اول شمالی ہند کی سیاسی تاریخ میں قنوج کے ہرش وردھن کی سیاسی قوت کے عروج کے لئے مشہور ہے۔ گو کہ یہ عہد بہت مختصر تھا۔ یہ عہد (650-300) ہندوستانی تاریخ نویسی میں اہم ثقافتی ترقیات، امن اور خوشحالی کے لئے سراہا جاتا ہے۔ جب کہ پہلے کے عہد میں ثقافتی سرپرستی کا ایک بڑا حصہ غیر سیاسی لوگوں کے ذریعہ دیا گیا۔ چوتھی صدی سے اور خاص طور سے ساتویں صدی کے بعد سے ثقافتی عمل کے لئے سرپرستی خصوصاً شاہی گھرانوں سے ملی۔ یہ اپنے آپ میں خود ہی سماجی اور ثقافتی صورتحال کی اہم تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔

لگ بھگ 650 سے 1300 عیسوی میں پھیلے ساڑھے چھ سو سالوں میں بشمول شمالی ہند، پورے ہندوستان میں سماجی، معاشی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں علاقائی خصوصیات ابھر کر آئیں۔ شمالی ہند کی اس عہد کی سیاسی تصویر بے شمار علاقائی اور مقامی طاقتوں کے ظہور اور کسی عظیم طاقت جیسے شمالی ہند میں گپتا حکومت کے ناپید ہونے سے جڑی ہے۔ یہی بات دکن اور جنوب کے آخر کی سیاسی صورتحال پر صادق آتی ہے۔ حکمرانوں کے درمیان علاقائی جھڑپوں کے باوجود فوجی فتوحات سے یقیناً حدود کی توسیع نہیں ہوئی۔ علاقائی اور مقامی طاقتوں نے نہ صرف گنگا وادی میں ہی سر اٹھایا بلکہ وہ اس وقت تک کامروپ (آسام کا اوپری حصہ)، سماتتا (مشرقی بنگال) ڈہالہ (مدھیہ پردیش میں جبل پور کا علاقہ)، کشمیر اور راجستھان جیسے معمولی علاقوں میں بھی ظہور پذیر ہو چکی تھیں۔ ان میں سے بہتیرے علاقوں نے 600 عیسوی سے پہلے تک کسی ملوکیت کا تجزیہ تک نہیں کیا تھا۔ لگ بھگ ڈھائی سو سال تک وسیع گپتا سلطنت کا وجود اور شمالی ہند کے بیشتر نئے علاقوں میں ملوکانہ ریاست کا وجود یقیناً ایک مضبوط زرعی بنیاد پر ہوگا۔ یقیناً 300 سے 1300 عیسوی تک کے عہد میں زرعی معیشت میں غیر معمولی وسعت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت کی معیشت کی بنیاد گاؤں پر تھی۔ بہت سے تاریخ دانوں کے مطابق 600 سے 1000 عیسوی کے دوران معیشت کا غیر زرعی حلقوں میں زوال آچکا تھا۔ 1000 عیسوی کے بعد ہی دستکاری تجارت اور شہری مراکز پھر سے زندہ ہوئے۔ اس تصویر نے علمی موشگافیوں کو جنم دیا لیکن سماجی معاشی ثقافتی اور سیاسی صورتحال میں بڑھتی ہوئی علاقائی خصوصیات کو ان دیکھا کرنا ناممکن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ 650 سے 1300 عیسوی کے عہد میں ہندوستانی تاریخ میں مابعد گپتا یا ابتدائی عہد وسطی کا نام دیا گیا ہے۔ ابتدائی عہد وسطی کا مطلب ہی ہے کہ وہ عہد جس میں ماضی کے زمانے کی تصویر میں تبدیلی کا رجحان ظاہر ہوا۔ یقیناً یہ ماضی سے عہد وسطی کے بیچ میں تبدیلی کا پتہ دیتا ہے اور اس لئے اسے ابتدائی عہد وسطی کا نام دیا گیا ہے۔

14.2 ماخذ

زیر نظر سروے عہد میں، قبل کے عہد کے مقابلے میں زیادہ تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس کا علم نئی قسم کے ماخذی مواد اور دستاویزوں کے ذریعہ بھی ہوتا ہے جو بدلتی تصویر کے خود گواہ تھے۔ اس عہد کے مطالعہ کے لئے سب سے زیادہ اہم ذریعہ بڑی تعداد میں کتبات کا موجود ہونا ہے۔ کتبات تیسری صدی قبل مسیح سے ہی وجود میں آچکے تھے۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی کے بعد کے زیادہ تر کتبات تانبے کی پلیٹوں (تامر ساسن/تامر پٹہ) کے زمرے سے متعلق ہیں۔ ان تانبے کی پلیٹ میں عطیہ پانے والوں کو شاہی احکام کے ذریعہ محصول سے آزاد زمین، جائیداد کا تبادلہ کئے جانے کے حوالے ملتے ہیں۔ گو کہ یہ عمل غالباً سب سے پہلے دکن میں دوسری صدی عیسوی کے آس پاس نظر آیا۔ زمین کا عطیہ دینے کا رواج پوری طرح سے چوتھی صدی عیسوی سے ہی قائم ہوا اور 600 عیسوی کے بعد یہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ زیادہ تر تانبے کی پلیٹوں میں کسی برہمن، کسی برہمن گروہ یا کسی مذہبی ادارے (بودھ مٹھ، برہمنی مندر یا کوئی مٹھ یا کوئی جین عبادت گاہ) کو تحفہ میں دئے گئے یعنی محصول سے آزاد زمین کو وجود بخشتا۔ اس طرح کے زمین کے عطیات پانے والے مذہبی ادارے (تحفہ پانے والے) کو اگرہارا کہا جاتا ہے۔ تانبے کی پلیٹ چونکہ زمین کے عطیات سے متعلق سرکاری دستاویزات ہیں، یہ دیہی معیشت کو سمجھنے کے لئے غیر معمولی اہم ہیں۔ خاص طور سے زمین کا تبادلے کا عمل دیہی آبادکاری کا طریقہ، فصلوں، سینچائی کے طریقوں، کسانوں اور زرعی محصول کے مطالبوں کو سمجھنے کے لئے۔ بہر حال بسا اوقات یہ عطیات ان اہم تاجروں اور دستکاروں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جن کی موجودگی زمین کے عطیات کا مقدس عمل کے اہم گواہ کہ طور پر ریکارڈ کی گئی ہے۔ سوداگر، تانبے کی عطیات پلیٹوں میں ایک گروہ یا ایک اسمبلی کی شکل میں یقینی محترم دنوں میں بھی نظر آتے ہیں، جب وہ لوگ کسی دیوی یا مندر کو ان اشیاء پر جن کی وہ تجارت کرتے تھے، اپنی طرف سے کچھ دینے کا فیصلہ لیتے تھے۔ ایسے عطیات میں فطری طور پر نہ صرف سوداگروں بلکہ مختلف قسم کی اشیاء کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کتبات سے ہمیں مختلف قسم کے بازاروں کا بھی علم ہوتا ہے جن میں سے کچھ سے محصول اور کسٹم (شلک) وصول کئے جاتے تھے۔ اس سے تجارت

میں محصول کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے کتبات سے اس کا بھی علم ہوتا ہے جن میں سوداگروں کے ذریعہ انفرادی طور پر دئے گئے عطیات کا حوالہ ملتا ہے جو یا تو کسی دیوتا کو یا کسی رفاہ عام کے کاموں کے لئے دئے جاتے تھے۔

تجارت اور شہری مراکز کے متعلق جانکاری، تفصیلی قانونی یا نظریاتی کتابوں (شاستر/دھرم شاستر) سے ملتی ہے۔ وشنو، وسشٹ، برہسپتی اور نارد کے نظریاتی حوالے (سمرتی) ہمارے مقصد کے لئے مفید ہوں گے۔ ان کتابوں پر تبصرہ (مثال کے طور پر منوسمرتی اور یجنا والکیہ سمرتی پر تبصرہ) میں بھی اس موضوع پر کچھ اہم جانکاری فراہم کرتی ہیں۔ اس سے تعلق رکھنے والی کچھ معلومات امر سمہا (پانچویں چھٹی صدی عیسوی) کی مشہور تصنیف امر کوش، ابھید ھنا چنتامنی اور ہیم چندر (گیارہویں بارہویں صدی) کی دیسی نما ملا اور لیکھ پدھتی جیسی تکنیکی کتابوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تجارتی عمل سے متعلق کچھ جانکاری وسیع اختراعی ادب میں بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر کالیداس کی کتاب سدرکا کا مرچھا کاٹکم۔ ڈانڈن کی داس کمار چرت اور مختلف قسم کی جین کی کتابیں۔ اس حقیقت پر نظر ڈالنا ضروری ہے کہ دو مشہور جینی کتاب جگت چریتا اور وستو پالم ہت مائم، گجرات کے ابتدائی عہد وسطی کے دو خاص سوداگروں کی سوانح حیات ہیں۔ تجارت، خاص طور سے ہندوستان کی بیرونی ممالک سے تجارت کی تاریخ جاننے کے لئے ذرائع کے طور پر بیرونی مواد کی خاصی اہمیت ہے فاہیان (پانچویں صدی کی ابتداء)، ہوان سانگ (ساتویں صدی کے نصف اول میں)، آئی سانگ (ساتویں صدی کا آخر) اور چاؤ جوکوآ (1225 عیسوی) کے چینی حوالے ہندوستان میں تجارت کو سمجھنے کے لئے غیر معمولی اہم ذرائع ہیں۔ ہندوستان میں عربی اور فارسی کے جغرافیائی اور سفر (سلیمان لگ بھگ 851 عیسوی) ابن خورداد بہ (882 عیسوی)، المسعودی (915 عیسوی)، بزرگ بن شہر یار (995 عیسوی)، حدود العالم کا گمنام مصنف (982 عیسوی)، البیرونی (973-1048) اور الادریسی (1162 عیسوی)، ہندوستانی پیداواری اشیاء اور مغربی اشیاء کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات کے متعلق جانکاری سے بھر پور ہیں۔ حالانکہ یہ حوالے بسا اوقات ایک سی ہی بات کہتے ہیں کیونکہ زیادہ تر عرب مصنفین نے ہندوستان کا سفر ہی نہیں کیا تھا۔ ان حوالوں میں شام کے عیسائی راہب کوسمس انڈیکوپلیوسٹس کے چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں لکھے گئے حوالے اور وینیٹین مسافر مارکو پولو (تیرہویں صدی عیسوی کا اواخر) کے ہندوستان سے متعلق مشہور حوالوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ ایک اہم قسم کا ذریعہ، عہد وسطی کے یہودی تاجروں کے خطوط ہیں جو ہندوستان کے مغربی ساحل اور بحر احمر کے درمیان طویل سمندری تجارت کرتے تھے۔ تاہم ان کے تعلقات کی بنیاد کرناٹک اور مالابار کے ساحل تھے۔ یہ نادر تجارتی خطوط میں لمبی دوری کی تجارت میں حقیقی شرکاء کے تجربات کو قلم بند کیا گیا۔ ہے یہ گجرات کے ساحلوں پر تجارت کے متعلق اہم حقائق پیش کرتے ہیں۔

600 قبل مسیح سے 300 عیسوی کے عہد میں آثار قدیمہ سے حاصل ہونے والے بھر پور مواد کے مقابلے میں بعد کے ایک ہزار سال کے عہد میں ہمیں صرف تھوڑا سا مواد حاصل ہوتا ہے۔ جس کی کھدائی ہوئی ہے اور جو مطالعہ میں آیا ہے۔ ابتدائی تاریخی بستیوں سے الگ ابتدائی عہد وسطی کے آثار قدیمہ کا باضابطہ طور پر نہ تو مطالعہ کیا گیا ہے اور نہ ہی کھدائی کی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تجارت اور شہر کاری پر آثار قدیمہ کے ثبوت ناکافی ہیں۔ گپتا حکمرانوں کو عمدہ قسم کے سونا اور چاندی کے سکے جاری کرنے کے لئے سراہا جاتا ہے۔ گپتا راجاؤں کے سونے کے سکوں کی نقل ساتویں صدی عیسوی کے کئی چھوٹے راجاؤں کے ذریعہ کی گئی۔ تاہم قیمتی دھاتوں (سونا اور چاندی) کے سکے ابتدائی عہد وسطی میں کم ہو گئے بنسبت اس سے ماقبل کی صدیوں کے۔ اہم سکوں کی ڈھلائی شمالی ہند میں کچھ علاقوں تک ہی محدود تھی۔ 1000 عیسوی کے بعد ہی قیمتی دھاتوں کے سکوں کی ڈھلائی پھر سے شروع ہوئی۔ لہذا علم مسکوکات (سکوں کا علم) کے ماخذ سے ابتدائی تاریخی سکوں کے ذریعہ ملنے والی اطلاع کے مقابلے میں کم اطلاع ملتی ہے۔ اسی بنیاد پر کچھ اسکالروں نے اس کو تجارت کی کساد بازاری کی بنیادی وجہ بتایا ہے۔ خاص طور سے 600 سے 1000 عیسوی کے عہد میں ہندوستان کی غیر ممالک سے تجارت۔ ابتدائی عہد وسطی میں ہندوستان کے بعض حصوں میں پائے گئے سکوں کے ثبوت پر بحث مناسب جگہ پر کی جائے گی۔

14.3 تجارت، بازار اور شہری مراکز 300 سے 650 عیسوی تک

روم کی دنیا سے ہندوستان کی پھلتی پھولتی تجارت میں تقریباً 250 عیسوی کے بعد زوال دکھائی پڑتا ہے۔ مغربی ممالک میں ہندوستانی اشیاء کی مانگ میں شاید بھاری کمی آئی تھی اور شاید تجارت کے پیمانہ میں بھی زوال آ گیا تھا۔ کشان حکومت کا 262 عیسوی کے آس پاس زوال بھی، شمالی ہندوستان کا باہری دنیا سے تجارت کی مقدار میں، اس دور میں کمی کی وجہ رہی ہوگی۔ بہر کیف تجارتی پس منظر میں اس بدلاؤ سے ہندوستان کے اندر اور شمالی ہند میں تجارتی لین دین میں کسی

بڑے بحران کی نشاندہی نہیں کرتے ہیں۔

14.3.1 سوداگر/تاجر

چنانچہ مشہور لغت نویس امر سمہا نے تجارت کو کریا وکریے (اشیاء کی خرید وفروخت) سے تعبیر کیا ہے۔ پہلے ہی کی طرح وانگ (عام تاجر)، سریشٹی (بہت مالدار تاجر غالباً بینکر یا پیسہ کا تاجر) اور سارتھواہا (تاجروں کے قافلہ کا سردار) اس عہد میں متحرک تھے۔ سخت ورن قانون کے لاگو رہنے کی وجہ سے ان کو ویشوں کے درجہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ موقعوں پر تجارتی سرگرمیاں اس سخت ورن اصولوں کو پھلانگ جاتی تھی۔ چنانچہ دو تاجر بھائی بھریکوٹی ورمن اور اچل ورمن اندر پور جدید اندور۔ بلند شہر ضلع۔ اتر پردیش) کے ایک سورج مندر کے لئے (نقد میں) مذہبی عطیہ دینے والوں کی شکل میں 466 عیسوی (سکندر گپت کے زمانے میں) کے ایک کتبہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ چھتری تھے اور اسی لئے ان کو چھتری وانگ کہا گیا۔ ورن قانون کی ایسی خلاف ورزی نہ تو ان کے لئے کوئی بدنامی لاتی۔ اور نہ ہی مذہبی مقامات پر ان کا عطیہ نا قابل قبول ہوتا۔ اس قسم کے تین وانکوں، شکتی ناگ، کمار ناگ اور سکند ناگ نے مدھیہ پردیش کے موجودہ مشرقی حصہ میں ایک دوسرے سورج مندر کی سرپرستی کی۔ چھٹی صدی عیسوی کی شروع میں گنگا وادی ہی میں نہیں بلکہ دھلہ (جبل پور کے نزدیک) کے پرانے علاقہ میں جو جنگل (اٹاویراج) میں واقع تھا ظاہر ہوتے ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے شروع کے ہی دو دیگر کتبات میں اس علاقے کے ایک تاجر (وانک) اور ایک دستکار (کرو) نظر آتے ہیں۔ یہ مثالیں نہ صرف گنگا وادی میں بلکہ وسط ہندوستان کے الگ تھلگ رہ گئے علاقوں میں بھی تاجروں کے عملی وجود کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ایک تاجر کا پیشہ اپنانا اتنا عام تھا کہ مشہور ڈرامے اچھ چھا کٹیکم کا ہیرو چارودت ایک تاجر تھا۔ جب کہ وہ ایک برہمنی خاندان میں پیدا ہوا تھا (وپرا سارتھا، وپرا= برہمن اور سارتھا، سارتھاواہا کا مخفف ہے)۔ یہ ڈرامہ دراصل یہ بتاتا ہے کہ چارودت کے باپ اور دادا بھی تاجر تھے۔ گوکہ وہ برہمنی نسل کے تھے۔ وہ تاجروں کو دئے گئے شہر کے محلے (شریشٹی چٹورے) میں رہتے تھے سارتھاواہا اور سرشٹھی دامودر پور (بنگلہ دیش کے شمالی حصہ میں) جو گپتا حکومت کے پندر وردھن بھکتی (صوبہ) میں شامل تھا، وہاں سے ملے گپت عہد کی پانچ تانبے کے پلیٹوں میں مستقل طور پر ذکر ملتا ہے۔ ان تانبے کی پلیٹوں 443-44 سے 543-44 کا زمانہ درج ہے (یعنی ایک صدی)۔ ان کتبات میں جو اصل لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے نگر سریشٹی۔ نگر کا مطلب شہر ہے اور سریشٹی تاجروں کے سردار کو کہتے ہیں۔ لہذا اس محاورے کا مطلب شہر کے تاجروں کا سردار لیا گیا۔ غالباً کوٹی ورشا کا شہر (اس کی پہچان آثار قدیمہ کا مقام بنگرہ، جنوبی دیناج پور ضلع مشرقی بنگال کے ساتھ کی گئی ہے) جہاں سے یہ جاری ہوئے۔ نگر سریشٹی لفظ، بینک کے افسر اعلیٰ یا روپے پیسوں کی تجارت کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ سریشٹی غالباً ایک بہت مالدار آدمی ہوتا تھا جو مختلف تجارت میں اپنا پیسہ لگاتا تھا۔ مگر سریشٹی کے ساتھ ساتھ سارتھاواہا یا تاجروں کے قافلہ کے سردار کا ذکر بھی شمالی بنگال کے گپتا عہد کے تانبے کے پلیٹوں میں ملتا ہے۔ یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ نگر سریشٹی اور سارتھاواہا ضلعی نظم کے انتظامی بورڈ (وشیادھستھنا) کے ممبر ہوتے تھے۔ جو ضلع ادھیکاری (وشیاپتی) کو تعاون دیتے تھے۔ ضلع افسر ایک ممتاز افسر ہوتا تھا جو پندرودھن بھکتی کے صوبائی گورنروں (اپاریکا یا اپاریکا مہاراج) کے ذریعہ مقرر کیا جاتا تھا۔ جو خود بھی گپتا راجاؤں کے ذریعہ مقرر کیا جاتا تھا۔ مگر سریشٹی اور سارتھاواہا دوسری طرف شمالی بنگال کے گپتا صوبوں میں تنخواہ دار ملازم نہیں ہوتے تھے۔ اب لگتا ہے کہ وہ لوگ ڈسٹرکٹ بورڈ میں اپنے اپنے پیشے کی تنظیموں کے نمائندے کے طور پر لئے جاتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شمالی بنگال میں نہ صرف اہم سوداگر تھے بلکہ تاجروں کی تنظیمیں بھی تھیں۔ ان تاجروں کی تنظیموں کے لیڈر اتنے اہم ہوتے تھے کہ ان کو ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بنایا جانا ضروری ہوتا تھا باوجود اس کے کہ وہ لوگ ریاست کے تنخواہ دار اسٹاف نہیں تھے۔ یہ نظام جو تقریباً ایک صدی تک رائج رہا پانچویں اور چھٹی صدی کے شمالی بنگال میں سماجی اور سیاسی طور پر تاجروں کی اہمیت کا پتہ دیتا ہے۔

تاجروں (دستکاروں کے ساتھ ساتھ) کی اہمیت بہر حال صرف شمالی بنگال تک ہی محدود نہیں تھی۔ کم سے کم 270 مہریں اور/ یا Sealings ویشالی (شمالی بہار) سے ملی ہیں، جو گپت عہد کی مانی جاتی ہیں۔ یہ مہریں تاجروں اور دستکاروں (سریشٹی، سرتھاواہا کلیکا نگم) پرتھما کلیکا پیشہ ورانہ تنظیموں سے متعلق ہیں۔ نگم لفظ ایک پیشہ ور تنظیم کا پتہ دیتا ہے اور شرینی کے مترادف ہے۔ ممکن ہے کہ ویشالی کے تاجروں، تاجروں اور دستکاروں اور قافلوں کی اپنی اپنی تنظیمیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ پیشہ ور تنظیموں (سریشٹی، سارتھاواہا کلیکا نگم) کی ایک اور بڑی تنظیم ہوتی تھیں۔

لہذا کتباتی ثبوت اس بات کے پکے گواہ ہیں کہ تاجر اپنی اپنی شرینی کی تنظیموں سے جڑے ہوتے تھے۔ ان تنظیموں کے آپس میں تال میل (سموہا) پر برھسپتی

اور نارد کے دھرم شاستروں میں خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ برہسپتی کے مطابق جیسے ہی اور جب بھی کسی شرینی میں کوئی نیا ممبر لیا جاتا تھا تو اس کو کچھ خاص عمل سے گذرنا پڑتا تھا۔ (1) کوشل یا اس کے اخلاقی قدروں کا پتہ لگانے کے لئے ایک امتحان (2) لیکھ کریا۔ نئے ممبر کے ذریعہ تنظیم کے قاعدہ قانون کی پابندی کرنے کے لئے تحریری حلف نامہ (3) مدھیست، کسی ایسے شخص کی موجودگی جو اس نئے ممبر کو اچھی طرح جانتا ہو۔ دھرم شاستر، تنظیم کے عہد و پیمان پر بار بار زور دیتا ہے۔ یہ امید کی جاتی تھی کہ شرینی کا ہر ایک ممبر تنظیم کے لئے برابر برابر سرمایہ لگائے گا۔ اگر کوئی ممبر شرینی کو نقصان پہنچاتا ہے تو باوجود ان الزاموں کے جو دوسرے ممبران کے خلاف لگائے ہیں، قصوروار ممبر کو شرینی کو ہوئے نقصان کی بھرپائی کرنی ہوگی۔ تنظیم کے قاعدے قانون اور شرطوں (سموت دیاتی کرم) کی کسی ممبر کے ذریعہ خلاف ورزی پر اس کو قانونی کاروائی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دھرم شاستر بھی زور دے کر کہتا ہے کہ شرینی کے قانون ملک کے قانون کے جیسے ہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں شرینی کے قصوروار ممبر کو شرینی کے قانون کے مطابق سزا دی جاتی تھی۔

دامودر پور سے ملے گپتا عہد کے تانبہ کا عطیہ کتبہ

حکمرانی کا برس۔۔۔ کے پھاگن ماہ کی 15 تاریخ؟ جب کہ پرم دیوتا پرم بھٹارک مہاراج ادھیراج شری بدھ گپتا تھے (زمین پر حاکم) اور جب کہ کوٹی ورش کے ویشے میں پندرورد ھن کی بھکتی میں اپاریکا مہاراج جے دت کی حکومت میں ترقی پا رہا تھا جو مہاراج کی مہربانیوں کا نتیجہ تھا۔ آیکت سندک (گنڈک؟) اس کے (جے دت) کے ذریعہ مقرر نگر سریشٹی ریبھو پال تاجر دشومتر کلیکا کا افسر اعلیٰ وردت اور بڑا منشی وپراپال کے ساتھ ملک اپنے (ان سب کی مدد سے) نگر (ادھسٹھان) کے معاملوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس سریشٹی ریبھو پال کے ذریعہ یہ گذارش اس طرح کی گئی۔ ہیم واچ چھیکھر (ادبی لحاظ سے ہمالیہ کی چوٹی) کے ڈونگ گرام میں اپرداز مینوں کے 4 کلیاواپ میرے ذریعہ کوکا مکھ سوامی کو دئے گئے اور 7 کلیاواپ سویتا ورہا سوامن کو اس امید پر کہ مجھے فائدہ پہونچے گا (اور) مذہبی معیار میں بڑھوتری کرنے کی خاطر اب ان زیر کاشت زمین کے پڑوس میں ان پرم دیوؤں کا مکھ سوامن اور سویتا ورہا سوامن (اور) ایک نام لینگم؟ کے لئے دو مندر اور دو بھنڈار کمرے بنوانا چاہتا ہوں۔ لہذا آپ کے لئے مناسب ہوگا کہ (مجھے) موجودہ فروختگی کے رواج کے مطابق ہی وستو (عمارت کی زمین) کے ساتھ کلیاواپ دیں۔

رادھا گووند بسک، دی فائیو دامور پور کوپر پلیٹ انسکرپشن آف دی گپتا پیریڈ، اپی گرافیا انڈیکا، جلد 15، 1982، نئی دہلی، پلیٹ نمبر 4 (ترجمہ) صفحہ 41-140۔

14.3.2 انجمن پیشہ وران (گلڈس)

قانون کی کتابوں اور کتبات میں بھی پیشہ ور تنظیموں کو شرینی کے نام سے جانا جاتا تھا جس کا اکثر غلط طریقہ سے انگریزی میں 'guild' ترجمہ کیا گیا ہے۔ ہمارے ماخذوں میں ایسی شرینی زیادہ تر دستکاروں اور خدمتگاروں کی تنظیموں کے نام سے ملتی ہیں اور بہت کم تاجروں کے لئے ونیک گرام نامی تاجروں کی ایک خصوصی تنظیم کا چھٹی صدی عیسوی کے مغربی ہندوستان سے ملے تین کتبات میں خصوصیت سے تذکرہ آتا ہے۔ لفظ ونیک گرام تاجروں کے کسی گاؤں یا بستی کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ ان کے ایک پیشہ ور تنظیم کی طرف اشارہ کرتا ہے (ایک اجتماع یا اجتماعی تنظیم کے معنی میں گرام) یہاں تاجروں کی تنظیم ونیک گرام کے بارے میں گفتگو کرنا درست رہے گا۔ 503 عیسوی اور 506 عیسوی کے سنجیلی (گجرات) سے ملے دو کتبات میں ونیک گرام بڑی وضاحت سے دکھائی پڑتا ہے۔ زیادہ واضح جانکاری 503 عیسوی کے کتبہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کتبہ میں ودرپالی میں مختلف جہات سے آنے والے تاجروں کے ناموں کی لسٹ ملتی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زیر غور تاجروں کی تنظیم میں مقامی (واستو) اور غیر مقامی تاجر دونوں شامل ہوتے تھے۔ غیر مقامی تاجر مختلف جگہوں سے آتے تھے (چتر دشا بھے گتک ویدیشے)۔ اس کتبہ میں واضح انداز میں مذکور 13 تاجروں میں سے کچھ تو کنیا کبج (جدید قنوج) اور اجینی جیسی دور دراز جگہوں سے آئے تھے۔ ایک تاجر کا نام دوسئے بھاسم تھا۔ جو اجینی سے آیا تھا جو یقیناً غیر ہندوستانی تھا۔ یہ تاجر ششٹی تاجر (وانیجک) کے گھر (گرہ

وستو ویتی) پر جو شاید ورد پالی کا ایک مقامی تاجر تھا، ملا تھا۔ تاجروں نے اس گروہ کے ایک وشنو مندر کے لئے کچھ اشیاء پر اپنی مرضی سے ٹیکس چکانے کا فیصلہ لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ تین سال بعد 506 عیسوی میں ششٹی نے اسی وشنو مندر (پرم دیوتا بھاگیہ وتائن) کو اپنا گھر (سوادیا گرہ وستو) دان کر دیا۔ ورد پالی میں ونیک گرام کے ممبروں کے ذریعہ تجارت کرنے والی بیشتر اشیاء روزمرہ میں استعمال آنے والی اشیا تھیں۔ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ ان کے ٹیکس نقد میں وصول کئے جاتے تھے، زیادہ تر چاندی کے سکوں میں (روپی نیکا وموپیکا)۔ حالانکہ کچھ اشیاء جیسے تیل، اس پر ٹیکس جنس میں لیا جاتا تھا۔ گجرات سے ملے 592 عیسوی کے تیسرے کتبہ میں ونیگ گرام کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ اس چارٹر میں جو مغربی گجرات کے لوہٹ گرام میں میترک حکمراں وشنوشینا کے ذریعہ جاری کیا گیا تھا۔ ان ونیک گرام کے لئے لاتعداد خصوصی رعایتوں کا ذکر ہے۔ ایسی رعایتیں اس امید پر دی گئیں تھی کہ وہ لوہٹ گرام میں آباد ہوں گے (اچرا ششٹی پتر)۔ اس کتبہ میں مذکور سبھی 72 دفعات ونیک گرام تاجروں کی حرکات وسکنات سے جڑی ہوئی تھیں۔ 592 عیسوی کے اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تاجر بیرون ملک کا سفر کرتے تھے غالباً سمندری بیڑوں سے (وہیترا) یہ کتبہ ہمیں نقل وحمل سے متعلق مختلف قسم کے ملکی طریقوں کی جانکاری دیتا ہے۔ جن میں نوکائیں (کشتیاں) اور مختلف النوع دستکاری پیداوار شامل تھیں (مثال کے طور پر بانس کا کام، چمڑے کا کام اور نیل بنانا)۔ جن پر مقررہ ٹیکس وصول کئے جاتے تھے۔

14.3.3 بازار

ہمارے ماخذوں میں مختلف ایسے الفاظ آتے ہیں جو تبادلے کے مراکز کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس وقت مختلف قسم کے بازار کا وجود تھا معمولی دیہی سطح کے تجارت کے مراکز کو ہاٹ کہا جاتا تھا۔ کومیلا علاقہ، بنگلہ دیش سے ملے 507 عیسوی کے ایک کتبہ میں ایک دوشیہاٹ یا کپڑوں کی تجارت کے ایک مرکز کا ذکر ہے۔ کالیداس کی کتابوں میں بھی بازار کا تذکرہ ویانی کے طور پر ہوا ہے۔ کالیداس نے اپن کے لفظ سے دوکان ہی مراد کیا ہے۔ شراب بیچنے والی دوکانوں کو سوندیکا پنم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اور دوکان کی طرف جانے والی گلی کو اپن مارگ کہا گیا ہے۔ کلاسیکی سنسکرت ادب ترقی یافتہ دوکانوں سے گھرے راج مارگوں (ریدھا پنم راجہ پتھم) کے تذکروں سے بھرا پڑا ہے۔

14.3.4 تجارتی راستے

شمالی ہند میں مختلف جگہوں پر پہنچنے کے لئے تاجر زمینی ترسیل کے وسائل کے جانے پہچانے طریقے کا استعمال کرتے تھے۔ شمالی ہند کے میدانی علاقے خاص کر گنگا بیسن اور گنگا ڈیلٹا، یقیناً آبی ترسیل کی سہولت فراہم کرتے تھے۔ دو مشہور چینی سیاح، پانچویں صدی کی ابتداء میں فاہیان اور ساتویں صدی کے نصف اول میں ہیون سانگ کی سیاحت کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ شمالی ہند کا بیشتر حصہ جو شمالی مغربی سرحدوں سے لے کر برہمپتر وادی میں بنگال ڈیلٹا اور کامروپ تک پھیلے ہوئے تھے وہ روایتی راستوں سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان دنوں ترسیل سے متعلق بے شمار پریشانیاں، مشکل علاقوں اور ڈاکوؤں کی وجہ سے غیر محفوظ راستوں میں حائل تھیں۔ ان کے سفرنامے اس پر بھی بھرپور روشنی ڈالتے ہیں کہ شمالی ہند دو راستوں سے دکن کے ساتھ تعلق بناتا تھا۔ ایک تھا مشرقی مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کے راستے اور دوسرا مالوہ علاقے سے ہو کر۔ سمدر گپت (75-335) کا مشہور دکھشن پتھ (دکن) حملہ پہلے راستے سے ہو کر مشرقی دکن میں ہوا معلوم ہوتا ہے مشرقی مغربی مالوہ سے ہو کر ہی اس کا لڑکا اور جانشین چندر گپت دوم چوتھی صدی کے اواخر اور پانچویں صدی کے آغاز میں مغربی ہند کے ساکا حکمرانوں کو ہرانے کے لئے گجرات پہنچا تھا۔ مہرولی کا اسپات کھمبے کا کتبہ (پالیوگرافیکی کے مطابق یہ گپتا کے زمانہ کا ہے) کے راجہ چندر کو سندھ ندی کے سات راستوں کو پار کر کے بھیلیکا (بلخ موجودہ مزار شریف، افغانستان) پہنچنے کے لئے سراہا جاتا ہے۔ یہ سندھ ڈیلٹا اور شمالی مشرقی افغانستان کے درمیان تعلق کو بتاتا ہے۔ شمالی مغربی علاقوں سے ہو کر جانے والے خشکی کے راستے خاص طور سے کمبوج سے آنے والے عمدہ جنگی گھوڑوں کی فراہمی کے لئے مشہور تھے۔ مغربی ایشیائی نسل کے یون یا تاجر کے لئے، کالیداس کے مطابق شمالی ہند کے میدانی علاقوں میں اس راستے سے بھی عمدہ گھوڑے (اشو وانیکا نا یوانینا) لائے گئے۔

14.3.5 لمبی دوری کی سمندری تجارت

زیر نظر عہد کے دوران لمبی دوری کی سمندری تجارت کے بارے میں ہماری معلومات قدرے کم ہیں، بمقابلہ ہماری معلومات کے جو اس سے قبل کی صدیوں کے

بارے میں ہیں، جب ہندوستان اور رومی سلطنت کے درمیان خاص طور سے بحر احمر کے تجارتی نیٹ ورک سے ہوکر غیر معمولی اہم تجارتی تعلقات تھے۔ چوتھی صدی عیسوی کے اختتام پر رومن سلطنت اور بحر ہند کے مغربی خطوں کے ساتھ تجارت میں بتدریج زوال نظر آتا ہے۔ بہر حال جنوبی ہند سے ملے سکّوں کے خزانوں میں بازنطینی بادشاہوں کے سکّے ملے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کے بندرگاہ جو ساسانی حکمرانوں کے تحت ایران کے ساتھ خاص ترسیلی ذریعہ فراہم کرتی تھی، خلیج فارس میں تجارت کے لئے اہم رہی ہوں گی۔ گجرات کے ساحل سے لے کر جنوبی مغربی ایران کے کرمان ساحل تک لال مٹی کے برتنوں کی تقسیم، ایرانی سمندری ساحل کے داخلے کے ساتھ، شمالی مغربی سمندری ساحلوں کے ملکوں سے سمندری تعلقات کی زوردار وکالت کرتے ہیں۔ سمندری ساحل پر حرکت بنگال کی خلیج میں زیادہ تیز تھی جو جنوبی مشرقی ایشیاء کے ساتھ تجارتی اور ثقافتی تعلقات میں مددگار ثابت ہوا یعنی زمینی حصوں سے گھرے گنگا کے میدانوں کو سمندر سے جوڑنے کے بطور ایک راستہ کے بنگال ڈیلٹا اہم اول نبھاتا تھا۔ 414 عیسوی میں فاہیان سری لنکا جانے کے لئے تیار ایک تجارتی بیڑے میں تامرلپتی کے مشہور بندرگاہ سے سوار ہوا۔ یہ سفر واضح طور پر بتاتا ہے کہ یہ ایک سمندری سفر تھا جو کسی خشکی کے سفر سے الگ تھا اور جس میں شمال مشرقی مانسونی ہواؤں سے مدد ملی تھی۔ سری لنکا سے یہ چینی سیاح جنوب مشرقی ایشیاء میں جاوا کی طرف بڑھا اور آخر کار چین کے ساحل پر جا پہنچا۔ بنگال ساحل کے سمندری راستوں سے رشتوں کی بہتر وضاحت، جزیرہ نما ملایا، بدھ گپت نامی ایک مہاناوک (جہازی استاد) کی موجودگی سے ہوتی ہے۔ جزیرہ نما ملایا سے ملے ایک چھٹی صدی کے کتبے میں لکھا ہے کہ بدھ گپت رکت مرتکا کا باشندہ تھا (رکت مرتکا واسک)، جو غالباً مرشد آباد ضلع، مغربی بنگال میں واقع ہے۔ گنگا سمیت دیگر ندیوں کے ساتھ بنگال ڈیلٹا، بنگال کی کھاڑی تک پہنچنے کے لئے خاص طور سے اہمیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بنگلہ دیش سے ملے دو چھٹی صدی کے کتبوں میں ایک جہاز تعمیری علاقہ (ناوت شرینی) اور تجارت کی دیکھ بھال کرتے ایک افسر (ویاپارکرندیا) کا ذکر ملتا ہے۔ بنگال میں ایک مرکزی ڈیلٹا علاقے کا نام نو ویاواکسیکا (نئی نہر یا خاص ندی) تھا، جو پرک سمدر کے ساتھ جڑا تھا۔ پرک سمدر لفظ یا تو یہ بتاتا ہے کہ نو ویاواکسیکا کا انتظامی حلقہ سمندر تک پہنچتا تھا یا پھر مشرقی (پراک) ساگر (سمندر)، ایک ندی سے ملنے والی نہر کے نویاواکاسیکا سے ڈیلٹا علاقہ سے ملا ہوا تھا۔ اس خطہ میں بلاشبہ مشہور بندرگاہ تامرلپت تھی۔ جس کو بنگال میں، ہیون سانگ نے سفر نامہ میں خصوصیت سے جگہ دی ہے۔ ہیون سانگ نے سن۔مو۔تا۔ٹایاسمتٹ کی اہمیت کا بھی ذکر کیا ہے جس نے جنوبی مشرقی ایشیاء کے خشکی کے حصوں کے چھ خطوں کے ساتھ سمندری رشتے قائم کئے۔

14.3.6 سکّہ سازی

تین صدی کے دوران شمالی ہند میں تجارت کا ایک اہم سراغ سکّوں سے حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ ہند میں عظیم گپتاؤں کو لگ بھگ دو صدیوں تک بہترین سونے کے سکّوں کی ڈھلائی کے لئے یاد کیا جاتا ہے۔ بہترین ڈھنگ سے ڈھلے ان گپتا عہد کے سکّوں کو ہم عصر کتبوں میں ابتداء میں دینار کے نام سے جانا جاتا تھا اور بعد میں سورن کا نام دیا گیا۔ یہ سکّے 124 اناج کے دانوں (grain) کی ایک معیاری وزن کا پیمانے (metrology) پر ڈھالے جاتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں گپتا عہد نے غالباً کشان عہد کے سونے کے سکّوں کی میٹرولوجی کو قائم رکھا۔ کمار گپت (414-54) کے عہد حکومت میں پہلی بار زیادہ وزنی دھات کے پیمانے پر گپتا سونے کے سکّے ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ کمار گپت کے کچھ سکّوں کا وزن 132 گرین (grains) تھا۔ گپتا عہد کے سونے کے سکّوں کے لئے 144 گرین کے وزن کے زیادہ وزنی سونے کے سکّوں کی ڈھلائی سکندر گپت (455-67) کے عہد میں شروع ہوئی۔ گو کہ گپتا عہد میں سونے کے سکّوں کی ڈھلائی زیادہ وزنی پیمانے پر شروع ہو گئی تھی۔ تاہم سونے کے سکّوں کی سونے کی خصوصیت (metalic purity) قائم رکھ پانا مشکل تھا۔ خاص کر 500 عیسوی کے بعد۔ یقیناً ایسا بالکل ممکن تھا کہ عظیم گپتا خاندان کے بعد کے حکمرانوں کے معیاری سونے کے سکّوں میں ملاوٹ شامل ہو گئی ہو۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خود حکومت کے اندر اس عہد میں معاشی پریشانیوں کا دور آچکا تھا۔ سکندر گپت (455-67) کے عہد حکومت میں اور چھٹی صدی کے ابتدئی چوتھائی حصہ میں شمالی ہند میں لمبی دوری کی تجارت پر ہون کے حملہ کا اثر پڑا ہو۔ بہت سے حکمرانوں نے جنھوں نے گپتا حکمرانوں کے مقابلے میں آنے کا سوچا، انھوں نے اسی جیسے سکے جاری کرنے شروع کئے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر گپتا سونے کے سکوں کے وزن کے برابر اور اس جیسے سکّوں کی نقل اتار لی۔ لیکن ان سونے کے سکّوں میں ملاوٹ تھی۔ کبھی کبھی تو اس میں صرف 37% سونا ہی ہوتا تھا۔ ایسا ناممکن ہے کہ سونے کے معیاری وزن (144 گرین) کے یہ سونے کے سکّے خاطر خواہ قدر و منزلت رکھتے ہوں گے اور چھٹی صدی عیسوی کے آخر نصف صدی میں لمبی دوری کی تجارت کے لئے شاید ہی لائق استعمال رہے ہوں۔

گپتا عہد میں چاندی کے سکوں کی ڈھلائی پانچویں صدی عیسوی کی ابتداء میں مغربی چھتر پا حکمرانوں کے ذریعہ گجرات کے علاقوں کی فتح کے ساتھ شروع ہوئی۔ گپتا عہد میں چاندی کے سکوں کا معیار چھترپا حکمرانوں کا چاندی کا سکہ تھا اور 32 رتی یا 57.6 گرین والے لمبے عرصہ سے چلے آ رہے گھریلو کرشپانا (چاندی کے سکّے) کے معیار کو نہیں اپنایا۔ شمالی بنگال سے ملی پانچویں صدی کی تانبے کی پلیٹ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گپتا عہد کے چاندی کے سکوں کو روپک کے نام سے جانا جاتا تھا۔ گپتا عہد کے سونے اور چاندی کے سکوں میں 1:16 کا تناسب تھا۔ قیمتی دھاتوں سے بنے یہ سکّے کم سے کم 500 عیسوی تک شمالی ہند میں لمبی دوری کی تجارت کے ساتھ ساتھ تجارت پر دلالت کرتے ہیں۔ جس کے بعد شمالی ہند میں لمبی دوری کے خشکی کے ذریعہ تجارت میں کساد کو پوری طرح خارج از امکان نہیں کیا جاسکتا ہے۔

14.3.7 شہری مراکز

شہری مراکز بطور سیاسی انتظامی مراکز کا بطور تجارتی اور ثقافتی مراکز کے اس عہد کی ادبی کتابوں میں ذکر ملتا ہے۔ خاص طور سے کالیداس کی مشہور کتابوں میں سنسکرت کی کتابوں اور کتبات، پور اور نگر کے حوالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مشہور لغت نویس امرکوش نے پور، نگر، اور پٹ بھیدن غیرہ لفظوں کو ایک دوسرے کے لئے استعمال ہونے سے شہری مراکز مراد لئے ہیں۔ پٹ بھیدن، جیسا کہ بتایا گیا کا مطلب ایک قسم کا شہری مرکز ہے۔ شہروں کی نشاندہی کرنے والے الفاظ میں اس لفظ کی شمولیت کا مطلب ہے کہ کم سے کم کچھ بڑے تجارتی مراکز نے تو شہری شکل اختیار کر ہی لی تھی۔ ایک دیگر مشہور تکنیکی مجموعہ وتسیانا کی کام سوتر میں شہری مرکز میں پلے بڑھے آدمی (ناگرک) پر توجہ مرکوز کی ہے۔ مکمل شہری زندگی کی چھاپ گپتا عہد کے چار بھان یا ایک شخصی monologue ڈرامہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف فاہیان اور ہیون سانگ نے یہ تاثر دیا ہے کہ شمالی ہند کے بہت سے مشہور اور پرانے شہروں کی اپنی پرانی عظمت اور شان و شوکت غائب ہو چکی تھی اور روبہ زوال تھے۔ اس میں شمالی ہند کے ان شہری مراکز سے متعلق آثار قدیمہ سے ملی جانکاری کے مطابق کئی شہری مراکز تباہی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ شراوستی، متھرا، اترنجی کھیڑ، کھیرادہیہ (اتر پردیش میں)، راج گرہ، ویشالی (بہار میں)، اور چمپا جیسے شہروں کی بہار لٹ چکی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ وارانسی اور اجینی جیسے شہروں کی اہمیت برقرار رہی۔ اس طرح شمالی بنگال کے ہستھاں گڑھ اور بنگڑھ میں بھی، شہری معیار میں کوئی بڑی گراوٹ نظر نہیں آتی ہے۔ مگر عام طور پر گپتا عہد (600-300 عیسوی) سے متعلق آثار قدیمہ سے ملے ثبوت اتنی اہمیت کے حامل نہیں جتنی کہ ساکا، کشان، ستواہن عہد میں (200BC-300AD)۔ یہیں سے اسکالروں نے گپتا عہد میں شہری مراکز کے زوال کو رومی سلطنت کے ساتھ ہندوستان کی لمبی دوری کی تجارت میں کمی کو دکھایا ہے اور شمالی ہند میں خشکی کے راستے تجارت پر ہون کے حملوں سے مرتب ہونے والے منفی اثرات پر زور دیا ہے۔ گپتا اور مابعد گپتا عہد میں تجارت اور شہری مراکز میں زوال کا نظریہ اسکالروں کے درمیان بے حد اختلاف پیدا کر رہا ہے۔ اس مسئلہ پر اگلے سیکشن میں تفصیل سے بحث کی جائے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارا کورس ای ایچ آئی، 03، بلاک ایک، اکائی 2)۔

14.4 تجارت، بازار اور شہری مراکز 650 سے 1300 عیسوی

ان ساڑھے چھ سو سالوں کے حال کے دنوں کے مطالعہ نے تاریخ دانوں کے درمیان اہم بحث چھیڑ رکھی ہے۔ یہ عہد بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے نصف سے ہی تاریخ دانوں کا دھیان اپنی طرف متوجہ کرنے لگا تھا۔ حالانکہ شروع شروع میں اسکالروں نے خاندانی تاریخ کو اپنا پسندیدہ موضوع بحث بنایا تھا۔ شمالی ہندوستان اور پورا برصغیر سیاسی طور پر شہنشاہی حکومتوں کی ماتحتی میں تھا۔ تاہم 600 عیسوی سے قبل کی صورتحال سے مختلف اب کسی بھی حکومت کو شمالی ہند، دکن اور جنوب بعید میں مکمل اختیار حاصل نہیں تھا۔ سیاسی صورتحال کی تصویر کشی ان گنت طاقتور علاقائی حکومتوں اور مقامی طاقتوں کے وجود سے کی جاسکتی ہے۔ سیاسی و انتظامی صورتحال کی دوسری خصوصیت بے شمار جاگیرداروں یا مختلف گریڈ اور رینک کے سامنتوں کے وجود میں مضمر ہے۔ اس وقت سیاسی صورتحال کہیں زیادہ پیچیدہ تھی۔ بہ نسبت گذشتہ صدیوں کے۔ موجودہ دور میں اسکالروں کی توجہ علاقائی سیاسی تصویر کے وجود اور ان کے طاقتور ہونے کے بارے میں زیادہ ہے بجائے اس کے کہ خاندانی جانشینی پر توجہ دی جائے۔ ان تمام حکمرانوں نے بے شمار زمین کے عطیات کے احکامات جاری کئے جو نہ صرف سیاسی تاریخ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سماجی معاشی اور ثقافتی تاریخ کی داستان پیش کرتے ہیں۔

14.4.1 شہروں کے زوال پر بحث: زوال کی موافقت میں دلائل

جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ زمین کے عطیات ابتدائی عہد وسطیٰ کے دیہی سماج اور معیشت پر غیر معمولی اہم اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ لیکن ان عطیات کی نوعیت میں شہری مراکز میں دستکاری اور سوداگری کے عمل کی تفصیل پیش کرنے میں شاید ہی کوئی کسر چھوڑی ہو۔ شمالی ہند کے ساتھ ساتھ پورے برصغیر میں 600 عیسوی سے ہی تانبے کی پلیٹوں کے چارٹروں کی لاتعداد وجود کو شاید ہی کوئی نظر انداز کر سکتا ہے۔ ان عطیات میں معیشت کے غیر زرعی شعبہ سے متعلق معلومات نسبتاً کم ہیں۔ یہ صورتحال 600 عیسوی سے قبل کے عطیات سے متعلق دستاویزات اور انتظامی امور سے متعلق دستاویزوں سے یکسر الگ ہیں۔ جس میں تاجروں، دستکاروں اور مختلف قسم کے پیشہ وروں کا تذکرہ خصوصیت سے کیا گیا ہے۔ بہت سے اسکالروں کا خیال ہے کہ دستاویزوں اور ان کے طرز تحریر میں تبدیلی، دراصل معاشی اور سماجی زندگی میں بدلاؤ پر دلالت کرتی ہے۔ زمینی عطیات کی کثیر تعداد کا مطلب، ان لوگوں کے خیال کے مطابق 600/650 عیسوی کے بعد سے ہی ایک مضبوط دیہی معیشت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس بدلتی صورتحال میں دستکاروں، تاجروں اور شہری مراکز کی اہمیت گھٹ گئی تھی۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ چوتھی صدی کے بعد رومن سلطنت کے ساتھ ہندوستان کے پھلتے پھولتے اور گہرے تجارتی رشتے میں زوال نے ہندوستان کی معیشتی زندگی پر منفی اثر ڈالا۔ 1000-600 کے دوران لمبی دوری کی تجارت میں ہندوستان کی کوئی معقول حصہ داری نہیں دکھائی پڑتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بین الاقوامی سطح پر اشیاء کی پیداوار اور اسکے تبادلے کے لئے شاید ہی کوئی کشش رہ گئی تھی۔ لہذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان کی لمبی دوری کی تجارت میں احیاء کا دور 1000 عیسوی کے بعد شروع ہوا جب پھیلتے ہوئے عربی تجارتی نیٹ ورک کے ساتھ تجارت میں ترقی واقع ہوئی۔ کتبات سے ملی معلومات کو ادبی کتابوں، خاص طور سے پرانوں سے ملی معلومات سے اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیشتر پرانوں کا جائزہ لینے سے جو چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں اپنی موجودہ شکل میں وجود میں آئے، بہت سے اسکالروں نے یہ باور کرادیا ہے کہ پرانوں کی توجیہات سے سماجی، معاشی اور سیاسی صورتحال میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ یہ اسکالر پانچویں صدی کے بعد، سماجی، معاشی اور سیاسی صورتحال میں زبردست بحران محسوس کرتے ہیں۔ کل یگ جو ہندوستانی تصورات میں چار یگ والے روایتی نظام میں سب سے برا دور (یگ) خیال کیا جاتا ہے۔ اس دور میں تاجروں کی بدحالی کی طرف پرانک تصورات کے مطابق توجہ مبذول کرائی ہے۔ برہنارد یا پران کے مطابق تاجر کل یگ میں نوکروں (کرموپاجیون) اور دھان کٹائی کرنے والوں (تینڈولکرن) کی حالت میں پہنچ گئے تھے۔ 600 سے 1000 عیسوی کے دوران شمالی ہند سے ملی دستاویزوں میں صرف مٹھی بھر تاجروں کا خصوصیت سے تذکرہ ملتا ہے۔ تامرلپت نہ صرف بنگال کی نامی گرامی بندرگاہ تھی بلکہ زمینی خطوں سے گھری گنگا وادی کی بندرگاہ تھی، آٹھویں صدی عیسوی میں ناپید ہو گئی۔ اس کی وجہ اس ندی میں گاد کا جمع ہو جانا تھا جس پر وہ قائم تھی۔ تامرلپت کا آخری حوالہ بہار کے ہزاری باغ کے علاقے سے ملے ایک آٹھویں صدی کے کتبے میں ملتا ہے۔ سندھ ندی کے ڈیلٹا میں بار بیری کم بندرگاہ کو ابتدائی عہد وسطیٰ میں معاشی طور پر کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اس علاقہ میں دیبول بندرگاہ دسویں صدی کے بعد ایک بین الاقوامی بندرگاہ کے طور پر روشنی میں آئی۔ اسی طرح گجرات کی مخصوص بندرگاہ بیری گازایا بھڑوج کا پرانا امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ ان تین بندرگاہوں کے ناپید ہو جانے سے شمالی ہند کی لمبی دوری کی سمندری تجارت پر خاصا منفی اثر پڑا ہوگا۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے شمالی ہند کی معیشتی زندگی میں تجارت اور تاجروں کے حالات میں بتدریج زوال کو دکھانے کے لئے ہی یہ ساری مثالیں دی گئی ہیں۔

ابتدائی عہد وسطیٰ میں تجارت کے زوال سے متعلق مندرجہ بالا بیان کی تصدیق قیمتی دھاتوں سے بنے سکوں کی قلت سے بھی ہوتی ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کی تین غیر معمولی طاقتور حکومتیں بنگال اور بہار کے پال اور سین خاندان (تقریباً 750-1200AD) اور جنوب کے راشٹر کوٹ (754-974AD) نے کوئی بھی سکہ جاری نہیں کیا۔ ایک اور اہم طاقت قنوج اور مغربی ہند کے گورجر پرتی ہاروں نے چاندی کے سکے تو ڈھالے مگر یہ سکے اپنے متنازعہ وزن اور خالص دھات کے سبب مشتبہ تھے۔ اپنی درج کی گئی قیمتوں سے مماثلت نہ ہونے کی وجہ سے ایسے سکے لمبی دوری کی تجارت کے لئے ایک معتبر دھاتی زر مبادلہ کا وسیلہ نہ بن سکے۔ قابلِ ذکر ہے کہ زر مبادلہ کی زوال پذیر حالت کے سلسلہ میں دیکھا گیا کہ پنجاب اور شمالی مغربی ہندوستان کے شاہی حکمراں اس سے مستثنیٰ تھے کیونکہ انہوں نے معیاری سکے جاری کئے تھے۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان کے شاہی حکمرانوں کے تحت اس خطہ سے کوئی بھی تانبہ کی پلیٹ حاصل نہیں ہوئی ہے۔ لہذا کچھ دانشور اس بات پر زور دینا چاہیں گے کہ زر مبادلہ کی معیشت اور زمینی امداد کی معیشت دونوں ہی باہمی طور سے ناکامیاب تھیں۔

گنگا کی وادی اور خاص طور سے بنگال سے حاصل شدہ تانبے کی پلیٹ میں امداد کے طور پر پورن، دھارن اور دھرم جیسے لفظ سکوں کی اصطلاح میں وقتاً فوقتاً ملتے ہیں۔ حالانکہ سکوں سے متعلق اس طرح کی اصطلاحات معروف تھیں لیکن ایسے سکوں کے کوئی اصل نمونے پال خاندان اور سین خاندان کی ریاستوں سے نہیں

ملتے ہیں۔دوسری جانب، بڑی تعداد میں تانبہ کی پلیٹوں میں اکثر کپاردوکوں یا کوڑیوں کا ذکر ملتا ہے۔کپاردک۔پورن جیسے الفاظ بھی ان تانبہ کی پلیٹوں میں نظر آتے ہیں۔پورن لفظ کسی خاص قسم کے سکے کی طرف اشارہ نہیں کرتا، بلکہ کوڑیوں کی ایک پورن یا ایک چاندی کے سکے کی شکل میں ان کی قیمت کو ظاہر کرتا ہے۔ابتدائی عہد وسطی کے شمالی ہندوستان کی روایتی اعدادی حساب کی فہرستوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک چاندی کے سکے اور کوڑی کے درمیان تعداد کا تناسب تھا1:1280۔دوسرے الفاظ میں 1280 کوڑیاں ایک چاندی کے سکے کے برابر تھیں۔ابتدائی عہد وسطی کے تحریری دستاویزوں میں کپردک پورن لفظ کا وسیع پیمانے پر استعمال، جس کا ذکر آٹھویں صدی سے قبل نہیں ملتا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کوڑی زرمبادلہ یا لین دین کا اہم ذریعہ تھی۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوڑیوں نے مبادلہ کے طور پر دھاتوں کی جگہ لے لی تھی جو اپنی مسکوک حقیقی قیمت کے سبب اپنا متعلقہ مقام کھو چکے تھے۔مشرقی بہار میں بھاگلپور کے قریب کولگانگ میں ہوئی کھدائی میں بڑی تعداد میں کوڑیاں ملی ہے۔جس سے زرمبادلہ کے طور پر ان کے باقاعدہ رائج ہونے کا مادّی ثبوت ملتا ہے۔اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کوڑیاں زرمبادلہ کا ایک کم قیمت والا اور ناکافی اور معمولی سا ذریعہ رہی ہوں گی۔وزنی کوڑیوں کو زیادہ مقدار میں لانا لے جانا فائدے کے بجائے پریشانیوں کا باعث ہوگا۔دوسرے الفاظ میں کوڑیوں کو لمبی دوری کی تجارت کے لئے غیر موزوں تصور کیا جاتا تھا۔ان کا بہتر استعمال مقامی سطح کی تجارت کے لئے ہی کیا جاتا تھا اور وہ لمبی دوری کی تجارت میں رکاوٹ کا باعث تھیں۔لہذا قومی زرمبادلہ کی حیثیت سے کوڑیوں کا رائج الوقت ہونا لمبی دوری کی تجارت کے زوال کے طور پر ترجمانی کرتا تھا اس زمانے کی شاندار تجارتی معیشت کو متاثر کرنے والے زرمبادلہ کی قلت (Monetary Anaemia) کا نظریہ متعدد تاریخی تحقیقات میں اہمیت کے ساتھ موجود ہے۔

تجارت کا زوال اور دھاتوں کے سکوں کی شکل میں زرمبادلہ کی غیر موجودگی لین دین کے مقصد سے بڑے پیمانے پر ضروری اشیاء کی پیداوار کے لئے مناسب نہیں تھی۔اس کے نتیجے میں نہ صرف زراعت پر انحصاری بڑھا بلکہ اس سے خودکفیل دیہی معیشت کا بھی ظہور ہوا۔ایسا خیال کیا جاتا ہے کی گاؤں کی ضرورتیں وہاں پیداشدہ ودستیاب اشیاء سے پوری ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے باہر سے ضرورت کی اشیاء لانے لے جانے کی ضرروت محسوس نہیں ہوتی تھی لہذا تجارت کی غیر موجودگی کے سبب گاؤں خودکفیل بن گئے جس کی وجہ سے وہ حاشیہ پر آگئے اور ان کی ترقی کی رفتار کم ہوگئی۔سکوں کی شکل میں زرمبادلہ کی قلت سے حکمرانوں کے سامنے اپنے افسران کو تنخواہوں کی ادائیگی میں سخت مشکلات درپیش تھیں۔ایسے حالات میں حکمرانوں کو اپنے افسروں کو تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے نقدی کے بجائے زمینوں کی تقسیم کا سہارا لینا پڑا۔اس سے مذہبی لوگوں اور مذہبی اداروں کی زمینی امداد کے علاوہ ایک سیکولر زمینی امداد کے رواج کو تقویت ملی۔خدمات کے بدلے زمینی پٹے یا سیکولر زمینی امداد سے شاہی خزانہ اور زیادہ خسارہ میں آگیا اور مرکزی اقتدار کو بھی نقصان پہونچا۔تجارت کی عدم موجودگی اور لین دین کے لئے دھاتوں کے زرمبادلہ کے وسیلہ کی غیر موجودگی کے سبب عہد وسطی میں جنوبی ہند میں ایک خودکفیل اور محدود دیہی معیشت کا ظہور ایک لازمی عمل تھا۔سست رفتار اقتصادیات اور زرمبادلہ کی قلت کے اثرات صرف معاشی زندگی تک ہی نہیں محدود تھے بلکہ اس نے غیر مرکزی طرز حکومت اور منقسم اقتدار کی راہ بھی ہموار کردی۔ہندوستانی جاگیردارانہ نظام کے حامیوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی اقتصادیات کی سست رفتاری کی وجہ دھاتوں کے زرمبادلہ کی غیر معمولی قلت تھی اس کے نتیجے کے طور پر حکومت کے ملازمین کو نقد ادائیگی سے متعلق مشکلات کی شروعات ہوئی اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلی افسران کو نقد کے بدلے خدماتی زمینی پٹے (آئندہ زمانوں میں جاگیر کی طرز پر) دینے کا رواج شروع ہوا۔آنے والے وقت میں ان اعلی افسران نے ان تقسیم شدہ خطوں سے نہ صرف بے شمار دولت حاصل کہ بلکہ مقامی طور پر وہ کافی طاقتور بن گئے۔اس سے حکمرانوں کا اقتدار واختیار جو سیاسی اقتدار اعلی کی حیثیت رکھتا تھا، حاشیہ پر آگیا۔دوسرے الفاظ میں ان جاگیرداروں اور زمین داروں کے عوض حاکم کے اپنے معاشی اور سیاسی خصوصی اختیارات میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔سیاسی اور معاشی حالات کے نتیجہ میں ابتدائی عہد وسطی میں ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کی ابتداء اور استحکام کو بڑھاوا ملا۔

لہذا معیشت جاگیردارانہ خصوصیات کی حامل ہونے کے سبب دیہاتی نظام میں گھل مل گئی۔اور اس میں تجارت کے لئے بہت کم گنجائش تھی۔ایسا مانا جاتا ہے کہ یہ شاید ہی شہری ترقی کا باعث بنی ہو۔ابتدائی تاریخی دور کے شہری مراکز سے متعلق آثار قدیمہ کے اعداد وشمار کے مقابلے میں ابتدائی عہد وسطی کے شہروں کے بارے میں کھدائی اور مطالعاتی معلومات کافی کم مقدار میں دستیاب ہیں۔کئی سابقہ شہری مراکز نے اپنے طبیعی ماحول میں تباہ شدہ بنیاد اور اینٹوں کو دوبارہ استعمال کرکے کارآمد بنانے کے ثبوت چھوڑیں ہیں۔ان سے AD 600-1000 کے دوران بشمول جنوبی ہندوستان، برصغیر کے بیشتر حصوں میں شہری آبادکاری کی عدم موجودگی کی واضح علامات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ایک پراکرت ادبی کتاب بیان کرتی ہے کہ شہری مراکز گاؤں میں تبدیل ہونے لگے (نارائنی گاما

MEDIA CENTRE LIBRARY Hyderabad

بھویانی ہوتی)۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے اقتصادیات کے زوال نے شہری زوال میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ شہری خطے میں جو معیشت کے غیر زرعی خطے تھے، تجارتی مراکز سے جڑے ہوئے تھے اور بہت سے شہری مراکز تجارت اور اقتصادیات کے اہم مراکز کی بھی حیثیت رکھتے تھے، پال خاندان، سینا خاندان اور پرتی ہارا خاندان سے متعلق تانبہ کی پلیٹوں کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں نگر اور پور کے بہت کم حوالہ ملتے ہیں۔ تانبہ کے پلیٹیں اور جایاس کندھوراؤں یا فاتح فوجی خیموں کے حوالوں سے بھری پڑیں ہیں۔ اسطرح کے جایاس کندھوراؤں نے سیاسی وفوجی صدر دفتروں کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ مبادلہ اور دستکاری کی صنعت کے خطوں کی حیثیت رکھنے والے مراکز رفتہ رفتہ ختم ہو گئے اور ان کی جگہ شمالی ہندوستان میں تیرتھ یعنی مذہبی مراکز کی ابتداء کے شواہد ملتے ہیں۔ جنہوں نے کسی وقت مذہبی مراکز کی شکل میں شہر کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوستانی جاگیردارانہ نظام کے حامی تاریخ دانوں کا ماننا ہے کہ چونکہ شہری مراکز نے تجارتی مراکز کی حیثیت سے اپنی بنیادی اہمیت کھودی تھی، وہ مذہبی مراکز بن گئے جس کے سبب ضروری اشیاء کی پیداوار/صنعت اور مبادلہ کے مراکز کی حیثیت سے انکا کردار حاشیہ پر آگیا تھا۔ اس طرح ابتدائی عہد وسطیٰ میں ''زرمبادلہ کی قلت'' کی طرح شہری قلت بھی عام ہوگئی۔ شہروں کے سکڑنے کے نتیجہ میں گاؤں کا پھیلاؤ ہوا جس نے معاشرتی ماحول کو تقویت دی۔ تجارت یا صحیح معنی میں تجارت کی عدم موجودگی نے ابتدائی عہد وسطیٰ کے شمالی ہندوستان میں جاگیردارانہ معاشرتی تشکیل میں ایک کلیدی کردار نبھایا۔ تین خطوں میں جاگیردارانہ معاشیات کی مثالی علامات دیکھنے کو ملتی ہیں: پال اور سینا خاندانوں کے تحت بنگال، گنگا۔ جمنا دوآب میں گورجر۔ پرتیہارا اور دکن میں راشٹرکوٹ اقتدار۔

14.4.2 شہروں کے زوال پر بحث: زوال کی مخالفت میں دلائل

ابتدائی عہد وسطیٰ کے دوران شمالی ہندوستان میں اقتصادی اور شہری معاشیات کے زوال سے متعلق مندرجہ بالا بیان غیر متنازعہ نہیں رہا۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں جاگیردارانہ معیشت کی تشکیل کی بھی تنقید کی گئی۔ بہت سے دانشوروں نے جاگیردارانہ معیشت کی تشکیل میں حقائق کی غیر درستگی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ مختلف ماخذ بشمول کتباتی مواد (epigraphic Materials) کو استعمال کر کے یہ ثابت کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں کہ تجارت کا تشویشناک طور پر زوال نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی شہری غیر آبادکاری کا عمل کسی بڑے وسیع وعریض علاقہ میں موجود تھا۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ زمینی امداد کی روایت کے تحت اکثر ناقابل کاشت زمین، غیر آباد جنگلات یا بنجر علاقے کی زمین، امداد کے طور پر دی جاتی تھیں جس سے ناقابل نظیر دیہی وسعت کی راہ ہموار ہوگئی۔ لیکن کیا زرعی بستیوں کے ظہور پذیر ہونے کا مطلب لازمی طور پر خود کفیل اور جامد گاؤں کا مستحکم ہونا تھا؟ انسانی ضرورت کی دو نہایت ضروری اور ناقابل فراموش ضروریات یعنی نمک اور لوہا مقامی طور پر ہر ایک گاؤں میں دستیاب نہیں تھا۔ اگر ان اشیاء کو غیر مقامی ذرائع سے حاصل کیا جاتا تھا، تو خود کفالت کے نظریہ پر اور ابتدائی عہد وسطیٰ کے گاؤں کی (محدود) نوعیت پر شبہات ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔

بازاری مقامات کی موجودگی

زمینی امداد کے عمیق مطالعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بازاری مقامات قطعی طور پر ان دستاویزات میں غیر موجود نہیں تھے، یہاں تک کہ 1000 عیسوی سے قبل کے تحریری دستاویزات میں ایسا نہیں ہے۔ تحریری دستاویزات اور ادبی کتب کے ماخذ متفرق قسم کے بازاری مقامات کی موجودگی کا تذکرہ کرتے ہیں، جن میں سے کچھ 600 عیسوی سے قبل تک غیر معروف تھے۔ لہٰذا ابتدائی عہد وسطیٰ میں شمالی ہندوستان کے تحریری دستاویزات میں ہاٹ یا ہاٹیکا جیسی اصطلاحات اکثریت سے استعمال کی گئی ہیں۔ ہاٹ یا ہاٹیکا لفظ عام طور سے مبادلہ کے ایک دیہی سطح کے چھوٹے مرکز کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ اصطلاح جدید لفظ ہاٹ کی شکل میں آج بھی زندہ و جاوید ہے جو بنگال اور بہار میں زیادہ معروف ہے۔ یہ بازار مختصر مدتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان میں روزانہ لین دین نہیں ہوتا ہے، بلکہ مقررہ ایام میں ہفتہ میں ایک ایک بار یا دو بار۔ ایسی تانبہ کی پلیٹیں جو دیہی گرد و پیش کے ساتھ خاص طور سے منسلک تھیں، میں دیہی سطح کے بازاری مقامات مثلاً ہاٹ اور ہاٹیکا کے ثبوت ملتے ہیں۔ ان تانبہ کی پلیٹوں میں، دیہی علاقوں کا تذکرہ اہم سنگ میل کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اس طرح کے کئی قصے کہانیوں کے تذکروں میں ہاٹ کے اندر پینے کے پانی (پرایا) اور آرام گاہوں (آراما)، کھانے پینے کے مکانات کا (ستارا)، ان بازاروں کے نزدیک دستیابی کا بھی ذکر ہے۔ پال دور کے کچھ تحریری دستاویزات میں ہمیں ہٹواڑا لفظ بھی ملتا ہے۔ یہ غالباً عام بازار کے مقابلے میں زیادہ اہم اور زیادہ بڑے بازار ہوتے تھے۔ دیواپالا دیوہاٹ غالباً ایسا ہی ایک بازار تھا۔ یہ نالندہ کی مشہور خانقاہ اور یونیورسٹی کے نزدیک واقع تھا۔ مشہور پال خاندان کے حکمران دیوپال

تقریباً(50-810 عیسوی) کے نام پر یہ ہاٹ غالباً کسی عام دیہی سطح کے بازار کے مقابلے میں زیادہ بڑا اور مشہور تھا۔ تانند پورا (آہار، بلند شہر ضلع، اتر پردیش) میں واقع مشہور شہری بازار کے مشرقی حصہ (پورواہاٹ) میں ایک ہاٹ موجود تھا۔ اس حقیقت کی وضاحت وہاں سے حاصل شدہ تحریری دستاویزوں (نویں صدی کے دوسرے نصف) سے ہوتی ہے۔ یہ ہاٹ یقیناً کوئی دیہی سطح کا بازار مرکز نہیں تھا، بلکہ یہ ایک بڑے شہری تجارتی علاقہ کے اندر واقع تھا۔ ایک ہاٹ مارگ یا کسی بازاری مقام کی طرف لے جانے والی گلی کا تذکرہ تانند پورا سے حاصل شدہ ایک دوسری تحریری دستاویز میں کیا گیا ہے۔ اس طرح ہاٹ کی اصطلاح کا مطلب کسی شہری خطہ میں تجارتی مرکز ہوسکتا ہے۔ جو کسی دیہی مبادلہ کے مرکز سے متعلق اس کے عمومی معنی میں اضافہ تھا۔ اسی طرح ایک ہاٹ راجستھان کے جودھپور علاقے میں ککوکا کے ذریعہ 861 عیسوی میں سابقہ زمانوں میں الگ تھلگ رہے۔ ایک مقام روہنی شکوپک میں قائم کیا گیا تھا، اس بازاری مرکز میں بھی تاجر آباد ہوگئے (ہاٹ مہاجن شکا استھا پیتا)۔

گھوڑوں کے میلے کا تذکرہ: پیہوا کتبہ

اوم! سب سے بالاتر، اعلیٰ اقتدار والا، شہنشاہوں کا شہنشاہ (اور) سب سے بڑا مالک، نامور بھوجا جو سب سے بالاتر، اعلیٰ اقتدار والے، شہنشاہوں کے شہنشاہ (اور) سب سے بڑے مالک، نامور رام بھدر کے قدموں پر سر جھکاتا ہے، کے ترقی پذیر پاک اور کامران دور حکومت میں 276 سال کے وشاک مہینہ کے ساتویں تاریخ (قمری دن)، اعداد میں سموت 276 وشاک، سودی 7 کو، مندرجہ بالا سال، مہینہ اور شہری دن (مہینہ) کے مطابق طے شدہ اس قمری دن میں یہاں پشاچی چتر داسی پر لگے گھوڑوں کے میلہ میں پرتھودک کے مشہور شہری یہاں جمع ہوئے چتر وارشیک کے مندرجہ ذیل باشندے بھٹ ویروکا کے بیٹے وندا اور راجیہ ول اور ولوکا، اسی طرح رینوکا کے بیٹے راجیہ سیہا اور اتپادلیکا کے مندرجہ ذیل باشندے بھلوک کا بیٹا کلوک اس کا بیٹا جارک، اس طرح چکری سلوانا پورا کے (مندرجہ ذیل) باشندے، دادا کا بیٹا واموک، ولد یوپور (بلد یوپور) کے (مندرجہ ذیل) باشندے، کھمبھاٹا کے بیٹے ھودا، مری گنک کا بیٹا ودک، کیشو کا بیٹا دھنوک، کھنکا کا بیٹا واموک، مانک کا بیٹا اویھری، سارنکڈک کے (مندرجہ ذیل) باشندے نار کے بیٹے لوہٹ (یالا ہٹ) اور شنکر، والوک کا بیٹا ایشور آدیتیہ، سیھر ودکاک کے (مندرجہ ذیل) باشندے وتچھک ولد اولک، رانیک ولد جے دھرک، پرگد ولد سور، تریگھٹک کے (مندرجہ ذیل) باشندے چند اولد دھرت، سوا ولد ایلگورک پھمپھا ولد ویوشرمن، کامیک ولد واگلک، گم گھاک کے (مندرجہ ذیل) باشندے سوا میرک ولد للیکا کاسی ہا، ولد سم گھک، پومھا ولد دامودر، دوو ولد ھلوک۔۔ کاسیلی، کھجّی ولد مانا اسولا راہووک کے (مندرجہ ذیل) باشندے ودھا ولد اوسوھا تاجروں کے سردار مختلف ممالک سے آتے ہیں جن میں اہم وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ مشہور پرتھودک کے پاک مقام کو امداد کے طور پر مندرذیل فرمان جاری کیا۔ مشہور کنیا کبجا میں نامور گھوگھا آدیتیہ کے بنوائے گئے دیوتا (مندر) کے لئے اور گوتیرتھ میں بھی کادمبا آدتیہ کے ذریعہ بنوائے گئے۔ دیوتا (مندر) کے لئے اور کنیا کبج کے نزدیک مشہور بھوج پور میں گنگا کے ساحل پر نگر بھٹ پر بھاکر کے بیٹے بھووک کے ذریعہ بنوائے گئے گھوڑ سوار دیوتا (مندر) کے لئے اور مشرقی سرسوتی کے نزدیک مشہور پرتھودک میں اسی بھووک کے ذریعہ بنوائے گئے یگیہ۔ وراہ (مندر) کے لئے ہم نے گھوڑوں، گھوڑیوں اور کھچروں اور دوسرے جانوروں کی خرید وفروخت کی اجازت دی ہے۔ پرتھودک میں راجہ کے ذریعہ خریداری کی صورت میں۔ ساتھ ہی ریاست میں رہنے والے ٹھاکروں کے ذریعہ خرید کی صورت میں اور اس کے بعد دوسرے مذہبی مقامات میں صرف راجہ کے ذریعہ خرید کی صورت میں۔ آخرت کی ثواب کے لئے۔ ہر مویشی پر دو دھرما بطور مذہبی امداد، اور اس کے چوبیس حصے کرکے ہم نے نامور گوہا آدتیہ کے ذریعہ بنوائے گئے دیوتا (مندر) کے لئے سات حصے نذرانے کے طور پر دیئے ہیں۔ سات ہی حصے کادمبا آدیتیہ کے ذریعہ بنوائے گئے دیوتا (کے مندر) کے لئے اور سات ہی حصے اس کے (مندر) کے لئے جو گروڈ پر سواری کرتا ہے اور ایک حصے پرتھودک نے بھووک کے ذریعہ بنوائے گئے یگیہ وراہ کے (مندر) کے لئے ایک (ہی) حصہ یگیہ وارہ کے مندر کے پجاری کے لئے اور آخری ایک حصہ پرتھودک کے پاک مقام کے لئے (پیش کئے ہیں)، اس کے علاوہ ہم نے بارہ حصے اور نذرانے کے طور پر دیئے ہیں۔ جن میں گھوڑوں کو خریدنے والے کے ذریعہ ہر گھوڑے کے لئے ایک دھرما کو بانٹا گیا ہے، چھ حصے مشرقی سروسوتی کے قریب پر تھودک میں بھووک کے ذریعہ بنوائے گئے یگیہ وارہ (کے مندر) کے لئے اور اس مندر کے پجاری کے لئے دو حصے اور نامور پرتھودک کے مقام کے لئے چار حصے۔ یہ گھوڑوں کے خریداروں اور فروخت کرنے والوں (دونوں) کے ذریعہ بنوائے گئے (قابل قبول ہونا چاہئے)، اور اچھے اخلاق پر عمل کرنے والی گوشٹیوں کو تب تک جب تک سورج اور چاند قائم رہیں، مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق اپنے لئے اور دوسروں کے لئے انتظام کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ یہ حصہ گوشٹیوں کے ذریعہ مندرجہ بالا (اصولوں) کے مطابق ہی تقسیم کرنا چاہئے۔

جی۔ بوھلر۔ دی پیہوا۔ انسکرپشن فرام دی ٹیمپل آف گریب ناتھ، ایپگرافیا انڈیکا، جلد اول، ص 190-188۔

ابتدائی عہد وسطیٰ پرتھودک (جدید پیہوا، ضلع کرنال، ہریانہ) میں نویں صدی میں ایک گھوڑوں کے میلہ (گھوٹکا۔ یاترا) کا انعقاد ہوا۔ متعلقہ کتبے میں پرتھودک میں جمع ہونے والے گھوڑوں کے تاجروں کا بھی تذکرہ ہے۔ یاترا لفظ کا یہاں مفہوم ایک میلہ یا پینٹھ ہے یہ بھی مختصر مدتی نوعیت کا تھا۔ ایسا نہیں لگتا کہ یہ مویشی میلے پورے سال روزانہ منعقد کیے جاتے ہوں گے۔ دوسری طرف یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا کہ ایسے میلے سال کے ایک مقررہ وقت میں منعقد کیے جاتے ہونگے، خاص طور پر کسی تیوہار کے موسم میں۔ حالانکہ مختصر مدتی ہوتے ہوئے بھی یاترا ایک ہاٹ سے مختلف ہے کیونکہ یہ میلہ ہفتہ میں ایک یا دو بار نہیں بلکہ پورے سال میں صرف ایک بار لگتا تھا۔ اونی (wooly) مویشیوں کے لین دین کے مقصد سے اس طرح کے سالانہ میلہ کا تذکرہ راجستھان میں واقع کمن میں نویں صدی عیسوی میں ملتا ہے کمن کتبہ میں ایسے کمبلی ہاٹ کہا گیا ہے۔

ہمیں آٹھویں اور نویں صدی سے نئے قسم کے بازاری مقامات کا پتہ ملتا ہے۔ یہ ہمیں تقریباً مکمل طور سے شمالی ہندوستان کے دستاویزات میں ملتے ہیں۔ یہ بازاری مقامات منڈاپیکا ہیں جن کے لفظی معنی ہیں چھت سے ڈھکا ہوا علاقہ۔ مندر بالا اصطلاح کو باآسانی سے منڈیوں کے درجہ میں رکھا جاسکتا ہے جو جدید دور میں گنگا جمنا دوآب، بالائی گنگا وادی اور مغربی ہندوستان میں پائی جاتیں ہیں یہ منڈیاں دیہی سطح کے مقابلے میں زیادہ بڑی ہوتیں ہیں۔ لیکن بڑے شہروں میں واقع بازاروں سے چھوٹی منڈی کے سب سے قدیم حوالے ہماچل پردیش میں واقع کانگڑا خطے میں بجنی ناتھ پرشاستی (آٹھویں/نویں صدی) میں دیکھے جاسکتے ہیں کیڑاگرام جدید کانگڑا میں ایک منڈاپیکا تھی جہاں تاجروں کے ایک خاندان سے متعلق تین تاجروں نے بیج ناتھ میں ایک مندر کے لئے منڈاپیکا سے حاصل روزآنہ وصولی میں سے چھ درہم (چاندی کے سکے) نقد امداد کئے۔ سیودونی جدید سرون میں ایک بڑی منڈاپیکا تھی۔ جہاں تاجروں بشمول تاجروں کے اور مختلف پیشہ ورانہ گروہوں کی موجودگی ان کتبات سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ کتبات یہ بھی ظاہر کرتے ہیں دسویں صدی کے وسط سے اور خصوصاً 1000 عیسوی بعد راجستھان اور گجرات میں منڈاپیکاؤں کی مرکزیت دیکھنے میں آئی۔ ندولہ (جدید نادول) ابتداء میں ایک گاؤں تھا۔ دراصل بارہ گاؤں پر مشتمل ایک گاؤں تھا۔ (دودش گرامیئے ندولگرام) ندولہ بعد ازاں ایک منڈاپیکا کی حیثیت سے ظاہر ہوا جہاں خاص طور سے اناج اور زرعی پیداوار کی تجارت ہوتی تھی۔ ندولہ بعد میں ایک نگر یا شہر کہا جانے لگا اور آخرکار یہ نادو کے چہمنوں کا سیاسی مرکز بن گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندولہ بارہ گاؤں کے مجموعہ کے مرکز میں واقع تھا یا ان گاؤں سے کم وبیش یکساں دوری پر واقع تھا۔ اس نے ندولہ کو ایک مرکزی حیثیت عطا کی جہاں آس پاس کے گاؤں سے فاضل زرعی پیداوار لائی جاتی تھی۔ اس نے ندولہ میں ایک منڈاپیکا کے قیام کی راہ ہموار کردی۔ یہ عناصر ندولہ کے ایک گاؤں اور ایک شہری مرکز اور آخرکار عہد وسطیٰ کے راجستھان میں مقامی طاقتور کے اعلیٰ سیاسی مرکز کی حیثیت دینے میں مددگار ثابت ہوئے کتباتی ریکارڈوں سے یہ بات واضح ہے کہ یہ منڈاپیکائیں تجارتی راستوں اور آمد و رفت کے دستیاب ذرائع کے ساتھ اچھی طرح مربوط تھیں۔ اس طرح 1114 عیسوی میں ضرورت کی اشیاء بیلوں (ورش) گدھوں (گردابھ) یا اونٹوں (اوشتر) کے ذریعہ منگل پورا جدید منگرول گجرات میں واقع منڈاپیکائیں میں لائی جاتی تھیں۔ منڈاپیکائیں دھابول مدھیہ پردیش کے مشرق میں واقع کالاچوری ریاست میں بھی ظہور پذیر ہورہی تھی۔ اس قسم کی ایک منڈاپیکا بلہاری میں واقع تھی اور دوسری کاریتلائی میں۔ بلہاری میں واقع منڈاپیکا کا ذکر 975 عیسوی کے ایک کتبے میں ملتا ہے۔ منڈاپیکا کی علامات کا وہاں جمع ہونے والے تاجروں کے حوالے سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔ کئی منڈاپیکاؤں کو شولک منڈاپیکا کے نام سے جانا جاتا تھا یعنی منڈاپیکا میں محصول اور چنگی، نقد اور اشیاء کے لین دین دونوں شکلوں میں وصول کیا جاتا تھا۔ محصولوں یا ٹیکسوں کی وصولی منڈاپیکا میں اقتصادی لین دین کی ایک واضح مثال ہے۔ نادول میں واقع منڈاپیکا کا شری ندولہ تلپڈا شولک منڈیکا کے روپ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا منڈاپیکا کو ایک محصول وصول مرکز کی حیثیت سے اختیار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ تلپڈا خطہ (سرکاری خزانہ کے لیے پوری طرح سے طے شدہ محصول کا خطہ) میں اس کا قیام منڈاپیکا کے محصول حاصل کرنے کی صلاحیت کے امکانات پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ جنسوں کا متاثر کن سلسلہ، جو فروخت کے لیے لائی جاتی تھیں، بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ منڈاپیکا میں لائی جانے والی اشیاء کی فہرست میں اناجوں و ہری سبزیوں، نمک وغیرہ کے ساتھ زرعی پیداوار کی بہت ساری اقسام نظر آتی تھیں۔ کپڑے اور مختلف قسم کے مسالوں کا ذکر بھی قابل محصول پیداواروں کی فہرست میں ہے۔ کافی دلچسپ بات ہے کہ کالی مرچ (ماریچا) مدھیہ پردیش کے بلہاری میں واقع منڈاپیکا میں دستیاب تھی یہ مرچ اس خطہ کی مقامی پیداوار رہی ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ غالباً دور دراز مالابار سے لائی جاتی تھی یا وہ خطے جو کالی مرچ کے باغوں کے لئے سب سے زیادہ مشہور تھے۔ بلہاری میں اور ساتھ ہی شری پدا اور وسوت (بیانہ راجستھان میں 955 عیسوی) کے منڈاپیکا میں گھوڑے جیسے کافی قیمتی اشیاء بھی فروخت کی جاتی تھیں۔ ہاتھی، اعلیٰ طبقہ کے خریداروں کے لیے ایک اور قیمتی جانور، بلہاری میں واقع منڈاپیکا میں لایا جانے والا قابل محصول اشیاء کی فہرست میں نمایاں ہے۔ منڈاپیکاؤں میں اس طرح معدنیات، مختلف روزمرہ کی

ضرورت کی چیزوں (غالباً تھوک اشیاء کی شکل میں) اور قیمتی اشیاء جیسے مسالہ وگھوڑے ہاتھی جیسے جانوروں کا لین دین ہوتا تھا۔ کچھ منڈاپیکائیں مثلاً سیادونی اور بلھاری میں واقع منڈاپیکائیں، پتن منڈاپیکا کے روپ میں مشہور تھیں۔ اس لفظ کا مطلب یا تو کسی شہری خطہ میں منڈاپیکا یا ایسی منڈاپیکا جس نے شہری وضع اختیار کر لی ہو؟ ہوسکتا ہے۔ لیکھا پدتی، گجرات سے حاصل شدہ ایک ابتدائی عہد وسطیٰ کی کتاب میں مہا منڈاپیکا لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مہا۔ لاحقہ کا استعمال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ چاہے جو ہو کچھ منڈاپیکائیں اپنے ہم منصبوں کے مقابلے کافی بڑی بن گئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ منڈاپیکاؤں نے اپنے اپنے دیہی اندرونی خطوں کے ساتھ ساتھ باہری شہری خطوں کے ساتھ بھی قابل ذکر تجارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔

سیادونی کا کتبہ

(1) (سطر 4-1): سموت 960 سرون (لفظوں اور اعداد میں) پوراشہر سنگت کے بیٹے، تاجر چانڈوک کے ذریعہ قائم کیا گیا، شہر کے جنوبی حصہ میں، شری نارائن بھٹارک کو 200x225 ہاستہ پیائش کا ایک کھیت دیا گیا۔

(2) (7-4): سموت 964 مارگ سیرا وا، دی-3 (لفظوں اور اعدد میں) مہا سامنتادھی اندابھٹ نے چانڈوک کے ذریعہ قائم، ایک پنچیہ کڈرم کا چوتھائی اور ایک یوگ (؟) شری وشنو۔ بھٹارک کی روزانہ ادائیگی کو طے کرتے ہوئے ایک دینی امداد کے طور پر پیش کیا۔

(3) (8-7): وہی تاریخ: سنگت کے بیٹوں، تاجر چانڈوک، سواس اور ماہپ نے سنگت کے بیٹے چانڈوک کے ذریعہ قائم شری وشنو۔ بھٹارک کے لئے چار مکانوں والا ایک آواسنک (یا گھر) دیا۔

(4) (10- 8): سموت 965، اشوین۔ سو، دی (لفظوں اور اعداد میں) چنڈو کے بیٹے تاجر ناگک نے اس ضمن میں کچھ کمہاروں کے ذریعہ جمع کی گئی ایک دینی امداد پیش کی۔ اس کے تحت نشہ آور شراب کشید کرنے والوں کو شراب کے ہر کنستر پر دیوتا (وشنو) کو آدھے وگیر ہاپالا در (؟) کے برابر شراب دی جائے گی۔

(5) (10): چنڈو کے بیٹے، تاجر ناگک نے ایک وارھکیا وسوپک (؟) کے کچھ چینی بنانے والوں کے ذریعہ روزانہ ادائیگی (کو طے کرنے والا ایک مذہبی امداد) پیش کی۔

(6) (13-11): سموت، 967 فالگون وا، دی 15 (لفظوں اور اعداد میں) تاجر واسودیو نے چنڈوک کے ذریعہ قام شری وشنو بھٹارک کے قریب (؟) واسودیو کے ذریعہ قائم شری وشنو بھٹارک کو دوشی ہاٹ میں ایک آواسنک (؟) اور اسی دیوتا کو (پاک آگ کی پوجا کے لئے) اپنا گھر دیا۔

(7) (15-13): تاجر چانڈوک نے پرسن ہاٹ میں ایک وِتھی یا دوکان دی؛ اور سنگت کے بیٹے، اسی چانڈوک نے شری وشنو بھٹارک کو اپنی چار دکانیں دیں۔

(8) (16-15): ویٹھور کے بیٹے، پان بیچنے والے کیشو نے چانڈوک کے ذریعہ قائم شری وشنو بھٹارک کو چتر ہاٹ میں اپنی ایک خاندانی دکان دی۔

(9) (17-16): چانڈوک کے بیٹے، تاجر ناگک نے شری وشنو بھٹارک کو دوشی ہاٹ میں حاصل شدہ دو دکانیں دیں۔

(10) (18-17): ماہپ کے بیٹے تاجر شیلوک نے شری نارائن بھٹارک کو بذات خود حاصل کی ہوئی ایک دکان دی۔

(11) (20-18) سموت 969، ماگھ سو۔ دی کو (لفظوں اور اعداد میں) چندو کے بیٹے تاجر ناگک نے نشہ آور شراب کے کشید کرنے والوں کے پاس جمع شدہ 1,350 شری مدادی وراہادرم کی رقم دی، جن کو شری وشنو بھٹارک کو شراب (؟) کے ہر کنستر پر آدھا وگراھتونگیہ درم ہر مہینہ چکانا تھا۔

(12) (21-20) چنڈو کے بیٹے تاجر ناگک نے دوشی ہاٹ (؟) میں کچھ یوگوں پر دو کپر دکوں کی ادائیگی والی ایک مذہبی امداد پیش کیا۔

(13) (22-21) ناگک نے شری نارائن بھٹارک کو دوشی ہاٹ میں حاصل شدہ ایک دکان دی۔

(14) (23-22)؛ چنڈوک کے بیٹے ناگک نے شری نارائن بھٹارک کو اپنی تین دکانیں دیں۔

(15) (24-23) گووند کے بیٹے؛ تاجر بھیلہ نے شری وامنس وامی دیو کو ایک خاندانی دوکان (وگراہ پالیہ درم؟ کا ایک تہائی حصہ والی) دی۔

(16) (25-24): ناگک نے تری بھون سوامی دیو کو دو مکان دیئے۔

(17) (26-25) پان بیچنے والا دھامک نے شری اومامہیشور کو خود خریدا گیا ایک اونک دیا گیا۔

(18) (27-26): سموت 994، بیسا کھ وا، دی، 5 سنکراتی، کیشو کے بیٹے، پان بیچنے والے ساوراور اچو کے بیٹے مادھو نے چانڈوک کے ذریعہ قائم دیوتا (وشنو) کو پتوں کی ہر پالیکا پر ایک وگراہ درم سوواک کی ادائیگی کی شکل میں ایک مذہبی امداد دی۔

(19) (27): سواس نے تری بھون سوامی دیو کو ایک دکان دی۔

(20) (27-28): ناگک نے تیلیوں (؟) کے ہرکولہو سے تیل کی ایک پالیکا دی۔

(21) (28-29) سموت 1005، ماگھ سودی کو (لفظوں اور اعداد میں) دوشی ہاٹ میں مہاجنوں نے تاجر وکرم کے ذریعہ قائم، شری بھیلا سوامی دیو کو ایک تہائی درم کا ایک ماہانہ نذرانہ ادائیگی کی شکل میں پیش کیا۔

(22) (29-30): سوتر دھار ججب، وشیاک، بھالویاک اور دیگر سنگ تراشوں نے شری وشنو، بھٹارک کو ہر بھارن پر ایک تہائی وگراہ پال درم کی ادائیگی پیش کی۔

(23) (30-31): سموت 1008، ماگھ سودی۔ 11 (صرف اعداد میں)۔ کیشوا، درگا دتیہ اور دیگر تیلیوں نے چنڈو کے ذریعہ بنوائے گئے وشنو کے مندر میں پورندر کے ذریعہ قائم، شری۔ چکر سوامی دیو کو ہر کولہو سے تیل کی ایک پالیکا دی۔

(24) (31-33): پپّا کے بیٹوں، تاجر مہادتیہ اور نوہل نے دیدادا کے بیٹے، پپک کے ذریعہ قائم، شری۔ چکر سوامی دیو کو تین مکانوں والی ایک آواسنک دی۔

(25) (33-34): سموت 991، ماگھ سو۔دی۔10 (اعداد میں)۔ چنڈو کے بیٹے ناگک، جاجو کے بیٹوں دیویکا، والی اور رودک اور ساوا کے بیٹے چھترک نے دیوتا (وشنو) کو ایک آواسنک، اس سے ملحقہ مکان اور دو کانیں دیں۔

(26) (34-36): جاجو کے بیٹوں دیدیکا، والیکا اور رودک نے چنڈو کے ذریعہ قائم، شری۔ وشنو، بھٹاوک کو چتوشک ہاٹ میں ایک دوکان دی۔

(27) (36-39) سموت 1025، ماگھ۔وا۔دی۔9 (اعداد میں)۔ مہا آدتیہ کے بیٹے، تاجر شری دھر نے چنڈو کے ذریعہ بنوائے گئے۔ وشنو کے مندر میں مہا آدتیہ کے ذریعہ قائم شری۔ وشنو۔ بھٹارک کو دوکان (۹) کے کرانہ کی شکل میں واجب الادا ایک چوتھائی شری مدادی وارہ درم پیش کئے۔

کے۔کیل ہورن، 'سیادونی اسٹون انسکرپشن، ایپیگرافیا انڈیکا، جلد۔ا، ص 68-167۔

بازاری مقامات میں دوکانوں کے بھی شواہد ملے ہیں جن کو ہٹ اور اپانا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سیادونی میں کچھ دوکانوں کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ خاندانی طور پر ان پر چند تاجروں کے مالکانہ اختیار تھے (پترا پتا ماہو چار جیتا)، دوسری کچھ دکانوں کے مالک وہ تاجر تھے جنہوں نے انہیں خود بنایا تھا (سوپار جیتا)۔ خاندانی طور پر مالکانہ اختیار والی دوکانوں کا تذکرہ غالباً تین پیڑھیوں تک جاری رہنا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ ان خرید وفروخت کے اداروں میں کافی لمبے عرصہ تک متحرک اقتصادی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان دکانوں کو ظاہر طور پر پرچون تجارت کے لئے بنایا گیا تھا۔

حالانکہ ہاٹ/ ہاٹیکا اور پور، نگر، پال۔سین دور (تقریباً 1200-750 عیسوی) کے تانبہ کی پلیٹوں میں تو ظاہر ہوتے ہیں لیکن بنگال میں منڈا پیکا ئیں نظر نہیں آتیں۔ بنگال جو گنگا ڈیلٹا میں واقع ہے اور کئی ندیوں کے ذریعہ پانی حاصل کرتا ہے، میں کئی ندیوں پر واقع بندرگاہیں تھیں جو ندیوں پر مبنی آمد ورفت میں مدد کرتی تھیں۔ بنگال سے حاصل شدہ ابتدائی عہد وسطی کے تانبہ کی پلیٹوں میں اکثر دیہی مقامات میں سرحدوں کی شکل میں چھوٹے کشتیوں کے اسٹیشنوں (نو۔دنڈ، نو۔بندھ) کا ذکر ملتا ہے جس میں بے شمار منبع، چھوٹی ندیوں (سروتا سیونی، گنگنی کا)، نہریں اور دریائی راستوں کو شامل کیا گیا تھا۔ یقیناً زیادہ تر دریائی راستے خاص طور سے گنگا اور بھاگیرتھی سے ہوکر گذرتے تھے جن پر بے شمار بیڑے سفر کرتے تھے (ساکھلو بھاگیرتھی پتھ پرورتمان۔نووت)۔ ساتویں صدی کے ابتدائی نصف سے ہی اس ڈیلٹا کے مشرقی حصہ میں۔ ساحلی بندرگاہ نظر آنے لگی تھیں۔ ایسی ہی ایک بندرگاہ تھی دیوپروت (جدید مینامتی۔ لالمائی، بنگلہ دیش) جو تانبہ کی پلیٹوں (ساتویں سے ابتدائی دسویں صدی) کے مطابق شیرودہ ندی کے ساحل پر تھی جس پر دیوپروت ندی، بندرگاہ کے اردگرد کئی کشتیاں چلا کرتی تھیں۔ سابھر (بنگلہ دیش کی راجدھانی ڈھاکہ کے نزدیک) سے حاصل شدہ، تقریباً 971 عیسوی کے ایک دوسری تانبہ کی پلیٹ میں ایک عجیب وغریب مقام کا نام مندرج ہے: ونگ ساگر۔سمبھند ریاک۔ سابھر واسی ندی کے ساحل پر واقع ہے اور ایک چھوٹے سے داخلی دریائی بندرگاہ کے روپ میں کام کرتا ہے۔ سمبھند ریاک کے معنی اشیا کا ذخیرہ (بھنڈار) کے لئے حسب ضرورت اور مناسب سہولیات (سمیک) مہیا کرانے کے مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ سابھر/سامبھر' لفظ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ضروری اشیاء کا ذخیرہ ہے۔ اس بات کے قوی امکان ہیں کہ سابھر یا قدیم سامبھر ایک سمبھند ریاک کی ہی نمائندگی کرتا تھا۔ سامبھر میں واقع یہ ذخیرے کی سہولت ہی اسے ابتدائی زمانہ کے پٹھیدنوں کے نزدیک لائی ہوگی۔ (اوپر دیکھیں)

تجارتی سرگرمیوں کا تذکرہ مختلف قسم کے ادبی شاہکاروں میں ملتا ہے۔گر ینسوری کے نیوالے یاملا (تقریباً آٹھویں صدی) تاجروں کی ایک جماعت (ونیک میلی) زندہ وجاوید سرگزشت پیش کرتی ہے جو سرپرک کی مشہور بندرگاہ شہر میں جمع ہوئے تھے۔حالانکہ یہ سرگذشت غالباً ماضی کی یادداشتوں پرمبنی ہے۔دلچسپ بات تاجروں کی تجربات کا آپس میں لین دین ہے۔یہ بندرگاہ آریہ سور (تقریباً 7ویں/8ویں صدی) کی جاتک مالہ میں بھی نظر آتی ہے۔سرپورک میں، اس کتاب کے مطابق، بھگوان بدھ اپنے ایک سابقہ جنم میں ایک ماہر ملاح کے روپ میں رہا کرتے تھے جو جہازوں کو بندرگاہ تک لانے (آہرن) اور وہاں سے لے جانے (اپرہن) کے فن میں ماہر تھے۔یہ واقعات نا تو اقتصادیات کے جاری رہنے اور نا ہی اس کی عدم موجودگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔جو کہ اس نظریہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں کہ جس کے مطابق جاگیردارانہ سماجی تشکیل سے اقتصادیات کا زوال ہوا۔

شمالی ہندوستان کے وسیع وعریض میدانوں میں اکثریت سے آمدورفت کے زمینی راستے موجود تھے،جن میں سے کچھ ابتدائی عہد وسطی میں خاص طور سے اہمیت کے حامل تھے۔لہٰذا چیاتان (785-805) ایک ایسے راستہ کے متعلق بیان کرتا ہے جو پندرودھن (شمالی بنگال) اور کج نیگلا (راج محل کی پہاڑیوں کے قریب) کو چھوتے ہوئے کامروپ سے ملدھ جاتا تھا۔متعدد زمینی راستے کنیا کبج کو ہندوستان کے مختلف حصوں سے جوڑتے تھے۔جیسا کہ البیرونی نے تحریر کیا ہے۔ایک ایسا ہی راستہ ایودھیا، بنارس، پاٹلی پتر اور مونگیر سے ہو کر کنیا کبج سے گنگا ساگر (سمندر کے ساتھ گنگا کے سنگم پر) تک جاتا تھا۔کنیا کبج سے شروع ہو کر ایک دوسرا راستہ پریاگ (الہ آباد) سے جڑتا تھا، پھر مدھیہ پردیش کے ریوا خطہ سے ہو کر اڑیسہ پہنچتا تھا اور پھر وہاں سے دور دراز جنوب میں کانچی پورم (چنئی کے نزدیک) تک چلا جاتا تھا۔

گنگا، جمنا دوآب، البیرونی کے مطابق، مغربی ہندوستان کے ساتھ اچھی طرح جڑا ہوا تھا۔اسی طرح، متھرا کے اجینی اور بیانہ (راجستھان) بھی ایک زمینی راستہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے منسلک تھے۔اور دونوں مقامات سے کاٹھیاواڑ میں سومناتھ کی مشہور بندرگاہ تک پہنچنا ممکن تھا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی کی ابتداء کے کچھ سین خاندان کے راجاؤں کے تانبہ کی پلیٹیں ایک نئی قسم کی بستی کی نشاندہی کرتی ہیں جس کا نام چتورک تھا۔چتورک لفظ بارہویں صدی میں بنگال سے حاصل شدہ کتبات میں نظر نہیں آتا ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں ایک ایسا مقام جو چار سڑکوں کے سنگم پر واقع ہو۔چتورک کوئی گاؤں نہیں تھا۔لیکن کوئی بڑا شہری بازاری خطہ بھی نہیں تھا۔ایسا ہی ایک چتورک، بیٹادا، چتورک کے نام سے معروف تھا جو گنگا ندی کے ساحل پر واقع تھا (پوروے جاہنا ولیسیم)۔اس کو ہاوڑہ ضلع، مغربی بنگال میں بیتور کے نام سے جانا جاتا تھا۔جس کو سرسوتی ندی پر سپت گرام کی مشہور بندرگاہ کے ساتھ گنگا کو جوڑنے والی ایک داخلی بندرگاہ کی حیثیت سے 16ویں صدی میں قابل ذکر اہمیت حاصل ہوگئی۔ایک دریا کی ساحلی بندرگاہ کے طور پر بیتور کے رول کی شروعات اسی طرح 12ویں صدی سے ہی ہو چکی تھی۔گنگا ڈیلٹا میں ان داخلی بندرگاہی شہروں کی حیثیت دیہی اندرونی خطوں اور باہری شہری مراکز کے درمیان وسیلہ کی تھی اور یہ کم وبیش ابتدائی عہد وسطی میں شمالی اور مغربی ہندوستان کی منڈاپیکاؤں کی طرح ہی اپنا کردار نبھاتے تھے۔

مندرجہ بالا ماخذ غالباً: شمالی ہندوستان میں تجارت کے زوال کے بارے میں کچھ نہ کہتے ہوں لیکن اقتصادیات سے متعلق بلا واسطہ ثبوت تانبہ کی پلیٹوں میں دستیاب مختلف حصوں کی وصولی کرنے والے افسروں کی فہرست سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔لہٰذا ہاٹ پتی (ہاٹوں کا نگراں افسر)، شولکیا (شولک، کسٹم اور چنگی کی وصولی پر معمور افسر)، تارک (تارا اور کشتی پر واجب الادا محصول کی وصولی پر معمور افسر)، گما گمیکا (داخلی دروازہ اور آمد کی دیکھ بھال کرنے والا افسر)، نووت اور اردھ نووت (تجارتی بیڑوں کی آمدورفت پر نظر رکھنے والے چھوٹے اور بڑے افسر) وغیرہ کے حوالے شمالی ہندوستان کے آمدورفت اور کچھ آمدورفت کے راستوں کی موجودگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔نویں صدی کے ابتدائی نصف میں ویر بھدر دیو نے نگر ہارا (جلال آباد، افغانستان) سے سمبودھی (بودھ گیا، بہار) تک ایک سفر کا آغاز کیا۔اس کتبے میں بودھ گیا میں متعدد ہم وطنوں کو دیکھ کر ویر بھدر دیو کی خوشی کا بھی بیان ہے۔یہ وسیع زمینی آمدورفت کے نظام کے ساتھ ساتھ مسافتوں کی باقاعدگی اور کثرت کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔یہ زمینی راستہ گنگا کی وادی میں ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے عمدہ جنگی گھوڑوں کی درآمد کے لئے یقیناً خاص طور سے اہم رہا ہوگا۔اس لئے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ پال دور کے کتبات شمالی سرزمینوں سے گھوڑوں کو حاصل کرنے کے لئے پال خاندان کے راجاؤں کے اشتیاق یا دلچسپی کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس بات کی وضاحت منہاج السراج کی طبقات

ناصری کے ذریعہ بھی ہوتی ہے، جونوڈیہ (سین خاندانی راجہ لکشمن سین کی راجدھانی ،تقریباً 1199-1179 عیسوی) میں عربی گھوڑوں کے تاجروں کی باقاعدہ آمدکوزوردیکر بیان کرتی ہے۔شمال مشرقی سرحدی خطوں اور خاص طور سے کامروپ کے ساتھ بنگال کے تعلقات کی تصدیق،کتبات،منہاج کے تذکروں اور مارکوپولوکی سیاحتوں (تقریباً 1324-1254 عیسوی) کے ذریعہ خاص طور سے ہوتی ہے۔چالوکیہ ریاست کے تحت گجرات میں زمینی راستوں کے ذریعہ رابطوں میں قابل ذکر سدھار کا مشاہدہ کیا گیا۔چالوکیہ ریاست (پٹن) کا اہم شہر انہل پور،منجاپور،چھن چھنواڑہ،ویراگام،وڈھوان،سائلا،ون تھلی،وغیرہ کے ساتھ اچھی طرح جڑا ہوا تھا۔دوسری طرف یہ وارانسی،پریاگ اور دھار (وسطی ہندوستان میں) کے ساتھ بھی جڑا ہوا تھا۔گجرات کی اہم بندرگاہوں کا،مثلاً استمبھاپوریا کامبے اور سومناتھ،داخلی شہروں،خاص طور سے جو مالوہ پٹھار میں تھے،کے ساتھ ایک موثر آمدورفت کا نظام قائم تھا۔تامرلپت ،جوآٹھویں صدی تک مشرق کی اہم بندرگاہ تھی،میں ایودھیا کے تاجرآتے رہتے تھے۔1024 عیسوی میں ساحلی آندھرا سے بنگال میں ونگلہ دیش تک چول خاندان کے راجہ راجیندر کی دلیرانہ مہم،اوڑیسہ کے ساتھ بنگال اور پھر وہاں سے آندھرا کی جانب زمینی راستوں کے رابطوں کی نشاندہی کرتی ہے۔دوردراز شمال مغرب میں،پنجاب میں ملتان نے تجارت کے ایک اہم مرکز کے روپ میں قابل ذکر اہمیت حاصل کرلی تھی،جوگنگا کے میدانوں اور ساتھ ہی اس برصغیر کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے بھی جڑا ہوا تھا۔ملتان ایک مخصوص تجارتی مرکز کی حیثیت سے عرب سرگزشتوں میں بڑے پیمانہ پر دکھائی دیتا ہے۔

لمبی دوری کی سمندری تجارت میں موجودگی کی اہمیت

مندرجہ بالا اعداد وشمار اور بحث ومباحثہ سے ابتدائی عہدوسطی کے شمالی ہندوستان میں تجارت میں کسی زوال کی نشاندہی نہیں ہوتی۔دستیاب معلومات کا بغور مطالعہ بھی،بیرونی علاقوں کے ساتھ شمالی ہندوستان کی زوال پذیر تجارت کی دلالت نہیں کرتا۔اس مقصد کے لئے عربی اور فارسی کے ماخذ ہمیں اہم معلومات مہیا کراتے ہیں۔بڑے تعجب کی بات ہے کہ ہندوستانی جاگیردارانہ نظام کی تشکیل کے حامیوں نے ہندوستان کی لمبی دوری کی تجارت سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں،ان ماخذوں کوعموماً نظرانداز کیا ہے۔مغربی ایشیاء،افریقہ کے کئی حصوں اور بحیرہ روم سے لے کر اسپین تک اسلام کا عروج اور پھیلاؤ اقتصادی سرگرمیوں میں مددگار ثابت ہوا۔اسلام نے تجارت اور شہریت کو ایک نئی اور امتیازی پہچان دی۔آٹھویں صدی میں عباسی خلافت کے قیام اور اس کے استحکام سے وسطی ایشیاء،چین اور جنوبی ایشیاء کے ساتھ مغربی ایشیاء کے زمینی راستوں کے آمدورفت میں مدد ملی۔لیکن سمندری تجارت میں بہت زیادہ شاندار ترقی غورطلب ہے۔عباسی خلافت،خلیج کے شمالی حصہ میں اہم بندرگاہ سیراف کے ساتھ خلیج فارس (دریائے اخضر) کی اہمیت کو بڑھانے میں ایک اہم آلہ کار ثابت ہوئی۔969 عیسوی میں مصر میں فاطمی خلافت کے قیام سے سمندری تجارت میں ایک دوسری اہم تبدیلی واقع ہوئی۔اس کے نتیجہ میں مغربی بحر ہند کی اہم سمندری گلی (Sea-Lane) کی حیثیت سے بحراحمر کا عروج ہوا،جس سے ہندوستان کے ساتھ ساتھ بحیرہ روم کے خطوں کے ساتھ بھی بحری تجارت میں مدد ملی۔بحر ہند میں لمبی دوری کی تجارت کا مغربی سرایا تو سیراف میں یا پھر مصر میں اسکندریہ اور مشرقی سرا ساحلی جنوب مشرقی ایشیاء کے ساتھ ساتھ چین کے ساحل پر جاکر ملتا تھا۔بحر ہند کے اس پار یہ نقل وحرکات،مانسونی ہواؤں کی تبدیلیوں کے قابل،پیشین گوئی نظام سے رہنمائی حاصل کرکے اپنی سمت طے کرتی تھیں جس میں ہندوستان بھی شامل تھا جو بحر ہند کے مرکز میں واقع تھا۔اس سمندری مقام کو البحر الہند (ہندوستانی سمندر یا بحر اعظم) کا درجہ ملنے سے عرب تاجروں اور مسافروں کے ساتھ ہندوستانی بندرگاہوں یا پٹنوں کی وابستگی کو بے حد بڑھاوا ملا۔بحر الہند کے حصوں سے عرب مصنف اچھی طرح واقف تھے۔بحر لاروی (لار=لتا یا جنوبی گجرات،گجرات کا سمندر یعنی بحر عرب) اور بحر ہرکال (ہری کیلا کا سمندر ہری کیلا بنگلہ دیش کے جنوب مشرقی حصہ میں واقع تھا،چنانچہ بحرہ ہرکال خلیج بنگال کو ظاہر کرتا ہے۔)۔ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ 971 عیسوی کی ایک تانبہ کی پلیٹ میں خلیج بنگال کا ونگ ساگر کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔حالانکہ دکن اور دوردراز جنوبی ہندوستان میں کافی تعداد میں بندرگاہیں موجود تھیں۔عربی اور فارسی ادبی ماخذ سے شمالی ہندوستان کی بھی کئی بندرگاہوں کا پتہ چلتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ یہ ادبی ماخذ 1000 عیسوی کے بعد کے دوران بڑے پیمانے پر اور باقاعدہ تجارت کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن 1000 عیسوی سے قبل بھی ان میں ہندوستان کی سمندری تجارت کی واضح علامتیں ملتی ہیں۔

چچ نامہ آٹھویں صدی کے سندھ پر پہلے عربی حملہ کی تذکرے اور ایک عربی تاریخ داں البلاذری (تقریباً 892 عیسوی) کی سرگزشت،سندھ ڈیلٹا پر واقع دیبل بندرگاہ کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔اس وقت تک پہلے ہی دیبل شری لنکا کے ساتھ اپنے سمندری رابطوں کے لئے جانا جاتا تھا۔اس ابتدائی عہدوسطی کی بندرگاہ

کے باقیات پاکستان میں بنھبور کے مقام کی کھدائی سے ملتے ہیں۔دیبل کی اہمیت نویں سے بارہویں صدی کے عرب مصنفین کے تذکروں میں قائم رہی۔شمالی ہندوستان کے مغربی ساحلی صوبوں میں بہرحال، گجرات ساحل نے ہی خاص پہچان حاصل کی۔حالانکہ بھڑوچ، جسے عرب سرگزشتوں میں بزور کہا گیاہے،زوال پذیر ہو چکا تھا۔اقتصادی منظر پر ایک عظیم بندرگاہ نمایاں ہوئی،شری استھجہ پور/شری استمبھ تیرتھ یا جدید کامبے۔یہ بزرگ بن شہریار(955ء)،ابن خردادبہ(تقریباً 882ء)،المسعودی(915ء)،سلیمان(تقریباً 851ء)،حدود العالم، نامعلوم تصنیف(982عیسوی)،البیرونی(1034 عیسوی)،الادریسی(1162 عیسوی)،چاؤ، جو۔کوآ(1225ء)،مارکوپولو(1295ء)اور ابن بطوطہ (ابتدائی چودھویں صدی)کے عربی تذکروں میں متواتر نظر آتی ہے۔اس بندرگاہ نے سیراف اور ہرمز جیسی دونوں خلیج فارس کی بندرگاہوں اور بحرِ احمر کے مہانے پر عدن کے ساتھ رابطے قائم کئے۔دوعہد وسطیٰ کے ادبی ثقافتی ماخذ۔وستوپال مہاتیم اور جگدوچریتر۔دو گجراتی تاجروں۔وستوپال اور جگدیو(بارہویں/تیرہویں صدی)کے سرگرمیوں کے مرکز کے روپ میں اسی بندرگاہ کی بات کرتے ہیں۔کامبے یقیناً ایک اعلیٰ درجہ کی بندرگاہ تھی حالانکہ اسے کئی چھوٹی بندرگاہوں کی حتی المقدور مدد حاصل تھی جو کامبے کی اہم بندرگاہ کے لئے معاون بندرگاہوں کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔یہ مندرجہ ذیل تھیں:سومناتھ(1264 عیسوی کے ایک سنسکرت۔عربی دولغتی دستاویز میں خصوصیت سے نظر آنے والی)،الدیب(دیو۔ایک بارہویں صدی کے یہودی تجارتی خط میں متذکرہ)اور گھوگھا۔کتباتی اور ادبی ماخذ میں ہرمز(سنسکرت ادبی ماخذ میں متذکرہ آردرپور)اور کامبے،سومناتھ اور گھوگھا کے درمیان قریبی روابط کے بارے میں کافی دستاویزات ملتے ہیں۔گھوگھا کو ہرمز سے آنے والے جہازوں(ہرموجی واھن)کی آمد کے مرکز کی حیثیت سے خاص تذکرے ملتے ہیں۔مثلاً تھانہ،سنجن اور چول ان سب کا ذکر عربی سرگذشتوں میں ملتا ہے۔گجرات قریبی شمالی کونکن ساحل میں یہ بندرگاہیں،ہندوستانی ادبی ماخذ اور کتبات میں بھی نظر آتی ہیں۔جن کو عموماً ویل کل یا بندرگاہ کی اصلاح دی گئی ہے۔

اب ہم اپنی توجہ بنگال کے ساحل پر واقع بندرگاہوں کے طرف مبذول کرتے ہیں۔جو چاروں طرف سے زمین سے گھرا گنگا کی وادی کے لیے سمندر کی طرف جانے کے لئے اہم راستہ تھا۔یہ حقیقت ہے کہ آٹھویں صدی کے بعد تامرلپت کی عظیم بندرگاہ کی متحرک حیثیت کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ کم ازکم ساتویں صدی کے ابتدائی نصف سے ہی ہیون سانگ جنوب مشرقی ایشاء میں کچھ علاقوں کے ساتھ سمتٹ (گنگا ڈیلٹا کا آخری مشرقی سرا)کے سمندری روابط سے بھی متاثر تھا۔ایسا تب کہہ رہا تھا جب تامرلپت اپنے وقار کی بلندی پر تھا۔سمتٹ ہری کیلا خطہ ساتویں صدی کے ابتدائی نصف میں ساحلی جنوب مشرقی ایشاء کے ساتھ سمندری تعلقات کے نقطۂ نظر سے ایک اہم خطہ کے روپ میں ابھر رہا تھا،یہ بات آئی سنگ کی سفری سرگزشت(675-95 عیسوی ہندوستان میں)سے ثابت ہوتی ہے۔نویں صدی کے وسط سے لے کر چودھویں صدی کی ابتداء تک عرب سرگزشت دھوم (DHM۔دھوم یقینی پال خاندان کے راجا دھرم پال)کی ریاست میں ایک بندرگاہ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔جس سے اس کے بنگال ڈیلٹا میں ہونے کا پتہ چلتا ہے یہ بندرگاہ ہے سمندر۔یہ نام غالباً سمندر یا ساگر لفظ سے بنایا گیا ہے۔ابنِ بطوطہ نے اسے سودکاون کے نام سے جانا۔یہ ایک ندی کے مہانہ پر واقع تھی۔اور اس کے قریب ہی ایک جزیرہ بھی تھا جو الادریسی کے مطابق (1162)متفرق ممالک کے تاجروں سے بھرا ہوا تھا۔ادریسی یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ بندرگاہ ایک تنگ خلیج یا داخلی راستہ (خاور)کے نزدیک واقع تھی جو بیڑوں کے آنے جانے میں مددگار تھا۔ابن بطوطہ نے دور دراز شمال میں سودکاون سے ھبانگ، جسے بنگلہ دیش میں ہبی گنج کے نام سے جانا جاتا ہے،تک کا سفر کیا تھا۔اس نے نیلی ندی کے کنارے کنارے بھی ایک سفر کیا۔اس ندی کی عموماً میگھنا کے نام سے پہنچان کی جاتی ہے۔سمندر/سودکاون کے بارے میں مختلف ادبی تصانیف میں اس کی پہچان جدید چٹاگانگ (چٹاگرام)کے قریب واقع ایک بندرگاہ کے ساتھ کی جاتی ہے۔دراصل بالترتیب آٹھویں اور دسویں صدی کے دومرتبان والے کتبات (vase inscriptions) میں یہ خطہ نواچٹا منڈل کے نام سے جانا گیا۔تامرلپت کے زوال اور اس کے نقصان کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اس ڈیلٹا کے عین مشرق میں ایک نئی بندرگاہ کا ظہور ہوا۔سمندر نے،عربی ادب کے ماخذ کے مطابق،سراندیپ (شری لنکا)اور ارن شین (اڑیسہ)،گنجا(کورومنڈل میں کانچی پورم)وغیرہ کے ساتھ اقتصادی روابط قائم رکھے۔ابن بطوطہ،حالانکہ بعد کے زمانے میں آیا پھر بھی،سوکاون اور مالدیپ کے درمیان سمندری سفر کا تذکرہ کرتا ہے۔سوکاون کے جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ روابط کے بارے میں ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہے۔لیکن نالندہ سے حاصل ایک تانبہ کی پلیٹ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جاوا کے راجہ بل پتر دیو نے پال خاندان کے حکمراں،راجہ دیو پال (37-802ء) سے درخواست کی تھی کہ وہ نالندہ وہار کو پانچ گاؤں امداد کے طور پر دے،جاوا کے راجہ کی التجاء کو باقاعدہ عزت دی گئی۔یہ بنگال اور ساحلی جنوب مشرقی ایشیاء کے درمیان باقاعدہ ثقافتی تعلقات کی واضح علامت ہے۔ایسے ثقافتی تعلقات ان دونوں

خطوں کے درمیان مسلسل اقتصادی روابط کا نتیجہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ عرب مصنف ، بندرگاہ پر عمدہ قسم کے کپڑوں، قامرونی عود کی لکڑی(Qamarui aloe wood)، گینڈے کی سینگوں اور تلواروں کی دستیابی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو یقینی طور پر ان مصنوعات کی جہازوں پر لادنے /اتارنے کا مقام تھی۔ قامرونی عود کی لکڑی جس کا مقام صرف ملتان کی لکڑی کے مقابلے دوسرا تھا، یہ بنگال یا سمندر کی مقامی پیداوار نہیں تھی یہ کامروپ سے دریائی راستہ کے ذریعہ سمندر لائی جاتی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ گینڈے کے سینگ بھی ہندوستان کے شمال مشرقی حصوں سے ہی سمندر تک پہنچتے ہونگے۔تلوار غالبًا !انگ (مشرقی بہار) جو ہتھیار بنانے کے لئے مشہور تھا، میں بنائی گئی اشیاء تھی۔ کپڑے عین ممکن ہے کہ بنگال کی مقامی پیداوار تھے جو سب سے عمدہ قسم کے سوتی کپڑوں کی پیدوار کے لئے مسلسل مشہور رہا ہے۔ سمندر کی بندرگاہ، اسی طرح، ایک وسیع داخلی خطوں سے جڑی ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی تذکرہ کیا ہے کہ گنگا ڈیلٹا کی چھوٹی اندرونی دریائی بندرگاہیں (مثلاً دیوپروت اور وانگ ساگر سمبھند ریا یک) غالبًا! بنگال ڈیلٹا میں اہم بندرگاہیں تھیں اور داخلی خطوں کے درمیان اہم روابط قائم کرتی تھیں۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے بنگال میں متحرک سمندری تجارت کے بارے میں کم اختلافات ہیں۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے بنگال میں لمبی دوری کی تجارت کے زوال سے متعلق نظریہ کو قبول کرنا مشکل امر ہے۔

قوی تجارتی جماعتوں کی موجودگی

ہمارے ماخذ تاجروں کی موجودگی پر بھی زور دیتے ہیں۔ جب کہ قدیم اصطلاحات جیسے وانیک، سارتھاواہ اور شریشٹھی جاری رہیں۔ نئے قسم کے تاجر بھی نظر آئے۔ مغربی ہندوستان سے حاصل شدہ ایک دسویں صدی کا کتبہ شریشٹھی۔ سارتھ کا ذکر کرتا ہے۔ جو غالبًا ایک تاجر زر تھا کیونکہ اس کا تذکرہ چاندی کے سکے ڈھالنے والوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ سیادونی کی مشہور منڈاپیکا میں ہمیں ایک نمک کے تاجر (نیمک ونج) کی متحرک موجودگی نظر آتی ہے۔ یہ اتنا دولت مند تھا کہ سیودونی میں بہت سے مندروں کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ حالانکہ ابتدائی عہد وسطیٰ کے بنگال کے کتبات میں تاجر انفرادی طور پر بڑی تعداد میں نمایاں نہیں ہیں۔ دسویں صدی کے ابتدائی نصف کے ایک امداد سے متعلق کتبے میں ایک وردھا سارتھ کا تذکرہ ہے۔ وردھا سارتھ لفظ کے لفظی معنی ایک بزرگ تاجر ہوسکتا ہے۔ اس سے مراد ایک تجربہ کار تاجر بھی ہوسکتی ہے۔ (جنوبی ہندوستان کے دستاویز کے وددو یاوہاری لفظ سے موازنہ کریں)۔ گجرات اور راجستھان سے حاصل عہد وسطیٰ کے کتبات سے تاجروں کے ذریعہ مذہبی اور ثقافتی مراکز کو دیئے جانے والے کثیر امدادی نذرانوں کے حوالے ملتے ہیں۔ راجستھان سے حاصل شدہ ابتدائی عہد وسطیٰ کے کتبات کے عمیق مطالعات متعدد مقامی تاجروں کے خاندانوں کی اہمیت میں اضافہ پر زور دیتے ہیں، مثلاً دھوسر دھرکٹ، ایسوال/ اوئیسوال (بعد میں اوسوال)، شری مالی اور پراگوت۔ امداد دینے والے تاجر اکثر! امداد دیتے وقت اپنی خاندانی شجرہ پر زور دیتے تھے، وہ اس بات پر اس لئے زور دیتے تھے کہ وہ تشہیر چاہتے تھے کہ وہ (عزت دار، صاحب حیثیت) طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، نئے دولت مند نہیں ہیں۔ 1000 عیسوی کے بعد گجرات سے حاصل کتبات میں ایک خاص قسم کے تاجر نمودار ہونے لگے۔ ان کو نووٹک کہا جاتا تھا، جو اس سے قبل کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ یہ ایک ایسے تاجر کی نشاندہی کرتا ہے جو اپنی دولت (وت) جہازوں (ناؤ) سے کماتا تھا، دوسرے الفاظ میں یہ ایک جہاز کے مالک تجارت کرنے والے کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی لفظ کا فارسی/عربی لفظ ناخدا ہے یعنی ناؤ (جہاز) کا خدا یا مالک یہ دو لفظوں ناؤ اور خدا کی مختصر شکلیں ہیں جو ساحلی گجرات کے کتبات میں اکثریت سے نظر آتے ہیں۔ گجرات کے کچھ لکھ پتی تاجروں، جیسے وستوپال اور جگدیو، نے جہاز رانی کی تجارت میں پیسہ لگایا، حالانکہ وہ بنیادی طور پر جہازوں کے مالک نہیں تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ نووتک اور ناخدا بہت دولت مند تھے۔

دھاتی نقدی کا اجراء

تاجروں، بازاروں، ضروری اشیاء، بندرگاہوں اور آمدورفت کے راستوں سے متعلق مندرجہ بالا اعداد وشمار اور بحث ومباحثہ ابتدائی عہد وسطیٰ کے شمالی ہندوستان میں لمبی دوری کی تجارت سمیت تجارت کے زوال کی تصویر پیش نہیں کرتے ہیں۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں دھاتوں کے سکوں کی شکل میں زرمبادلہ کی قلت کے مسئلہ پر یہاں غور کرنا منطقی بات ہوگی۔ شمالی ہندوستان، خاص طور سے، بنگال میں کوڑیوں کا وسیع پیمانے پر استعمال، اس بات کی لازمی طور پر نشاندہی نہیں کہ یہ ایک محدود اقتصادی دائرے میں ہی لین دین کی دلیل تھی۔ کوڑیاں مقامی طور سے دستیاب نہیں تھیں۔ 12 ویں، 13 ویں، اور

16 ویں صدی کے عرب سرگزشتوں اور ما۔ ہوآن کے تذکروں (ابتدائی سولہویں صدی) سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوڑیاں دور دراز مالدیپ سے بنگال تک پہنچتی تھی۔ یہ ان جہازوں میں لاد کر بنگال لائی جاتی تھیں جو مالدیپ کو چاول برآمد کرتے تھے۔ کوڑیاں اسی وجہ سے لمبی دوری کی تجارت میں روکاوٹ نہیں ہوسکتی تھیں کیونکہ بحر ہند میں سمندری تجارت کے ساتھ یہ اچھی طرح گھل مل گئیں تھیں۔ کوڑیاں تھوک اشیاء کی شکل میں اچھی طرح گھل ملی گئیں تھیں۔ کوڑیاں تھوک اشیاء کی شکل میں جہازوں میں لائی اور لے جائی جاتی تھیں اور بحر ہند کی ساحلی معیشت میں چھوٹے زرمبادلہ کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔

حالانکہ بنگال کے پال خاندان اور سین خاندان کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے سکے جاری کیئے یا نہیں۔ لیکن یہ بہر حال بنگال میں سکوں کی ڈھلائی نہ ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔ سابقہ تین دہائیوں سے مسلسل تحقیقات واضح طور سے ظاہر کرتی ہیں کہ آٹھویں سے لے کر تیرھویں صدی تک بنگال کے جنوب مشرقی حصوں (سماٹاٹا۔ ہری کیلا زون) میں عمدہ چاندی کے سکے لگاتار جاری کیئے جاتے رہے تھے۔ اس بات کی مزید باریکی سے جانچ کی ضرورت ہے۔ قدیم بنگال میں رائج سونے کے سکے ساتویں صدی کے ابتدائی نصف کے بعد کی ہی نہیں مانے جاسکتے ہیں۔ یہ معیاری سونے کے سکے، گپتا دور کے سونے کے سکوں کی نقل تھے۔ لیکن اس میں بہت زیادہ ملاوٹ تھی۔ لیکن آٹھویں صدی کے بعد عمدہ چاندی کے سکے ڈھلنے لگے، جو عام طور سے 8 گرام وزن کے ہوتے تھے۔ ان سکوں کے چت پر آرام کی حالت میں بیل کی تصویر ہے اور ہری کیلا نقش ہوتا تھا، لیکن پٹ حصہ پر ایک تین حصوں میں منقسم علامت ہوتی تھی۔ جاری کرنے والی کسی سیاسی حکومت کا کوئی نام ان سکوں پر نہیں تھا، ان پر صرف خطہ کا نام ہوتا تھا۔ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ ہری کیلا علاقہ بنگلہ دیش کا نواکھالی۔ چٹا گانگ خطہ تھا، جو میگھنا ندی کے مشرق میں واقع تھا۔ ایک اقتصادی خطہ کی حیثیت سے ہری کیلا کی اہمیت کا بیان پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ ان سکوں کی اس خطہ سے ملحقہ اراکان کے چندر حکمرانوں کے ذریعہ جاری کیئے گئے، اسی طرح کے چاندی کے سکوں سے کچھ مشابہت ہے۔ ہری کیلا لفظ کی تحریر کا علم قدیم خط شناسی (Palaeography) کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سکے آٹھویں صدی کے تھے۔ کم وبیش اسی زمانہ میں چت حصہ پر پٹی کودہ لفظ تحریر شدہ ہے اسی طرح کے چاندی کے سکے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ پٹی کودا، ہری کیلا کی ہی طرح، ایک مخصوص مقام کا حوالہ دیتا ہے جو پٹیکارا، کومیلہ ضلع، بنگلہ دیش سے تعلق رکھتا ہے۔ پٹی کودا کے چاندی کے سکوں پر ہری کیلا چاندی کے سکوں کی ڈھلائی کی روایت کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ عمدہ قسم کے چاندی کے سکے (جن میں چاندی کا تناسب 90% تک ہوتا تھا) آٹھویں صدی کے بعد بھی ہری کیلا میں ڈھالے جاتے رہے، لیکن کچھ مخصوص تبدیلیوں کے ساتھ۔ سکوں کے نقش اور علامت صرف ایک طرف تھے، دوسرا حصہ پوری طرح خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔ چت حصہ میں لیٹے ہوئے بیل کی شبیہ، تین حصوں میں منقسم شناختی علامت اور ہری کیلا نقش دکھائی دیتا ہے۔ سکہ کے نقش ہری کیلا کو، بعد میں چاندی کے سکوں میں (Paleographically) قدیم علم خط شناسی کے طور پر بارہویں / تیرہویں صدی کے دور کا مانا گیا ہے لہٰذا بعد کے ہری کیلا کے چاندی کے سکے نویں سے بارہویں/ تیرہویں صدی تک رائج رہے۔ سب سے اہم تبدیلی، بہر حال، ان کے نظام میزان میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ سکے دو مختلف معیاری اوزان میں ڈھالے جاتے تھے۔ پہلا معیاری وزن 2.3800 سے 3.3600 گرام کے درمیان ہوتا تھا؛ دوسری طرح کا معیاری وزن 0.8392 سے 1.9912 گرام کے درمیان ہوتا تھا۔ یہ دونوں ہی اقسام ہری کیلا کے ابتدائی سکوں کے سلسلہ کے مقابلہ میں ہلکے تھے، جو 8 گرام وزن کے آس پاس کے تھے۔ ہلکے سکے 3.73 گرام والے مشہور ہندوستانی کرشپن میعار (32 رتی یا 57.6 گرین) کے برابر ہی تھے۔ یہ بعد میں ہری کیلا چاندی کے سکے پال۔ سین کتبات میں نظر آنے والے زرمبادلہ یا سکوں کی اصطلاحات، جیسے، پورن، درم، دھرن وغیرہ سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف، بعد کے ہری کیلا کے چاندی کے سکے دسویں صدی کے بعد کی ترمیم شدہ عربی درہم، سونے کی گنی کے ساتھ، ان کی واضح یکسانیت تھی۔ بینامتی (کومیلہ ضلع، بنگلہ دیش) میں ہوئی کھدائی سے آخری عباسی خلیفہ، المعتصم باللہ (1258-1247 عیسوی) کا ایک سونے کا سکہ (1258) حاصل ہوا ہے۔ ہری کیلا سکے، چونکہ پال۔ سین کتبات میں واضح طور سے نمایاں ہیں، انہیں آسانی سے لین دین کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا یا کوڑیوں میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ جنوب۔ مشرقی بنگال کا زرمبادلہ کا پس منظر، سمندر نامی بندرگاہ کے متحرک تجارت سے متعلق معلومات سے اچھی طرح مطابقت رکھتا تھا۔ مندرجہ بالا بیان اس نظریہ کی نفی کرتا ہے کہ ابتدائی عہد وسطی میں کم قیمت کے سکے رائج العمل تھے اور اسی کے سبب تجارت کا تیزی سے زوال ہوا۔ مندرجہ بالا جائزہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ زمینی امداد اور سکوں کی ڈھلائی کا کام ابتدائی عہد وسطی کے ہندوستان میں کسی مخصوص خطہ میں باہمی طور سے غیر موافق نہیں تھا۔

یہ بات خصوصیت کی حامل ہے کہ شمالی ہندوستان، خاص طور سے گنگا۔ جمنا دوآبہ خطہ میں، جہاں گیارہویں صدی کی ابتداء تک گورجر۔ پرتیھاروں کا غلبہ تھا، کئی

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE • MANUU
IMC
LIBRARY
Hyderabad-32

ابتدائی عہد وسطیٰ کے سکوں کے ذخیرے (Coin-hoards) ملتے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ''تقریباً 1000-600 عیسوی کے شمالی ہندوستان میں رائج سکوں کے حجم کا کشان دور، سلطنت اور مغل دور کے سکوں کے حجم سے موازنہ کیا جاسکتا ہے اور ظاہری طور سے گپتا دور سے قبل اور راجپوت دور کے بعد کے سکوں کے مقابلے میں اعلیٰ معیار کے تھے۔'' گورجر۔ پرتیہار ریاست (آٹھویں صدی کے ابتدائی نصف سے دسویں صدی کے ابتدائی نصف تک) میں زرمبادلہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لہٰذا نا تو، پال خاندان اور سین خاندان کے غلبہ والے شمالی ہندوستان میں، نا ہی گورجر پرتیہار دورِ حکومت میں، اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کوئی جائز بنیاد ہے کہ ابتدائی عہد وسطیٰ میں شمالی ہندوستان میں خصوصاً 1000-600 عیسوی میں، کوئی ''زرمبادلہ کی قلت'' اور تجارت میں گراوٹ دیکھی گئی۔

شہروں کی ترقی

ابتدائی عہد وسطیٰ کی تجارت اور اقتصادیات کسی قسم کے بحران اور مروجہ سکوں کی تعداد میں تیز گراوٹ کو اگر ثابت کرنا مشکل ہے تو یہ تجزیہ کرنا بھی اتنا ہی مشکل ہوگا کہ کیا شمالی ہندوستان میں وسیع پیمانے پر شہروں کے زوال کا مشاہدہ کیا گیا؟ گپتا دور کے بعد کے شہری مراکز کے مطالعہ میں ایک خاص رکاوٹ آثارِ قدیمہ کے وسائل کی کمی ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے مقامات کی دریافت اور کھدائی پر بہت کم دھیان دیا گیا ہے، کیونکہ خاص دھیان ابتدائی تاریخی شہری مراکز پر ہی ہے۔ ہیون سانگ کی سفری سرگزشتیں، ویشالی، پاٹلی پتر، کوسی نگر، شراوستی اور کوسمبی جیسے شہرون کے زوال پذیر حالات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں اور نیپال کے نشیبی علاقہ میں زمینی راستوں سے جڑے ہوئے ان شہروں نے ہی غالباً زوال کا مشاہدہ کیا۔ لیکن یہ امر پھر بھی سبھی اہم شہری مراکز کے کسی وسیع پیمانے پر ہوئے زوال کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ ابتدائی تاریخی دور کے بعض شہر 600 عیسوی کے بعد بھی قائم رہے، جیسا کہ دستیاب آثارِ قدیمہ کے وسائل سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اہی چھتر (بریلی ضلع، اترپردیش)، جو ابتدائی تاریخی دور میں وجود میں آیا، ابتدائی عہد وسطیٰ کے دوران پیشہ وارانہ صنعتوں کا ایک لامحدود سلسلہ پیش کرتا ہے۔ دہلی کے پرانے قلعہ علاقہ میں بھی کوئی خاص ویرانی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ جو کشان اور ترک دورِ حکومت کے درمیان بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔ گپتا دور کے بعد کے آثارِ قدیمہ کے باقیات ابتدائی تاریخی دور کے ایک صفِ اول کے شہری مرکز اترنجی کھیڑہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح، وارانسی کے نزدیک راجگھاٹ میں ہوئی کھدائی مہم میں 700-300 عیسوی اور 1200-700 عیسوی کے دوران اس شہری مرکز میں مستقل طور پر تجارت جاری رہنے کا واضح مشاہدہ ہوتا ہے۔ اہار میں واقع آثارِ قدیمہ باقیات نویں اور بارہویں صدی کے وسط کے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ اس دوران وہاں کسی شہری مرکز کی موجودگی تھی۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کے کتبات میں پورپٹن اور نگر کا مسلسل تذکرہ بھی شہری روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ میں شمالی ہندوستان میں کچھ نئے شہری مراکز بھی ظہور میں آئے۔ 867 عیسوی اور 906 عیسوی کے وسط میں قائم دس کتبات تٹانند پور کا تذکرہ ترقی یافتہ شہر کے روپ میں کرتے ہیں۔ اس کو ایک بندرگاہ کی حیثیت سے بھی جانا جاتا تھا جو اسے گرام یا پالی جیسی دیہی بستیوں کے مقابلے میں ایک واضح امتیازی درجہ دلاتا ہے۔ اس کی نہایت ترقی یافتہ امتیازی خصوصیت اس کی چھوٹی اور تنگ گلیوں (کراتھیا)، چوڑی سڑکوں (برھا دراتھیا) اور ہاٹ مارگوں (بازاری مراکز کی طرف لے جانے والے راستہ) کے حوالوں سے ظاہر ہے۔ پٹن میں اواری یا دوکانیں اور گرہ یار ہائشی ڈھانچے بھی ہوتے تھے۔ یہ واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک واری یا دوکان میں پکی اینٹ سے بنے تین کمرے ہوا کرتے تھے۔ پکی اینٹیں گرہ یار ہائشی مکانوں کے تعمیر کے لئے بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ تٹانند پور (آہار) کے شہری مرکز کا متاثر کن سائز لاجواب ہے کیونکہ یہ 3800 ایکڑ خطہ میں پھیلا ہوا ہے۔ سیادونی، جس کا ذکر ہم منڈاپیکاؤں کے حوالے سے کر چکے ہیں اپار سرک (ڈیوڑھی یا بیٹھک والا گھر)، آوسنک (رہائش گاہ) اور گرہ بھٹی (مکان) پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں، سیادونی میں کئی ہاٹ (بازار) تھے۔ ایک دوسرا شہر گوالیار میں واقع تھا جس کا نام گوپا گیری یا گوپادری تھا۔ کوٹاپال (محل یا قلعہ کا سربراہ) اور بل آدھیکرت (سپہ سالار) جیسے اہم شاہی اہل کاروں کی موجودگی کا تذکرہ تحریری دستاویزوں میں ملتا ہے اسی طرح گوپادری میں شرشٹھی اور سرتھاواہ بھی متحرک تھے۔ ان میں سے کئی پیشوں میں ہمیں دستکاروں کے متحرک کردار کا بھی پتہ چلتا ہے: تیلی (تیلکا)، مالی (مالاکار) اور شراب ساز (کلاپال)۔ ان مراکز میں خاص مذہبی زیارتی مقامات ہوا کرتے تھے جہاں مختلف سمتوں سے آنے والے تاجر، انتظامیہ کے اہل کار اور دستکار و مذہبی شخصیات کا اجتماع ہوتا تھا۔ اس طرح ان مراکز میں اکثر: معاشی، سیاسی اور ثقافتی تقریبات کا ایک ساتھ انعقاد ہوا کرتا تھا۔ جو شہری مراکز کی حیثیت سے ان کی قابل ذکر پیچیدگیوں کو پیش کرتی تھیں۔ ہم پہلے بھی

تذکرہ کر چکے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں کچھ منڈاپیکاؤں نے کس طرح شہری شکل اختیار کرلی۔ کسی گاؤں سے نکلے ندولہ کا شہر میں تبدیل ہوجانا اور پھر آخر کار: مقامی چھمنا حکمرانوں کے سیاسی مرکز کے روپ میں اس کے عروج پر پہلے ہی بحث ہو چکی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندولہ کو ایک شہری مرکز کی شکل دینے میں تجارت کا ایک اہم رول تھا۔ شمالی ہندوستان میں، مہااستھان گڈھ کے آثار قدیمہ کے باقیات سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائی تاریخی شہر پندر نگر ابتدائی عہد وسطیٰ میں اپنے شہری روایتی کردار میں کسی قسم کے عدم استحکام کی نشاندہی نہیں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، ابتدائی عہد وسطیٰ کے بنگال میں متعدد شہر بھی وجود میں آئے مثلاً رام پال کے نام پر رام وتی، جس کی شناخت اماٹی کے آثار قدیمہ کے مقام سے کی جاتی ہے۔ لکھنوی شہر، جس کا ذکر منہاج السراج کے ذریعہ کیا گیا ہے، گوڑ میں واقع تھا اور لکشمن سین جو بارہویں صدی کے اواخر میں بنگال کا سین خاندان کا راجہ تھا، نے اپنے نام پر قائم کیا۔ ظاہری طور پر یہ اعداد وشمار شمالی ہندوستان میں، خاص طور سے 1000-600 عیسوی کے دوران، وسیع پیانے پر شہری آبادکاری کی نفی نہیں کرتے ہیں۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کے شہری مراکز پر تفصیلی بیانات کے تجزیات کے علاوہ ایک نقطہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ شہروں کے زوال کے تصور کے پیچھے اہم عناصر 500 عیسوی کے بعد لمبی دوری کی تجارت میں سرد بازاری معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستانی جاگیرداری کی تشکیل سے متعلق تاریخ نگاری یہ بھی دلیل پیش کرتی ہے کہ 1000 عیسوی کے بعد شمالی ہندوستان میں شہری احیاء کا آغاز ہوا۔ اس بات کی طرف واضح طور سے اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ عرب تجارت کے بڑھنے سے 1000 عیسوی کے بعد شہری آبادکاری کے پھیلاؤ کو حمایت ملی۔ دوسرے الفاظ میں، ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے شہری مراکز کی ترقی اور زوال کی وضاحت، اس نقطہ نظر کے مطابق، ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کو مدنظر رکھتے ہوئے کی جاتی ہے۔ بالالفاظ دیگر، اس کی وضاحت کے لئے باہری محرکات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ابتدائی عہد وسطیٰ میں میں شہری آبادکاری کے آغاز کو لوہے کی تکنیک اور اس کے نتیجہ میں زراعت کی فاضل پیداوار کی دستیابی میں تلاش کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اقتصادیات اور غیر ملکی تجارت کو ابتدائی تاریخی زمانہ میں، شہری مراکز کے آغاز اور پھیلاؤ کے اہم اسباب کی شکل میں پیش نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن ان ہی شہروں کے زوال کی وضاحت تجارت میں سرد بازاری کے طور پر کی جاتی ہے۔ اگر زراعت کی ترقی کو شہر کی تشکیل کے لئے سازگار تسلیم کرلیا جائے تو ابتدائی عہد وسطیٰ بھی منطقی طور پر اس میں کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔ دانشوروں کے درمیان ایک عام اتفاق یہ ہے کہ ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بے مثال زرعی پھیلاؤ دکھائی دیا۔ اس سے فاضل زرعی پیداوار کی دستیابی اور اس کو حاصل کرنے میں مدد ملی ہوگی جو ابتدائی عہد وسطیٰ کے ہندوستانی شہری کی تشکیل کے لئے اہم بنیادی ضرورت تھی۔ گیارہویں صدی کے آخری نصف اور بارہویں صدی کی ابتدائی نصف کے مشہور جین مصنف ہیم چندر کے مطابق گاؤں اکثر شہروں کے مشابہ ہی ہوتے تھے (گرام پچ پوراسنھا)۔ اس حوالہ سے ایک مخصوص مثال راجستھان کا نودلہ گاؤں ہوسکتا ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے کچھ گاؤں یا تو رقبہ کے اعتبار سے اتنے بڑے ہوگئے کہ وہ شہری نوعیت کے مانے جانے لگے، یا پھر زراعت کے پھیلاؤ نے کچھ گاؤں میں آبادی کے ایک مرکز پر جمع ہونے کا راستہ ہموار کیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کے کردار کی نوعیت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ جیسا کہ دانشوروں نے مشاہدہ کیا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ متعدد ابتدائی عہد وسطیٰ کے شہری مراکز اپنی اپنی مقامی یا علاقائی بنیادوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوئے تھے۔ دوسری جانب، ابتدائی تاریخی دور کے شہر خاص طور سے وسطی گنگا کے میدانوں کے شہروں کی طرز پر ارتقاء پذیر ہوئے۔ وسطی گنگا کے میدانوں نے ابتدائی تاریخی شہری آبادکاری کے لئے ایک مثالی مرکز (epicentre) کا کردار ادا کیا۔ ابتدائی عہد وسطیٰ کے شہروں کا ایسا کوئی مثالی مرکز نہیں تھا۔ اس سے انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوئی یہی وجہ ہے کہ ابتدائی عہد وسطیٰ کے شہروں کے بارے میں کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان میں شہری آبادکاری کے تیسرے مرحلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

14.5 خلاصہ

یہ دور، رومن (تقریباً 250 عیسوی) اور کشان سلطنتوں (تقریباً 262 عیسوی) کے زوال کی آمد کی خبر دیتا ہوا، ہندوستان کی لمبی دوری کی پھلتی پھولتی تجارت کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں تاجر سماج نے متحرک طور پر اپنا کام جاری رکھا اور ان کے طبقات (پیشہ ورانہ انجمنیں) بھی پھلی پھولی۔ سارتھاواہ اور نگر شریشٹھی کا تذکرہ کتبات میں کثرت سے ملتا ہے۔ بازاروں سے متعلق معلومات کے بارے میں ثبوتوں کی افراط ہے۔ جزیرہ نما ملایا اور جنوبی چین کے سمندر کے ساتھ سمندری روابط مستقل طور سے جاری رہے۔ گپتا دور میں عمدہ سونے اور چاندی کے سکوں کی ڈھلائی سے بھی اس دور میں پھلتی پھولتی معیشت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس دور میں مستقل شہری ارتقاء بھی دیکھا گیا۔

دانشوروں کے درمیان اس بات پر ایک لمبی بحث چلی کہ گپتا اور گپتا دور کے بعد شہروں کا زوال ہوا تھا یا ان کی ترقی میں اضافہ ہوا تھا؟ شہروں کے زوال کے نظریہ کے حامیوں کی دلیل ہے کہ روم سلطنت کے ساتھ ہی تجارت میں گراوٹ، اور ہنوں کے حملوں نے ہندوستان میں تجارتی سرگرمیوں پر برے اثرات مرتب کیے۔ اس دور میں شہری مراکز کا زوال تیزی سے ہوا تجارت میں بھی گراوٹ آئی، دھاتوں کے سکے (سونا اور چاندی) کی شکل میں زرمبادلہ بھی تقریباً نادر تھا۔ اس کی جگہ پر کوڑیوں کا استعمال بڑھا جو لمبی دوری کی تجارت کے زوال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لمبی دوری کی تجارت میں ایک زبردست گراوٹ دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بجائے زمینی امداد کئی گناہ بڑھ گئیں۔ تجارتی سرگرمیوں کے کم ہونے سے خود کفیل دیہی معیشت کا راستہ ہموار ہوا جس نے آخر کار ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کے عروج کے لیے سازگار حالات پیدا کر دیے۔

لیکن جو لوگ مندرجہ بالا بیان سے اتفاق نہیں رکھتے وہ بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ پیش کردہ تصویر کافی دھندلی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ نا تو بازاری مقامات پوری طرح او جھل ہوئے اور نہ ہی شمالی ہندوستان میں تجارت میں کوئی گراوٹ درج ہوئی۔ اس کے بجائے اسلام کے عروج سے اس خطہ میں متحرک اقتصادی سرگرمیوں کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ بنگال نے تجارت اور اقتصادیات میں اپنی بالادستی کو قائم رکھا۔ وانک، سارتھا واہ اور شریشٹھی کے حوالے مسلسل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دلیل کہ دھاتوں کے سکوں کی شکل میں زرمبادلہ کی بے حد قلت تھی، بہر حال، اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے کہ تجارتی سرگرمیوں میں گراوٹ آ گئی تھی، کیونکہ کوڑیاں جو بڑی تعداد میں بنگال میں تجارت کے لیے استعمال کی جاتی تھیں، خود بنگال کی پیداوار نہیں تھیں بلکہ دور دراز مالدیپ سے بنگال میں لائی جاتی تھیں۔ اس دور میں ہری کیلا کی حیثیت اقتصادی سرگرمیوں کے میدان میں مسلسل سب سے اعلیٰ مقام رکھتی تھی۔ ہمیں اس مقام پر ڈھلے ہوئے کافی تعداد میں عمدہ چاندی کے سکے ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ سکوں کے ذخیروں (Coin hoards) میں، جس میں گورجر، پرتیہاروں کے سکوں کا غلبہ تھا، بھی شمالی ہندوستان میں رائج سکوں کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ مزید یہ کہ اس دور میں شہری مراکز کی نشوونما بھی مسلسل بلا کسی رکاوٹ کے جاری رہی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پرانے مراکز کے زوال کی علامات دکھائی دیتی ہے لیکن ان کے مقام پر نئے مراکز بھی ابھر کر سامنے آئے۔ اس دور میں بے مثال زرعی پھیلاؤ ہوا۔

14.6 فرہنگ

عباسی خلافت: 750 عیسوی میں امیہ خلفاء کے مقام پر عباسی آئے۔ 762 عیسوی میں وہ اپنی راجدھانی سیریا میں دمشق سے ہٹا کر عراق کے نئے شہر بغداد لے گئے۔ عباسیوں نے پورے مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ پر 750 عیسوی سے لے کر تقریباً 1000 عیسوی، یعنی جب وہ کمزور پڑنا شروع ہو گئے، تک حکومت کی۔ سب سے پہلے شمالی افریقہ ان سے الگ ہوا اور فاطمیوں کے زیر قیادت ایک آزاد ریاست بن گیا۔ 1258 عیسوی میں عباسی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

الباہلمن اراکان: اراکان شمال میں ہندوستان، مشرق میں برما اور مغرب میں بنگلہ دیش سے گھرا ہوا ہے۔ اراکان روما (رخینگ روما) نامی پہاڑی سلسلہ، برما اور اراکان کے باشندوں کے درمیان رکاوٹ کا کام کرتا ہے۔ یہ جنوب مغرب میں خلیج بنگال سے گھرا ہوا ہے۔ اراکان آجکل برما یونین کے ماتحت ہے۔

فاطمی خلافت: فاطمیوں نے شمالی افریقہ، مصر اور فلسطین پر دسویں سے بارہویں صدی عیسوی تک حکومت کی۔ فاطمی، حضرت محمدؐ کی صاحبزادی اور چوتھے خلیفہ و پہلے شیعہ امام حضرت علیؓ کی شریک حیات حضرت فاطمہؓ کے خاندان سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ فاطمیوں کا پہلا مقصد تھا بغداد کے عباسی خلیفہ کو ہٹا کر اپنے خلیفہ کی تاج پوشی کرنا۔ خلیفہ عبیداللہ نے بغداد کے سنی خلیفہ کے خلاف 909 عیسوی میں قاہرہ کے مقام پر خود کو خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ انھوں نے خلیج فارس سے ہو کر جانے والے سابقہ راستہ کے بجائے ایشیاء جانے کے لیے بحر احمر سے ہو کر جانے والے ایک نئے راستہ کی بنیاد رکھی۔

گورجر۔ پرتیہار

اس خاندان کا قیام آٹھویں صدی میں ناگ بھٹ اول کے ذریعہ ہوا۔ یہ ریاست یا سلطنت اپنے عروج پر راجہ بھوج (90-836) اور مہیندر پال (910-890) کے دور حکومت میں پہنچی۔ اس کی راجدھانی قنوج تھی۔ یہ خاندان 10ویں صدی میں راشٹر کوٹوں کے مسلسل حملوں کے سبب کمزور ہوگیا اور اس کی طاقت پوری طرح ختم ہوگئی جب 1018 عیسوی میں غزنی کے حکمراں محمد غزنوی نے قنوج کو لوٹا۔

ہون

یہ مرکزی ایشیاء کے خانہ بدوش اور چرواہے لوگ تھے۔ یہ ظاہری طور سے منگولیائی معلوم ہوتے تھے۔ اپنی تیز رفتار گھوڑوں کی طاقت کے ذریعہ انھوں نے فوجی بالا دستی حاصل کرلی تھی۔ ہون تاریخ میں تیسری صدی قبل مسیح میں ظاہر ہوتے ہیں جب انہیں چین سے باہر رکھنے کے لئے چین کی عظیم دیوار بنائی گئی تھی۔ ہون سلطنت جدید ھنگری میں مرکزی طور سے قائم تھی۔ ایٹلا ان کا سب سے طاقتور راجہ تھا (453-434)۔ ہونوں کی حکومت بحرِ اسود (Black sea) کے شمالی رائین سے لے کر دور دراز بحر کیپیین تک پھیلی ہوئی تھی۔ گپتا خاندان بھی 480 عیسوی میں ہونوں کے حملوں کا شکار ہوا۔ وہ 30 سالوں تک چھوٹی سے مدت میں تورمان کی قیادت میں 500 عیسوی کے آس پاس مالوا میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بیٹے اور جانشین میہیرکولا نے شمالی ہندوستان کو فتح کیا لیکن جلد ہی یشودھرمن کے ذریعہ انہیں کشمیر کی طرف کھدیڑ دیا گیا جہاں 542 عیسوی میں اس کی وفات ہوئی۔

جزیرہ نما ملایا

یہ وہ خطہ ہے جو آجکل جزیرہ نما ملیشیاء اور جنوب۔ مشرقی ایشیاء کے نزدیکی جزائر کا سمندر ہے، اس میں سماترا کا مشرق ساحل، رینو کا ساحل اور ان خطوں کے درمیان آنے والے چھوٹے چھوٹے جزیرے شامل ہیں۔ یہ بحر ہند کے بحر انڈومان اور مغرب میں ملکا کی ابتداء اور تھائی لینڈ کی خلیج اور مشرق میں جنوبی چین کے سمندر کے درمیان واقع ہے۔ اس جزیرہ نما کا شمالی حصہ تھائی لینڈ کے ایک حصہ کی تشکیل کرتا ہے۔ جنوبی حصہ میں مغربی ملیشیا اور ملیشیا کا ملاین حصہ شامل ہے۔

لال ظروف

ایک قسم کی مٹی کے برتن جو لال رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان پر رنگ نہیں کیا جاتا بلکہ انکو پکا کر لال کیا جاتا ہے۔ ساحلی گجرات اور عراق کے جنوب مغربی حصہ سے لے کر سندھ ڈیلٹا تک ان کا کافی رواج تھا۔

ساسانی سلطنت (651-226 عیسوی)

انھوں نے آرکا مینڈیز کے ذریعہ حاصل شدہ سرحدوں کے اندر ہی اپنی سلطنت قائم کرلی، جس کی راجدھانی ٹیسیفون Ctesiphon تھی۔ اس خاندان کا قیام بادشاہ اردشیر کے ذریعہ کیا گیا جو پارتھیائی حکمراں کا جاگیردار تھا۔ شاپور اول (272-241) پر حملہ کرکے بری طرح شکست دے کر فتح حاصل کرلی۔ بعد میں اس نے کشانوں پر بھی حملہ کیا اور ان کی راجدھانی پیشاور پر قبضہ کرلیا تھا۔ آخر ساسانی حکمراں یزدگرد III (636-632) تھا۔ عربوں نے ٹیسیفون پر 651 عیسوی میں قبضہ کرلیا اور آخری ساسانی حکمراں کی موت بھگوڑے بادشاہ کی حیثیت سے ہوگئی۔

مغربی شترپ حکمراں

ایک شاکا حکمراں خاندان جس نے مغربی ہندوستان اور مالوہ پر حکومت کی تھی۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad * IMC LIBRARY

14.7 مشقیں

(1) 1300-300 عیسوی کے دوران تجارت اور کاروبار کی ترقی میں کتبات اور سکوں کے رول کا تجزیہ کیجیے۔

(2) ہیون سانگ کی سفری سرگزشت کی روشنی میں 1300-300 عیسوی کے دوران تجارتی سرگرمیوں کا تنقیدی جائزہ لیجیے

(3) شہری زوال کے مسئلہ پر تاریخ دانوں کے درمیان بحث ومباحث کا تذکرہ کیجیے۔ آپ کے مطابق کونسی دلیل قابل قبول ہے اور کیوں ہے؟

14.8 معاون کتب

بساک۔ آر۔ جی (1919)، دی فایوداموڈر پورکوپر پلیٹ انسکرپشنز آف دی گپتا پیریڈ، اپی گرافیا انڈیکا، XV، 45-113۔

چکرورتی، رنبیر (2002)، ''ٹریڈ اینڈ ٹریڈرس ان ارلی انڈین سوسائٹی، نیو دہلی۔

چکرورتی، رنبیر، (2001) ٹریڈ ان ارلی انڈیا، نیو دہلی۔

چندر، ستیش، (1987)، دی انڈین اوشن: ایکسپلوریشن ان ہسٹری، کامرس اینڈ جیوگرافی، نیو دہلی۔

چٹوپادھیائے، بی۔ ڈی (1987) ایسیز ان اینشینٹ انڈین اکنامک ہسٹری، نیو دہلی۔

چٹوپادھیائے، بی۔ ڈی (1994)، دی میکنگ آف ارلی میڈیول انڈیا، نیو دہلی

چودھری، کے۔ این (1985)، ٹریڈ اینڈ سیویلائزیشن ان دی انڈین اوشن فرام دی رائز آف اسلام ٹو 1750، کیمبرج۔

کرٹین، فلپ ڈی، (1984)، کراس کلچرل ٹریڈ ان ورلڈ ہسٹری، کیمبرج۔

ڈیئل، جون ایس، (1990)، ''لیونگ ود اوٹ سلور، مونیٹری ہسٹری آف ارلی میڈیول نارتھ انڈیا، نیو دہلی۔

گھوش، اے، (1989)، این انسائکلوپیڈیا آف انڈین آرکیالوجی، دو جلدوں میں، نیو دہلی۔

گوئٹین، ایس، ڈی۔ (1973)، لیٹرز آف میڈیول جیوش ٹریڈرس، پرنسٹین۔

گوئٹین، ایس، ڈی (1973)، لیٹرز آف میڈیول جیوش ٹریڈرس پرنسٹین۔

گوپال، لالن جی (1965)، دی اکنامک لائف آف نارتھرن انڈیا، AD 700-1200، وارانسی۔

MEDIA CENTRE LIBRARY
Accn No. MA-026
Date 03.08.2015
HYDERABAD

گوپال، لالن جی، (1966)، ارلی میڈیول کوائن ٹائپس ان نارتھ انڈیا، وارانسی۔

ہورانی۔جی۔ایف (1951)، عرب سیفارنگ ان دی انڈین اوشن ڈیورنگ دی اینشیٹ اینڈ میڈیول ٹائمز، بیروت۔

جین، وی کے۔(1989)، ٹریڈ اینڈ ٹریڈرس ان ویسٹرن انڈیا1300-1000، نیو دہلی۔

جھا، اے۔کے، (1991) کوائن ایج، ٹریڈ اینڈ اکونومی، انجانیری۔

جھا، ڈی۔این (1967)، ریونیو سسٹم ان دی پوسٹ۔موریہ اینڈ گپتا ٹائمز، کلکتہ۔

جھا، ڈی۔این (2000)، دی فیوڈل آرڈر، نیو دہلی۔

کوسامبی۔ڈی ڈی۔(1956)، این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری، ممبئی۔

میتی، ایس۔کے، (1957)، اکنامک لائف آف ناردن انڈیا ان گپتا ٹائمز (C. 300-550AD)، کلکتہ۔

مجمدار، بی۔پی۔(1960)، دی سوشیو۔اکنامک ہسٹری آف ناردن انڈیا، کلکتہ

مکھیا، ہربنس (1999)، دی فیوڈل ازم ڈبیٹ، نیو دہلی۔

رے، نہار نجن، بی۔ڈی۔چٹوپادھیائے، رنبیر چکرورتی اینڈ وی۔آر۔منی، (2000)، اے سورس بک آف انڈین سویلائزیشن، حیدرآباد۔

شرما، آر۔ایس۔(1966)، ارلی میڈیول انڈین سوسائٹی، اے اسٹڈی ان فیوڈل ازم، نیو دہلی۔

شرما، آر، ایس (1980)، انڈین فیوڈل ازم، نیو دہلی، دوسرا ایڈیشن۔

شرما، آر۔ایس۔(1983)، پرسپیکٹیو ان دی سوشل اینڈ اکنامک ہسٹری آف ارلی انڈیا، نیو دہلی۔

شرما، آر۔ایس۔(1987)، اربن ڈکے ان انڈیا AD 300-1000، نیو دہلی۔

تھاپر، رومیلا (1993)، انٹرپریٹنگ ارلی انڈیا، نیو دہلی۔

تھاپر، رومیلا، (1995)، ریسینٹ پرسپیکٹیو آف ارلی انڈین ہسٹری، ممبئی۔

یادو، بی۔این۔ایس۔(1974)،سوسائٹی اینڈ کلچران نارتھ انڈیا ان دی ٹویلتھ سینچری، الہ آباد۔

اکائی 15 مبادلہ کے نیٹ ورک، تجارتی تنظیمیں اور شہر کاری: جنوبی ہند

ساخت

15.1 تعارف

15.2 بازار کے مراکز، تجارت کا نیٹ ورک اور سفری تجارت

15.3 مقامی ترقیات

15.3.1 دکن۔کرناٹک

15.3.2 کوکن ساحلی تجارت اور سمندری سفر

15.3.3 آندھرا کا خطہ

15.3.4 کیرلا

15.3.5 تامل خطہ

15.4 جنوبی ہند کی تجارتی تنظیمیں

15.5 جنوبی ہند میں بنکر، کپڑے کی پیداوار اور تجارت

15.6 خلاصہ

15.7 فرہنگ

15.8 مشقیں

15.9 معاون کتب

15.1 تعارف

زرعی اصلاحات کے پھیلاؤ کے ابتدائی مرحلہ (چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی) میں جنوب ہند کی ابتدائی عہد وسطیٰ کی معیشت واضح طور پر زراعت پر مبنی تھی۔ اس بات کی نشاندہی ہم پہلے بھی کر چکے ہیں کہ ایسا زمینی امداد کے عمل کی وجہ سے ممکن ہوا جس میں برہمدیا اور مندر دونوں متحد کرنے والی اہم طاقتوں کی حیثیت رکھتے تھے اور دیہی تنظیم کی بنیاد تھے۔ (موجودہ بلاک کی 13 ویں اکائی دیکھئے) ساتھ ہی بڑھتی ہوئی تجارتی سرگرمیوں میں کچھ برہمدیا اور مندر والے تجارتی مراکز کا رول مزید بڑھ گیا جب اس میں تجارت، دستکاری اور اقتصادی سرگرمیوں کو شامل کرلیا گیا اور ان نئے ابھرتے ہوئے معاشی گروپوں نے شہروں میں بھی اپنا ایک مقام بنالیا۔ سیاسی یا انتظامی مراکز نے بھی شہری سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا اور ایک ایسی آبادی کو اپنی طرف متوجہ کیا جو صنعتی اشیاء کے استعمال کرنے والے بھی تھے اور پیسہ کا استعمال کرنے والے بھی تھے یعنی سکے یا زر مبادلہ۔ یہ سکے حکومتوں کے ذریعہ جاری کیے جاتے تھے اور ممکنہ طور پر تاجروں کی پیشہ وارانہ، انجمنوں کے لئے رائج الوقت سکہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن کتبات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔ جنوبی ہند کے علاقوں کی یہ دوسری شہری آبادکاری تھی۔

اس مرحلہ میں ہم جس شہری آبادکاری کا ذکر کررہے ہیں وہ ایک مختلف نوعیت کی حامل ہے۔ اور اسے خود ساختہ شہری آبادکاری (Sui generis) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زرعی اصلاحات کی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہی اس نے نشو ونما پائی (دیکھئے موجودہ بلاک کی اکائی نمبر 13)۔ چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی یعنی ابتدائی عہد وسطیٰ کے پہلے مرحلہ میں اس کا ارتقاء ہوا۔ یہ عمل جو پورے جزیرہ نما میں پھیل گیا تھا لیکن جنوب ہند کے تمام خطوں میں اس کا پھیلاؤ یکساں نہیں تھا۔ دکن یعنی کرناٹک اور آندھرا کے علاقے زرعی اصلاحات کی تنظیم کے اعتبار سے بالکل الگ تھے۔ حالانکہ وہاں بھی زمینی امداد کا نظام کافی وسیع علاقہ میں ایک اصلاحاتی تنظیم کے پھیلاؤ کا اہم ذریعہ ثابت ہوا۔ کرشنا ندی اور گوداوری ندی کے پٹھاری خطوں اور اندرونی دریائی وادیوں کے کچھ علاقوں کو

MEDIA CENTRE * IMC LIBRARY * Hyderabad

چھوڑ دیں تو ان علاقوں میں سلسلہ وار میدان نہیں تھے۔ زرعی سرگرمیاں زیادہ وسیع پیمانے پر صرف پٹھاری خطوں میں ہوا کرتی تھیں جبکہ پلیٹو کے بڑے حصوں اور پہاڑی علاقے چرواہا گیری اور/ یا زرعی چرواہا گیری اور شکاری سرگرمیوں پر منحصر تھے۔

تامل خطہ میں ابتدائی عہد وسطیٰ کی شہری آبادکاری کو ہم دوسری شہری آبادکاری کہہ سکتے ہیں جو زرعی پھیلاؤ اور ناڈو جیسی چھوٹی علاقائی کسانوں کی تنظیم کے ذریعہ کی گئی تھی۔ یہ شہری مراکز کے نئے تانے بانے کے درمیان ایک دانشمندانہ تبدیلی کے سلسلہ کی نمائندگی کرتے ہوئے آٹھویں سے بارہویں صدی کے درمیان ظاہر ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے زرعی اصلاحات کے لئے ایک بنیاد فراہم کی اور بڑی مقدار میں فاضل پیداوار کی دستیابی سے تجارت کو چنوتی دی۔ اس طرح کے بازار کے مراکز کا دوسری زیادہ بڑی تجارتی تنظیموں کی تحریک جیسے ایاوولے کے ساتھ مل جانے سے شہری مراکز، اندرونی مقامی تجارتی نظاموں اور نظام ترسیل کا ظہور ہوا۔ (تفصیل کے لئے ہمارے کورس EHI-03 کے بلاک نمبر 1 کی اکائی نمبر 4 دیکھئے)۔ ماحولیاتی اور ثقافتی اختلافات کی وجہ سے شہری مراکز کی نوعیت، درجہ بندی اور نظام مراتب میں بھی کچھ مخصوص قسم کی تبدیلی پائی جاتی ہے۔ اس لئے صحیح اور مجموعی پس منظر کو پیش کرنے کے لئے شہری مراکز کا مقامی مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ کچھ علاقوں جیسے راجستھان، مرکزی اور شمالی ہندوستان اور جنوبی ہند میں تامل خطہ سے متعلق اس طرح کے مطالعات دستیاب ہیں۔ کرناٹک اور آندھرا کا جہاں تک تعلق ہے ایسے مطالعات ابھی ابتدائی مراحل میں۔ ہی ہیں مثلاً یہ ابھی تک واضح نہیں ہے کہ تامل ناڈو جیسا علاقہ آباد زرعی یا کسانوں کے خطوں کے طور پر ملک میں باضابطہ شامل تھا یا نہیں اور وہاں ناکھرا یا نگرم جیسے ابتدائی عہد وسطیٰ کے تجارتی مراکز کی شروعات ہو چکی تھی یا نہیں۔

15.2 بازار کے مراکز، تجارت کا نیٹ ورک اور سفری تجارت

ابتدائی عہد وسطیٰ کی شہری آبادکاری میں شہری مراکز کی بڑھوتری اور تال میل میں نسبتاً ایک درمیانہ روی کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ کچھ ایسے بازار کے مراکز اور تجارتی مراکز (میلے۔ سانتا/ سانتائی) بھی موجود تھے جو لین دین کے نظام کے بنیادی تصدیق شدہ مراکز کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ایسے مراکز باہمی لین دین کے معاملات، چھوٹے زرعی داخلی علاقوں اور مقامی اقتصادی داخلی علاقوں کے درمیان اور ہندوستان کی سرحدوں کے باہر مختلف نوعیت رکھتے تھے۔ لیکن ابتدائی تاریخی شہری مراکز کی بہ نسبت ابتدائی عہد وسطیٰ کے شہری مراکز کی جڑیں مقامی معاملات سے زیادہ جڑی ہوئی تھیں۔

خرید وفروخت کی سہولیات اور مقامی مبادلہ کے ارتقاء کی ضرورت کے پیش نظر بازار کے مراکز وجود میں آئے۔ جو ایک مخصوص خطہ کے لئے مبادلے کے مراکز کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کی سب سے اچھی مثال جنوب ہند کے نگرم ہیں۔ ان کے واضح ثبوت تامل ناڈو اور کچھ حد تک کرناٹک (ناکھرا) اور آندھرا کے خطہ (نگرمو) سے ملتے ہیں۔ یہ ناڈو (کے۔ آر۔ ہال 1980) یا کرم، تامل ناڈو میں ایک کاشتکاری خطہ، کے لئے بازار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح کے مراکز کا قیام کافی بڑی تعداد میں حاکم خاندانوں کے ذریعہ وجود میں آیا یا چولا جیسے شاہی خاندانوں نے ان کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے نام حاکموں کے نام پر رکھا جاتا تھا۔ جنوبی ہندوستان کے تمام خطوں میں ایک مشترک خوبی یہ ہے کہ ان کے نام سے پہلے پور یا پٹن جوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن اس طرح کے سبھی نگرم، اقتصادی طور پر یکساں خصوصیت نہیں رکھتے تھے۔ نگرم خاص خاص تجارتی راستوں پر بنائے گئے تھے۔ سفری تاجروں کے ایک جگہ ملنے والے مقامات پر بنائے گئے یہ مراکز اپنے سائز کے اعتبار سے اور تجارت اور اقتصادی پھیلاؤ کے اعتبار سے بھی بڑے بڑے شہروں کی شکل میں ترقی کر گئے اسی طرح وہ تجارت کے ایسے نیٹ ورک کی حیثیت اختیار کر گئے جو اندرونی اور بیرونی مقامی تجارت کے ساتھ ساتھ بیرون ملک تجارت کا بھی وسیلہ بنے۔ جو سفری تجارتی تنظیموں کے ذریعہ کی جاتی تھی اور شاہی بندرگاہوں کے ذریعہ اور شاہی مفادات کے لئے کی جاتی تھی۔ اور اس سے لمبی دوری کی تجارت کو فروغ دینے کی حکمت عملی اپنائی گئی۔ ایسے ترقیاتی عمل کم وبیش پورے جزیرہ نما ہند میں دسویں صدی عیسوی سے یکساں طور پر ظہور میں آئے۔ جب جنوبی ہند کی تجارت کا دائرہ وسیع جنوبی ایشاء کی تجارت تک پھیل گیا۔ جو دسویں صدی عیسوی میں از سر نو شروع ہوگئی تھی۔ جس میں جنوبی ایشیاء کے سبھی ممالک۔ چین اور عرب ممالک بھی شامل ہو گئے۔ دسویں اور بارہویں صدی میں جنوبی ایشیائی تجارت نے ضروری اشیاء کی پیداوار، مبادلہ، شہروں کی ترقی، اندرونی اور ساحلی دونوں طرح کی تجارت کے ارتقاء کو بڑھاوا دیا۔ تامل خطہ کے نگرم نے بندرگاہوں کو سیاسی اور انتظامی مراکز سے جوڑنے کا کام کیا۔ سفری تاجروں کی تحریک نے اسی نیٹ ورک میں ایک اہم رول ادا کیا۔

باہمی مقامی تجارت سے دستکاری کے خاص مراکز کا ارتقاء ہوا۔ کپڑے کی صنعت اور کپڑے بننے کے یہ مراکز بھی تینوں جنوبی ہند کے خطوں ۔ کرناٹک، آندھرا اور تمل ناڈو میں تھے۔ ابتدائی تاریخ کے دور کے کچھ دستکاری اور اقتصادی مراکز ابتدائی عہد وسطیٰ تک برقرار رہے۔ وہ بھی دوسری شہرکاری کے عمل میں شامل ہوگئے اور نئے دور کے سماجی معاشی اداروں سے جڑ گئے۔

15.3 مقامی ترقیات

جنوبی ہند میں مختلف سطح پر شہری مراکز کا ارتقاء ہوا۔ حالانکہ ہر مقام پر ان کی کارکردگی اور اہمیت کے اعتبار سے ان کی نوعیت مختلف تھی اور بڑے لین دین کے نیٹ ورک کے ساتھ ان کے تعلقات کے اعتبار سے بھی ان کی حیثیت الگ الگ تھی۔

15.3.1 دکن ۔ کرناٹک

کرناٹک میں نگرم، تجارتی نیٹ ورک کے درمیان مبادلہ کے مراکز کی حیثیت سے زرعی یا کاشتکاری علاقوں میں باقاعدہ بازار کی حیثیت سے مختلف کام انجام دیتے تھے۔ حالانکہ ان سبھی نگرم (نکھر) کی ایک یکساں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان مراکز میں رہنے والے غیر پیداواری شہری/ دستکاری/ تجارتی گروہوں کے لئے ایک بنیادی زرعی اندرونی خطۂ ارض رکھتے تھے۔ یا حاصل کرلیتے تھے۔ (مقامی مندر سے امداد کے ذریعہ) ان بازاروں پر تاجروں کا کنٹرول ہوتا تھا۔ اور پٹن سوامی نامی تاجروں کا سربراہ ان کی سربراہی کرتا تھا۔

کرناٹک میں ساتویں صدی سے بارہویں صدی کے درمیان شہروں میں باقاعدہ اضافہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کے مراکز کے قیام کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر اقتصادی مراکز کی بھی ابتداء ہوئی جو شمال مغرب میں کرناٹک، کوکنی ساحل اور بیجاپور، دھاراوا، بیلگام اور شیموگا جیسے اقتصادی اضلاع میں واقع تھے۔ مغرب یعنی عرب، فارس کی خلیج اور اس کے اس پار واقع علاقوں کے ساتھ تجارت میں جزیرہ نما ہند کے مغربی ساحل نے ابتدائی تاریخی دور میں مسلسل طور پر اہم کردار ادا کیا۔ مہاراشٹر میں تھانے، گوا، کرناٹک میں بھٹکل، کارواڑ، ہوناواڑ اور منگلور جیسی کئی بندرگاہوں نے دسویں اور بارہویں صدی کے درمیان لمبی دوری کی تجارت کی ازسرنو شروعات کے دوران ترقی پائی، جس کے ثبوت ہمیں ساحلی جہاز رانی اور سمندری جہاز رانی سے ملتے ہیں۔

اس دور میں خاص طور پر دکن اور آندھرا کے خطوں میں اقتصادی لین دین میں زر (Money) کے استعمال میں عمومی طور پر اضافہ دیکھا گیا۔

علم کتبات، معلومات حاصل کرنے کا اہم ماخذ ہے۔ زیادہ تر مطالعات میں مختلف علاقوں میں ظہور پذیر ہوئے متفرق شہروں کی درجہ بندی کرنے اور ان کا پتہ لگانے کے لئے پوری طرح کتبات میں جو اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں وہ اس طرح ہیں۔ راجدھانی، نیلیے ویدو، اور پٹن یا نگر، جہاں نیلیے ویدو عام طور سے مقامی/صوبائی حاکم کا صدر دفتر ہوتا تھا۔ پٹن یا نگر اقتصادی شہر کے حوالے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ شہری منصوبہ بندی اور طرزِ رہائش کی نوعیت کا کچھ اشارہ وینوگرام یا ویلوگرام، موجودہ بیلگام سے ملتا ہے۔ جہاں بیرونی اور مقامی تاجروں کے لئے الگ الگ محلے ہوتے تھے۔ بیلگام ایک قدیم وینوگرام تھا جو ابتدائی طور پر جینیوں سے متعلق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بیلگام 4000 Burghesses کی کفالت کرتا تھا جو عموماً یوروپی طرز کے Burghesses نہیں تھے بلکہ اس کے کچھ گاؤں پر مشتمل تھا۔ جو اسی شہر کی زراعتی اور تجارتی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ کتبات کے ریکارڈ سے یہ بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ایسے شہروں میں مختلف دستکاری اور تجارتی سماجوں کے لئے Geris یا محلے بھی ہوتے تھے۔ بیلگاؤں جیسے بڑے شہری مراکز میں دوسرے خطوں سے آئے ہوئے مہاجرین رہتے تھے۔ مثلاً تامل ناڈو (تیگولا)، کیرل، لاٹا، یا، گجرات، بنگال، اور یہاں تک کہ کشمیر اور اترپردیش کے آہچ چھتر وغیرہ سے آئے مہاجرین۔ بہت سے ایسے شہروں میں مثلاً لوکی گونڈی (بادامی سے 80 کلومیٹر) اور بیلور (ہاسن سے 39 کلومیٹر) میں ایاوولے (سفری) تاجر اکثر آیا جایا کرتے تھے۔

آمدورفت اور ارسال وترسیل شمالی مغربی کرناٹک میں سڑکوں کی تعمیر ہوجانے سے آسان ہوگئی۔ جہاں تردل (ضلع بیجاپور) لوکی گونڈی اور بیلگام خاص تجارتی مراکز کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ قومی شاہراہیں اور ٹرنک روڈ، کرناٹک، آندھرا اور تمل ناڈو سے جڑنے لگے۔ اور سابقہ تجارتی راستے ابتدائی عہد وسطیٰ

میں بھی استعمال کیے جاتے رہے۔کاویری کے شمالی اور جنوبی کناروں پہ اس کے درمیانی جنگلاتی خطے (کونگو خطے)، کرناٹک، تامل ناڈو کے درمیان بہت سے لین دین کے مراکز سامنے آئے جیسے تلکٹر (میسور کے نزدیک) ارموڈی کونڈن (تھیرووار ضلع)۔

کرناٹک اور آندھرا یا تمل خطوں کے درمیان وسیع تجارتی رابطے (Network) بھی موجود تھے۔کنٹر، تامل اور تیلگو تاجروں کی موجودگی کی تصدیق کئی شہروں میں واضح طور پر ہوتی ہے۔جیسے بیلگام (کرناٹک)، بیرور (نالگونڈہ ضلع آندھرا پردیش) اور آندھرا میں وشاکھا پٹنم اور گھنٹ شالہ ساحلی شہر۔آندھرا ساحل نے خاص بازاروں کی حیثیت حاصل کر لی۔موتو پلی۔وشاکھا پٹنم اور گھنٹ شالہ کے ساتھ جنوب مشرقی ایشیائی تجارت پر خاص دھیان دیا جانے لگا۔مثلاً نیلور، دراک شراما، تری پورن تکم اور انو ما کونڈا آندھرا پردیش کے ایسے بازاری شہر تھے جو اندرونی مقامی تجارت کی نمائندگی کرتے تھے۔

تاجروں کی انجمنیں (Guilds)

عہد وسطیٰ میں جنوبی ہند کے تاجروں کی انجمنیں مختلف گروہوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔کرناٹک سے حاصل کتبات میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔سیٹی گتا، نانادیسی، بنا جو، ویرابنا جو، مہانگر، ابھے نانادیسی، موری ڈنڈ، ٹانڈا، نکھر، ناڈوسیٹی، پردیسی گالو، استھان بناجی گارو، موتروم بیدینا سیٹی یارو، اشٹ داس پٹنی گارو، ناڈو، گوارے، گاندھیکا، گاتری گا، نگرمہاجن، وانی گا مہاجن، سمست دیسی، بیرادرو وغیرہ۔یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا یہ انجمنوں یا مقامی گروپوں کا ایک باقاعدہ حصہ تھے یا نہیں۔یہ سفری تجارت میں کبھی کبھی حصہ لیتے تھے جو جنوبی ہند کے مختلف خطوں میں جاری تھی۔

کرناٹک کے کتبات میں اس طرح کی انجمنوں کے بے شمار حوالے دیئے گئے ہیں جیسے سرینی، کوٹالی، (گوٹالی)، سموہا، سے ینگل، ہتو یا پتو، اوراُ کالو، جوزرعی انجمنیں معلوم ہوتی ہیں۔اگور 300 گرویا سیٹیگا ٹمبولیگا، گالے 300، بلا 300، (تاڑی نکالنے والے)، میدرو، موٹوکرا، بانس بنانے والے، بوجنگا، اراوٹو اوکلو، وغیرہ جو پیشہ وارانہ یا طرز روزگار پر مبنی گروپوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔جو شاید کسی بستی میں منظم دستکار گروپوں کی شکل ہی میں رہتے تھے۔حالانکہ داخلی مقامی دستکار گروپوں کی تنظیمیں بھی تحریری دستاویزات میں بڑی تعداد میں دکھائی دیتی ہیں۔جیسے تیلگا، گوٹالی، جگتی سے ینگل، پتسا لیگرو، فنکاروں، سناروں، بڑھیوں، چھپی گا گوٹالی (درزیوں)، جیڈا کوٹالی (کپڑا بننے والے)، پتھر تراشنے والے، کنچا گر گوٹالی، بیورو تمبر، کماٹا (ٹکسال)، گانا او کالو (ہاتھ اور بیل کے ذریعہ چلنے والا کولہو)، گانا متیو وارو (پیروں سے چلنے والا کولہو) وغیرہ۔اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پیداواری محنت سرگرمیوں کے سبب دستکاری کی صنعت کو اقتصادی حیثیت سے اسکی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا اور ان کی درجہ بندی سے پیداوار اور تجارت کے عمل کو تقویت ملی ہوگی۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی تنظیموں نے ان کی ماہرانہ صلاحیت اور خوبیوں کو بڑھاوا دیا ہوگا۔

یہ پیشہ وارانہ انجمنیں، پٹن سوامی یا وڈ ڈیا واہاری کے تحت کام کرتی تھیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان پیشہ وارانہ انجمنوں کی مزید درجہ بندی ذیلی ذاتوں کی حیثیت سے بھی کی گئی تھی۔خاص خاص دستکاریوں کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کولہو، گنا، پان تیار کرنا، نمک بنانا، بانس کی دستکاری، دیوی دیوتاؤں کی دھاتوں کی مورتیاں بنانا، موسیقی کے آلات، لیمپ اور برتن بنانا وغیرہ جو مندر و مذہبی رسم ورواج سے متعلق تھے۔کپڑے کی صنعت سب سے زیادہ ترقی کر رہی تھی۔میگا دیرے یا کرگھا دکن کے سبھی حصوں میں عام تھا۔جیسے ہاسن، کادور، بنگلور، میسور، شیموگا، چترادرک، اور رائے چور اضلاع۔کپڑے کی لاتعداد قسمیں ہیں جیسے پٹا (سلک)، سائیرے (لمبا کپڑا بعض اوقات ساڑی)، سوتی کپڑے، ٹیرے سائرے، ہود کے نولو (سوتی دھاگے سے بنے کپڑے)، اتم پون بٹے (سنہرے رنگ کا ریشمی کپڑا)، کٹی دانل پٹا، دارا پٹا، پٹیا پٹے، سیٹی گیا نبجارا، وغیرہ۔کتائی کے عمل کی تفصیلی معلومات چرخے (رتنے)، کتلی (کادیرو) اور ذیلی تختوں (ادیا ہالیگے) سے ملتی ہے۔عطر اور لوبان (دھوپ) بنانے کا تذکرہ مانسولاس میں ملتا ہے، جوگدیوں (آسن)، زیورات (مانیگار)، سونا چاندی کے کاریگروں اور چوڑیاں بنانے والوں کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔مجسمہ سازی ودیگر فنونِ لطیفہ کے علاوہ بڑھئی گیری، برتن سازی، درزی کا کام، لوہار کا کام اور رنگائی وغیرہ دوسری پیشہ وارانہ سرگرمیاں تھیں۔

سکوں کی ڈھلائی

سودی، گبور، بلی گاوے لکونڈی جیسے مقامات پر سکوں کی ڈھلائی خاص طور پر مہر کنندہ سکے، کامتکاروں کے ذریعہ کی جاتی تھی، جبکہ ساودکٹو کار سکوں کی کٹائی چھٹائی کر کے انہیں یکساں شکل، سائز اور وزن کے مطابق بناتے تھے۔ بینکنگ اور قرض کے لین دین کے لئے کوئی با قاعدہ نظام نہیں اپنایا جاتا تھا۔ کیونکہ وہاں کے لوگ اس کے قائل نہیں تھے۔ عام طور سے مندروں میں پیسہ جمع کیا جاتا تھا اور اس کے سود کا استعمال عبادت کے کاموں میں کیا جاتا تھا۔ اس لئے اقتصادی سرگرمیوں میں مندر کا اہم رول تھا۔ سود عام طور سے اشیاء کی شکل میں لیا جاتا تھا۔ جیسے دھان وغیرہ کی شکل میں لیکن پیسہ کی شکل میں سود کے لین دین کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ سالانہ سود عام طور سے پانا، ہاگا، ویسایا بیلے کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا۔ جسے اکثر تو دووڈی کی حیثیت سے جمع کیا جاتا تھا۔ جس کی اصل رقم گادیان، پون یا ہن کی شکل میں ہوتی تھی۔

بازار کی سہولیات، تاجروں اور دوکانداروں کے ذریعہ ہفتہ وار میلوں میں مہیا کرائی جاتی تھیں جن کا انعقاد پٹن سوامیوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا یا دوسرے مذہبی رسم و رواج کے طور پر ایسے میلے لگائے جاتے تھے۔ دوسری دکانوں کے ساتھ مندر کی دکان منیادان گاڈی کو خاص اہمیت حاصل تھی، یہ دکانیں دیورن گڈی کہلاتی تھیں۔ دوسری دکانیں جیسے کرادان گاڈی، انگاڈی مانے یا مالیگے تھوک کی اشیاء کی دکانیں تھیں۔

علاقائی یا بین علاقائی تجارت اور مذہبی زیارت سے شہروں اور تجارتی مراکز کی مجموعی ترقی کو بڑھاوا ملا۔ راجدھانی پٹن جیسے کلیانی اور دوار سمدر شہری درجہ بندی میں سب سے اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اراسی یا کیرے اور بلی گاوے اقتصادی مراکز ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی مرکز کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔ داخلی شہروں میں قابل ذکر شہر اس طرح ہیں: پیٹھن، تیر یا تگر، کلیان، نانڈگاد، ولائی پٹن، پانڈی پور، کودور گنڈی، (ہاسن ضلع) وبجیا نا ٹیپور، پولی گیرے، مودو بیدیرے اور دیگر۔

ساحلی تجارت

سمندر پار کے تعلقات بڑھ رہے تھے اور کونکن اور کنٹر ساحلوں پر واقع بندرگاہوں مثلاً بھٹکل، بسرورد، بارا کور، کارواڑ، ہونا واڑ، کاسارگوڈ، کمبالہ، منگلور، سیرور، سداسی واگد، مالپے، انکولہ اور مرجان کی ترقی ہوئی۔ ہوناواڑ ایک خاص بندرگاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہاں باقاعدہ طور سے ساحلی آمدورفت اور وقفہ وقفہ سے لمبی دوری کی آمدورفت جاری تھا اور سامان کو ساحلی شہروں سے لاکر ہوناواڑ ار کاسارگوڈ جیسی بڑی بندرگاہوں پر اتارا جاتا تھا جو مسلم تاجروں کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ منگلور، عرب ممالک سے آنے والے مسافروں کے لئے سب سے بڑا شہر تھا۔

عرب کے قلم کاروں نے اپنے کتب میں چاول، کالی مرچ، ریشم، ناریل، کیلے، چیڑ کی لکڑی، عود (A l o e)، بانس، کافور، چھوٹی الائچی، لونگ، آم، سلفر، گندھک اور جڑی بوٹیوں کی درآمد کا ذکر کیا ہے۔ مارکو پولو نے درآمد کی فہرست میں تانبہ، سونے کی چھڑیں، ریشم اور ادویات کو شامل کیا ہے۔ اگر ہم سفری تاجروں کے تحریری دستاویز پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ گھوڑے، ہاتھی، موتی، کپڑے، مشک اور صندل بھی تجارت کی کچھ دوسری اہم چیزیں تھیں۔ جن کو گندھار، تروشکا، سمہالہ، چولا، مگدھ اور ملے یالا سے لیا جاتا تھا۔

پہلگام سے حاصل شدہ 1204 عیسوی کے کتبے میں سب سے متاثر کن فہرست ہے جس میں چیڑ کی لکڑی، ناریل، مصالحہ (کالی مرچ، اور ادرک) اور کپڑوں جیسی استعمال میں آنے والی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شمالی کرناٹک کئی طرح کے تاجروں کے لئے ایک اہم پڑاؤ تھا۔ تجارتی اشیاء میں روزمرہ کے استعمال کی چیزیں جیسے دھان، چاول، کالی مرچ، ہینگ، ہری ادرک، ہلدی، پان سپاری، ناریل، کھجور کے پتے، گھاس، گنا، کھانڈ شکر، کیلے اور جڑی بوٹیاں شامل تھیں۔ یہ واضح نہیں ہے کہ ان میں سے کونسی اشیاء ساحلی جہازوں سے لائی اور لے جائی جاتی تھیں۔ عیش و آرام کی اشیاء کے علاوہ زراعتی پیداوار اور صنعتی پیداوار دونوں

کے لئے ساحلی تجارتی نیٹ ورک کافی مؤثر اور تیز رفتار تھا۔

15.3.2 کونکن ساحلی تجارت اور سمندری سفر

ابتدائی عہد وسطیٰ میں غیر ملکی تجارت میں ایک طرح کی رکاوٹ پیدا ہوگئی خاص طور سے سمندری تجارت کے زوال کے بعد۔ روایتی بیانوں سے تجارتی راستوں (زمین کے ذریعہ اور ندیوں کے ذریعہ)، تجارتی مراکز، تاجروں کے پیشہ وارانہ اداروں کا تو حوالہ ملتا ہے لیکن ساحلی نیٹ ورک کے بارے میں بہت کم معلومات فراہم ہوتی ہے۔ جو ایسا لگتا ہے کہ شاذ ونادر ہی رہے ہونگے۔ 1500 عیسوی کے بعد ہی کہیں جا کر ایشیاء اور مشرقِ وسطیٰ کی تجارت کو پہچان ملی ہوگی۔ مثلاً کونکن ساحل، سابقہ آپرانتا یعنی مہاراشٹر کا ساحل (شمال اور جنوبی کونکن) اور اس کی اہمیت کے بارے میں قدیم مستند ماخذ سے معلومات فراہم ہوتی ہے۔ لیکن شمالی اور جنوبی کونکن کے درمیان کی بندرگاہوں کے آپسی رابطوں کی معلومات ابتدائی دور میں واضح طور سے نہیں ملتی۔ کونکن کی اصطلاح کو اہمیت ابتدائی عہد وسطیٰ میں ہی ملی۔ عربوں کی ادبی کتب میں کم کم لفظ کا استعمال بلہارا سلطنت یعنی راشٹر کوٹوں کے لئے کیا جاتا رہا ہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی تک شمالی کونکن اور تلوان (دھابول سے گوا۔ جواہ سند پور) کے درمیان کوئی امتیاز ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ بادامی کے چالوکیوں کے دور حکومت (چھٹی سے آٹھویں صدی عیسوی) سے اسی ساحل کے کچھ حصوں پر چالوکیوں کے ذریعہ کنٹرول کرنے میں دلچسپی بڑھی خاص طور سے چالوکیوں کے ذریعہ لاٹا (جنوبی ساحلی گجرات) پر فتح حاصل کرنے کے بعد۔ اس کے بعد شمالی کونکن ساحل اور گجرات۔ کاٹھیاواڑ ساحلوں کے درمیان ساحلی رابطے قائم ہوئے اور ساحلی سمندری سفر با قاعدہ شروع ہو گئے۔

کونکن خطوں میں ابتدائی تاریخی دور کی بہ نسبت ابتدائی عہد وسطیٰ میں زیادہ نئی نئی بندرگاہوں کے ظہور میں آنے کے شواہد ملتے ہیں۔ کونکن ساحل پر نویں صدی عیسوی سے بندرگاہیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں جن کا عربی اور فارسی کے ماخذوں میں تذکرہ ملتا ہے۔ ایک اہم تجارتی مرکز کے روپ میں کولہاپور کا پتہ یہودی تاجروں کے خطوط سے ملتا ہے۔ شمال سے جنوب تک بے شمار جہازی پناہ گاہوں (Harbours) کا ذکر کیا گیا ہے: سمین/سندن (سنجس = تھانہ ضلع میں)، سری استھاتک (تھانہ)، چیمولیہ/سیمور (چاؤل۔ کولابہ ضلع میں)، ناگ پورا (ناگاو۔ کولا بہ ضلع میں)، بالی پٹن (کھیرے پٹن ضلع رتناگری میں)، گوپا کا پٹن/گوے (گوا)، چندر پورا/سند پور (گوا کے جنوب میں چندور)۔ سند پور کا حوالہ عرب ماخذوں میں ملتا ہے گوے، کادمباس کی راجدھانی اور ایک اہم بندرگاہ تھی۔

عرب سرگذشت نگار جیسے سلیمان اور ابن خورداد بہ (9ویں صدی) نے کونکن اور مالا بار نیز کامبے (کنبایا) کے درمیان تجارتی روابط کے بارے میں بڑے دلچسپ حقائق بیان کئے ہیں۔ ان کی تصدیق فارسی جغرافیائی کتاب ''حدود العالم'' (982 عیسوی) سے بھی ہوتی ہے۔ ممبئی کے نزدیک سوپارہ یعنی سورپارکا بھی غیر ملکی سرگزشتوں میں ایک مانوس نام تھا۔ مالا بار سے ہو کر کونکن سے سری لنکا تک کی لمبی سمندری مسافتوں کے سبب داخلی تجارت اور دستکاری کے مراکز سے رابطے قائم ہوئے۔ بعد ازاں سلاہارا لوگوں نے جو مہاراشٹر کے ساحل پر سب سے زیادہ طاقتور تھے پورے کونکن ساحل پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کی کوشش کی۔

گیارہویں صدی تک شمالی کونکن کی بندرگاہیں زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔ لیکن گیارہویں صدی کے بعد سے حالت بدلی اور جنوبی کوکن کی بندرگاہوں کو بھی اہمیت ملنے لگی خاص طور سے بالی پٹن جس کا تذکرہ سلاہار (موجودہ رتناگیری ضلع میں واقع کھیرے پٹن) کے کتباتی دستاویز میں ملتا ہے۔ بالی پٹن اور گوا کے اطراف کے علاقوں کے درمیان ساحلی مسافتوں نے چندر پور اور چمولیہ (چاؤل) کو بالی پٹن سے جوڑ دیا۔ بالی پٹن، گوا کے اطراف اور شمالی بالی پٹن سے آنے والے سمندری بیڑوں سے حاصل ہونیوالا محصول آمدنی کا اہم ذریعہ تھا۔ سمندری بیڑوں کی دو اہم پناہ گاہیں یعنی شمال اور جنوب کے درمیان تجارتی روابط بہتر بنانے کے لئے رعایتیں بھی دی جاتی تھیں۔ کونکن خطوں کے شمالی ساحلی تجارت کا ارتقاء جس میں بالی پٹن کی ایک خاص اہمیت ہے، ابتدائی عہد وسطیٰ میں زرعی آبادیوں کے تدریجی پھیلاؤ، فصلوں کی متفرق اقسام کی نشوونما، دستکاری کے فروغ اور کرناٹک میں تجارتی ترقی کے نتیجہ کے طور پر ان علاقوں میں ساحلی تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔

سند پور جس کے گوا کے ساتھ اچھے تعلقات تھے کا تعارف عرب جہاز راں احمد بن ماجد (پندرہویں صدی کا مشہور معلم) کی جہاز رانی سے متعلق کتاب میں ملتا ہے۔ مقامی کادمبا حاکموں کے تحت گوپک پٹن، گوپ پور اور گوے (گوا) سب سے اہم ترین بندرگاہ کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ گوا کے تجارتی مرکز کی اہمیت کو ظاہر کرنے والے حوالے اس طرح ہیں۔ کادمبا حاکموں کے ذریعہ کولہاپور، سومناتھ تک مذہبی زیارتیں یا گیارہویں صدی میں تھانے کے راستہ جنوبی کونکن سے کاٹھیاواڑ ساحل (سوراشٹر) تک، عرب مسلمان تاجروں کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے جہاز سے ایک کادمبا حاکم کو بچانا جو بعد میں گوا کے انتظامی سربراہ بھی بنے۔ نووٹک (جہاز راں) لفظ کے عربی معنی ناخدا (جہاز کا مالک) ہے۔ اس لفظ کے کثرت استعمال سے یہ لفظ جہاز کے مالک تاجر کے حوالہ سے استعمال ہونے لگا۔ اس کے ذریعہ بنائی گئی مسجد (میجی گیٹی) کی دیکھ بھال گرجر، سوراشٹر، لاٹا، کونکن وغیرہ سے آنے والے سمندری بیڑوں پر گوا میں لگنے والے محصول کی آمدنی سے کی جاتی تھی۔

مالا مار کے شمالی حصہ میں ایک اہم بندرگاہ منجرور اور کاٹھیاواڑ کے درمیان رابطوں اور کونکن ساحل سے ہوکر گجرات کی طرف جانے والی سمندری مسافتوں کے ثبوت یہودی تاجروں کی قاہرہ گنیز ا دستاویزات میں ملتے ہیں جو عدن کے ساتھ یہودیوں کی تجارت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تنبو ایک جہاز کا مالک (ناخدا) کے بارے میں 1145 عیسوی کے ایک یہودی خط سے پتہ چلتا ہے۔ عدن اور ہندوستان کے درمیان چلنے والے جہازوں کو کونکن ساحل پر سمندری لٹیروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تنبو کی جہاز رانی کی تجارت کونکن علاقوں کے ساتھ ساتھ منجرور سے تھانے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابتدائی ہندوستانی تاجروں کی جہاز رانی تجارت میں شمولیت تھی لیکن اس کے اعداد و شمار نا کافی ہیں۔ ناخدا مہروز یعقوب منجرور سے 1145 عیسوی میں اپنے بہنوئی کے لئے ایک خط لے کر آیا۔ جس سے منجرور سے تھانہ تک کی سمندری مسافت کا حوالہ ملتا ہے۔ کنبے (کامبے) جس کے منگلور اور مالا بار خطوں کی دوسری بندرگاہوں کے ساتھ باہمی تعلقات تھے، بھی ساحلی نیٹ ورک کا ایک اہم حصہ تھا۔ مالا بار اور کولم کے حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کاٹھیاواڑ اور سومناتھ سے سمندری مسافتیں گیارہویں صدی میں با قاعدگی سے شروع ہو چکی تھی۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کے ماخذ سے سمندری بیڑوں کی قسموں کے بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں ملتی ہیں۔ جس کا علم پیری پلس کو تھا مثلاً تراپگا اور کوٹیامبا، جن کے حوالے جینیوں کی کتب انگاوجا (چوتھی صدی عیسوی) میں ملتے ہیں۔ تراپگا اور کوٹیامبا سمندری جہاز تھے جو چمولیہ اور چندر پور کے درمیان چلتے ہونگے۔ سمندری جہازو کے بارے میں تصویر ذرا دھندلی ہے اور تحریری دستاویز اور کتب میں ان کے حوالے بہت کم ملتے ہیں۔ ممبئی کے نزدیک بوری ولی کی غاروں میں، ویرا گال یا Hero Stones میں جنگ کی تصویر کشی کی گئی ہے اس میں تختوں کو ایک ساتھ جوڑ کر بنائے گئے کئی قسم کے جہاز دکھائے گئے ہیں۔ غالباً یہ بارہویں صدی کے سلہاروں اور کادمبوں کے درمیان لڑائی میں بھی استعمال کئے گئے تھے۔ فوجیوں کو لانے والی چھوٹی کشتیوں اور مسافروں اور سامان کو لانے لے جانے والے بڑے جہازوں کے حوالے یہودی خطوط میں ملتے ہیں۔ ابتدائی عہد وسطیٰ میں جہاز رکھنے والے تاجروں کے ایک سماج کے اعداد و شمار کتباتی دستاویز میں ملتے ہیں۔ مہاماتیہ ایک اعلیٰ افسر تھا اور سلہاروں کے تحت ایک افسر کو سائدہ کہا جاتا تھا جو ایک ناووٹک بھی (عرب کے ماخذوں میں جسے ناخدا کہا گیا ہے) ہوتا تھا۔ وہ انتظامی اور تجارتی دونوں طرح کے رول ادا کرتے تھے۔

آٹھویں صدی کے وسط میں اور دسویں صدی عیسوی تک دھاتوں کے سکوں کی کمی کی جہ سے ٹکسالی (روپئے پیسے کے) پس منظر متحرک تجارت کی معلومات سے مطابقت نہیں کھاتا۔ جبکہ راشٹرکوٹوں کے ذریعہ جاری کی گئی کوئی سرکاری کرنسی رائج العمل نہیں تھی غالباً عربی درہم استعمال میں رہے ہونگے۔ سلہاروں نے گادھیا پیسہ طرز کے چاندی کے سکے جاری کئے۔ سونے کے سکے گیارہویں صدی سے منظر عام پر آئے (کلاچوریوں، کادمبوں اور مغربی چالکیوں کے تحت)۔ ساحل پر غیر یقینی حالات اور خطروں کے باوجود تاجروں اور تجارت کے سامان کا آنا جانا جاری رہا۔ لمبی دوری کی تجارت کی بہ نسبت سمندری تجارتی سفر زیادہ محفوظ اور پر امن ثابت ہوئے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایسے سفر باقاعدگی سے جاری تھے۔ حالانکہ کونکن ساحل پر تجارتی سرگرمیاں پر امن نوعیت کی تھیں لیکن ان میں بھی اتار چڑھاؤ اور رد و بدل ہونے کے سبب بالی پٹن جیسی نئی بندرگاہوں کا ظہور ہوا۔ راشٹرکوٹوں کے تحت سنجن شمالی کونکن میں ایک معروف بندرگاہ تھی۔ مالا بار خطوں، کونکن اور سوراشٹر کے درمیان رابطے ابتدائی تاریخی دور سے ابتدائی عہد وسطیٰ تک مسلسل قائم رہے اور ابتدائی جدید دور تک جاری و ساری رہے۔

15.3.3 آندھرا کا خطہ

مبادلہ کے روابط آندھرا خطہ میں ابتدائی تاریخی دور سے ارتقاء پذیر ہوئے۔ جس کی اہم وجہ تھی جزیرہ نما کا شمالی ہندوستان کے تجارتی حلقوں کے لئے کھلا ہونا۔ مقامی اور سمندری تجارت دونوں خاص طور سے مغربی اور جنوب مشرق ایشیائی خطوں کے ساتھ لمبی دوری کی تجارت، نے بھی تجارتی اور شہری سرگرمیوں کی ترقی کو بڑھاوا دیا۔ اس کے برخلاف، آندھرا میں ابتدائی عہد وسطٰی کے شہری عمل خود ساختہ ارتقاء پذیر (Sui generis) تھے اور جنوبی ہند کے دوسرے خطوں کے مقابلہ میں اس دور میں زراعت کے پھیلاؤ کا نتیجہ تھے۔ دستکاری کی صنعت اور بندرگاہوں کے ساتھ شہروں اور قصبوں کی ترقی اس دور کی سماجی معاشی تبدیلیوں کا ہی ایک حصہ تھی۔ روزمرہ کے استعمال میں آنے والی ضروری اشیاء کے ساتھ ساتھ عیش وعشرت کے سامان کی مانگ بڑھنے سے دھاتوں کی صنعت جیسی دوسری صنعتوں کی ترقی ہوئی۔ دکن کے بہت سے حصوں میں سونا، لوہا، تانبہ، پیتل، اور ہیرے کی کانوں کو کھودنے کا کام شروع ہوا۔ جبکہ زنک zinc اور پٹن غالباً جنوب مشرقی ہندوستان سے آتا تھا۔ دھاتوں کی دستکاری کے بارے میں دسویں صدی سے معلومات ملنا شروع ہوتی ہیں اور خاص طور سے کاکتیہ دور سے (گیارہویں صدی سے چودھویں صدی عیسوی)۔ کاکتیہ کتباتی دستاویزات میں پنکا لوحالہ براہمو کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ایک ایسا سماج ہے جس کا نام دھاتوں کی تجارت سے وابستہ ہے۔ شاہی خاندانوں کے علاوہ جنھوں نے ان صنعتوں کی خاص طور سے حوصلہ افزائی کی، مندروں میں دیوی، دیوتاؤں پر زیورات وغیرہ چڑھائے جاتے تھے۔ سولھویں صدی کی ادبی کتب مثلاً ولا بھارایا کی کریدا بھیراما مواور شری ناتھ کی پالن اتی ویراچر تریا درک شرما مندر کے کتبات (1144 عیسوی)۔ اس طرح کی عیش وعشرت کی چیزوں کو استعمال کرنے والے ان کی سرپرستی کرنے والے حاکموں اور مندروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور زیورات کے ناموں کا ذکر بھی ان میں ملتا ہے۔ مندروں کے لئے تانبہ، پیتل کے مجسمہ بنائے جاتے تھے۔ رتھ، بڑھئی گیری کے ہنر کے ایک بہتر مثال ہے۔ رتھ خاص طور سے کاکتیہ دور کے بعد سے مندر کے جلوسوں کا ایک اہم حصہ بن گئے تھے۔

آندھرا خطہ کے دوسری اہم صنعت تھی تیل کی پیداوار۔ جس میں بنولہ (Gngelly) سب سے عام تیل کا بیج ہوا کرتا تھا۔ کتباتی دستاویز میں چینی اور گڑ کی پیداوار کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ آئندہ زمانوں کے کتباتی دستاویزات کے ریکارڈ ان ہنرمندیوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور وجے نگر دور تک آتے آتے ان کو ایک مخصوص مقام حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن کپڑے کی صنعت عہد وسطٰی کے آندھرا میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی جہاں پورے خطہ میں کالی مٹی (یعنی ضلع گنٹور) کی کپاس کی پیداواری علاقے بکثرت موجود تھے۔ آندھرا کے بہترین اور نفیس کپڑوں سے مارکو پولو اور دوسرے عہد وسطٰی کے سیاح اچھی طرح واقف تھے۔ دوسری صنعتوں میں نمک کی پیداوار وغیرہ شامل ہے۔

پنچانا مووروں کے نام سے مشہور لوہاروں اور دھات کے کاریگروں کا سماج الگ محلوں میں رہتا تھا۔ اور ان سماجوں کو زمینی امداد دی جاتی تھی وہ مندروں میں نذرانہ دینے اور منڈپوں کی تعمیر میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ (مثلاً ایڈاولی ضلع گنٹور کے 1257 عیسوی کے کتبے کے مطابق) اور جو ایک لاحقہ ہے جو مندر بنانے والے فنکاروں/ماہرین تعمیرات کے ناموں سے پہلے لگایا جاتا تھا۔ ساتویں صدی کے بعد سے ہی یہ رواج عام تھا۔ امراوتی سے حاصل ایک پندرہویں صدی کے کتبے میں ایک پرساتی نام کے فنکار سماج کا ذکر ملتا ہے جس کی ابتداء کا حوالہ پنچانا موورو سے وابستہ ہے۔ جس کا تعلق روایتی طور پر دشوکرما سے ہے۔ کرناٹک کے پانچالوں اور پرانوں کا عالم تھا۔ وانٹی میٹا کتبے میں زیادہ تفصیلی پرساتیاں ہیں جو ان کی عالمی تناظر میں وضاحت کرتیں ہیں اور اسے وراپیمدوتا کی حیثیت سے پیش کرتیں ہیں جو اپنے ہاتھوں میں اپنا پرچم (گروڈ) موسیقی کے ساز، سنہری پالکی، تلوار، پنکھا تاج وغیرہ سے آراستہ تھا۔ اکا سالے کی اصطلاح فنکار سماجوں کا حوالہ دینے کے لئے استعمال کی جاتی تھی اس طرح پرساتی تیلی کیسوں (آندھرا میں تیل کے تاجروں کی ایک تنظیم۔ بیزواڈا کے مالک تیل نکالنے والے اور اس کی تجارت کرنے والے، پینو گونڈا ویسیا س (بڑے تاجروں کا ایک مرکز تھا اور اس لئے اسے مالک یا سوامی کہا جاتا تھا) اور بلانجہ تاجروں کے ذریعہ اپنائی گئی۔

ان سماجوں کی تنظیمی سرگرمیوں کو صرف چودھویں پندرہویں صدی کے کتبات سے ہی زیادہ بہتر جانا جاسکتا ہے۔ (مثلاً آلن گونڈی کتبے سے تجور ضلع کے رتھ بنانے والوں کا حوالہ ملتا ہے جو کہا جاتا ہے کہ انولوم اور پرتی لوم ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔) ان میں شامل سونا چاندی کے کاریگروں لوہار، بڑھئی، سنگ تراشی

اور رنگ ساز وغیرہ۔ بہت سے ناڈو کے رتھ سازوں پر لگائے جانے والے محصول (ذاتوں سے لئے جانے والے جانے والے محصول) اناوری کا تذکرہ کئی کتبات میں موجود ہے۔ آندھرا کے ادیاگری سے حاصل ایک نامعلوم تاریخ کے کتبے میں مندر کے خزانہ کے لئے ایسے محصول سے چھوٹ کا تذکرہ ہے)۔ غالبًا پندرہویں صدی یا اس کے بعد۔؟) چودہویں صدی سے پندرہویں صدی سے علاقائی طور پر منظّم، مشترکہ دستکاری سماجوں کا سماج پر کافی اثر تھا۔ یہاں تک کہ تیرہویں صدی سے بنگلور ضلع سے حاصل شدہ 1291 اور 1342 عیسوی ہوئے سالا کے کتبات میں یہ سماج سب سے زیادہ نمایاں طور سے دکھائی دیتے ہیں۔ وجے نگر دور میں ان کو بہت زیادہ عزت کی نظر دیکھا جانے لگا۔

وجے واڑہ کے تیلیکی ویوورد (1000 خاندان) ایک دوسری اہم تنظیم تھی اور اس کا تذکرہ 1120-1071 کے کتبوں میں، کولوٹونگا اول۔ چالوکیہ۔ چول حاکموں کے دور سے اور منومس پران جیسے ادبی شاہکاروں میں ملتا ہے۔ انھوں نے وینگی کے مشرقی چالوکیوں کے دور حکومت سے بہت ہی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ راجاؤں نے ان کے لئے باقاعدہ دھرم شاشن جاری کئے جو اس سماج سے واقف تھے اور خوش تھے۔ 1084 کے تیکی پلیٹ مختلف مقامات کے تیلوکا سیٹھوں اور ان کو دئے گے اعزازت کے بارے میں حوالے دیتی ہیں۔ دیوی دیوتاؤں سے متعلق قصے ان کی ابتداء کو ایودھیاء کے ساتھ جوڑتے ہیں اور شمال میں ان کی اصل رہائش گاہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 1163 عیسوی کے باپٹلا کتبات اور 1164 عیسوی کے ان کے بھاؤ نارائن مندر کو دیئے گئے سونے کے چراغ کے طور پر نذرانوں کے ریکارڈ سامایا کی حیثیت سے ان کے تنظیمی کردار کو اجاگر کرتے ہیں۔ نارینڈلا اور بیزواڈا کے کتبات کی پرساتیاں انھیں اعلی مقام پر فائز کرتیں ہیں۔ ان کے فوج کے سپہ سالاروں یعنی چالوکیہ راجیہ ملستا مبھیا مانولا کی حیثیت سے بھی عزت حاصل ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی میں آندھرا میں لمبی دوری کی تجارتی سرگرمیاں درمیانہ روی سے چل رہی تھیں۔ اسکے بارے میں کہا جاتا ہے کی سیاسی حالات سازگار نہیں تھے۔ لیکن ایک محدود پیمانہ پر داخلی تجارت جاری تھی۔ تاجر اکثر بینکروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ مثلاً چندہ بھیم پوٹی سیٹی، ولاناتی کلوتنگا کوڈا گونکاراجو (1157) کے لئے بینکر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ وینگی، گوڈی میٹا، ناڈینڈلا، دھارتی کوٹا اور نیلور جیسے ماتحت سرداروں اور ان کی راجدھانیاں تاجروں کو متاثر کرتیں تھیں۔ تجارت کو فروغ دینے والوں مندروں کے درمیان پانچ ارام تھے (بھیم پور، گوڈی پوڈی، پالکونالو۔ درک شرما اور امراوتی) ساتھ ہی بیزواڈا میں ملیشورا اور چھیبرلو میں مہاسینا بھی جو زیارتی مراکز تھے۔ زیارتی مراکز میں مشہور سمہاچھلم یا باپٹلا، گھنٹ شالہ، شری سلیم، اہوبالم اور تروپتی بھی شامل تھے۔ گیارہویں بارہویں صدی میں ایسے مندروں کے آس پاس گاؤں شہر آباد ہو گئے۔ پینوگونڈہ کے حاکم، تامل تاجر اور آندھرا کی تجارتی تنظیم جسمیں 500 منی گرامم انجوونم شامل تھے (ملم کتبہ) خاص طور سے متحرک تھے۔ لیکن کاتیہ راجہ گنپتی دیو 1261-1199 عیسوی کے دور حکومت میں شاندار ترقی کے نئے دور کی شروعات ہوئی۔ جو سمندری تجارت کو بڑھاوا دیکر اور موٹوپلی گنٹور ضلع کی بندرگاہ کی تجدید کر کے اور سبھی غیر ملکی تاجروں کے لئے ایک ابھے شاشن جاری کر کے کی گئی۔ اس سے تکلیف دہ محصول اور ڈکیتی وغیرہ سے آزادی ملی۔ تجارتی اشیاء مثلاً چندن، کافور، موتی ہاتھی دانت، ریشم، دھاگہ، مونگہ اور مسالوں پر طے شدہ محصول سے مال اور تاجروں کے باقاعدہ نقل وحمل میں مدد ملی۔ ذرائع ابلاغ میں بھی سدھار آیا۔ مارکو پولو اس بندرگاہ کا حوالہ متفیلی بندرگاہ کے روپ میں دیتا ہے۔ 1244 عیسوی کے موٹوپلی کتبے (گنٹور ضلع) میں شہر کی درآمد اور برآمد دونوں کا تذکرہ ہے (موٹوپلی کتبے کے خلاصہ کے لئے موجودہ اکائی کا صفحہ 110 دیکھئے)۔

اس زمانہ میں ویش سماج کی عام خوشحالی ویشیا پران میں عیاں ہے۔ پینوگونڈا اور 17 دوسرے شہر 714 گوتروں والے ویشوں کی اصل رہائش گاہیں تھیں۔ سب کا ایک ناکرم ہوتا تھا جس کا سربراہ ناکرسوامی ہوتا تھا۔ کوماٹی تاجر، جن کے بارے میں ویشیا پران میں قصے بھرے پڑے ہیں، گھنٹہ شالہ کے کچھ کتبوں میں بھی ان کا تذکرہ ایک اہم گروہ کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

گیارہویں صدی سے چودہویں صدی کے دوران تیلگانہ میں، معیشت، سماج اور طرز حکومت سے متعلق مطالعات زیادہ تر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تیلگانہ کاکتیہ دورِ حکومت میں تجارت کے نقطۂ نظر سے ایک اہم خطہ تھا۔ اس دور میں یہ نسبتاً ایک خشک اور جھیلوں کی آبپاشی پر منحصر خطہ تھا۔ جس کا ارتقاء زرعی پھیلاؤ اور منظّم تجارت کے ذریعہ ایک باشعور طریقہ سے کیا گیا۔ بعد ازاں یہی وہ عمل تھا جس نے حکومت کی حوصلہ بخش پالیسی اور سرپرستی کے ذریعہ، مقامی

MEDIA CENTRE LIBRARY Hyderabad

و بیرونی اور لمبی دوری کی تجارتوں میں پورے آندھرا کی اہمیت کو بڑھایا۔

پیشہ وارانہ گروہوں میں اضافہ کے شواہد قصے کہانیوں کی کتب اور ادبی ماخذ میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کیونکہ اس دور میں دستکاری کی صنعت میں اضافہ ہوا اور متفرق دستکاریاں وجود میں آئیں۔ دستکار گروہوں کے حوالے جن شکلوں میں ملتے ہیں وہ ہیں پنچ لوہادھی پتیلو، پانچ دھاتوں کا کام کرنے والے، سونا، چاندی، تانبہ، ٹن اور سیسہ، سلی ورو، کپڑا بننے والے، ودا ورو، سنگ تراشی، کاسے۔ راج گیر، ودرانگی۔ بڑھئی، کمرار یلو۔ 'لوہار کماریل' کمہار موسار اورو۔ وہ لوگ جو گھالی بناتے اور بیچتے تھے اور' تیلی کاورو۔ تیلی اور اکاسل ورو۔ سناروں، پرمبنی دستکاریوں (اشٹ داس پرجا) کی شکل میں منظّم اور سماجی و معاشی روپ میں قائم تھے اور ایک دستکاروں کی تنظیم کی حیثیت سے تیار شدہ اشیاء کی از سر نو تقسیم یا خرید و فروخت کے کام دیکھتے تھے۔ کردابھی رامامو، پرتاپرودر چریتر اور سدھیشو رچریتر جو غالباً پندرہویں صدی سے سولہویں صدی میں کاکتیہ دور کے بعد لکھی گئی کتابیں ہیں، مختلف دستکار گروہوں کے حوالے پیش کرتی ہیں جیسے پدم سالے سوتی کپڑا بننے والے، پٹونیسے سالے ورو۔ ریشمی کپڑا بنے والے، وشوا کرما واسا جولو، دیگر۔ تیلیکی ویورو (تیلی) کے ذریعہ تیل نکالنے کی متفرق آلات گانوگو یا سیماپا گینو نے اور کرنوگنونے کا ذکر کردار بھی رامامو میں آتا ہے۔ ایک شہتیر (beam) سے بندھے بیل کے ذریعہ تیل نکالنے کے عمل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب میں خوشبودار تیل کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ سوتر دھاری یعنی معمار (وستو شاستر) کی بھی قابل ذکر اہمیت تھی۔ جو فنکاروں اور وشوا کرما کی فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ پرساد یا محل بنانے میں ماہر، علم تعمیرات کا عالم یہ معمار، نگر، کالنگا، وراوڈ اور ویسارا طرز کی حویلیاں اور مندر ڈیزائن کرتے تھے۔ سبھی دستکار اپنے وقت اور مذہب نیز سماج کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کے پابند تھے۔ ساتھ ہی ان قوانین کی پابندی نہ کرنے پر سزا بھی طے کرتے تھے۔

دستکاری کی صنعت میں، زراعت کے آلات کے علاوہ، ہتھیاروں (کلہاڑی)، گانوگو۔ تیل نکالنے کی مشین، مگامو، لکڑی کا کرگھا، بیل گاڑی اور کشتیوں کے بنانے کے کام اہم تھے۔ جنگی ہتھیار، زیورات اور دوسری عیش و عشرت کی اشیاء بنانا، جس میں ہنرمندی اور منظّم پیداوار کی ضرورت ہوتی ہے، اہم مصنوعات تھیں۔ فرنیچر بنانے والے وورانگولو یا بڑھئی اور ہاتھی دانت (دانتامو) کا کام کرنے والوں کے قابل ذکر حوالے بھی ملتے ہیں۔ دستکاروں کا زراعت پر انحصار اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ تر مثالوں میں انہیں ان کی خدمات کے بدلے زمین دینے کا ذکر ملتا ہے۔ دستکاری کی پیداوار اور اس کی نوعیت میں اضافہ بارہویں صدی اور خاص طور سے کاکتیہ دور میں بیرونی اور لمبی دوری کی تجارت کے لئے روزمرہ استعمال کی اشیاء کی پیداوار کو بڑھاوا دینے میں تاجروں کی دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس صنعت نے زراعتی تنظیموں سے کہیں زیادہ خود کفالت حاصل کر لی تھی۔ اور زر مبادلہ کے نظام میں زیادہ نمائندگی حاصل کر لی تھی۔ لیکن زر مبادلہ کا عمل وجے نگر دور تک عمومی طور سے کم نوعیت کا تھا۔

یہ عمل اہم دستکاری کے فن کے روپ میں بنائی کے ارتقاء میں نمایاں ہیں۔ سلی ورو کپڑا بناتے بھی تھے اور اس کی تجارت بھی کرتے تھے۔ کپڑے کی متفرق اقسام کی معلومات ادبی ماخذ سے ہوتی ہے۔ جیسے سمہاسن، دواترم سیکا (تیلنگانہ)، ہرولاسمو اور باسوا پرانا موجو چھپے ہوئے ریشمی اور اونی کپڑوں کے حوالے دیتے ہیں۔ چینی رشیم (چینی یوگالم) اور مختلف نمونوں اور طرز کے کپڑوں کے ساتھ 37 سے بھی زیادہ قسموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ کپڑے بننے والوں کو متحد جماعت کو سلی یا جانالو کہا جاتا تھا۔ دستکاروں کی حالت میں ترقی کی نشاندہی بارہویں صدی کے مچیرلا کتبے سے ہوتی ہے۔

منظّم تجارت و تاجروں اور دستکاروں کے درمیان باہمی لین دین کا مفہوم ٹیکس اور محصولوں کے ذریعہ سرکاری کنٹرول لاگو کرنا بھی تھا جو سن کادھی کارولو، سن کاویرگڈے اور نایک جیسے افسروں کے ذریعہ لیا جاتا تھا جو تجارت کی نقل و حمل پر نظر رکھتے تھے، سانتانگرامو کے ساتھ ساتھ تاجروں کے ذریعہ منعقدہ سبھی انگا ڈولو، انگاڈی ویدھی یا ہاٹ مارگ اور سانتا بھی ان کی دیکھ ریکھ کے دائرہ میں آتے تھے اور اڈاوٹا سنکامو (ایک طرح کا محصول) نامی ایک علیحدہ ٹیکس بھی وصول کیا جاتا تھا۔

1228 عیسوی کے (گن پتی دیوکے) وارنگل دورگ کے کتبے میں مختلف تجارتی تنظیموں کے ذریعہ کئے گئے آیا مولو کے تحائف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ معیاری اشیاء کی قیمتوں کو طے کیا جاتا تھا۔ اور ان میں کسی طرح کا اضافہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سکل نیتی سماتمو میں راجہ کو صلاح دی گئی ہے کہ وہ تاجروں کو غیر ملکی

اشیاء کالین دین نہ کریں۔ اگر وہ راجہ کے ذریعہ خریدنے پر بھی اشیاء کے دام بڑھادیتے ہیں تو ایسے تاجروں کو سزادے جو اپنی مرضی سے دام بڑھانے کی کوشش کریں۔ وزن اور ناپ تول پر راجہ کے جاسوسوں کے ذریعہ نظر رکھی جاتی تھی۔ موٹو پلی کتبات ایک ابھے یاشاسن تھا جو تجارت پر، کم از کم خارجی تجارت پر محصولوں کا معیار طے کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ 1124 عیسوی کے موٹو پلی کتبے کے ریکارڈ میں برآمد اور درآمد کی کچھ اشیاء کا تذکرہ ہے۔ اس میں متذکرہ کچھ تجارتی اشیاء اس طرح تھیں: کاڑی (ہاتھی)، تورگ (گھوڑا)، کنک (سونا)، رتن (قیمتی پتھر)، مونگا، تانبہ، جست، سیسہ اور ریشم کا دھاگہ وغیرہ۔

موٹو پلی کتبے کا ترجمہ

(سطر 135) اس باوقار مہاراج گن پتی دیو کے ذریعہ مندرجہ ذیل فرمان (یقین دہانی کے طور پر) کے ذریعہ سبھی براعظموں، جزیروں، غیر ممالک اور شہروں کو سمندری سفر پر جانے والے اور وہاں سے آنے والے تاجروں کو حفاظت باہم پہنچائی گئی ہے۔

(سطر 140) اس سے قبل ایک ملک سے دوسرے ملک کے لئے سفر شروع کرنے کے بعد، جہازوں اور بیڑوں کے ذریعہ لایا جانے والا سارا سامان جیسے سونا، ہاتھی، گھوڑے قیمتی پتھر وغیرہ راجاؤں کے ذریعہ زبردستی چھین لیا جاتا تھا، انہیں طوفان کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جہاز ٹوٹ جاتے تھے اور انہیں ساحل پر پھینک دیا جاتا تھا۔

(سطر 146) لیکن ہم ہمدردی کے طور پر، وقار اور اچھی صفات کے پیش نظر انہیں مقررہ محصول کو چھوڑ کر سب کچھ امداد کر رہے ہیں۔ جنہوں نے اس خیال سے سمندری مسافت کے بڑے خطرہ کا سامنا کیا کہ دولت زندگی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

(سطر 151) اس محصول کی شرح ہے (سبھی) درآمد اور برآمدوں پر 30 میں ایک۔

(سطر 154) ایک تولہ صندل پر، ایک پیگوڈا 1/4 فنم Fanm

(سطر 155) (دیسی) کافور، چینی کافور اور موتیوں کے ایک پیگوڈا قیمت پر 3/4 اور 1/4 فنم

(سطر 157) عرق گلاب، ہاتھی دانت، عطر، کافور کا تیل، تانبہ، جستہ، رسیسہ (؟) سیسہ، ریشم کے دھاگے، مونگے اور عطریات کے 1/4 اور 1/8 فنم

(سطر 162) کالی مرچ کے ایک پیگوڈا قیمت پر 3/4 اور 1/8 فنم

(سطر 163) سبھی طرح کے ریشم پر 1/2 5 فنم فی گانٹھ (؟ سوا روپ)

(سطر 165) فی ایک لاکھ سپاری پر ایک پیگوڈا 1/4 3 فنم

(قطع F28) گیارہ سو چھیاسٹھ بمطابق ساکا سال کرودھن نامی عظیم دیسیو یا کونڈا پٹن (جیسے موٹو پلی، گنپتی دیو نے (اس) ستون، کتبہ کو قائم کیا جو دائمی (قانون کے) انصاف (دھرم) کے کھمبے کی طرح ہے جو کالی دور کی دلدل میں لڑکھڑا رہا ہے۔

ای۔ ہولٹز، موٹو پلی پلر انسکرپشن آف گنپتی دیو، 45-1244 عیسوی، اپی گرفیکا انڈیکا، جلد XII، نمبر 22، ص 97-196۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD
Acc. No MA-02
Date 03.08.2015

نگرمو، ایک مقامی تنظیم جو مقامی تجارت کے انتظام کو دیکھتی تھی چولا دورِ حکومت کے تحت چلنے والی خود مختار تنظیم نگر کی طرح نہیں تھی ۔ یہ اشٹ داس پرجا کا ایک لازمی جزو تھی ۔ جس میں مہاجن ، نگرمو ، کمپولو ، اور بلنجا سیتی شامل تھے ۔ پیرو کتبے میں تیلگو نگرمو اور اور انکر مو کے درمیان جو امتیاز کیا گیا ہے دراصل وہ تمل نگرم اور تیلگو نگرم کی مرکز میں موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے ۔

تجارتی سماجوں کو ویشیا جانولو اور کوماٹی لفظوں کے ذریعہ جانا جاتا تھا ۔ کوماٹیوں کو پنساریوں ، تاجروں اور ساہوکاروں کی حیثیت سے جانا جاتا تھا ۔ جیسا کہ سولہویں صدی کے ویشیا پران میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ سیتی اور کوماٹی دس بندھ زینی امداد کے کام سے جڑے ہوئے تھے اور مندروں میں آنے والے نذرانوں وغیرہ کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے ۔

تاجروں کی بڑی پیشہ وارانہ تنظیموں جیسے ایاولے ، پیکاندرو ، نادیسی (مختلف خطوں سے) ، پردیسی (غیر ملکی جو پیشہ وارانہ انجمنوں کا حصہ تھے) ، ابھایا نادیسی اور سودیسی (مقامی) کی اپنی پرساستیاں تھیں ، جیسے تیلنگانہ میں ایاولے اور پیکاندرو ۔ سپاری ، عطر ، پان وغیرہ اشیاء کے لئے مخصوص تاجر بھی ہوا کرتے تھے ۔ 1303 عیسوی کے عالم پور کتبے سے ایک منظم داخلی ساخت کا پتہ چلتا ہے ۔ کم اشیاء کی اقسام ، ان کی نوعیت اور زرمبادلہ کے حجم کے اعتبار سے حیثیت اور خطاب کی درجہ بندی کی جاتی تھی ۔ ان میں سے کچھ انتظامی اہمیت کے عہدوں پر بھی فائز تھے یعنی بھنڈا اگار ادھیکش (گودام کا سربراہ جس میں مال گودام اور شاید خزانہ بھی شامل تھا) جس کو سیتی کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا اور اس کا تذکرہ ہرولا سمو کی کتاب میں ملتا ہے ۔

مدا ، گدیان ، چنا موا اور ساموجیسے سکے کاکتیوں سے وابستہ ہیں ۔ راجہ گن پتی دیو کو ’ دیا کجا کیسری ‘ کے مہر والے سکے جاری کرنے کا شرف حاصل ہے جن پر بطور کاکتیوں کی علامت جنگلی خنزیر کا نشان کندہ تھا ۔

کاکاتیہ دورِ حکومت کی نشاندہی تیز رفتار شہری آبادکاری سے کی جاتی ہے ۔ لہذا پوری ، نگر اور پٹن لاحقہ والے بہت سے شہر ظہور میں آئے ۔ صرف دستکاری اور تجارت کی موجودگی سے ہی شہروں کی شناخت نہیں کی جاتی تھی بلکہ پیشہ وارانہ ذاتوں سے بھی شہروں کی شناخت کی جاتی تھی ۔ اس طرح کے کچھ صنعتی مبادلہ کے مراکز کا بیان سولہویں صدی کی ادبی کتب میں ملتا ہے ۔ ان مراکز کی درجہ بندی کی شناخت مندروں کی شہروں ، شاہی شہروں یا سیاسی مراکز کی حیثیت سے کی جا سکتی ہے ۔ جہاں زیادہ تر معاشی سرگرمیاں صنعت اور مبادلہ سے جڑیں ہوئیں ہیں ۔ یہ فاضل تصرف کے مراکز بھی تھے ۔ مندر کی دولت اور معاشی سرگرمیوں میں مختلف پیشہ وارانہ گروہوں کی شمولیت تھی جہاں مندر شہری ترقی کی نمائندگی کرتا تھا ۔ خاص طور پر وہ مندر جو مذہبی زیارتی مراکز میں واقع تھے ۔ سیاسی مراکز میں دولت کا جمع ہونا ، فاضل دولت اور حکومت کے مختلف اداروں میں اسی کی از سرِ نو تقسیم سے شہروں کا دائرہ بڑھ گیا ۔ لیکن گیارہویں صدی سے قبل دستکاری اور تجارت مقامی نوعیت کی تھی ۔ ہنوما کونڈا پور جو ابتدائی کاکتیوں کی سیاسی سرزمین تھی ، اپنی سماجی اہمیت کے سبب ایک بڑا اقتصادی مرکز بن گیا ۔ دسویں صدی سے گیارہویں صدی تک ، کلیانی کے چالوکیوں کے تحت اور بعد میں کاکتیوں کے زیر سرپرستی حکومت کی قیادت میں ایسے مراکز کی ترقی کی راہ ہموار ہوگئی ۔ نالگونڈا ضلع میں پیرو ایک اور شہر تھا اور گیارہویں صدی میں ایک بندرگاہ بھی تھا ۔ بارہویں صدی سے ، تجارت کو بڑھاوا دینے والی ایک باشعور حکمت عملی اور سفری تاجروں کی نقل و حرکت کی وجہ سے ترقی کی رفتار میں اضافہ ہوا ۔

تجارت اور دستکاری کی سرگرمیوں کے پھیلاؤ اور جدت ، کثیر تعداد میں شہروں کے ظہور سے واضح ہوتی ہے ۔ جس میں شہری مراکز کی درجہ بندی کے طور پر اوروگالو (وارنگل) ، کاکتیہ راجدھانی کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل تھا ۔ اس راجدھانی میں ایک مندر اور ایک تالاب ، جنوبی ہند کا ابتدائی قلعہ تھا ۔ اس کے وقار کا تذکرہ پندرہویں سولہویں صدی کے ادبی شاہکاروں کریدا ابھیرامامو ، پرتاپ رودر چرتر موا اور سدھیشور چرتر مو میں کہا گیا ہے ۔ یہ ایکسیل نگرمو کے نام سے بھی مشہور تھا ۔ جس کے مختلف محلے واڈا تھے جیسے اکل واڈا اور ویشیکا واٹکا اور تیلیکیوں کے لئے کمپولو ، مداروں (ٹوکری بنانے والے) ، موہاری (درزیوں) کے لئے جوذات کی بنیاد پر منظم تھے اور وہاں ایک خاص گلی اور ایک بازار تھا جو راج مارگو مویا راج مارگ کی طرف جاتا تھا ۔ تیز رفتار تجارت متحرک آبادی میں جیسے مسافر اور زائرین دوسرے شہروں کو جاتے تھے اور دستکاری کو ، صنعت اور تجارتی مراکز سے اور وگلو کو ایک نمائندہ شہر کی حیثیت سے حاصل ہوگئی ۔

دوسرے مراکز جس میں دیہی اور شہری دونوں خصوصیات موجود تھیں اور مکمل تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل کر چکے تھے، جیسے پولاواسا پٹن (بارہویں صدی مغربی چالوکیوں کے ماتحت)، یہ پولاواسا کی حاکموں کی راجدھانی اور مغربی چالوکیوں کے ماتحت تھا۔ اس نے ایاولے 500 ابھے نانا دیشی، موموری دنڈوں اور دوسرے مقامات کے سفری تجارت کو متاثر کیا۔ کرناٹک اور آندھرا خطوں میں کئی شہروں کا جنم ہوا جن میں عالم پوری، مکتال گوند پورم (وارنگل ضلع)، مروتاڈو، نالگونڈا ضلع، گنٹور ضلع میں موٹوپلی اور کھمم محبوب نگر، کریم نگر ضلع میں، وغیرہ جانے مانے شہر تھے۔

تاجروں اور دست کاروں کی معاشی حالت نہ صرف قابل قدر حد تک بہتر ہوئی بلکہ تیرہویں صدی سے مال تجارت کی پیداوار پر زور دئے جانے کے سبب حالت میں بدلاؤ آیا۔ جس سے جنوبی ایشیاء اور دوسرے پڑوسی خطوں کے زیادہ وسیع نیٹ ورک کے ساتھ نئے روابط قائم ہوئے۔ وجے نگر دور حکومت میں اس میں مزید تیزی آئی۔

15.3.4 کیرل

کیرل نے مغربی ممالک کے ساتھ رابطے قائم کئے اور شاہی (چارٹروں) فرمانوں کے ذریعہ یہودیوں، عیسائیوں اور عربوں جیسے بیرونی تاجروں کو تجارتی شہر دیئے گئے یعنی انھیں آباد ہونے اور تجارت کے لئے ایسے مراکز دیئے گئے جہاں خاص تجارتی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ دوسرے ساحلی شہر بھی ظہور پذیر ہوئے جیسے کولیکوڈو، کولم وغیرہ جو مغربی ایشیاء کی تجارت کے لئے درمیانی بندرگاہ کا کام کیا کرتے تھے۔ انجوونم ایک تجارتی تنظیم تھی جس کے اجتماع نویں صدی سے دسویں صدی میں کیرل میں کانارا کے ساحل پر اکثر و بیشتر ہوا کرتے تھے جو بعد میں بھی جاری رہے۔ جنوبی کانارا میں پندرہویں سولہویں کے کتبات میں ہنزامانا غالبًا ابتدائی عہد وسطی کے انجوونم کی ہی نمائندگی کی گئی ہے۔ ایسے تجارتی گروہوں کی موجودگی اور ملے یالا خطہ سے آنے والے عربی گھوڑوں کی تاجروں نے کرناٹک اور کیرل کے ساحلی علاقوں کی اہمیت کو بڑھا دیا جیسے کوزی کوڈے کے نزدیک سلطان توپ خانہ کے ایک کتبے میں پندرہویں سے سولہویں صدی میں ایاولے کی موجودگی کا بھی حوالہ ملتا ہے۔

15.3.5 تامل خطہ

یہ تامل خطہ ہی ہے جہاں ابتدائی عہد وسطی کی معیشت کے ارتقاء کے لئے عمل کی، خاص طور سے تجارتی سرگرمیوں اور شہری ترقی کا پلوو۔ پانڈیا اور چول دور حکومت کے کتبات میں بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی سے نویں صدی عیسوی تک اور اس کے دوران برہمدیا اور مندر جیسے اداروں کے ذریعہ زرعی نظام کا باقاعدہ ارتقاء کرتے ہوئے ناڈو نامی زراعتی خطوں کے لئے ایک مبادلہ کے مرکز کی حیثیت سے نگرموں کے ظہور سے اس نے نہ صرف ایک زرعی خطہ کے روپ میں ناڈو کے مبادلہ کے نظام میں مدد کی بلکہ بین ناڈو لین اور بین لین دین کے لئے اس نے رابطہ کے مرکز کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ بعدازاں اس نے سفری تاجروں کی تنظیموں کے ذریعہ چلائی جارہی لمبی دوری کی تجارت میں مال لے جانے اور لانے کے کام کو بھی آسان بنا دیا۔ یہ ایک تجارتی نظام کا تدریجی ارتقاء تھا جس کے لئے تمل خطہ نے مختلف مراحل میں سب سے اہم ثبوت دستیاب کرائے۔ حالانکہ ایسے سبھی نگرموا اہم شہری مراکز نہیں بنے۔ ان میں سے کئی تجارتی راستوں پر واقع تھے۔ سفری تجارت کے درمیان تقسیمی مراکز کی حیثیت سے رابطہ جوڑنے کا کام کرتے ہوئے (تسائی ایرا ٹو اینوروار نانادیسی، ولانجیار اور ایاوولے)، مانیگرامم اور انجوانم بڑے قصبوں اور شہروں میں تبدیل ہو گئے۔ اس کے علاوہ برسر اقتدار خاندانوں کی راجدھانیوں اور بندرگاہوں نے بھی اس طرح کا رول ادا کیا۔ یہ سبھی مراکز مغربی ایشیاء اور جنوبی ایشیائی (سری لنکا) اور جنوب مشرقی ایشیائی خطوں کے ساتھ تجارتی سرگرمیوں کے ایک جال میں لین دین کے ایک بڑے نیٹ ورک کے ساتھ جڑ گئے۔ جہاں گیارہویں صدی سے سفری تجارت کی تنظیموں کے کتبات ظہور میں آنے لگے۔ غیر زرعی یا دستکاری کی صنعت اور تجارت کے نتیجہ میں شہری مراکز کا ارتقاء ہوا۔ جو شاہی مراکز کے علاوہ برہم دیہ اور مندر تھے۔ اور یہی اہم مراکز کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوئے۔ جیسے کاویری ڈیلٹا میں کادموکو یارائی، پالار سیار وادی میں کانچی پورم اور تامر پارنی گھاٹا وادی میں امباسمدرم (منارکوئیل اور تیروو السوارم) یہ عام طور سے کئی مندروں والے اور مجموعی مراکز تھے۔ ہر مندر شہر کی ترقی اور اس کی معاشی اہمیت کی نشاندہی کرتا تھا۔ دوسرے مراکز بڑے مندروں والے پاک اور زیارتی مراکز تھے جو تجارت اور تجارتی سرگرمیوں کو ترغیب دیتے تھے۔ ماملا پورم، کاویری پوم پٹینم، ناگاپٹینم شاہی بندرگاہیں تھیں جو حکمرانوں کی سرپرستی میں چلائی جاتی تھیں جہاں لمبی دوری کی تجارت کی موجودگی کی نشاندہی وہاں موجود غیر ملکی ایجنٹوں سے کی جاتی ہے (ناگاپٹینم میں چین کے ایجنٹ اور شاہی افسران

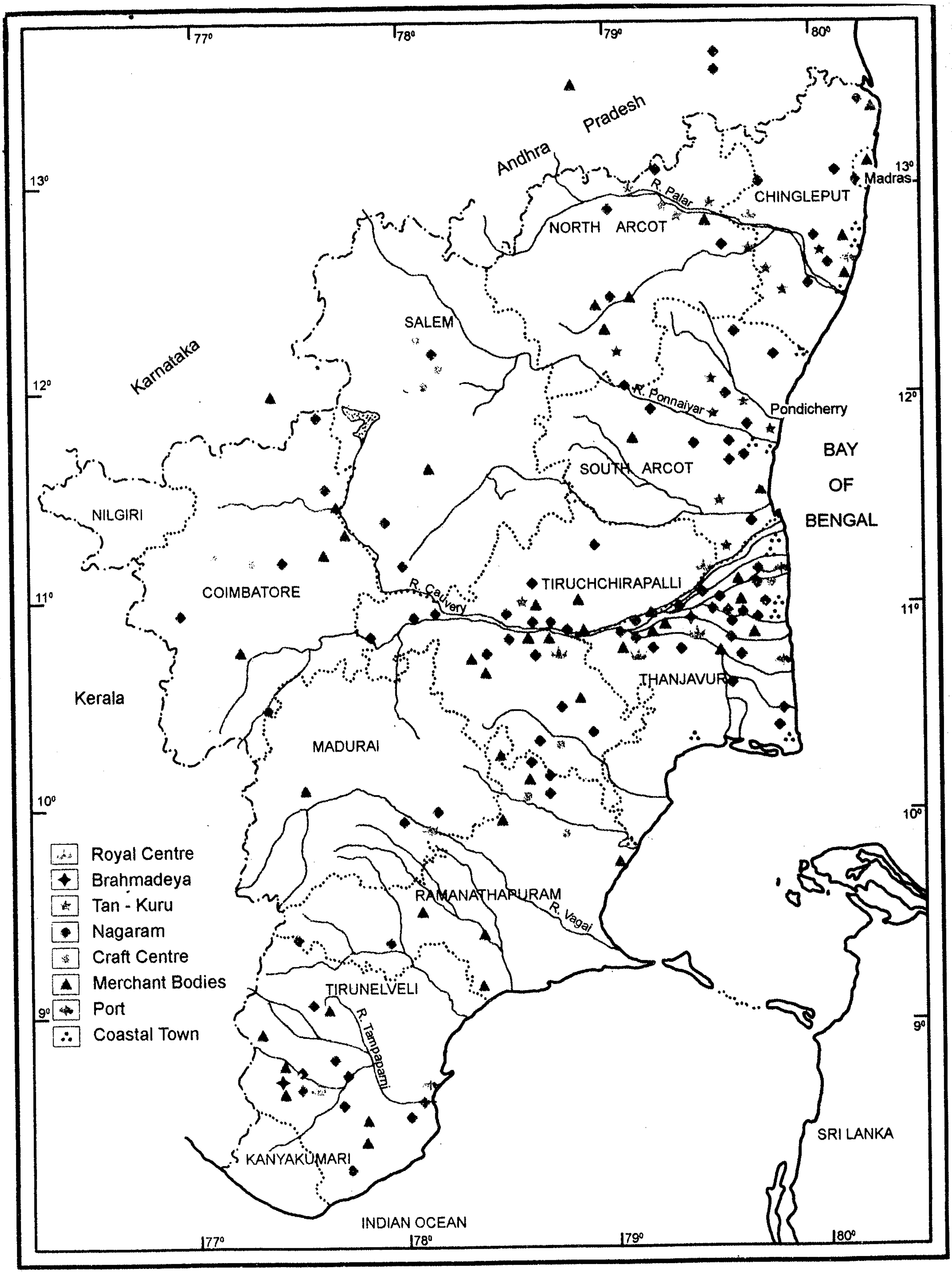

تامل ناڈو: ایک غیرزراعتی ہیئت، تقریباً۔1300اے ڈی، چمپک لکشمی، آر (1996) ٹریڈ، آئیڈیالوجی اینڈ اربنائزیشن: ساؤتھ انڈیا 300بی سی سے 1300اے ڈی نئی دہلی، او یو پی، صفحہ 245۔

جوایک دوسرے کے ساتھ لین دین کیا کرتے ہیں۔ چولا حاکموں کے ذریعہ چین کے ساتھ سفارت خانوں کا قیام اور محصولوں کا ختم کرنا (سنگم) ناگاپٹینم میں بدھ وہار جیسے مذہبی اداروں کی تعمیر یہ سب تجارت کوفروغ دینے کے لئے باشعور شاہی حکمت عملی کے اقدام تھے۔ چولا حکمرانوں کی جنوب مشرقی ایشیائی مہمات خاص طور سے سری وجیا بھی جنوبی ہند کے ہندوستانی تاجروں کو سہولیات فراہم کرانے کے لئے کی گئیں تھیں۔ جن کی موجودگی ان علاقوں میں اور دور دراز چین کی تجارتی اہمیت کی حامل تھی۔

دیہی شہری تسلسل (یعنی شہری دیہاتی تفریق کے بغیر شہری طرزعمل اور شہری سرگرمیوں کی طرف بتدریج منتقلی) کی سب سے بہترین مثال تامل خطہ میں شہری طرزعمل سے ملتی ہے۔ جہاں خاص خطوں میں برہمدیا اور مندر کے مراکز کے ظہور کے ساتھ ساتھ، برہمدیا کی معاشی سرگرمیاں اور مندر کے مراکز شہری ترقی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں کچھ انتظامی نوعیت کے مراکز تھے اور اس طرح ان کی سیاسی کارگذاریاں اور یا ان کی معاشی افادیت ان مراکز کے شہری کردار میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔ اس طرح کے خاص علاقہ کومبھا کونم، امبھا سمدرم اور کانچی پورم تھے۔ کچھ بڑے برہمدیا مجموعی بستیوں کی شکل میں وسعت پا گئے اور پیڈاگائی گاؤں اور نگرم (بازار) اور دستکاری کی پیداوار کے مراکز کے ہو جانے کے سبب وہ تنکورویا تانیور (آزاد بستی یا محصول اکائی) میں تبدیل ہو گئے۔

نگرم

نگرم کے بڑے تعداد میں ظہور پذیر ہونے سے ان بازاروں نے چولا دور حکومت کے تحت تین مراحل میں اپنی تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ کے ساتھ اپنی ترقی کی رفتار کو بنائے رکھا (چولا دور حکومت 1070-985 کے وسط میں مزید نمایاں تھا)۔ چین کے لئے ڈبلیو-ہیکنر کے ذریعہ وضع کیا گیا تجارتی نظام اور مراکز کا نمونہ یا ماڈل نے کینتھ آر-ھال کے ذریعہ تامل نگرم کے مطالعات کو متاثر کیا۔ ہرناڈو میں کم سے کم ایک نگرم کی شناخت کی گئی یہ نگرم شہری ترقی کی امکانی مراکز تھے لیکن پھر بھی جو مراکز تجارتی راستوں میں واقع تھے اور سیاسی اور تجارتی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے وہی بڑے شہری مراکز کے روپ میں ترقی پا سکے۔ نگرم نے گیارہویں صدی سے اندرون ملک اور بیرون ملک تجارت کے لئے ایک وسیع نیٹ ورک کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس تجارتی نیٹ ورک کی امتیازی خوبی تھی اروراپٹینم یا تمل خطہ کے مستند تجارتی شہروں (یعنی حکومت کے ذریعہ منظور شدہ یا چارٹریا ایک تجارتی طور پر محفوظ شہر) سے تجارت کی انھیں مسلح فوجیوں کے ذریعہ حفاظت مہیا کرائی گئی تھی اور گیارہویں صدی سے سفری تاجروں کی تنظیموں کے لئے محفوظ گوداموں اور تقسیمی مراکز کی حیثیت سے ظاہر ہونے لگے۔ پرانے سکوں کے ثبوتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کی دسویں صدی اور خاص طور سے گیارہویں صدی سے معیشت میں جزوی طور پر زر مبادلہ کی اہمیت بڑھنے لگی تھی۔ خرید وفروخت اور تجارت میں مہارت کے سبب تنظیموں جیسے سالیہ نگرم کپڑا بننے کے ساتھ ساتھ اس کی تجارت کرنے والے سنکراپڈی نگرم، (تیل کشید کرنے والے تاجر) اور پراگا نگرم (غیرملکی تاجر) کا ظہور ہوا۔ تیل کی تجارت کرنے والے وانیا نگرم تیل کشید کرنے والی ایک بڑی تنظیم جس میں مختلف خطوں کے تاجر شامل تھے جس کا موازنہ آندھرا میں وجے واڑہ کی تیلیکی کیا جا سکتا ہے۔ گھوڑوں کی تجارت ایک اور پیشہ وارانہ تجارتی مہارت تھی جو پورے عہد وسطی میں تقریباً پوری طرح ملائی منڈلم (کیرل) سے آئے تاجروں کے ہاتھوں میں تھی۔ عربی گھوڑوں کی تجارت خاص طور سے گجرات سے لے کر کیرل تک مغربی بندرگاہوں پر ہوتی تھی اور تمل خطہ انھیں حاصل کرنے کے لئے اور آمد ورفت کے لئے کیرل کے تاجروں پر منحصر تھا۔ کچھ دستکاری تنظیموں جیسے کپڑا بننے والے اور تجارتی تنظیموں کے درمیان گہرے تعلقات تھے۔ تجارت کے مختلف مراکز میں چترامیلی پری یانڈو اور تیسائی ایرٹاوانیوروار کے مشترکہ امدادی کاموں کی خاص اہمیت ہے کیوں کی تجارتی سرگرمیوں کی ایسے مقامات میں مندروں کے لئے مخصوص امداد کے لئے بارہویں سے سولہویں صدی میں زرعی تجارتی انجمنوں اور تجارتی انجمنوں کے ایک فورم پر ایک ساتھ ملنے سے ان کی ادارتی اہمیت میں اضافہ ہوا جب کہ چولا حکومت کا زوال ہو رہا تھا۔ اس کے زوال سے ایک نیا پس منظر سامنے آیا جس کے تحت اس طرح کی تنظیموں نے جنوبی ہندوستان اور ایشیاء کی تجارت میں ایک خاص اہمیت حاصل کر لی۔

تجارتی راستے

پوڈوکوٹائی اور رام ناتھ پورم، سالیم اور کوئمبٹور جیسے خطے ایسے راستوں پر واقع تھے جو تمل ناڈو کو کرناٹک اور کیرل سے جوڑتے تھے اور مزید جنوب کی طرف سری

لنکا لے جانے والی خلیج منار سے ان کی تجارتی اہمیت سنگم دور سے ہی ہے اس کے ثبوت punch-marked coins کے ۔ وہ ابتدائی تمل براہمی تحریری کتبات اور رومن سکوں کے ذخیرہ کی تقسیم (تقسیم کے بیان کے لئے اکائی 10 کا نقشہ 2 کا دیکھئے) سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ عہد وسطی تک باقاعدہ جاری رہا اور انھوں نے مغربی ساحل سے شمالی ساحل تک تجارت کی نقل اور حرکت میں مدد دی۔ ساحلی شہروں جیسے تروپلی ونم، مائلا پور، مالا پورم اور آگے جنوب میں کاویری پم پٹینم، ناگپا پٹنم (چولا ساحل پر) تونڈی، کائیل اور پانڈیا ساحل پر دوسرے شہروں کے ظہور سے ساحلی راستوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تونڈی تیتا نداتن پورم ایک اہم ساحلی شہر تھا جہاں مختلف تجارتی گروہ یعنی انجوونم مانیگرامم اور سمنت پنڈا سالی کے ذریعہ مقامی مندر کو مذہبی امداد دینے کے لئے مقررہ محصول کی وصولی کے لئے ایک معاہدہ کیا گیا۔ تیرہویں اور چودہویں صدی کے لئے کامودی اور پرانملائی کتبات 18 پٹینموں، 32 ولار پورموں اور 64 کادی گیٹا ولموں کا بیان کرتے ہیں جس میں سبھی متفرق شہروں کی ابتداء کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو جنوبی ہند کے نظام میں مختلف قسم کی اہمیت رکھنے والے ساحلی شہروں کے میلوں اور بازاری شہروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کونگو خطہ میں جہاں موڈی کونڈہ چولا پورم ایک اہم تجارتی مرکز تھا، کاویری کے جنوب اور شمال میں واقع کئی شہر ظہور میں آئے جہاں تاجروں کی نقل اور حرکت کافی حد تک بڑھ چکی تھی۔ پیریرو قابل ذکر اہمیت کا حامل تھا اور ایک بڑا شہر تھا جہاں چکرورتی لقب والے تاجروں کا بہت زیادہ اثر ورسوخ تھا۔

دستکاری پیداوار

دستکاری پیداوار والے خطوں کا پتہ لگانا کافی مشکل کام ہے۔ حالانکہ روایتی کپڑے کی صنعت اور بنائی کے مراکز جدید دور تک جاری رہے (یعنی چنگل پوٹ، کوئمبٹور مدورائی سیلم، تنجور، تری چراپلی ترونیل ویلی ضلع)۔ بنائی کو ایک صنعت کے روپ میں چولا دور قبل سے ہی جنوبی ہند کے حکمرانوں کے ذریعہ باضابطہ طور سے بڑھاوا دیا جاتا تھا۔ قدیم بنائی کے مراکز پر چولوں کے دور حکومت میں خاص توجہ دی گئی اور نئے بنائی کرنے والوں کی بستیوں کو بڑھاوا دیا گیا تھا۔ ایسے کئی کپاس پیدا کرنے والے خطے تھے جن کے نزدیک بنائی کے مراکز ظہور پذیر ہوئے۔ لیکن اہم مرکز کے طور پر کانچی پورم پر چولوں نے خاص دھیان دیا۔ مدورائی بھی یکساں طور سے اہمیت کا حامل تھا کانچی مہاناڈو یا بنائی کرنے والی پیشہ وارانہ تنظیم کی نمائندگی کرنے لگا جو کپڑے کی پیداوار اور خرید اور فروخت اور اس کی تجارت پر کنٹرول رکھتا تھا۔

دستکاری کی پیداوار کونگو خطہ میں زیادہ وسیع پیمانہ پر کی جاتی تھی۔ جہاں بارہویں صدی سے چودہویں صدی کے کتبات میں بڑے پیمانے پر فنکارانہ (کمالار) سرگرمیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور مخصوص رعایتوں اور اہم بلدیاتی فرائض کی حصہ داری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے پر منحصر معاشی گروہوں نے دستکاروں کو خاص رعایتیں دیں اور انھیں خاص پناہ دی۔ جس سے اعلیٰ طبقہ اور تاجروں کے باہمی مفاد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایروڈے میں گیارہویں صدی عیسوی میں دستکاروں کو تجارتی تنظیموں کے ذریعے پناہ گزین مراکز مہیا کرائے گئے۔ ذات/ پیشہ وارانہ جماعتوں کے دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم (انولوم رتھ کار) نے بھی دستکاری کو امداد اور مندر کی تعمیر یا مجسموں کو قائم کرنے میں حصہ دار کے ذریعہ اپنی حیثیت کی تدریجی ارتقاء کرنے میں مدد کی۔

چولا دور حکومت میں بھی امبالہ ناڈو میں مرکانم سے لے کر ویدار نیام تک مشرقی ساحل پر نمک بنانے کے مراکز کا ایک سلسلہ ظہور پذیر ہوا۔ لیکن نمک بنانے کا کام حکومت کے ذریعہ منظم کیا جاتا تھا اور حکومت کے اہلکار ہی مقامی مندروں کے اس پر لاگو محصول کے نظام کو دیکھتے تھے۔ نمک کو نگرم کے دائرۂ اختیار سے بڑی احتیاط کے ساتھ دور رکھا گیا۔ نگرم نمک کے علاوہ سبھی استعمال کی اشیاء پر محصول طے کرتے تھے اور اسے لاگو کرتے تھے۔

15.4 جنوبی ہند کی تجارتی تنظیمیں

تجارتی یا تاجر جماعت کو عام طور سے بلانجہ کے نام سے جانا جاتا تھا جو ویر بلانجہ (بناجو، بناجیگا، وانیگا وغیرہ) کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ یا ضابطہ اخلاق کو لاگو کرتے تھے اور جنوبی ہند کے علاقوں اور مشرق کے دور دراز ممالک جیسے برما، ملیشیاء، اور سماترا سے تجارت کیا کرتے تھے۔ آٹھویں صدی میں کرناٹک میں ایہول کے باشندوں ایاولے کے 500 سوامی دوسرے علاقوں میں ہجرت کر گئے اور دسویں صدی تک تمل خطہ میں اصل تجارتی راستوں پر ظاہر ہونے

لگے ،انھوں نے عرفی ناموں کا ایک تفصیلی سلسلہ اختیار کر لیا جیسے ابھے نانا دیسی ،مماری دنڈ ،اینوروار ،سوامی گلو ،پیکنڈرو ،نانا دیسی پیکنڈرو اور گوارے۔ 1292ء تری پورناٹکم کتبے کی ایک تفصیلی پرساتی نے بھی رائج طرز عمل کو اپنایا۔اور اپنے قصہ کہانیوں کے وجود کو روحانی قوتوں سے جوڑا، اور افراد کی انفرادی خوبیوں کی ان کے اصولوں اور ایمانداری اور اخلاق کے باوقار تعریف کی۔اس لئے مارکو پولو اضافی ثبوت مہیا کراتا ہے جیسے دیوتاؤں کے لئے ان کا اپنے آپ کو وقف کر دینا، برہمنوں کے تئیں ان کی عقیدت، اپنے آپ کو برہمنوں سے بڑھ کر ثابت کرنا، ان کی سماجی حیثیت و مرتبہ، برہمن اور چھتریوں کے مقام تک پہونچنے کے لئے جدوجہد کے دعوے اور ان کی دولت مندی اور اثر رسوخ۔

ان کی سرگرمیاں بارہویں صدی تک کافی بڑھ گئیں۔(1134ء کا بیلگاؤں کا کتبہ) کئی نگرموں اور گراموں میں ان کی موجودگی کا ثبوت بیجاپور میں بیلگاؤں اور دھارواڑ ضلع میں حاصل شدہ ان کے کتبات میں ملتا ہے بارہویں صدی کے بعد بھی یعنی تیرہویں صدی (کاکاتیہ دور حکومت) سے وجے نگر سلطنت کے زوال تک، ان کے کتبات دکن اور آندھرا خطوں میں ملتے تو ہیں لیکن نسبتاً کم نظر آتے ہیں کیوں کی اس دوران جنوبی ایشیائی تجارتی نیٹ ورک میں تجارت اور دوسری سرگرمیوں کی نوعیت میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکیں تھیں۔ان کی سرگرمیوں کی جیتی جاگتی تصویر کشی بیلگاؤں کے 1184 عیسوی کے کتبے میں کی گئی ہے۔جس میں ان کا اصل مقام اور پانی اور خشکی کے راستہ سفر کرتے ہوئے اپنی اشیاء تجارت کے ساتھ مختلف خطوں میں داخل ہونا نیز اعلی نسل کے ہاتھی، گھوڑے بڑے قیمتی پتھر، کرسٹل، موتی، لال پتھر، ہیرے، سلیمانی پتھر، پکھراج، مونگا پنا، کارکیتنا اور کم قیمت کی بے شمار اشیاء پھیری اور پٹری لگانے والے کے علاوہ غیر ملکی تجارت میں وہ بڑے پیمانہ پر لین دین کیا کرتے تھے۔

تمل تاجر جو خود کو تسائی آئیرٹو اینوروار کہتے تھے، کا سمندری تجارت میں خاص طور سے ساترا اور برما کے ساتھ اہم رول تھا۔آندھرا اور تمل خطہ میں وہ مختلف مندروں کو محصول سنکا کا نذرانہ دیا کرتے تھے۔قیمتی پتھروں اور کم قیمت والے پتھر جیسی عیش عشرت کی اشیاء کے علاوہ وہ زرعی پیداوار کی بھی تجارت کیا کرتے تھے جیسے اناج، چنا، تیل یعنی کھلی، کپاس، اون اور کپڑا۔محصول (سنکا پیٹا سنکم ساناتاس) کو جمع کرنے میں انکا رول اور ان کا اثر رسوخ بارہویں صدی سے تیرہویں صدی میں واضح طور سے دکھائی دیتا ہے اور کاکاتیہ دور کے آخر میں اور اس کے بعد یہ مزید بڑھ گیا۔سنکا تجارتی کارگذاریوں کے مختلف مراکز۔موجود اشیاء پر لگنے والا خاص محصول تھا۔وہ سامیا دھرم کے ماننے والے تھے جس کے تحت مذہب کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جاتی تھی اور امتیازی خدمات کے لئے لوگوں کو خطابات اور انعامات اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا جیسے پرتھوی سیتی تاجروں کا مہانا ڈو اکثر مندروں کے منڈپوں پر اجتماع کی شکل میں ملا کرتا تھا۔

مختلف تاجروں کے درمیان تنظیموں کے باہمی تعلقات کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔نہ ہی یہ بات واضح ہے کی ابتدائی عہد وسطی کے دوران ہی ان تنظیموں کی درجہ بندی کا ارتقاء ہوا۔اپنے ویرشاشنوں کے ساتھ ایاولے 500 ان انجمنوں میں سب سے اہم معلومات دیتی ہے اور یقیناً یہ سفری تاجروں کی تنظیموں میں سرفہرست رہی ہوگی یہ تاجر، تجارتی کارواں (تیلگو میں ساتو اور تمل میں ستو) کی شکل میں سفر کیا کرتے تھے جس کا حوالہ فرشتہ (تقریباً 1560-1620) اور ابن بطوطہ (م 1377) میں دیا گیا۔

اشیائے تجارت کی بین علاقائی نقل اور حمل ان ہی تنظیموں کے ذریعہ کنٹرول کی جاتی تھی اور ہم محسوس کرتے ہیں کی جنوبی کرناٹک میں ایاولے 500 جو اپنے آپ کو جنوبی ایاّولے کہتے تھے تسائی آئیرٹو اینوروار گیارہویں صدی سے آندھرا خطہ میں باقاعدہ آیا جایا کرتے تھے۔تامل تاجر بھی آندھرا کی تجارت میں گیارہویں اور تیرہویں صدی تک نظر آتے تھے۔کتبوں میں چول منڈل مناویاپاری کا حوالہ ملتا ہے اور کولوتنگا اول کے دور حکومت کا وشاکھا پٹنم کتبے میں اس مقام کا کولوتنگا چول پٹن اور چول پانڈیا پور کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے۔جہاں پانچ سو اور انجونم موجود تھے۔چالوکیہ چول حاکموں اور کولوتنگا کے دور حکومت میں موٹوپلی کی بندرگاہ (دیسی ایا کونڈا پٹن) کا ایک تجارتی ایمپوریم کے روپ میں ظہور ہوا اور اسے کاکاتیہ گن پتی دیو (1190-1252) کے دور شاسن میں 1245ء کے ابھے شاسن کے ساتھ ساتھ باقاعدہ طور سے ترقی دی گئی ہے۔چول پانڈے پور کے نام سے مشہور گھنٹ شالا بارہویں صدی کا ایک نگرموں تھا۔

بارہویں صدی کے وسط کے بعد غیر ملکی تجارت میں شمولیت کی واضح علامات ہیں جو تیرہویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان میں سمندری درآمدات سے ثابت ہوتا ہے۔ یوآن شاہی خاندان کے دور حکومت میں جنوبی ہند میں بھیجے گئے چینی تجارتی وفود سے جنوبی ہندوستان اور اس کے بعد کے دور میں سمندری تجارت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ عیش وعشرت کی اشیاء سے لے کر روزمرہ کی ضروریات کی اشیاء جیسے رنگ، سوتی دھاگہ، کپڑے، خام لوہا، کالی مرچ اور گھوڑے وغیرہ۔ سمندری تجارت کی اشیاء میں تبدیلیوں کا تذکرہ ایاولے کتبے میں خاص طور سے دکھائی دیتا ہے۔ یہ مال جنوبی ہندوستان میں جہاز پر لادنے کے لئے کیسے آتا تھا اور اس کے جہازراں کون تھے؟ یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ تجارتی انجمنوں کے ذریعہ اپنے ایجنٹ دور دراز ممالک میں بھیجے گئے تھے اور انہوں نے تجارتی مراکز قائم کئے تھے۔ (مثلاً تکواپا۔ منی گراموں جزیرنما ملایا میں اور پاگن۔ ایاولے۔ برما میانمار میں۔ اس میں پہلا مقام اور دوسرے Guild کی نمائش کرتا ہے) تاجروں کے رسوخ راجاؤں سے ہوتے تھے۔ سری لنکا میں چول حملوں میں اس طرح کے باہمی رسوخ کارفرما تھے۔ چول حکمرانوں کی غیر ملکی حکمت عملی، غیر ملکی تجارت کے پھیلاؤ کے مقصد سے وضع کی گئی تھی۔ جس میں چول حکمرانوں اور تاجروں دونوں کی باہمی تجارتی مفاد شامل تھے۔ یہ مہمات لوٹ مار کے لئے نہیں بلکہ تجارتی مقاصد کے لئے کی جاتیں تھیں جو چول تجارتی پالیسی کا ایک حصہ تھی اور چول حکمرانوں کے باہمی نفع کمانے کی غرض سے تاجرں سے اچھے تعلقات تھے۔ شمالی سری لنکا میں چول کتبے، منتائی سے ٹرنکومالی تک پائے جاتے ہیں جہاں پولونروواا ہم مرکز تھا۔

شمالی سری لنکا پر جو چولوں کا اختیار، جنوب مشرقی ایشیاء کے ساتھ سری لنکا کے تعلقات میں ایک رکاوٹ معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور سے جاوا اور بالی کے ساتھ سنہالی تعلقات میں۔ سری لنکا قیمتی پتھروں سے مالا مال تھا جیسے لال پتھر، پکھراج، اور نیلم۔ عربی کی تحریر میں جسے اخبار السند والھند سفری سرگذشتوں کا ایک مجموعہ اور ابن خورداد بہ کی تصنیف میں بھی کالی مرچ، عطر، مشک، ہیرے جوہرات، سونا اور موتیوں کے حوالے ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خوشبودار اور مصالحے سری لنکا کو برآمد کئے جاتے ہیں۔ شمالی مغربی سری لنکا میں منتائی (مہاتیتا) ہی چولوں کے لئے داخلی دروازہ کا کام کیا کرتے تھے۔ منتائی ابتدائی عہدوسطی کا ایک بڑا ایمپوریم تھا جس کا موازنہ خلیج فارس پر واقع سیراف سے کیا جاسکتا ہے۔ کالی مرچ کی چین اور مغربی ممالک میں اونچی قیمت ملتی تھی اور اس کی مانگ میں تیرہویں صدی عیسوی میں کافی اضافہ ہوا۔

چولا اور جنوب مشرق میں ایشیاء کے درمیان تجارتی تعلقات کی وضاحت گیارہویں صدی کے ابتدائی ناگا پٹنم ریکارڈ اور چولا حکمرانوں کو کمبوجا کے تحائف اور چین (1077 عیسوی) کو بھیجے گئے چول وفود کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جنوب مغرب میں ایشیاء میں کادارم یا شری وجے کی طرف چول حکمراں راجیندر کی سفری مہمات ایک ساحلی سفر ہی تھا۔

چول حملوں کا مقصد تھا ''شری وجے کی دخل اندازی سے ہندوستانی تجارتی مفاد کی حفاظت کرنا''۔ چین کے سنگ شہنشاہوں اور جنوب مغربی ایشیاء میں شری وجے کی حکمرانوں نے بھی ان خطوں میں غیر ملکی تجارت کو بڑھانے اور تمل بولنے والے تاجروں کے لئے تجارتی اختیارات حاصل کرنے کی شفارس اور کوشش کی، کینٹن کا شری وجے کتبہ اگر اس کا صحیح ترجمہ کیا گیا ہوتو اس سے ایک غیر معمولی سفارتی حکمت عملی کا علم ہوتا ہے جو کینٹن میں چول حکمرانوں کی تجارتی سرگرمیوں میں پہلے سے موجود تھی۔ (اس میں کولوتنگا اول کی طرف سے کینٹن میں تاؤنزاد خانقاہ کو ایک امداد دینے کا ذکر ہے) 1088 عیسوی تک ایاولے پیشہ وارانہ انجمن سماترا میں باروس کے نزدیک قائم ہو چکی تھی۔ چول حکمراں سمندری تجارت کے منافع میں انفرادی طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔

پیران مالی (تیرہویں صدی کا آخری نصف حصہ)، کوئیل پٹی (ترچی ضلع 1305)، تیرو ورنکیور یچی (ترچی ضلع) سے حاصل شدہ تحریری دستاویز میں درآمد ات اور برآمدات کا تذکرہ ہے۔ ان میں متذکرہ اشیاء میں شامل ہیں: سپاری، کالی مرچ، جڑی بوٹیاں، لوہا، روئی، موٹا کپڑا، سوت، موم، یاک کا تیل، کافور کا تیل، عطریات، گھوڑے، اونٹ؟ (aloe) صندل وغیرہ، استعمال کی خاص اشیاء تھیں۔ لونگ۔ لوبان، سونٹھ، اباکا کپڑے (Abaca cloth)، چھتریاں، تلواریں، بوتل پیٹھا، کھجور، ریوند چینی، غلام، مور، جاوائی لوبان، پوٹ چوک (Putchuk)، مارگوسا بارک (Margosa bark)، تربوز، خربوز، سفید پھول، ناریل، الائچی، شراب کے پیالے، اور بہت سی دوسری اشیاء۔ چینی اور جنوبی ہندوستان کی فہرستوں میں عام استعمال کی یکساں چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ صندل اور کافوران دو چیزوں کی بحر ہند کی تجارت میں خاص مانگ تھی۔ خوشبودار مصالحے بھی ایک اہم تجارتی چیز تھے۔ کیونکہ ان مخصوص اشیاء کی مانگ

لگا تار بڑھ رہی تھی۔لوبان مغربی ایشیاء سے آنے والی واحد تجارتی چیز تھی جبکہ خوشبودار مصالحے زیادہ تر جنوب مشرقی ایشیاء سے آتے تھے۔

ایاولے کتبے میں پانڈیا ریاست سے درآمد کی جانے والی اشیاء کی ایک بڑی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے۔تمل ناڈو کے مشرقی ساحل (پانڈیا) پر چودہویں صدی کے کائیل پٹنم اورٹنن داتاناپورم (ٹونڈی) کے کتبات تجارتی تنظیموں اور اشیاء کے ذخیروں کے حوالے دیتے ہیں جیسے کہ مانی گرامم اور سامنت پنڈ سالی۔آندھرا میں جاگی سربراہوں کا چنتاپالے کتبہ (گنٹور ضلع) اور گن پتی دیو کا موٹو پلی کتبہ (1184 عیسوی) اس خطہ کی داخلی اور بیرونی تجارت اور سمندری تجارت کی اشیاء کے حوالے دیتے ہیں۔

اس تجارت کی شاخوں در شاخوں میں جنوب مشرقی ایشیائی ممالک، شری لنکا اور جنوبی ہندوستان سے ہوکر چین سے مغربی ایشیائی خطوں تک علاقوں اور مال تجارت کی جنسوں کا ایک طویل سلسلہ شامل ہے۔اس کے علاوہ گجرات ساحل پر بھی جو زیادہ تر ہندوستانی تجارت کو مغربی ایشیاء سے جوڑتا تھا، باقاعدہ سمندری آمدورفت جاری رہتی تھی۔جو اسے ہرمز اور دوسرے وسطی ایشیائی علاقوں و شمالی چین سے جوڑتی تھی۔مارکوپولو، چین کو کالی مرچ، قیمتی پتھر اور موتیوں کی تجارت کی اہمیت بیان کرتا ہے۔مابار، پانڈیا خطہ، سے چین کے لئے سفیر بھیجے گئے (1283 اور 1284 عیسوی) اور چین سے بھی سفیر کولم (1279 عیسوی)، مغربی ساحل پر مخصوص بندرگاہ تک پہنچے۔

سمندری تجارت خاص طور سے مغربی ایشیاء اور مصر (قاہرہ) و چین کے ساتھ خصوصاً مغربی ساحل سے ہوتی تھی۔جہاں کولم ایک اہم بندرگاہ کی حیثیت سے کام کرتا تھا، گنیزا دستاویز اور یہودی خطوط وغیرہ بحیرہ روم یعنی اٹلی، سسلی، مراکو اور لبنان (سیریا) کے ساتھ تعلقات کے واضح ثبوت پیش کرتے ہیں۔کریمی کے نام سے مشہور مصری بلدیاتی تنظیم کالی مرچ اور مصالحوں کی تجارت کرتی تھی۔وہ تیرہویں صدی تک چول، پانڈیا اور کاکتیہ دور حکومتوں میں گجرات اور جنوبی ہندوستان کے ہندوستانی تاجروں سے مالِ تجارت حاصل کیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ سنہالا جزیرہ سے بھی۔چین کے سنگ اور بعد میں یوآن حکمرانوں نے بھی اس تجارت کو بڑھاوا دیا۔برصغیر ہندوستان اپنی مختلف برآمدات کے بدلے ادائیگی کی شکل میں سونا، چاندی اور تانبہ حاصل کرتا تھا۔چین میں چیزوں کے لین دین کی شکل میں ادائیگی کو اہمیت دی جاتی تھی۔گنیزا دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے والے یہودی تاجروں کو اپنے تجارتی میزان کو بنائے رکھنے کے لئے سونے کی شکل میں ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔مصر کو بھیجے جانے والے مصالحوں نے یوروپ اور مصر (وجے نگر دور کی Venetian sequins) سے ہندوستان کو مستقل طور پر سونے کی سپلائی ممکن ہوئی۔لیکن گھوڑوں کے درآمد سے زر (currency) کے اخراج کی ایک اہم وجہ تھی، سونے کے باہر جانے کا یہ پہلو، خاص طور سے چول دور حکومت کے بعد، معیشت کا ایک ایسا پہلو ہے جس کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ایاولے اور منی گرامم کے ذریعہ خرید و فروخت کی جانے والی تجارت کی اشیاء میں مختلف انواع کی چیزیں شامل تھیں جیسے کپڑے، لوہا، صندل کی لکڑی (اگارو، آگھل)، سپاری اور پان، گوگل، کافور، عطریات، کپاس اور سوتی کپڑے۔اس لئے کتائی اور بنائی کی ٹکنالوجی کو باشعور طور پر ترقی دی گئی اور جنوب مشرقی ایشیاء، ہندوستانی کپڑوں کے لئے ایک اہم بازار بن گیا۔کپاس کی متحرک تجارت کا پتہ چینی سرگذشتوں سے چلتا ہے۔(پاتولہ۔چودہویں صدی)۔کپڑا مغربی بازاروں کو بھیجا جانے والا اہم برآمد تھا۔حالانکہ گھوڑوں کو پالنے کا علم جنوبی ہندوستان میں نہیں تھا۔گھوڑے ہمیشہ تروشکا، کمبوجا، اور ویاوان سے درآمد کئے جاتے تھے۔موٹو پلی کتبات (میرا ابراہم ص 170) میں بہت سے تجارتی سامان کے حوالے ملتے ہیں۔لوہا اور اسٹیل (wootz) جنوبی ہندوستان کے بہت سے حصوں سے برآمد کیا جاتا تھا۔ہندوستانی اسٹیل، جس سے مشہور دمشقی (Damascus) تلواریں بنائی جاتی تھیں، ہندوستان سے برآمد کی جانے والی سب سے اہم چیز تھی۔جیسا کہ گنیزا دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے۔زعفران، جڑی بوٹیاں، موتی، کالی مرچ، پوٹ چوک (Putchurk)، عرق گلاب، صندل، موم اور شہد و ریشم کی مختلف قسموں کی بھی تجارت کی جاتی تھی جبکہ چینی ریشم کی چول اور پانڈیا ممالک میں درآمد کیا جاتا تھا۔

15.5 جنوبی ہند میں بنکر، کپڑے کی پیداوار اور تجارت

کپڑے کی دستکاری، جنوبی ہندوستان میں عیسوی سن کی ابتدائی صدیوں سے ہی اہم دستکاری رہی ہے اور یہ جدید دور تک جاری وساری ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ میں یہ فن مختلف خطوں میں ارتقاء پذیر ہوا۔ نا صرف سماج کے ہر طبقہ میں اس کی اہمیت کے سبب بلکہ حکومتی سرپرستی، اونچے طبقہ کی مانگ اور مندر کی ضروریات کے پیشِ نظر تمام معاشی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا۔

بنائی کے روایتی مراکز عہد وسطیٰ سے لے کر کم وبیش صدیوں تک جاری رہے۔ ان کے کسی خاص مقام میں قیام کا سبب کچے مال کی دستیابی تھا۔ مثلاً کپاس، کالی مٹی سے مالا مال علاقوں میں، نباتاتی رنگوں اور رنگوں کو چٹکیلا بنانے والے مادوں کی سہل دستیابی، ہنر مند کاریگروں، آمد ورفت اور خرید وفروخت کی سہولیات

عہد وسطیٰ کے جنوبی ہندوستان میں بنائی مراکز، 1000-1500 عیسوی۔
وجیاراماسوامی، (1985)، ٹیکسٹائلس اینڈ ویورس ان میڈیول ساؤتھ انڈیا، او۔یو۔پی۔نئی دہلی۔صفحہ 7۔

اور بندرگاہوں سے نزدیکی وغیرہ۔ کالی مٹی والے خطے جیسے کوئمبٹور، تمل ناڈو کے مدورائی اور رام ناتھ پورم وترونیل ویلی اضلاع، شمالی کورومنڈل (آندھرا پردیش) چیرال، گنٹور، ایلورو وغیرہ اور بیجاپور میں دھارواڑ اور بیلگاؤں (کرناٹک) بنائی مراکز کے لئے جانے جاتے ہیں۔

کپڑا بننے والی جماعتیں مختلف ناموں سے جانی جاتی ہیں جیسے دیوانگاس، اصلاً آندھرا و کرناٹک خطوں سے آئے تھے جو بعد میں وجے نگر دور میں تامل علاقے میں چلے گئے۔ ساتویں صدی سے مشہور تامل ناڈو کے کیکول، سالک سماج یا سالے یا سالیہ جو اکثر پدم سالے اور پٹو سالے (سنسکرت میں سالے کے معنی ہیں بنکر) کے روپ میں طبقاتی طور سے منقسم تھے۔ ان تینوں خطوں میں بنکروں کی جیدار ذات خاص طور سے کرناٹک میں اور آندھرا و کرناٹک خطوں میں سیںیگار نام سے جانی جاتی تھی۔

تامل ملک میں سالیہ بنکروں کا ایک اعلیٰ طبقہ تھا جب کہ کائی کولا بنیادی طور سے چول عہد حکومت میں فوجی اور راجہ کے خاص دستہ کے فوجی تھے۔ وہ فوجی خدمات کے ساتھ ساتھ بنائی بھی کرتے تھے اور وجے نگر عہد میں وہ پوری طرح سے بنکر بن گئے۔ وہ ویرباہو، کا کاتیہ کے خدائی مددگار کے طور پر فوجی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دیوانگ اپنی محافظ دیوی چودمبیکا کے فوجیوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تیرومدئی ویلاگم یا مندر چوک میں بنکروں کے محلے ہوتے تھے جنھیں کائیکولہ تیرو کہا جاتا تھا۔ سالیہ درجہ میں اعلیٰ ہوتے تھے جو مندر انتظامیہ سے نزدیکی طور پر جڑے تھے۔ اور شاہی خاندان اور سماجی اعلیٰ طبقہ کو کپڑے کے فراہم کردہ بھی تھے۔

کپڑے کی اقسام میں شامل تھیں: پوڈوئی (کپڑے کے لمبے ٹکڑے)، ویتی اور اتر (ی) یام (مردوں کے لباس)، جیسا کہ چول کتبات میں ذکر ملتا ہے۔ کپڑے میں شیرو وستر خاص طور سے مندر کی تقاریب اور سماج کے اعلیٰ طبقوں کے لئے بنا جاتا تھا۔ جو دیوتاؤں اور شاہی خاندان (پومپاتی گل کٹی دانل پاٹو) کے لئے سنہرے رنگ کے ریشمی کپڑے کے علاوہ ہوتا تھا۔ کنچوک ایک سلا ہوا لباس ہوتا تھا (بلاؤز یا قمیص طرز کا لباس) جو سماج کے ذیلی طبقہ کے لوگ پہنتے تھے۔ تناکار ار لفظ کا تذکرہ درزی کے حوالے سے آتا ہے جس کا استعمال سنگم کے بعد کی قصہ کہانیوں کی کتب میں یعنی سیلا پڑی کرم میں کیا گیا ہے۔ تیان یعنی وہ جو سلائی کرتا ہے اور تیال۔ سلائی۔ پیرونٹونن، رتن تیان وغیرہ دوسرے الفاظ میں جو درزی طبقہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ گوتالی یا کوتالی کے نام سے مشہور درزیوں کے اداروں کا بھی تذکرہ کرناٹک کے کتبات میں ملتا ہے۔

مل مل اور چھینٹ کپڑے، جو زیادہ تر بنے جاتے تھے، مسولی پٹنم میں ان کی پیداوار ہوتی تھی۔ منسولاس، ایک دکن (راشٹر کٹا دور) کا بارہویں صدی کا ملخص مجموعہ تھا۔ اس میں وچتر یا چھینٹ، سوت (کرپاس) اور ریشم (پٹوسوترم)، ٹائی اینڈ ڈائی وغیرہ کا ذکر ہے۔ جیوک چنتامنی نامی تامل جین کتاب، پومپٹو، پچیلائی پٹو وغیرہ کا ذکر کرتی ہے۔ جو ریشم کی قسمیں ہیں۔ پٹاول پٹو (پٹولا) کا تذکرہ کوئمبٹور سے حاصل شدہ ایک بارہویں صدی کے کتبے میں ملتا ہے اور وارنگل سے حاصل شدہ چودہویں صدی کے کتبے میں بھی بچائی پٹو اور دساری پٹو (تسور) کا ذکر ہے۔ تسور کے بارے میں بارہویں صدی کی متاکشرا سے بھی پتہ چلتا ہے۔

کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی کے لئے نباتاتی رنگوں اور لکڑی کے بلاکوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسے کہ کوسمب لال سورج مکھی، نیلی (نیل)، منجشٹ (مجیٹھ، لال ڈائی) اور تیزابی ایجنٹ یا صاف کرنے والے مادے جیسے اریشتا، کڈوکائی (میروبالن)۔ مانا سولاس میں ڈائی کی کئی قسموں کے استعمال کا حوالہ ملتا ہے۔ کپڑے کی بڑھتی ہوئی مانگ کے ساتھ بنکروں اور رنگسازوں پر محصول میں بھی اضافہ ہوا جس کا حوالہ بارہویں صدی کے کتبات میں حوالہ دیا گیا ہے۔

کپڑے کی صنعت کی تکنالوجی میں بھی عہد وسطیٰ میں ترقی ہوئی جس کی نشاندہی مختلف قسم کے آلات اور اوزار جیسے نال، کپاس بیلنے کا بیلن، پنجانا یا (Batting instrument)، روئی سے دھاگہ نکالنے کی تکلی، ان میں سے کچھ کا ذکر ادبی تصنیفات جیسے ابھی دھنا چنتامنی میں کیا گیا ہے اور کچھ کے حوالے کتبات میں ملتے ہیں۔ دھاگہ کتائی کا چرخہ جس میں ایک ہتھا لگا ہوتا ہے چودہویں صدی میں ترکوں نے متعرف کرایا۔ عمودی شکل والا کرگھا ابتدائی قسم تھی (1184 عیسوی کے شموگا ضلع کے جامبیر کتبات)۔ چپٹی شکل کا کرگھا کا استعمال کیکولہ سماج کے گیتوں میں دکھائی دیتا ہے جسے نینار کوٹار کہا جاتا تھا۔ کھینچنے والے چینی کرگھے اور مشرق وسطیٰ کے کھینچنے والے کرگھے بھی معلوم ہوتا ہے کہ معروف تھے، خاص طور سے مسلمانوں کے بننے کے ایرانی طریقہ کی بھی معلومات تھی۔ عربوں والے کرگھے یا نمونوں والے کرگھے جسے اچھورتاری کہا جاتا تھا گیارہویں صدی کے بعد سے جنوبی ہندوستان میں جانے گئے۔ جیسا کہ راجا راج اول (985-1014) کی سلطنت کے ترووتور کتبے میں حوالہ دیا گیا ہے۔

کپڑے کو بیل گاڑیوں، لکڑی کے چھکڑوں اور سر پر ڈھوکر (تلائی کٹو) داخلی تجارتی کے لئے سانتا، ہفتہ وار بازار میں لے جایا جاتا تھا۔ کپڑے کی صنعت کے خاص مراکز تھے، جنوب میں تنجور ضلع میں شیالی، ارانتا گی اور کمبھا کونم رامانا تھ پورم ضلع میں سواگن گائی، تیرو پتور، چنگلی پوٹ ضلع میں سداس اور کانچی پورم اور موجودہ چنئی میں مائیلا پور۔ مدورائی سوتی کپڑے کی پیداوار اور بنائی کا اہم مرکز تھا۔ پانڈیا جس کی بندرگاہ تھی جو تیرونیلو یلی ضلع میں کورکائی پر واقع تھی۔ شمال میں کورومنڈل، موٹو پلی ریشم کے دھاگوں اور کپڑوں کے لئے مشہور تھا۔ وینیٹیئن سیاح، مارکو پولو نے موتفیلی یا موٹو پلی کی ملائم اور نفیس مل کی تعریف کی ہے۔ جیسے کا کا تیہ راجہ، گنپتی دیوا کے ذریعہ خاص تجارتی مرکز کو بڑھاوا دینے کے لئے خاص اجازت حاصل تھی۔

شمالی کرناٹک میں کئی مراکز جیسے سائیمور، ہوناواڑ، بھٹکل، بارکور اور جنوبی کرناٹک میں میسور، شیموگا، چیتل درگ (گھٹیا سوتی کپڑے کے لئے)، بیجاپور میں ٹرڈل اور جنوبی کنارا میں منگلور کافی مشہور تھے۔ ابنِ بطوطہ (45-1342 عیسوی) نے ہوناواڑ حکمرانوں (سلطانوں) کے تحت بہت سے مقامات کا حوالہ دیا ہے جو اپنے ریشمی اور نفیس و باریک کپڑوں کے لئے جانے جاتے تھے۔ چینی ریشم، کرناٹک کی بندرگاہوں پر آتا تھا (چین اور مہا چائینا)۔ عبدالفداء (تیرہویں صدی عیسوی)، چاؤ جو کوآ، ایک چینی سیاح، ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مارکو پولو نے ریشمی کپڑے، چھینٹ اور دوسرے قسم کے کپڑوں کا حوالہ دیا ہے۔ چولہ خاندان کا کولوتنگا اول، کلا چوری، بجانا اور کا کا تیہ خاندان کے گنپتی کے ماتحت خاص طور سے حکومت کے ذریعہ تجارت کی مستقل سرپرستی ہوتی رہی۔ جس کے اچھے یا سانا سے سمندر کے راستہ تمام براعظموں، جزیروں اور غیر ممالک اور شہروں سے آنے والے تاجروں کو مخصوص برآمد بشمول کپڑے کی برآمد میں مدد دی گئی۔ کپڑا برآمد کرنے کی تجارت داخلی تجارت کے مقابلے میں زیادہ ہوتی تھی۔

کپڑے کی تجارتی تنظیم کا کام تھوک بیوپاریوں کی جماعتوں کے ہاتھ میں تھا۔ (نگرم، تسائی، آئیرتو، اینوروار، مانی گرام، ولنجیار، اجوانم اور پیکاندر وغیرہ) کپڑے کی پیداوار کے مختلف پہلوؤں کے لئے خاص مہارت کی ضرورت ہوتی تھی اور فروخت کا کام کپڑے کی تاجروں کی آزادانہ جماعتوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا جس کی ایک مثال کانچی پورم ہے جو اکثر کپڑے کے تاجروں کے لئے ایک مہاناڈو کا انعقاد کیا کرتی تھی۔ تاجروں کے خاص محلے ہوا کرتے تھے جیسے کودائی وانیگار اور اروائی وانیا چیری۔ تیرہویں سے چودھویں صدی کے پران مالائی پیرن مالئی کتبے میں اس طرح کے کئی محلوں کا ذکر ہے۔ لیکن کپڑے کی تجارت کو دوسرے مال تجارت پر سبقت حاصل نہیں تھی۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ تاجروں کی تنظیموں کی حفاظت کے لئے ان کی اپنی مسلح افواج ہوتی تھیں۔ مختلف منڈلموں میں سلائی سیتی ہوتے تھے جیسے جیانکونڈا چولہ منڈلم، کانگو منڈلم اور ملائی منڈلم (کیرل)۔ تامل خطہ میں، چدامبرم کے سالیہ سیتیوں کو شہر میں ایک خاص مقام حاصل تھا جن کے اپنے سالیہ گرام تھے۔ بیلگاؤں (1224 عیسوی) کے کالاچوری کتبات میں سالیہ سمایانگل (تنظیموں) کے حوالے موجود ہیں۔ بعد کے چولہ کتبات میں دلالوں، تراگو کاسو (دلالی) کا ذکر ہے۔ جس میں کورائی تراگو آیام بھی شامل تھے۔

کپڑے کی صنعت پر لگنے والے محصولوں میں کرگھوں پر لگنے والے محصول بھی شامل ہیں۔ (تاری ارائی، تاری کادامائی تمل میں)، آندھرا اور کرناٹک میں مگادیرے، پیرکر گھے پرا چھوتاری، تاری پوداوئی پنچو پیلی، پاروتی کادامئی، پتادائی نولائیم۔ رنگسازوں پر لگائے جانے والے ایک محصول جسے کا ئبانا یا بانیگے کہا جاتا تھا۔ کنٹر کتبات سے اس کا علم ہوتا ہے بارہویں سے تیرہویں صدیوں میں باقاعدہ محصول کے تذکرے ملتے ہیں اور یہ نقد یا پیسہ کی شکل میں لاگو کئے جاتے تھے (وجنا نیشورا متاکشرا سے پانم، واراہان اور مدائی کے حوالے ملتے ہیں)۔ تیرہویں صدی میں ہوئیسالہ حکومت کے تحت بڑھتے ہوئے محصولوں کے خلاف احتجاج کے واقعات دیکھے گئے جو وجے نگر دور میں مزید بڑھ گئے۔ راجاؤں یعنی ریاست کے ذریعہ بڑے پیمانے پر رعائتیں اور مراعات نقصان کو پورا کرنے کی غرض سے دی جاتی تھیں۔

کرناٹک میں طاقتور دیوانگا تنظیم (دیوانگا پورنم) اور کانچی پورم میں مہاناڈو (کولن پوروا پٹیم) تیرہویں اور چودھویں صدیوں کے نزدیک اور سالیہ چولہ کے تحت مندر کے منتظم اور متولی کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ جس سے دولت کی نوعیت اور قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جو بنکروں اور ریاست نے تدریجی طور پر حاصل کی تھی۔ بعد کے دور میں کائیکولہ منظر عام پر آئے اور مندر کی خدمات کرنے والے گروپ کی حیثیت سے دیوار دیار۔ ان کے ذریعہ مندر کو نذرانے اور زمین پیش کی جاتی تھی۔ اصل میں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ وابستگی مثلاً کارتیکیہ اور دیویوں (امان) جیسے کاماکشی چامنڈا وغیرہ نے ان کی روایتی حیثیت کو

REFERENCE ONLY

بڑھانے کا کام کیا۔ مندروں کی تعمیر کے لئے ان کی امداد، شوا، پاروتی، پلائی یار اور کارتیکیہ کی مورتیوں کا ان کے ذریعہ قائم کرنا، اور خازن کی حیثیت سے (یعنی اورگم، کانچی میں) خدمات انجام دینا، بنکروں کی معاشی اہمیت اور سماج میں ان کی حیثیت اور رتبہ میں اضافہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

زمین پر مالکانہ اختیار اور بنکروں کو ذاتوں کے لقب مثلاً کائیکولہ مدالی اور القاب جیسے پیدارن، کانی یاچی، اور کوڈی کانی جو بنکروں کو دئے جاتے تھے، سے زراعت پر مبنی معاشرے میں ان کی حیثیت کو بڑھاوا ملا۔ مندروں کے اعزازات اور علامتیں جیسے سنگو اور تانڈ و جو بنکروں کو دئے گئے تھے ان کے سماجی رتبہ کو بڑھاتے تھے۔ مندر کی روایت کے مطابق ان کی پہلی لڑکی جوان کے خاندان میں پیدا ہوئی تھی وہ مندر کی رقاصہ اور لڑکے کو گانے کا حق ملتا تھا جیسے تیورام یا پاک حمد یا بھجن (پونا مبالہ کنٹر نینار) کہا جاتا تھا۔ بنکروں کی درجہ بندی، اداننگائی۔ ولانگائی طبقوں کے تحت بھی کی گئی تھی۔ ویراسائیوایا لنگایت سماج میں دستکار ذاتوں بشمول بنکروں کو دوسرے ممبران کے ساتھ برابری کا درجہ دیا جاتا تھا۔ (جیدار دیسی مایا)۔ تنکالائی سری ویس نواسم فرقہ میں بنکروں کو ایک قومی رتبہ حاصل تھا۔ جس کے تحت انہیں مندروں میں مذہبی رسم ورواج ادا کرنے کا حق حاصل تھا۔

15.6 خلاصہ

زرعی اصلاحات کا پھیلاؤ اور زراعت کی صنعت پر عمومی انحصار معیشت کی اہم خصوصیت تھی۔ جنوبی ہندوستان میں شہری آبادکاری کے نئے مرحلہ کی ابتداء کے لئے یہ خصوصیت ایک اہم آلۂ کار ثابت ہوئی۔ تامل ناڈو میں خاص طور سے ثانوی شہری آبادکاری کا ظہور، ناڈو، نگرم اور ایسی تنظیموں جن کے وسیع نیٹ ورک تھے جیسے ایاولے کی ترقی کے ذریعہ ممکن ہوا۔ ابتدائی تاریخی شہری مراکز کی بہ نسبت اس مرحلہ کے دوران شہری مراکز کے ارتقاء کی جڑیں ان خطوں میں زیادہ گہری تھیں۔ پیشہ وارانہ طبقات کی تعداد میں اضافہ کی موجودگی سے ''پیداواری سرگرمیوں کی متفرق نوعیت'' کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری صنعت وحرفت کے ساتھ کپڑے کی صنعت نے سب سے بلند مقام حاصل کرلیا۔ حالانکہ آندھرا خطہ میں کانکنی بھی ایک اہم صنعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ پورے خطہ میں ساحلی آمدورفت باقاعدگی سے جاری تھی۔ خاص طور سے کونکن اور مالابار خطہ اس دور میں زیادہ خصوصیت کے ساتھ ظہور میں آیا۔ مقامی سطح پر مقامی ادارے مثلاً تمل ناڈو میں نگرم اور آندھرا میں نگرموں تجارت کو متحرک طور پر منظم کر رہے تھے۔ پورے دور کے دوران متحرک تجارتی سرگرمیوں میں تاجروں کی شمولیت جاری رہی وہ تاجروں کی گروہ (کارواں) کی شکل میں نقل وحرکت کیا کرتے تھے۔ ریاست نے غیر ملکی تجارت پر معیاری محصول لاگو کرنے کی کوشش کی خاص طور سے آندھرا خطہ میں ہمیں کپڑے کی صنعت کی پیداوار پر بڑے پیمانے پر محصول لاگو کرنے کے حوالے ملتے ہیں۔ محصولوں کے بھاری بوجھ کے نتیجہ میں احتجاج بھی ظاہر کئے گئے۔

15.7 فرہنگ

کونگو خطہ: جنوبی ہندوستان میں تامل ناڈو کا قدیم خطہ، جس میں تامل ناڈو کے کئی اضلاع شامل ہیں، مثلاً موجودہ کوئمبٹور، ایروڈے، سیلم، کرور اور ڈنڈیگل کا ایک حصہ۔

قاہرہ گینیزا ریکارڈ: فوسٹاٹ، قاہرہ کے سینا گو میں پائے گئے قدیم یہودی دستاویز۔ 1890 میں یہ ماخذ لندن کی آکسفورڈ یونیورسٹی کی بوڈلین لائبریری میں منتقل کردیئے گئے تھے۔

Sui Generis: خود ساختہ یا وہ عمل جو بغیر کسی باہری اثرات کے اپنے آپ پیدا ہوتے ہیں اور خود بخود ارتقاء پذیر ہوتے ہیں۔

Composite Artisan Community: اس میں متفرق دستکاریاں شامل تھیں۔ لیکن چودہویں صدی عیسوی تک یہ ایک بڑی دستکار جماعت کی شکل میں منظم ہوگئی اور اس نے خاطر خواہ اثرات مرتب کئے۔

ویراساسناس
Virasasanas
پیشہ وارانہ طبقات کے کتبات جو ایک پرساتی سے شروع ہو کر اپنے بہادرانہ اور شجاعتی اعمال کے سبب سفری تاجر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، جو بہت اچھے جنگجو بھی تھے۔

15.8 مشقیں

(1) جنوبی ہندوستان میں شہری آبادی کی ترقی میں ناڈو، نگرم اور ناکھر کے رول کا تجزیہ کیجئے۔

(2) جنوبی ہندوستان میں دوسری شہری آبادکاری کس حد تک زرعی پھیلاؤ کا نتیجہ تھی؟ تجزیہ کیجئے۔

(3) جنوبی ہندوستان میں دوسری شہری آبادکاری کا عمل کس طرح مندر کی معیشت سے جڑ گیا؟ تنقیدی جائزہ لیجئے۔

(4) جنوبی ہندوستان میں شہری آبادکاری کے عمل کے مطالعہ کے لئے کتبات، معلومات کا ایک اہم ماخذ تھے۔ تبصرہ کیجئے۔

(5) دستکاری، تجارت اور شہری آبادکاری کے ارتقاء میں تاجروں کے پیشہ وارانہ تنظیموں کے کردار پر بحث کیجئے۔

(6) چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی کے دوران جنوبی ہندوستان میں کپڑے کی صنعت کی ترقی پر ایک نوٹ لکھیے۔

15.9 معاون کتب

ابراہم میرا (1988)، ٹو مرچنٹ گلڈز آف ساؤتھ انڈیا، نیو دہلی۔

چکرورتی، رنبیر (2001)، ٹریڈ ان ارلی انڈیا، او، یو، پی، نئی دہلی۔

چمپک لکشمی، آر (1996)، ٹریڈ آئیڈیولوجی اینڈ اربنائیزیشن: ساؤتھ انڈیا 300 بی سی ٹو 1300 اے ڈی، نیو دہلی، او، یو، پی۔

ھال، کے۔ آر (1980)، ٹریڈ اینڈ اسٹیٹ کرافٹ ان دی ایج آف دی چولاز، نیو دہلی۔

کپوسوامی، جی۔ آر (1975)، اکونومک کنڈیشنز ان کرناٹکا (1336-1973 اے ڈی)، دھارواد۔

لیلہ شانتا کماری (1986)، ہسٹری آف دی اگراہاراز کرناٹکا 1300-400، مدراس۔

راماسوامی، وجیا (1985)، ٹیکسٹائلز ویورس ان میڈیول ساؤتھ انڈیا، او۔ یو۔ پی، نیو دہلی۔

سندرم، کے (1987)، اسٹڈیز ان اکنامک اینڈ سوشل کنڈیشنز ان میڈیول آندھرا، مچھلی پٹنم۔

وارمینگٹن، ای، ایچ (1988)، دی کامرس بٹون دی رومن ایمپائر اینڈ انڈیا، دہلی، دوسرا ایڈیشن۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE IMC LIBRARY Hyderabad-32

REFERENCE ONLY

MHI-05

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد

ہندوستان کی معاشی تاریخ

History of Indian Economy

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE • MANUU
IMC LIBRARY
Hyderabad-34.

4

عہدِ وسطیٰ کی معیشت کا ارتقاء وتوسیع-1

MHI-05

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد

ہندوستان کی معاشی تاریخ

History of Indian Economy

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY * MANUU * HYDERABAD
MA-027
03.08.2015

بلاک

4

عہدِ وسطیٰ کی معیشت کا ارتقاء و توسیع-1

Expansion and Growth of Medieval Economy - 1

اکائی 16

زراعتی پیداوار

Agricultural Production 05

اکائی 17

زراعتی ڈھانچہ: زرعتی تعلقات

Agrarian Structure: Relations 27

اکائی 18

غیر زراعتی فصلیں

Non-Agricultural Production 50

اکائی 19

محصولات

Taxation 81

اکائی 20

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں شہری مراکز

Urban Centres in Medieval India 110

معاون کتب

Suggested Readings for this Block 125

فرماں رواؤں کا تاریخ وار سلسلہ

Chronology of Rulers 130

REFERENCE ONLY

مجلس ماہرین

پروفیسر بی۔ ڈی۔ چٹوپادھیائے
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

پروفیسر دلباغ سنگھ
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

پروفیسر کپل کمار
ڈائریکٹر
اسکول آف شوشل سائنسز، اگنونئی دہلی

پروفیسر آر۔ چمپک لکشمی
سابق پروفیسر تاریخ
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

پروفیسر کے۔ کے۔ ترویدی
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

پروفیسر اے۔ آر۔ خان
فیکلٹی آف ہسٹری
اسکول آف شوشل سائنسز
اگنو نئی دہلی

پروفیسر ایم۔ جی۔ ایس۔ نارائنن
سابق پروفیسر تاریخ
کالی کٹ یونیورسٹی، کالی کٹ

پروفیسر نیلادری بھٹاچاریہ
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

ڈاکٹر آبھا سنگھ (کنوینر)
اسکول آف شوشل سائنسز
فیکلٹی آف ہسٹری، اگنونئی دہلی

پروفیسر ہربنس مکھیا
سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

پروفیسر دیجیندر ترپاٹھی
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمینٹ
احمد آباد

پروگرام کوآرڈینیٹر	:	پروفیسر اے۔ آر۔ خاں
کورس کوآرڈینیٹر	:	ڈاکٹر آبھا سنگھ
بلاک ایڈیٹر	:	پروفیسر ہربنس مکھیا

بلاک پری پیریشن ٹیم

اکائی نمبر		**ریسورس پرسن**	**اگنو فیکلٹی**
اکائی	16	ڈاکٹر آبھا سنگھ فیکلٹی آف ہسٹری اسکول آف شوشل سائنسز، اگنونئی دہلی	ڈاکٹر آبھا سنگھ
اکائی	17	پروفیسر دلباغ سنگھ سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی	
اکائی	18	ڈاکٹر آبھا سنگھ فیکلٹی آف ہسٹری اسکول آف شوشل سائنسز، اگنونئی دہلی	
اکائی	19	ڈاکٹر آبھا سنگھ فیکلٹی آف ہسٹری اسکول آف شوشل سائنسز، اگنونئی دہلی	
اکائی	20	ڈاکٹر آبھا سنگھ فیکلٹی آف ہسٹری اسکول آف شوشل سائنسز، اگنونئی دہلی	

میٹیریل پروڈکشن
جناب جتیندر سیٹھی
جناب منجیت سنگھ
پرتل وسشٹ (مسودہ تیاری)

سکریٹیریل اسسٹینس
رشمی سرپال صاحبہ
سنیتا صاحبہ
جناب سنیل پٹوال

ستمبر-2004
(C) اندرا گاندھی نیشنل یونیورسٹی ۲۰۰۴ء
IS BN 81.266-1402-1
زیر اہتمام: ٹرانسلیشن ڈویژن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
طبع اول: مئی 2005ء
کاپی رائٹ (C) اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، 2003، طباعت ثانی
مزید معلومات کے لیے: ڈائرکٹر فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032 سے ربط پیدا کریں۔

مترجم : شبنم ادریس
مدیر : ڈاکٹر محمد تعظیم
کمپوزنگ : تہامی آرٹ اینڈ گرافکس

Manipal Press Limited, Manipal 2010

بلاک 4 عہدِ وسطیٰ کی معیشت کا ارتقاء وتوسیع -1

اکائی 16 سے 20 تک عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی معیشت کے سب سے زیادہ اہم پہلوؤں کی ترقی کی شکل وصورت اور عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کے مواضع وقصبوں وشہری زندگی کا زندہ ڈھانچہ ہے حالاں کہ یہ ایک بہت ہی معمولی خاکہ پیش کرنے کی کوشش ہے۔

یہ مانتے ہوئے کہ دنیا بھر میں سبھی عہدِ وسطیٰ کی معیشتوں کی نوعیت زرعی تھی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اپنی مختلف جہتوں میں کاشتکاری کو سب سے اہم مقام ملنا تھا لہٰذا پہلی دو اکائیوں میں اس کے حصے سب سے زیادہ وسیع ہیں۔ ہم اپنی تفصیل زراعتی پیداوار سے شروع کریں گے جو خود مختلف نہج پر مبنی مسئلہ ہے۔

غیر متحرک یا کم از کم سست روی سے چلنے والی، جیسا کہ تاریخ میں زراعتی پیداوار کی تصویر سے دکھائی پڑتا ہے، مگر پھر بھی یہ ایک بہت تیز رفتاری کی کہانی ہے جس میں نئی فصلوں پر تجربات کئے جا رہے ہیں۔ نئی تکنیک اختیار اور کھیتی کے تحت نئے علاقے لائے جائے جا رہے ہیں، یہ بھی ایک کہانی ہے جس کے ذریعہ ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھا جاسکے جس میں کسی بھی خطرناک خلل کی وجہ سے فطرت کی طرف سے سخت قسم کا نتیجہ براشت کرنا پڑے گا۔ یہ انسانی تنظیموں کی قدرت کے ساتھ اس کے ربط کی ایک کہانی ہے۔ لہٰذا انفرادی طور پر وہ فرقوں کی شکل میں زراعتی طبقہ، سماجی درجہ بندی اور اعلیٰ اداراتی حکومت کی شکل میں ریاست، یہ سبھی اس کہانی میں اسے جامع بنانے کے حوالوں کے شمار میں آتے ہیں۔

کاشتکاری سے ہم معیشت کے دوسرے حلقوں کی طرف بڑھتے ہیں جس، کو اجتماعی شکل سے اور روایتی طور سے، حالاں کہ پھر بھی غیر اطمینان بخش طور پر''غیر زراعتی پیداوار'' کی شکل میں ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں کچھ چیزیں تو زراعت سے متعلق ہیں اس معنیٰ میں کچا مال اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ بُنے ہوئے کپڑے، ریشم، تیل، گنا وخوردنی تیل اسی قبیل سے ہیں۔ دوسرے (اقسام) گروپ زراعت سے کسی بھی طرح جداگانہ اور آزاد ہیں یعنی سونا چاندی جملہ دھاتیں اور ان سے تیار شدہ اشیاء، ہیرے، جواہرات اور لوہا بھی جو کہ کسی طرح سے بھی کم اہم نہیں کہے جاسکتے اس کے برخلاف اپنے عظیم وجود کے ساتھ تعمیری صنعت بھی ہیں۔ اکائی 18 غیر زراعتی پیداوار کے انھیں حلقوں کے مفصل بیان پر مشتمل ہے۔ یہ اکائی ان حلقوں میں پیداوار کے طریقہ کار سے آگے جاتی ہے اور ان سوالات کو اٹھاتی ہے جو کہ تاریخ دانوں کے دل سے زیادہ قریب ہیں یا سماج کے پیداواری طریق کار کے ساتھ متعلق ہیں اور ان طریقہ کار کی سماجی تنظیم سے متعلق ہیں۔

اکائی 19 ایک طرح سے ریاست اور معیشت کے بیچ تعلق کی طرف رخ کرتی (نظر آتی) ہے جس کا تجزیہ نظام ٹیکس کے سوال کے تعلق سے کیا گیا ہے۔ کاشتکاری چونکہ قبل عہد جدید کے مالی آمدنی کے حصول کا اہم ذریعہ تھی نیز ریاست کی آمدنی کا اہم وسیلہ بھی۔ سرکاری طور پر لگان کا حصول اس بنیاد پر بھی تھا کہ حکومت لوگوں کی حفاظت کا انتظام کرتی تھی جو کہ زراعتی طریقۂ کار کو آگے چلانے کے لئے بہت ہی زیادہ ضروری تھی۔ سرکاری ٹیکس کا حصول عموماً ایک مفصل اور کثیر الجہت طریقۂ کار کا نتیجہ تھا جس کا ایک خاص مقصد تھا دولت مند اور طاقتور لوگوں کو عیش وآرام میں رہنے دیا جائے۔ جس کو پسماندہ غریب کاشتکاروں کی محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اس وقت واضح طور پر لگان لینے والوں اور دینے والوں کو مختلف مرحلوں میں مسلسل کشمکش کی حالت رہتی تھی۔ وہ کشمکش جس کو انھوں نے جدا جدا طور طریقوں سے ظاہر کیا۔

اکائی 20 میں آپ دیہی زندگی سے متعلق یعنی شہری مرکزوں کی ضروریات زندگی سے متعلق، حالاں کہ بہت ہی مختصر شکل میں پائیں گے۔ بیس اور تیس کے دہے میں بلجیم کے مورخ ہینری پیرین (Henri Pireme) نے جب سے دیہی معیشت، جسے وہ خود کفیل اور اسی بنیاد پر 'ناقابل تغیر خیال کرتا تھا' کے مقابلے میں عظیم فعال طاقت کی شکل میں شہروں اور تجارت پر توجہ مرکوز کی تب ہی سے شہروں اور گاؤں کے درمیان تعلقات مورخوں کے بیچ موضوع بحث بن گئے یہ اکائی اس سوال پر مشتمل ہے اور پھر دیگر موضوع کی طرف رخ کرتی ہے جو کہ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی آنکڑوں سے زیادہ متعلق ہیں۔

REFERENCE ONLY

اگر کوئی بڑی بات ان سبھی اکائیوں سے نکل کر آتی ہے تو وہ یہ ہے کہ تاریخ اور مورخین آپس میں کسی بھی سوال پر ہم خیال نہیں ہیں۔ نظریات کے اختلافات ہی ہمارے مضمون کی حقیقی روح ہیں۔ تاریخ کی طالب علموں کی حیثیت سے ہم کو اسی اختلافات کو محفوظ رکھنا اور سیکھنا چاہیئے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU
MA-027
03.08.2015
INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE IMC LIBRARY

اکائی 16 زراعتی پیداوار

ساخت

16.1 تعارف
16.2 وسائل کے استعمال کے نمونے (Pattern)
16.2.1 زمین
16.2.2 زراعتی رقبہ
16.2.3 جنگلات کی صفائی
16.3 پیداواریت کا سوال
16.3.1 مٹی
16.3.2 قحط
16.4 پیداوار کی تکنیکیں: فصل
16.4.1 فصلوں کے نمونے
16.4.2 فصلیں
16.4.3 پیداوار کے ذرائع
16.5 پیداوار کی تکنیکیں: آبپاشی
16.5.1 کنویں
16.5.2 تالاب، باندھ اور آبی ذخیرے
16.5.3 نہر
16.6 زراعتی پیداوار کی تنظیم
16.7 چراگاہی اور جنگلاتی معیشت
16.8 زراعت اور ریاست
16.9 خلاصہ
16.10 مشقیں

16.1 تعارف

زراعت اور ماحول کا باہمی تعلق ہے اسی لئے وہ ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس وقت کی عہد وسطیٰ کی معیشت خصوصاً پیداوار کے طریق عمل کی طرف رہنمائی کرنے میں ماحولیات کا کیا رول تھا۔ ہندوستانی سیاق وسباق میں یہ سوال مزید موزوں ہو جاتا ہے خصوصاً اس نقطہ نظر سے مکمل تاریخ کے دور میں ہندوستانی معیشت میں زراعت ہی اہم رہی ہے۔ ڈیوڈ لڈن (David Ludden) نے بلاک نمبر 1 میں علاقوں اور ماحول کے سوال پر اور اس بات پر بھی کہ کسی طرح جغرافیائی حالات فصلوں کے پیٹرن (Pattern) اور زراعتی پیداوار کو متاثر کرتے ہیں، تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہاں پیش کردہ اکائی میں عہد وسطیٰ کے تانے بانے کے اندر مذکورہ مدعا کو اور گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ماہرین کے ذریعہ یہ بات عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ قبل نوآبادیاتی زمانہ میں جنگلات کی کٹائی اور جنگوں کے سبب، نوآبادکاری کے باوجود، کافی حد تک انسان

اور ماحول کے بیچ مطابقت اور توازن تھا۔ جنگلات کی کٹائی اور عمارتی لکڑی کی برآمد ایک 'قابل برداشت' عمل تھا۔ عام طور پر اتنی ہی کٹائی ہوتی تھی جتنی کہ قدرتی طور پر اس کی بھر پائی ممکن تھی۔ مگر نوآبادیات کے زمانہ میں یہ توازن بگڑ گیا۔ مگر نئے تحقیق نگار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پہلے بھی حالت اتنی مثالی محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی تصویر پیش کی جاتی رہی ہے۔ ایندھن اور عمارتی لکڑی آس پاس کے جنگلات سے مستقل سپلائی کی جاتی تھی اور جنگلات کو کاٹا جاتا تھا۔ زراعت کے مقصد سے جنگلات کی کٹائی کے ساتھ ساتھ جنگ کے واسطے آگے بڑھتی فوجوں سے بھی موجودہ جنگلات کو کوئی کم نقصان نہیں پہنچا۔

ہمارے زیر مطالعہ عہد میں ندیوں میں آئی تبدیلیوں کے اثرات بھی کوئی کم اہم نہیں ہیں۔ رچرڈ ایٹن نے بنگال کے حوالے سے بنگال ڈیلٹا میں ندیوں میں آئے تغیرات کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عہد وسطیٰ میں بنگال میں اہم ندیوں کی مشرق کی جانب تیز حرکت (بہاؤ) تھی۔ مغربی بنگال میں گنگا۔ بھگیر تھی۔ ہگلی کی اہم شاخوں نے موجودہ پدما میگھنا نظام کے لئے راستہ دیا، جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں گاد جمع ہونے کے سبب اس علاقے میں نم دھان کی کھیتی ممکن ہوئی۔ اس کے نتیجے کے طور پر مشرقی بنگال میں زراعت کی شاندار ترقی ہوئی۔ یہ طریقہ پندرہویں صدی کے آس پاس شروع ہوا لیکن اس نے تیزی سولہویں صدی کے آخر برسوں ہی میں حاصل کی۔

لڈن اور ایٹن کی تحقیقات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ماحولیات سے متعلق تبدیلیوں نے اس برصغیر کی زراعتی معیشت کو متاثر کیا۔ مگر یہ پتہ لگانا دونوں اعتبار سے بہت اہم اور دلچسپ ہوگا کہ موجودہ ماحول کو بدلنے میں انسانی داخل اندازی کس طور پر فیصلہ کن رہی ہے۔ پیش اکائی میں ہم خصوصاً زراعت سے متعلق سوالات پر اپنی بحث کے دوران کبھی کبھار ان مسائل پر بھی توجہ مرکوز کریں گے۔

آیئے بحث کا آغاز عہد وسطیٰ میں زراعتی وسائل کی نوعیت اور نمونے سے کریں۔

16.2 وسائل کے استعمال کے نمونے

زراعت کے تناظر میں وسائل کے استعمال سے ہمارا مطلب ان وسائل سے ہے جو کہ زراعتی پیداوار کے طریق عمل میں معاون و مددگار تھے۔ زمین کا لازمی طور پر اس تناظر میں اعلیٰ مقام تھا۔ زمین کے علاوہ عملی سرمایہ اس کا ایک اہم اور ضروری حصہ تھا۔ عملی سرمایہ سے مراد ہے ہل بیل وغیرہ، تیسرا سبب تھا زراعت کی تنظیم میں کاشتکاروں کی صلاحیت و طاقت (Capacity)۔ یہاں کاشتکار اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بذات خود بھی پیداوار کی ترقی میں پیش بین مقام رکھتا تھا خصوصاً عہد وسطیٰ کے حوالے میں جب کہ زراعتی امور وسیع شکل میں نجی کھیتی (Individual Peasant Farming) پر مشتمل تھے۔ اس کے علاوہ کرائے کے مزدور اور بے زمین کاشتکاروں کا کردار بھی عام طور پر بہت اہم تھا۔

16.2.1 زمین

پورے عہد وسطیٰ میں زمین کثیر مقدار میں دستیاب تھی۔ اس طرح اعلیٰ زمین لوگوں کے تناسب سے عہد وسطیٰ میں زراعتی ڈھانچہ کی ایک خاص علامت تھی۔ پھر بھی عہد سلطنت میں ہر خاندان کو جوتوں کے حقیقی رقبہ کو متعین کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ مغلیہ عہد سے متعلق کچھ علاقائی مطالعہ سے یقیناً اس پر تھوڑی روشنی پڑتی ہے۔ دل باغ سنگھ (1990) نے مشرقی راجستھان کے علاقے کے لئے تخمینہ لگایا ہے کہ ہر خاندان (آسامی) پر جتائی کے لئے تقریباً 90 بیگھ زمین تھی۔

زمین بہتات میں تھی اور حکومت کے لئے موضوع فکر تھا کہ کاشتکار کو زمین سے باندھ کر رکھا جائے۔ رسک داس (66-1665) کو اپنے فرمان میں اورنگ زیب نے حکم دیا تھا کہ اگر کسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے تو عامل (محصل ٹیکس) ان کی واپسی کے لئے کوشش کرے۔ حکومت کی تمام دلچسپی اس بات میں تھی کہ اپنے محصولی وسائل کو وسعت دینے کی غرض سے زراعتی امور کو فروغ دیا جائے۔

عہد وسطیٰ میں بیلوں کا چلن سرمایہ کا اہم حصہ تھا ایس۔ پی گپتا نے مشرقی راجستھان کے لئے تخمینہ لگایا ہے کہ ہر کاشتکار کے پاس 3.31 بیل تھے جو کہ عہد

وسطی کے موافق مویشیوں کی آبادی کی نشاندہی کرتا ہے۔ مراٹھا علاقوں کے گاؤں میں خصوصاً سرحدی گاؤں کے سامنے مسلسل مویشیوں کو اٹھا کر لے جانے کی پریشانی موجود تھی جس کی وجہ سے زمین جوتنے سے متعلق پریشانیاں پیدا ہوئیں۔

وسائل کے استعمال سے متعلق ایک دوسرا اہم پہلو تھا کسان کی ہل رکھنے کی صلاحیت۔ جتنے زیادہ ہل اس کی ملکیت میں ہوتے تھے اتنی ہی زیادہ کھیت جتائی پر وہ قابض ہو سکتا تھا اور گاؤں کی طبقاتی درجہ بندی کے مطابق وہ اتنا ہی اونچا مقام حاصل کرتا تھا۔ ایس۔ پی۔ گپتا (1986) تذکرہ کرتے ہیں کہ مشرقی راجستھان میں پرگنہ موضع آباد کے ایک پٹیل (گاؤں کا مکھیا) کے پاس تقریباً 9 ہل تھے جب کہ غریب کسانوں کے قبضے میں اس کے مقابلے میں ایک یا دو ہی ہل تھے۔

مویشیوں کی قوت کی دستیابی کاشتکاری کی توسیع کے اُمور کے واسطے ایک خارجی ضروری سبب تھا۔ ابوالفضل اکبر کے دربار کا تاریخ داں بیان کرتا ہے کہ منظور شدہ ٹیکس سے مستثنیٰ جانوروں کے ریوڑ کی تعداد ایک ہل پر 4 بیل، 2 گائیں اور ایک بھینس تھی۔ جب کہ 25-1924 میں اتر پردیش میں اوسطاً مویشیوں کی تعداد ایک جوئے پر 2 بیل، 1.1 گائیں، 1 بھینس تھی۔ 1595 میں مویشیوں کے ریوڑ کی دستیابی کہیں زیادہ تھی یہ کاشتکاروں کے ہل جوتنے کی عمدہ صلاحیت کا پتا دیتی ہے (عرفان حبیب، کیمبرج، 1982)

مشرقی راجستھان کے لئے دل باغ سنگھ (1990) کا قیاس ہے کہ ایک ہل تقریباً 50 بیگھہ زمین کو جوتنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مگر حقیقت صوبہ بہار میں منقول ہے کہ اس معاملہ میں مغلوں کی ایک عام سوچ تھی کہ ایک ہل بیس بیگھہ عمدہ طریقہ پر جوتی گئی زمین کے لئے کافی ہے۔ تخمینون کے اختلاف کے باوجود مشرقی راجستھان کے لئے دل باغ سنگھ کا تجزیہ کہ 'زراعت کی وسعت اور کسی مخصوص گاؤں میں موجود ہلوں کے تعداد کے بیچ ایک وسیع اتحاد تھا' صحیح معلوم ہوتا ہے۔ دل باغ سنگھ بیان کرتے ہیں کہ پرگنہ آمیر اور غازی کا تھانہ (مشرقی راجستھان) میں مویشی طاقت کی نسبتاً کم موجودگی کی وجہ سے زراعتی امور میں قابل ذکر کمی واقع ہوئی ہے۔

16.2.2 زراعتی رقبہ

دلی کے سلطانوں خصوصاً علاؤالدین اور اس کے بعد محمد تغلق نے زراعتی زمین کی پیائش کرائی۔ ابوالفضل زراعتی امور کی وسعت کے تعلق سے مفصل اور ثبوت کے لئے اعداد و شمار پیش بھی کرتا ہے۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ پیائش کے لئے خریف اور ربیع دونوں کی الگ الگ پیائش کی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر اگر کسی گاؤں میں ربیع اور خریف دونوں ہی فصلیں اُگائی گئی ہوں تو اس گاؤں کی زمین کی دوبار پیائش کی جاتی تھی۔

ابوالفضل کے آراضی پیائش کئے گئے رقبہ سے متعلق آنکڑوں (تخمینوں) میں ممکنہ طور پر نہ صرف کُل بویا گیا رقبہ شامل تھا جیسا کہ ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ کا ماننا ہے کہ اس میں موجودہ افتادہ زمین، قابل کاشت بنجر زمین، ناقابل کاشت اور غیر مزروعہ زمین کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔ جیسا کہ عرفان حبیب (1963) اور شیریں موسوی (1987) کے تخمینے صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ شیریں موسوی کے تخمینے کے مطابق آئین کے آراضی اعداد و شمار میں لگ بھگ 10 فی صد غیر مزروعہ زمین بھی شامل تھی۔ مشرقی راجستھان کے لئے دل باغ سنگھ اور ایس۔ پی گپتا کی شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مزروعہ زمین 7-20 فیصد تک تھی۔ یہ رقبہ بستی، جنگل، نالا، ندی، تالاب، باغات زمین یا پھر پہاڑیاں ہو سکتی تھیں۔ اکبر کے عہد کے لئے شیریں موسوی اور مشرقی راجستھان کے لئے ایس پی گپتا کا ماننا ہے کہ کل قابل زراعت رقبہ ناپے گئے رقبہ کا تقریباً 65-50 فی صد تھا۔ مغربی راجستھان کے لئے بی۔ ایل۔ بھدانی (1999) کے اندازوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کھیتی کے تحت علاقے تقریباً قابل معائنہ کئے ہوئے علاقوں کے آدھے تھے۔ مگر صوبہ آگرہ کے لئے کے۔ کے۔ ترویدی (1998) کا کہنا ہے کہ ناپا گیا رقبہ کل رقبہ کا تقریباً 55 فیصد تھا جس میں سے صرف 50 فیصد ہی زراعتی تھا۔

شیریں موسوی کا قیاس ہے کہ 1871-1600 کے دوران شرح آبادی کے اوسط 0.21 کے مقابلے زراعت کی اوسط توسیع در 0.23 فیصد رہی۔ انھوں

نے 1595 میں کل مزروعہ زمین زمین کا مقابلہ 1910 کے زراعتی اندازوں میں دی گئی کل مزروعہ زمین سے کیا اور پایا کہ زراعت کا اوسط 47.35 فیصد رہا یعنی یہ 1910 کے اوسط شرح کا تقریباً آدھا تھا۔ عرفان حبیب (کیمبرج، 1982) کے اندازوں کے مطابق مغلوں کے تحت فی آدمی اوسطاً پیداوار اندازاً 1900 میں فی آدمی اوسطاً پیداوار سے بہت زیادہ تھی۔ صوبہ آگرہ پر کے۔ کے۔ ترویدی کی تحقیق سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ غذائی فصلوں کے معاملے میں پیداوار 1892 کے اندازوں کے مقابلے 1595 میں 20 فیصد سے زیادہ تھی حالاں کہ شیریں موسوی کا ماننا ہے کہ بڑی غذائی فصلوں کے معاملے میں ان کی پیداوار میں تقریباً 1870-1540 کے بیچ عملاً ایک ایکڑ کی پیداوار کے برابر رہی۔ نقدی فصلوں کے مقابلہ میں ان کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی۔ جنوبی ہند میں بھی اس مدت میں، عمدہ سطح کی پیداوار کا اندراج ہے۔ مگر اس علاقہ میں 19 ویں صدی کے دوران پیداوار میں کافی گراوٹ آئی۔

مارواڑ علاقہ میں خشکی کے سبب عموماً پھر سے زرخیزی پانے کے لئے تقریباً تین سالوں کے لئے زراعتی زمین کو آزاد چھوڑ دینے کا رجحان تھا۔ اس لئے بی۔ ایل۔ بھدانی (1999) کا ماننا ہے کہ مارواڑ علاقے میں ممکنہ طور پر ایک قسم کی جھوم کھیتی (Shifting Cultivation) (ادل بدل کر کھیتی کرنا) کا رجحان تھا۔ اے۔ وی۔ ڈیسائی نے اس دلیل کو گنگا جمنا دوآب علاقے کے لئے بھی صحیح مانا ہے۔ لیکن شیریں موسوی (1987) ڈیسائی کی اس دلیل سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ طریقہ 'کچھ منتشر ملحق چھوٹے علاقوں ہی تک محدود تھا جو اپنے آس پاس کے علاقوں سے کسی بھی معنی میں جغرافیائی یا ماحولیاتی طور پر مختلف نہیں تھے'۔

عمدہ پیداوار خاص طور پر آبپاشی کی سہولیات اور مٹی کی خوبی پر منحصر تھی۔ ہربنس مکھیا کا ماننا ہے کہ عہد وسطیٰ میں عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کاشت عموماً سب سے زیادہ زرخیز میدانوں تک محدود تھی۔ آئین اکبری (1595) میں مذکور مختلف فصلوں کے لئے عمدہ پیداوار کی وجہ سے کے۔ کے۔ ترویدی (1998) نے بھی یہ ہی نتیجہ نکالا کہ صوبہ آگرہ میں کاشت خاص کر قابل زراعت زمین ہی تک محدود تھی۔ چیتن سنگھ (1991) کی بھی دلیل ہے کہ 17 ویں صدی کے دوران پنجاب میں کاشت کی توسیع خصوصاً صرف کھیتی کے نقطہ نظر ہی سے ترقی یافتہ علاقوں میں ہوئی۔ اعلیٰ خوبی والے پانی کا وجود بھی پیداوار کو عام طور پر متاثر کرتا تھا۔ کھاری پانی سے پیداوار بھی عموماً ممکنہ طور پر عمدہ ہی ہوتی تھی۔ مگر چکنا اور چکنا (OilyandOily) اور زیادہ کھارا پانی پیداواری نقطہ نظر سے فائدہ مند نہیں تھا۔

کاشت کے وسیع ترقی کی ایک وجہ غیر مذہبی (سیکولر) (جاگیر) اور مذہبی (مدد معاش) زمینی عطیات تھے۔ مغلوں کے ماتحت ہر ایک مدد معاش عطیات میں 50 فیصد بنجر Waste یا لائق افتادہ Cultivable Waste زمین بھی دی جاتی تھی۔ مہاراشٹر میں شاہ جی کی پونا جاگیر شروعات میں ایک غیر آباد علاقہ تھا جو بھیڑیوں، جنگلی جانوروں اور ڈاکو لٹیروں سے بھرا ہوا تھا۔ دادو جی کونڈ دیو نے مالوں (پہاڑی قبائل) کو ان کے ذریعہ جوتی جانے والی زمین پر انھیں مستقل حقوق دے کر بسایا تا کہ وہ جنگلات کی صفائی کر کے اس علاقے میں بس جائیں۔

آبپاشی اور خشک زمین کی بنیاد پر پیداواریت علاقے علاقے میں مختلف تھی۔ کشمیر میں آبی (Irrigated) زمین کی اوسط پیداوار خشک (Unirrigated) زمین کی پیداوار کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ تھی۔ مہاراشٹر میں موجود قابل زراعت کھیتی کا فی صد بہت کم تھا۔ اے۔ آر۔ کل کرنی (1969) کے مطابق گاؤں منولی (وائی تعلقہ) میں زراعتی زمین کل گاؤں کی زمین کا صرف 16 فیصدی تھی جب کہ آبی زمین کا وجود اور بھی کم تھا۔ گاؤں نیا گاؤں، پرگنہ سیروال، جدید بھور تعلقہ میں یہ مقدار ایک فیصد تھی مگر بھیم سین 1658 میں لکھتے ہوئے اورنگ آباد کے بارے میں ذکر کرتا ہے کہ 'یہ رقبہ بہت گھنے طور پر بسا ہوا ہے اور یہاں زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں ہے جو کہ کاشت سے مستثنیٰ ہو'۔

دل باغ سنگھ کی مشرقی راجستھان کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں 1750 کے بعد کی دہائیوں میں زراعتی پیداوار میں صاف گراوٹ دکھائی دیتی ہے۔ جو رعیت (کاشتکاروں) کی بڑھتی غریبی اور مقروضیت میں تبدیل ہوئی۔ 1763 میں پرگنہ چاٹسو میں رعیت کے پاس 350 کھیت تھے جن میں سے انہوں نے 175 مہاجنوں کے فروخت کر دیے اور ان میں سے کئی صرف بٹائی دار اور دہاڑی مزدور بن کر رہ گئے۔

16.2.3 جنگلات کی صفائی

کھیتی کی توسیع کے مقصد سے جنگلات کی صفائی عہد وسطی کی ایک خاص نشانی تھی۔ کاشت کی ترقی کی تاریخ جنگل کی بربادی کی تاریخ ہے۔ حقیقت میں معاش کی ایک شکل (زراعت) ترقی معاش کی دوسری شکل چراگاہ ہی (جنگلاتی معیشت) کے خاتمے کا اشارہ کرتی ہے۔ ہمارے عہد کی شروعات میں گنگا کے میدان جنگلات سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مگر جنگل کے حجم گھٹنوں میں سترہویں صدی کے خاتمہ تک خصوص تبدیلیاں آئیں۔ اسلحہ بردار فوجوں نے جنگل کی صفائی کے ذریعہ کھیتی کی ترقی میں کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کیا۔ ہمارے عہد مطالعہ میں شمالی ہند میں اسلحہ بردار فوجوں کے ہمراہ لکڑ ہاروں کا چلنا ایک عام بات تھی۔ گنگا جمنا کے دوآب میں ہمیں جنگلات میں پناہ لینے کاشتکاروں یا باغیوں کے واقعات اکثر ملتے ہیں۔ بلبن نے میواتیوں اور کٹیہر یوں (کٹیہر علاقے جدید روہیل کھنڈ) کے ایسے باغیوں کو بہت چالاکی سے کچلا اور آس پاس کے علاقوں کے جنگلات کو صاف کروایا جہاں انھوں نے پناہ حاصل کی تھی اور اس علاقے میں قلعے قائم کئے جہاں افغان فوجی تعینات کئے گئے۔ چودھویں صدی کا مورخ ضیا برنی لکھتا ہے:

> اپنے (بلبن کے) عہد حکومت کا پہلا سال اس نے جنگلات کو لوٹنے اور میواتیوں کا قلع قمع کرنے میں لگایا جن کو شمس الدین کے وقت سے آج تک کسی نے نہ چھیڑا تھا۔۔۔
>
> تخت نشینی کے سال میں سلطان کو لگا کہ میواتیوں کے اوپر قابو ہی اس کا پہلا فرض تھا اور پورے سال وہ انہیں اکھاڑ پھینکنے اور جنگلات کو مٹا ڈالنے ہی میں لگا رہا جو اس نے کامیابی کے ساتھ پورا کیا۔ بڑی تعداد میں میواتیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ سلطان نے گوپال گیر میں قلعہ تعمیر کرایا اور اس شہر کے آس پاس متعدد چوکیاں قائم کیں جن کو اس نے افغانوں کے سپرد کیا نیز ساتھ ہی اس نے ان کو زمینیں بھی (اس کی دیکھ بھال کے) بخشیں۔
>
> جب سلطان نے اس طرح میواتیوں کو کھدیڑ دیا اور شہر کے آس پاس جنگلوں کو صاف کر دیا تو پھر اس نے دوآب کے شہروں اور گاؤں کو اہم سرداروں کو سونپ دیا۔ ان ہدایت کے ساتھ کہ لٹیروں کے گاؤں کو اجاڑ کر منہدم کر دیا جائے، آدمیوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے، جنگل کو صاف کر دیا جائے اور سبھی غیر قانونی کارروائیوں سے سختی سے نمٹا جائے۔ امراء طبقہ کے لوگوں نے طاقتور فوجوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا اور انھوں نے جلدی ہی باغیوں کو کچل دیا اور انھوں نے جنگلات کو صاف کر ڈالا اور باغیوں کے بھگا دیا اور انھوں نے رعیت کو اپنے تحت محکوم بنا کر فرمانبردار بنایا۔۔۔
>
> جب سلطان ان کاموں میں مشغول تھا کٹیہر سے خبر آئی کہ وہاں شورش شروع ہو گئی ہے۔۔۔
>
> اس نے انہیں (فوجیوں کو) حکم جاری کیا کہ کٹیہر کو جلا کر برباد کر دو۔۔۔ پورا علاقہ اجاڑ دیا گیا اور اتنی لوٹ پاٹ کی کہ اس سے شاہی فوج بھی خوشحال ہوئی نیز بدایوں کے لوگ بھی مطمئن ہوئے۔ جنگل سے ہو کر راستہ بنانے کے لئے لکڑ ہاروں کو بھیجا گیا۔۔۔
>
> ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ایلیٹ۔ ایچ۔ ایم اور جون ڈاوسن، دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹورین: دی محمڈن پیریڈ، الہ آباد، جلد سوم، صفحہ 106-103۔

نورالحسن صوبہ بہار کے تعلق سے بیان کرتے ہیں کہ شاہ جہاں کے دور حکومت میں زیادہ تر زمین داریوں کی ابتداء بنکٹی یعنی جنگلات کو صاف کرنے کے بعد آباد زمین پر ہوئی۔

شاہ جہاں کے وقت میں رواج تھا کہ لکڑ ہارے اور ہل چلانے والے کسان ان کے فوجی دستوں کے ہمراہ چلتے تھے تاکہ جنگل صاف کیا جا سکے اور زمین کی جتائی ہو سکے۔ ہل سرکار کی طرف سے عطیات میں دیئے جاتے تھے۔ مختصر مدتی پٹے (مطالبہ ٹیکس سے متعلق دستاویز) دیئے جاتے تھے (اور یہ) پہلے سال میں سرکاری مطالبہ ایک آنہ فی بیگھہ کے حساب سے متعین کیا جاتا تھا۔ چودھری (بچولیئے) متعین کئے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے حسن سلوک کے ذریعے اپنی رعایا (کاشتکاروں) کو خوش رکھیں اور علاقے کو آباد کریں۔ انہیں یہ یقینی کرنا ہوتا تھا کہ پٹے سرکاری احکام کے مطابق دیئے جائیں اور اپنائے عہد پر عمل ہو۔ ایک عام حکم تھا کہ جو کوئی بھی جنگل کو صاف کرے گا وہی اس زمین کو کاشت کے واسطے استعمال کرے گا وہ زمین اسکی زمینداری ہوگی۔۔۔۔ ہل بھی سرکار کی طرف سے انہیں دینے چاہئیں۔ ان ہلوں کی قیمت زمین داروں کے دو یا تین سال میں وصول کی جانی چاہیے۔ ہر ایک ''ہل میر'' (یعنی وہ شخص جو کہ چار یا پانچ ہلوں کا مالک ہو) کا پتا لگایا جائے اور اس کو ایک دستار (دوپٹہ یا پگڑی یعنی عزت کا نشان) نذر کیا جانا چاہیے تاکہ وہ جنگلات کو کاٹ کر زمین پر کھیتی کر سکے۔ اس طریقہ سے عوام اور رعایا اس کے حسن سلوک سے متاثر ہوں اس سلوک سے اور جنگلی زمین کو قابل زراعت بنانے کے واسطے دیگر علاقوں و صوبوں سے عوام اور رعایا یہاں آئے۔

نورالحسن (ترجمہ)، حقیقت صوبہ بہار (برلن قلمی نسخہ، پرش (Pertsech)505، اب یہ ماربرگ، جرمنی میں ہے) میڈیول انڈیا اے مسلینی ، جلد اول، علی گڑھ، 1969، صفحہ 238-273۔

صاف کئے گئے زمین کے علاقے ان کو پٹوں کی شکل میں سونپ دیئے جاتے تھے جو اس کٹائی کے کام میں شامل ہوتے تھے۔ اس طرح خصوصی علاقوں میں زمین داری کی شروعات ہوتی تھی۔ کاشتکاری کے واسطے جنگلات کی صفائی کئے جانے کی وجہ سے بہار میں زراعت میں تیز رفتاری سے ترقی ہوئی۔ مونگیر کا جنوبی علاقہ اکثر ایک جنگلی علاقہ تھا جہاں قبائلی ذاتیں آباد تھیں۔ شیر شاہ نے اپنے راجپوت اور افغان فوجوں کی مدد سے سہسرام کے نزدیک آباد ان قبائلی ذاتوں (کیرو یا کھارواڑ؟) کو کچلا اور جنگلات کو صاف کر کے قابل زراعت علاقوں کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ شیر شاہ نے خواص خاں اور دریا خان کو بھی پالامئو میں سون ندی کے پار قبائلی ذاتوں سے دوستی کرنے اور جھارکھنڈ کے جنگلوں کو بڑی تعداد میں صاف کرنے کے واسطے بھیجا (1538 عیسوی)۔ جھارکھنڈ اور چھوٹا ناگپور علاقے میں ایسے راجپوت بھی تھے جنھوں نے شمال اور وسط ہند سے کوچ کر کے اس علاقے میں اپنی نئی بستیاں قائم کیں جنہیں ''بھوم'' کہا جاتا ہے (سنگھ بھوم، بیر بھوم، بڑا بھوم، شکھر بھوم، مان بھوم وغیرہ)۔ بے شمار زمین داریوں کی بنیاد پڑی۔ کھڑگ پور کے راجا بہروز سنگھ (76-1631) کے ذریعے جنگلوں کو صاف کر کے اس علاقے میں زراعت کے تحت کافی مقدار میں زمین لائی گئی۔ اورنگ زیب نے راستوں کی حفاظت کے واسطے گھاٹ والی (خدماتی پٹے) کی شکل میں رام سنگھ کو کنڈا (موجودہ ہزاری باغ) عطا کیا۔ مغلوں نے منی ھاری گڈا کو لوک گرھ کھیتوری راجپوت خاندان کو ایک جاگیر (محصول عطیہ کی شکل میں) بخشی۔ چندیلوں نے بھیّوں (Bhaiyas) کے علاقے کے فتح کر کے تین صوبوں کی بنیاد ڈالی: گدھم، خیرا اور کھڑگ پور۔ ان فتوحات کے ساتھ کیوری۔ کرمی اور مسلم فرقوں کے ممبران نے بھی ان کے ساتھ کوچ کیا۔ انھوں نے اپنی خود کی بستیاں (بھوم) قائم کیں جیسے برہمن بھوم، گوپی بھوم، بھانگی بھوم وغیرہ۔ انھوں نے اس طرح جھارکھنڈ اور چھوٹا ناگپور کے قبائلی علاقوں میں زمین کو قابل کاشت بنانے میں اور زراعت کو فروغ دینے میں تعاون کیا۔ اور ان قبائلی علاقوں میں مستقل کاشت کے بیج بوئے۔

16.3 پیداواریت کا سوال

پیداوار کسی مخصوص علاقے میں مٹی کی موجودگی کی قدرتی صلاحیت سے تعلق رکھتی ہے۔ مٹی کی افادیت و خوبی حالاں کہ دیگر اسباب پر منحصر ہے: بارش کی مقدار و کیفیت (Pattern)، آبپاشی کے واسطے نہروں کا وجود، مٹی میں معدنی قدرتی اجزا (Deposist) کی نوعیت۔ مٹی سے گہرے طور پر متعلق ہیں: قحط سالی۔ اس کی تعداد تکرار اور خوفنا کی عموماً قدرتی وسائل کی موجودگی اور قدرتی آفات سے نمٹنے کے دائرے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔

آیئے اس برصغیر میں قدرتی وسائل کی موجودگی کے پیٹرن (Pattern) کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ زراعتی پیداوار کے پیٹرن (Pattern) کو اس علاقے میں کس حد تک متاثر اور متعین کیا۔

16.3.1 مٹی

مٹی کی نوعیت اور مقامی حالات کی بنیاد پر مغلوں نے ٹیکس متعین کرتے وقت زمین کی درجہ بندی کے تعلق سے دیسی طریقے، اختیار کیے۔صوبہ بہار میں زمینوں کی درجہ بندی کھیلفی (Irrigated) اور کنہیل (تالاب کے ذریعہ آبپاشی کی گئی، زمین کچھ علاقوں میں تالابی کے نام سے بھی جاتی ہے) کی بنیاد پر کی جاتی تھی۔ بھور، ریتیلی مٹی ہوتی تھی جس پر عموماً خریف کی فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ زمین کے اس کے علاوہ دو اہم درجے تھے بانگور (عمدہ زمین) اور کھادر، (نچلی زمین) یعنی نشیبی۔ کھادر فصل عموماً غیر یقینی ہوتی تھی۔ اسی طرح خشک علاقوں کے علاوہ سیلابی مٹی میں گہرائی سے جتائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مغلوں کے تحت زمین پولج، پروتی اور بنجر میں منقسم تھی۔ پولج کو پرتی چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی اور اس پر کاشت کے لئے کم محنت کی ضرورت ہوتی تھی۔ پروتی کو کچھ وقت کے لئے خالی چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ زراعت کے لئے مزید زرخیزی حاصل کر سکے یہ چار تین یا چار برس تک خالی پڑی رہتی تھی۔ بنجر ایسی زمین تھی جو کہ عام طور پر پانچ یا اس سے زیادہ سالوں تک بغیر بوئے چھوڑی جاتی تھی۔ بنجر کے کچھ علاقے عام طور پر غیر مزروعہ پڑے رہتے تھے۔ خصوصاً ریگستان اور پہاڑی علاقوں میں۔ لگان (ٹیکس) کے تعین کے لئے پولج اور پروتی زمینوں کی درجہ بندی آبی (نالوں کے ذریعہ آبپاشی کی گئی)، چاہی (کنوؤں کے ذریعہ آبپاشی کی گئی)، نہاری (نہروں کے ذریعہ آبپاشی کی گئی) بارانی (غیر آبپاشی والی زمین، بارش پر منحصر) اور سیلابی (سیلاب یا ندیوں کے ذریعہ نم کی گئی، سیلاب میں غرق کردینا) کے طور پر کی گئی تھی۔ دہلی اور اودھ صوبوں میں خصوصاً سیلابی زمین تھی جو اپنی بڑی ندیوں گنگا و جمنا کے ذریعہ آبپاشی شدہ ہوتی تھی۔ سیلابی زمین پر عام طور پر زیادہ پانی آنے سے فصل کی بربادی کا خطرہ بھی سر پر رہتا تھا۔ کچھ مخصوص سیلابی علاقوں میں تین فصلوں کی پیدا ہونا ممکن تھا۔ بارانی زمین دو حصوں میں تقسیم تھی۔ دوہور (دوہری چکناہٹ)، نچلے علاقوں میں ندی نالوں کی باڑھ سے پانی سے بھرے یہ علاقے ایک دو ماہ تک پانی سے بھرے رہتے ہیں اور کتلی ندی کے کنارے کی آس پاس کی زمین۔ سیلابی زمین میں عام طور پر جوار، باجرہ، لہدار موٹھ وغیرہ کی فصلیں اگتی تھیں۔ آئین اکبری میں اجمیر علاقے کی مٹی کو خاص طور پر ریتیلی بتلایا گیا ہے۔ کشمیر میں تین قسم کی زمینیں تھیں آبی (Irrigated) لالمی (ناہموار) اور چل کھیر (جھاڑی دار)۔

مٹی کی اقسام میں بے شمار علاقائی فرق تھے۔ مراٹھا علاقے میں بارش کے ذریعہ آبپاشی شدہ زمین کو جیرایت (Jirayat) کہا جاتا تھا جب کہ آبپاشی سہولیات سے آبپاشی کی جانے والی زمین بگیت (Bagait) کہلاتی تھی۔ ندیوں کے کنارے پائی جانے والی سیلابی مٹی کو ملائی یا مالوہ کہا جاتا تھا۔ میدانی علاقوں میں اکثر کالی مٹی پائی جاتی تھی جب کہ پہاڑی علاقوں میں عموماً لال مٹی تھی۔ کونکن علاقوں میں کالی مٹی بہت کم تھی اور زیادہ تر مٹی لال بھوری تھی۔ سیلابی مٹی صرف ندیوں کے کناروں ہی پر تھی۔ اس علاقے میں زمین دو قسم کی تھی: مالوارکر (Malvarkar) جہاں ہل کا استعمال کیا جا سکتا تھا، دوسری قسم تھی ڈونگری وارکر (Dongrivarkar)۔ سیدھی ڈھلان والے علاقے بھی تھے جہاں کھیتی صرف جسمانی محنت ہی پر ممکن تھی۔ جنوبی ہند میں مٹی دو قسم کی تھی من چئی (نم زمین یعنی آبپاشی شدہ) اور پن چئی (خشک زمین یعنی غیر آبپاشی شدہ)۔

ہندوستان، مٹی کی زرخیزی کے لئے جانا جاتا تھا۔ بوئی جانے والی فصلوں اور پرتی چھوڑی گئی زمینوں، دونوں ہی حالتوں میں ہندوستان کی مٹی بغیر کسی شک کے زرخیز تھی۔ ہمیشہ سے ہندوستان میں زمین سے ایک سال میں دو یا کبھی کبھی تین یا چار فصلیں پیدا کی جاتی تھیں۔ خاصی تعداد میں مویشیوں کے ہونے سے ان سے گوبر کی کھاد کثیر مقدار میں حاصل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہربنس کھیا کا ماننا ہے ندی بیسن کی مٹیوں کی زرخیزی کو قدرتی طور پر محفوظ رکھنے کا اہم سبب تھا ندیوں کے پانی کی زرخیزی صلاحیت، خاص کر گنگا بیسن میں جس سے ہر سال سیلاب کے نتیجے میں ندی کے نشیب میں زرخیز گاد (Silt) جمع ہو جاتی تھی۔ جو قدرتی طور پر ندی بیسن کی مٹی کو زرخیز رکھتی تھی۔

16.3.2 قحط

قحط عام طور پر کچھ کچھ وقفوں کے بعد پڑا کرتے تھے۔ یہ اکثر بارش کی کمی (بارانی) کا نتیجے تھے یا پھر بارش کی کثرت کے سبب پڑتے تھے۔ دلّی میں التتمش کے دورِ حکومت میں خطرناک قحط پڑا۔ محمد تغلق کے دورِ حکومت میں 27-1326 کے مشہور قحط نے دوآب علاقے کو پوری طرح تہس نہس کر دیا تھا۔ 1631 کے

سیلاب نے سورت کے آس پاس خطرناک قحط کی صورت حال بنادی تھی۔ جب کہ اس سے پہلے کے سال میں اس علاقے میں خشک سالی واقع ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں 32-1630 کے دوران گجرات کو غیر معمولی قحط سالی کا سامنا کرنا پڑا جس کی گرفت میں تقریباً 30 لاکھ لوگ آگئے۔ ٹڈی دل بھی فصلوں کو اکثر موقعوں پر نقصان پہنچایا کرتے تھے۔ 1675 میں حالاں کہ بارش کافی ہوئی مگر میواڑ علاقے میں فصلوں کو ٹڈی دل کے حملہ نے برباد کر دیا۔ بی۔ ایل۔ بھدانی (1999) کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے آخری سالوں میں میواڑ علاقے میں قحط اور کثرت سے واقع ہوئے۔

آیئے اس بحران سے نمٹنے کے واسطے ریاست کا ردعمل اور ریاست کے ذریعہ اٹھائے جانے والے راحتی اقدام کا پتہ لگائیں۔

برنی اپنی فتاویٰ جہاں داری میں ذکر کرتا ہے کہ بادشاہ زمینی لگان (خراج) اور ذاتی ٹیکس (Poll Tax) کو کم کر کے یا اپنے خزانے سے لوگوں کو قرض دے کر ان کی مدد کرسکتا ہے جو غریبوں اور ضرورت مندوں کے لئے تحفہ کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ وہ حکم دے سکتا ہے کہ تاجروں کو پیشگی نقد قرضے دیئے جائیں تاکہ وہ دوسرے ملکوں سے مال درآمد کرسکیں اور اس کو رعیت کو حتی الامکان سستی قیمتوں پر فروخت کرسکیں۔ اگر قحط زیادہ خطرناک ہو تو بادشاہ لگان اور ذاتی قرض دونوں کو مکمل طور پر معاف کرسکتا ہے اور ملک کے مالدار لوگوں کو اس طرح کا ایک عام حکم جاری کرسکتا ہے کہ وہ غریبوں اور بے سہاروں کی ذمے داری لیں تاکہ کسی بھی قبیلے یا علاقے میں کوئی شخص بھوکا نہ مرے (رشید 1964)۔

علاؤالدین خلجی نے قحط کے دوران یہ لازمی کر دیا تھا کہ آدمی صرف غذائی اشیاء اپنی ضرورتوں کے مطابق ہی خریدے۔ محمد تغلق نے اس پریشانی سے نمٹنے کے لئے مفصل احکام دیئے، طویل المدت اور قلیل المدت (دونوں طرح کے)۔ دوآب میں قحط کے دوران فوری راحت دینے کے لیے اس نے خزانے سے دولت تقسیم کی۔ ابن بطوطہ (م 1377) بیان کرتا ہے کہ محمد تغلق نے بطور راحت حکم جاری کیا کہ 'دہلی کے سبھی باشندوں کو چھ ماہ کے گزارے کے لائق غذائی اشیاء فراہم کرنے کے لئے چھ ماہ کا راشن تقسیم کیا جائے'۔ اس نے بطور راحت دینے ہندوستان آنے والے غیر ملکی مالوں پر سے تمام محصول معاف کر دیئے۔ ریاست کی پہل پر کنویں کھودے گئے، کاشت کاروں کو بیج تقسیم کیے گئے۔ طویل المیعاد منصوبہ کی شکل میں محمد تغلق نے ریاست کے مالی تعاون کے ذریعہ ریاست میں براہِ راست کھیتی کے لئے بڑے علاقے کو کاشت کے تحت لانے کا قدم اٹھایا۔ محمد تغلق نے دوراندیش ماسٹر پلان کا خاکہ بھی تیار کیا۔ اس کا مشورہ تھا کہ قحط زدہ علاقوں میں متبادل (ضروری) فصلیں اگائی جاسکتی ہیں۔ فیروز شاہ تغلق کے ذریعہ کھدوائی کی گئی نہریں بھی ان علاقوں میں بڑی راحت بن کر آئیں۔

عبداللہ اپنی تاریخ داؤدی میں ذکر کرتا ہے کہ قحط کے دوران سکندر لودھی (1519-1489) نے زکوٰۃ (چنگی) جنس کی شکل میں لی۔ شیر شاہ نے کسی بھی قسم کے ناگہانی حالات کے لئے اناج کا ذخیرہ جمع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تاریخ افغان میں حوالہ ملتا ہے کہ شیر شاہ نے ذخیرہ اندوزی کے مقصد سے کاشتکاروں سے فی بیگھہ 10 اِستر (istar) وصول کر کے جمع کرنے کا بھی حکم جاری کیا۔ نتیجتاً غلہ سستا ہو گیا اور شیر شاہ کے دورِ حکومت میں پھر کوئی قحط دیکھنے میں نہیں آیا۔

قحط حد سے زیادہ تباہ کن ہوتے تھے۔ اس دوران قیمتیں آسمان چھونے لگتی تھیں۔ ہمیں مردہ جانوروں کا گوشت کھانے پر مجبور لوگوں کے اکثر واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قحط کے ساتھ ہی علاقوں میں موت اور تباہی کے بیک وقت آنے سے صحت کے لئے خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔ قحط اکثر مویشیوں کے فقدان، انسانی طاقت کی کمی اور کاشتکاروں کی ہجرت اور بربادی پر انجام پذیر ہوتے تھے۔ 1630 کے قحط میں لوگوں کے راجستھان سے پٹنہ ہجرت کرنے کا حوالہ ملتا ہے جہاں ہیرجی شاہ کے ذریعہ ان کو پناہ دی گئی اور اس کے ذریعہ ان کی بنیادی ضروریات بھی پوری کی گئیں۔ راجستھان میں قحط کے دوران برہان پور، آگرہ، متھرا اور مالوہ وغیرہ کی جانب کاشتکاروں کے ہجرت ایک معمول کی بات تھی۔ پرگنہ نارائن کے عامل کے مطابق 1665 کے قحط نے رعایا (کسانوں) کو مالوہ کی جانب ہجرت کے لئے مجبور کیا۔ اس نے مہاجروں کو واپس لانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے پایا کہ ان میں سے زیادہ تر کی موت واقع ہو چکی تھی اور کچھ مزدور بن گئے تھے۔ اس نے یقین دلایا کہ ان کے رشتہ داروں اور دیگر کاشت کاروں کو واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ گاؤں پھر سے آباد کیا جاسکے۔ گجرات کے قحط (32-1630) کے سبب لوگ نہ صرف منتشر ہوئے بلکہ اس کا اثر اتنا تباہ کن تھا کہ فصلیں پیدا کرنے کے پیٹرن میں ہی تبدیلی آگئی۔ کاشت کاروں نے

غذائی فصلوں کی خاطر نقدی فصلوں (کپاس اور نیل) کو پیدا کرنا ہی چھوڑ دیا۔

16.4 پیداوار کی تکنیکیں: فصل

عہد وسطیٰ کے دوران ہندوستانی زراعت کی رفتار سست (جمود) نہیں تھی۔ زراعت کے میدان میں نئی تکنیکیں مسلسل ترقی پذیر تھیں اور اپنائی جارہی تھیں اور نہ صرف مستعمل تکنیکوں کے لحاظ سے بلکہ اگائی جانے والی فصلوں کے پیٹرن (Pattern) میں بھی خصوصی تبدیلیاں آئیں (تکنیکوں کے لئے دیکھیں اکائی 23 بلاک 5)۔

16.4.1 فصلوں کے نمونے

شمالی ہند میں سال میں دو فصلیں اگائی جاتی تھیں، خریف اور ربیع۔ راجستھان میں انھیں سیالو (موسم خزاں) اور انہالو (موسم بہار) کہا جاتا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں مخصوص قسم کے دھان کی کاشت کی بنیاد پر فصلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، کڈّ پاہ کر (Kuddapahkar) اور سمب پیشنم (Samb-Peshanam) ورنہ دوسری فصلوں کے معاملہ میں فصلوں کے مخصوص موسموں کی یہاں مکمل کمی تھی۔ دوآرتو باربوسا (تقریباً 1518) مالا بار پر تنقید کرتے ہوئے ذکر کرتا ہے کہ یہاں سال کے ہر ماہ میں ہر چیز پیدا ہوتی ہے۔ جنوبی ہند میں خاص کر کالی مٹی کے علاقوں میں کافی نمی کی وجہ سے سال بھر کھیتی کی پیداوار ممکن تھی۔ کچھ فصلوں (گنا، نیل وغیرہ) کے پکنے میں ایک سال لگتا تھا جب کہ کچھ (پانی کی بیل وغیرہ) کے پکنے کی مدت تین سال بھی ہوتی تھی۔ وہیں کچھ فصلیں ایک ساتھ بوئی جاتی تھیں مگر ان کی کٹائی مختلف مدتوں میں ہوتی تھی۔ فصلوں کے تنوع کے بارے میں ہندوستانی کاشکار چین کے کاشتکاروں سے زیادہ آگے تھے۔ آئین میں کم سے کم 45-40 قسم کی فصلوں کا ذکر ہے۔ یوروپی ایک فصلی پیداوار سے مختلف یہاں کاشت عموماً دو فصلی (دوہری فصل) تھی۔ اس کے نتیجے میں اپنے یوروپی فریقوں کے مقابلے یہاں کہیں زیادہ مقدار میں کاشت کی زائد پیداوار دستیاب تھی۔ ابن بطوطہ (1377م) تذکرہ کرتا ہے کہ ہندوستان میں دوہری فصل اگانا عام ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ہندوستانی سال بھر میں دو فصلیں بوتے ہیں۔ جب گرمیوں میں ان کے ملک میں بارش ہوتی ہے تو وہ موسم خزاں کی فصلیں بوتے ہیں اور ساٹھ دنوں بعد اسے کاٹ لیتے ہیں۔ جب وہ اس فصل کی کٹائی کرتے ہیں تب وہ موسم بہار کے اناجوں کو بو دیتے ہیں۔۔۔۔ یہ اس زمین میں بوئے جاتے ہیں جہاں موسم خزاں کی فصلیں بوتے ہیں کیوں کہ ان کی زمین فیاض اور مہربان ہے۔ جہاں تک دھان کا سوال ہے وہ اس کو سال میں تین بار ہوتے ہیں اور یہ ان کے ملک میں اہم اناجوں میں سے ایک ہے۔ سجان رائے بھنڈاری (1695) بیان کرتا ہے کہ پنجاب میں کچھ مثالیں ایسی بھی ہیں جہاں تین یا زیادہ فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ مگر مغربی راجستھان جیسے کچھ علاقے بے آب وگیاہ کی بناء پر، یہاں تک کہ میٹھے پانی کے کنویں والے علاقے بھی، دوہری فصل کے لائق نہیں تھے (بھدانی 1999)۔ راجستھان میں دوہری فصل کی پیداوار صرف چکنی مٹی والے علاقوں ہی میں ممکن تھی ریتیلی مٹیوں میں تو یہ ناممکن ہی تھا۔ بارش پر منحصر فصلوں کی قیمتیں آبپاشی والی فصلوں سے کچھ کم ہوتی تھیں۔ مراٹھا علاقے کے لئے حالاں کہ اے۔ آر۔ کلکرنی (1969) کا خیال ہے کہ صرف 'دیس' علاقے ہی میں جہاں کالی مٹی پائی جاتی تھی فصلوں کو ادل بدل کر بونا (Crop Rotation) ممکن تھا۔ ساحلی علاقوں میں جہاں مٹی میں سمندری مادہ (deposits) ہوتے تھے وہ باغوں کے لئے عمدہ تھی۔ مراٹھا علاقوں میں جہاں آبپاشی کی سہولیات فراہم تھیں صرف وہیں دوہری فصل پیدا کرنا ممکن تھا، ورنہ عام طور پر اس علاقے میں ایک فصل ہی اُگائی جاتی تھی۔

عہد وسطیٰ میں ادنیٰ درجہ کی فصلوں کی جگہ عمدہ اقسام کی فصلوں کی کاشت کو بڑھاوا دینے کا رجحان تھا۔ محمد تغلق نے کاشتکاروں کو حکم دیا تھا کہ عمدہ قسم کی فصلیں اگائیں جو کے مقام پر گیہوں اور گیہوں کے مقام پر گنا اور گنے کی جگہ کھجور اور انگور کی فصل، رسکداس (66-1665) کو مخاطب فرمان میں اورنگ زیب نے بھی واضح طور پر اس بات پر زور دیا تھا کہ ادنیٰ قسم کی فصلوں (جنس ادنیٰ) کے عوض عمدہ قسم کی فصلوں (جنس اعلیٰ) کی پیداوار کی کوشش کی جائے۔

عہد وسطیٰ کے کاشتکاروں کو اس بات کا علم تھا کہ کچھ فصلیں مٹی کو منفعت بخش (زرخیز بنانے کے لئے) ہیں۔ مونگ، اُرد اور مٹر جیسی دالوں کے طور پر استعمال ہونے والے اناج مٹی کی زرخیزی کے مقصد ہی سے خوردنی اناجوں کے ساتھ بوئے جاتے تھے۔ ایل۔ اے۔ آلیو (کیمبرج، 1982) بھی جنوبی ہند میں فصلوں کو ادل بدل کر بونے کی تکنیک کے رواج کی تصدیق کرتے ہیں۔ کچھ فصلوں خاص طور پر نقدی فصلوں اور ربیع کی فصلوں کو زیادہ جتائی کی ضرورت ہوتی

تھی اور ساتھ ہی خوردنی اناج فصلوں کے مقابلے انھیں آبپاشی کے زیادہ مصنوعی وسائل کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راجستھان جیسے زیادہ خشک علاقوں میں عام طور پر باجرہ، جوار وغیرہ کی ہی کھیتی زیادہ کی جاتی تھی۔

ہمیں ملی جلی فصلوں (Mixed Crops) کے بھی حوالے ملتے ہیں۔ مکس فصلوں کے اُگانے کا طریقہ کار ہندوستان میں مغلیہ عہد میں معلوم تھا۔ باجرہ کو اکثر کسی نہ کسی دوسری پھلی دار فصلوں (مونگ، اُرد، موٹھ وغیرہ) کے ساتھ ملا کر بویا جاتا تھا۔ اس طرح گوچنی (گیہوں کے ساتھ ملا چنا)۔ بےجھڑی وغیرہ کی پیداوار کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ راجپوتانہ میں موٹھ اور پنجاب و ہریانہ علاقوں میں چنا ہمیشہ ہی خوردنی اناج فصلوں کے ساتھ اور بہت ہی کم اکیلے اُگایا جاتا تھا۔

16.4.2 فصلیں

گنگا کے میدانوں میں فصلوں کے نمونے (Pattren) ابھی بھی عہد قدیم کے طرز پر ہیں۔ اس علاقے میں عام طور پر گیہوں، جو، چنا، دالیں، گنّا، کپاس، تلہن (تل، سرسوں وغیرہ) اُگائے جاتے تھے۔ جو راجستھان میں اگائی جانے والی اہم فصل تھی۔ مگر بنگال اور آسام کے علاقوں میں ان کی پیداوار کمیاب تھی۔

چنا، مغربی راجستھان میں خاص طور پر اُگایا جاتا تھا مگر بعد میں یہاں اس کی پیداوار تیزی سے کم ہوئی۔ بھدانی (1999) 17ویں صدی کے دوران چنے کی وسیع طور پر کاشت کو گھوڑوں کے واسطے راجپوت فوج کے ذریعے اس کی بےحد مانگ کے ساتھ جوڑتے ہیں۔

ہندوستان کے جنوبی حصہ میں نم زمینوں (نچّی) پر اگائی جانے والی اہم فصل دھان تھی۔ جنوبی ہند میں اگائی جانے والی دوسری اہم فصلیں تھیں: چولم، راگی، وراگو، تل، السی، مونگ پھلی، کپاس وغیرہ۔ عہد وسطیٰ میں اڑیسہ، کشمیر اور آسام میں بھی دھان ہی اہم فصل تھی باوجود یہ کہ گیہوں، جوار، دالیں، چنا وغیرہ بھی اس علاقہ میں اگائے جاتے تھے۔ کشمیر میں تقریباً دوتہائی آبی زمین پر دھان کی پیداوار کی جاتی تھی۔ بہار بھی دھان کی پیداوار کے لئے مشہور تھا مگر راجستھان میں دھان کی پیداوار بالکل ہی نہیں ہوتی تھی۔

مغربی گھاٹوں سے متصل علاقے مسالوں کی پیداوار کے لئے مشہور تھے۔ مسالوں کے علاوہ پیداوار کی دیگر اشیاء تھیں: سونف، دھنیا، زیرہ، اجوائن، کھجور وغیرہ۔ سیاہ مرچ، بہار کے چمپارن علاقے میں بہت زیادہ مقدار میں جنگلی پودے کی شکل میں اُگتی تھی۔ ابوالفضل بیان کرتا ہے اس کی قیمت ایک سیر (40 سیر = 1 من) 16 دام (40 دام = 1 روپیہ) تک ہوتی تھی۔

افیم کی پیداوار مالوہ اور بہار کے علاقوں میں وسیع طور پر ہوتی تھی۔ نینسی اور پیٹر منڈی (1655-56) بیان کرتے ہیں کہ افیم، کپاس اور نیل میٹرتا علاقے (راجستھان) میں بھی اگائے جاتے تھے۔

عہد وسطیٰ میں بنگال میں پیداوار کے لحاظ سے جوٹ کے مقابلے سن کی پیداوار زیادہ تھی۔ بنگال میں چاول اور چینی کی قیمت پر جوٹ کی اہمیت میں اضافہ 19ویں صدی میں حاصل کیا جاسکا۔ اس کی پیداوار رتنا گیری ضلع میں بھی کثرت سے کی جاتی تھی جو وسیع طور پر ماہی گیروں کے جال، رسّیاں وغیرہ بنانے کے کام آتا تھا۔

کافی (قہوہ) چنندہ طبقوں میں ایک معروف مشروب تھا۔ یہ عموماً جزیرہ نما عرب اور ابی سینیا سے درآمد کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک معمولی قسم جنوبی مہاراشٹر میں اگائی جاتی تھی۔ کشمیر زعفران کے لئے مشہور تھا۔

17ویں صدی مختلف قسم کی نئی فصلیں: مکّا، آلو، شکر قندی، تمباکو، مونگ پھلی، مرچ اور ٹماٹر کی شروعات کے لئے جانی جاتی ہے۔

آئین میں مکّا نام ان فصلوں کی فہرست میں نہیں ہے جن کے لئے نقد ٹیکس کی قیمتیں ذکر کی گئی ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے یہ نئی دنیا سے آیا تحفہ تھا۔ مکّا لفظ کا استعمال یہ تصدیق کرتا ہے کہ یہ بحر احمر کے راستہ ہندوستان آئی تھی۔ اگرچہ مشرقی راجستھان، مہاراشٹر، اور دکن سے ہمیں 17ویں صدی میں اس کی زراعت کے حوالے ضرور ملتے ہیں مگر ممکن ہے اس کی بڑے پیمانے پر کاشت 19ویں صدی کے بعد سے شروع ہوئی (حبیب 1963)۔

مرچ، ہندوستان میں 17ویں صدی میں متعارف ہوئی مگر اس کا پھیلاؤ 18ویں صدی ہی میں زیادہ عام ہوا۔

تمباکو کے استعمال کا پھیلاؤ غیر معمولی شکل میں تیز رفتاری سے ہوا۔ آنندرام مخلص (18ویں صدی) تذکرہ کرتا ہے کہ سنبھل (مراد آباد، یوپی) علاقے میں تمباکو بڑی مقدار میں اگایا جاتا تھا۔ 1708 میں اڑیسہ کا دورہ کرتے ہوئے الیکزینڈر ہیملٹن بالاسور میں تمباکو کی پیداوار کا تذکرہ کرتا ہے۔

باغان فصلوں میں ابن بطوطہ (1377م) آموں کے بارے میں بڑھ چڑھ کر تذکرہ کرتا ہے۔ برنیر (58-1656) بنگال، گول کنڈہ اور دلّی میں پیدا آموں کی تعریف کرتا ہے۔ پورے کونکن ساحلی علاقے میں ناریل، سپاری، پان، مونگ پھلی، کھجور، اناس، کٹھل، شکر قندی وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ مہاراشٹر میں آبپاشی کی سہولیات والے علاقے میں انگور، پان، انجیر وغیرہ باغان فصلوں کے لئے مشہور تھا۔ البیرونی تذکرہ کرتا ہے کہ پان کا استعمال ہندوستان میں عام تھا۔ امیر خسرو (13ویں صدی) نے اعجاز خسروی میں اس کی کم سے کم 42 قسموں کا ذکر کیا ہے۔ بہار ماگھی پان کی پیداوار کے لئے مشہور تھا۔ حاجی پور (بہار) کٹھل کی پیداوار کے لئے جانا جاتا تھا۔ صوبہ بہار میں سنترے کے علاقے 30 میل تک پھیلے ہیں۔

اناس نئی دنیا کی مقامی پیداوار ہندوستان میں پرتگالیوں کے ذریعہ لائی گئی۔ اس کی پیداوار تیزی کے ساتھ پورے ہندوستان میں پھیلی۔ پپیتا اور کاجو بھی نئی دنیا کی دیگر پیش کش تھیں۔

یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ پھل عام طور پر بیج کے ذریعہ اگائے جاتے تھے۔ ترکوں نے قلم لگانے کی تکنیک کی شروعات کی (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں اکائی 23 بلاک 5)۔ جس سے پھلوں کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ کچھ پھلوں خصوصاً سنترے کی خوبی میں بھی اضافہ ہوا۔ قلم باندھنے کی تکنیک کے استعمال سے 17ویں صدی کے دوران وسط ایشیاء سے لائے گئے مختلف پھل یہاں اُگائے جانے لگے (میٹھی چیری (شاہ دانہ)، خوبانی، کیلا، نارنگی، سنترہ وغیرہ)۔ مگر تربوز ابھی وسط ایشیا سے بیج لاکر ہی اگائے جاتے تھے۔ برنیر لکھتا ہے کہ اچھے تربوزوں کے بیجوں کا حصول اور انھیں بہت زیادہ ہوشیاری سے تیار کی گئی زمین میں بونے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جیسا کہ امیروں کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ اچھے تربوز بہر حال کم ہیں۔۔۔۔۔۔ شروع شروع میں قلم باندھنے کی تکنیک کے استعمال کی اجازت صرف شاہی باغات ہی میں تھی۔ شاہ جہاں نے قلم باندھنے کی تکنیک پر سے بندش اٹھائی اور اس طرح اس کا استعمال عام لوگوں میں رفتہ رفتہ ہوا۔

13ویں صدی کے دوران انگوروں کی پیداوار اتنی عام نہیں تھی جتنا کہ اس صدی کے اختتام پر۔ محمد تغلق نے کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کہ وہ انگوروں کی فصل کی طرف توجہ دیں۔ ہمیں اس بات کا حوالہ ملتا ہے کہ فیروز تغلق کے ذریعہ دلّی کے آس پاس اپنے سرکاری 1200 پھل باغات میں اس کی بے شمار اقسام لگائی گئیں تھیں جس سے اس کی قیمت میں تیزی سے گراوٹ آئی۔ سراج عفیف فیروز شاہ کی دور حکومت میں اس کی قیمت 7 جیتل (تانبہ کا سکّہ) فی سیر بتاتا ہے جب کہ گیہوں کی قیمت اس وقت 8 جیتل فی من (40 سیر = ایک من) تھی۔

پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار عموماً شہری مراکز کے آس پاس ہی تک محدود تھی۔ شمالی ہند میں مالی ذات کے لوگوں کو اس کے اگانے میں مہارت حاصل تھی۔ عہد

وسطی میں پھل باغات کی نگہداشت کی روایت کی ترقی ہوئی مگران کی نگہداشت (دیکھ بھال) عام طور پر بادشاہوں یا امراء کے ذریعہ ہی کی جاتی تھی۔17ویں صدی کے دوران دکن میں شاہی باغات سے ہونے والی سرکار کی سالانہ آمدنی تقریباً-586,57,5 روپئے تھی۔

زراعت کی تجارت کاری

عرفان حبیب کا خیال ہے کہ اس عہد میں زراعتی تجارت کے پیچھے اہم مقصد سرکار کے ذریعہ نقد میں ٹیکس جمع (وصول) کرنے پر زور دیا جانا تھا اور ساتھ ہی نفع حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ سرکار کے ذریعہ نقد میں زمینی لگان کی مانگ سے قبل بھی دیہی معاشیات میں سکّہ اور مبادلہ کے کافی ثبوت ملتے ہیں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرکار کی اس کارروائی نے زراعتی حلقوں میں تجارت کاری کو یقینی طور پر وسعت بخشی۔اس سے کاشتکاروں کو بھی نفع ہوا۔بازار میں اپنی فصل فروخت کر کے یا بیش قیمت فصلیں اُگا کر۔کاشتکار بازار کے مطالبہ کی جانب سے ہمیشہ بیدار رہتے تھے۔کپاس ایک ایسی ہی فصل تھی جو کہ مقامی بازار سے باہر آخری پیداوار یعنی کپڑے کی مانگ کو دماغ میں رکھ کر اگائی جاتی تھی۔چینی،قند اور بورا دونوں بازار کے مقصد سے پیدا کی جاتی تھیں۔تجارتی فصلوں میں نیل سے سب سے زیادہ اہم فصلوں میں ایک فصل تھی۔سندھ سے سہوان کے نیل کے کاشتکاروں کو جو کہ اپنی فصل مشرقی وسطی میں برآمد کیا کرتے تھے،اس وقت بہت مشکل پیش آئی جب 1640 کے دہے میں نیل کی مانگ میں تیزی سے کمی آئی۔تمباکو جو حالاں کہ 17ویں صدی کی شمولیت کی بھی بڑی تیزی سے تجارت کاری ہوئی۔لہٰذا کاشت کی پیداوار کا ایک حصہ درحقیقت تجارتی پیداوار ہی تھا۔عرفان حبیب (89-1869) کا ماننا ہے کہ نقدی فصلوں کی کاشت کو درحقیقت بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی تھی جو کہ یہ ایک عام کاشتکار کی قوت برداشت سے باہر تھا۔لہٰذا حبیب اعلیٰ قسم کی،خود کاشت کھیتی کو جو بازار کے مقصد سے کی جاتی تھی،سرمایہ دارانہ کاشت کے سب سے قریب پاتے ہیں۔

16.4.3 پیداوار کے ذرائع

ہمارے پاس کاشتکاری میں استعمال ہونے والے اوزاروں کے متعلق جانکاری کی کمی ہے۔ویسے لوہے کے مقابلے لکڑی کے اوزار عام طور پر استعمال کیئے جاتے تھے۔یوروپی سیاحوں نے لوہے کے پھال والے لکڑی کے ہل کا تذکرہ کیا ہے حالاں کہ ریتیلی اور نرم مٹی کے لئے سخت لکڑی کے پھال بھی استعمال میں تھے۔دکن اور جنوبی ہندوستان میں خاص طور پر کالی مٹی والے علاقوں میں وزنی ہل کا استعمال کیا جاتا تھا جو بیلوں کی 3-2 اور کبھی کبھی 5-4 جوڑیوں کی مدد سے کھینچے جاتے تھے۔مگر نم زمین والے علاقوں میں استعمال کیئے جانے والے ہل نسبتاً چھوٹے اور ہلکے ہوتے تھے۔ہندوستانی ہل پاٹا (ڈھیلی مٹی کو ہموار کرنے کے لئے مستعمل تختہ) ہل کی پھال کے بغیر ہوتا تھا کیوں کہ اس کا استعمال ہندوستان کے لئے مناسب نہیں تھا اس سے شور (نمکین) اور تیزابی عناصر کے مٹی میں ملنے کا خطرہ ہوتا تھا۔یہی بات کم گہرے ہل کے استعمال کے تعلق سے بھی درست ہے۔اس سے پانی کی بندش کی صلاحیت کم ہوتی ہے اور مٹی کے تیزی سے سوکھنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

مویشیوں کے گوبر کی کھاد کا استعمال سب سے زیادہ عام تھا۔مغربی راجستھان میں اس قسم کے حوالے ملتے ہیں کہ بھیڑوں کے ریوڑ کو دو تین راتوں تک کھیتوں میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔جنوبی ہند پر بحث کرتے ہوئے ایل۔اے۔آلیو (کیمبرج،1982) لکھتے ہیں کہ مٹی کو زرخیز بنانے کے لئے ایک کنی (=1.32 ایکڑ) علاقے پر تقریباً 1000 بھیڑ یا بکریوں کے ریوڑ کے ذریعہ 7-5 راتیں گزارنی کافی ہوتی تھی۔چونکہ اس کے واسطے مویشی پالنے والوں کو زیادہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی صرف اعلیٰ سماجی سطح کے لوگ ہی اسکو برداشت کر سکتے تھے۔دکن اور جنوبی ہند میں نم زمین اور کالی مٹی کے علاقوں کو شاید ہی کبھی کھاد کی ضرورت پڑتی تھی جب کہ لال مٹی کو اس کی ضرورت ہوتی تھی۔

عام طور پر دھان کی کھیتی کے لیے پود کو 3 سے 5 پودوں کے گچھوں کو زمین میں بونے کی تکنیک کا استعمال کیا جاتا تھا۔یہ فصل تیار ہونے میں 3 سے 4 ماہ کا وقت لیتی تھی۔بیج بکھیرنے (Broadcasting) کے لئے جنوبی ہند میں سوکھے یا پھر نوشگفتہ (Sprouted) بیجوں کا استعمال ہوتا تھا۔

B. NO. 2

16.5 پیداوار کی تکنیک: آبپاشی

شمالی ہندوستان میں جہاں خریف کی فصلیں عام طور پر مانسون ربارش پر منحصر تھیں وہیں ربیع کی فصلیں زیادہ تر مصنوعی وسائل کی دستیابی پر ہی منحصر تھیں۔ بابر نے بہتے پانی (یعنی نہروں) کی کمی پر ماتم کا اظہار کیا۔اس نے اس حقیقت پر زور دیا کہ فصلیں خاص طور پر بارش اور آبپاشی کے دیگر مصنوعی وسائل پر ہی انحصار کرتی ہیں۔ہمیں ایسے بھی بہت سارے حوالے ملتے ہیں کہ خراب مانسون یا حد سے زیادہ بارش کی وجہ سے کاشتکار کوچ کر گئے ہوں۔ بابر کے مقابلہ میں زین الدین خواف (تزک بابری) آبپاشی کے مقصد سے ندیوں سے نکالی نہروں کی موجودگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ آئین میں بہت سے محل (لگان تعین کی سب سے چھوٹی اکائی) اور گاؤں کا تذکرہ کرتا ہے جو ندی رنالوں کے کنارے موجود تھے۔اور عام طور پر آبپاشی کے لئے انھیں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جنوبی مغربی اور جنوب مشرقی مانسون کے سبب، شمال کے مقابلے جنوبی ہند میں بارش کا پیٹرن (Pattern) کہیں زیادہ منقسم تھا۔اس کے علاوہ جنوبی ہند میں خشک کھیتی (آبپاشی کے مصنوعی وسائل پر مبنی) شمالی ہند کے مقابلے کہیں زیادہ رواج میں تھی۔ حالانکہ حکمرانوں، امراء اور گاؤں کے باشندوں کے ذریعہ وسیع آبپاشی ہمیں شروع کی گئیں ان کے رکھ رکھاؤ کے لئے شاید ہی کوئی توجہ دی گئی ہو۔

16.5.1 کنویں

آبپاشی کے نہایت عام وسائل میں کنوؤں کا مقام اہم تھا۔محمد تغلق نے کنویں کھودے جانے کے لئے کاشتکاروں کو قرضے فراہم کئے۔ بابر لاہور اور دیپال پور میں فارسی رہٹ اور جمنا کے مشرقی علاقے میں دیسی چرس دونوں کی موجودگی کا تذکرہ کرتا ہے (چرس اور فارسی رہٹ دونوں میں شامل تکنیک کے واسطے اکائی 22 بلاک 5 دیکھیں)۔ چرس (گجرات میں 'کوسا' نام سے مشہور) کنوؤں کے ساتھ ساتھ ندی کے کناروں پر بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ربیع کی فصل عام طور پر آبپاشی کے مصنوعی ذرائع پر منحصر تھی۔ رسک داس کروڑی (لگان وصول کرنے والا، 66-1665) کو ارسال اپنے فرمان میں اورنگ زیب نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نا قابل استعمال پرانے کنوؤں کی مرمت کی جائے اور ساتھ ہی مختلف مقامات پر نئے کنویں بھی کھدوائے جائیں تا کہ کاشتکاری کو فروغ ملے اور جنس کالم (اعلیٰ قسم کی فصلوں) کی پیداوار ہو۔ آبپاشی کے مقصد سے باؤلیوں (سیڑھی دار کنویں) کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ موہنوت نینسی، راجا جسونت سنگھ (78-1638) کے دیوان نے اپنے مارواڑ راپرگنہ ری وگت میں آبپاشی کے لئے استعمال دو کنوؤں کا ذکر کیا ہے۔ کوسیتا (کم گہرے عام طور پر کچے کنویں) اور کوہر (گہرے، عام طور پر اینٹوں سے چنے ہوئے)۔ کچے کنویں عام طور پر پختہ کنوؤں کی تعداد میں زیادہ تھے۔

عرفان حبیب کی دلیل ہے کہ پنجاب علاقے میں رہٹ کی شروعات کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہوا مگر چیتن سنگھ (1991) نے اس علاقے میں فارسی رہٹ کی تاثیر پر شک کا اظہار کیا ہے ان کا خیال ہے کہ فارسی رہٹ کی اپنی (متعین) حدود تھیں۔ یہ وہاں زیادہ کارگر نہیں تھا جہاں پانی کی سطح بہت نیچی ہو۔ دس فٹ کی گہرائی کے بعد اس کا استعمال کم فائدہ مند تھا یہی وجہ تھی کہ پنجاب کے جن علاقوں میں پانی زیادہ گہرائی سے کھینچنا پڑتا تھا چرس زیادہ مفید بنا رہا۔ منوچی نے (1656-1712) چرس کا تذکرہ لاہور کے آس پاس آبپاشی کے اہم طریقہ میں کیا ہے۔ چرس کے ساتھ فائدہ یہ تھا جیسا کہ چیتن سنگھ کا ماننا ہے کہ اس میں کم لاگت لگتی تھی اور اس کے استعمال میں مویشی کی بھی طاقت کم خرچ کرتی تھی۔ اگر چہ دلچسپ بات ہے کہ مہوت نینسی، چیتن سنگھ کے دعوے کے برخلاف ذکر کرتا ہے کہ چرس (کوسیتا) 45-15 فٹ کی گہرائی تک کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور فارسی رہٹ (ارھٹ ڈھیبرا) 45-42 سے لے کر 48 فٹ تک کی گہرائی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ مشرقی راجستھان میں فارسی رہٹ کا کوئی حوالہ نہیں ملتا جب کہ آبپاشی کے لئے کنوؤں سے پانی کھینچنے کے لئے یہاں چرس سب سے عام ذریعہ تھا۔ ممکن ہے کہ عرفان حبیب نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ 'اس کی بہت زیادہ لاگت نے اسکو ہندوستانی کاشتکاروں کی پہنچ سے باہر رکھا'۔

مہاراشٹر میں کنوؤں کے ذریعہ آبپاشی کی جانے والی زمین موٹاستھل (Motasthal) کہلاتی تھی مگر اس علاقے میں کنوؤں کے ذریعہ آبپاشی راجستھان اور مغل علاقوں کی بہ نسبت عام نہیں تھی یہی بات جنوبی ہند کے معاملے میں تھی اس پر بھی باغان، فصلوں کی آبپاشی کے لئے کنوؤں کا اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔

16.5.2 تالاب، باندھ اور آبی ذخیرے

آبپاشی کے مقصد سے باندھوں (Dams) کا استعمال عہد وسطی میں کافی وسیع تھا۔ بابر نے آبپاشی کے واسطے جھیلوں، تالابوں، آبی ذخیروں اور آبی مرکزوں کا استعمال عام طور پر قبول کیا۔ زین الدین خواف ایسے جل ھا یعنی جھیل اور تالاب کا حوالہ دیتا ہے۔ جو کہیں کہیں تو 3-1 کروہ (7.5-2.5 میل) علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ خصوصاً سبزی کے کھیتوں اور پھل باغات کی آبپاشی کے واسطے مستعمل تھے۔ بابر تذکرہ کرتا ہے کہ جہاں مناسب نالے رنالیاں نہیں تھیں لوگ پودوں کی آبپاشی کے واسطے خود گھڑوں میں پانی بھر کر لایا کرتے تھے۔ مگر ایسی تھکانے والے اور بہت زیادہ وقت برباد کرنیوالے طریقے ممکنہ طور پر زمین کے چھوٹے حصوں کی آبپاشی کے لئے ہی استعمال کئے جاتے ہوں گے۔

سیلاب کے پانی کو بہتر طور پر استعمال کرنے کے لئے باندھوں کا استعمال بہت کارگر طریقے سے کیا جاتا تھا۔ اتر پردیش کے چندیل حکمرانوں کے ذریعہ تعمیر شدہ باندھ جو 56-1954 تک وجود میں بنے رہے چندر پر بھاندی سے بہہ کر آنے والے سیلاب کے اس پانی کا استعمال کارگر طریقے سے کیا جاتا تھا۔ اس پانی کا استعمال چندر پر بھا کرم نارادو آب کے بڑے علاقے کی آبپاشی کے لئے پوری ہنرمندی سے استعمال کیا جاتا تھا۔

کھڑگپور کے راجا بہروز سنگھ (76-1631) نے بھیم باندھ (کھڑگپور کے جنوب مغرب میں) نام کا ایک باندھ تعمیر کرایا تھا۔ اس کے ذریعہ پہاڑیوں سے آنے والے بارش کے پانی کا صحیح استعمال کیا جاتا تھا۔ اس نے بارش کے پانی کی تقسیم کا ایک دلچسپ منصوبہ بنایا تھا۔ باندھ سے پانی لانے کے لئے اونچے چبوتروں پر بڑی بڑی نالیاں بنائی تھی پانی کی اس طرح تقسیم کی گئی تھی کہ پورے سال پانی کی رسد بنی رہے۔ آبپاشی کے لئے بارش کے پانی کا استعمال کرنے کے واسطے بہروز نے کھڑگ پور پہاڑیوں کے مشرقی جانب اور اس طرح کا آبی مرکز راجارانی نامی بنوایا تھا۔ آبی مرکز میں پانی سال بھر رہتا ہے اور دھان کے کھیتوں کی آبپاشی کے لئے آج بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

پکے نالے جس کو (پاٹا اسٹھل) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مراٹھا علاقوں کی ایک عام خوبی تھی۔ وہاں کے گاؤں پکے نالے کے ذریعہ اپنے کھیتوں کی سینچائی کرنے کے لئے استعمال کئے جانے والے باندھوں میں بارش کے پانی کا ذخیرہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ندیاں اور نالے عام طور پر گرمیوں میں سوکھ جایا کرتے تھے اور ان دنوں آبپاشی کے لئے یہ طریقہ بالکل بھی استعمال نہیں ہوتا تھا۔ تالاب اور آبی ذخیروں کا استعمال کھیتوں کی آبپاشی کے لئے کیا جاتا تھا۔ کے۔ کے۔ ترویدی کے مطابق آگرہ صوبہ میں تقریباً ہر گاؤں میں تالاب تھے۔ مارواڑ میں حکمرانوں اور امراء طبقے کے ذریعہ بے شمار تالابوں کی تعمیر کی گئی۔ جیسے سور ساگر، فراست ساگر، (مہاراجا سور سنگھ کے ذریعہ 1607 میں تعمیر)، بسنت ساگر وغیرہ۔ ان تالابوں کو مستقل صفائی کی ضرورت تھی۔ ابوالفضل ذکر کرتا ہے کہ جب اکبر نے میٹرتا کا دورہ کیا تو اس نے ایک آبی مرکز صاف کئے جانے کا حکم دیا جس کا استعمال آبپاشی کے مقصد سے کیا جاتا تھا۔

جنوبی ہندوستان میں آبپاشی کے سب سے زیادہ مشہور مصنوعی ذرائع میں تھے: آبی مرکز، تالاب اور باندھ۔ مگر ان کی تعمیر میں کافی مقدار میں دولت کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان میں ذاتی کوششیں ناممکن تھیں۔ بغیر کسی اختلاف کے ہم عام طور پر پاتے ہیں کہ اس میں پورا گاؤں یا گاؤں کی جماعت یا کوئی امراء یا راجا وغیرہ کا حصہ ہوتا تھا۔ وجے نگر کے حاکموں نے اپنی حکومت میں تالابوں کے نیٹ ورک کے بڑے حصہ میں دل چسپی دکھائی وجے نگر حکمراں کے ذریعہ تالاب تعمیر کا قدیم حوالہ 1369 کا ہے جب بکا اول کا بیٹا بھاسکر بھوودور (راج کمار بکا) کے ذریعہ آبپاشی کے لئے مال دیوی ندی کا پانی لایا گیا۔ یہ تالاب آج بھی کھیتوں کی آبپاشی کے لئے مستعمل ہے۔ یہ تالاب سات میل لمبا اور ڈھائی میل چوڑا ہے۔ اس نے ایک نہر کھدوا کر اور اس کو ایک تالاب سے جوڑ کر پنیو کونڈا علاقے میں بھی پانی کی سپلائی کو یقینی بنا دیا تھا۔

دیوارائے اول کے ذریعہ اپنی راجدھانی تک 15 میل کی دوری پر واقع تنگ بھدرا ندی سے پانی لایا گیا۔ یہ نہر ابھی بھی کھیتوں کی آبپاشی کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ کرشن دیوارائے نے بھی دھان کے کھیتوں اور باغات کی آبپاشی کے لئے ناگل پور (موجودہ ہوس پیٹ) میں ایک بڑا تالاب رائر کیرے بنوایا تھا۔

پورو ما میلا تالاب کا کتبہ 1369 عیسوی

(V.6) بھگوان چیوت (وشنو) تکلیفوں سے آزاد (کریں) تین زمانوں کی حفاظت کریں کیونکہ کل ملا کر ایسا کوئی (کارِ ثواب) نہیں جس کا مقابلہ اس (تب تک ظاہر) سے کیا جا سکے جو ایک تالاب کے بنوانے سے (حاصل ہوتا ہے)۔

(V.9) ایک لڑکا، ادبی تخلیق اور تالاب (پوشیدہ) خزانہ، ایک شیو مندر، ایک جنگل (چھوٹا جنگل) ایک برہمن گاؤں (یہ) سات (اقسام) کے پھل زیادہ عمدہ ہیں۔

(V.28) سب سے اعلیٰ انعام کی بات سن کر، راجا بھاؤدر، پاک روح کی طرح نے، زمین پر تالابوں کی تعمیر کا کام شروع کرایا (تا تکا ماترکا)۔

(L.48) اس کا طریقہ کار (مندرجہ ذیل تھا):

(Vv.29-31) یہ (یعنی تالاب) ملک میں شری پرورت (شری شیل) کے جنوب میں بنا ہے، جو مذہبی یاترا کی مشہور مقدس جگہ ہے۔ اس مقدس مقام (تیرتھ: سیاحت سے) مشرق میں یوجنوں، دور مقامات کو اہو بالا کہا جاتا ہے۔ پوتر سدوتھ-ناتھ کے علاقے میں دو یوجن اس کے (دارالسلطنت) ادے گری کے مغرب میں اور پھلتے پھولتے شہر پورو ما میلا کے مشرق میں! میں (اب) اس کتبے میں تالاب کی تعمیر کا ذکر کروں گا:

(Vv.32-35) تخلیق کار کی زندگی میں نصف حصہ میں، شویت وراہا کلپ میں سے وسوت منو (کے زمانہ) میں اور 28 ویں زمانہ میں۔ ملک کی اس دیوا سقل میں۔ کلی کی پہلی سہ ماہی میں چار ہزار چار سو ستر، اعداد ہیں۔ سالوں کے وقفے کے بعد اور ساکا سالوں کے بھی (بھولی) کے بعد جو زمین (1) نند (9) آنکھیں (2) اور ایک (1) اعداد میں 1291 (دوہرانا) سال سومیئے (Saumya) میں کارتک نام کے مہینہ میں آدھے چمکدار (Bright half) چودھویں (دن) پشیہ (Pushya) کے شامل گرو (Gru) کے مبارک دن، جب کرکٹک لگن (Karkataka) تھی۔ من پسند مبارک گرہوں (سیاروں) کے زیر اثر۔

(V.36) تعمیر کرائے گئے تالاب (مذکورہ مخصوص وقت اور تاریخ پر) کے تعلق سے شاستر (علم) (کی ضروریات) کے مطابق اس سرکاری حکم میں ہم با اثر راجاؤں کے فائدہ مند موقع بارہ جز (حصوں) کا تذکرہ کریں گے۔

(V.37) (i) ایک نیک، غنی، خوش مزاج منصف (اور) دائمی شہرت (حاصل کرنے) کا خواہشمند راجہ (ii) زمین کے پانی کا علم (پاٹھا شاستر) کا ماہر (iii) سخت چکنی مٹی سے مزین زمین (VI) میٹھا پانی لانے والی ندی (اور) تین یوجن دور (اپنے منبع سے) (V) جس کے پہاڑ کے حصے اس کو (یعنی تالاب کو) چھوتے ہوں (vi) ان کے (پہاڑ کے حصے) بیچ بڑے پتھروں سے (تعمیر) ایک باندھ جو بہت لمبا نہیں (لیکن) مضبوط ہو (VII) دو کنارے (سری گما) جو باہر پھل (دینے والی) زمین (پھل استھر) کی طرف (اشارہ کرتی) ہو (VIII) نیچے پھیلا ہوا اور گہرا (IX) اور سیدھے و لمبے پتھروں کی ایک کھان (X) ملے ہوئے کھیت، پھلوں سے بھرپور (اور) ہموار (XI) پہاڑ کی حالت (آدری استھان) کے سبب مضبوط چشمہ (بھنور) پانی کا راستہ (XII) اس کی تعمیر میں (ماہرین فن) لوگوں کی جماعت ان بارہ ضروری لوازمات کے ساتھ ہی (اس) زمین پر ایک عمدہ تالاب با آسانی بنوایا جا سکتا ہے۔

(V.39) جب (1) باندھ سے پانی چونا (؟) (ii) کھاری مٹی (iii) دو ریاستوں کی سرحد پر (موجود) (iv) (تالاب کے) تل کے بیچ ابھار (کورم) (V) مشکل میدان اور بہت زیادہ پانی کی سپلائی: اس (تعلق) میں یہ چھ خرابیاں ہیں۔

(V 40) خامیوں سے محفوظ اور بے شمار فوائد سے بھرپور دنیا میں پورے انمتا راج، یہ لامتناہی سمندر کے نام سے مشہور جس کا پانی شریں ہے، کی بنیاد راجا بھاسکر کے ذریعہ رکھی گئی تھی (v.41) وہاں ہر دن تالاب اور باندھ میں ہزار مزدور (کام میں مشغول) تھے۔ اور بند کے دروازے یا دیوار (بھرم بھتی) کی چنائی کی خاطر ایک سو گاڑیاں لگی تھیں۔ (v.42) اور یہ بہت عمدہ تالاب دو سالوں میں بن کر تیار ہوا۔ وہاں یقیناً اس (تعلق) سے بے حد دولت اور غلہ خرچ ہوا۔

MEDIA CENTRE • MANUU • LIBRARY • Hyderabad

(V.43) باندھ (بشمول) پہاڑی (کے حصہ) کے ساتھ باندھ کی اونچائی، چوڑائی اور لمبائی کے جز کے حساب سے پیمائش یہاں دی گئی ہے (V.44) پانی کی نکی (یعنی بندھ کے دروازے) والا یہ باندھ جو گھنیش (گنپتی)، ایشور (شیو) وشنو، بھیرو اور عظیم درگا کے ذریعے محفوظ ہے۔ ایک ایسا باندھ ہے جس کی عظیم لمبائی پانچ ہزار، اونچائی سات اور اس کی چوڑائی آٹھ ریکھا مدا سے ہے اور زمین بہت اچھی ہے اور سبھی موسموں میں بھرپور فصلیں دیتی ہے اور ساتھ ہی یہاں باغات بھی ہیں۔

(V.45) یہ زمین دیوتاؤں اور برہمنوں کی دل جوئی کی خاطر بڑی فراخ دلی کے ساتھ عطا کی گئی تھی۔ اس زمین کے عطیہ کے ثواب سے یہ تالاب (تالابوں کا) ایک زیور بن کر سامنے آیا۔

(V.46) جس طرح کسی آبی ذخیرے کے باندھ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے، راجاؤں کے بحر عظیم کے دھرم باندھ کے ساتھ بھی بالکل ویسا ہی کرنا چاہئے۔ اس وجہ سے بھاسکر، زمین پر سبھی راجاؤں سے برابر درخواست کرتا ہوں کہ میرے عطیہ کی قدر دانی کریں۔

(V.50) اس تالاب کا ذمہ دار افسر (ادھیکاری) جس کا نام دیورراجا ہے، کمارگری ناتھ نام کے وزیر کا عقلمند بیٹا ہے۔

(V.52) دھان پیدا کرنے والی (زمین کی) ایک کھڑی اور کالی مٹی زمین کی (ایک) کھڑی (یہ) بھاسکر کے ذریعہ اس کو دیئے گئے اعزاز کے علاوہ تھے جو کسی دیوتا کو اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔

وی۔ ایس۔ سکھ تھنکر: دی پروما میلا ٹینک انسکریشن آف بھاسکر بھاودورا: ساکا 1291، اپی گرافیا انڈیکا، جلد xiv، نمبر 4 (18-1917) صفحہ 106-109

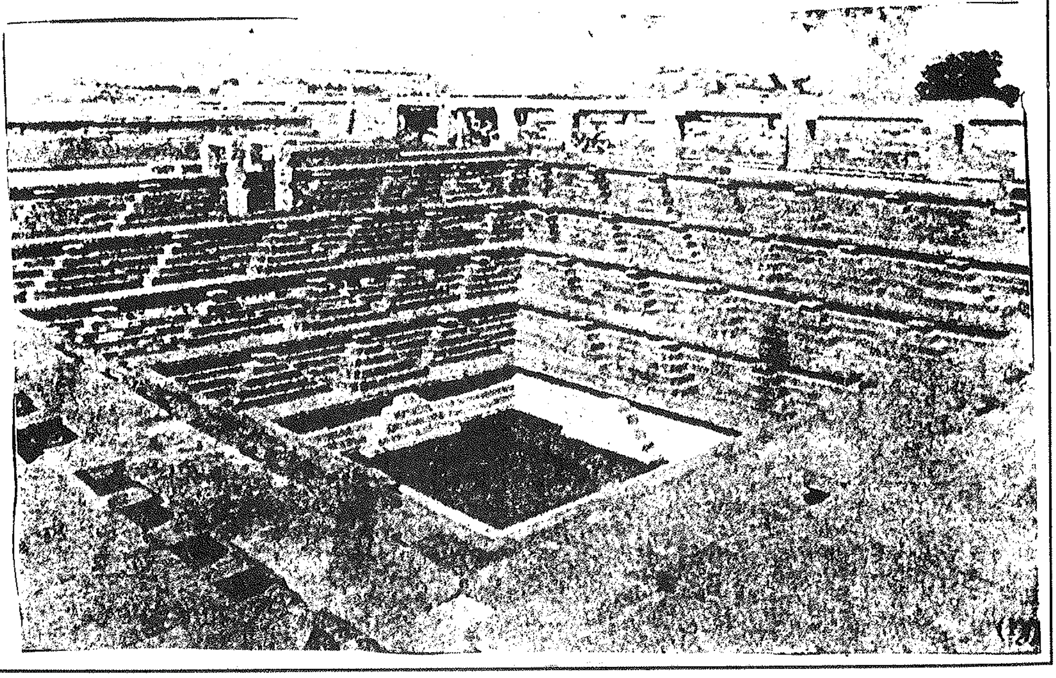

وجے نگر عہد میں خاص کر نیم خشک علاقوں میں مخصوص افراد کے ذریعہ بے شمار ذاتی کوششیں بھی کی گئیں۔ بدلے میں انہیں بڑھی ہوئی فصل سے حصے دینے کا وعدہ کیا جاتا تھا۔ یہ ان کی منقولہ جائداد کا حصہ تھا۔ ایسے حقوق کرناٹک میں کٹو کوڈگے اور تمل علاقے میں وساوندنام سے جانے جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک مثال میں ایک مندر گاؤں (دیودان) میں تالاب بنوانے والے کو اس تالاب کے ذریعہ آبپاشی شدہ زمین پر پیدا ہوئے دھان کے 3/10 حصہ اور خشک زمین پر

پیدا وار گی میں ایک حصہ دینے کی یقین دہانی دی گئی تھی۔ بدلے میں اس تالاب کی مرمت اور انتظام (دیکھ بھال) کا ذمہ داری سونپی گئی۔ اپنے نجی دیودان گاؤں میں کھیتوں کی آبپاشی کے لئے تالاب تعمیر کی سرگرمیوں میں مندروں کا اشتراک جنوبی ہند میں ہمارے زمانہ کی ایک عام علامت تھی۔

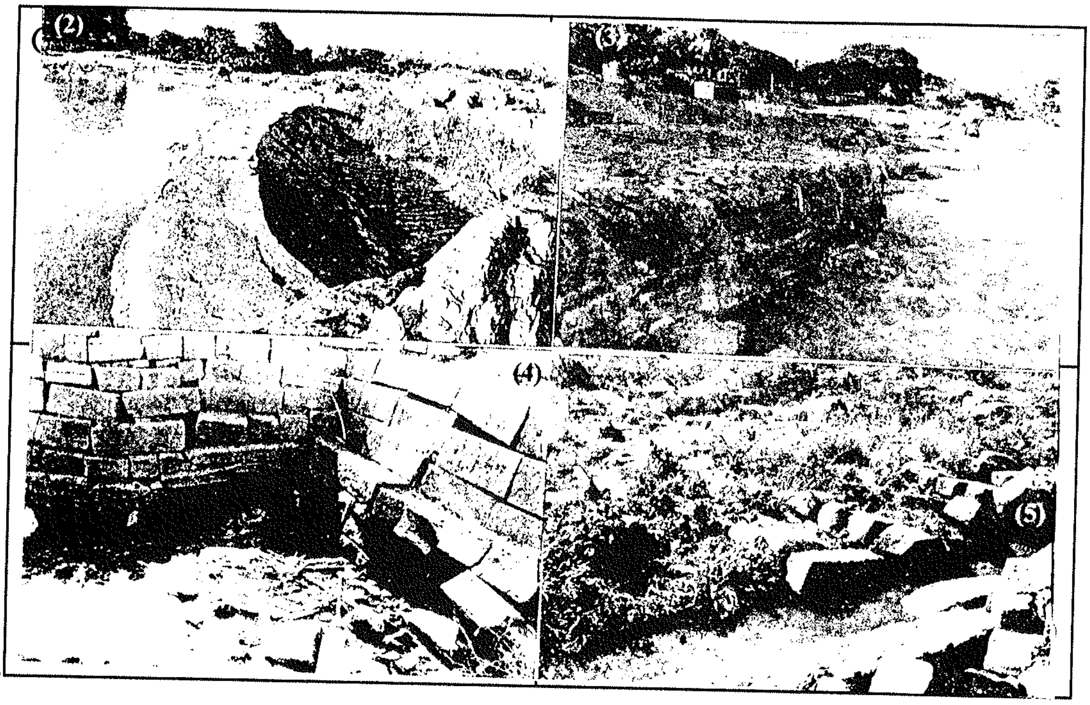

(1) سیڑھی دار تالاب: وجے نگر، (2) انی گنڈی انی کٹ، (3) انی گنڈں انی کٹ، (4) کملا پورم تالاب کا نکاس، اور
(2) زائد پانی کے نکاس کا راستہ (Waste weir)

16.5.3 نہر

جنوبی ہند میں ندیاں عام طور پر برساتی ہیں اور پانی کی سطح اکثر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اسی سبب آبپاشی ذرائع کی شکل میں نہریں شاید ہی وسیع طور پر مناسب سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے مقابلے شمالی ہند میں 14 ویں صدی کے شروع ہی سے ہمارے عہد میں آبپاشی کے مقصد سے وسیع نہروں کا جال دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ نہریں کھدوانے کی شروعات غیاث الدین تغلق (25-1320) کے ذریعہ کی گئی۔ آبپاشی کے مقصد سے وسیع نہروں کے جال کا معمار فیروز شاہ (86-1351) تھا۔ حصار فیروزہ کے اپنے نوتعمیر شدہ شہر کو مسلسل پانی فراہم کرانے کے لئے فیروز نے جمنا ندی سے دو نہریں کھدوائیں، رجبواہ اور الغ خانی۔ اس سے زراعتی میدان میں ترقی ہوئی۔ برنی اور عفیف دونوں تذکرہ کرتے ہیں کہ جہاں پہلے صرف خریف ہی کی فصل پیدا ہوتی تھی اب وہاں ربیع کی فصل اگانی بھی ممکن ہوگئی تھی۔ عفیف تعریف کرتا ہے کہ نہروں نے اس علاقہ میں زمینی پانی کی سطح کو بھی بڑھانے میں مدد کی ہے۔ اکبر کے عہد حکومت میں رجبواہ (1560) اور الغ خانی (71-1570) نہروں کی دوبارہ کھدائی کی گئی۔ شاہ جہاں نے اس نہر کی (شاہ نہر، نہر فیض) لمبائی میں 30 کروہ (1=2.5k.m) کا اور اضافہ کیا نیز اپنی نوتعمیر شدہ راجدھانی شاہ جہاں آباد تک اس کا پانی لایا۔ شاہ جہاں کے دور حکومت میں راوی ندی پر بالائی باری دو آب علاقے (پنجاب) میں ایک اور بہت ہی اہم نہر کھودی گئی جس کا پانی لاہور تک آتا تھا۔

مراٹھا علاقے میں نہروں اور باندھوں کا کھودا جانا عام طور پر گاؤں خاص کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔ مگر اے۔ آر کل کرنی (69-1968) کا ماننا ہے کہ ریاست نئے باندھوں کی تعمیر یا پھر پرانے باندھوں کی مرمت کا پورا یا پھر کچھ خرچ برداشت کرتی ہوگی۔ پکے نالے (aqueduets) کے ذریعہ سے لئے گئے پانی کی کوششیں ''پال'' کہلاتی تھی۔ کلکرنی (1969-1968) 1674 کے ایک دلچسپ محضر کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں ناسک ضلع میں موہادی گاؤں کی رعیت (کاشتکار) کے ذریعہ بان گنگا ندی پر ایک باندھ کی تعمیر کے خلاف مدعی نے شکایت درج کرائی تھی۔

شمالی علاقوں میں کاشتکاری کافی حد تک بارش پر منحصر تھی۔ کنوؤں کا کھودا جانا انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وہاں جو بھی نہریں کھودی گئیں وہ ریاستی اقدام کے نتیجہ میں ہوئی۔ ان کے ذریعہ صرف ایک چھوٹے سے زمینی خطہ کی آبپاشی ہی ممکن تھی۔ دکن اور جنوبی میدانی حصوں میں بھی ہمیں آبی دھاروں پر باندھ بنا کر بنائی گئی مصنوعی جھیلوں کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ مگر آبپاشی سہولیات فراہم کرانے سے متعلق ریاست کی انتہائی کوششوں کے باوجود 19 ویں صدی کے آخر میں جنوبی ہند میں قابل آبپاشی زمین کے اندازہ کے مطابق کل قابل کاشت زمین کا 3 سے 7 فی صد ہی تھی (تنجور کو چھوڑ کر جہاں یہ 50 فی صد تھی)۔

16.6 زراعتی پیداوار کی تنظیم

عہد وسطیٰ میں ہندوستان کی معیشت عام طور پر کاشتکاروں سے آزاد معیشت تھی۔ ہمیں ایسے حوالے دیکھنے کو نہیں ملتے جہاں کاشتکاروں نے متحدہ کاشتکاری (Community Cultivation) کا متبادل چنا ہو۔ پھر بھی عام طور پر کاشتکار اپنے فیملی ممبروں (خاندان) کے ساتھ انفرادی بنیاد پر فصل پیداوار کے کاموں میں حصہ لیتا تھا۔ جنوبی ہند میں بھی چھوٹے کاشتکار گھر کا ذمہ دار اپنے خاندان کی محنت کے ذریعہ ہی پیداوار کی بنیادی اکائی کی تعمیر کرتے تھے مگر وہ کاشتکار (خود کاشت، کسان شمالی ہند میں) قبضہ والی زمین کے بڑے حصے کے مالک ہوتے تھے۔ انھیں مسلسل زائد محنت کے عمل پر ہی منحصر رہنا پڑتا تھا۔ مراٹھا علاقے میں چونکہ بڑی تعداد میں جوان لوگ عموماً شیواجی کی فوج میں بھرتی ہوگئے تھے۔ ریاست اس بات کو یقینی بنانے کے لئے پریشان رہتی تھی کہ کاشتکاری کے واسطے درکار عوامی طاقت حاصل ہے یا نہیں۔

عام طور پر کسی بھی گاؤں میں زمین مالکوں کے تین درجہ ہوتے تھے۔ اعلیٰ ذات (اعلیٰ حقوق یافتہ) معمولی ذات (رعیت) اور نچلے طبقہ کی ذاتیں (کھیتی مزدور اور گاؤں کے نوکر چاکر وغیرہ) (مزید تفصیل کے لئے اکائی نمبر 17 دیکھئے)۔ نچلے طبقہ کی ذاتیں کھیت مزدوروں کی شکلوں میں کام کرتی تھیں۔ عہد وسطیٰ کا شمالی ہند اس طرح ایک فرق پیش کرتا ہے کہ ایک طرف زمین کثیر مقدار میں موجود تھی تو دوسری طرف زمین سے محروم لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ بیگاری کی بھی جھٹ پٹ مثالیں ملتی ہیں۔ مغربی راجستھان میں راٹھوروں کے ذریعہ بیگاروں کی شکل میں نائی رکھے جاتے تھے۔ جبکہ جالور علاقے میں بھومیا (راجستھان میں زمینداروں کا لقب) ڈھیڈھوں (چمڑے کا کام کرنے والے) سے کھیتوں میں گھاس پھونس (خش وخاشاک) اکھڑواتے تھے۔ شمال کے مقابلے جنوبی ہند میں بیگاری کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ آلیو (کیمبرج 1982) کا ماننا ہے کہ مزدوروں کی قلت کافی حد تک اس حقیقت سے جڑی تھی کہ اعلیٰ ذات سے آنے والی آبادی کا ایک اچھا خاصہ حصہ جسمانی محنت کو حقیر اور کچھ کاشت کے کاموں کی ممنوع سمجھتا تھا اور مسلسل پیداوار کے عمل میں ذاتی طور پر حصہ دار بننے سے گریز کی کوشش کرتا تھا۔۔۔۔۔۔(اور) محنت کی کفایت شعاری کی طرف تھا نہ کہ زمین کی کفایت کے لئے۔

اپنے عہد مطالعہ میں ہمیں اکثر ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی جانب کاشتکاروں اور مزدوروں کی ہجرت کے حوالے ملتے ہیں (مزید تفصیل کے لئے اکائی 17 دیکھیں)۔ جب کسی گاؤں کو بسایا جاتا تھا تو جس سربراہ کے ذریعہ گاؤں کو خصوصاً بسایا جاتا تھا اس کو اس علاقے میں زمیندار کا درجہ دیا جاتا تھا۔ مراٹھا علاقے میں وہ پاٹل کہلاتا تھا۔ اس کو عموماً یہ عطیہ وطن (موروثی مالگذاری تفویض) کی شکل میں ملتا تھا۔ کاشتکاروں کو جنہیں وہ عام طور پر کاشتکاری کے لئے لاکر بساتے تھے ان کو اس علاقے میں زمین پر میراثی حقوق ملتے تھے۔

شمالی ہند میں کاشتکار برادریاں (ذاتیں) تھیں۔ جاٹ، اہیر اور راجپوت۔ جو کاشتکاری عمل میں براہ راست شامل تھے۔ برہمن عموماً اپنی زمین پر کھیتی کرائے کے مزدوروں کی مدد سے کیا کرتے تھے۔ مغربی راجستھان میں کمین (نچلی ذات کے لوگ) لوگوں کا تذکرہ کھیتی والوں کی شکل میں کیا گیا تھا۔ وہیں راجپوتوں کو اس علاقے میں ممتاز حقوق حاصل تھے۔ ان کے پاس زمین داری (باسی Basi) گاؤں ہوتے تھے نہ کہ رعیتی۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کی اس علاقوں میں ایک غیر کاشتکار برادری تھے (بھدانی، 1999)۔ وہیں پٹیل ایک دیگر غیر کاشتکار ذات تھی۔ ان کا ارتکاز جالور علاقہ میں تھا۔ دوسری طرف جاٹوں کے گاؤں رعیتی تھے جو یہ دکھاتے ہیں کہ وہ اس علاقے میں کاشتکار ذات تھے۔ تقریباً سبھی پرگنوں میں پالی وال بھی کاشتکار برادری معلوم ہوتی ہے۔ مراٹھا مقبوضہ علاقے میں عموماً کاشتکاری مراٹھا طبقہ سے متعلق تھی۔

ان نام ونہاد کاشتکار برادریوں (ذاتوں) کے علاوہ ہمیں دیگر برادری بھی دیکھنے کوملتی ہے جو یا تو دستکار طبقہ سے متعلق تھیں یا پھر سماجی درجہ بندی میں کم درجہ پر تھے۔ان کے پاس زمین تھی اور انھیں کاشتکار کہا جاتا تھا۔

آلیو(کیمبرج،1982) جنوبی ہند میں علاقائی محنت کی تقسیم کی بات کرتے ہیں۔ مالا بار کو جہاں مرچ اور مسالوں کی پیداوار میں خاص مقام حاصل تھا وہیں چاول کے لئے اسے گجرات،کورومنڈل اور بنگال پر منحصر رہنا پڑتا تھا۔

16.7 چراگاہی جنگلاتی معیشت

چراگاہی معیشت

مویشی پالنے کا دستور ممکنہ طور پر ہر جگہ موجود اور منتشر شکل میں پھیلا ہوا تھا نیز کاشتکاری اور مویشی پالنے کے بیچ گہرا تعلق تھا۔مغربی راجستھان میں چراگاہ نہ صرف مشترکہ وسیلہ کی شکل میں گاؤں کے لوگوں کی ملکیت تھی بلکہ اپنے خالصہ (شاہی زمین) علاقے میں بھی راجپوت حکمرانوں کے ذریعہ بڑی تعداد میں چراگاہ قائم کی گئیں تھیں(بھدانی 1999)۔ایسے ساحلی علاقوں میں جو عام طور پر پانی سے لبریز رہتے تھے اور جہاں سیلاب عام علامت تھی مقامی کاشت کاری کے بجائے مویشی پالن اور خانہ بدوش معیشت کی اہمیت تھی۔ پنجاب پر چیتن سنگھ (1991) کی تحقیق بڑے پیمانے پر چراگاہی معیشت پر بقائے زندگی کے لئے منحصر چراگاہی فرقوں کی موجودگی خصوصاً سندھ کے نچلے میدان میں ظاہر کرتی تھی۔ ابوالفضل (1595) اور سجان رائے بھنڈاری (1695) بھی سندھ کے نچلے میدانی حصوں میں ادل بدل کر کھیتی کرنے (shifting cultivation) کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس طرح خشک علاقون میں جہاں بارش کی کمی کی وجہ سے کھیت کی جتائی بوائی مشکل ہوتی تھی گھاس بھرے اور جنگلی علاقوں میں مویشی پالن اہم ذریعہ اور بقائے زندگی بن گیا۔عہد وسطی میں فی آدمی کے پاس مویشی کی تعداد 1900 میں فی آدمی کے پاس جانوروں کی تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔عرفان حبیب کا ماننا ہے کہ بڑی تعداد میں مویشیوں کو پالنے کے لئے وسیع بنجر زمینوں کا ہونا ہی اس دل چسپ تناسب کا اہم سبب تھا۔ان کے مطابق حد درجہ مویشیوں کی تعداد ہی گاؤں میں غذائی اناجوں کو لانے لے جانے کے لئے بیل گاڑیوں کے بجائے بیلوں کے زیادہ استعمال میں تبدیل ہوئی۔ نتیجتاً چراگاہی پیداوار جیسے گھی مغلیہ عہد کے ہندوستان میں گیہوں کے مقابلے کافی سستا تھا۔راجستھان میں گھی،اون اور چمڑا پیداوار برآمد کے اہم مدات تھے۔ 1662 کی ایک قانون گوہی میں ذکر ملتا ہے کی تقریباً 650 من گھی مغربی راجستھان میں صرف خالصہ زمین ہی سے برآمد ہوتا تھا۔(بھدانی 1999) بہار میں متھیلا علاقے میں تریٹ اپنے دودھ دہی پیداوار کے واسطے مشہور تھا۔ مویشی کاشتکاری عمل کا ایک لازمی حصہ تھے، زراعت کے مقصد سے بھی اور پانی کھینچنے کے لحاظ سے بھی۔ یہ اہم بات ہے کی مذہبی پیشواؤں (nishadhon) نے مویشیوں کا استعمال غذائی شکل میں کئے جانے پر رکاوٹ ڈالی۔راجستھان میں اونٹ پالنا ایک اہم معاشی سرگرمی تھی۔اونٹ کا استعمال صرف بار برادری کے مویشی کی شکل میں نہیں تھا بلکہ وہ کاشتکاری کے کاموں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔مغربی راجستھان میں مویشی پالن ایک اہم پیشہ تھا۔مویشیوں کے ریوڑ خصوصاً بیل اور گائیں مارواڑ علاقے سے قریب کے علاقوں کو برآمد کی جاتی تھیں۔ مغربی راجستھان خصوصاً ملیاً نیار عمدہ نسل کی گایوں کے لئے مشہور تھا۔ناگم علاقے کے کاشتکار بیلوں کی نسل کے پالنے کے لئے جانے جاتے تھے۔حالانکہ ملّانی گھوڑا پالنے کے لئے مشہور تھا۔عام طور پر گھوڑا پالن کوئی بہت فائدہ مند کاروبار نہیں تھا بلکہ راجستھان خصوصاً بھیڑ اور بکری پالن کے لئے مشہور تھا۔رائے باڑی اور گوجر اہم چراگاہی اور خانہ بدوش فرقے تھے جو راجستھان میں مویشی پروری کا کام کیا کرتے تھے۔نونز بیان کرتا ہے کی بانک پور (جدید دھارواڑ) کے آس پاس کا علاقہ افزائش زمین (نسل)(seed plots) اور مویشی پروری کے فارموں سے بھرا پڑا تھا۔

جنگلاتی معیشت

عہد وسطی میں جنگلات کی وسعت آج کے مقابلے کل کہیں زیادہ تھی۔ اگر چہ زراعتی پیداوار ہندوستانی معیشت کا بنیادی سرمایہ تھی۔ جنگل کی پیداوار سے ملنے والے محصول بھی عام طور پر بہت اہم تھے۔ یہ بہت ساری پیداوار کے لئے لازمی تھا خاص طور پر، عماری لکڑی، شہتوت، شہد، مویشیوں کی کھال وغیرہ سے جڑی

پیداوار۔کل وسائل کا تقریباًدس فیصد قبائلی علاقوں سے آتا تھا۔ پہاڑوں سے عمارتی لکڑی میدانی علاقوں میں آگے کے صارفین کے واسطے متفرق لکڑی کے بازاروں کوندی کے راستے بہاکر پہنچائی جاتی تھی۔ چیتن سنگھ کشتی سازی کے لئے پنجاب کے ندی والے شہروں میں عمارتی لکڑی کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہیں ۔چناب ندی کے ساحل پر وزیرآباد کشتی سازی کی سرگرمیوں کے لئے جانا جاتا تھا۔اس کو پہاڑوں سے چناب ندی کے راستے لکڑی کے لٹھے (Timber logs) حاصل ہوتے تھے۔مغربی گھاٹ عمدہ قسم کے ساگوان کی پیداوار کے لئے مشہور تھا جس کا نمبر مالا بار کی ساگوان کی لکڑی کے بعد دوسرا تھا۔اس علاقے میں اس کی پیداوار سے جہاز سازی کی صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔شیواجی کی جہاز سازی سے متعلق سرگرمیاں کلیان اور بھیونڈی علاقوں میں مرکوز تھیں جو اپنی عمارتی لکڑی کی پیداوار کے لئے مشہور تھا۔

بابر عمدہ قسم کی کابلی روہارب کا ذکر کرتا ہے جو وہاں مغربی ہمالیہ سے آتی تھی۔ مجیٹھ یا میدر کا استعمال رنگائی کے کاموں میں کیا جاتا تھا خصوصاً بھوٹیاؤں کے ذریعہ موٹے اونی کپڑوں کو رنگنے کے لئے۔گم لیک دوسرے قسم کا رنگ مغربی پہاڑیوں سے حاصل ہوتا تھا۔مشک ایک مویشی سے حاصل شدہ پیداوار کشمیر سے آسام تک پھیلے مغربی ہمالیہ کے علاقہ میں پائی جانے والی ایک ایسی پیداوار تھی جس کی مانگ اور مطالبہ بہت تھا۔ ہاتھی دانت کی امراء طبقوں میں خاص مانگ تھی۔ہمیں جنگل یا پہاڑی عدیم التحصیل (نایاب) اشیاء کی مغل بادشاہوں کو نذر پیشکش کی شکل میں مانگ کے ثبوت ملتے ہیں۔سرمور کے راجا بدھ پرکاش تقریباً (1664-1684) کو تحریر کردہ شاہ جہاں کی بیٹی جہان آرا کے خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ راجا کے ذریعہ شہزادی جہاں آرا کو کالاگڑھ جنگل سے برف ،مشک،انار اور سال کی لکڑی بھیجی گئی تھی۔

16.8 زراعت اور ریاست

عرفان حبیب (کیمبرج 1982) نے برنی کے اس تجزیے کی بنیاد پر کہ زیادہ محاصل نے زراعت کو متاثر کیا یہ دلیل دیتے ہیں کہ زمینوں کا لگان اور زراعتی پیداوار کے بیچ تعلق تھا اور زراعت میں گراوٹ کے مطابق زمین کے لگان میں بھی کمی آئی۔ وہ اس میں ایک تضاد پاتے ہیں کہ جہاں محمد تغلق کے بھاری محصولات نے دوآب میں ایک بڑی ہی خوفناک کاشتکار بغاوت کو ابھارا۔ساتھ ہی زراعتی پیداوار کے میدان میں ایک منصوبہ بند اصلاح سے متعلق پالیسی کا منظم خاکہ پیش کرنے والا بھی وہی تھا اس نے ایک دیوان کی قیادت میں امیر کوہی نام سے اعلیٰ شعبہ منظم کیا۔مکمل دوآب علاقے کو زراعت کے تحت لانے کے لئے اس نے بے شمار افسران مقرر کئے ہر ایک کی ذمہ داری 30 کروہ (1=2-5 KM) زمین کو کاشت کے تحت لانے کی تھی۔ برنی افسوس ظاہر کرتا ہے کہ اس ابتدائی منصوبہ کے تحت 70 لاکھ ٹنکے (چاندی کا سکّہ) تقسیم کئے گئے تھے،مگر زراعت کے تحت مشکل ہے اس کا ہزارواں 1000 یا سواں 100 حصّہ ہی لایا گیا۔محمد تغلق کی کوششوں کا کچھ بھی انجام ہوا ہو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کی کاوشوں سے زراعت کے تحت نئے علاقوں کو لانے کی زراعتی وسعت سے متعلق تصور کا آغاز ہوا۔کم قیمت والی فصلوں کی جگہ بیش قیمتی فصلوں کو شامل کرنے سے متعلق تصور کو سامنے رکھنے کی اس کی کوشش بھی عام طور بہت اہم تھی۔

زراعت کے واسطے کاشتکار،ریاست اور سماج کے غنی طبقہ پر بہت زیادہ منحصر تھے۔عام کاشتکاروں کے پاس اچھے بیجوں کا فقدان ہوتا تھا۔زمین کی آبپاشی کرنے یا کنواں کھودنے کے لئے یا پھر کھیتوں میں ہل چلانے کے واسطے بھی انھیں زائد رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔(مزید تفصیل کے لئے دیکھیں اکائی نمبر 17)

آبپاشی منصوبوں کو رقم کی فراہمی کرنے میں ریاست ایک خاص کردار ادا کرتی تھی۔نہروں کے ذریعہ آبپاشی تقریباً مکمل طور پر ریاست یا امراء طبقہ کی پہل اور مالی تعاون پر منحصر تھی۔یہاں تک کہ اینٹوں کی ذریعہ چنے گئے پکے کنویں تعمیر کرانا بھی عام کاشت کار کی ہمت سے باہر تھا۔سب سے پہلی بار دوآب قحط کے دوران محمد تغلق (1325-51) نے آب پاشی کے مقصد سے کنویں بنانے اور زراعت کی توسیع کے واسطے کاشتکاروں کے درمیان قرض (سوندھر) وسیع طور پر تقسیم کئے۔مغلوں کے تحت فصل کے لئے اس طرح کے پیشگی قرض تقاوی کہلاتی تھی۔دل باغ سنگھ کا ماننا ہے کی مشرقی راجستھان میں نئے کنویں بنوائے اور پرانے کنوؤں کا رکھ رکھاؤ ریاست کی فکر کا اہم موضوع تھا۔اورنگ زیب رسک داس کو ارسال اپنے فرمان میں بھی انھیں اندیشوں کی بات کرتے ہیں۔

شیواجی نے اپنے افسران کو ہدایت دی تھی کہ بیل، بیج وغیرہ خریدنے کے واسطے کاشتکاروں کو پیشگی رقم فراہم کرائیں۔کاشت کاروں کو یہ رقم آسان قسطوں میں

ادا کرنی ہوتی تھی۔ 1676 میں شیواجی نے پربھاولی معاملہ (تعلقہ) کے صوبے دار کو حکم دیا کہ وہ سبھی گاؤں کا دورہ کرے اور کاشتکاروں کی ضروریات کا پتہ لگائے کہ کیا ان کے پاس حسب ضرورت مقدار میں کھیتی کے واسطے بیج، ہل، بیل وغیرہ ہیں۔ ضرورت ہونے پر ان کو پیشگی رقم فراہم کرے۔ مگر ریاست کی مدد ہمیشہ کافی نہیں ہوتی تھی اور اکثر اوقات کاشتکاروں کو گاؤں کے مہاجنوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ ایسے معاملوں میں اکثر اس کو رقم کا دوگنا چکانا پڑتا تھا، ریاست کی بنیادی تشویش تھی کہ کھیتی کے تحت زیادہ سے زیادہ زمین کو لانے کے لئے کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کرے۔ ریاست ان کو برائے نام ٹیکس لگا کر لبھاتی تھی۔

اجارہ داری اور ریاست کی دخل اندازی

بازار کی طاقتیں ہی عہد وسطی میں زراعت کو عام طور پر اور وسیع شکل میں متعین کرتی تھیں۔ مگر علاء الدین کے بازار کنٹرول اقدامات ایک ایسی مثال ہے جب ریاست نے دخل اندازی کرنے کی کوشش کی اور قیمتوں کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ مہم اس کی موت کے بعد جلد ہی مسمار ہو گئی۔

پھر بھی ہمیں ریاست کی جانب سے اجارہ داری قائم کرنے کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ کان کنی پر پورے عہد وسطی میں ریاست کا قبضہ تھا یہاں تک کی قلم باندھنے کی تکنیک بھی شاہی باغات ہی تک محدود تھی۔ یہ ممانعت شاہ جہاں کے عہد حکومت میں اٹھائی گئی۔ چے (Chay) مشرقی دکن میں پیدا کئے جانے والے ایک رنگ کی پیداوار بھی مکمل راجا کے قبضے میں تھی۔ ہمیں 35-1633 کے دوران مغل حکمراں شاہ جہاں کے ذریعہ لاگو کی گئی نیل کی اجارہ داری، ایک دل چسپ مثال ملتی ہے۔ زراعتی پیداوار میں سب سے زیادہ مانگ نیل ہی کی تھی۔ بادشاہ کی کاروائی اس میں موجود فائدہ کے باعث تھی۔ شاہ جہاں نے 11 لاکھ روپے کے بھگتان پر منوہر داس ڈانڈا کو سلطنت میں نیل خریدنے کا حق بلاشرکت عطا کیا۔ سبھی تاجروں سے کہا گیا کہ وہ اس سے نیل خریدیں یہ بات کسانوں کو بھاری پڑی۔ بہت سے کاشتکاروں نے قیمت گرنے کے خوف سے اپنی فصل ضائع کر دی ان کو اپنے محنتانہ سے کافی کم قیمت ملی۔ شاہ جہاں نے پھر نیل کی پیداوار کا حق میر جملہ کو ٹھیکے پر دے کر حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ مگر سلطنت کے ذریعہ تھوپی گئی یہ اجارہ داری مشکل سے ہی ایک سال چل سکی اور بادشاہ کو اس کو واپس لینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ نمک کی اجارہ داری سے اکیلے مچھلی پٹنم میں ہی مغلوں کا سالانہ ٹیکس تقریباً 1,10,00 روپے تھا۔

16.9 خلاصہ

عہد وسطی میں زراعت کی اہم علامات تھیں: موافق زمین، لوگوں کا تناسب، چراگاہ اور مویشیوں کی تعداد۔ اگرچہ زمین کثیر مقدار میں حاصل تھی۔ بڑی تعداد میں بے زمین مزدوروں کی تعداد موجود تھی۔ مگر وہ اس وقت کی سماجی ساخت میں روایات اور زمینداروں کی طاقت کے نیچے دبے تھے۔ اس دور میں خصوصاً وسیع پیمانے پر جنگلات کی کٹائی، آبپاشی کی نئی تکنیک خاص کر فارسی رھٹ اور نہروں وغیرہ کے سبب زراعت کی بڑے پیمانے پر توسیع ہوئی۔ نئے راستہ کی تلاش نے روابط کے نئے راستے کھولے جو نئی فصلوں کی جانکاری لے کر آئے خاص کر نئی دنیا سے جو مختلف قسم کی نئی فصلوں کی پیداوار اور وسعت میں ظاہر ہوئی۔ قحطوں کے تواتر نے یقینی طور پر زراعت کو متاثر کیا۔ یہ نہ صرف بڑے پیمانے پر ہجرت کے سبب کاشتکار آبادی کی بے دخلی کی مشکل میں ظاہر ہوتا تھا بلکہ یہ کبھی کبھی پیداوار کے عمل کو بھی متاثر کرتا تھا۔ ہم نے دیکھا کے کس طرح 1630 کے گجرات قحط کے بعد کاشتکاروں نے غذائی فصلیں اگانی شروع کر دیں جو اس علاقے میں کپاس پیداوار کے زوال کی شکل میں سامنے آیا۔ پورے پیداواری عمل میں ریاست کا کردار مرکزی تھا۔ ایک طرف ریاست نے قدرتی آفات سے مقابلہ کرنے کے لئے کاشتکاروں کو ہر ممکن مدد کی تو دوسری جانب ریاست نے کچھ حد تک پیدوار پر اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش بھی کی۔

16.10 مشقیں

(1) عہد وسطی میں ہندوستانی زراعت کی اہم خصوصیات کا اجمالی تذکرہ کیجئے۔

(2) مٹی کی اقسام نے زراعتی ترقی کے پیٹرن (Pattern) کو کس طرح متاثر کیا؟

(3) عہد وسطیٰ میں ماحولیات نے فصل پیٹرن کو کس حد تک متاثر کیا؟

(4) عہد وسطیٰ میں آبپاشی کے مصنوعی ذرائع نے کس حد تک پیداواری عمل کو تیزی بخشی؟

(5) عہد وسطیٰ میں ہندوستان میں استعمال کی جانے والی پیداوار کی تکنیکوں کا تجزیہ کیجیے۔

(6) عہد وسطیٰ میں زراعت کی ترقی میں ریاست کے کردار کا تذکرہ کیجیے؟

(7) عہد وسطیٰ کی معاشیات میں چراگاہی اور جنگلاتی پیداوار کی اہمیت پر بحث کیجیے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU * HYDERABAD *
Accn No MA-027
Date 03.08.2015

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad-32
IMC LIBRARY

اکائی 17 زراعتی ڈھانچہ: زراعی تعلقات

ساخت

17.1 تعارف
17.2 کاشتکاری طبقاتی ڈھانچہ : زمیندار
17.3 کاشتکار درجہ بندی
17.4 اقتدار کا تصور
17.4.1 کاشتکار سماج میں طاقت کے وسائل
17.4.2 زمین اور وسائل
17.4.3 دولت
17.5 کاشتکاروں کے درجات
17.5.1 خود کاشت
17.5.2 پائی کاشت
17.5.3 مزارعان
17.5.4 بٹائی وار
17.5.5 زرعی مزدور
17.5.6 کمین
17.6 قرضہ جاتی تعلق اور ساہوکار
17.7 گاؤں اور گاؤں کی جماعتیں
17.8 کاشتکار مخالفت کی شکلیں
17.9 زراعتی ڈھانچہ : دکن
17.10 زراعتی ڈھانچہ : جنوبی ہند
17.11 خلاصہ
17.12 مشقیں

17.1 تعارف

دیہی سماج ایک ایسا تجمع تھا جس میں ایک طاقتور طبقہ اور کثیر التعداد طبقہ جو زمین جوتتا تھا اور اپنا پسینہ بہاتا تھا کا آمیزہ تھا۔ ہم اپنی بحث حقوق اور زائد مقدار کے ذریعہ گاؤں کے وسائل تک پہنچ کے تناظر میں اعلیٰ طبقہ کی حالت اور انکی اس طاقت کی نوعیت کی جانچ پڑتال کر کے شروع کر سکتے ہیں، جس کو وہ صرف میں لاتے تھے۔ عرفان حبیب کے مطابق مغل سلطنت میں زیادہ مرکزی نظام کے ذریعہ کاشتکاروں کی زائد پیداوار کا ایک بڑھا حصہ حاصل کیا جاتا تھا۔ مالگذاری وسائل کا زائد حصہ امراء و منصب داروں کے درمیان انتقال پذیر جاگیر کے ذریعہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ ان مالگذاری وسائل کی دوبارہ تقسیم کا مقصد سلطنت کی فوجی طاقت اور اپنے سیاسی ایجنٹوں کی وفاداری کو یقینی بنائے رکھنے کا اہم ذریعہ تھا۔ زائد پیداوار کا ایک کم تر حصہ زمینداروں کو جاتا تھا جن کی شرکت اس انتظام میں نہ صرف سیاسی وجوہات سے بلکہ کاشتکاروں سے محصول اکٹھا کرنے کی کارروائی کو آسان بنانے کے واسطے بھی لازمی تھی۔ مگر زمینداروں کو زمین کی پیداوار پر مستقل اعلیٰ حقوق ہوتے تھے جبکہ جاگیرداروں کے پاس ایسے کوئی مستقل حقوق نہیں تھے۔

17.2 کاشتکار طبقاتی ڈھانچہ : زمیندار

مغلیہ عہد کے ہندوستان میں زمیندار طبقہ سماجی طور پر ایک مختلف العناصر گروہ تھا۔ ان کی حالت، حقوق اور فرائض میں بہت اختلاف تھا۔ تجزیہ کے مقصد سے نورالحسن نے زمینداروں کو تین درجوں میں بانٹا ہے۔ خود مختار سردار، بچولئے اور ابتدائی زمیندار۔ پروفیسر نورالحسن کے مطابق درجات میں نظام مراتب تھا مگر باہمی طور پر خارج نہیں تھے ساتھ ہی ان کے بیچ زمین، اقتدار اور اختیار کے لئے ایک غیر واضح کوشش رہتی تھی۔ اس طرح بچولئے زمینداروں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے بڑے راجاؤں کا ایک مسلسل عمل تھا۔ ایک طبقہ کی شکل میں یہ زمیندار بھی ذات، نسل، قبائلی بنیادوں پر تقسیم تھے۔ مغلوں نے نسلوں اور ذات ڈھانچہ، دونوں کی نظر سے اپنے ذاتی مقصد کیلئے زمینداروں کے مختلف طبقوں کے بیچ مقابلوں کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ زمیندار طبقہ کے اختلاف پر زور دیئے جانے کی ضرورت ہے تا کہ ان کے مختلف النوع سلوک کو سمجھا جا سکے۔

اس پوشیدہ کمزوری کے باوجود ایک گروہ کی شکل میں زمیندار عہد وسطٰی کے ہندوستانی سماج اور ریاستی انتظام میں ایک طاقتور عناصر اور حصہ تھے۔ ان کے قبضہ میں وسیع علاقے اور محصول کے وسائل تھے۔ بابر نامہ کے مطابق ہندوستان کے محصول کا ایک بٹا چھ حصہ زمینداروں کے علاقے سے ہی آتا تھا۔ فوجی وسائل کی شکل میں انہیں مضبوط طاقت کی شکل میں شمار کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل (1595) کے مطابق زمینداروں کی کل فوجی تعداد 44 لاکھ تھی۔ اس کے علاوہ زمیندار طبقہ دیہی سماج میں مضبوطی سے قائم تھا۔ اور وہ اس پر ذات پات تعلقات اور رسمی تعلقات کی بنیاد پر اپنا اقتدار رکھتے تھے۔ مقامی وسائل تک پہنچنے کے لئے زمیندار ہی سب سے زیادہ اہم کڑی تھے۔ مغلوں کے سامنے یہ پریشانی تھی کہ مرکزی ریاست کے حق میں زمینداروں کے اقتدار اور اختیار کو کس طرح قبضہ میں کیا جائے۔ نیز مستقل طور پر انہیں کس طرح انتظامی امور میں شامل کیا جائے۔ مغلیہ محصول نظام اپنی بہتر فوجی طاقت کے ذریعہ زمینداروں پر رعب جمانے کے واسطے مغلیہ عہد کی صلاحیت وطاقت پر منحصر تھی ساتھ ہی مغلوں نے محصول وسائل کی تقسیم اور از سر نو تقسیم سے متعلق سوال کے ارد گرد مرکوز دونوں کے بیچ اصل مخالفت حل کرنے کی بھی کوشش کی۔ زمینداروں کو مغل انتظامیہ میں اس حد تک شامل کر لیا گیا کہ وہ اقتدار کے حصہ دار بن گئے۔ حالانکہ وہ اس نظام میں مغلوں کے برابر کے حصہ دار تھے۔ مغلوں نے زمینداروں کو اعتماد میں لانے کے لئے کوشش کی کہ ریاست کے اقتدار کو للکارنے کے بجائے اس کی حمایت کرنے ہی میں ان کا زیادہ فائدہ ہے۔ منصب داروں کا ایک چھوٹا حصہ جیسے راجپوت، بلوچ اور گھکر سردار زمیندار گروہ سے ہی متعلق تھے۔ انہیں جاگیریں ادی گئی تھیں۔ مغلوں نے کاشتکاروں سے زمینی لگان وصول کرنے کے لئے زمینداروں کو زمینی لگان انتظام میں شامل کیا۔ مقامی سطح پر بھی مغل ریاست اکثر زراعتی پالیسی پر عمل پیرائی کے لئے زمینداروں پر ہی منحصر رہی۔ خصوصاً زراعتی توسیع اور ترقی کے لئے۔ ریاستی خدمات کے بدلے انہیں جمع یا محصول کا ایک حصہ حاصل ہوتا تھا۔

مگر زمینداروں اور مغل حکومت کے بیچ اختلاف کی اہم وجہ تھی زائد پیداوار میں زمینداروں کے حصہ کا فی صد۔ عرفان حبیب کا ماننا ہے کہ زمینداروں کا حصہ نہ صرف شاہی اصولوں اور قوانین اور رائج رسم ورواجوں کے ذریعہ محدود تھا بلکہ حقیقت میں اس سے کہیں زیادہ اس سچائی کے ذریعہ کہ محصول کی مانگ کی اعلیٰ شرح کاشتکاروں کے پاس اتنا چھوڑتی ہی نہیں تھی کہ کوئی دوسرا کچھ لے پائے۔ اس طرح دونوں کے درمیان حقوق کا تصادم تھا۔

زمینداروں کے تئیں مغل پالیسی میں تضاد تھا۔ ابوالفضل (تقریباً 1595) اور 17 ویں صدی کے دیگر مغل مؤرخین موقع پرستی یا بے وفائی کے عنوان سے ''زمیندارانہ'' لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ انتظامی امور کے لحاظ سے زمینداروں کو نظم ونسق کے لئے اہم خطرہ اور زمینی لگان چکانے کے لئے ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ مغل، زمینداروں پر رعب گھانٹنے کے اہل نہیں تھے۔ یہ حقیقت اسی بات سے پوری طرح ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے زمینداروں کو دو درجوں میں بانٹا تھا۔ زور طلب اور رعیتی۔ مغل، زمینداروں کو کاشتکاروں سے الگ کرنے ہی میں کامیاب ہو پائے۔ زمینداروں نے اپنے حقوق میں اضافہ کرنے کی بڑی تمنا کبھی نہیں چھوڑی پھر بھی مغل زمینداروں پر بہت زیادہ منحصر تھے اور وہ خود ہی دیہی سماج میں ان کی حالت مضبوط کرنے کے لئے جوابدہ تھے۔

ہم مغلیہ دور سے حاصل شواہد سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ریاستی انتظامیہ اور زمینداروں کے بیچ مقابلہ جو اکثر مسلح مقابلوں کی شکل رونما ہو جاتا تھا۔ اس وقت کی سیاسی حالت کی ایک اہم علامت تھی۔ منوچی 1700 کے قریب تحریر کرتا ہے کہ مغل گورنر مسلسل زمینداروں کے ساتھ مقابلہ کی حالت میں رہتے ہیں اور اکثر

مغلیہ اقتدار میں زمینداروں کی کوئی نہ کوئی بغاوت چلتی ہی رہتی ہے۔ یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ مغل خاتمہ تک اس بنیادی تضاد کو حل نہیں کر سکے جو زائد وصولیابی کے اردگرد گھومتا رہتا تھا۔

زمینداری حقوق کا مطلب نہ صرف گاؤں کے سماج میں مضبوط حالت اور عمدہ سماجی حالت تھی۔ بلکہ اس سے ان کو کچھ مالی فائدے بھی حاصل ہوتے تھے۔ جس نے زمینداری حقوق کو بہت قیمتی بنا دیا اس کا اہم مالی حق رعیت سے مالکانہ مانگ تھی۔ اس کے علاوہ زمیندار گاؤں کے سماج میں اکثر موقعوں پر کئی دوسرے رواجی اختیارات کا بھی دعویٰ کرتا تھا جیسے شادی۔ ولادت تیوہار وغیرہ کے موقعوں پر ابواب کا مطالبہ۔ اس کو کسانوں، کاشتکاروں اور مزدوروں سے مروجہ رسموں کی بنیاد پر بیگار مانگنے کا بھی حق تھا۔ زمینداروں کو اپنی نجی زمین پر رعایتی قیمت پر زمین کا لگان ادا کرنے کا بھی حق تھا۔ پرگنہ میٹرتا میں زمینداروں کے پاس کل مزروعہ زمین کا 9% فی صد تھا اور وہ لگان کے طور پر صرف 19 روپے دیتے تھے۔ جبکہ کل عام ٹیکس 200 روپے تھا۔ زمینداروں کو اپنی زمین مالیت پر گاؤں کے خرچ اور کئی دوسرے ٹیکسوں کو ادا کرنے سے بھی رعایت ملتی تھی اپنی زمین کے ایک بڑے حصہ پر وہ نقدی فصلوں کی کھیتی کرتا تھا کیونکہ وہ اس حالت میں ہوتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کر سکے۔ اس بات کے بھی ثبوت ملتے ہیں کہ وہ اپنی رقیق پونجی سودخوری میں بھی لگاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ زمینداری حق خاص طور سے نفع بخش مانا جاتا تھا۔ اس کی تصدیق اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ رعیتی گاؤں میں نئے زمینداری حقوق کو قائم کرنے کا اعلیٰ طبقہ کے بہت سے افراد کا رجحان ہمیشہ رہتا تھا۔ جبراً فروخت کے ذریعہ سے بھی زمینداری حقوق کے لاگو کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔

زمیندار کی اعلیٰ سماجی حالت ان مروجہ رسم و رواج کے تنوع سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو وہ دیہی طبقے کی سماجی زندگی میں ادا کرتا تھا۔ یہ اس کا خاص رسمی حق تھا کہ گاؤں میں کسی شادی کے جلوس کی آمد پر اور رخصت کے وقت ڈھول بجوائے۔ دولہا سے امید کی جاتی تھی کہ وہ زمیندار سے ملنے جائے اور اس کو تحفہ پیش کرے۔ رعیت کی طرف سے یہ ضروری تھا کہ وہ شادی کے موقع پر زمیندار کو دعوت نامہ بھیجے۔

زمیندار اور رعیت کے ایک طبقہ کے بیچ باہم دیگر انحصار کا تعلق ہوا کرتا تھا۔ اس تعلق کے معاشی پہلو کی خاص اہمیت تھی۔ زمیندار جس کے پاس بڑے زمینی قطعہ ہوتے تھے، اس کی بوائی، جتائی اور کٹائی کے لئے وہ کاشتکاروں پر ہی منحصر ہوتا تھا۔

عرفان حبیب کے مطابق طاقتور شاہی اقتدار کے لئے مقابلہ نے زمینداروں کو اپنے کسانوں کے لئے ایک دوستی سے بھرپور رویہ اپنانے پر مجبور کیا جوان کے دوست بن سکتے تھے۔ یہ بہت زیادہ ممکن ہے کہ کسان طبقہ اور زمیندار طبقہ میں زائد کے اس حصہ کو لیکر مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہو جس پر زمیندار اپنا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ بات بہر حال غور طلب ہے کہ یہ تضاد مغلیہ عہد حکومت میں پوری طرح نہ ابھرا۔ بلکہ حاکمانہ زاویہ نظر سے جیسا کہ عالم گیر نامہ سے واضح ہوتا ہے یہ تھا کہ زمیندار طبقہ کے عام طور پر کسانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ ذات اور روایتی تعلقات شاید ان دونوں کے بیچ دوستانہ بنائے رکھنے اور اسے مضبوطی بخشنے کے اہم سبب تھے۔ جاٹ اور مراٹھا باغیوں میں ذات کا کردار واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس تعلق کا بہر حال کوئی ایک پیٹرن نہیں دکھائی پڑتا۔ ان دونوں کے بیچ تعلق مختلف اسباب پر منحصر تھے جیسے ذات پات کا ڈھانچہ مروجہ رسمیں، معاشیات کی حالت، کاشتکار فرقہ کی طاقت اور انتظامی کنٹرول کی نوعیت۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمل کیا تھے جن سے زمیندار اور کسان ایک ساتھ آئے؟ لگان کے مطالبہ کے بڑھتے دباؤ نے نہ صرف کسان مخالفت کو بھڑکایا بلکہ کافی تعداد میں زمینداروں کو بھی مجبور کیا کہ بغاوت کا رویہ اختیار کریں۔ کیونکہ ان کو نہ صرف لگان وصول کرنے کا حق تھا بلکہ اس زمین پر بھی ان کے مستقل حقوق تھے جو کسان طبقہ کے حقوق سے میل کھاتے تھے۔ دوسرے زمینداروں کو اپنے کچھ کسانوں کی روایتی آقا پرستی بھی حاصل تھی۔ زمینداروں کے بہت سے اسلحہ بردار فوجی کسان ہی ہوتے تھے۔ زمینداروں کی خدمت کسی نہ کسی نسلی بندش کی وجہ سے کرتے تھے جس کے بدلے انھیں مالی فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ ان کسانوں کو زمیندار اپنی نجی خاندانی (موروثی) دشمنی اور بہت بڑی تمناؤں کے حصول منفعت کے واسطے کھینچ لیتے تھے۔ عرفان حبیب کے مطابق زمیندار اور کسان دو حالتوں میں بغاوت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے، اول بڑھتے لگان کے دباؤ کی وجہ سے جو دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتا تھا اور دوسرے زمینداروں کے مقابلہ کی حالت میں جس میں کسان خصوصی طور پر روایتی وفاداری کی وجہ سے شامل ہوتے تھے۔ جاٹ اور مراٹھا زمینداروں کا ذات کی بنیاد پر

کاشتکاروں کے درمیان ایک یقیناً سماجی بنیاد تھی۔کم از کم دوعلاقوں آگرہ۔مشرقی راجستھان اور مغل دکن میں وسیع بغاوتیں،ایک طرف زمینداری کے اقتدار کے دوبارہ زندہ ہونے کے پس منظر میں ہوئیں تو دوسری طرف کاشتکاروں کے بڑھتے استحصال کے سبب۔

جے۔ایف۔رچرڈس نے عرفان حبیب کی تشریح کہ زمینداروں نے دیہی سماج پرلگان کا مطالبہ کے بڑھتے دباؤ کے نتیجے میں بغاوت کی،پر سوالیہ نشان لگایا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ بڑھتی پیداوار اور نظام زر نے زمینداروں کوزیادہ مفید حالت میں لا دیا تھا۔مقامی زمینداروں نے آہستہ آہستہ شاہی فوج کے مقابلے اہم صلاحیت حاصل کرلی تھی۔مغلوں کے پاس حملہ آورزمینداروں کو ہتھیاروں سے محروم کرنے کی خواہش اور وسائل کا فقدان تھا۔بلکہ دیہی سماج پر مغل زراعتی نظام کا طویل المدتی انجام یہ ہوا کہ اس نے زمینداروں کی خوداعتمادی اور وسائل میں اضافہ کیا جس سے وہ دوسرے مسلح گروہوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے حوصلہ مند ہوئے۔

مگر بغیر کسی اختلاف کے یہ کہا جاتا ہے کہ مغل سماجی توازن بنا کر نہیں رکھ سکے جو اس وقت کی مغل استحکام کی بنیاد تھی۔زمینداروں اور ریاست کے بیچ نیز زمینداروں کے متعدد گروہوں کے بیچ مفادات کے ٹکراؤ کا مسئلہ حل نہیں کیا جاسکا۔نورالحسن کے مطابق ان مقابلوں نے مسلسل ٹکراؤ اور نظم ونسق تباہ کرنے کی حالت بنائی اور مائل کیا۔ساتھ ہی ریاست کی انتظامیہ اور فوجی طاقت کو بے حد کمزور کیا۔1707 میں اورنگزیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت اتنی کمزور ہوگئی کہ وہ سماجی توازن قائم رکھنے کی حالت میں نہیں رہی۔مغل سلطنت کا سورج غروب ہور ہا تھا اور یہ زمیندار ہی تھے جو خود کو کوشاں رکھتے تھے۔

17.3 کاشتکار درجہ بندی

دیہی آبادی میں عوام کے مختلف طبقے اور درجات شامل تھیں ان میں سے ہر ایک کے جدا جدا کام اور درجے تھے۔دیہی سماج کے اعلیٰ طبقے میں آتے تھے: زمیندار، مقدم، چودھری، قانون گو(دیہی اشراف)۔ان کی عظمت جزوی طور پر زمین میں موروثی اعلیٰ حقوق اور جزوی سرکاری محصول انتظامیہ میں، ان کی حالت کی وجہ سے تھی۔جاگیرداری رسم نے دیہاتی سماجی ڈھانچہ میں تبدیلی نہیں کی۔

بہرحال گاؤں کی آبادی کے سب سے زیادہ اہم طبقہ میں کاشتکار آتے تھے جن کو مجموعی شکل میں رعیت کی صورت میں جانا تھا۔رعیت اور آسامی الفاظ کا استعمال اکثر عمومی مطلب میں کاشتکاروں کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔دیگر الفاظ جیسے خودکاشت، پاہی، مزارع، ہالی وغیرہ کاشتکار طبقہ کے اندر مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے اور اس طرح ان کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا تھا۔وہ کمین(دستکاروں اور مزدوروں) نیز دیگر پیشہ ور طبقوں سے جدا تھے جو زراعتی امور میں شامل ہو سکتے تھے۔عددی طور پر دیہی معاشیات وسماج میں اپنا کردار، دونوں کے سبب کاشتکار، گاؤں میں سب سے زیادہ اونچا طبقہ تھا۔

جدول نمبر 1

مشرقی راجستھان میں دستکار اور مزدور آبادی کی تقسیم

گاؤں	کاشتکار	دستکار مزدور
بدھیرا	93	33
رنگ پورا	56	09
ارنئے	32	12
چدیل پور	55	07
وور کھیڑی	20	06

بہت سارے گاؤں میں آبادی اکثر ایک ہی ذات کی ہوتی تھی اور اکثر ایک ہی نسلی گروپ کی۔ یہاں تک کہ 18 ویں صدی میں کوئی بھی گاؤں آسانی سے جاٹ ۔اھیر۔ گوجر۔ مینایا راج پوت گاؤں کی شکل میں پہنچانا جاسکتا تھا۔ دیگر گاؤں میں کاشتکار ذاتوں کا ایک عمدہ باہم مرکب تھا۔ حالانکہ ایک نہ ایک ذات پھر بھی گاؤں میں خاص مضبوط حالت میں ہوتی تھی۔ جیسا کہ مشرقی راجستھان سے متعلق مندرجہ ذیل جدول سے تصدیق ہوتی ہے۔

جدول2

گاؤں	کاشتکار گھرانوں کی تعداد	ذی اثر ذاتوں کے خاندانوں کی تعداد		دیگر ذات کے خاندان
چندیل پور	45	جاٹ	33	12
ارنئے	32	مینا	26	06
رنگ پورہ	56	جاٹ	51	05
کوٹھی	51	مینا	25	26
موچپور	17	جاٹ	11	اھیر 06

کاشتکار صاحب ملکیت کو خود کاشت کہا جاتا تھا اور وہ کسان جن کے پاس اپنی زمین نہیں تھی، مزارعوں کے نام سے جانے جاتے تھے۔ خود کاشت کسانوں میں کثیر التعداد تھے۔ خود کاشت سے کچھ کم تعداد میں تھے پاہی۔ جو لازمی طور پر مہاجر کسان تھے۔ وہ یا تو قریبی گاؤں کے باشندے ہوتے تھے یا پھر وہ کسان تھے جنھوں نے اپنے اصل گاؤں کو چھوڑ دیا تھا۔

خود کاشت، پاہی اور مزارعین کے علاوہ کسانوں کے ایک طبقہ میں بٹائی دار اور ہالی یا مزدور آتے تھے۔ جن کی ایک حد تک منطبق ہونے کی حالتیں تھیں اور ان کے حقوق گھٹتے بڑھتے تھے۔ مزارعین اور ھالوں کے بیچ کی تقسیم کی لکیر ہلوں اور بیلوں پر غلبہ تھا۔ ایسے کسانوں کی بھی مثالیں ملتی ہیں جو زراعتی اثاثوں کی بربادی کی سبب مجرور یا ہالی کے درجے پہنچ گئے تھے۔ گاؤں کی آبادی کی درجہ بندی کی بنیاد مندرجہ ذیل تھی۔ (۱) ذات اور پیشہ (2) رہائشی مقام (3) زمین پر حقوق کی نوعیت۔ گاؤں کے سماجی درجہ بندی کے لحاظ سے ہر شخص کی حالت اور خصوصاً انہیں اسباب سے متاثر ہوتی تھی۔ گاؤں کے سماج میں ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں تبدیلی کے امکان پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ خود کاشت زمین سے محروم، کاشت کار یا پاہی کی حیثیت تک گر سکتے تھے وہیں پاہی درجہ بندی کے لحاظ سے اوپر جاسکتے تھے اور کاشتکار صاحب ملکیت بن سکتے تھے۔ زرعی مزدوروں نے اپنی حالت ہل اور بیل حاصل کر کے درست کی۔

انفرادی کاشت کاروں میں وسائل کی حالت میں بھاری فرق تھا۔ یہ بات ان کسانوں کے حوالہ سے ظاہر ہوتی ہے جو مستقل طور پر زرعی مزدوروں کو اجرت پر رکھ کر بڑی زمینوں پر کھیتی کرتے تھے۔ ان کے پاس زائد ہل اور بیل بھی ہوتے تھے جو ضرورت مند کاشتکاروں کو کرایہ پر دیتے تھے وہیں چھوٹے کسانوں کے پاس، حالانکہ وہ اپنی زمین کے مالک ہوسکتے تھے اکثر کافی وسائل نہیں ہوتے تھے اور وہ کھیتی اور زیر استعمال قرضوں کی سپلائی کے واسطے دولت مند طبقہ کی طرف دیکھتے تھے۔

زمین اور کھیتی کے آلات کی تقسیم میں بڑے گروپ کی درجہ بندی اور مختلف النوع کو ظاہر کرنے کے لئے ہم مشرقی راجستھان سے کچھ دستاویزوں کا حوالہ لے سکتے ہیں۔

B. NO. 219

... CENTRE ... HYDERABAD ... LIBRARY

جدول 3
مشرقی راجستھان میں زمین (جتائی) کے سائز کی تقسیم کا پیٹرن

موضع سلونو

کاشتکاروں کی کل تعداد	کاشتکاروں کی تعداد	زمین (جتائی) کا سائز (ناپ)
20	2	8 بیگھہ
(8 کاشتکار صرف خریف کی فصل اگاتے تھے		
12 دو فصلیں اگاتے تھے	6	20 سے 30 بیگھہ
14 نقدی فصلیں اگاتے تھے	8	50 سے 80 بیگھہ
6 صرف غذائی فصلیں اگاتے تھے)	4	100 سے 200 بیگھہ

موضع ساگود

کاشتکاروں کی کل تعداد	کاشتکاروں کی تعداد	زمین (جتائی) کا سائز
19	3	10 بیگھہ سے کم
	4	10 سے 20 بیگھہ
	13	50 سے 80 بیگھہ
	14	100 بیگھہ

موضع باورڈ

کاشتکاروں کی کل تعداد	کاشتکاروں کی تعداد	زمین (جتائی) کا سائز
22	7	10 بیگھہ سے کم
	11	20 سے 50 بیگھہ
	6	100 بیگھہ سے زیادہ

موضع خیرآباد

کاشتکاروں کی کل تعداد	کاشتکاروں کی تعداد	زمین (جتائی) جا سائز
33	14	10 بیگھہ سے کم
	15	30 سے 80 بیگھہ
	5	100 بیگھہ سے زیادہ

موضع واقود

کاشتکاروں کی کل تعداد	کاشتکاروں کی تعداد	زمین (جتائی) کا سائز
42	29 زمین کے مالک	13 زمین سے محروم

ہلوں کی تقسیم پیٹرن

مشرقی راجستھان کے موضع جھولہ پا میں 83 کاشتکاروں کو 244 ہل تقسیم کئے کئے گئے یعنی اوسطاً تین ہل ہر کسان کو۔ حالانکہ یہ تصویر بدل جاتی ہے گر اہم انفرادی مثالوں کو الگ الگ کر کے دیکھیں۔

13	1 سے کم ہل	5	5 سے زیادہ ہل
14	1 سے 2 ہل	2	33 ہل فی آدمی کو
50	3 سے 5 ہل		

گاؤں کے کھیتوں کے کچھ ہی سے افراد کے ہاتھ میں زیادہ تر ہلوں کا ارتکاز مشرقی راجستھان کے گاؤں دھولیا سے متعلق ایک دستاویز سے بھی جانچا جاسکتا ہے۔ یہاں 203 ہلوں میں سے 102 ہل صرف دوراجپوت کاشتکاروں کے پاس تھے۔

مشرقی راجستھان کے گاؤں پسراؤں میں کل 74 ہل تھے جن میں سے 18 گاؤں کے کھیا کے پاس تھے۔ 25 راجپوتوں کے پاس اور 9 ایک مہاجن کے پاس تھے۔ اسی طرح موضع رتواڑہ میں 39 دستیاب ہلوں میں سے 19 ہل صرف دوراجپوتوں کے پاس تھے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کے آخر کس حد تک کسانوں کی ذات کا درجہ، معاشی درجہ سے متعلق تھا۔ مالی تفریق کی نوعیت متعین کرنے کا ایک معیار ہلوں اور بیلوں پر غلبہ ہی ہے۔ اس بحث کی اہمیت یہ مقرر کرنے کی کوشش میں پوشیدہ ہے کہ اعلی طبقہ کو دی گئی رعایت خاص طور پر پیدا کرنے والے وسائل کے ملکیت کے اختلافات میں منصوبہ بند طریقے سے ظاہر ہوتی ہے یا نہیں۔ ذاتوں کی بنیاد پران اثاثوں کی ملکیت میں تفریق تو ظاہر ہے مگر اہم نہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذات حیثیت کو مالی حالت کے لئے خود کار نیابت سبب کی شکل میں نہیں لیا جاسکتا مگر زیادہ تر خوشحالی کاشتکار اعلیٰ ذاتوں ہی سے متعلق ہیں۔

17.4 اقتدار کا تصور

ہم ان اسباب پر بھی ایک نظر ڈال سکتے ہیں جنہوں نے کاشتکار طبقہ کے اندر سماجی اقتصادی اختلاف پیدا کر دئے۔ ساتھ ہی کچھ کے لئے وہ طاقت کا سبب تھے تو دوسرے کے لئے کمزوری کا۔

17.4.1 کاشتکار سماج میں طاقت کے وسائل

ذات اور اقتدار کے درمیان تعلقات ذرا پیچیدہ ہیں۔ یہ پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم کو مذہبی رسوم کی درجہ بندی کے ساتھ ساتھ اس اقتدار کو بھی ذہن میں رکھنا پڑتا ہے جو ان کو مالی اور سیاسی لحاظ سے اس درجہ بندی کے مطابق ان کی موافق حالتوں کے سبب حاصل ہوئی یا پھر ان کے ذریعہ اپنائی گئی۔ کاشتکاروں کی تقسیم خود کاشت، مزارعین، پاہی، ہالی اور مزدور وغیرہ درجوں میں تھی۔ سوال یہ ہے کہ ان درجات کی ہر ذات، ڈھانچہ خاص طور پر ان کے عہدہ اور عزت واحترام سے متعلق تھی یا نہیں۔ ذات ایک طرف ذات کا شتکار طبقہ اور دوسری طرف مزدور طبقہ (زرعی مزدور) میں کے تقسیم کی بنیاد بھی تھی۔ مگر حالات کو محض طاقتور اعلیٰ ذات بنام کمزور نیچی ذات کے نظریہ سے نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ ذات پات کے پیدا کردہ نظام کے ذریعہ پیدا کی گئی ناہمواری کوئی نقصان پہنچائے بغیر ہم یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ یہ سچ نہیں ہے کہ ذات ایک طرف کچھ لوگوں کو پوری طاقت عطا کرتی ہے وہیں دوسری طرف اور دوسرے لوگوں کے لئے بالکل ہی کمزوری کی حالت پیدا کر دیتی ہے۔

ذات مادی ترقی کے واسطے ایک اہلیت ضرور تھی۔ کیونکہ مختلف برادریوں کی مالی حالتوں میں تعجب خیز فرق تھا۔ اعلی ذاتوں کا لگان کا تعین بھی رعایتی دروں پر کیا جاتا تھا۔ ذات پات کے بندھنوں نے کاشتکاروں کو اجتماعی کاروائی کے لئے آمادہ کیا۔

17.4.2 زمین اور وسائل

زمین اور وسائل پر غیر مساوی پہنچ کے سبب دیہی سماج میں بہت ساری ناہمواریاں اور انحصار پیدا ہوا۔ زمین جوتنے کے واسطے ضروری وسائل پر تصرف اقتدار کا ایک بہت اہم وسیلہ تھا۔ اس نے اس وقت کے گاؤں کے سماج میں اور ریاست کی نظر میں قابضوں (Possesors) کی حالت میں اضافہ کیا۔ ہمارے دستاویز جب کبھی بھی وہ کسی گاؤں خاص کے آسامیوں یا پھر ان کی جو زمین کو قابل کاشت بنانے کی غرض سے کہیں منتقل ہو گئے ہیں کی فہرست تیار کرتے ہیں۔ تو ان کے پاس دستیاب ہل اور بیلوں کی تعداد کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہم کو ان غریب کاشتکاروں کا علم ہے جو کہ ان پر منحصر تھے نیز جن کے پاس زائد آلات تھے۔ وسائل کی ملکیت کی اتنی اہمیت تھی کہ وہ زمین کی تقسیم اور اعلیٰ درجہ بندی کے مطابق تعین میں اہم کردار انجام دیتے تھے۔

وسائل کا فقدان زراعت سے متعلق بہت سارے انحصاروں کی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ کھیت مزدور کاشت کے انحصار کے سب سے انتہائی صورت حال کی نمائندگی کرتے تھے۔ وسیع قرضوں کے بوجھ نے بھی فصل سے متعلق فیصلوں میں کاشتکاروں کی خود مختاری کو کم کیا۔ کاشتکار مالکوں یا ''خود کاشت'' کے ذریعہ محنت طریقہ کار میں براہ راست دخل اندازی، قرض دوبارہ ادا کرنے کی شرطوں میں فریب کے ذریعہ اپنایا جاسکتا تھا۔ ایسی ہی ایک مثال میں ہم پاتے ہیں کہ ساہوکار غلہ کے واسطے دیئے گئے قرض کی وصولی فصل کے بعد کپاس کی شکل میں ادا کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔

17.4.3 دولت

وہ لوگ جن کے پاس دولت ہوتی تھی کافی طاقت حاصل کر لیتے تھے۔ یہ بات گاؤں کے سماج میں ساہوکاروں Money Lenders کی حالت اور معیار سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو ان کو دولت کے نتیجہ میں حاصل شدہ ہے۔ گاؤں کے سماج کے تقریباً سبھی طبقے کسی نہ کسی طریقہ سے ساہوکار پر منحصر تھے۔ اپنے پیسہ کی طاقت پر ہی انہیں زمین، خاندان کے مطابق عہدہ اور اجارہ (ٹھیکے پر) میں ادائیگی کے قطعات زمین حاصل کئے۔ دراصل وہ گاؤں کے رواجوں کے مطابق قیادت کے مضبوط نمائندوں کی شکل میں ابھر رہے تھے۔ گاؤں کے سماج کا غریب طبقہ خاص طور پر ساہوکاروں کے ذریعہ دیئے جانے والے قرض پر منحصر تھا۔ مقروضیت نے غریبوں کے استحصال میں اضافہ کیا۔ اس کے باوجود ہمیں کاشتکاروں کے ذریعہ زمینداروں وغیرہ کے خلاف ساہوکاروں کی حمایت کئے جانے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ عہدوں کی بڑے پیمانے پر خرید میں ہی اقتدار کے کھیل میں دولت کی اہمیت خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ دولت زراعتی وسائل تک پہنچنے کا متبادل ذریعہ بن گئی تھی۔

17.5 کاشتکاروں کے درجات

گاؤں میں زمین کے پٹہ کی نوعیت کی بنیاد پر کاشتکار بہت سارے درجوں میں تقسیم تھے۔

17.5.1 خود کاشت

''خود کاشت'' لفظ کا مطلب تھا، زمین پر موروثی ملکیت اور اس کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کے حقوق۔ اس حق کی لازمی علامت تھی خاندانی ملکیت والی زمین کو جتائی کے واسطے نجی ہلوں کا رکھنا اور استعمال کرنا۔ ''خود کاشت'' کو 15-10 برس گزرنے کے بعد بھی اپنی زمین کا پٹہ واپس لینے کا حق حاصل تھا۔ بشرطیکہ وہ بقایا لگان ادا کرے۔ اعلیٰ ذات اور مالدار ''خود کاشت'' اپنے کھیتوں کو جوتنے کے واسطے کل وقتی یا جز وقتی مزدوروں پر بھروسہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی خواتین کھیتوں میں کام نہیں کرتی تھیں۔ اور برہمن وراجپوت زمینوں میں خود ہل نہیں چلایا کرتے تھے ان کے معاملہ میں زمین کے پٹے کی بنیاد پر توجہ دیئے بغیر کرائے کے مزدوروں کا استعمال ناگزیر تھا۔ کسی ''خود کاشت'' کے پاس اس کے ہلوں کی تعداد اس کی حیثیت کا پیمانہ تھی۔ ''رعیت'' کا ایک طبقہ جن کے پاس ہل نہیں تھے ان خود کاشتوں پر بے حد منحصر رہتا تھا جن کے پاس زائد ہل ہوتے تھے۔

خود کاشت اور اعلیٰ ذاتوں کے کاشتکاروں میں دولت مند طبقہ کو ٹیکسوں میں رعایت حاصل ہوتی تھی۔ ان کا گاؤں کے سماج میں قائدانہ مقام ہوتا تھا۔ خود

کاشت کاشتکاروں کے گاؤں کے عام اخراجات کی ادائیگی میں بھی مکمل طور پر یا جزوی شکل میں رعایت حاصل ہوتی تھی مختصراً خود کاشت بہ نسبت خوشحال کسان، سب سے عمدہ زمین کے مالک، نیز ان کے ہلوں اور بیلوں کے مالک تھے۔ اور اس کے علاوہ وہ مناسب ٹیکس (لگان) کے تعین کا بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ مغلیہ حکومت کے ذریعہ اس طرف بھی توجہ مرکوز کی گئی کہ کبھی کبھی خود کاشت طبقہ عیاری سے اپنا وزن عام کسانوں کے سر پر ڈالدیتا تھا۔ وہ ''رعیتی کاشت'' کو خود کاشت میں تبدیل کر کے چھوٹے کسانوں کو کچلنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ انتظامی طور پر رعیت کاشت زمین کو خود کاشت میں تبدیل کرنا خلاف قانون تھا۔ مگر حکومت کی جانب سے ممانعت کے باوجود اس رجحان کو آہستہ آہستہ حمایت حاصل ہوگئی۔ مالدار طبقہ جن کے قبضہ میں وسائل تھے غریب کسانوں کے وسائل سے متعلق زمین کے پٹے خریدنے اور رہن رکھنے لگے۔ جس سے بٹائی داری اور پٹے داری کی ترقی ہوئی۔

زراعت کی توسیع اور ترقی کے واسطے سرمایہ لگانے کی ان کی صلاحیت کے سبب ہی خود کاشتوں سے امید کی جاتی تھی کہ وہ ریاست کی زراعتی پالیسی کو نافذ کرلیں گے۔ انتظامیہ کے ذریعہ یہ غور کیا گیا کہ خود کاشت کا ایک طبقہ زراعت کو بحران کے سالوں میں بھی جاری رکھ سکتا تھا جب کہ چھوٹے کاشت کاران حالات میں کھیتی چھوڑ بیٹھتے تھے۔ اس کیفیت کا احساس ہی تھا کہ جس نے خوشحال خود کاشتوں کو اپنی حالت سرکار اور دیہی سماج کے کمزور طبقوں کے مقابلے میں مستحکم کرنے کے قابل کیا۔

17.5.2 پائی کاشت

''پائی کاشت یا پاہی کاشت'' وہ کاشت کار تھے جو اپنے رہائشی گاؤں کو چھوڑ کر دوسرے مواضع سے آئے تھے۔ ان کی سماجی حیثیت اور ان کے زمینی حقوق کی نوعیت ان کی ذات، ہجرت کی مدت، ان کا زراعتی سرمایہ، زمین کی فراہمی اور مخصوص علاقے کی رسموں اور روایت کے مطابق جدا جدا ہوتی تھی۔ ذات اور عزت واحترام میں ان کا مقام نیچا ہوتا تھا۔ موقع محل کے لحاظ سے ممتاز ذاتوں والے بھی پاہی بن جاتے تھے۔ اگر چہ وہ عام طور پر غریب ہوتے تھے ان کی مالی حیثیت کے ضمن میں سرسری طور پر کسی نتیجے پر پہنچنا ناممکن ہے۔ وہ جنکے پاس ہل اور بیل تھے خوش حال کہلاتے تھے اور ان کو حکومت کے ذریعہ عطا کردہ رعایتوں کی زیادہ امید اور یقین ہوتا تھا۔ رعایتی قیمتوں پر زمین لگان ادا کرنے کی تجویز کے ذریعہ گھروں کی تعمیر میں مدد دے کر، قابل کاشت بنجر زمین کی تقسیم کے ذریعہ پاہیوں کے وسائل اور محنت کی صلاحیت کا ریاست کے حق میں استعمال کیا جاتا تھا۔

پاہیوں کے دو درجے تھے: اول کو غیر مقیم کاشتکار کہا جاتا تھا وہ اکثر قریب کے گاؤں سے آتے تھے نیز اس موضع کے باشندہ بنے بغیر ہی زمین پر کاشت کرتے تھے۔ پٹے داروں کی طرح زمین جوتتے تھے اور اس کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کا ان کو حق حاصل نہیں تھا۔ پاہیوں کو نو آباد گاؤں اور کم آبادی والے گاؤں کو ترقی دینے کے واسطے ابھارا جاتا تھا۔ اور ان سے رعایتی قیمتوں پر لگان حاصل کیا جاتا تھا۔ یہ عمل کبھی کبھی ان پاہیوں کو مقیم کاشتکاروں کے مقابلے زیادہ کامیاب بنا دیتا تھا۔ مگر چونکہ وہ دوسرے گاؤں کے باشندہ ہوتے تھے ان کو سماج میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا تھا۔

پاہیوں کا دوسرا درجہ لازمی طور پر مہاجر کسانوں کا تھا۔ جو دور موضعوں اور پرگنوں سے آتے تھے۔ ایسے کسانوں کی حرکت پذیری اس حقیقت سے تصدیق شدہ ہے کہ وہ دوسرے علاقوں سے آتے تھے۔ 1665 میں دکن سے ہجرت کر کے 400 پاہی آئے اور راجستھان کے پرگنہ ملارن کے 36 گاؤں میں آکر بس گئے۔ یہ پاہی اپنے ہمراہ 416 ہل لائے تھے۔ ان مہاجر پاہیوں کے سامنے دو بنیادوں پر دلکش شرطیں پیش کی گئیں۔ (1) ان کو اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑنا پڑا تھا۔ (2) ان کے زراعتی سرمایہ کی وجہ۔ چھپر بندی کی رسم کے ذریعہ ان کو گاؤں میں جھونپڑی بنانے اور باشندہ کا درجہ حاصل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے نتیجہ میں آگے چل کے وہ بذات خود اپنے آپ کو ''خود کاشت'' میں بدلنے کے قابل ہوگئے۔

پاہیوں کی ہجرت کے اسباب کو کبھی کبھی دستاویزوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ قحط، جنگ، مقامی افسران کے ذریعہ استحصال، حد سے زیادہ ٹیکس کا بوجھ، بقایا لگان کا مطالبہ، قرضوں کا بوجھ، قرضوں کا نہ ملنا، بہتر اصول و شرطوں کی جستجو، وغیرہ سبھی نقل مکانی کے اسباب تھے۔ مشرقی راجستھان سے دریافت ایک 17 ویں صدی کے دستاویز کے مطابق۔ ''ٹپا پھاگی کے پٹیل اور رعیت'' قحط کی وجہ سے اورنگ آباد منتقل ہوگئے۔ پرگنہ ملارن کے 78 گاؤں کی مردم شماری کے مطابق تقریباً

10 فیصد مہاجر تھے جن میں 7 فی صد قریب کے پرگنوں سے آئے تھے۔ تقریباً 3 فیصد دکن اور مالوہ سے آئے تھے۔ تقریباً 4 فیصد کسانوں نے مذکورہ پرگنہ سے ہجرت بھی کی تھی۔ بہتر حالات کی جستجو کے لئے نقل مکانی کرنے اور اس سے ریاستوں کی ٹیکس صلاحیت پر اثر کو تسلیم کرنا ریاست کی زراعت اسکیم کا ایک اہم حصہ تھا۔ کسانوں میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو دوسری جگہ بہتر شرائط کے موجود ہونے کی وجہ سے ہجرت کرنے کو تیار رہتا تھا۔

ہمارے دستاویزوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پاہی، خود کاشت کے بمقابل تعداد میں کم تھے۔ پرگنہ پناین سے متعلق ایک یداشتی دستاویز کی مطابق 20 گاؤں میں کسانوں کی تعداد 319 تھی۔ جن میں سے 76 پاہی تھے۔ 5 گاؤں میں ان کی تعداد صفر کے برابر تھی اور 15 گاؤں میں ان کی تعداد 1 سے لے کر 22 تک تھی۔ وہ اس پرگنے میں کاشتکاروں کی کل تعداد کا 19 فیصد تھے۔

17.5.3 مزارعان

کسانوں کے ایک درجہ کی شکل میں مزارعین کو خود کاشت کے برعکس کم خصوصی اختیار حاصل تھے اور موقع محل کے لحاظ سے وہ بیل، ہل، اور بیج وغیرہ کے لئے گاؤں کے ساہوکار، زمیندار اور کھیا پر منحصر تھے۔ یہ مزارعین مختلف درجوں سے متعلق تھے۔ ریاستی پٹے دار اور اعلیٰ طبقے کے پٹے دار۔

ریاستی پٹے دار وہ تھے جو ریاستی محصول حکام کے ذریعہ جاری کئے گئے ایک پٹے میں مذکور مخصوص معیاد شرطوں کے تحت گاؤں میں زائد زمین یا کسی خود کاشت کے ذریعہ متروک (چھوڑی گئی) زمین پر زراعت کرتے تھے۔ ریاست کے حکام ''مدد معاش'' اور ''انعام'' منصرم (Holders) کی طرف سے پٹے داروں کو اپنی طرف کھینچنے کی مقابلہ آرائی لگی رہتی تھی۔

ریاستی پٹے داروں کی سماجی حالت، حقوق اور مالی حالت کچھ یقینی حالات پر منحصر تھی، جیسے قابل کاشت بنجر زمین کی دستیابی اور ان کی ملکیت میں زراعت سے متعلق آلات کی نوعیت۔ ایسے پٹے دار جن کے پاس اپنے خود کے سامان (اوزار) ہوتے تھے ریاست ان کو اولیت دیتی تھی۔ وہ افسران سے مناسب شرطوں پر پٹے یقینی بنانے کے لئے خرید و فروخت کر سکتے تھے پٹے داری کی شرطیں جدا جدا ہوتی تھیں۔ ان میں سے کچھ صرف ایک فصل یا ایک سال کی میعاد پر کسی خاص زمین کے پٹے پر کھیتی کرتے ہوئے قلیل مدت کے واسطے ٹھیکداروں کی شکل میں کام کرتے تھے۔ لیکن یہ ٹھیکہ ان کو دوبارہ حاصل ہو سکتا تھا۔ کچھ دستاویزوں کے مطابق ریاست کا پٹے داروں پر زمین لگان کا مطالبہ بنجر زمین کی جتائی پر پیداوار کا 40 فی صد ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ریاستی پٹے داروں کا ایک طبقہ جس کو بنیادی طور پر قابل کاشت بنجر زمین سونپی گئی تھی، وہیں بس گیا اور زمین پر اپنے موروثی حقوق اختیار حاصل کر لئے۔

پٹے داروں کی دوسری قسم ممتاز طبقہ (زمیندار، مقدم، انعام منصرم، مدد معاش عطیات) و دیگر خوشحال کسانوں کی نجی زمینوں پر جتائی کرتی تھی جو کچھ تو سماجی اسباب کی وجہ سے اور کچھ زمین پٹوں کی نوعیت کے سبب پٹے دار کسانوں پر ہی منحصر رہتے تھے۔ زمین کا ایک حصہ طاقتور اور دولتمند طبقہ کے پاس تھا جو جزوی پٹے داروں کو دیا جاتا تھا۔ جہاں پٹے دار ریاست کو صرف زمینی لگان ہی ادا کرتے تھے۔ ان پٹے داروں کو اس کے علاوہ زمین کے مالک کو لگان یا ''مالکانہ'' بھی دینا پڑتا تھا جو پیداوار کا 5 فیصد حصہ ہوتا تھا۔ اگر ہم اس میں ریاست کے ٹیکس کی شکل میں لئے گئے 40 یا 50 فیصد کو جمع کریں تو پٹے داروں سے طلب کیا گیا حصہ اس پیداوار کا 55 سے 60 فیصد تک ہوتا ہے۔ یہ تناسب اور زیادہ بھی ہو سکتا تھا اگر پٹے دار کے پاس مطلوبہ زراعتی سرمایہ نہ رہے اور اس نے زمین کے مالک سے قرض لیا ہو۔ قابل کاشت زمین کی کثرت کے باوجود ایسے پٹے داروں کی موجودگی کو ان کے ذریعہ اپنی پٹہ زمین میں سرمایہ کاری نہ کر پانے میں ان کی عدم دستیابی کی شکل میں واضح کیا جا سکتا ہے۔

17.5.4 بٹائی دار

بٹائی بھی ایک قسم کا انحصار ہے۔ اس کو نہ اچھوت ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی زمین سے محروم کے برابر رکھا جا سکتا ہے۔ یہ کسان کی اپنی نجی جوت سے مناسب پیداوار نہ کرنے کی عدم صلاحیت یا اس کے خراب وسائل کی حالت کا نتیجہ تھی۔ سانجھا مشروط ہبہ (Sanjha Entailed) میں سرمایہ کاری اور

محنت کے بیچ نیز سرمایہ کاری اور دوبارہ تقسیم کے درمیان مخصوص پیداوار، تعلق ضروری تھا۔اس نظم کے تحت ایک گروہ خصوصاً ضروری سرمایہ کاری یا پیداوار کے وسائل دیتا تھا اور مزدور طاقت کسی دوسرے گروپ کے ذریعہ لگائی جاتی تھی۔ سانجھا پٹے (Tenure) کے تحت ایسے وسائل غریب کسان کو زمینداروں یا دیگر خوش حال کسانوں کے ساتھ مل کر زمین کھیتی کرتے تھے جنہوں نے اپنی بڑی جوتوں کی وجہ سے اس نظام کا سہارا لیا ہوتا تھا نیز جن کے واسطے وہ مزدور مطالبہ اور بذات خودنگرانی نہیں کر سکتے تھے۔ چھوٹے کاشتکار سانجھا جوت پر کام کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کیا کرتے تھے۔ کچھ معاملوں میں زمین زمیندار کی ملکیت میں ہوتی تھی لیکن سرمایہ کاری یا پیداوار کی لاگت میں سانجھا داروں کی حصہ داری ہوتی تھی مگر اکثر زمین کا مالک ہی پیداوار کی لاگت فراہم کرتا تھا۔ سانجھا کی ایک خاص نشانی سانجھا کے دونوں فریقین کی علاحدہ شرحوں پر لگان کا تعین تھا۔ زمینداروں کے لئے لگان کا تعین رعایتی شرحوں پر ہوتا تھا اور کسانوں کو زمین کا لگان عام شرح پر ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ سانجھا جوتوں کو ملبہ بقایا سے بھی مستثنیٰ نہیں رکھا جاتا تھا۔

17.5.5 زرعی مزدور

ذات پات کے سبب (Cast Factor) نے کرائے کے مزدوروں کی ایک معین سپلائی کی مانگ کو یقینی بنایا۔ ایسے مزدوروں کی محفوظ کثیر تعداد کی سپلائی نچلے طبقہ کی ذاتیں کرتی تھیں۔ زمین سے محروم لوگوں کے علاوہ چھوٹے کاشتکاروں کا ایک طبقہ بھی جز وقتی مزدوری کے کام کے واسطے موجود تھا۔ ہمہ وقتی و جز وقتی مزدوروں کی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں۔ ھالی، مجورے (Halis, Majure) جن کو گاؤں کے مختلف طبقوں کے ذریعہ کام پر رکھا جاتا تھا۔ ہالیوں کی طبقہ بندی برہمن کا ہالی، راجپوت کا ہالی، زمیندار کا ہالی اور گاؤں کا ہالی کی شکل میں کی جاتی تھی۔ یہ ان زرعی مزدوروں کی طرف اشارہ ہے جو اعلیٰ ذات کے کسانوں، ممتاز طبقوں جیسے زمیندار، گاؤں کا مکھیا اور ان کے ماتحت مصروف کار ہوتے تھے جو گاؤں سماج کی ترکیب میں رہ کر اپنی خدمات مہیا کراتے تھے۔ اس طرح مشرقی راجستھان کے ایک گاؤں میں 28 ہالیوں میں سے 10 دولتمند طبقہ کے ذریعہ کرائے پر کام کرنے پر مامور تھے اور باقی گاؤں سماج کی سروس میں تھے۔ ان میں کچھ ہالی کاشتکار ذات ہی کے تھے۔ اس طرح پرگنہ برسانہ کے گاؤں میں 40 میں سے 5 ہالی درمیانی درجے کی ذاتوں اور باقی دستکار یا مزدور تھے۔ جن میں شامل تھے: کھاتی، لوہار، نائی، کمہار، تیلی، مہار (سقے/ پانی ڈھونے والے) اور بالا ہی (چمڑے کا کام کرنے والے)۔ خواتین ہالیوں کو بھی خدمت میں لگایا جاتا تھا اس طرح پرگنہ باروڑ کے ایک گاؤں میں 8 ہالیوں میں سے 5 مرد اور 3 خواتین تھیں جو کہ جاٹ اور اہیر ذاتوں کی تھیں۔ زیادہ تر معاملوں میں ہمہ وقتی ہالیوں کو 3 سے 4 ماہ کی مدت کے لئے رکھا جاتا تھا اور ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔ اس طرح گاؤں امیہڑی میں 5 سے 4 ہالیوں کو 2 روپے کے حساب سے تنخواہ ملتی تھی اور پانچویں کو جو چمار ذات کا تھا ہر ماہ 1.50 روپئے ملتے تھے۔ خواتین ہالیوں کو ان کے مرد ساتھیوں کے مقابلے کم تنخواہ دی جاتی تھی۔ گاؤں بھاؤڈا میں دو ضعیف عورت ہالیوں کو ہر ماہ 1.25 روپیہ دئے جاتے تھے اور ایک جوان جاٹ عورت ہالی کو ماہانہ 2 روپئے۔ ہالیوں کو ایک چھوٹا حصہ خوردنی فصل کی پیداوار کا بھی دیا جاتا تھا۔ گاؤں کے ہالی یعنی وہ لوگ جو گاؤں کے سماج کے ذریعہ کام پر رکھے جاتے تھے زراعتی سرگرمیوں کے مشغول زمانہ جیسے بیج بونا، فصل کٹائی، گھاس پھونس (خس وخاشاک) اکھاڑنا وغیرہ کے وقت بھی زرعی مزدوری دیا کرتے تھے، ان کی محنت کا صلہ فصل میں سے کچھ حصہ دے کر کیا جاتا تھا۔ پیداوار میں ان کا یہ حصہ فصل کے 0.5 سے ایک فیصد تک کے درمیان ہوسکتا تھا ان کی جماعتوں (Communities) کو خدمت کے عوض انہیں زمین کے چھوٹے موٹے قطعات تقسیم کئے جاتے تھے۔

17.5.6 کمین

کمین طبقہ گاؤں کے معاشرہ میں درجہ بندی کی حیثیت سے سب سے نچلے درجہ پر تھا ان کو ''پاونی'' اور ''بیگاریا'' بھی کہا جاتا تھا۔ وہ گاؤں کے معاشرہ کے واسطے کھیتی کے اوزار اور مزدوری وغیرہ کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ نچلی ذاتوں کے لوگ جیسے چمار، بالا ہی، تھوری وغیرہ گاؤں کے مزدوروں کی شکل میں خدمتگار رہتے تھے اور گاؤں کے معاشرہ کو زرعی محنت کی سپلائی کا کام انجام دیتے تھے خصوصاً مصروفیت کے مہینوں میں۔

یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہے کہ وہ پیشہ ور اور خدمتگار ذاتوں یعنی کمین سے متعلق تھے ان کی سماجی حالت کیا تھی؟ عرفان حبیب کی رائے ہے کہ ذات پات کے نظام کے ذریعہ تھوپی گئی موروثی محنت تقسیم نے نچلی ذاتوں کو کاشتکاروں کی حیثیت حاصل کرنے میں رکاوٹ ڈالی، جس سے زرعی پیداوار کے لئے یقینی محفوظ مزدور طاقت کا ظہور ہوا۔ مگر اس بات کے پختہ ثبوت ملتے ہیں کہ کمین ہمہ وقتی کاشتکار بن سکتے تھے۔ ہم کمین طبقہ کو دو قسم میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا وہ جو

گاؤں سماج کو اپنی خدمات دیتے تھے اور روایت کے مطابق لگان ادا کرنے سے قبل اناج کے ڈھیر میں سے ایک طے شدہ حصہ کے عوض اعلیٰ ذاتوں کے لئے بیگار بھی کرتے تھے۔ کمین طبقہ کی دوسری قسم میں ایسے کاشتکار تھے جو کہ ریاست کو لگان ادا کرتے تھے۔ انہیں بیگار اور ذات پات سے متعلق پیشوں پر ٹیکس کی ادائیگی سے آزادی تھی۔ کھاٹی۔ تیلی، کمہار، کلال اور چمار، بالاہی، نائی جیسی خدمات انجام دینے والی ذاتیں آسامی یا ٹیکس دھندہ کی شکل میں ذکر کی جاتیں ہیں۔ کچھ گاؤں میں ان کی تعداد 10-17 فی صد تک تھی ہمارے شواہد سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کاشتکار کمینوں کی تعداد کافی زیادہ اور وسیع تھی۔

''رعیت'' زمین کی قیمت پر ''خود کاشت'' جوت (زمین پٹہ) کی وسعت پر سرکاری ممانعت کے باوجود یہ رجحان آہستہ آہستہ قائم ہونے لگا۔ وسائل سے بھرپور ''خود کاشت'' ایک بڑے پیمانہ پر ''رعیت'' کی زمین کو رہن رکھنے لگے تھے۔ سب سے اعلیٰ قسم کی زرعی زمین اسطرح غنی طبقہ کے ہاتھوں میں جانے لگی تھی۔ اس نے خصوصی حقوق حاصل کردہ کاشتکاروں اور کم حقوق یافتہ درجوں کے بیچ گہرا تناؤ پیدا کیا۔ اپنی مشترک عرضیوں میں کم قلیل مراعات یافتہ کسانوں نے مطالبہ کیا کہ ملبہ (گاؤں خرچ) سے رعایت کو ان کی اصل جوت تک ہی محدود رکھا جائے نیز قلیل مراعات یافتہ کاشتکاروں سے حاصل زمین پر انہیں نہ بڑھایا جائے۔

اس نے گاؤں کے معاشرہ میں ایک نئے تعلق کو جنم دیا یعنی اقتصادی اعتبار سے غنی اور غریب کسانوں کے درمیان۔ اس نے غریب کاشتکاروں کو پٹے داروں اور منحصر کاشتکاروں کی حیثیت سے لا کھڑا کیا۔ خود کاشت جوتوں کی توسیع کا گاؤں معاشرہ کے طریقۂ کار پر بے حد اثر پڑا۔ کامیاب خود کاشت جو بڑھی ہوئی مزدوری کی رسد کے مطالبہ کے ساتھ بڑی جوتوں کو منظّم کرنے کے اہل تھے، نے رعیت کو مفلس اور منحصر بنائے رکھنے کے لئے اپنی سماجی حالت اور سرمایہ کا استعمال کیا۔ جب ناموافق حالات میں کسی چھوٹے کاشتکار کو دیکھ ریکھ کے لئے پیسہ یا اناج قرض لینا پڑتا تھا تو مالدار خود کاشت زمین کو رہن رکھنے کے عوض قرض دیتا تھا ایک ایسی ہی مثال میں قحط اور فقدان کے وقت انہوں نے رعیت کے 350 میں سے 175 کھیتوں کو رہن رکھا تھا۔ یہ مالدار خود کاشت اپنی حاصل زرعی زمین کو لگان پر کاشت کار کو دیتا تھا۔ اکثر مالدار خود کاشت نے اس طرح اپنے آپ کو تقریباً پوری طرح کرائے پر دینے والا بنا لیا تھا۔

مالدار طبقہ ارزانی کے سالوں میں بھی زراعتی امور جاری رکھ سکتا تھا جب کہ زیادہ تر چھوٹے کاشتکاروں کے لئے چھوٹی جوتوں تک پر ایسی حالت میں کھیتی کرنا دشوار گذار تھا۔ اپنی حالت کے تئیں یہ بیداری ہی تھی جس نے مخصوص حقوق حاصل شدہ مالدار طبقہ کو ریاست اور دیہی طبقات میں اپنی حالت کو مضبوط بنانے کے لئے لائق کیا۔ انتظامیہ ان حقائق کے لئے پوری طرح بہت زیادہ غیر متفکر نہیں رہ سکتا تھا۔ حکمراں طبقہ کے مفادات کی حفاظت کے واسطے ریاستی انتظامیہ نے ایک دوسرے کو نہایت مستحکم کرتی معاشرتی اور معاشی عدم مساوات کو قائم رکھا۔

ریاست کو ارزانی کے سالوں میں زراعتی امور کا تسلسل بنائے رکھنے کے لئے ایک قسم کے بیمہ کی شکل میں گاؤں کے معاشرہ کے اندر دولتمند طبقہ کو قائم رکھنا پڑا۔ ریاست نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ دولت مند طبقہ ہی تھا جو زراعتی امور کو وسعت بخش سکتا تھا اور ممتاز قسم کی فصلوں کی زراعت کر سکتا تھا۔

بالآخر اس کا انجام یہ ہوا کہ معاشرتی ناہمواریوں میں اضافہ ہونا یقینی امر تھا جو بدلہ میں اعلیٰ سطح پر زمین کے ارتکاز اور دوسری طرف منحصر کسانوں کی تعداد میں اضافہ میں تبدیل ہوا۔ یہ ثبوت گاؤں پھاگی کی رعیت کے ذریعہ دائر عرضی میں بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کی شکایت تھی کہ پہلے ان کے پاس 700 ہل تھے اور اب صرف 28 ہل ہی رہ گئے ہیں۔ بہت سارے دستاویز رعیت کی بگڑتی حالت کی تصدیق کرتے ہیں۔ گاؤں پہاڑی میں رعیت سے تعلق رکھنے والے ہلوں کی تعداد 300 سے گھٹ کر 50 رہ گئی۔ ان کی بڑھتی مفلسی قرضوں کے بوجھ کے ساتھ آئی تھی جس نے آخر کار بہت سارے کسانوں کو ان کے کھیتوں اور کنوؤں تک سے بھی محروم کر دیا تھا۔ گاؤں کے معاشرہ میں اقتصادی تفاوت میں اضافہ ہوا۔ اور یہ پونجی جمع کرنے سے مالدار طبقہ کو کسان طبقے کے غریب طبقہ کا اور گہرے طریقہ سے استحصال کرنے کا اہل بنا دیا۔ زمین کی کثرت کے ذریعہ جو باہم انحصار اور غیر معمولی توازن تھا وہ تعلق معاشی قوتوں کی کاروائی کے سبب ٹوٹ گیا۔ انجام یہ ہوا کہ زمین پر دباؤ میں کسی بھی مناسب اضافہ کے بغیر بنا پٹے داروں اور منحصر کاشتکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور اس سے دولت مند طبقہ کی طاقت اور بڑھ گئی۔ کاشتکار طبقہ کے ایک بڑے حصے کی غریبی میں بھی اضافہ ہوا اور ایک چھوٹے سے طبقہ میں دولت کے ارتکاز کے ساتھ

B. NO.

ہی 18 ویں صدی میں دیہی سماج اس طرح پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ غیر مساوی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔

نظریاتی طور پر گاؤں کے معاشرہ میں جو انحصار اور باہمی انحصار موجود تھا، پر ایک نظر ڈالنے کے لئے انفرادی طور پر کسان فیملی اکائی کو ایک پیچیدہ پیداواری نظام کے ایک حصہ کی شکل میں دیکھنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ایسا خاص طور پر اس وجہ سے ضروری ہے کیونکہ مقامی سرمایہ پر کنٹرول گاؤں کے چیدہ افراد اور ساہوکاروں تک ہی محدود تھا۔

17.6 قرضہ جاتی تعلق اور ساہوکار

قرض کے واسطے کاشتکاروں کی ضرورت اور مطالبہ مندرجہ ذیل باتوں پر منحصر ہے (ا) سرکاری محصول قانونی معاہدہ (2) بقائے زندگی اور بیج کے لئے قرض (3) زراعتی اثاثوں کے لئے اور (4) سماجی فرائض کی ادائیگی کے واسطے۔ بنگالی سے حاصل 18 ویں صدی کے ثبوتوں کی بنیاد پر عرفان حبیب کا ماننا ہے کہ کسان قرض زیادہ تر زمینی لگان ادا کرنے کے واسطے لیتا تھا۔ راجستھان میں قرض بیج کی خریداری، کنویں تعمیر کرانے اور ذاتی استعمال وغیرہ کے لئے لئے جاتے تھے۔ زراعتی پیداوار کے لئے قرض کے رول کا ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔

عہد وسطی میں قرض حاصل کرنے کے اہم ذرائع تھے: بوہرہ، مہاجن، ساہوکار اور ریاست۔ یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے مکمل متبادل تھے۔ انفرادی قرضے عموماً بوہروں سے حاصل کئے جاتے تھے اور بڑی سطح پر قرض عام طور پر ریاست کے ذریعہ رعیت کو اجتماعی طور سے دئے جاتے تھے۔ یہ قرض ترقی اور کھیتی کی تجدید کاری، آبادکاری وغیرہ کے واسطے دیئے جاتے تھے اور اس حالت میں بھی دیئے جاتے تھے جب بوہرہ نہ مل سکے یا پھر ضرورت مند کاشتکاروں کو قرض دینے میں حیلہ بازی کرتا ہو۔

عرفان حبیب کا ماننا ہے کہ مہاجنی یعنی پیسہ قرض دیئے جانے میں اضافہ، نقد میں زمین کے لگان کے لئے مطالبہ کی تقریباً ایک ناگزیر دشوار گذار صورت تھی۔ اس نے فی الحقیقت کسی زراعتی سرمایہ کو پیدا نہیں کیا بلکہ محض کھیتی پر طفیلی ترقی کا اشارہ دیا۔ مگر راجستھانی دستاویزات سے حاصل ہمارے ثبوت ظاہر کرتے ہیں کہ نجی قرضے دینے والوں سے حاصل شدہ قرض کھیتی کے پیداواری نظام میں پوشیدہ تھا اور ساہوکار کاشتکار طبقے کو اپنی فائدہ مند خدمات مہیا کراتا تھا جس کی وجہ سے وہ زراعتی کاموں کو جاری رکھ پاتے تھے۔ ایسی ہی ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ بیس کاشتکار ارزانی کے سال میں ربیع کی فصل کے دوران ساہوکا کی مدد سے کنواں کھود کر خطرناک حالات میں خود کو ہلاکت سے بچا سکے۔ ریاست نے بھی ان کے اس اہم کردار کی تعریف کی جو گاؤں کے معاشی نظام میں بقائے زندگی کے میدان میں ان کے تسلط کے تناظر میں اور ان علاقوں میں جہاں پیداوار جغرافیائی اسباب کی وجہ سے ناممکن ہوتی تھی، نبھاتے تھے۔

گاؤں کے علاقوں میں مہاجن کا پیشہ صرف بنیوں کی قوم ہی تک محدود نہیں تھا۔ برہمن، سنیاسی، چودھری، قانون گو، زمیندار اور دولتمند کاشتکار بھی مہاجنوں کی شکل میں کام کرتے تھے۔ کچھ مہاجن اسکو تجارت اور زراعت سے منسلک کرتے تھے۔ ایسا گاؤں کا طاقتور طبقہ جنہوں نے ان سرگرمیوں کو ایک ساتھ جوڑا اور ان میں سے کچھ انتظامی عہدوں پر فائز تھے کا وجود 17 ویں 18 ویں صدی میں تھا۔ زمین رہن رکھنے سے متعلق تنازعوں میں اسی دیہی طاقتور طبقے کا اہم رول تھا۔ قرض دینے کے علاوہ یہ دیہی دولت مند طبقہ کنوؤں اور دیگر اثاثوں کو بھی کرایہ پر اٹھاتا تھا۔ مہاجنی دیہی معاشرہ میں ہر جگہ موجود تھی جیسا کہ مشرقی راجستھان کے پرگنوں میں رعیت کی مقروضیت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ راجستھان میں تکّی (تقاوی) سود سے آزاد نہیں تھی۔ نقدی یا اشیاء کی شکل میں دیئے گئے کسی بھی قسم کے قرض پر 9 فیصد سود لیا جاتا تھا۔

مشرقی راجستھان میں سود شرح 9 فیصد سے لے کر 25 فیصد تک کے حساب سے رائج تھی۔ مارواڑ علاقے میں یہ 10 سے 36 فی صد تک تھی۔ جب کہ مہاراشٹر میں یہ 37.5 سے لے کر 60 فیصد تک کے حساب سے چلتا تھا۔ سود شرح غیر ضمانتی قرضوں پر زیادہ رائج تھی اور جہاں ضمانت دی جاتی تھی وہاں یہ شرح نسبتاً کم ہوتی تھی۔ ریاست قرضوں کی وصولیابی کو یقینی بنانے میں مدد کرتی تھی بشرطیکہ وہ دس سالوں سے زیادہ پرانے نہ ہوں یا جہاں ریاست یہ سمجھتی تھی

کہ قرضوں کی وصولیابی سے زرعی پیداوار پر اثر پڑے گا ریاست وہاں کوئی تعاون نہیں کرتی تھی۔

ریاست نے بوہروں کی کاروائی پر بندش لگائی جس کا مقصد استحصال کو روکنا تھا نیز ساتھ ہی کھتی کی غیر دخل اندازی کو بھی یقین بنانا تھا۔ بوہروں کے زیادہ مطالبات کی وجہ سے کسانوں کی مخالفت، عام طور پر کسانوں کی اس جگہ سے ہجرت کر جانے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ گاؤں سے ہجرت کے سلسلوں کو روکنے کے واسطے ریاست نے مقامی حکمرانوں کو خصوصی ہدایات جاری کئے کہ (1) بوہرہ پرانے قرضوں کی وصولیابی کے لئے رعیت کو پریشان نہ کریں (2) دوبارہ ادائیگی فصلوں کی پیداوار کے مطابق ہی ہوا سبھی قرضوں کے تعلق میں عام اصول تھے (1) فصل کٹائی کے فوراً بعد نئے قرضوں کی دوبارہ ادائیگی (2) پرانے قرضوں کی وصولیابی اگر فصل بہت اچھی ہوئی ہو اور (3) قسطیں ادائیگی کی صلاحیت کے پیش نظر مقرر ہوں۔ ریاست نے مرکب سود (compound interest) کے واسطے زیادہ سے زیادہ حد متعین کی۔ اس بات کو یقینی بنایا گیا کی قرض اصل سرمایہ سے دوگنا نہ ہوجائے۔ زیادہ سنگین حالات میں رعیت کے ذریعہ سبھی قرضوں کی دوبارہ ادائیگی پر عارضی طور پر قرض کو باضابطہ ملتوی کر دیا جاتا تھا۔

ان بندشوں کو بہرحال راجا اور بوہروں کے درمیان باہمی مخالفت کی شکل میں نہ لیا جائے۔ بوہرہ کافی تعداد میں چھوٹے کاشتکاروں کو سہولیات فراہم کراتے تھے اور ریاست گاؤں کے پیداواری نظم اور بازاروں میں ان کے ذریعہ نبھائے جانے والے کردار کو پوری طرح قبولیت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس طرح وہ ریاست کے لئے محصول بہاؤ کو یقینی بناتے تھے۔ ریاست کے ذریعہ بوہروں پر بندش کا مقصد بذریعہ ریاست بوہروں کے مطالبہ کو محصلوں کے مطالبہ کے ماتحت کرنا تھا۔ بوہروں کے ذریعہ بذریعہ طاقت وصولیابی کو قبضہ میں رکھنے کے لئے اور حدود بند کرنے کی ریاستی پالیسی کا ایک مکمل حصہ تھا۔ ان کو ریاست کی تقاوی (taqavi) میں اضافہ کرنے کی سہولت تھی۔ اس حالت میں جب بوہرہ قرض دینے سے انکار کر دیتا تھا بوہروں کی وصولی کے لئے ایک حاکمانہ یقین دہانیوں کے ذریعہ حمایت یافتہ قرض دینے کے واسطے بھی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ یہ یقین دہانی کاشتکاروں کے ذریعہ غیر یقینی پیداوار یا ہجرت کی حالت میں قرض ادائیگی کی تعلق سے نجی بوہروں کے خوف کو کم کرنے میں فیصلہ کن مانی جاتی تھی۔

17.7 گاؤں اور گاؤں کی جماعتیں

گاؤں ایک خاص جغرافیائی علاقے کے ساتھ ساتھ ایک محصول اکائی بھی ہوتا تھا گاؤں کو نہ صرف اس کی طبعی جگہ کے لحاظ سے بلکہ ایک اجتماعی سماجی نمائندہ اقتدار کی حیثیت سے بھی دیکھا جاتا ہے جسکی نمائندگی اس کے ترجمان (spokes man) کی شکل میں مقدم والا دیہی طبقہ (village community) کرتا تھا۔ یہ بات مقدم کے ذریعہ اعلیٰ افسران کو کی گئی ادعا میں صاف طور سے ظاہر ہوتی ہے جو کل کاشتکار طبقہ سے متعلق مختلف مدعوں پر اپنے پورے گاؤں کی طرف سے بحث کرتا تھا۔

ہندوستان دیہی معاشرہ کو متعلقہ پہلے ابتدائی برطانوی حکمرانوں کی سرکاری تحروں میں دیہی طبقات کو ہندوستان میں کاشتکارانہ معاشیات کی سماجی بنیاد کی شکل میں پہچانا جاتا تھا۔ گاؤں کی جماعت (community) کی پہچان ایک بند جماعتی بنیاد کے شکل میں کی گئی ہے جو اپنی نجی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چھوٹی سطح کی پیداوار پر منحصر تھا۔ برٹش سرکاری تحریروں کے مطابق ایک چھوٹا گاؤں جمہوریت کی زمین تھا اور ہندوستانی عوام شہری سرکار یا چھوٹی جمہوریتیں کی اس سادہ صورت کے تحت پابند تھا۔

سر چارلس مٹکاف گاؤں کی جماعتوں (community) کی نوعیت کا تذکرہ چھوٹی جمہوریتوں کی شکل میں کرتے ہیں جو اکثر کسی بھی باہری تعلقات سے آزاد اور کردار میں غیر تغیر پذیر تھے۔ ان کا یقین تھا کہ گاؤں میں رہنے والے مختلف طبقوں کی اہم علامت باہمی جماعتی انحصار تھا۔ جیمس مل کا ماننا تھا کی کہ گاؤں کا طبقہ ایک شہری شکل میں تھا۔ سر ھیزی مین ہندوستانی جماعتوں کو خاندانوں کے ایک بذات خود مشغول جماعتوں کی شکل میں دیکھتے ہیں جن کو زمین کے ایک مخصوص حصہ پر مشترکہ حق ملکیت حاصل تھا۔ ان کے مطابق یہاں دو قسم کے دیہی طبقوں کا وجود تھا (1) وہ جن میں گاؤں کے حقوق گاؤں کی پنچایت میں پو شیدہ تھے (2) وہ جن میں حقوق گاؤں کھیا (Head man) کے ہاتھ میں تھے۔ الفنسٹن گاؤں کے سماج کا تصور مقامی علاقائی حقوق والے شہری

ادارے(municiple institutions) کی شکل میں کرتے ہیں۔ان کا یہ بھی ماننا تھا کی (۱)ہندوستان میں دیہی جماعتیں(community) کوئی عالم گیر مظہر نہیں تھی (2) کام پر مامور(دستکاروں وغیرہ) کے سبھی طبقے ہر گاؤں میں نہیں رہتے تھے(3) گاؤں کی بنجر زمین ریاست کا ملکیت ہوتی تھی نہ کہ گاؤں کے باشندوں کی۔ بیڈن پاویل کا ماننا تھا کہ دیہی سماج کا تصور زمین لگان کے نظام سے منسلک تھا اور یہ بھی گاؤں کے باشندے کسی غیر متبدل شکل میں ابتدائی زمانہ کی بقا نہیں ہیں۔ وہ اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ ہندوستانی گاؤں کا خاکہ اپنے ظہور کے وقت ہی سے عوامی حکومت یا جمہوریت کی شکل لئے تھا۔ انھوں نے گاؤں کو لازمی طور پر مختلف کاشتکار زمین مالکوں اور گاؤں کے دیگر پیشہ وروں کے ایک طبقہ کی شکل میں دیکھا جو کسی چھوٹی سی مطلق العنایت یا چند سری حکومت کی شکل میں منظّم تھے۔انھوں نے دو قسم کے گاؤں کی شناخت کی رعیتی یا غیر زمین داری اور زمین داری گاؤں۔

ان سبھی ضابطہ سازی (formulations) پر قبل نو آبادیاتی زمانہ میں دیہی طبقات کا خاکہ (structure) اور طریقہ کار کی مشکلوں کے حوالے سے تنقیدی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

جمہوری حکومت یا قدیم جمہوری حکومت ادارہ کی شکل میں دیہی کمیونٹی کا خیال قابل اعتراض محسوس ہوتا ہے۔ دیہی طبقات سے متعلق جمہوریت دامی تحریروں میں نقطۂ آغاز خصوصی علامات والی سماجی تنظیم کی کم وبیش کلی بنیاد پر دیہی طبقات کی تشریح کی گئی ہے، جیسے کی سیاسی خود اختیاری، معاشی طوائف الملو کی، سماجی یکسانیت اور اس قریبی اجتماعیت کا غیر متبدل کردار تھا۔

گاؤں کو ایک جغرافیائی علاقے کے تصور کے ساتھ ساتھ ایک لگان کی اکائی کی شکل میں بھی دیکھا جاتا تھا۔اس کو مکھیا (Head man) کی قیادت میں ایک دیہی سماج کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا وہ کل کاشتکار طبقے کے نمائندہ کی شکل میں مختلف مسائل کو پورے گاؤں کی طرف سے اعلی افسران کے سامنے بھی پیش کرتا تھا۔

سب سے پہلے گاؤں کبھی بھی جداگانہ (isolated) خود ضابطہ اکائی نہیں رہا۔سوال یہ ہے کی اس طرح کے تصور کے ساتھ عام طور پر نقد میں ریاست کو زمینی لگان ادا کرنے کی ذمہ داری کے ساتھ کسی طرح کی مطابقت کی جاسکتی ہے۔ یہ تسلیم کرنا کہ گاؤں کا مکھیا اجتماعی فائدے کے نمائندہ کی شکل میں کام کرتا تھا اور یہ بھی کہ وہ زرعی طبقہ کے قبضہ میں تھا، عمومی طور پر ہی شک پر مبنی ہے۔ حقیقت میں وہ ریاست کی انتظامیہ کے کنٹرول میں بھی اتنا ہی تھا جتنا کاشت کار طبقہ کے۔

کاشت کار معاشیات کی فرقہ وارانہ اور خود کفیل بنیاد تھی، یہ خیال بڑی تنقید کا مضمون رہا ہے۔ زمین کی ملکیت کا پیٹرن اور انفرادی کاشت کاروں کے بیچ زرعی اثاثوں کی تقسیم قابل ذکر طور پر مالی اختلاف کو واضح کرتی ہے۔ اس کو بھی قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ زرعی طبقہ کی یکسانیت یا بے تفریق اقتدار اور دیگر وسائل کی غیر مساوی تقسیم کے سبب کافی حد تک معاشی اختلاف پیدا ہو رہے گاؤں کے سماج میں زمین کی محرومی اور زراعت پر انحصار موجود تھا۔ پیداوار کے فیصلے کاشت کار خاندان کے ذریعہ ہی لئے جاتے تھے نہ کہ اجتماعی طور پر اور ٹیکس کی ادائیگی کا ذمہ بھی کاشت کار کا ہی ہوتا تھا۔لگان کی دستاویزوں میں لگان بقایا نہ ادا کرنے والوں کے کھاتوں میں 'دکھائے' جاتے تھے نہ کہ مکمل دیہی سماج کے کھاتے میں۔

مغل زراعتی نظم کی ایک دوسری خصوصیت تھی گاؤں کی معاشیات کا تنوع۔ یہ بات نہں تھی کہ گاؤں صرف دیہی معاشرہ کے لئے ہی پیداوار کا کام انجام دے رہا تھا یا پھر زراعت اور خانگی دستکاریوں کو متحد کرنے کے ذریعہ سے جس کی گاؤں کو اہم ضرورت تھی۔ دوسری جانب گاؤں کی معاشیات کی خصوصیت ممتاز طور پر مخصوص اشیاء کی پیداوار، زراعت اور گاؤں میں نقدی (روپیہ) معیشت میں داخل تھی۔ گاؤں کی معشیت روز بروز اور بازار مرکوز بنتی جارہی تھی۔ اشیاء کی پیداوار کی زیادتی نے زراعت اور دستکاری کے بیچ شہر اور گاؤں کے باہمی رشتوں کو ترقی کی طرف تبدیل کیا۔قصبات گاؤں کے بازاروں میں اضافوں کے اشارہ دیتے ہیں۔گاؤں کی آبادی اتنی نہں تھی کہ دستکاروں اور دوسرے کارندوں کے سبھی طبقوں کو اپنے اندر سما سکے یعنی شامل کر سکے۔

CENTRE • MANUU LIBRARY Hyderabad-34

اس طرح دیہی سماج بند، منجمد اور صحیح طور پر ایک مجتمع سماج کی بنیاد نہیں تھا۔ برٹش مؤرخین نے دیہی معاشرہ کے اندر تنوع اور تسلط نیز وسیع معاشی وسیاسی اداروں پر ان کے انحصار جیسے اہم پہلوؤں کو نظر انداز کیا۔ ان کی تحریریں جدوجہد اور تبدیلیوں کو مجتمع کرنے میں ناکام ہیں۔ بی۔ آر گروور کی دلیل ہے کہ دیہی طبقہ کا تصور، جیسا کہ 19 ویں صدی میں برٹش حکمرانوں کے ذریعہ بیان کیا گیا، ان کی 19 ویں صدی کی فریت کاری، متحدہ فیملی، زمینداری زمین جائداد پر مبنی تھی۔ جن کو زمین پر فرقہ وارانہ ملکیت والے پٹے داری اور بھائی چارہ زمینی حقوق کے نام سے جانا جاتا تھا۔

17.8 کاشتکار مخالفت کی شکلیں

مغلیہ ہندوستان کے زراعتی طریق کار کے مرحلہ میں نقل مکانی یا بغاوت میں دھکیل دیئے گئے ایک ناعاقبت اندیش تباہ حال کاشتکار طبقہ کا نظریہ ہے۔ زمینی محصول ادا کرنے سے انکار کو عرفان حبیب بذریعہ کاشتکار عدول حکمی کی کلاسیکل کاروائی کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ کسانوں کے ذریعہ شکایتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مؤرخین نے اپنی توجہ نقل مکانی پر مرکوز کی ہے۔ جو حبیب کے مطابق قحط اور ظلم، دونوں حالتوں میں کاشتکاروں کا پہلا ردعمل تھا۔ حبیب مسلح مخالفت کو کاشتکاروں کے غصہ اور مایوسی کا مجسمہ مانتے ہیں۔ پیزنٹ ان انڈین ہسٹری میں حبیب اس زبردست استحصال کو تفصیل سے نقل کرتے ہیں۔ جس کا شکار عہد وسطی کا کاشتکار طبقہ تھا اور پھر وہ کاشتکار بغاوتوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ حبیب فصلوں کو تباہ کرتے اور ادائیگی میں ٹال مٹول یا لگان ادا کرنے سے انکار کی کوشش کرتے کاشتکاروں کے ثبوت پیش کرتے ہیں۔ حبیب مجہول سے لے کر مسلح تک کاشتکار مقابلے کی متفرق شکلوں کو پیش کرتے ہیں اس حوالے سے دوسرے اسباب پر مناسب توجہ نہیں دی گئی ہے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کاشتکار طبقہ کے پاس ادائیگی کے متبادل کم ہی تھے۔ اصل بنیاد یہ ہے کہ کاشتکار جب استحصال سے نمٹنے میں ناچار ہوتے ہیں تو وہ آخرکار مسلح مزاحمت کا سہارا لیتے ہیں۔

آخرکار کھیا نے مزاحمت کے نظریہ کی تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے جو پوشیدہ و کھلے عام دونوں طرے سے ہوتی تھی۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ کاشتکار مزاحمت پیدا وار کے طریقۂ کار کی بنیاد پر مختلف شکلیں لے سکتی تھی۔ سستی، لاپرواہی، ادائیگی سے متعلق ٹکراؤ، خفیہ عرضی، کاشتکاری ترک کرنے کی دھمکی، پر تشدد بغاوت، ان سب کے امکانات تھے۔ حالانکہ کھیا کاشتکاروں کے استحصال کے نظریہ کو قبول کرتے ہیں۔ مگر ان کی دلیل ہے کہ کاشتکار طبقہ کے اس نظریہ کو صرف ایک حد تک ہی قبول کیا جاسکتا ہے۔ کاشتکار طبقہ کا تصور، کھیا نے مخالفت کے واسطے کچھ حد تک طاقتور اور مناسب مقدار میں تیز رفتاری رکھنے والے طبقہ کی شکل میں کیا ہے۔

دو حالتوں سے واضح ہے، اول، ہمارے پاس ایسی تحقیقات ہیں جو بغاوت پر توجہ مرکوز کرتی ہیں۔ دوسرے طبقے میں ہمارے پاس ان مؤرخین کی تقیدیں ہیں جو مجہول مزاحمت کے آئے دن کی شکلوں کے امکانات کے حامی ہیں۔ مزاحمت کی شکلوں سے متعلق ان دو حالتوں کی کاشتکار طبقہ کی دو دیگر تصویر ابھرتی ہیں۔ ایک طرف تو ہمارے سامنے بے حد مظلوم، مایوس اور بے یارو مددگار کاشتکار طبقہ کی تصویر ہے جو یہ نہیں جانتا کہ ہمیشہ موجود استحصال کی حالت میں وہ کیا کرے؟ اور کیسے زندہ رہے؟ اس کا آخری اور واحد ہتھیار بغاوت ہے۔ دوسری طرف ہمارے سامنے ایسی تصویر ہے جو انھیں ہمیشہ کے لئے استحصال سہنے کے کنارہ پر رکھے جانے کے خلاف آگاہ کرتی ہے۔ کاشتکاروں کو قطعاً مجہول و طاقت سے محروم ماننے والوں کی دلیل پر سوالیہ نشان لگاتی ہے اور دلیل پیش کرتی ہے کاشت کار طاقت کی مخالفت بے شمار طریقوں سے کرتے ہیں اور جتنے طریقوں سے ہم سوچتے ہیں اس سے کہیں زیادہ طور پر مقابلہ کرتے ہیں۔

درخواست گزاری (petitioning) مخالفت کے بے شمار طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا۔ جب کاشتکار کی درخواست میں یا تو راحت/رعایت کے لئے اس میں درخواست ہوتی تھی یا پھر استحصال کے خلاف شکایت ہوتی تھی اور وہ ریاست سے اس کے خلاف اقدامات کی مانگ کرتے تھے۔ ان کی درخواست کی نوعیت شکایت یا مخالفت ہوتی تھی۔ درخواست میں مطالبہ کی عدم منظوری پر حریف کاروائی کی خفیہ دھمکی بھی پوشیدہ ہوتی تھی۔ عرضیاں مطالبات کو پورا کرنے یا شکایات دفع کرنے کے واسطے ریاست کے حسب منشا اور حسب گنجائش دونوں میں درخواست دہندہ کا اعتماد پہلے ہی سے لیکر چلتی ہیں۔

زیادہ تر درخواستیں ناانصافی کو حکومت کی نظر میں لانے کی کوشش کرتی ہیں کاشتکار مختلف قسم کی ناانصافیوں کے خلاف عرضیاں پیش کرتے تھے سب سے زیادہ عام عرضیاں محصولات کے بہت زیادہ مطالبات سے متعلق شکایات پر مبنی تھیں۔ کاشتکاروں پر روایتی محصولات کے علاوہ زائد دیگر ٹیکسوں کو تھوپنے کی اکثر

مخالفت کی جاتی تھی۔ عرضیوں میں عرضیوں کے مضمون پر توجہ دیۓ بغیر مسئلہ کی سنجیدگی اور عرضی گذار کی بے باکی دیکھنے کو ملتی ہے درخوستوں کا لہجہ کرخت کبھی نہیں رہا نہ ہی جارحانہ۔ عرضی گذاروں کے ذریعہ کبھی بھی اقتدار اور ماتحتی کے ڈھانچہ کے قانونی جواز پر سوال نہیں اٹھایا گیا۔ جسکی مخالفت کی جاتی تھی وہ تھی موجود رواجوں کی زیادتی۔ درخواست کے ذریعہ کاشتکار حاکموں سے روایتی فرائض کی بے تعصب اور مکمل انصاف کا مطالبہ کرتے تھے۔

درخواستوں کے مضمون میں ایک بہت دلچسپ حقیقت یہ ہے کی کہ شکایت کرنے کے بعد درخواست کنندہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کی عذر بالا کی زیادتی کی صورت میں ہمارا زندہ رہنا مشکل ہے ہم مزید گاؤں میں نہیں رہ سکیں گے اور گاؤں کو آباد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس بات پر زور دے کر کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتے یا گاؤں میں نہیں ٹھہر سکتے یا خوشحال نہیں ہو سکتے وہ ریاست کی دخل اندازی کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ درخواست دہندوں کی تباہی کی نتائج کے تئیں بھی ریاست کو ہوشیار کرتے ہیں۔

درخواست گذاری مخالفت ظاہر کرنے کی ایک عمدہ طرز اور مقبول عام طریقہ ظاہر ہوتا ہے یہ ممکنہ طور پر استحصال کے تئیں پہلی ابتدائی کاروائی اور حفاظت کا پہلا قدم بھی رہا ہوگا۔ اس میں کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ یہ اپنے بات کی سماعت کرانے کا تقریباً پوری طرح یقینی طریقہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں حاصل درخواستیں ان کے مضمون کی وسعت نیز گاؤں کے ایک ایسے طبقے کے ذریعہ درخواستیں دائر کرنا یہ سب ثابت کرتے ہیں کی مخالفت ظاہر کرنے کا ایک سب سے زیادہ مقبول اور موثر طریقہ تھا۔

کاشتکاروں کے ذریعہ محصول نہ ادا کرنا یا ادا کرنے سے انکار کرنا ایک صاف نافرمانی مانی جاتی تھی۔ ادائیگی کرنے سے انکار کرنے کی ہمت کرنے والے کاشتکاروں کو زور طلب/ بدعمل کہا جاتا تھا۔ اگرچہ ادائیگی نہ کرنا ضروری نہیں کہ ہمیشہ کھلی مخالفت کی شکل ہی اختیار کرتا۔ یہ صاف انکار کرنے سے لے کر کاشتکاروں کی اس پالیسی کے تحت سرگرمیوں کی مختلف شکلیں محسوس ہوتی ہیں۔ جو تاخیر، حیلہ سازی، پیداوار کی کمی کا اظہار کرنا اور منشا کے مطابق خم نہ ہونا وغیرہ کی شکل میں نظر آتا ہے۔ کاشتکاروں کے اس طرح کے سلوک کے لئے راجستھان کی دستاویزوں میں مختلف الفاظ کا استعمال نظر آتا۔ اوراجڑ (بچنا اور بہانے بنانا)، کوتائی (کم پڑ جانا)، ڈھیل (تاخیر)، سوکھی (غصہ دکھانا)، سکھن (مزاحمت)، ججتی (بحث)، سینہ زوری (عدول حکمی)، کہاوتی (جھگڑا)، حرام زدگی (قانونی حیلہ)۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ لگان ادا کرنے سے انکار، مخالفت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔

کوچ (ہجرت) اور چھوڑنے کرنے کی دھمکی

کاشتکار جب زبردست استحصال کو برداشت نہ کر پانے کی حالت سے مجبور ہو جاتے تھے تو وہ اپنے گاؤں سے کوچ کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے نیز یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ کبھی کبھی کاشتکار استحصال کے جواب میں کوچ کرنے کی دھمکی بھی دیتے تھے۔ مشرقی راجستھان سے دریافت 17 ویں صدی کے نصف آخر اور 18 ویں صدی کے دستاویز بتاتے ہیں کہ کاشتکار اپنے مفاد کی خاطر کوچ کی دھمکی کا استعمال کس طرح سے کر سکتے تھے۔ ان شواہد سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کچھ معاملوں میں کوچ یا کوچ کی دھمکی ایک حفاظتی کارروائی تھی نہ کہ جرأت و بے باکی کا ایک پیمانہ۔ اس بات کے کافی ثبوت دستیاب ہیں کہ بہت زیادہ مطالبہ کے جواب میں گاؤں کا چھوڑ کر جانا عام نہیں تھا اور جب بھی کبھی حقیقت میں کاشتکاروں کو نقل مکانی کرنا پڑی ہے ان کو مسلسل تسلی دی گئی ہے اور واپس بلا کر پرسکون کیۓ جانے کی کوشش کی گئی ہے۔ زمین فرد کا تناسب اور زراعت میں مسلسل ریاست کی دلچسپی کو ذھن میں رکھتے ہوۓ کوچ یا کوچ کی دھمکی کے لئے ریاست کی طرف سے مناسب کارروائی ہوتی تھی۔ کاشتکاروں کی وعدوں اور تسلیوں کے ذریعہ مطمئن کیا جاتا تھا۔ اور ان کی واپسی کی خاطر ان کو ٹھوس رعایتیں دینے کے واسطے یقینی وعدے کیۓ جاتے تھے۔

سبک (نکتہ رس) مزاحمت

مشرقی راجستھان سے دستیاب دستاویزوں کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاشتکار جن میں دولت مند طبقہ شامل تھا، فریب، حیلہ، دھوکہ اور خفیہ تعاون، سب کا سہارا لیا کرتے تھے، تاکہ وہ فصل کا حتی الامکان بڑا حصہ اپنے واسطے حاصل کر سکیں۔ اس سے ریاست کے مطالبہ اور سلوک میں حقیقی ادائیگی، دونوں کے درمیان تعلق کا سوال رونما ہوتا ہے۔ ایسی کارروائیوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس میں مکمل محصول کی ادائیگی سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے کھیت میں کھڑی فصلوں کا کٹوا دینا، پیمائش کے وقت فصل و زمین کا اخفاء، نقدی فصل، آبپاشی شدہ زمین کے تحت اپنے حقیقی رقبہ کو ظاہر نہ کرنا، ٹیکس ادا کرنے والوں کی صحیح تعداد کا نہ بتلانا۔ عمدہ اگی ہوئی فصلوں کو کم تر فصل کی شکل میں ظاہر کرنا۔ مطلوبہ شرح ٹیکس کے تعلق میں غلط اظہار کرنا، ناپے گئے علاقوں کے اعداد و شمار میں ہیرا پھیری اور عام شرح پر تخمینہ لگائی جانے والی جوتوں کو رعایتی شرح سے تخمینہ لگانے کے لائق قرار دینا۔ زیادہ قابل توجہ حقیقت یہ ہے کہ گاؤں کے سماج کے سبھی طبقے گاؤں کا مکھیا اور کاشتکاروں کا خصوصی مراعات یافتہ طبقہ، ریاست کو فریب دینے کے معاملوں میں شامل تھے۔ ان کارگزاریوں سے متعلق درج شدہ معاملے کاشتکار معاشرہ کے اندر باہمی موافقت، آپسی تعاون اور پوشیدہ تعاونوں کی نوعیت کی بیش بہا بصیرت مہیا کراتے ہیں۔ جو تنوع اور درجہ بندی سے دور ہے۔ دیہی معاشرہ کے سبھی طبقے سرکاری محصول کی ادائیگی کے واسطے لگان تعین سے دفاع کی خاطر مشترکہ مقاصد میں شامل لگتے ہیں۔ ریاست کو فریب دہی کے معاملے میں کاشتکاروں کے دولت مند طبقہ کی شمولیت یہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ اصل مقصد صرف بقا سے متعلق ضروریات کو پورا کرنے کے واسطے صرف بقائے زندگی کی سطح کو یقینی بنانا نہیں تھا بلکہ واضح طور پر ریاست کی قیمت پر شخصی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش تھی۔ مخالفت کی یہ آئے دن کی قابل برداشت شکل اس کاشتکار طبقے کے لئے جو رسمی طور پر منظم اور مختلف گاؤں کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے سماجی و معاشی، دونوں ہی طریقوں سے ہی درجہ بند تھے، سب سے زیادہ موافق تھی۔

17.9 زراعتی ڈھانچہ: دکن

دکن میں گاؤں رہائشی (پندھاری) اور زراعتی (کلی) دو حصوں میں تقسیم تھے۔ کسی وجہ سے خاندانوں کے ذریعہ متروک رہائشی علاقوں یا گھروں کو گٹ کھل گھر تھانہ، گٹ کل واڑا کہا جاتا تھا۔ زراعتی زمین کے علاقے بہت سارے تھالوں (زمین) میں تقسیم تھا۔ تھالوں کو پھر آگے شیت (چھیتر یعنی کھیت) میں بانٹا جاتا تھا۔ گاؤں کی چراگاہ زمین (عام استعمال) کو لوکا چاکورن/ گائران کہا جاتا تھا۔ جبکہ سرکاری چراگاہ کو سرکار چہ کرن کہا جاتا تھا۔ گاؤں کے باشندوں کو سرکاری چراگاہ سے چارہ کاٹنے کے لئے بیگار کرنی پڑتی تھی۔ پٹہ جوتوں کی نوعیت کی بنیاد پر قابل زراعت زمین کو چار اہم درجوں میں دوبارہ ضمناً تقسیم کیا جاتا تھا، جیسا کی شمالی ھندوستان میں بھی تھا۔ میراث یا تھلکاری (زراعتی پٹوں) انعام، سرکاری شیری، خالصہ زمین (ریاستی زمین)، گٹا گل زمین اور پٹ زمین (بنجر زمین)۔

گاؤں کا مکھیا (مقدم) گاؤں کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی ہوتا تھا۔ موروثی افسران طبقہ (وطن دار، پٹیل، کلکرنی، مقدم) کاشتکار زمین مالک (میراث) اور گاؤں کا خادم (بلوطہ دار) گاؤں معاشرہ کا حصہ تھا۔ وہاں باہری/ اجنبی/ اوپری (زمین سے محروم کاشتکار (tenants-at-will)، اکثر انکا مقام میراث دار سے نیچے ہوتا تھا۔ مگر وہ فیس (نذر دیکر) میراث دار کا درجہ حاصل کر سکتے تھے۔

گاؤں کے مکھیا کے گٹ کل زمین اور بنجر زمینوں پر حقوق تھے۔ وہ اسے منتقل بھی کر سکتے تھے۔ ایک گروپ کی شکل میں گاؤں یعنی گرام سبھا کے پاس انعام کی شکل میں بنجر زمینوں کی فروخت کرنے کا حق موجود تھا۔

میراث دار روایتی طور پر کاشت کار کا زمین مالک تھا۔ وہی گاؤں کے اصل باشندے تھے۔ زمین پر ان کا حق تب تک ختم نہیں ہو سکتا تھا جب تک کی وہ اپنی زمین کو فروخت نہ کر دیں یا تحفہ میں نہ دے دیں۔ یہاں تک وہ میراث دار جو گاؤں کو چھوڑ دیتے تھے، زمین پر انکا حق بھی باقی رہتا تھا۔ ان کا تذکرہ دستاویزوں میں گٹ کلی کی شکل میں ملتا ہے۔ گرام سبھا اور گوٹ سبھا میں وہ متحرک کردار نبھاتے تھے۔ ان کا علامتی نشان ھل سبھی فیصلوں (محضر) پر لگایا جانا ضروری تھا۔ کچھ معاملوں میں صرف متعلقہ بلوطے دار کو ہی گوٹ سبھا میں حاضر ہونے کے واسطے بلایا جاتا تھا۔

بلوطے دار

گاؤں کے خادموں کو بلوطے دار کہا جاتا تھا۔ روایتی طور پر ان کی تعداد بارہ ہوتی تھی اور وہ بارہ بلوطہ کہلاتے تھے۔ مگر شروع میں یہ تعداد ممکن طور پر صرف پانچ تھی اور ان کو پنچ کاروک (کہار، لوہار، بڑھئی، نائی، و دھوبی،) کہا جاتا تھا۔ بلوطے کی تعداد گاؤں کے سائز اور گاؤں کی ضرورت کے لحاظ سے جدا جدا ہوتی تھی۔

روایتی طور پر بلوطے داروں کو ان کی آمدنی اور خدمات کی بنیاد پر جو وہ گاؤں کو فراہم کراتے تھے مجتمع کیا جاتا تھا۔ ان کی آمدنی (کاس) کی بنیاد پر ان کو تین درجوں (صفوں) میں رکھا جاتا تھا (1) تھورالی کاس (اہم صف) میں سوتر (بڑھئی) لوہار، مہار (گاؤں کے چوکی دار و دیگر نچلے درجہ کا کام کرتے تھے) اور مانگ (چمڑے کی رسی بنانے والے) آتے تھے۔ (2) مدھالی کاس (درمیانی صف) میں کمبھار (کمہار) چمبھار (موچی) (پاریت) دھوبی نیز نہاوی (نائی) آتے تھے اور (3) دھکتی کاس میں تھے بھاٹ (بارد) ملانا (مسجد گاؤں کے مسلم طبقہ کا خادم)، گرو (مندر کے پجاری) کولی (پانی ڈھونے والے) سونار/ پوت دار (سنار) جوشی (گاؤں کا جیوتشی) نیز راموشی (گاؤں کا محافظ)۔

خدمات کی بنیاد پر ان میں عمومی طور پر شامل تھے (1) گاؤں کے کاشتکار اور پیشہ ور لوگ (2) گاؤں کے عام خادم اور (3) مذہبی خادم۔ ان کی خدمات کے عوض فصل کٹائی کے وقت اناج (بلوطہ) متعین مقدار ملتی تھی۔ جب کہ کچھ کو (مہار وغیرہ) انعام میں زمین بھی دی جاتی تھی۔ بلوطہ داروں میں مہار طبقہ بہت بڑا تھا۔ کمیونیٹی کے ذریعہ منتخب شدہ مکھیا مہتر مہار کہلاتا تھا جو کمیونیٹی کے فلاح عام کے کام دیکھتا تھا۔ اپنی خدمات کے عوض پورے مہار وطن کے 9/1 حصے کے حق دار تھے جس میں غلہ، وظیفہ اور عطیات وغیرہ شامل تھے۔ وطن دار بلوطوں (نسلی) اور اوپری (اجنبی) بلوطوں کے درمیان واضح فرق تھا۔ یہ اوپری بلوطے دار عام طور پر مہاجر خادم ہوتے تھے جو ضرورت کے مطابق جگھوں کو بھرنے کیلئے آمادہ ہوتے تھے مگر ان کی خدمات کے لئے ادائیگی (نقد یا اشیاء کی شکلوں میں) کرتے وقت ایک وطن دار یا اوپری بلوطے کے درجے میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اے۔ ایس۔ الٹیکر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ چونکہ وہ کمیونیٹی کی ضروریات کی تکمیل میں مصروف تھے ان کو نان نفقہ کی ضمانت فراہم تھی۔ مگر بہتر معاش کی تلاش میں نقل مکانی کرنے کی اجازت حاصل نہ تھی۔ اس طرح الٹیکر کے ذریعہ ترقی کے پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کو دیہی کمیونیٹی کے خود کفیل اور خود مرکب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ علم معاشرہ اور علم انسانیت کے ماہرین (میکس ویبر، ڈبلیو۔ ایچ، وائزر، کارل مارکس، بیڈن پاویل) نے اس رشتے کو ججمان اور ججمانی حق کی شکل میں واضح کیا ہے ان کی خدمات کی ادائیگی کے خالق کا طریقہ {(Demiurgic) گاؤں کے غلام (serf) جنکو ان کی اپنی خدمات کے واسطے مزدوری نہیں دی جاتی تھی} کہا ہے۔ آر۔ ایس۔ شرما کا بھی یہی خیال ہے کہ شہری مرکزوں کی تہذیب کے زوال کے ساتھ ہی کافی تعداد میں کاشت کار دیہاتی علاقوں میں ہجرت کر گئے جس سے ججمانی رشتوں کا ظہور ہوا۔ مگر فو کازاوا اور اے۔ آر۔ کلکرنی دونوں ہی ججمانی نظام قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بلوطے دار (پجاری کے علاوہ) خاندان خصوصی سے نہیں مقرر کئے جاتے تھے بلکہ وہ پورے گاؤں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان کو حق لوازمہ (شرط لازمی) یا مان پان (خصوصی حق) کی شکل میں معاوضہ بھی ملتا تھا، اور یہ بلوطہ وطن نہ صرف موروثی ہوتے تھے بلکہ منقولہ بھی ہوتے تھے نیز ان کو فروخت بھی کیا جاتا تھا۔ اے۔ آر۔ کلکرنی نے ان کے لئے گرام سیوک یا گرام بھرتک لفظ کا استعمال کیا ہے جسکا استعمال روایتی طور پر ان کے لئے ادبی ماخذوں میں کیا جاتا تھا۔

ان بلوطہ داروں کے علاوہ بارہ الوتوں کے بارے میں بھی تذکرہ ملتا ہے۔ گرانٹ ڈف الوتے داروں کا ذکر نارو اور بلوطے داروں کا ذکر کاور کی شکل میں کرتے ہیں مگر فو کازاوا اور کلکرنی کا ماننا ہے کیوں کی برطانوی زمانہ میں سے قبل کے مراٹھا دستاویزوں میں ہمیں الوتہ لفظ نہیں ملتا۔ یہ لفظ بلوطہ لفظ کے استعمال کی وسعت میں ایک متبادل لفظ بنا لیا گیا ہے۔ یہ جاننا بہر حال میں باعث دل چسپ ہوگا کی روایتی طور پر انھیں پنچ کاروک کے نام سے انھیں مخاطب کیا جاتا تھا اور اس دوہری تقسیم کا تذکرہ ہم کو عموماً عہد وسطی سے قبل ملتا ہے (مزید تفصیل کے لئے سیکشن 12.6 دیکھیں)۔

17.10 زراعتی ڈھانچہ: جنوبی ہند

جنوبی ہند میں گاؤں عموماً ذات برادری/ پیشوں کی بنیاد پر بہت ساری آبادی کے حصوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ ہمیں پاندچیری (پرائیوں کے لئے) کمنچ چیری (کملاؤں کے لئے) کوڈی ایروکائی (کڈی کے لئے) کنار چیری (دھوبیوں کے لئے) وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے

جنوبی ہند میں گاؤں کی سطح پر سبھا/ سبھئی اور ار ہوا کرتی تھیں۔ سبھا عموماً برہم دیہ گاؤں سے متعلق ہوا کرتی تھی اور غیر برہم دیہ گاؤں میں موجود تھی یا پھر کم سے کم ایسے گاؤں میں جہاں پر کہ برہمنوں کی دوسری طرح سے قبضہ نہ ہو۔ جیسے برہمن دیہ گاؤں کا عطیہ حاصل کرنے والا صرف اکیلا آدمی ہو تو وہ ایک بھوگا (بلکہ اکیلے آدمی کے لئے مناسب زمین) کہلاتا تھا اور اگر کسی برہمن گاؤں میں زیادہ عطیات وصول کنندہ ہوتے تھے تو اس کو گن بھوگا (یعنی ایک گن/ گروہ (جماعت) کے مستعمل زمین) کہنے کا دستو تھا۔ چونکہ گن بھوگا گاؤں پر حکومت/ شرکت اجتماعی طور پر ہوتی تھی۔ ان کی تنظیم کو سبھا اور اسکے شرکاء کو ودوان مہاجن یا مہاجن کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ چتر ویدی منگلم (Caturvedimangalam) برہن دیہ گاؤں ایک مرکزی گاؤں کی شکل میں متعارف ہوا کرتا تھا جسکے ساتھ بہت سارے چھوٹے گاؤں وابستہ ہوتے تھے اور ہر گاؤں حصوں میں منقسم تھا۔

سبھاؤں کے پاس گاؤں کی زمینوں کو اکتساب کرنے یا فروخت کرنے کا اختیار تھا۔ وہ ممکن طور پر گن بھوگم یا سمودایم (جہاں ملکیت کا حق عمومی ہوتا تھا) گاؤں میں کارگذار تھی اور کام گاؤں کی کمیونیٹی کے تحت انجام دیا جاتا تھا۔ مندر انتظام سے متعلق ''پرو داری'' بھی عموماً گرم سبھاؤں کے تحت کام کرتے تھے اور ''ارور'' بھی لگان وصول کرنے کا کام انجام دیتے تھے۔ جو سرکاری خزانہ میں جمع کیا جاتا تھا۔ اس طرح وہ لگان وصول کرنے کے لئے سرکار کے ایجنٹ کی شکل میں بھی کام کرتے تھے۔ وقت پر زمینوں کے لگان جمع نہ کر سکنے کی صورت میں سبھا کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ زمین مالکوں/ کاشتکاروں کو زمین سے محروم کر سکتی ہے۔ اسکے قبضہ میں کچھ اسطرح کے مقامی ٹیکسوں کو لاگو کرنے یا معاف کرنے بھی اختیار تھا جن کو مجتمع کرنے کا اختیار سبھا کا ہوتا تھا۔ سرکار کی اجازت بغیر وہ ریاستی خزانہ سے متعلق یا منسلک کسی ٹیکس کو نہ لاگو کر سکتی تھی اور نہ ہی معاف کرنے کی مجاز تھی۔ مگر یہ مقامی تنظیم کافی با اثر تھی اور ریاست ان کی رضامندی کے بغیر کوئی ٹیکس نافذ یا معاف نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی ''ارور'' بھی سرکاری زمین کے پٹے داروں کی شکل میں کام انجام دیتی تھی۔

یہ تنظمیں مقامی طور پر لوگوں کو انصاف فراہم کرانے کا کام بھی انجام دیتی تھیں اور مجرموں کو سزا دینے کی بھی مجاز تھیں۔ بوقت ضرورت یعنی موقع محل کے لحاظ سے وہ مجرموں یا قصوروار شخص سے اسکی زمین بھی سلب کر سکتی تھیں۔ انہیں مندر کی زمین کو بھی تصدیق دینے کا اختیار حاصل تھا اور کبھی کبھی ان کے پاس مندروں کی شرکت میں زمینیں ہوا کرتی تھیں جیسے تالاب وغیرہ۔ وہ عوامی زمینوں، مذہبی اور رفاہی عطیات کے بھی سرپرست ہوا کرتے تھے۔ بکا دوئم کے عہد حکومت میں راسپا، چن نپا نام کے ایک تاجر کے بیٹے نے بھگوان کال دیو کو بنجر زمین کا ایک قطع عطیہ میں دیا تھا۔ اس جوت کا ذمہ دار مہاجنوں کو بنایا گیا۔ اسی طرح کی سبھا وجے نگر عہد حکومت میں بھی فعال رہی ہے اور مخصوص طاقت کا استعمال کرتی رہی جیسا کہ وہ چولوں کے ماتحت کرتی رہی تھی۔

ایک دوسری نیم خودمختار سبھا تھی- ناڈو۔ اگرچہ اسکے پاس تقریباً ویسے ہی اختیارات تھے۔ اسکا دائرہ کار ''سبھا یا اُر'' کے برعکس زیادہ وسیع تھا۔ اس کے ممبران کو نٹار/ نٹاور یا پیر یانٹار، تندیری نئی (تیلگو علاقے) اور کرناٹک کے علاقوں میں اوکوہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تمل ریکارڈوں میں نٹاوروں کے ذریعہ وصول کئے جانے والے ٹیکسوں ''نٹو ونی یوگم''، نٹو کنی کئی اور نٹایم وغیرہ کے تذکرے ملتے ہیں۔ اگرچہ چول عہد حکومت میں نٹاور عام طور پر ویلال زمین مالک تھے۔ وجے نگر عہد میں ہمیں ملتا ہے کہ اس زمانہ میں تاجروں، دستکاروں، وغیرہ متفرق گروپوں کے لوگ اس میں شامل تھے۔ کے۔ وی۔ کے۔ وی۔ سبرامنیم، وینکٹ رام نیا، ٹی۔ وی۔ مہالنگم اور نوبورو کراشما کی دلیل ہے کہ ان جماعتوں نے وجے نگر عہد حکومت میں اپنی طاقت رفتہ رفتہ ختم کر دی تھی۔ مگر اے کرشنا سوامی کا خیال ہے کہ انہوں نے درحقیقت سبھا اور اُر نیز ناڈو کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا۔ البتہ انہوں نے ان قدیم اداروں کو اس وقت دوبارہ زندگی بھی نہیں بخشی جب انہوں نے کام کرنا بالکل بند کر دیا تھا۔ ''جاگیردارانہ اور فوجی تنظیم'' وجے نگر کے بہادروں اور دشمنی انتہائی مرکوز جاگیرداریت اور متبادل مقامی سوسائیٹیوں ''نایتکر'' اور آئیگر طریقۂ کار کی ترقی۔ لیکن سالے ٹور کا خصوصی طور پر خیال ہے کہ یہ تنظمیں ابھی حال تک قائم رہیں۔ مہالنگم بھی اس رجحان کے

زوال کے پیچھے اہم سبب جزوی جاگیردارانہ اور جزوی فوجی، بنیاد مانتے ہیں۔ حالانکہ ان کی دلیل ہے کہ ان کو ختم کرنے کے لئے وجے نگر کے حکمرانوں کی جانب سے قصداً کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کا ماننا ہے کہ آئنگر طریقہ کار کا ترقی اور مقامی علاقوں کی حکومت کے لئے سرکار کے تئیں جوابدہ افسران کی براہِ راست تقرری نے ہی مقامی پہل اور خودمختاری کی حقیقی بنیادوں کو آہستہ آہستہ نقصان پہنچایا ہوگا اور گاؤں کی جمہوریتوں کی آزادی کا گلا گھوٹ دیا۔ نوبیرو کاراشما (2001) مہالنگم سے اتفاق کرتے ہوئے اس علاقے میں نائنک حکومت کی منظم ہوتے رجحان پر زور دیتے ہیں۔ نائکوں نے 16 ویں صدی کے آغاز سے اپنے نجی ایجنٹوں کے ذریعہ اپنے علاقے میں حکومت شروع کی۔ 16 ویں صدی میں تامل ناڈو میں نٹو ونی یوگم، نٹو کیدکائی اور نٹائم جیسے ٹیکسوں کے ارتکاز سے متعلق کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔ اسکے برعکس نوبیرو کی دلیل ہے کہ علاقائی اکائیوں کے شکل میں ناڈوں کا زوال عام طور پر پیٹی (نیا تجارتی مرکز) نیز نیکوٹ نموں (راست حکومت کرنے کے لئے وجے نگر کے حکمرانوں کے ذریعہ نائیکوں کو دان کی شکل میں دئے گئے علاقے) کے قیام کا انجام بھی ہوسکتا تھا۔ حالانکہ نٹاوروں کا استعمال ہوتا رہا مگر پرو (Parru) ہی موثر اقتدار اکائی بن گئی۔ 17 ویں صدی ہمیں 18 پرو (Parru)، 17 پرو کے حوالہ اکثر ملتے ہیں۔ 15 صدی کے دوران نائیکوں اور نٹاوروں کے درمیان جھگڑے مسلسل ہونے لگے۔ نٹاور ٹیکس کا بوجھ کم کرنے کے لئے کاشتکاروں کے حقوق کی نمائندگی کرتی تھی۔

13 ویں 14 ویں صدی میں جنوبی ہند میں غیر برہمن زمینداروں کا ایک اور طبقہ ابھرا جو اپنی زمین پر اڈی مئی (غلاموں) اور کڈی (زمین سے محروم کاشتکاروں) سے کھیتی کراتا تھا۔ یہ علم نہیں ہے کہ اڈی مئی یا اڈیار کس قسم کی خدمات دینے کا کام کرتے تھے۔ ممکن طور پر پرے یار اور پلیاز راعتی مزدوروں کی شکل میں کام کرتے تھے جب کہ ویلال گھریلو نوکروں کی شکل میں کام انجام دینے والے لوگ بھی کام میں مصروف تھے۔ کڈیا میرو (کاشتکاروں کی مدد سے زمین کی نوآبادکاری) کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ کڈی گل زمین سے محروم کاشتکاروں کی شکل میں مندر تنظیم کے ہدایت کے تحت مندر کی زمین کو جوتتے تھے۔ 15 ویں صدی کی شروعات میں کاشتکار بغاوت کے کے موقع پر زمین زیادہ تر زمینداروں (Kaniyalar) کے پاس تھی جو اس کے عوض اس کو زمین سے محروم کاشتکاروں (Kudi/Kudigal) کو لگان پر دیدیا کرتے تھے۔

اس طرح کاشتکار اپنی نجی زمین پر کھیتی کرتے تھے اور غلام مزدوروں (اڈی مئی یا زمین سے محروم کاشتکاروں/(Kudi/Kudigal) میں سے کسی ایک کو لگان پر دیکر) کی مدد سے بھی کھیتی کرواتے تھے۔ وجے نگر عہد حکومت کے آخری برسوں میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے کہ نائنک بھی مندر کی زمین کے پٹے داروں کی صورت میں ابھر رہے تھے۔ ہمارے عہد میں پٹے داروں کی شکل میں ایک اور طبقہ سامنے آیا۔ تجارتی طبقہ یعنی چیٹی (Chettis) پٹے داروں کی کئی شکل جس کا ظہور ہمارے عہد میں تجارت میں تیز رفتاری اور کاروبار میں اچھے اثرات چھوڑتا دکھائی دیتا ہے، سامنے آیا۔ کارشیما کا ماننا ہے کہ اس رجحان سے زراعت کے رشتوں میں گہری تبدیلی رونما ہوئی۔ اس نے 13 ویں 14 ویں صدی میں برہمن زمینوں (برہمدیا) کے زوال اور ان کی فروختگی کے طرف رجحان کیا۔ حالانکہ ان کی کمزوری کا فوری سبب وجے نگر کے حکمرانوں کے ذریعہ لاگو ٹیکسوں کا بھاری بوجھ تھا۔ کارشیما کے مطابق زراعت میں تبدیلی خاص طور پر زرعی معاشرہ میں تفریق کے حوالے سے بھی دیکھنا چاہئے۔ یہ زمینیں زیادہ تر غیر برہمنوں کے ذریعہ خریدی گئی تھیں۔ جو کہ چول حکومت کے آخری ایام میں نچلی کاویری وادی و دیگر علاقوں کے لئے مقامی دلکشی بن گئی تھی۔ نائکوں کے ذریعہ ایجنٹوں کو کاموں پر لگا کر اپنے علاقوں میں پیداوار پر کنٹرول سے متعلق ان کی کوششوں نے بھی نٹاوروں کی حیثیت و حالت کر متاثر کیا ہوگا۔

برٹن اسٹائن کی دلیل ہے کہ تمل علاقوں میں ہوئی تبدیلیوں کی طرح ہی کرناٹک کے علاقوں میں بھی مقامی ادارے تبدیل ہوئے۔ اسٹائن اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لاحقہ رٹا وڑے (ساڑھے سات لاکھ گاؤں) اور گنگا وڈی (96,000 گاؤں) مقامی کھیاؤں کے تحت نسلی اعتبار سے متعارف علاقے کی اکائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں کرناٹک کا آئنگر نظام زیادہ وسیع ہوا یعنی پورے تمل علاقے (Macro-region) میں۔

آئنگر

شمالی ہند کے گاؤں خادموں (Village Servents) اور دکن ومہاراشٹر کے بارہ بلوطوں (Bara balutas) کے طرز پر ہی جنوبی ہند میں جو گاؤں تنظیم عہد وسطی میں ظہور میں آئی اسے آئیگر کے نام سے موسوم ہوا۔ جس نے چول عہد کے ارکی اہمیت کو پس منظر میں پہنچا دیا۔ یہ ایک بارہ اہل کاروں (جیسے بلوطہ) کی تنظیم تھی۔ این۔ وینکٹ رمنیا آئیگروں کی فہرست میں خاص طور پر کرنم/ سینا بھو، گوڈا/ ریڈی، تلاری، دھوبی جوتا ساز، نائی، بڑھئی، سنار، جو کہ فصل کٹائی کے دوران غلہ تولا کرتا تھا، پروہت جو کہ ہل چلانے اور فصل کٹائی کے لئے گاؤں کی مذہبی رسموں کے لئے مبارک تاریخیں متعین کرتا تھا، سقہ جو کہ کھیتوں کو پانی کی سپلائی یقینی بنانے کا ذمہ دار تھا، کمہار، اور لوہار کو شامل کرتے ہیں۔ یہ گاؤں کی خدمت کی شکل میں کام انجام دینے پر مامور تھے مگر ان سے کرنم (جس کے پاس ان سب کا ریکارڈ محفوظ ہوتا تھا) گوڑا اور تالاری (گاؤں کا چوکیدار) کے علاوہ ریاستی امور سے کوئی بھی باضابطہ متعلق نہیں تھا۔ کرنم، ریڈی کے تعاون سے گاؤں کا لگان وصول کرنے کا کام بھی انجام دیتا تھا وہ رعیت سے جوڑی (Jodi) وصول کر کے سرکاری خزانہ میں جمع کرتے تھے۔

ان کو گاؤں کی زمین میں سے کچھ قطعہ آراضی بھی عطا کیے جاتے تھے جس پر ان کا نسلاً اختیار ہونے کا دستور تھا۔ جو کہ ''میراثی'' کہلاتا تھا اور بدلے میں جوڑی کے شکل میں لگان ادا کرنا ہوتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے وقت کے علاوہ جیسا کہ مہاراشٹر کے معاملہ میں ہے ان کو رعیت کے ذریعہ سے گاؤں کے رواجوں کے مطابق پیداشدہ اناج کی ایک خاص مقدار بھی ملنے کا دستور تھا۔ جس کو ان کی زبان میں میٹرا (Mera) کہا جاتا تھا۔ ان کا عہدہ موروثی اور مستقل ہوتا تھا۔ ان کے اختیارات پر اختلاف کی حالت میں ریاست دخل اندازی کرتی تھی۔ وہ بوقت ضرورت اپنے اختیارات کو فروخت کرتے یا رہن رکھنے کے بھی مختار تھے۔ ان کو ٹیکس سے آزاد عطیہ منیم Manyam بھی حاصل ہوتے تھے۔ جو ان کی خدمات کے عوض مستقل حق کے طور پر حاصل ہوتا تھا۔ جیسا کہ مہالنگم کا خیال ہے کہ ان گاؤں کے اہل کاروں کے علم میں لائے بغیر نہ تو کسی زمین یا جائداد کی منتقلی ممکن تھی اور نہ ہی کسی کو عطیہ دیا جا سکتا تھا۔ زمین کی فروختگی بھی انہیں اہل کاروں کی جانکاری پر منحصر تھی۔ اے۔ کرشنا سوامی کی دلیل ہے کہ تمل علاقوں میں یہ نظام بالکل نیا تھا۔ لیکن برٹن اسٹائن کا ماننا ہے کہ تمل علاقے میں گاؤں کے کھیا اور دستکاروں وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں۔ ان کے مطابق تمل ناڈو میں جو ایک نئی علامت تھی جو کہ اس سے قبل کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی وہ ان مخصوص لوگوں کی گاؤں کے پٹوں کی شکل میں دیئے جانے والا تعاون وحمایت جو کہ اس سے قبل شاید کبھی بھی موجود نہیں تھا۔ ویسے آئیگر طریقہ کار جو کرناٹک میں عموماً ایک قیمتی زمین پر عرصہ دراز تک قائم رہا تمل ناڈو میں یہ روایت 15 ویں صدی اور 16 ویں صدی میں جس کی ابتدا ہوئی جو کہ مضبوط زمیندار اور گاؤں کی خدمات انجام دینے والوں کی تقابلی طاقت میں تبدیلی کو ظاہر کرتی تھی۔ مقامی قیادت کی اس نئی بنیاد نے ایک فیصلہ کن طور پر سابقہ مالک۔ آسامی رشتوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اس عمل نے اس وقت زمین نظام میں بہت اہم تبدیلیوں کی جانب مائل کیا۔

مگر نوبورو کرشانے برٹن اسٹائن کے قول پر شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ تمل علاقے میں 15 ویں صدی میں شروع ہو گئی۔ ان کو اس پر شبہ ہے کہ یہ تمل علاقے میں وجیانگر عہد حکومت میں یا اس کے بعد میں شاید ہی کبھی شروع کیا گیا ہو۔ ان کا خیال ہے کہ انھیں کسی بھی تحریر میں ''آئیگر'' کا تذکرہ نہیں ملتا۔ کرشا کی دلیل ہے مہالنگم کے ذریعہ منقول تاریخ بھی کنڑ کتبات سے اخذ کی گئی ہے نہ کہ تمل کتبات سے ماخوذ ہے۔

17.11 خلاصہ

انتظامیہ اور محصول کے مقصد سے گاؤں ایک بنیادی اکائی ہی رہا۔ اس نظریہ کا کہ عہد وسطی کے گاؤں غیر متبدل اور غیر درجہ بند آبادی یا عوام کی قیادت کرتے تھے، شاید ہی یہ کسی بنیاد پر یہ بات سوچی سمجھی گئی ہو۔ دیہی کمیونیٹی، ذات وبرادری اور پیشوں کی بنیاد پر بڑے پیمانے پر درجہ بندی تھی۔ اگر چہ ریاست کی فکرو تشویش کا موضوع، زراعتی پیداوار کو یقینی بنانا تھا۔ ہمارے محفوظ ریکاڑ کاشتکاروں کی ہجرت اور ہجرت کے دھمکیوں سے معمور ہیں۔ زمین دار، کاشت کار اور ریاست کے درمیان اہم کڑی کا کام انجام دیتے تھے وہ دوہرا کردار نبھاتے تھے ایک طرف استحصال کرنے والے تو دوسری طرف وقت پڑنے پر محصول افسران اور جاگیرداروں کے استحصال کے خلاف وہ کاشتکاروں سے ہاتھ ملانے کے قائل تھے۔ دکن اور جنوبی ہند میں گاؤں کے خادم (بلوطے دار /آئیگر) دیہی سماج کا ایک اہم حصہ تھے۔ مگر گاؤں کے ساتھ ان کے تعلقات کا مقابلہ ججمانی حقوق سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں جنوبی ہند میں زراعتی تعلقات میں آئی ڈرامائی تبدیلیوں سے ظاہر ہیں۔ اس زمینی حصہ کی بڑھتی خوشحالی اور تیلگو جنگجوؤں (پولی گار/ نائک طبقوں کی بڑی پیمانے پر ہجرت، برہم دیہ زمینوں کے زوال میں رونما ہوئی جس سے وسیع طور پر غیر برہمن کاشتکار فیضیاب ہوئے۔

17.12 مشقیں

(1) عہد وسطیٰ کی دیہی کمیونیٹی سے متعلق مختلف نظریات کا تذکرہ کیجیے؟

(2) عہد وسطیٰ میں دیہی کمیونیٹی کے تناظر میں اقتدار کے اصول کو واضح کیجیے؟

(3) 'عہد وسطیٰ کی دیہی کمیونیٹی غیر متبدل اور غیر درجہ بند عوام کی قیادت کرتی تھی' تبصرہ کیجیے۔

(4) عہد وسطیٰ میں کاشتکاروں کی حالت پر بحث کیجیے؟

(5) عہد وسطیٰ میں کاشتکاروں کے مختلف درجات کی موجودگی کا تنقیدی تجزیہ کیجیے؟

(6) عہد وسطیٰ میں دیہی سماج میں قرض کی اہمیت اور اس کے اثرات کا تذکرہ کیجیے؟

(7) زمینداروں اور بھومیاؤں کے حقوق اور ان کی لازمی شرائط پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟

(8) شمالی ہندوستان کے زراعتی ڈھانچہ کا تقابل دکنی اور جنوبی ہندوستان کے زراعتی ڈھانچہ سے کیجیے؟

(9) عہد وسطیٰ میں دکن کے دیہی سماج کی اہم خصوصیات کا تذکرہ کیجیے؟

(10) عہد وسطیٰ کے جنوبی ہند میں دیہی سماج کے بدلتے پیٹرن کا تنقیدی جائزہ لیجیے؟

اکائی 18 غیر زراعتی فصلیں

ساخت

18.1 تعارف
18.2 زراعتی صنعتیں
18.2.1 کپڑا
18.2.2 ریشم
18.2.3 نیل
18.2.4 گنّا
18.2.5 تیل کی پیداوار
18.3 دھاتیں
18.3.1 سونا و چاندی
18.3.2 ہیرے اور قیمتی پتھر
18.3.3 تانبہ
18.3.4 لوہا
18.4 معدنیات
18.4.1 نمک
18.4.2 شورہ
18.5 تعمیر عمارات (فن تعمیر)
18.6 دیگر دستکاریاں
18.7 دستکاری پیداوار کی تنظیم
18.7.1 آزاد دستکاری پیداوار
18.7.2 دادنی
18.7.3 کارخانے
18.7.4 مشاہرہ/اجرت
18.7.5 دستکاریوں کی مہارت
18.7.6 ٹیکنالوجی اور اوزار
18.7.7 دستکاری کی حرکت پذیری
18.7.8 عہد وسطیٰ کی خواتین اور دستکاری پیداوار
18.8 اجارہ داری
18.9 بحث و مباحثہ
18.10 خلاصہ
18.11 مشقیں

18.1 تعارف

عہدِ وسطیٰ میں دستکاری کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے فرانسس برنیر (58-1656) تذکرہ کرتے ہیں کہ 'یہ دستکاریوں کے فنون کی سرپرستی میں لگے لوگوں کی نااہلیت کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ پورا ہندوستان اختراع پسند لوگوں سے معمور ہے۔ اوزاروں سے محروم افراد کے ذریعہ بنائے گئے کاریگری کے خوبصورت نمونے کی مثالیں کافی مقدار میں ملتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے کسی ماہر فن سے تربیت نہ حاصل کی ہو۔ گاہے بگاہے وہ لوگ یوروپی دستکاری کی نقل اتنی خوش سلیقگی سے کرتے ہیں کہ اصل اور نقل کے درمیان بھی فرق مشکل ہی سے واضح ہوتا ہے۔ استعداد کا فقدان اس کی وجہ نہیں ہے کہ ممتاز فن کاری کے نمونے راجدھانی میں نہیں دکھائی دیتے۔ اگر فنکاروں اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تو فائدہ منداور اعلیٰ فنون مزید پروان چڑھتے مگر ان بدنصیب لوگوں سے نفرت کی جاتی ہے، بے رحمی کا سلوک کیا جاتا ہے اور ان کو مزدوری ناکافی مقدار میں ادا کی جاتی ہے۔ دولت مندان لوگوں سے ان کے ذریعہ تیار شدہ چیز کو کم قیمت اور سستے داموں پر ہی خریدنے کا متمنی رہتا ہے'۔

برنیر کا قول دو بنیادی فرق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (ا) دستکاروں کی کوئی کمی نہیں تھی اور ان کی عمدہ کارکردگی کی یوروپ میں ان کے ہم پیشہ افراد کے ساتھ برابری کی جا سکتی ہے۔ اور (ب) ان کے اوزار بہت ہی سادہ تھے۔ ان کو کم مزدوری ملتی تھی اور ان کی حالت قابل رحم تھی۔ اپنی بحث کے درمیان ہم ان متعلقہ موضوعات پر روشنی ڈالیں گے۔ ایک اور مدعا شاید سب سے زیادہ مشکل غیر زراعتی پیداوار کی نوعیت اور اس کا پیٹرن ہے۔ وہ منجمد تھا یا ترقی پذیر؟ وہ پیداوار کے سرمایہ کارانہ شکل کی رہنمائی کرتا ہے یا پھر نیم سرمایہ کارانہ؟ ان سوالات کا جواب دریافت کرنا اتنا سہل نہیں ہے خصوصاً اس معنی و روشنی میں۔ اس میدان میں ہمارے پاس تخمینے برائے نام اور بالواسطہ ہیں۔ یہ جاننا بھی باعث دلچسپی ہوگا کہ ہم عہدِ وسطیٰ کے دستکاروں کو کس خانہ میں رکھتے ہیں۔ شہری یا دیہاتی یا شہری دیہی۔ ہم جانتے ہیں کہ پیداوار کے عمل میں شامل دستکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہونا ضروری نہیں کہ صرف شہری مرکزوں میں مرکوز ہوں۔ ہم متعلقہ دستکاری کے واسطے تکنیکی تربیت کے موضوع پر تفصیل سے کورس کی اکائی 23 میں بحث کرنے جا رہے ہیں۔ یہاں ہمارا زیادہ زور تیار شدہ مال/ دستکاری عمل، اس پیداوار کے طریقۂ عمل میں شامل افراد اور پیداوار کی تنظیم پر ہے۔ مگر ہم نے فی الحال دستکاروں کی سماجی حالت پر بحث ترک کر دی ہے۔ اس موضع پر ہم سبق ایم۔ ایچ۔ آئی۔ 06 میں تفصیل سے پڑھیں گے۔ اس کے علاوہ ہم نے اس میں ایسی پیداوار بھی شامل کی ہیں جو کہ زراعت سے غیر متعلق ہیں۔ اس کے ہمراہ وہ اشیاء بھی جن کے لئے خام مال زراعت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر بازار میں فروختگی سے قبل ان کو بھی آراستہ کیا جاتا تھا۔ پیش نظر اکائی نہ صرف پیداوار پر بلکہ اس کے تخلیق کاروں۔ دستکاروں پر بھی توجہ مرکوز کرتی ہے۔

18.2 زراعتی صنعتیں

آئیے ہم اپنی بحث کا آغاز ان دستکاریوں سے کرتے ہیں جو کہ خام مال کے واسطے زراعتی پیداواروں پر منحصر تھیں۔

18.2.1 کپڑا

کپڑے کی صنعت کو پورے عالم میں قبل صنعتی زمانہ کی 'گراں صنعت' کہا جا سکتا تھا۔ لاعلمی کے دور سے کپڑے کی صنعت کو ہندوستان کی دستکاری میں اولین مقام حاصل رہا ہے۔ کپڑے کی پیداوار (Production) پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ پلسارٹ تذکرہ کرتا ہے کہ چاباس پور (شہباز پور) اور سونار گاؤں (مشرقی بنگال) سے لیکر جگن ناتھ (پوری) تک سبھی کی معاش کا اہم ذریعہ بنائی صنعت ہی تھی۔ تقریباً ہر قصبہ/شہر بنکروں سے معمور تھا۔ 1620 کی دہائی میں صرف مسولی پٹنم میں 7000 ہزار بنکروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ 1640 کے دہے میں بنارس میں ان کی اتنی ہی تعداد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خام مال سے نزدیکی اور عمدہ نقل وحمل سہولیات، عہدِ وسطیٰ میں کسی کپڑے کے مرکز کو ترقی دینے کے واسطے اہم بنیاد تھے۔

مگر مطالبہ میں اضافہ کے سبب بنائی گاؤں بھی ظہور میں آئے، خصوصاً کمپنیوں کی طرف سے کسی خاص قسم کے کپڑے کی مانگ کو لے کر۔ ہم اپنے تحقیقی زمانہ میں جنوبی ہند میں بنکروں رہائشی پیٹرن میں ایک تبدیلی دیکھتے ہیں۔ پہلے ان کا ارتکاز خاص طور پر مندروں کے احاطوں میں ہوتا تھا۔ 17ویں صدی

MEDIA CENTRE · MANUU · IMC LIBRARY · Hyderabad-34

عیسوی کے دوران مندر کے احاطہ سے دریافت کیک کولا بنکروں کے کچھ مذہبی عطیات سے متعلق کتبات کے علاوہ اس دور میں بنکر جماعت Community کے عطیات سے متعلق کتبات مندر کے احاطے کے بجائے اکثر سیکولر مقاموں سے زیادہ ملتے ہیں۔ گجرات، بنگال، سندھ کے میدان اور کورومنڈل کپڑے کی صنعت کے بڑے مراکز تھے۔ 1630 کے قحط کے بعد گجرات نے اپنی اہمیت اور مقام کو کھو دیا جس کا مقام جلد ہی بنگال نے حاصل کر لیا تھا۔ 18 ویں صدی میں اس کا مزید زوال غیر اطمینان بخش سیاسی حالات کی وجہ سے خلیج فارس کے بازاری علاقوں کو گنواں دینے کی وجہ سے ہوا۔ اسی صدی کے بیچ مراٹھا شورشوں نے بھی ایک منفی کردار ادا کیا اور اس کے زوال میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔ مگر یہ بات باعث دلچسپی ہے کہ بنگال میں کپاس جو کہ عہد وسطی میں ایک اہم اگائی جانے والی فصل تھی، 19 ویں صدی میں اس زمینی حصہ سے لگ بھگ غائب ہو گئی۔ ابن بطوطہ (متوفی 1377) تحریر کرتا ہے کہ سب سے باریک سوت بنگال میں دو دینار میں 30 کیوبٹ کی سب سے زیادہ ارزاں قیمت پر فروخت ہوتا تھا۔ شمالی کورومنڈل علاقے (پولی کوٹ کے شمال میں) سفید ''گیانا'' کپڑا تیار کیا جاتا تھا جس کا بحر احمر اور لیونیٹ (Levent) علاقوں میں کافی زیادہ مطالبہ تھا۔ اسی طرح جنوبی کورومنڈل اپنے نیلے، سرخ اور دھاری دار کپڑے کے لئے مشہور تھا۔ اورنگ آباد اور برہانپور سفید کپڑوں کی پیداوار کے لئے مشہور تھا۔ چول لینن کے واسطے اور کیمبے رضائیوں کے واسطے مشہور تھا اتنا ہی مشہور مسولی پٹنم بھی تھا جو کہ رنگ ریزوں اور بنکروں کا شہر کہلاتا تھا۔ پانڈی چیری رنگ زائل کرنے (Bleaching) والے ایک مرکز کی شکل میں ظہور میں آیا۔ پانڈی چیری ہی سے رنگ شدہ کپڑے بھی برآمد کئے جاتے تھے۔

برٹش فیکٹری ریکارڈس سوتی کپڑے کی 150 سے بھی زائد قسموں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ململ زیادہ تر بنگال اور ڈھاکہ میں تیار ہوتی تھی۔ قائم خانی، مغلوں اور امراء و چنندہ افراد کے ذریعہ خصوصی طور پر خریدی جانے والی ململ ایک عمدہ قسم تھی۔ دلی، آگرہ اور پٹنہ اپنی چھینٹ کے کپڑے اور ناگ پٹنم سوتے کپڑوں اور چھینٹ کے کپڑوں کے لئے کافی مشہور تھے۔ مچھی واڑہ (صوبہ دہلی) بافتہ (اعلیٰ قسم کا سوتی کپڑا) کے لئے مشہور تھا۔ کچھ مرکز اپنے آپ میں اتنے زیادہ مشہور تھے کہ کپڑے کی اقسام کو بھی اسی علاقے کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دریا آبادی (دریا آباد ضلع بلند شہر، یوپی)، خیر آبادی (خیر آباد ضلع سیتا پور، یوپی)، سمانا سے سامیانو، سلاھٹی (سلہٹ سے)، دیوگیری (دیوگیر سے)، کانچی پورم سے کانچی ونی، تنجاور سے تن چیرا، وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ کپڑے کی چند اقسام بنکر معاشرہ کے نام سے بھی مشہور تھیں مثلاً بنکر جیدار سماج کے نام سے جے دار ریشم۔ زمانہ جنگ میں راجاؤں اور امراء کے ذریعہ خیموں کا مطالبہ بھی کافی بڑھ جاتا تھا۔ ابوالفضل خیموں کے کپڑے کی دس اقسام کا ذکر کرتا ہے۔ سب سے کم قیمت کے خیمے کے کپڑے کا نرخ 10,000 روپیہ تھا۔ لٹھا نام کا کپڑا زیادہ تر شمالی کورومنڈل اور شمالی ہند میں تیار کیا جاتا تھا۔

عہد وسطیٰ کے کرناٹک میں مگاڈاورو، نیگے یارور، دیوانگا، سیلے سامی ورو، دیوانگ اور جے دار وسماجوں نے بنکر سماج میں مسلسل اپنا اہم مقام بنائے رکھا۔ مگر کیک کولروں نے تمل ناڈو کے سالیاؤں کا مقام حاصل کر لیا۔ بنکروں سماجی درجہ بندی میں اپنی حیثیتوں کو بڑھانے کے واسطے مندروں میں عطیات بھی دیتے تھے۔

ترکی اور یوروپی اثرات کی وجہ سے ڈیزائینوں کے نقشوں (پیٹرن) میں بھی کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جنوبی ہند میں روایتی طور پر ڈیزائن مہا بھارت اور رامائن رزمیہ کے اہم موضوعات پر مبنی تھے۔ قلم کاری اس کی عمدہ مثال ہے۔

موٹے طور پر غریب صرف کمتر قسم کمین کے کپڑے ہی خرید سکتا تھا۔ عمدہ قسمیں مہین خصوصی طور پر چیدہ طبقوں کے استعمال کے لئے ہی تھیں۔ عہد سلطنت میں چرخہ اور پن جنا (روئی دھننے کی کمان) نے عہد وسطیٰ میں سوتی کپڑوں کی بنائی میں بہت تیز اضافہ کیا (ٹکنالوجی کی تفصیل کے لئے دیکھیں اکائی 23)۔ عرفان حبیب کے اندازہ کے مطابق چرخے کے استعمال سے کام کرنے کی صلاحیت میں چھ گنا اضافہ ہوا۔ عموماً ہم پاتے ہیں کہ کل استعمال کے ساتھ ساتھ کپڑے کی پیداوار میں بھی ہمارے تحقیقی زمانہ کے دوران اضافہ ہوتا نظر آتا ہے۔ جنوب میں بھی صنعتی تبدیلیاں مسلم رابطوں کے تحت ہی رونما ہوئیں۔ اس کے علاوہ پہلے ڈیزائن والے گڑے کرگھے (Patterned loom) کے علاوہ کرشن کرگھا (draw Loom) بھی عام ہو گیا۔ مگر اس کا استعمال جنوبی ہند میں زیادہ تر مسلم معاشرہ کے درمیان ہی محدود معلوم ہوتا ہے۔ تر وملائی۔ تروپتی، دیواستھان، کتبات ہم عصر بنکروں کے ذریعہ مستعمل کرگھوں کا مفصل تذکرہ ملتا ہے۔

’’جب کہ ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ہتھ کرگھوں سے بنائی کرتے وقت ایک تہائی (1/3) سدی سارا کڈم یا اچک کٹو کو لمبا تانے کی شکل میں بننا چاہئے اور دو تہائی سوتی دھاگے کو آڑی بنائی (بانے) میں استعمال کیا جانا چاہئے۔ بنائی کا یہ طریقہ صرف مسلم بنکروں کے ذریعہ ہی اختیار کیا جاتا ہے (اور ہندوؤں کے ذریعہ نہیں)۔ ان کو اپنی خدمات (اس طرح کی بنائی کے لئے) کے واسطے انعامات کے ساتھ اپنی بنائی کے لئے عطیات میں دی گئی زمینوں سے آمدنی جمع کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔

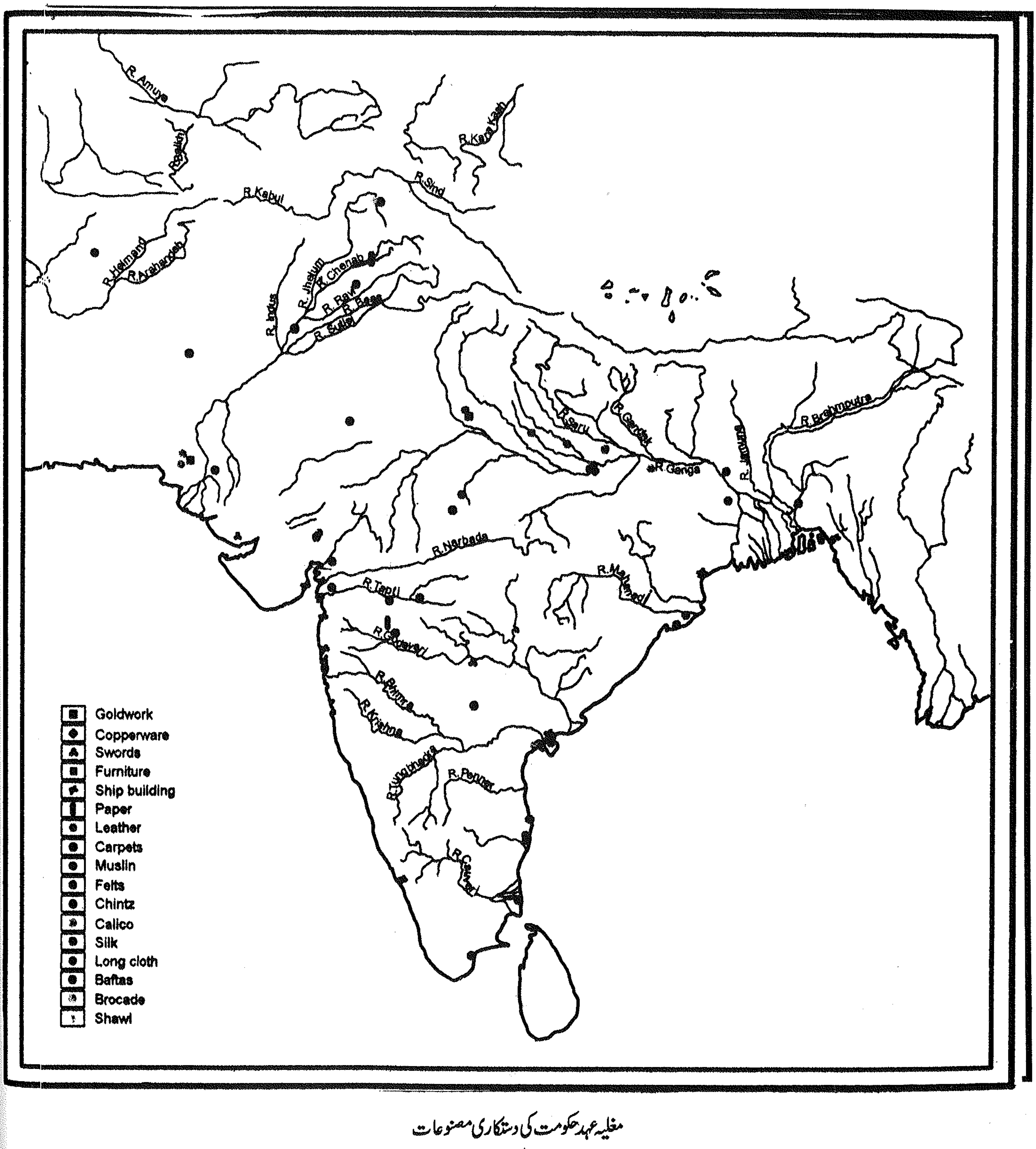

مغلیہ عہد حکومت کی دستکاری مصنوعات

ماخذ: عرفان حبیب، این ایٹلس آف دی مغل ایمپائر: پولیٹیکل اینڈ اکنامکس میپس، او۔یو۔پی۔، دہلی، 1982۔

B. NO. 219

ترملوئی-تروپتی، دیوستھانم، کتبات، مرتبہ ایس۔سبرامنیا شاستری اوروی۔وی۔ویراگھوآ چاریہ مدراس، 1931، جلد چہارم، نمبر 112، وجیا راجاسوامی، ٹیکسٹائلس اینڈ ویورس ان میڈیول ساؤتھ انڈیا، او۔یو۔پی۔1985، صفحہ 126۔

مندرجہ بالا کتبات کی بنیاد پر وجیاراماسوامی (126-27، 1985:66) عرفان حبیب کے اس دلیل کی تردید کرتے ہیں کہ کارچوب یعنی چوکور لکڑی کا فریم، ہندوستان میں 17 ویں صدی عیسوی میں استعمال کیا گیا۔ان کا خیال ہے کہ تروپتی کے کتبات میں تحریر سدی سارا کڈم بہت کچھ کارچوب کے مانند ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ ایک چوکھوٹا فریم ہے۔ہندوستان میں کرشن کرگھے (Draw Loom) کا استعمال کے موضوع میں بھی انہوں نے اپنا شبہ ظاہر کیا ہے کہ عرفان حبیب اس کو سترہویں صدی کی آمیزش مانتے ہیں (تفصیل کے لئے اکائی 23)۔وہ اس تکنیک کو عمودی شکل کا کرگھا (Vertical Loom) سے متعلق کرتے ہیں۔مگر وجیاراماسوامی کا خیال ہے کہ 'عمودی شکل کا کرگھا ہندوستان میں موجود کرگھوں میں سے سب سے زیادہ قدیم ہے۔وہ جمبور گاؤں (ضلع شموگا) میں ویر بلال دیو کے عہد حکومت کے 1184 عیسوی کے اس کتبہ کی مثال پیش کرتی ہیں جو ایک رسی کی مدد سے چھت سے بندھے کرگھوں کا تذکرہ کرتا ہے۔

18.2.2 ریشم

ہندوستان میں ریشم شہتوت کے پتوں کے ذریعہ (پالتو) اور بغیر شہتوت پر وردہ (جنگلی) دونوں ہی قسم کے کیڑوں کے ذریعہ تیار کیا جاتا تھا۔یہاں ریشم تیار کرنے کے اہم علاقے تھے: گجرات، بنگال اور کشمیر۔چول، ریشم کی بنائی کا کام کرنے والوں کے لئے کافی مشہور تھا۔(تفصیل کے لئے دیکھیں بلاک 5 اکائی 23)۔عہد وسطیٰ میں اڑیسہ میں بھی ریشم کی پیداوار کا تذکرہ ملتا ہے۔

کاشتکار پرانے شہتوت کے درختوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیا کرتے تھے اور ماہ اکتوبر میں زمین میں ہل چلا کر ان کو بو دیا کرتے تھے کچھ دنوں کے بعد ان سے نئی کونپلیں نکل کر شاخ کی صورت اختیار کر لیا کرتیں جن کو کیڑوں کو کھلانے کے واسطے روز توڑا جاتا تھا۔

ہندوستانی ریشم کی تمام اقسام کے لئے ایک ہی طرح کی بیلن (Reeling) تکنیک کا استعمال ہوتا تھا۔ان لوگوں کو بیلن کی چینی تکنیک کا علم نہیں تھا۔ریشم کی بیلن اس وقت کی جاتی تھی جب کہ ریشم کا کیڑا کویا (Cocoon) توڑ کر باہر آنے کے قریب ہوتا تھا۔کویا بیلن سے قبل گرم پانی میں ڈالا جاتا تھا اور اس کے بعد اس کو تازہ پانی میں ڈالا جاتا تھا۔بیلن کے طریقہ کار میں ریشم کے دھاگے کو صرف نرم کیا جاتا تھا۔اس طرح ہندوستانی طریقہ کار کو چینی اور فارسی طریقوں سے عمدہ مانا جاتا تھا۔ہندوستان میں چرخے کے ذریعہ کتائی کی ابتداء 14 ویں صدی میں چرخوں کی ابتداء کے ہمراہ ہی ہوئی۔عمدہ قسم کے کویوں سے حاصل ریشوں کو پٹانی اور ہلکی کوالٹی کے کویوں کے لئے پوٹی یا پوٹ کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔

علاؤالدین خلجی نے ابراد کمبایتی (کامبے کا دھاری والا ریشمی کپڑا) الخانی وزیر، رشیدالدین کو بطور تحفہ ارسال کیا تھا۔شروع شروع میں گجرات، چین سے خام مال درآمد کرتا تھا۔مگر 17 ویں صدی کے قریب بنگال ریشم کی پیداوار کے اہم مرکز کے طور پر ظہور میں آیا اور اس نے بہت کم وقت میں چین کا مقام حاصل کر لیا۔ٹیورنیر نقل کرتا ہے کہ اکیلے قاسم بازار سے 24 لاکھ پونڈ کا ریشم برآمد ہوتا تھا۔راج محل کے اندر شاہ شجاع کے باغ میں شہتوت کی ایک عمدہ قسم توت (Tut) کی فصل اگائی جاتی تھی۔جز، کوئلہ اور مشرو (سوت اور ریشم کا آمیزہ) وغیرہ اقسام دہلی میں تیار کی جاتی تھیں۔گجرات میں پیدا ہونے والی ریشم کی اقسام میں پٹولہ کی کافی مانگ تھی۔بھاگلپور بہار، ٹسر (Tasar) ریشم کی پیداوار کے لئے کافی مشہور تھا۔مگر 19 ویں صدی میں اسکی پیداوار میں کافی کمی واقع ہوگئی۔ٹیورنیر آسام کے موگا (Muga) ریشم کی پیداوار کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔

یہاں ریشمی اور سوتی کپڑوں کی بنائی کے علاوہ قالین بافی کا دستور بھی عام تھا۔وارنگل اور مسولی پٹنم اس کی پیداوار کے لئے کافی مشہور تھے۔جن کا مقصد زیادہ سے زیادہ ان کی برآمدگی (Export) تھا۔

18.2.3 نیل

نیل کی فصل عہد وسطیٰ میں سب سے زیادہ اہم نقدی فصلوں میں سے ایک مانی جاتی تھی۔ بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ٹھکر پھیرو (تقریباً 290) اپنی تحریر کردہ فصلوں کی لمبی فہرست میں کہیں نیل کی پیداوار کا تذکرہ نہیں کرتا جو کہ کپڑوں کی رنگائی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ نیل زیادہ ترالور (میوات)، بیانا (آگرہ کے نزدیک سہوان (سندھ)، تلنگانہ اور سرکھیج (گجرات) کے علاقوں میں پیدا ہوتا تھا۔ حالانکہ گھٹیا قسم کے نیل کی پیداوار تو ملک میں ہر جگہ ہوتی تھی مگر کو رومنڈل ساحل پر ناگ لیوانچ میں عمدہ قسم کے نیل کی پیداوار کی جاتی تھی۔ بیجاپور میں دھابول اور وینگرولا میں بھی نیل کی پیداوار ہوتی تھی۔ نینسی اور پیٹر منڈی (34-1630) تذکرہ کرتے ہیں کہ نیل راجستھان کے میٹرتا علاقے میں بھی پیدا کیا جاتا تھا۔ اسی طرح چیتن سنگھ کا بھی خیال ہے کہ ''لاہور نیل'' کا مقصد یہ نہیں کہ نیل باہر سے یہاں لایا جاتا تھا اور یہاں صرف اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ان کے مطابق لاہوری نیل اپنی افادیت کے لحاظ سے سرکھیج یا بیانہ یا پھر ''تھٹہ'' کے نیل سے مختلف تھا۔ نیل یہاں اس علاقے میں مقامی طور پر پیدا شدہ فصل سے کاشتکاروں کے ذریعہ تیار کیا جاتا تھا۔ 1614 میں مسولی پٹنم نیل کی قسم کی قیمت 12 پینس فی پاؤنڈ تھی۔ سورت کے نیل کا دام $13^1/_3$ پینس تھا جبکہ سرکھیج کے نیل کی قیمت 15 اور 20 روپئے فی من کے درمیان تھی۔ پلسارٹ (تقریباً 1626) جو کہ تھوڑے وقفہ بعد میں تحریر کرتا ہے کہ میوات کے ایک من نیل کی قیمت 20 روپئے فی من تھی جب کہ بیانا کے ایک من نیل کی قیمت 30 روپئے فی من تھی۔

نیل عموماً مارکیٹ میں طریق عمل (Processed) کے بعد ہی لایا جاتا تھا مگر گجرات میں ہم کو ایک مثال ملتی ہے کہ جہاں کاشتکاروں کے ذریعہ ہری پتیاں فروخت کی گئیں۔ نیل کی فصل ماہ جون کے آخر تک بوئی جاتی تھی۔ نیل کی فصل کی ایک سال میں تین بار تک کٹائی کی جا سکتی تھی۔ پہلی کٹائی نوتی (Nauti) لال سے رنگ کی ہوتی تھی دوسری جیری (Jerry) جو اگست تک تیار ہو جاتی تھی۔ درحقیقت یہ سب سے اعلیٰ قسم کی تھی جس سے تیار شدہ نیل کا رنگ مکمل طور پر بیگنی (Violet) ہوتا تھا۔ اس کا مطالبہ کافی زیادہ تھا تیسری کٹائی کیتل (Katel) مٹ میلی رنگ کی ہوتی تھی اور یہ سب سے نچلے درجہ کا تھا۔ نیل کو بازار میں فروخت کرنے کے واسطے خاص طور پر تیار کرنے کی (Processed) ضرورت ہوتی تھی۔ اس کو تیار کرنے کے واسطے پختہ اینٹوں سے بنے مستطیل اور گول قسم کے مخصوص حوض (گاہے بگاہے دو حوض) استعمال میں آتے تھے۔ جن کی اندرونی دیواریں چونے سے پتی ہوتی تھیں۔ 13ویں صدی میں عمدہ چنائی سامان (میٹریل) چونا، گارا کے استعمال کی شروعات نے نیل کی تیاری کو اور آسان اور عمدہ بنا دیا۔ جس کے ذریعہ حوض کی دیواریں واٹر پروف ہو گئیں۔ مستطیل حوض کو نیل کی پتیوں اور قلوی پانی سے عمدہ کارکردگی کے لئے 17-16 گھنٹے تک بھیگنے کے لئے بھر دیا جاتا اس دوران پتیوں کا نیلا رنگ پانی میں گھل جاتا تھا۔ پانی میں ڈوبے رہنے کے بعد اس سامان کو کوٹنے متھنے کے لئے ایک گول حوض میں ڈال دیا جاتا تھا۔ بیانہ میں نیل تیار کرنے کے لئے ایسے دو حوضوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن سرکھیج اور میوات دونوں جگہ ایک ہی حوض میں یہ طریقہ کار مستعمل تھا۔ اس کو گھمانے پھرانے کی حالت میں کچرے کو علاحدہ نکال دیا جاتا تھا۔ پلسارٹ بیانہ کے نیل کی بہتر قسم کی وجہ اس میں قلوی پانی کو بتاتا ہے۔ کے۔ کے۔ ترویدی (1998) کا خیال ہے کہ اس کے دھیرے دھیرے چلانے اور متھنے کے واسطے دو جدا جدا حوضوں کا استعمال اس کو عمدہ کوالٹی کا بنانے کے واسطے یہ عمل کافی معاون تھا۔ اس کے برخلاف سرکھیج ''ہری'' کے مقام پر خشک پتیوں کا استعمال بھی کوالٹی کے لئے کافی حد تک اثر بخش تھا۔ ترویدی کے خیال کے مطابق 'بیانہ' میں ایک فصل میں تقریباً 502 میٹرک ٹن نیل کی پیداوار ہو جایا کرتی تھی۔

عہد وسطیٰ میں نیل کی فصل اتنی بیش بہا تھی کہ شاہ جہاں نے اس پر اپنا اختیار قائم کرنے کوشش کی۔ یعقوب بیگ، بھڑوچ کے گورنر نے انگریزی کمپنی پر ان کے اعتراضات کے باوجود زور ڈالا کہ نیل اس سے ہی خریدا جائے۔ 17ویں صدی کے آخری برسوں میں خاص طور سے اس کی پیداوار میں گراوٹ آئی۔ بہت حد تک اس کی وجہ وہ مقابلہ جو کاشتکاروں کو ویسٹ انڈیز کے بازار کی طرف سے برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں سیاسی عدم استحکام جو خاص طور پر آگرہ اور دہلی کے قریبی علاقوں میں جاٹ (80-1670 کے دہے میں) اور ستنامی (1672) کی بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، نے بھی آہستہ آہستہ اس کے غائب ہونے میں مدد کی۔ 32-1630 کے گجرات قحط نے بھی اسی علاقے میں نیل کی پیداوار کو نقصان پہنچایا۔ اس علاقے میں تب ہی سے اس کی پیداوار گھٹتی چلی گئی۔ گجرات میں نیل کی پیداوار میں کمی واقع ہونے کی مثال دیتے ہوئے تپن رائے چودھری (کیمبرج 1982)، ہندوستان کے زراعتی پیداواروں

پلسارٹ کا بیان

اصلی بیانہ نیل، جو اس شہر کے پاس ہی تیار کیا جاتا ہے، کی پیداوار تقریباً 300 گانٹھ سے زیادہ نہیں ہوگی مگر یہ دیگر قریبی مواضعات کی پیداوار سے کافی عمدہ ہے۔ یہ امتیاز شہر کے قریب کنوؤں میں کھارے پانی کی وجہ سے ہے، کیونکہ میٹھے پانی کا استعمال نیل کو سخت اور روکھا بناتا ہے۔۔۔۔۔۔ ایک ہی کھیت کے کاٹے گئے پودے کو اگر میٹھے پانی کے مقابل کھارے پانی سے تیار کیا جائے تو اس کو فروخت کرنے میں فی من ایک روپیہ زیادہ حاصل ہوگا۔

دیگر مقامات پر بھی نیل کی پیداوار کافی مقدار میں ہوتی ہے جیسے کول (جدید علی گڑھ) یا گورسا (جدید خورجہ؟) جوندی کے دوسری جانب آگرہ سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اس زیادہ پیداوار کی خرید آرمینیائی، لاہوری اور کابلی، تاجروں کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ یہاں کا نیل عمدہ نیل ہے، مگر اس میں وہ خصوصیت نہیں جو کہ بیانہ کے نیل میں ہے۔

میوات کا علاقہ آگرہ سے 30 کوس ہے۔۔۔۔۔ اس علاقے کے بہت سے گاؤوں میں نیل کی پیداوار کی جاتی ہے اور اس کی سالانہ پیداوار 1000 گانٹھ سے زیادہ ہے، مگر یہ حقیر اور کم درجہ کا مانا جاتا ہے اور اکثر ریتیلا بھی۔ یہاں اس کی پیداوار کا طریقہ سرکھیج کی طرح ہی ہے نہ کہ بیانہ کے طرز پر۔ پودے بھگونے اور پتیوں سے رنگ کا مادہ نکالنے کے لئے متھنا۔ سارے امور ایک ہی پٹ (حوض) میں انجام پاتے ہیں جب کہ بیانہ یا گورسہ میں اس کام کے واسطے دو حوضوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ نتیجتاً اس کی قیمت کافی کم ہے۔ میوات میں ایک من کی قیمت صرف 20 روپے ہے جب کہ بیانہ میں 30 روپے ہے۔

ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ اینڈ پی۔ جیال، جہانگیرس انڈیا: ''دی ریمانس ٹرینٹی آف فرانسسکو پلسارٹ''، دہلی، صفحہ 15-13۔

کی اثر پذیر قیمتوں کے کردار کی اہمیت، پر زور دیتے ہیں۔ خصوصی فصلیں اُگانے کے لئے کاشتکاروں کی پسند 'ان کی ملنے والی قیمت' پر منحصر تھی۔ گجرات کے قحط کے بعد غذائی فصلوں کی قیمتیں کافی زیادہ اوپر ہوگئیں جس سے کاشتکاروں نے نقدی فصلوں کے مقابلہ غذائی فصلوں کو اگانے کا متبادل اختیار کیا۔ ایک خاص دلچسپ بات یہ ہے کہ نیل کی پیداوار میں خصوصاً سرکھیج میں تجارتی سرمایہ بھی لگا ہوا تھا۔

نیل کے علاوہ ایک اور چیز رنگائی کے کام میں استعمال ہوتی تھی جس کا نام ''آل'' (ایک لال رنگ کی ڈائی)، جو کہ دوآب، بندیل کھنڈ اور مالوہ کے علاقوں میں وسیع طور پر پیدا ہوتی تھی۔ لیکن نسبتاً کم درجہ میں مصنوعی ڈائی (رنگ) کی پیداوار کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کی پیداوار تقریباً ختم ہوتی چلی گئی۔

18.2.4 گنا

گنے کی پیداوار پورے شمالی ہند میں وسیع طور پر ہوتی تھی اور ''آئین'' کے یہ سبھی 'دستوروں' میں منقول ہے۔ مگر مغربی راجستھان میں پیدا کی جانے والی عہد وسطی کی فصلوں کی فہرست میں ہمیں گنا حقیقت میں غائب ملتا ہے حالانکہ یہ فصل مشرقی راجستھان کی فصل فہرست میں ملتی ہے۔ اسٹیل اور کراؤتھر نقل کرتے ہیں کہ 'آگرہ اور لاہور کے درمیان سارے علاقوں میں بورا (Powderd Sugar) کافی مقدار میں تیار ہوتا ہے'۔ سرکار حصار فیروزہ صوبہ دہلی میں 'اہم' عمدہ قسم کی شکر پیداوار کے لئے مشہور تھا۔ سب سے عمدہ اور ارزاں چینی کی پیداوار بنگال میں ہوتی تھی۔ ڈچوں کے ذریعہ صرف 1640 کے دہے میں ایران کو جانے والی بنگال کی چینی کی برآمد (Import) تقریباً 4,00,000-4,50,000 پاؤنڈ تھی۔ مگر بنگال کی گنے کی پیداوار میں 19 ویں صدی میں گراوٹ کے آثار نمایاں ہیں حالانکہ وہ پھر بھی علاقے کی بہت اہم فصل بنی رہی۔ چینی اور گڑ بنانے کے لئے گنے سے رس دکنی علاقوں میں بیل کے ذریعہ دندانے دار لکڑی کے بیلنو (Worm-geared Wooden-Roller) کے استعمال سے نکالا جاتا تھا اور گنگا کے میدانی علاقوں میں بیلوں کے ذریعہ پتھر کی موسل چکی (Stone-Mortar-Pestel-Mill) کا استعمال بیلوں کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا تھا۔ ان چکیوں کی جگہ لوہے کے بیلنوں (Rollers) کا استعمال 19 ویں صدی کے آخر تک ہی ہوسکا۔ رس کو لوہے کے کڑھاؤں میں جوش دے کر اس سے گڑ اور چینی کی مختلف قسمیں تیار کی جاتی تھیں۔ (حبیب، 1963)

18.2.5 تیل کی پیداوار

تیلی کا دیہی وشہری دونوں ہی مقامات پر ایک اہم مقام تھا۔ تیل چونکہ ایک لازمی استعمال کی شے تھی، تقریباً بڑے گاؤں میں اس طبقہ کی موجودگی ضروری تھی۔ خوردنی تیلوں کے نکالنے کے علاوہ کچھ کو خوشبو کے تیلوں کے لئے بھی کافی شہرت حاصل تھی جیسے مدینہ پور پھولوں سے نکالے ہوئے تیلوں کے واسطے مشہور تھا۔ گوالیار میں اسی مقصد سے چنبیلی کی کافی مقدار میں کاشت کی جاتی تھی اور اڑیسہ جنجیلی، جبکہ راندیر اور نواساری (گجرات) خوشبو دار تیلوں اور عطریات کے لئے مشہور تھا۔

کرناٹک میں اس کاروبار میں مشغول طبقے کو تیل لی گرنا کھرا، تیلی گرا کوٹ ٹلی، تیل لی گا سینی، تیل لی گرائے ووٹ ٹوکا لو اور گانی گاروکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 14-13 ویں صدی تک کرناٹک میں تیلی بھی تیل پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے تیل کی تجارت میں شامل ہو گئے۔ کرناٹک میں ان کے ذریعہ مستعمل گاونڈا اور سیٹی خطاب بڑے ہی دل چسپ ہیں اور یہ ان کی حیثیت میں اضافہ کی طرف نشان دہی کرتے ہیں۔

مہاراشٹر میں تیلی الوتے دار (دیہی دستکار جن کی خدمات گاؤں کو مستقل نہیں چاہیئے ہوتی تھیں) کے درجہ میں شمار ہوتے تھے۔ لیتا چرت 13 ویں صدی کی ایک مراٹھی سوانح عمری جس میں ہاٹ (مقامی ہفتہ واری بازار) میں تیل کی دکانوں کا تذکرہ ہے۔ گھان سے تیل نکالنے میں مشغول تیلیوں اور اپنے گھروں کے سامنے بیٹھ کر تیل فروخت کرتی گھریلو عورتوں کا ذکر اس میں ملتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تیل نکالنے میں تیلی اپنے بازوؤں کی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اپنے کولہو پر کام کرتے تھے۔ مگر ہمیں بیل گھان کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے یعنی تیل نکالنے کے لئے بیل کی طاقت کا استعمال۔ اس طرح تیل، گھانی کے ذریعہ بھی نکالا جاتا تھا اور تیل چکی (جواز کولہو) کے ذریعہ بھی۔

چراغ جلانے کے لئے تیل کے استعمال نے اسے مذہبی عطیات کی ایک شے بنا دیا۔ مندروں اور مسجدوں دونوں میں چراغ جلانے کے لئے مغلوں کے تحت "مدد معاش" کے کافی حوالے ملتے ہیں۔ مہاراشٹر سے دریافت کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی عطیات کے لئے دیئے جانے کے لئے ہر ایک گھان سے مندر کے پجاری کو ایک ڈو (لکڑی کی پلی) اور تیل کا ایک مرتبان (Jar) دیا جانا لازمی تھا۔ پاٹن سے دستیاب کتبات میں ذکر ہے کہ تیلی کاروں پر مٹھوں (Math) کو روشنی کے واسطے تیل کی سپلائی ضروری تھی ممکن طور پر یہی وجہ ہے کہ ریاست تیلی کاروں سے ٹیکس وصول کرنے کے بجائے مذہبی اور تعلیمی اداروں کے لئے مذہبی عطیات کی شکل میں ان سے ٹیکس لے کر اور انہیں ان اداروں کو صدقات میں دیتی تھی۔ مہاراشٹر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیہی حلقوں میں چھوٹے پیمانہ پر ساہوکاروں کی شکل میں رونما ہو رہے تھے اور عمدہ کمائی کر رہے تھے۔

علاء الدین نے دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں تیل کے تاجروں کی دھوکہ دہی پر قابو پانے کے لئے نگراں 'شہنہ' کی شکل میں سراج الدین کو مقرر کیا تھا۔ تیلیوں کے اپنی انجمنیں ہوتی تھیں جیسے بہار کے علاقوں میں ان کی تنظمیں۔

ماہی گیری ایک دوسرا اہم پیشہ تھا۔ مالا بار کے موگار اور مکوماہی گیروں نے اپنے پیشے کے ذریعہ کافی مقدار میں دولت جمع کر لی تھی۔

18.3 دھاتیں

ہندوستان معدنی ذخائر کے لئے کافی دولت مند تھا۔ کانوں سے برآمد (دھاتوں) اشیاء میں ہیرے کا مقام سب سے اعلیٰ تھا۔ ہندوستان اپنے لوہے اور اسٹیل کے لئے بھی مشہور تھا مگر اس کو سونا اور چاندی کے لئے زیادہ تر درآمد پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔

18.3.1 سونا اور چاندی

ہندوستان میں سونے کی پیداوار کسی قابل لحاظ پیمانہ پر نہ تھی۔ کرناٹک کی سونے کی کانیں کافی پہلے ہی سونے سے خالی ہو چکی تھیں۔ مگر ہمارے عہد میں ندی کے ریت سے سونا نکالنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ رالف فچ (91-1583) ذکر کرتا ہے کہ پٹنہ میں لوگ ریت کے ذخیروں کو کھود کر سونا تلاش کرتے ہیں۔ سونا گنگا اور اس کی معاون ندیوں کے ریت سے نکالا جاتا تھا مگر یہ طریقہ اخراج بہت گراں اور مہنگا اور فائدہ تقریباً برائے نام تھا۔

چاندی کی کانوں سے متعلق استخراج کے تعلق سے حوالے بہت کم ملتے ہیں۔ اگرچہ ابوالفضل کماؤں کی پہاڑیوں میں چاندی کی کانیں ہونے کا تذکرہ کرتا ہے اور سرمور کی پہاڑیوں میں چاندی کی کانوں کے کچھ باقیات ملتے ہیں زیادہ تر سونا اور چاندی ہندوستان میں۔ تجارت کے مناسب تناسب کے ذریعہ سے آتا تھا۔

اس پر بھی زیورات سازی ایک روز افزوں دستکاری تھی۔ برنیر (68-1656) تذکرہ کرتا ہے کہ 'ہوسکتا ہے کوئی یقین نہ کرے مگر ان چیزوں کی عمدہ دستکاری مہارت کسی یوروپی سنار سے بھی زیادہ عمدہ ہوسکتی تھی'۔ کرناٹک میں انہیں اکا سالگ کہا جاتا تھا۔ ان کا تذکرہ کتبات میں ٹیکس ادا کرنے والوں، عطیات حاصل کرنے والوں اور یہاں تک کہ عطیات دینے والوں کی شکل میں بھی ملتا ہے۔ انہوں نے مندر بھی تعمیر کرائے۔

18.3.2 ہیرے اور قیمتی پتھر

چھوٹا ناگپور (گونڈوانہ علاقہ) عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اپنے ہیروں کے واسطے مشہور تھا جس نے جہانگیر کو 1612 اور 1615 میں دو مہمیں بھیجنے کے واسطے آمادہ کیا۔ درجن سال (DURAJANSAL) سے ہیروں کا بڑا مال غنیمت حاصل ہوا۔ ٹیورنیر (47-1647) بھی چھوٹا ناگپور کے لوہاردا گا ضلع میں سومیل پور میں ہیروں کی کان کنی کا تذکرہ کرتا ہے۔ بہار میں کوکرادیش ہیروں کی کانوں کے لئے مشہور تھا۔ یہاں کے گورنر ابراھیم فتح جنگ نے شہنشاہ کو 9 ہیرے ارسال کئے تھے۔ مگر 1612 کے بعد اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

گول کنڈہ، راؤل کنڈہ اور کولور اپنی مشہور ہیروں کی کانوں لئے جانے جاتے تھے۔ ہیروں کی کان کنی میں ریاست کی اجارہ داری تھی اور راجاؤں کے ذریعہ کانیں تاجروں کو پٹے پر دیئے جانے کا دستور تھا۔ اکیلے کولور کان میں 17 ویں صدی کے دوران تقریباً 60000-30 مزدور کام کیا کرتے تھے۔ 1680 میں گولکنڈہ سے ہیرے کی کانوں سے اندازہ کے مطابق بیس لاکھ کا محصول وصول ہوا۔

مغلوں (1687) کے ذریعہ گولکنڈہ پر قبضہ کے بعد اس علاقے کی کانوں سے ہیرے کی پیداوار تقریباً پانچ سال بعد 1692 میں شروع ہوسکی۔ کانوں کو براہ راست فوجدار کی نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ قدیم طریقوں سے کوئی زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس کو نجی ٹھیکہ داروں کے دیدیا گیا جنھوں نے کرائے کے

گول کنڈہ کی ہیروں کی کانوں سے متعلق جیک دی کورٹ کا بیان تقریباً 1622-1592ء

جس قسم کی زمین سے ہیرے برآمد ہوتے ہیں وہ کچھ نرم اور سخت ہوتی ہے۔ جو تھوڑا سا دباؤ ڈالنے پر بکھر جاتی ہے۔ اور وہ سفید اور کالی رنگت والی مینگوئی رنگ کی طرح ہی ہوتی ہے۔ یہاں کے باشندے جو کل ملا کر 50 ہزار ہیں بہت غریب ہیں، ان کے پاس کھانے کو بھی بہت کم ہے۔ خاص طور پر ان کے پاس جو لوگ کانوں میں کام کرتے ہیں ------ اتنے مفلس ہیں کہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بھی اہل نہیں۔ وہ گروپ میں بھی ایک جماعت کے طور پر چلتے ہیں۔ اور ان تاجروں کے خدمات میں خود کچھ پیش کرتے ہیں جو ان کو خوراک دیتے ہیں بشرطیکہ وہ لوگ تاجروں کو اس ماہ دریافت ہیرے سونپ دیں۔ تاجران پر خرچ رقم کاٹ کر بہت ہی کم داموں پر ان کے ہیرے خرید لیتے ہیں۔ مزدور مہینوں قرض تلے دبے رہتے ہیں۔ کیونکہ دریافت شدہ ہیرے ان کے خرچوں کو بہت ہی کم مقدار میں پورا کرسکتے ہیں۔

۔۔۔۔۔وہ گوپال رائے، بادشاہ کے بھتیجے اور کانوں کے مالک کو وہاں کام کرنے کا ہر ماہ فی آدمی آدھا پگوڈا دیتے ہیں۔ سات کیرٹ سے اوپر کے ہیرے، مالک کے ہوتے ہیں۔ اس سے کم کے تلاش کرنے والے کے۔ کسی بھی بڑے ہیرے کے لئے مزدوروں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

کان کے کسی بھی حصہ کی کھدائی شروع کرنے سے پہلے وہ آدھا فٹ گہری کھدائی سے گھری ایک زمین تیار کی جاتی ہے۔ اس کے قریب وہ ایک پگوڈا کھڑا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد وہ لوہے کے اوزاروں سے کھدائی شروع کرتے ہیں۔ اور کھدی ہوئی مٹی کو بید سے بنی اور کھال کا استر لگی ایک چھلنی میں رکھا جاتا ہے۔ جس کو وہ فرش پر اس وقت تک رکھتے ہیں جب تک کہ دھو کر پھیلائے جانے کے لئے اس کا قد آدم ڈھیر نہ لگ جائے اس طریقے کار میں تیزی لانے کے واسطے وہ لوگ اپنے پیروں کی مدد سے مٹی کو پھیلاتے ہیں جیسے کھیت میں کاشت کار کرتا ہے۔ اسکے بعد 7-8 آدمی فرش پر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک بالشت کے مربع گرے نائٹ پتھر کی مدد سے ڈھیری کو کوٹ کر چورا بنا دیتے ہیں۔

پھر وہ لوگ فرش کے کنارے پر کھڑے ہو کر مٹی کو ہوا کے ذریعے اڑاتے ہیں۔ جس سے صرف پتھر ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ قد آدم پہلے والا ڈھیر کل آدھا گز اونچا ہی رہ جاتا ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے پتھر ہوتے ہیں۔ ساتوں آدمی اب ہیرے تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بڑے ہوں یا چھوٹے۔ لیکن اکثر انکو اپنے نصیب کے مطابق چھوٹا ہی ہیرا حاصل ہوتا ہے۔ ہیروں کی چھٹائی کرتے وقت آپس میں گفتگو نہیں کرتے اور کبھی کبھی دو یا تین مہینے بنا کسی کامیابی کے کام کرتے رہتے ہیں۔ ہیرے کے چھٹائی کے وقت وہ ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بڑا ہیرا چرا لے۔ فرش کے پاس ہی نگراں اور تاجر موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ چرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور غیر ملکیوں کو آدھی قیمت سے بھی کم پر فروخت کر دیتے ہیں۔ قانون شکنی کی سزا زندگی اور ملکیت سے محروم کیا جانا ہے جو خریدنے والے پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ کان مزدوروں کو اسے غیر ملکیوں کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ وہ اسکو مقرر تاجروں کے ہاتھ ہی فروخت کر سکتے ہیں۔ اس سے مالک کو ادا کرنے والے ٹیکس کی چوری سے بھی بچاؤ ہوتا ہے۔ جو کہ دو فیصد اور فروخت کرنے والے سے بھی 2% ہے۔ یہاں زیادہ تر لوگ ٹیکس ادا کرنے والے کاشت کار اور نگراں ہی ہیں اور غیر ملکی لوگ صرف تاجر ہی سے خرید سکتے ہیں۔

کانوں میں کام کرنا بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ یہاں کے قیام کے دوران میں نے ایک بار ایک کان کو ٹوٹتے دیکھا جس میں پچاس لوگ پھنس گئے۔۔۔۔

بیجاپور کی کانوں میں میرے دورے تقریباً 9 رہے۔ ان میں سے ہر ایک دورہ میں کچھ وقت لگایا۔ ہر کان کا اپنا مالک تھا۔ اور میں ان سے 8 میں گیا۔ ان کے نام ہیں: لنگاپور، رمن کوٹ، پولی، دوانی کٹھی، مارمر، گوتوال، کوٹا کنڈہ اور قطب شاہ کے علاقے میں ایک نئی کان، یہ سبھی ہیرے پیدا کرتی ہے۔ قطب شاہ کی فرماں روائی کے علاقے میں ایک دوسری کان ہے جس کو ڈاپولی کہا جاتا ہے جو نرم پتھر پیدا کرتی ہے۔ جیسے یاقوت، نیلم یاقوت، جمری، سمندری رنگ کا یاقوت، ارغوانی رنگ کا قیمتی پتھر اور دیگر رنگوں کے دوسرے موتی پتھر۔

ٹیوٹو نیو آر۔ ڈی سوز، اے نیوا کاؤنٹ آف دی ڈائمنڈ مائنز آف دی دکن، اے۔ آر۔ کل کرنی و دیگر، میڈیول دکن ہسٹری، ممبئی، 1996 صفحہ 127,128,130۔

مزدوروں کے ذریعے ہیروں کے لئے زمین کی متعینہ ٹکروں میں کان کنی کی۔ جب کہ گذشتہ ایک مثال میں ملتا ہے کو ایک سونے کے ہن (ایک اونس کا

3/8 حصہ) کے وزن سے اوپر کے ہیرے بادشاہ کے لئے ہوتے تھے۔ ایک تبدیلی جو آئی وہ یہ تھی کہ پہلے ہیرے کی تجارت کے لئے سرگرمیوں کا مرکز حیدرآباد تھا، اب یہ مرکز منتقل ہوکر بادشاہ کا خیمہ بن گیا۔ اس میں ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس علاقے کے سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے کان کنی کے علاقے کی قلع بندی کر دی گئی اور ان کی حفاظت کے واسطے فوج تعینات کر دی گئی۔

مارکوپولو (1298) جنوبی ہند میں ٹوٹی کورن (Tuticorin) کی صدف گیری (Peal Fishery) کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ پرگنہ مہا کانت (گجرات) میں کاز وربھی پرل فشری کے لئے مشہور تھا۔ کیمبے کے پاس لم دورا میں ایک پہاڑی سے عقیق کی کان کنی کی جاتی تھی۔ کیمبے متفرق مقامات کو موتی برآمد کرتا تھا۔ یہاں دستکار عمدگی کے ساتھ ہیروں اور موتیوں سے اشیاء تیار کرتے تھے کہ باربوسا (تقریباً 1518) بیان کرتا ہے کہ ان میں اصل اور نقل کی شناخت کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ علاقہ ہاتھی دانت کے کنگنوں کے لئے بھی مشہور تھا۔ جبکہ لینٹے گری مونگا پالش کے لئے مشہور تھا۔

18.3.3 تانبہ

تانبہ کا استعمال وسیع طور پر سکہ ڈھالنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ اسلحہ پیداوار کے لئے بھی اہمیت کا حاصل تھا۔ شمال میں تانبہ کی کانیں اراولی پہاڑی سلسلے کے درمیان میں واقع تھیں۔ راجستھان اپنی تانبہ کی کانوں کے لئے مشہور تھا۔ تانبہ کی کانوں کے اہم علاقے تھے۔ سوجت، ٹوڈا، بھیم، بیراٹ، سنگھانہ، ادے پور، کوٹ پتلی، نارنول۔ جنوب مشرقی بہار بھی تانبہ کی خام دھات (ORE) کے لئے مشہور تھا۔ کھڑگ پور کے راجہ بہروز (76-1631) نے اپنے مفاد کی خاطر کانوں سے معدنی ذخائر کا استحصال کیا۔ سکیت منڈی میں تانبہ اور لوہے کی کانوں کی موجودگی کے بھی حوالے ملتے ہیں۔

18.3.4 لوہا

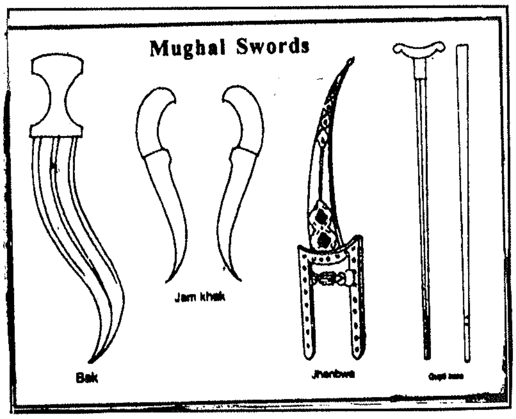

شہاب الدین العمری (م۔1348) ہندوستانی لوہے و اسٹیل کی بھرپور تعریف کرتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں اکائی 23)۔ خام لوہا عموماً پہاڑی علاقہ میں پایا جاتا تھا۔ جو گوالیار سے جنوب تک پھیلے تھے۔ ہمالیہ کے آس پاس کے پہاڑ۔ (کماؤں اور شوالک پہاڑیاں) میں بھی لوہے کی کانیں تھیں۔ دکن کا علاقہ مشرق وسطی کو لوہے کی برآمد کرتا تھا۔ مسولی پٹنم، پوٹا پولی (جدید نیگا پٹنم)، پلی کٹ وغیرہ لوہے کی برآمد کے اہم مرکز تھے۔

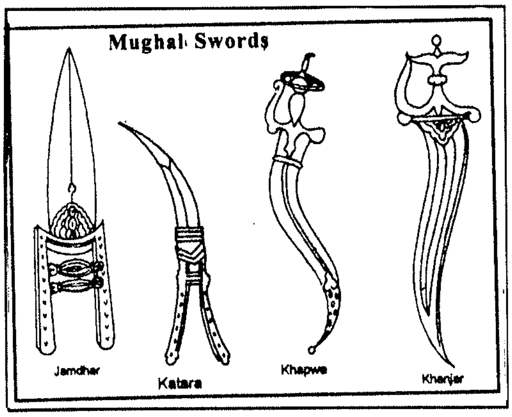

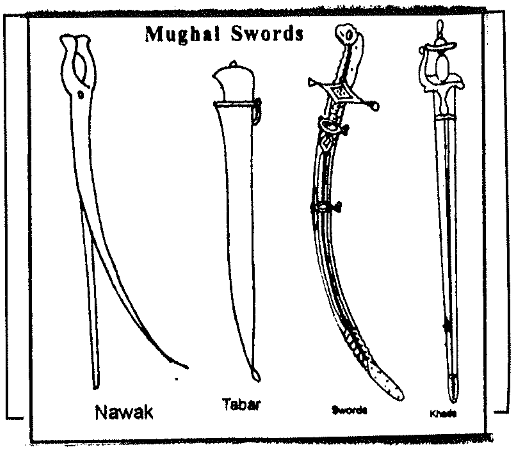

سرکار (Sarkar) سورت میں چکھلی کے ساحلی شہر میں بھی لوہے کی کانیں تھیں۔

لوہا پگھلانے کا عمل شدید محنت کا تھا۔ جس میں غیر ترقی پذیر بھٹیاں اور اوزار استعمال کئے جاتے تھے۔ (دیکھیں اکائی 23) زیر زمین کانوں کے کوئی دستور نہیں تھا۔ بلکہ سطح زمین کے قریب سے ہی کچی دھاتوں کو نکالا جاتا تھے۔ اکثر جب ایک کان ختم ہو جایا کرتی تھی تو

دوسری کم گہری کھان دوسری جگہ کھود لی جاتی تھی۔ بنگلور کے پاس کے علاقے میں ریت ملے لوہے کے تہہ نشین مادہ کو برساتی موسم میں جمع کیا جاتا تھا۔ بعد میں ریت کو دھو کر مٹی ہٹا دی جاتی تھی۔ پھر اس کو گلایا جاتا تھا۔

لوہا پیداوار میں تلواروں کو اپنی بے حد عمدہ قسموں کے لئے ہندوستان کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ کماوں اپنی تلواروں اور کٹاروں کے لئے مشہور تھا۔ کورج تلواروں کی مشہور قسمیں کچھ (Kutch) علاقے سے حاصل شدہ لوہے سے بنتی تھیں۔ اندلوئی (نظام آباد کے قریب) تلواروں، کٹاروں، بھالوں کی پیداوار کا ایک اہم مرکز تھا۔ یہاں زیادہ تر کالا گھاٹ پہاڑیوں سے حاصل ہونے والا خام مال استعمال ہوتا تھا۔ احمد آباد اپنے اسلحہ پیداور کے لئے مشہور تھا۔ جبکہ پاٹن اپنی تلواروں کے لئے مشہور تھا۔ کیونکہ وہاں کے کنوؤں کا پانی لوہے کو عمدہ سختی دیتا تھا۔

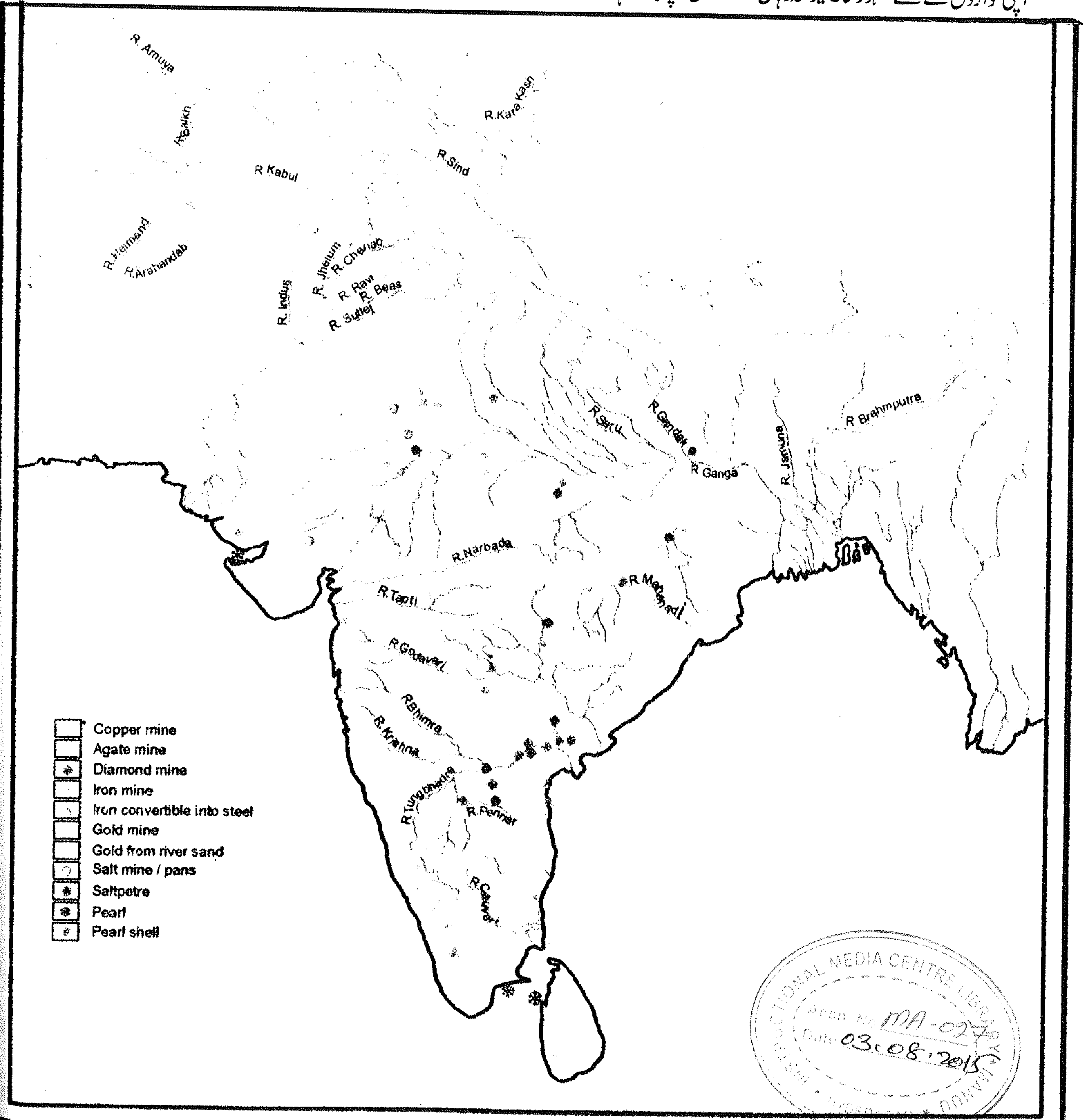

MEDIA CENTRE LIBRARY
Accn. No. MA-0274
Date 03.08.2015

مغل سلطنت میں معدنیات اور کانیں

ماخذ، عرفان حبیب، این ایٹلس آف دی مغل ایمپائر: پولیٹیکل اینڈ اکنومک میپس، او۔ یو۔ پی۔ دہلی 1982

18.4 معدنیات

عہد وسطیٰ میں کانوں سے کان کنی کئے جانے والے معدنیات کی اشیاء میں نمک، شورہ، نوشادر، گندھک، اور سہاگہ تھے۔ سہاگہ شمالی بہار کی پہاڑیوں سے حاصل ہوتا تھا۔ تھانیسر اپنی نوشادر کی پیداوار کے لئے جانا جاتا تھا۔ جب کے گندھک کی کانیں ملک میں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں

18.4.1 نمک

مشہور سالٹ رینج میں نمک کی پیداوار ممکنہ طور پر ہوان چوانگ (ہیون سانگ 645-629) کے وقت سے قبل ہی بنا رکاوٹ ہوتی چلی آرہی ہے۔ کانوں سے حاصل ہونے والی پیداوار کے حصہ کی تقسیم کے پیٹرن پر تنقید کرتے ہوئے ابوالفضل تحریر کرتا ہے کہ کان سے نکالے گئے نمک کا 4\3 حصہ مزدور کا ہوتا تھا۔ جبکہ نمک ڈھونے والے کو 4\1 دیا جاتا تھا۔ مالک کی فیس 10 دام (40 دام = ایک روپیہ) فی بار بردار ہوتی تھی۔ راجستھان میں ڈیڈوانہ، سانبھر اور پچ پردا سے لے کر کچھ کے رن کا علاقہ نمک کی پیداوار کا سب سے بڑا علاقہ تھا۔ نینسی اکیلے پچ پردا علاقے میں 325-300 نمک کے گھڈوں کا تذکرہ کرتا ہے مارواڑ علاقے میں کھاروال طبقہ نمک کی پیداوار سے ہی منسلک تھا۔ مغربی راجستھان میں نمک کے اخراج کے دو طریقے رائج تھے۔ یا تو گھڈے کھود کر (آگار) یا پھر زمین کے ٹکڑے (پرتال) پر پانی پھیلا کر (بھدانی 1999)۔ نمک میواڑ سے بنجاروں کے ذریعے راجستھان کے مختلف علاقوں میں پہونچایا جاتا تھا اور پنجاب میں مقامی بنیوں کے ذریعہ۔ مگر ریلوے لائنوں کی وجہ سے اس علاقے میں اس کاروبار کو کافی نقصان پہونچا۔ بھدانی کے مطابق 1660 کے دہے ہیں اس میدان میں کام کرنے والے نمک مزدوروں کی تعداد تقریباً 2965-2922 تھی۔ جبکہ 1891 میں یہ کم ہوکر 828 رہ گئی۔ نمک کی آگرہ سے بنگال تک کافی مقدار میں (کم سے کم 10,000 ٹن تک سالانہ) تجارت کی جاتی تھی۔ گجرات کے ساحل پر سرکار بھڑوچ نمک پیداوار کا مرکز تھا۔

کونکن بھی نمک کی پیداوار کے لئے مشہور تھا۔ پین، پنویل، ناگوتھانے، ریوڈنڈا اور تھانہ (سبھی جدید تھانہ اور کولابہ میں) نمک کے مشہور مراکز تھے۔ یہاں زیادہ تر کاشتکار و کسان نمک پیدا کرتے تھے۔ گویا کہ اسطرح یہ زراعت کی معاون پیدااور کی شکل میں کام کرتے تھے۔ شیواجی کے عہد حکومت میں نمک بنانے والوں کو گوواکے پرتگالیوں کے ساتھ سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کرناٹک میں نمک بنانے والوں کو اُپالگ اور اپالیکار کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اوران کی تنظیم کو بیساوکلو کے نام سے جانتے تھے۔ کرناٹک میں دیگر پیشوں کی طرح نمک تیار کرنے والوں کا جنگجوؤں اور فوجیوں کی شکل میں ریاستی خدمت میں حصہ لینا ایک عام دستور تھا۔

18.4.2 شورہ

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے اندر شورہ کا استعمال بارود (Gun powder) اور خنک سازی (Refrigeration) کے لئے ہوتا تھا۔ اسکی اونچی قیمت کی وجہ سے اس بات کا امکان کم ہی کہ خنک سازی کے لئے اس کا استعمال عام آدمی کے لئے دستیاب رہا ہو۔ بہار سے آنے والا شورہ بارود کے استعمال میں سب عمدہ مانا جاتا تھا۔ بہار میں پٹنہ اور سرن اسکی پیداوار کے لئے کافی مشہور تھے۔ احمد آباد اور آگرہ اسکی پیداوار کے دوسرے مرکز تھے۔ چال بابرا اور مالپور سرکار احمد آباد، شورہ کی پیداوار کے بہت ہی اہم مرکز تھے۔ مغربی راجستھان میں یہ ریاستی خرچ کی اہم چیز تھی۔ یہ جالور سے حاصل کیا جاتا تھا۔ پلسارٹ (تقریباً 1626ء) شورہ کو تیار کرنے کا مفصل ذکر پیش کرتا ہے۔

> یہ تین طرح کی مٹیوں سے بنایا جاتا تھا۔ کالی، پیلی اور سفید۔ لیکن کالی مٹی جو نمک یا کھارے پن سے آزاد ہوتی ہے، اس سے حاصل شورہ بہت عمدہ کوالٹی کا ہوتا ہے۔ اس کو بنانے کا طریقہ ذیل میں تحریر ہے۔ نمک کے کڑھاؤں کی ہی طرح سے زمین پر دو اتھلے آبی مرکز بنائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک بمقابل دوسرے کے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ بڑا والا نمکین مٹی سے بھر دیا جاتا ہے اور پھر زمین میں ایک نالی کے ذریعہ پانی بھرا جاتا ہے۔ مٹی کو متعدد مزدوروں کے ذریعے تب تک اچھی طرح سے کچلا جاتا ہے جب تک وہ آپس میں ملکر بالکل پتلی نہ ہو جائے۔ پھر اسکو دو روز تک یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تاکہ پانی سارے مادّہ کو خشک کرلے۔ پانی کو پھر دوسرے آبی مرکز میں ایک بڑی نالی کے ذریعہ بہا کر لیجایا جاتا

ہے۔ جہاں مادہ نیچے تلی میں بیٹھ جاتا ہے جو خام شورہ ہوتا ہے۔ اس کو ایک یا دوبارہ لوہے کے کڑھاوں میں خشک کیا جاتا ہے۔ جو سفیدی اور خالص پن کے درجہ کے حساب سے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس پر سے لگاتار میل اتارتے رہتے ہیں جب تک کوئی گندگی نہ رہے۔ اس کو پھر مٹی کے بڑے بڑے مرتبانوں میں رکھا جاتا ہے۔ جن میں ایک مرتباں میں تقریباً 25 سے 30 پاونڈ تک آتا ہے۔ رات کو شبنم گرنے سے اس پر ایک پپڑی جم جاتی ہے۔ اور اگر کوئی گندگی پھر بھی رہ جاتی ہے تو وہ تلی میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر ان برتنوں کو توڑ دیا جاتا ہے۔ اور شورہ کو دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔

18.5 تعمیر عمارات (فن تعمیر)

عمدہ تعمیری جڑائی کے مسالے (چونا گارا) اور نئی تکنیکوں (محراب اور گنبد) کی شروعات کے ساتھ ہی ہمیں شہروں میں اینٹ سے بنے مکانوں میں تیز اضافہ دکھائی دیتا ہے۔ علاالدین خلجی نے اپنے محلوں کے تعمیر کے لئے 70,000 کاریگروں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ بابر کے ذریعہ اپنے محلوں کی تعمیر کے لئے لگائے گئے کاریگروں میں صرف پتھر تراشوں کی تعداد 1491 تھی۔

مغل راج مستری مصروف کار، اکبر نامہ

محلوں کی تعمیر میں انجینیر وں (مہندس) اور معماروں نیز ٹھیکیدار (بلڈر) (بناع) کا کردار بہت اہم ہوتا تھا۔ پہلے محل کی 'طرح' (نقشہ/منصوبہ) کاغذ پر بنایا جاتا تھا اور عمارت 'محل' طرح' کے مطابق ہی تعمیر کیا جاتا تھا۔ ماہر فن معمار کو استاد کہا جاتا تھا۔ شاجہاں آباد کے قلعے کی تعمیر کے واسطے استاد احمد اور استاد حامد مقرر کئے گئے تھے۔ بابر نامہ سے حاصل ایک تصویر میں بابر کو باغیچے کے ایک نقشہ کو دیکھتا ہوا مصور کیا گیا ہے۔ باغات مغلیہ محلوں کی تعمیری سرگرمیوں کا ایک حصہ ہوا کرتے تھے۔ کرناٹک میں معماروں اور ٹھیکیداروں (بلڈروں) کو رووراری، روپ کار، شلپی، آچاری اور آچاریہ وغیرہ ناموں سے جانا جاتا تھا۔ وہ تالاب اور مندروں وغیرہ کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔

پختہ اور دھوپ میں خشک شدہ دونوں ہی طرح کی اینٹیں اور پتھر اہم تعمیری اشیاء تھیں۔ دوسری تعمیری شے چونا، چونا۔ گاراتھی۔ سرخ ریتیلا پتھر فتح پور سکری اور روپ باس کی کانوں سے لایا جاتا تھا۔ بہار بھی پتھر اور پالش کے لئے مشہور تھا۔ راجستھان کے پھلودی علاقے میں پتھر کی دو کانیں تھیں۔ ابوالفضل بہار کے راجگیر اور گیا زیورسازی میں استعمال ہونے والے سنگ مرمر کی دو کانوں کی موجودگی کے ضمن میں تذکرہ کرتا ہے۔ سنگ مرمر مارواڑ کی کانوں سے بھی نکالا جاتا تھا۔ تاج محل کے لئے سنگ مرمر اُدے پور (راجستھان) سے لایا گیا تھا۔ پتھر گاڑی سے لائے جاتے تھے۔ چونا بھڑوچ اور پٹیالی (علی گڑھ کے قریب) کی کانوں لایا جاتا تھا۔ چونا پتھر کا استعمال سفیدی (پتائی) کے واسطے بھی کیا جاتا تھا۔ گجرات میں سنگ مہتابی (چونے کی ایک قسم) اپنے چکنے پن اور سفیدی پن کے لئے مشہور تھا۔ بنگال کے علاقے میں چونا سمندری سیپ، وغیرہ سے تیار کیا جاتا تھا۔ چونا گارا بنانے کے لئے سرخی (کوٹ کر چورا شدہ اینٹ) کا استعمال کیا جاتا تھا۔

بیلدار کو بنیاد بھرنے میں مہارت حاصل ہوتی تھیں۔ سنگ تراش پتھر کی کٹائی کا کام کرتا تھا۔ گر بیل بوٹے (نقش ونگاری) بنانے والے (عکس اتارنے والے، نقاش) جڑائی کرنے والے (پراچین کار) علاحدہ علاحدہ ہوتے تھے۔ اینٹ کی چنائی کرنے والے (راج) علاحدہ درجہ میں آتے تھے۔ لوہار اگر چہ تعمیری سرگرمیوں میں اہم کردار نبھاتے تھے جیسا کہ مغلیہ عہد کی تصویروں سے ثابت ہوتا ہے مگر ایک اہم بات یہ ہے کہ مکانوں کی تعمیر سے متعلق مزدوروں کی ابوالفضل کی فہرست میں نظر نہیں آتے۔

نجار اور آرہ کش مکانات کی تعمیر کا اہم حصہ تھے۔ کرناٹک میں یہ بڈاگی اور وراڈھاگی کے نام سے مشہور تھے۔ جنگی حیثیت رتھکار کے مساوی تھی۔ 14 ویں صدی میں کیرالہ میں ارنجال کٹ مندر مین تک کٹا کمل (دستکار، پروہت اور ایک بڑھئی) کا تذکرہ مندر کے تعمیری کاموں کے ذمہ دار کی شکل میں ملتا ہے۔ وہ

فتح پور سکری کی تعمیرات کا معائنہ کرتے ہوئے اکبر (اکبر نامہ کا ایک صفحہ)۔

دیہی و شہری معاشیات دونوں میں مساوی طور پر اہم تھے۔ دیہی سماج میں زراعتی اوزار و بیل گاڑیوں کو بنانے کے لئے وہ حد درجہ ضروری تھے۔

18.6 دیگر دستکاریاں

عہد وسطیٰ میں مختلف دستکاریوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہمیں بانس کی اشیاء بنانے والے (مہاراشٹر میں کومتی)، بت فروش جوڑیوں کے تاجر (مہاراشٹر میں کاسر) وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ کیمبے اپنے لکڑی کے فرنیچر، عطریات وغیرہ کے لئے مشہور تھا۔ بڑودہ میں تیار فرنیچر بصرہ تک بر آمد ہوتا تھا۔ احمد آباد (گجرات) اور سنبھل (اتر پردیش) کاغذ کی صنعت کے اہم مرکز تھے۔ سیالکوٹ اور سرہند (پنجاب) میں کاغذ کی مختلف اقسام بنانے کے لئے مشہور تھے۔ (تکنیکی تفصیل کے لئے اکائی 23 کا مطالعہ کریں) وان ٹوئسٹ (تقریباً 1638) نقل کرتا ہے کہ احمد آباد کاغذ کی پیداوار کے خام مال کے لئے مالابار ساحل پر منحصر تھا۔ احمد آباد میں سندور، پارے سے تیار کیا جاتا تھا۔ سورت اس کی پیداوار کے لئے ایک اور اہم مرکز تھا۔

کمہار دیہی سماج کا اہم حصہ تھے۔ پٹنہ کے کمہار مٹی کی برتن سازی کے لئے مشہور تھے۔ ان کے برتن اتنے عمدہ قسم کے ہوتے تھے کہ ان کی موٹائی کاغذ کی طرح بالکل باریک سی ہوتی تھی۔ یہ ایک نادر چیز کی شکل ہیں متفرق علاقوں کو بھیجے جاتے تھے۔ کمہاروں کو ان کی خدمات کے عوض زمین عطیہ یا فصل کے دو مقررہ حصہ دینے کا دستور تھا۔ جنوبی ہند میں وہ جنگجوؤں کی شکل میں کام کرتے تھے۔

چرم سازی ہی صرف ایسا واحد پیشہ تھا جس کا کام صرف چمار برادری کے لوگوں پر منحصر تھا۔ کاٹھی/ زین، بالٹیاں، چمڑے کے مرتبان، جوتے اور اس طرح کی دیگر متعدد اشیاء چمڑے سے بنائی جاتی تھیں۔ سرہند ترکش سازی، ساق پوش، جوتوں اور سینڈلوں کے لئے مشہور تھا۔ گینڈے کی کھال سے سنبھل میں عمدہ قسم کی ڈھالیں تیار کی جاتی تھیں۔ جبکہ کیمبے میں ڈھالیں کچھوے کے خول سے تیار کی جاتی تھیں۔

18.7 دستکاری پیداوار کی تنظیم

جہاں تک غیر زراعتی پیداواروں کا تعلق ہے پورے برصغیر میں زیادہ تر ایک طرح کا پیٹرن ملتا ہے۔ زیادہ تر دستکاری پیداواروں میں دیہی شہری خصوصیت موجود تھی۔ 'ذات' پیداواری عمل میں اہم کردار نبھاتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دستکار یا ایسی بھی تھیں جو دیہی سماج سے منسلک تھی جبکہ بعض آزاد آجر بھی موجود تھے۔ ہم غیر زراعتی پیداواری نظام کی عام طور پر چار حصوں میں اس کی درجہ بندی کرتے ہیں (الف) دیہی دستکار (ب) اپنے خود کے اوزار اور سرمایہ کے ذریعہ پیداوار کرنے والے دستکار (ج) دادنی یا پٹنگ آوٹ (putting out system) نظام جہاں دستکاروں کو پیسہ یا خام مال بطور پیشگی دیا جاتا تھا۔ (د) کارخانے۔

عموماً دیہات ہی پیداوار کی بنیادی اکائی ہوتے تھے۔ عہد وسطیٰ میں ہر ایک گاؤں میں دستکار ہوتے تھے جو کہ دیہی سماج سے منسلک ہوا کرتے تھے۔ ان کو مہاراشٹر میں بلوتے دار اور جنوبی ہند میں آئیگر کہا جاتا تھا۔ ان کی خدمات سے پورا گاؤں مستفید ہوتا تھا۔ اور زیادہ تر ان کی پیداوار بازار میں فروختگی کے مقصد سے نہیں کی جاتی تھی۔ مگر ماہر فن دستکار اپنی مصنوعات قصبہ کے بازار میں ہی فروخت کرتے تھے۔ جوتے، کمبل، کپڑا اور لکڑی کے سامان اسی زمرہ سے تھے۔ سابقہ اکائی میں ہم گاؤں کے سماج کے حوالہ سے ان کا کردار اور کارگزاریوں پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ ہم یہاں دوسری تین اقسام کے تحت، کہ کس طرح پیداوار کا انتظام کیا جاتا تھا، پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

18.7.1 آزاد دستکاری پیداوار

عہد وسطیٰ میں ممکن طور پر کوئی متحدہ مزدور طاقت موجود نہیں تھی۔ دستکار انفرادی طور پر اپنی یا خاندان کی محنت سے اپنے اپنے گھروں میں اپنے ہی سرمایہ سے مصنوعات کی پیداوار کرتے تھے۔ حالانکہ ان کے ذریعہ مستعمل آلات بھونڈے ہوتے تھے اس کے باوجود انھوں نے اعلیٰ مہارت حاصل کر لی تھی۔ مارکس نے اسکو ایشیائی طریقہ پیداوار (Asiatic mode of production) اور چھوٹے پیمانہ (Petty) کی پیداوار طریقہ کار سے موسوم کیا۔ جبکہ مورلینڈ اسکو آزاد دستکاری پیداوار (Artisanal system of production) نظام کہتے ہیں۔ مگر عرفان حبیب اسکو عہد وسطیٰ میں ہندوستانی پیداوار (Medieval Indian Production) سے تعبیر کرتے ہیں۔

شمالی ہندوستان میں خصوصاً مغل عہد میں ریاست ہی سب سے بڑی آجر (Producer) تھی۔ عمدہ ماہر فن دستکار ریاست کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ پھر بھی بڑی تعداد میں دست کار آزادانہ طور پر دستکاری پیداوار کرتے تھے اور مقامی استعمال کی اشیاء کی پیداوار کرنے کی انھیں آزادی حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ان کے ذریعہ تیار کردہ اشیاء کی مانگ دور دراز کے بازاروں میں بھی تھی۔ لاہور قالین بافی کے لئے مشہور تھا۔ منوچی (1772-1656) ذکر کرتا ہے کہ لاہور شہر میں اونی اشیاء کی 20 قسمیں آگرہ بازار میں فروخت کی جاتی تھیں۔

غیر زراعتی پیداوار کی جڑیں زراعت کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ تھیں۔ مغلیہ عہد پر تنقید کرتے ہوئے پتن رائے چودھری (کیمبرج 1982) کا ماننا ہے کہ مغلیہ عہد میں ہندوستان میں غیر زراعتی پیداوار زیادہ تر ایک دیہی سرگرمی تھی۔ اگر چہ زیادہ تر شہری مرکزوں میں بھی خاص طور پر آرام دہ اور نیم آرام دہ اشیاء دستکار تیار کرتے تھے۔ بنکر اور رنگریز گاؤں خدمات میں کوئی حصہ نہیں تھے۔ مگر بنیادا گاؤں سے ہی متعلق تھی۔ سوت کتائی (Spinning) مستقل طور پر عورتوں کے ذریعہ نقد رقم مزدوری کے عوض انجام دی جاتی تھی۔ بنکر آزادانہ کتائی کرنے والے لوگوں ہی سے سوت خریدتے تھے۔ سوت تیار کرنے کے اہم مرکز تھے: بالاسور، قاسم بازار اور بھڑوچ۔ روئی دھننے والے (نداف) آج بھی گاؤں میں گھر گھر جا کر اور شہروں میں بھی اپنی خدمات اجرت کے عوض پیش کرتے ہیں۔ دستکار خصوصاً بنکر اور تیلی اپنی مصنوعات کو نزدیکی بازاروں میں فروخت کیا کرتے تھے۔ فوکازاوا (1982) حالانکہ پاتے ہیں کہ دکن میں بنکر اور رنگریز دیہی کے بجائے شہری زیادہ تھے۔ جنوب میں بھی وہ مندر۔ شہروں کا اہم حصہ تھے۔ ہندوستان میں 17 ویں صدی کی کپڑا پیداوار کا ذکر کرتے ہوئے کے۔ این۔ چودھری کا خیال ہے کہ شمال میں یہ شہر مرکوز زیادہ تھی جبکہ جنوب اور بنگال میں اسکی پیداوار سارے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

جنوبی ہندوستان میں مختلف پیشوں وذاتوں کے دستکاروں کے عموماً اجتماعی شناخت ہوتی تھی جیسے پنچالا (کرناٹک) پنچ نامور (آندھرا پردیش) اور کمالار (تامل ناڈو)۔ یہاں مندر شہر کی ترقی اور ظہور کے مرکز میں دستکار ہی پیش پیش تھے۔ دستکار نہ صرف تعمیری سرگرمیوں میں ایک اہم ذمہ داری نبھاتے تھے بلکہ وہ مندر کے احاطہ کا ایک حصہ بھی ہوتے تھے۔ مندروں کے احاطہ میں انکی بستیوں کو ترو مڈیلگم کہا جاتا تھا۔ دلچسپ بات ہے کہ مندر کی تعمیر میں دستکاروں کی حالت گاؤں میں مصروف ان کے فریق جیسے لوہار وغیرہ سے کافی مختلف تھی۔ ان کے درمیان بڑا سماجی اقتصادی فرق موجود تھا۔ (وجیاراماسوامی 2003) یہ بہت ہی اہم ہے کہ جنوبی ہند میں اگر چہ کارخانوں کی طرح کی کوئی تنظیم ہمیں نہیں ملی، مندر سے منسلک دستکاروں کے ضمن میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انھیں مندر کی سرپرستی اور نظم ونسق میں حصہ لینے کا حق بھی حاصل تھا۔ وہ مندر کے لئے کام کرتے تھے۔ بت ساز دستکاروں کو سرکار کی طرف سے سرپرستی حاصل ہوتی تھی۔ (وجیاراماسوامی، 2003) مگر کارخانوں میں کام کرنے والے دستکاروں سے جدا یہ نہ صرف اپنے سرپرستوں کو اپنی مصنوعات کی رسد کرتے تھے بلکہ بازار میں بھی یہ اپنی مصنوعات فروخت کرتے تھے۔

یوروپی فیکٹرس (factors) بچولیوں (دلالوں) کے ذریعہ سے کام کرتے تھے۔ یہ دلال ان کو دور دراز علاقوں سے مال حاصل کرانے میں تعاون دیتے تھے۔ بنکروں، سوتی کپڑوں کی چھپائی کرنے والوں، وغیرہ دستکاروں کو پیشگی رقم دی جاتی تھی۔ اگر چہ شروع شروع میں اس اقدام سے بنکروں کو تعاون حاصل ہوا مگر آگے چلکر اس نے پیداوار کے عمل میں تاجروں کی دخل اندازی کی جانب مزید منتقل کیا۔ سپلائی کو یقینی بنانے کے لئے یوروپی کمپنیوں نے آہستہ آہستہ کارخانوں کے نزدیک ہی قیام پذیر ہونے پر آمادہ کیا۔ اس سے بنکر آبادیوں میں تیزی سے اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں نئے رہائشی پیٹرن اور نئے مساواتی پہلوؤں کا ظہور ہوا۔ پانڈیچیری کے قریب کے گاؤں میں فرانسیسیوں نے بنکروں کو آباد کرنے کے لئے تقریباً 30,000 پیگوڈا پیشگی رقم عطا کی۔ دلچسپ بات یہ ہے فرانکوس مارٹن کے ذریعہ ملازم رکھے گئے مقامی فوجیوں کو امن کے وقت بنائی کے کام کے واسطے استعمال کیا جاتا تھا۔

ہم کو اس بات کا مکمل طور پر علم نہیں ہے کہ یہ گلڈس کس حد تک اس زمانہ میں قائم رہیں یا ان گلڈوں کا کوئی رسمی جماعتی نظم موجود تھا یا نہیں۔ مگر ایک ہی پیشہ کے لوگ شہر/گاؤں کے ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ مہاراشٹر میں بنیادی پیشہ ور تنظیم ذات برادری ہوتی تھی۔ ہم کو دکن میں مہتار (کھیا) کا حوالہ ملتا ہے۔ برٹن اسٹائن کی دلیل ہے کہ چول عہد کی مضبوط تجارتی گلڈیں مرکزی نوکر شاہی کے قیام کی وجہ سے وجے نگر عہد حکومت میں روبہ زوال ہوگئیں۔ مگر وجے راما سوامی (1985:82) اس کی مخالفت کرتی نظر آتی ہیں کہ 16 ویں صدی عیسوی میں کپڑا تجارت ایاوولے گلڈ کے ہاتھوں میں ہی بنی رہی اور کپڑا صنعت

کے ساتھ اس کا تعلق 17 ویں صدی کے آخر تک قائم رہا۔ہمیں 17 ویں صدی میں ائی راوار، ناگرتار اور چولیاؤں کے حوالے ملتے ہیں۔مگر پھر بھی ان کی طاقت اور خوشحالی میں پہلے کی صدیوں کے مقابلے اس زمانے میں ایک یقینی زوال دکھائی دیتا محسوس ہوتا ہے۔گلڈوں کی گراوٹ نے تاجروں کو بذات خود ایک زمین گروپ کے ساتھ تعلق رکھنے پر مجبور کیا جو اس عہد میں ایک طاقتور نجی زمین مالکوں کی شکل میں ظہور میں آئے نیز چتر میلی، پیریاناڈو کی شکل میں منظم ہوئے۔

اس زمانہ میں جنوبی ہند میں بنکر۔تاجروں یا ماسٹر بنکروں کے ذریعہ اپنے ماتحت دستکاروں کو کام پر رکھنے کی رسم کا ظہور ہوا۔اس کا زائد فائدہ یہ ہوا کہ اس نے نہ صرف دستکاروں کو بلکہ پورے خاندان کی خدمات کو بھی یقینی بنا دیا۔ڈچوں کے اس قسم کے تجارتی تعلقات سب سے زیادہ تھے۔اس طرح کی پابندیاں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سالا اور جان راور کے بنکر طبقہ کے ماسٹر بنکروں کے ساتھ لگائی گئیں۔ایسے معاملہ میں ماسٹر بنکر اس طرح بنکروں کے ساتھ ساتھ کمپنی کے مفادات کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔

ہمارے عہد کا ایک نیا رجحان تھا۔والوڈیلم پٹو علاقے کے کیک کولاؤں (بنکروں) خاص طور پر پین نئی اور گاڈیلم کی نچلی وادی میں اور کن مالا (دھات کا کام کرنے والے) کی بڑھتی ہوئی طاقت، مقامی انتظامیہ اور مندر کے انتظامیہ کے ساتھ ان کا تعلق انکی بڑھتی ہوئی طاقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ 16 ویں صدی عیسوی کے ریکارڈوں کے مطابق کنامالوں کو کنک کائی، پوڈی، پری وٹّم اور مگن ٹوڈی سے رعایت حاصل تھی۔

دستکار نہ تو معاشی حیثیت سے خوشحال تھے نہ ہی ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔پلسارٹ (تقریباً 1626ء) دستکاروں کی حالت زار پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے نقل کرتا ہے۔کہ'مزدوروں کے لئے دو مشکلات تھیں پہلی کم مزدوری دوسری (مشکل)، گورنر، حکمراں طبقہ، دیوان، کوتوال، بخشی، و دیگر سرکاری افسران کے ذریعہ (ان کا استحصال)۔اگر ان میں سے کسی کو کامگار کی ضرورت واقع ہوتی ہے، تو اس آدمی سے یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ کیا وہ اس کام پر چلنے کو راضی ہے۔انکار کرنے پر اس کو زبردست طریقے سے پیٹا جاتا ہے۔اور پھر شام کو اسکو اسکی نصف مزدوری ہی سونپ دی جاتی ہے۔یا پھر کچھ بھی نہیں دیا جاتا ہے۔برنیر (1656) نے بھی مغلیہ عہد میں ہندوستان کے دستکاروں کی اس وقت کی حالت پر اس طرح کی تنقید کی ہے۔'دولت مند آدمی ہر ایک چیز سستی قیمت پر خریدے گا۔جب ایک امیر یا منصب دار کو کسی دستکار کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اسکو بزور طاقت اگر ضرورت ہو تو، بازار سے بلا لیتا ہے، تاکہ وہ بے چارہ اس کا کام کرے اور جب کام ختم ہو جائے تو وہ اس کی محنت کی قیمت نہیں ادا کرتا ہے بلکہ اپنے خود کے محنت کے معیار پر، دستکار خود کو خوش نصیب مانتا ہے اگر پیسہ کی جگہ اس کو کوڑا (پٹائی) کھانے کو نہ ملے'۔

شمالی ہند میں کچھ ذاتوں کی تنظیم کے ذریعہ ان کے استحصال کے خلاف کبھی کبھی مخالفت و احتجاجات کے حوالے بھی ملتے ہیں۔اسی طرح دستکاروں کی جانب سے بھی ہمیں احتجاج کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔1630 میں بڑودہ میں بنکروں نے انگریزوں کے روبرو شرط رکھی تھی کہ جب تک وہ بازار سے سوت خریدنا نہ بند کر دیں ان کو بافتہ کی رسد نہیں کریں گے۔کیونکہ ان کے اس عمل کی وجہ سے سوت کی قیمت بازار میں بہت بڑھ گئی تھی۔اسی طرح انگریز فیکٹر (36-1634) بڑودہ ہی کے ایک معاملہ کا تذکرہ کرتا ہے جہاں بنکروں نے فوجدار کو اسکے ذریعہ بتائی گئی قیمتوں سے کپڑا فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور شہر ترک کرنے کی دھمکی بھی دی۔عوامی تحریکوں میں دستکاروں کی از حد گہری حصہ داری خصوصاً ستنامی بغاوت، استحصال کے خلاف دستکاروں کی مخالفت کی علامات ظاہر کرتی ہے۔

جنوبی ہند کی دستکار تنظیموں نے اجتماعی 'سودے بازی' میں سرگرم رول ادا کیا اور بڑھتے ٹیکسوں کے خلاف مظاہرہ کئے۔1513 میں کرشن دیورائے کے ذریعہ کرگھا ٹیکس میں اضافہ بنکروں کا احتجاج اجتماعی ہجرت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ابے کیرے (74-1672) نقل کرتا ہے کہ (کمالار دستکاروں کے بیچ) ایک مضبوط رسم تھی کہ اگر ان میں کسی کے ساتھ زیادتی کی جاتی تھی یا غلطی سے اسکو پکڑ لیا جاتا تھا تو دوسرے سبھی اپنی دکانیں بند کر دیتے ہیں اور کام کرنا ترک کر دیتے ہیں۔

اس روداد کا دوسرا پہلو یعنی دستکاروں کی طرف سے دھوکا دھڑی کے معاملے بھی درج ہیں۔ اگر چہ ایسی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔ انگریز فیکٹر کبھی کبھی شکایت کرتے تھے کہ رنگریز کبھی کبھی آدھے رنگے کپڑے ہی سپلائی کر دیتے تھے۔ گجرات کے قحط کے بعد نیل کی پیداوار میں بہت تیزی سے کمی واقع ہوئی تو نیل کے پیدا کرنے والوں نے نیل میں ریت یا تیل وغیرہ کی آمیزش شروع کر دی۔

18.7.2 دادنی

''دادن'' دراصل ایک فارسی لفظ ہے۔ عموماً تاجروں کے ذریعہ بنکروں کو پیشگی رقم دی جاتی تھی۔ مگر تاجروں کے ذریعہ لگایا گیا سرمایہ نقدی یا خام مال کی بھی صورت میں ہوسکتا تھا۔ دراصل کاریگر دستکار اپنی ذاتی پونجی اپنی مصنوعات پیداوار میں صرف نہ کرتا تھا مگر پھر بھی چونکہ وہ چیزوں کی بنانے میں اپنے اوزاروں کو استعمال میں لاتا تھا۔ جنوبی ہند میں ورلاگ نظام دادنی کی ہی طرح تھی۔ جہاں پر تاجر بنکروں کو خام مال بطور پیشگی دیا کرتے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں یہ طریقہ یوروپی تجارتی کمپنیوں کے زیر اثر شروع ہوا جنکو کپڑے کی مخصوص اقسام کی خواہش تھی۔ اس طرح اس میں مطلوبہ مقدار اور قسم سرمایہ دار کے ذریعہ ہی طے اور مقرر کی جاتی تھی۔ جبکہ اوزاروں اور محنت پر ابھی بھی دستکاروں کا ہی قبضہ تھا۔ اس طرح خام مال منتخب کرنے اور تیاری۔ پیداوار کے لحاظ سے کاریگر کی پسند محدود ہو گئی تھی ان کی جدت پسندی کپڑوں کے مخصوص ڈیزائن اور اچھی قسموں کے کپڑے دینے کے تاجروں یا کمپنیوں کے احکام میں دب کر رہ گئی۔ یوروپی فیکٹریوں کے ذریعہ احکام جاری کئے جاتے تھے کہ جو مال تم بھیجو گے ہماری خواہش ہے کہ اسکی زمین حد درجہ سفید ہو اور رضائیوں کے بیچ میں پھول پتیاں ہوں جب کہ ابھی رضائیوں کی زمین بھدے سرخ رنگ کی ہوتی ہے۔ جو یہاں اتنی پسند نہیں کی جاتی ہے۔ (وجیا راما سوامی 1985)۔ سرمایہ کار کوئی دلال یا تاجر بھی ہوسکتا تھا۔ ان تاجروں کا یہ طریقہ کار تھا کہ وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سرمایہ کاری علاقوں پر اجارہ داری جمانے کی اور کبھی کبھی وہ اشیاء کی قیمتوں پر بھی اثر انداز ہونے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ پلسارٹ (تقریباً 1626ء) نقل کرتا ہے کہ نیل پیدا کرنے والوں کو پیشگی رقم دینے کا دستور بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ کبھی کبھی ایک من نیل کی بازار قیمت صرف 36-35 روپئے ہی ہوتی تھی۔ جبکہ پیشگی رقم دینے پر صرف 25-24 روپے کے عوض ہی دستیاب ہوتا تھا۔ اس طرح تاجر پیداوار پر بلاواسطہ منتظم بنکر ابھرے۔ 17 ویں صدی میں ہمکو تجارتی تنظیموں کے برخلاف آزاد تاجروں کا تذکرہ زیادہ ملتا ہے۔ جن میں کچھ مشہور نام تھے: میر جملہ، ویرجی بوہرہ، چتا کاسی، ویرنا، شیشا داری، وردپا وغیرہ۔ ان لوگوں کے پاس کافی سیاسی قوت بھی تھی۔ جس وقت چتا کی ڈچوں سے دشمنی شروع ہوئی تو اس نے سینٹ گل ڈریا کی قلعہ بندی کر دی۔ حالانکہ وہ اپنی اسی کوشش میں ناکام رہا۔ مذکورہ بالا تاجروں نے اپنی حیثیت سے زیادہ کاریگروں کا استحصال کیا۔ سورت کے سوجی چت پیشگی دی گئی پونجی پر دستکاروں سے سود وصول کیا کرتے تھے۔ وہ اس رقم پر ایک فیصد سود کی بجائے 12 فیصد سود وصول کرتے تھے۔ دراصل بنکر اشیاء کی قسم کا انتخاب کرنے، پیداوار کی مقدار مقرر کرنے اور ان کے سب کے علاوہ سب سے زیادہ اہم تیار شدہ مال کی قیمت طے کرنے میں بھی اپنی آزادی ختم کر چکے تھے۔ اس نے عملی طور پر ان کو کرائے کے مزدوروں کی سطح پر لا کھڑا کر دیا اور ان کے درمیان صرف ایک باریک لکیر ہی انہیں الگ کرتی تھی۔ مگر کبھی کبھی یہ لوگ ان کو حاکمانہ سرکوبیوں سے بچالیتے تھے۔ یہ تاجر۔ دلال، کمپنی اور کاریگروں کے درمیان ایک مضبوط سلسلہ کا کام انجام دیتے تھے۔ اس سے کمپنی کے لئے بھی جوکھم کم ہو جایا کرتا تھا۔ نیز کبھی کبھی وہ کمپنی کو ایڈوانس رقم بھی دیا کرتے تھے۔

18.7.3 کارخانے

یہ کارخانے لازمی طور پر پیداوار کے مرکز نہیں تھے۔ مگر پھر بھی کچھ واقعی دستکاری کارخانے تھے جہاں پر وڈکشن کا کام ہوتا تھا (جیسے قرخانہ۔ ہتھیارات اور اسلحہ خانہ) جب کہ دیگر سرکاری گوداموں (فیل خانہ ہاتھیوں کا اصطبل) آب دار خانہ (محل میں پانی کی سپلائی بنائے رکھنے کا نظم) وغیرہ کی شکل میں کام کرتے تھے۔ شمس سراج عفیف تقریباً (1400ء) قسم اول کو غیر راتبی اور دوسرے قسم کو راتبی کے لقب سے ذکر کرتے ہیں۔ راتبی کو مقرر شاہی عطیہ حاصل ہوتا تھا۔ پیش نظر حصہ میں ہم اول قسم کے کارخانوں ہی پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے جہاں درحقیقت پروڈکشن ہوتا تھا۔ ان کارخانوں میں نہ صرف روزمرہ استعمال آنے والی اشیاء بلکہ توپوں اور گولہ بارود کی پیداوار (پروڈکشن) بھی ہوا کرتی تھی۔

کارخانوں کا نظام ایران سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بیوتات (لغوی معنی مکان) کی شکل میں معروف کارخانوں نے سرکاری دستکاری کارخانیں کی شکل میں مصروف عمل تھے۔ جو شاہی گھرانوں کے لئے مطلوبہ قیمتی ضروری چیزوں کی تیاری میں مصروف تھے یا ان چیزوں کو اسٹور کرنے کا کام کرتے تھے۔

ایرانیوں کے ذریعہ پیداوار کے مقصد سے کافی تعداد میں جنگی قیدیوں کا استحصال کیا جاتا تھا۔

تغلق عہد سے قبل ہم کو کارخانوں کے ضمن میں معلومات بمشکل ہی حاصل ہو پاتی ہیں۔ محمد تغلق نے اپنے شاہی کارخانوں میں 400 ریشم بنکروں کو کام میں مصروف کیا۔ مگر فیروز کے عہد حکومت میں کارخانوں میں بہ نسبت پہلے کے غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کے ذریعہ کم از کم 36 کارخانے قائم کئے گئے۔ عفیف فیروز کے تحت کارخانوں کی سرگرمیوں کا ایک مصورانہ تذکرہ پیش کرتا ہے۔

فیروز شاہ کے شاہی ادارے (کارخانے)

سلطان فیروز کے پاس 36 کارخانہ تھے جنکے لئے کافی مقدار میں اشیاء جمع کی جاتی تھیں۔۔۔ اور جن پر سالانہ خرچ بہت زیادہ تھا۔ ان میں سے کچھ کو ایک متیعنہ رقم دی جاتی تھی۔ (راتبی) دیگر کچھ کی کوئی مقررہ آمدنی نہیں تھی (غیر راتبی)۔ اس طرح راتبی کارخانوں میں تھے: ہاتھی ،گھوڑے، اور اونٹ کے اصطبل، باورچی خانہ، باورچی خانہ کا اسٹور (ذخیرہ)، روشنی کا شعبہ، کتا گھر، پانی ٹھنڈا کرنے کے شعبہ جات وغیرہ نیز اسی طرح کے دوسرے کارخانے۔ اور ان کو اپنے خرچہ کے لئے ماہانہ ایک لاکھ 60 ہزار ٹنکے کا وظیفہ مقرر تھا۔ اس کے علاوہ اس میں شامل انکے فرنیچر وغیرہ کی لاگت اور محرروں و دیگر افسران کی ماہانہ تنخواہیں جو ایک لاکھ ساٹھ ہزار چاندی کے ٹنکوں کے برابر تھی۔ ایسے کارخانہ جن کا کوئی مقررہ وظیفہ طے نہیں تھا جیسے توشہ خانہ، عالم خانہ یا شاہی علامتی نشان، قالین کے اسٹور وغیرہ۔ نئی چیزیں سالانہ جاری کردہ احکام کے مطابق حاصل کی جاتی تھیں۔ صرف موسم سرما کے زمانے میں توشہ خانہ پر چھ لاکھ ٹنکے خرچ کئے جاتے تھے۔ موسم بہار اور گرمیوں کا خرچہ اس سے جدا تھا۔ عالم خانہ میں اشیاء کی خریداری پر 80,000 ٹنکے خرچ کئے جاتے تھے۔ محرروں اور کامگاروں کی تنخواہ الگ تھی۔ تقریباً دو لاکھ ٹنکہ قالین شعبہ پر خرچ کئے جاتے تھے۔ یہ سبھی کارخانہ ایک اعلیٰ افسر کے تحت کام کرتے تھے۔ ''جو خان'' یا ''ملک'' کہلاتا تھا۔ اس طرح توشہ خانہ ملک علی اور ملک اسماعیل کے زیر صدارت تھے۔ ☆☆☆

خواجہ ابوالحسن خان کے پاس عام طور پر سبھی کارخانوں کی سربراہی سپرد تھی۔ اور اس کے ذریعہ ہر ایک ادارے کے لئے احکام جاری کئے جاتے تھے۔ کارخانوں کے ایک جداگانہ شعبہ (دیوان خانہ) تھا جس میں عام حساب و کتاب و تحریریں محفوظ رکھی جاتی تھی۔ مگر یہ حساب کتاب دیوان وزارت کے نام معنون ہوتے تھے اور اسی میں درج کئے جاتے تھے۔ اس طرح دیوان وزارت نہ صرف لگان (قطع) کا حساب رکھتا تھا۔ بلکہ کارخانوں کے اخراجات کا حساب بھی اسی کے پاس ہوتا تھا۔ متفرق کارخانوں میں ان کے محاسبی محرر ہوتے تھے جنھیں ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مترجم، ایلیٹ، ایچ۔ ایم۔ اور جان ڈاوسن، دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ، بائی انٹز آن ہسٹوریئنس: دی محمڈن پیریڈ، الہ آباد، جلد سوم، صفحہ 106-103۔

مغلیہ حکومت کے تحت ان اداروں کی مزید ترقی ہوئی۔ اکبر نے اس کی توسیع میں خصوصی دلچسپی لی۔ جدوناتھ سرکار نے کم از کم 70 قسم کے کارخانوں کی فہرست تیار کی ہے جو مغلوں کے تحت کام کرتے تھے۔ ان اداروں کے تعلق سے خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے برنیر (68-1656) تحریر کرتا ہے کہ ہندوستان میں یہ فنون کافی پہلے ہی اپنے حسن و خوبصورتی کھو چکے ہوتے اگر بادشاہ اور اہم امراء ان فنکاروں کو تنخواہ پر نہ رکھتے جو انکے گھروں میں کام کرتے، بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور انعام کی امید اور کوڑے کے ڈر سے محنت و جانفشانی کی طرف محرک ہوتے ہیں۔

یہ شاہی کارخانے نہ صرف دہلی اور دوسرے دارالخلافہ شہروں میں قائم تھے بلکہ وہ بڑے پیمانہ پر دوسرے صوبوں میں بھی موجود تھے۔ جیسے شال سازی صنعت کشمیر میں مرکوز تھی۔ ہندوستان کے دیگر حصوں اور خصوصاً لاہور میں شال سازی صنعت کو مقبول بنانے کا سہرا اکبر کے سر جاتا ہے اسکے عہد حکومت میں کارخانوں کی توسیع اتنی تیز تھی کہ ابوالفضل کارخانوں کا موازنہ ایک شہر سے کرتا ہے۔ اکبر نے پٹنہ، آگرہ، دہلی اور لاہور میں شال اور قالین بنانے کے

B.NO. 219

کارخانے قائم کرنے کی کوشش کیں۔ابوالفضل صرف اکیلے لاہورشہر میں 1000 سے زیادہ شال کے کارخانوں کا تذکرہ کرتا ہے۔

آئین 32: شال، اونی کپڑے وغیرہ۔

بادشاہ سلامت نے اس شعبہ میں چار طریقوں سے اصلاحات کیں۔یہ اصلاح واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔اول، طوس شالوں میں، جو اسی نام کے ایک جانور کی اون سے تیار کی جاتی ہیں، جسکے قدرتی رنگ: کالا، سفید اور لال، مگر زیادہ تر کالا ہی۔کبھی کبھی یہ رنگ بالکل سفید ہوتا ہے۔اس قسم کی شالیں ملائمت، گرم، اور ہلکے پن کے لئے مشہور ولا ثانی ہیں۔لوگ عموماً اس کو اس کے قدرتی رنگوں میں بغیر تبدیلی کے استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔بادشاہ سلامت نے اسکو رنگ وایا ہے یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اس پر سرخ رنگ نہیں چڑھ سکتا۔دوسرے سافد آلچہ میں جنکو طرح دار بھی کہتے ہیں۔یہ اپنے قدرتی رنگ میں ہوتا ہے۔یہ اون یا تو سفید ہوتی ہے یا پھر کالی۔یہ اونی کپڑے تین رنگوں میں آتے ہیں: سفید، کالا یا ملا جلا۔اول یا سفید قسم عموماً تین طریقوں سے رنگی جاتی تھی، بادشاہ سلامت نے اسے مختلف طریقوں سے رنگنے کا حکم دیا۔تیسرے زردوزی، کلابتو، کشیدہ، قلغہ، بندھنو، چھینٹ، آلچہ، پرزدار جیسے اونی کپڑے۔جن پر بادشاہ سلامت زیادہ توجہ دیتے ہیں۔چوتھے، سبھی اونی کپڑوں کے عرض میں اصلاح کی گئی۔بادشاہ سلامت نے کپڑے کے ٹکڑوں کو اتنا بڑا بنوایا ہے کہ اس سے پوری پوشاک بن سکے۔

پرانے زمانے میں شالیں اکثر کشمیر سے لائی جاتی تھیں۔لوگ ان کو چارتہوں میں موڑتے تھے اور ان کو عرصہ دراز تک پہنتے تھے۔آج کل وہ عموماً بغیر موڑے ہی پہنی جاتی ہیں اور صرف کاندھے پر ڈالے جانے کا دستور ہے۔بادشاہ سلامت نے ان کو دوہرا کر کے پہننا شروع کیا ہے، جو کہ بہت خوبصورت لگتا ہوتا ہے۔

بادشاہ نے کشمیر میں شالوں کی تیاری کی ہر ممکن طریقہ سے حوصلہ فزائی کی ہے۔لاہور میں بھی ایک ہزار سے زیادہ کارخانے ہیں۔شال کی ایک قسم ''میان'' یہاں خاص طور سے بنی جاتی ہیں۔اس میں ریشم اور اون ملا کر اس کو تیار کیا جاتا ہے۔دونوں کا استعمال چیرا، نوٹئل، فوتہ (شیر کی دھاریاں) وغیرہ کے لئے کیا جاتا ہے۔

ابوالفضل علامی آئین اکبری، مترجم، ایچ۔بلاک مین، جلد اول، نئی دہلی، آئین 87، صفحہ 98-97۔

اورنگ زیب کے امیر بختاور خان کے کارخانوں کا نیٹ ورک کا وسیع حصہ دہلی، آگرہ، لاہور اور برہانپور میں تھا۔پیٹر منڈی نے جب 1632 میں پٹنہ کا دورہ کیا تو اس نے پایا کہ وہاں کے گورنر عبداللہ خان نے اپنے حرم کے لئے باریک ململ سازی کے واسطے بنکروں کو کام پر رکھا تھا۔علی مردان خاں نے شاہ جہاں کو اپنے کارخانے میں بنے قالین اور شالیں ارسال کیں کی تھیں۔شاہ جہاں کی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم کے ذریعہ بھی ایک کارخانہ قائم کیا گیا تھا۔کھڑگ پور کے راجہ بہروز (76-1631) کی اپنی بھی نجی فیکٹریاں تھیں۔جن میں کول، نیا اور اُسوروں کے ذریعہ خام لوہا پگھلایا جاتا تھا۔اور راجہ کے لئے وہ چونا تیار کیا کرتے تھے۔اس کے دستکاری کارخانوں میں چاندی کا کام بھی ہوتا تھا۔

مگر اورنگ زیب کے ذریعہ اس طرح کی روادارانہ سرپرستی نہیں عطا کی گئی اور اس کے عہد حکومت میں بہت سارے کارخانے زوال پذیر ہوگئے۔مگر 18 ویں صدی میں کارخانوں کا رواج جے پور، بنگال وغیرہ علاقوں میں زندہ رہا۔

وہ زیادہ تر ریاست کے مطالبوں کو پورا کرتے تھے۔چاہے تو شاہی استعمال کے لئے یا پھر تحائف کے مقصد سے۔عموماً پرتعیش اشیاء اور قیمتی سامان کارخانوں ہی میں تیار ہوتے تھے۔مگر بعد میں یقینی طور پر شاہی کارخانوں میں پروڈکشن صرف راجہ اور امراء طبقہ کے نجی استعمال کے لئے ہی نہیں بلکہ بازار کے لئے بھی کیا جانے لگا۔عفیف (تقریباً 1400 عیسوی) ذکر کرتا ہے اکیلے فیروز کے تحت موسم سرما میں جامدار خانہ کا لین دین 60 ہزار ٹنکہ تھا۔جبکہ فراش خانہ (قالین

بنائی) کا 200000 ٹنکہ (چاندی کے سکے) سالانہ اور کانوں کے کارخانوں کی آمدنی ملتان شہر کے ٹیکس کے برابر تھی۔ جی۔ ایس۔ ایل۔ دیورا (1987) کے مطابق 1694 سے 1699 کے درمیان مختلف کارخانوں سے بیکانیر کے حکمرانوں کا فائدہ 33 ہزار 8 سو 81 روپے تھا۔ انکا خیال یہ ہے کہ امراء طبقے کے بیچ کارخانوں کے ٹریڈ مارک (تجارتی نشان) زدہ پروڈکشن کے استعمال کا فیشن تھا۔ ان شاہی کارخانوں میں تیار اشیاء کو بازاری قیمت پر متعدد شعبہ جات کو ارسال کیا جاتا تھا۔ اس طرح وہ کارخانے وسیع طور پر محصول کی آمد کا اہم ذریعہ تھے۔

مگر یہ کارخانے تجارتی اداروں کی شکل میں کبھی بھی ترقی پذیر نہ ہوسکے کیونکہ ان کا وجود کافی حد تک سرکاری سرپرستی یا امراء طبقہ کے ذریعہ سرپرستی پر منحصر تھا۔ جیسے ہی اس طرح کی سرپرستی ختم ہوئی انکا بھی زوال ہو گیا۔

مراٹھا اور گول کنڈہ ریاستوں میں بھی کارخانے مغل کارخانوں کی بنا پر ترقی یافتہ ہوئے۔ اپنی ریاست میں کارخانے قائم کرنے کا سہرا شیواجی کی جاتا ہے۔ سبھاسد نے شیواجی کے 18 کارخانوں کا ذکر کیا ہے۔ پروڈکشن زیادہ تر شاہی فیملی کے لئے کیا جاتا تھا نہ کہ بازار کے لئے اور وہ محض سرکاری شعبوں کی شکل میں کام کرتے تھے۔ یہ اہم بات ہے کہ مراٹھاؤں کے تحت دکن میں کارخانوں میں بیگار (ویٹھ بیگار) بھی لیا جاتا تھا۔ (فوکازاوا 1982)۔ بیگار کی مدت ایک سال میں آٹھ روز سے دو روز تک ہوسکتی تھی جو کہ کام کی نوعیت پر منحصر تھا۔ کبھی کبھی ان کو تھوڑے بہت روپے پیسے نقد کی شکل میں یا کسی شے کی صورت میں ادا کیے جاتے تھے۔

کارخانوں کی تنظیم

دہلی کے سلطانوں کے تحت ہر کارخانے کو ایک ممتاز امیر کے ماتحت رکھا جاتا تھا۔ اس کی معاونت متصرف کرتا تھا۔ یہ کارخانے وسائل سے معمور اور مہارت کے ساتھ منظم ہوتے تھے۔ ابوالحسن فیروز شاہ کے عہد حکومت میں تمام ہی شاہی کارخانوں کا خاص متصرف تھا۔ ابتداء میں اکبر کے تحت کارخانے دیوان بیوتات کے ماتحت رکھے گئے تھے اور اس کے بعد میر سامان کے ذریعہ ان کی نگرانی کی جانے لگی۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں یہ ذمہ داری خان سامان کے پاس چلی گئی۔ مگر دیوان بیوتات، میر سامان سے آزادانہ طور پر مالی معاملات دیکھتا رہا۔ ہر کارخانہ میں ایک داروغہ (نگراں)، تحصیل دار (خزانچی اور اسٹور کیپر) اور ایک مشرف (محاسب) ہوتا تھا۔ داروغہ کچہری، دفتر کے عمومی نگرانی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ داروغہ اور تحصل دار ہی تھے جو کاریگروں سے براہ راست وابستہ تھے اور نظر رکھتے تھے۔ نیز وہ روزمرہ کے سامان اور کام پر نظر رکھتے تھے۔ مستوفی، محاسبی کا نگراں ہوتا تھا۔ جو کہ حسابات کو دیوان کے دفتر میں جانے سے قبل اسکی تصدیق کرتا تھا اور حساب کتاب کی جانچ کرتا تھا۔

دستکاری کارخانے

اس جانب پہلا جرأت مندانہ کام 21-1620 میں ہیوگیز (Hughes) اور پارکر (Parker) کے تحت پٹنہ میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ کیا گیا۔ 100 کاریگران کے ذریعہ ریشم کے کارخانوں میں لگائے گئے تھے۔ 1646 میں انگریزوں کے ذریعہ احمد آباد میں رنگائی کا مرکز قائم کیا گیا تھا۔ جہاں نہ صرف وہ لوگ کاریگروں کو اجرت پر رکھتے تھے بلکہ وہ اوزاروں کے بھی مالک تھے۔ 1652 میں کورومنڈل ساحل پر پال کولو میں ڈچوں نے نیلے کپڑے کی رنگائی کے مقصد سے 300 مرتبان (Jars) بنوائے۔ انگریزوں کے ذریعہ اسی قسم کی رنگائی کے کارخانے سورت، تیگنا پٹم، فورٹ سینٹ ڈیوڈ، پولی کٹ اور فورٹ جیل ڈریا میں بنائے گئے۔ مگر وہ زیادہ تر تاجر دلالوں کے ذریعہ ہی سے کام کرتے تھے۔

کارخانے اور کاریگر

ان مذکورہ شاہی کارخانوں میں کاریگروں کی بھرتی کے پیٹرن کا پتہ لگانا بڑا دلچسپ ہوگا۔ کیا وہ انفرادی بنیاد پر کام پر رکھے گئے تھے؟ کیا وہ صرف تنخواہ دار تھے؟ ان کا سماجی ومعاشی پس منظر کیا تھا؟ اور سماج میں ان کیا درجہ تھا؟

ان پہلوں پر ہماری معلومات بہت ہی سطحی ہے۔ یہ تو یقینی طور پر ہم کو معلوم ہے کہ شاہی کارخانوں میں ماہر دستکاروں کو نہ صرف ہندوستان سے بلکہ ترکی، ایران، چین اور یہاں تک کہ یوروپین ملکوں سے بھی لایا جاتا تھا۔ اسی طرح کارخانوں کو بلاشبہ ماہر دستکاروں کی خدمات حاصل ہوتی تھیں۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک بار کارخانوں میں آنے کے بعد ایک دستکار اپنی من پسند کی اشیاء تیار کرنے میں کس حد تک مختار تھا۔ ڈیزائن یا پھر صورت یا رنگ کے لحاظ سے۔ مصنوعات کو شہنشاہ کی پسند وچاہت کے مطابق تیار کیا جاتا تھا۔ دستکاروں کو متصرف کے ماتحت کام کرنا ہوتا تھا۔ اپنی خدمات کے عوض اسکو تنخواہ ملتی تھی۔ خام مال کی انتخاب میں اس کی اپنی کوئی پسند نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ اسکو ریاست کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتا تھا۔ دستکار محض تنخواہ پانے والا ملازم ہوتا تھا۔ جو کہ حکمران کی دل چسپی کے مطابق ہی مال تیار کرتا تھا۔ جہانگیر اپنی تزک میں بیان کرتا ہے کہ 'میں نے استاد پورن اور کلیان، جن کا نقاشی میں کوئی ثانی نہیں ہے، انکو حکم دیا ہے کہ وہ کٹار کے دستے اس شکل کا بنائیں جس کی اس کے ذریعہ منظوری دی گئی اور وہ جہاں گیری فیشن کے نام سے مشہور ہوئی۔ ساتھ ہی اس کا بلیڈ، میان اور دستہ کا کام بھی ماہر کاریگروں کو سونپا گیا۔ جن میں ہر ایک اپنے فن میں اس زمانہ میں یکتا تھا۔ درحقیقت یہ سب مکمل طور پر میری خواہش کے مطابق کیا گیا'۔

اگر چہ یہ تجزیہ کرنا مشکل امر ہے کہ کیا کاریگروں کے درمیان درجہ بندی موجود تھی؟ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مہارت کی بنیاد پر کاریگروں کے بیچ کسی طرح کی درجہ بندی ضرور تھی۔ ابوالفضل محلوں کی تعمیر میں مشغول کاریگروں کی ایک لمبی فہرست بیان کرتا ہے۔ مثلاً سنگتراش، پلاسٹر کرنے والے، بڑھئی، آرہ کش، جالی بنانے والا، اینٹ چنائی کرنے والا شیشہ تراش وغیرہ۔

کارخانوں میں ان کاریگروں نے نہ صرف آجر کے طور پر اپنی آزادی کھوئی بلکہ ان کو اپنی صلاحیت سے کافی کم مزدوری بھی ملتی تھی۔ پلسارٹ (تقریباً 1626) ان کارخانوں میں کاریگروں کی قابل ترس حالت پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے شام کو صرف پانچ یا چھ ٹکا (دام) پانے کے لئے کاریگروں کو صبح سے شام تک کام کرنا پڑتا تھا۔ ان کو بالجبر بھرتی کیا جاتا تھا۔ مزاحمت کرنے پر انعام ہوتا تھا---- مسلسل زدوکوب اور نصف تنخواہ۔ ایک اور بڑا جھٹکا اس بات کا تھا کہ ایک کارخانہ میں مشغول ہونے سے ان کی فیملی کی محنت بے کار جاتی تھی۔ اپنی مفلسی کی وجہ سے وہ لوگ بہت ہی کم سودے بازی کرنے کی ہمت کر سکتے تھے۔ زیادہ قیمت ملنے کی امید پر اپنے مال کو دور دراز بازاروں میں لے جانا بھی ان کے لئے آسان نہ تھا۔ عموماً وہ اپنا مال کم قیمت پر ہی مقامی بازاروں میں فروخت کرنے میں عافیت محسوس کرتے تھے۔

دستکاری پیداوار اور کارخانہ پیداوار کے بیچ اہم تبدیلی یہ آئی کہ دستکار جو کہ بذات خود مالک، استاد، تیار کنندہ (worker) اور فروخت کردہ تھے، منتشر ہونا شروع ہوگئے اور اس عمل میں وہ اپنی آزادی گم کر بیٹھے۔

18.7.4 مشاہرہ/اجرت

اس تعلق میں ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں۔ صرف ایک مضبوط جانکاری ہمکو ابوالفضل کی آئین میں ملتی ہے۔ مگر آئین میں مذکورہ قیمتیں دار السلطنت/شاہی خیمہ کی قیمتوں ہی کی قیادت کرتی ہیں۔

کارخانوں میں کاریگروں کو ماہانہ یا روزانہ بنیاد پر مزدوری دی جاتی تھی۔ 1620 میں مشرقی دکن میں لوہار، سنار وغیرہ کو روزانہ 8.4 سے 9.6 پیسے اور معاون کار کو تقریباً 2.8 سے 3.2 پیسے روزانہ دیئے جاتے تھے۔ اسی طرح کولو ہیرا کان میں مزدوروں کی اجرت دو پیسے فی دن تھی۔

آ ئین 87: محل تعمیر میں مشغول مزدوروں کی اجرت سے متعلق

گل کار (چونا مزدور): اعلیٰ درجہ کا کاریگر، 7 دام، دوسرے درجہ کا 6 دام، سوئم درجہ کا 5 دام۔

سنگتراش (پتھر مزدور یعنی راج): خاکہ نگاری گز 6 دام، سادہ کام کرنے والے کو 5 دام، کانوں میں کام کرنے والے پتھر توڑنے والے مزدور کو فی من 22 جیتل۔

(بڑھئی): اول درجہ 7 دام، دوئم درجہ 6 دام، سوئم درجہ 4 دام، چہارم درجہ 3 دام پنجم درجہ 2 دام عموماً چھوٹے چھوٹے کاموں کو انجام دینے پر اول درجہ کے بڑھئی کو ایک گز پر 17 جیتل، دوسرے درجہ کے بڑھئی کو ایک درجہ ایک دام 6 جیتل ملیں گے، تیسرے درجہ کے بڑھئی کو 21 جیتل۔

پنجرہ ساز (جالی اور ٹوکریاں بنانے والے): اول درجہ جب ٹکڑوں کو جوڑا جاتا ہے (رسی کی ستلیوں سے باندھا جاتا ہے) اور سراخ والی (بارہ گھنٹا) ہوں 24 دام فی گز، جب درز بارہ دائرہ بنائیں 22 دام اور جب مسدس ہوں تو 18 دام اور جب جافری ہوں (معین شکل جیسے ایک ترچھی عموری ہو دوسری افقی)، 16 دام، جب شطرنجی ہو 12 دام فی مربع گز۔

دوسرے، کام جب غیر وصلی ہوں (تیلیاں ستلیوں سے نہ باندھی گئی ہوں بلکہ مہارت کے ساتھ اور مضبوطی کے ساتھ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ باندھی گئی ہوں) اول درجہ کے کام کے لئے 48 دام فی مربع گز، دوسرے درجہ کے لئے 48 دام فی مربع گز، تیسرے درجہ کے کام کے لئے 40 دام فی گز مربع۔

آرہ کش (وہ جو شہتیروں کو چیرتے ہیں) عام درجہ کے کاموں کے لئے فی مربع گز 1/2 2 دام، اگر سیسا او کی لکڑی ہو یعنی ناز ہو لکڑی ہو تو دو دام۔ پورے دن کی ایک فرد کی مزدوری پر 2 دام، ہر ایک آرے پر 3 آدمی کام کریں گے ایک اوپر 2 دو نیچے۔

بیلدار (اینٹ چنائی والے): اول درجہ روزانہ 1/2 3 دام، دوسرا درجہ فی دن 3 دام، قلعہ کی دیوار بنانے کے لئے 4 دام ایک مربع گز، بنیاد ڈالنے والے کو 21/2 دام، دیگر سبھی دیواروں کے لئے 2 دام فی مربع گز، گڑھے کھودنے پر آدھا دام فی گز۔

چاہ کن (کنواں کھودنے والا)	:	اول درجہ کا مزدور 2 دام فی مربع گز۔ دوسرا درجہ 2 دام فی مربع گز۔ تیسرا درجہ 11/2 دام فی مربع گز۔
غوطہ خور	:	وہ کنویں صاف کرتے ہیں۔ سردی کے موسم میں 4 دام فی غوطہ خور گرمیوں میں 3 دام دوسرے کام کے حساب سے، فی گز گہرائی صاف کرنے کے لئے 2 روپئے۔
خشت تراش یا کھپریل بنانے والے	:	100 کھانچوں کے لئے 8 دام۔
سرخی جوب (پرانی اینٹوں کا چورہ)	:	8 من کے ایک ڈھیر لئے 11/2 دام۔
شیشہ تراش	:	100 دام فی گز۔
بانس تراش	:	2 دام فی دن۔
چھپر بند (چھپر چھانے والے)	:	3 دام فی آدمی، اگر کام کے حساب سے طے کیا جائے، 24 دام 100 گز کے لئے۔
پتل بنک	:	ایک دام فی 4 گز۔
لاکھڑا	:	وہ لاکھ سے سرکنڈا وغیرہ پر وارنش کرتے ہیں۔ تنخواہ 2 دام فی دن۔
آب کش (پانی ڈھونے والا)	:	اول درجہ 3 دام فی دن دوسرا درجہ 3 دام فی دن، تیسرا درجہ 2 دام فی دن، پانی ڈھونیوالے جو گھر کی تعمیر کے لئے گارے اور بغیر بجھے چونے کے لئے پانی لاکر دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں 2 دام فی دن۔

ابوالفضل علامی، آئین اکبری، مترجم۔ایچ۔ بلاک مین، جلد اول، نئی دہلی 1977، آئین 87،ص 36-235۔

نوٹ: 40دام=ایک چاندی کا روپیہ۔

کم مزدوری کے خلاف مظاہروں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔1660 میں اورنگ زیب کو اطلاع دی گئی کہ کارخانہ مزدوروں نے کم قیمتی نئے سکوں کی شکل میں مزدوری قبول کرنے سے انکار کردیا۔لہذا ان کی مزدوری میں ایک سے لیکر 1.5 ٹنکا مغلیہ عہد کا تانبہ کا سکہ =2 دام کا اضافہ کیا گیا۔اسی طرح کے ایک واقعہ میں 72-1671 میں علی محمد خاں کی احمد آباد کے محل کی تعمیر میں مزدوروں کی کم مزدوری سے متعلق ایک شکایت کا ذکر ملتا ہے۔اورنگ زیب نے صوبہ کے دیوان کو ہدایت دی کہ متعلقہ معاملہ کو دیکھیں اور حکم دیا کہ ان کو مقررہ معیار کے مطابق مزدوری دی جائے۔دستکاروں کو کم مقدار پر تنخواہ دینے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے پلسارٹ (تقریباً 1626ء) بھی اس کو اچھی قسم کے دستکاری پرڈکشن یا پروڈکشن میں اضافہ کی خاطر کاریگروں کی حوصلہ افزائی کے فقدان کو اہم سبب مانتے ہیں۔مگر کم مزدوری کے باوجود مور لینڈ (1920 کے دہے میں تحریر کرتے ہوئے) کا خیال ہے کہ مغلیہ عہد کے کارخانوں میں مشغول مزدور' آج کے بہت سارے مزدوری کے بہ نسبت خوشحال تھے'۔شیرین موسوی کے ذریعہ کیا گیا تجزیہ (1987) بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ 1595 میں اناجوں کے لحاظ سے قوت خرید خاص طور پر 19 ویں صدی کے نصف آخر میں قوت خرید کے مقابلے بہتر تھی۔(اور یہ) ماہر کاریگروں کی مزدوری میں ایک واضح گروات کو ظاہر کرتی ہے۔

18.7.5 دستکاریوں کی مہارت

عہد وسطیٰ میں اگر چہ کاریگر اپنی فیملی کی محنت کی تعاون سے عجائب روزگار اشیاء تیار کرتا تھا۔محنت کی تقسیم لازمی تھی۔ ہمارے پاس یقینی شواہد ہیں۔اس کے علاوہ اس قسم کی خصوصیات کو دستکاری سرگرمیوں کی شکل میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر کپڑے ہی کو لیجیے حصہ 5، اکائی 23 صفحہ 46 پر دی گی 17 ویں کی تصاویر میں واضح طور پر بنائی طریقہ کار میں خصوصی کردار نبھاتے دستکاروں کی جانب اشارہ کرتی ہے۔بنکر درمیان میں بیٹھا استاد کاریگر اپنے کرگھے پر کام میں مشغول ہے۔جبکہ سوت بٹتا ایک بٹنے والا بھی دیکھا جاسکتا ہے۔مگر اپنے اپنے کام میں مشغول دھنوں اور رنگریزوں کو بھی، روئی اور سوت گجرات کے شہر میں سہولت سے دستیاب ہوجاتے تھے۔ گجرات ہی کے قریب گاؤں سوبے مکمل طور پر بنکروں اور سوت کاتنے والوں کا گاؤں تھا۔بھڑوچ عمدہ قسم کے پانی کی دستیابی اور ماہر کاریگروں کے موجودگی کی وجہ سے عمدہ قسم کے رنگریزی کے اہم مرکز کے شکل میں ظہور میں آیا۔احمد آباد، بڑودہ اور آگرہ سے کپڑے رنگائی کے لئے بھڑوچ آتے تھے گجرات کے رنگریز اتنے مشہور تھے کہ ان کی موجودگی 1642 میں جاوا میں بھی ریکارڈ کی گئی۔ یہاں تک کہ انگریزوں ایجنٹوں نے بھی کچھ رنگریزوں کو بمبئی بھیجنے کے التجا کی۔ بنائی اور رنگائی چھپائی دو جداگانہ کام تھے۔یہی بات سوت کی تیاری کے بارے میں تھی۔ مطالبہ میں اضافہ کے ساتھ ہی مزدوروں کا ایک مخصوص طبقہ ظہور میں آیا جو صرف پیداوار میں مشغول تھے۔بھڑوچ سوت پیداوار کے مشہور مرکز کی شکل میں بھی ظہور میں آیا۔ان کی پیداوار بازار مرکوز ظاہر ہوتی ہے۔ جب گجرات قحط نے سوت کی پیداوار کو متاثر کیا تو بازار میں سوت کی کمی نے کپڑے کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کی جانب بڑھا دیا۔ اس سے پیداوار کی دیگر سرگرمیاں بھی متاثر ہوئیں۔

نیل ایک دیگر پیداوار تھا، جہاں محنت کی ایسی ہی تقسیم دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کے تیار کرنے کے طریقہ میں لوگوں کے ایک گروپ کی ضرورت ہوتی تھی۔نیز یہ کام اکیلے نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس کام میں کرائے کے مزدوروں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی تھیں یا پھر فیملی ممبران کا تعاون حاصل کیا جاتا تھا۔اس طریقہ کار میں گجرات میں مزدوروں کا استعمال لازمی تھا۔کیونکہ یہاں فصل پیدا کرنے اور اشیاء کی تیاری پر اکثر مختلف لوگ ہوا کرتے تھے۔نیل کی پتیاں خریدنے اور ان کو تیار کرنے والے اکثر کرائے کے مزدور ہی رکھتے ہوں گے۔ہمیں ایسے یوروپین کی بھی شہادتیں ملتی ہیں جو بذات خود پتیاں خریدتے اور کرائے کے مزدوروں کے ذریعہ مال تیار کراتے تھے۔شورہ کی پیداوار بھی اسکا کوئی اشتثنا نہیں تھا۔اس میں جیسا کہ ہم نے دیکھا کان کنی سے لیکر تیار پیداوار تک پرڈوکشن کے عمل میں مزدوروں کی جماعتی کوششوں کی ضرورت تھی۔دوآرت باربوسا (تقریباً 1518) ذکر کرتا ہے کہ عقیق کی چٹان کی کان کنی سے لیکر اسکی آخری طریق

عمل تک کے کاموں میں 13 آدمی مصروف تھے۔شہری ہیرے کی کان کنی میں کرائے کے مزدوروں کا استعمال ایک عام بات تھی۔ جان فرائز (81-1672) تحریر کرتا ہے کہ مونگا ایک ھندو کے گھر میں گڑھا جاتا تھا۔اور مسلمان سبھی طرح کے ھیروں کی کٹائی کرتے تھے۔اس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مہارت خصوصی اور محنت کی تقسیم موجود تھی۔

دستکاروں اور فوجیوں کے درمیان ایک بہت ہلکا فرق تھا۔درحقیقت عہد وسطی میں جب خاص طور پر جنوبی ہندوستان میں تلوار ہی بنیادی طور پر فیصلہ کن تھی ہم پاتے ہیں کی فوجوں میں سبھی پیشوں اور مختلف درجوں کے لوگ شامل ہوتے تھے۔

18.7.6 ٹیکنالوجی اور اوزار

بابر اپنی خودنوشت میں ہندوستان کے دستکاروں کی تعریف کرتے ہوئے ذکر کرتا ہے کہ یہاں ہر طرح کے لامحدود اور بے شمار مزدور موجود ہیں۔ دستکار ایک ہی پیشہ کو سیکھ کر نسل درنسل اس میں پیشہ ورانہ مہارت تکنیکی مہارت وخصوصیات حاصل کرتے تھے۔یہ حقیقت برنیر (68-1656) کے ذریعہ بھی اچھی طرح پیش کی گئی ہے۔کشیدہ کار اپنے بیٹے کو ایک کشیدہ کار کی شکل میں پالتا ہے اور ایک سنار اپنے بیٹے کو سنار بنانا پسند کرتا ہے۔کوئی بھی اپنے بچوں کی شادیاں اپنے کاروبار و پیشہ سے باہر نہیں کرتا اور یہ دستور مسلمانوں کے اندر بھی اسی مضبوطی سے نبھایا جاتا ہے، جیسا کے ہندوں سماج میں، جنکے لئے ان کے قانون میں اسکی واضح اہمیت موجود ہے۔پلسارٹ (تقریباً 1626ء) بھی اسی طرح کے الفاظ ادا کرتا ہے۔مزدوروں کے بچے اپنے باپ کے پیشہ کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتے۔اگر چہ عہد وسطی کے دستکاروں کو خاصی شہرت حاصل تھی مگر اس کے اوزار یوروپی اور چینی دستکاروں کے مقابلے زیادہ پرانے اور سادہ تھے۔(تفصیل کے لئے حصہ 5 اکائی 23)اگر چہ جہاں تک سوت کی پیداوار کا سوال ہے چرخے نے کراماتی تبدیلیاں پیدا کیں مگر یہ سوت نسبتاً موٹا ہوتا تھا اور عمدہ قسم کی پیداوار کے لئے دستکاروں کو روایتی اوزاروں پر ہی منحصر رہنا پڑتا تھا۔ڈھاکہ کی مشہور ململ کے لئے سوت چرخے پر نہیں کاتا جاتا تھا۔بلکہ اس کے واسطے بانس سے بنی ایک تکلی استعمال ہوتی تھی۔دستکاروں کے مستعمل اوزار بھونڈے تھے مگر نسلوں سے ایک ہی پیشے، مشق وہوشیاری نے انھوں نے صلاحیت ومہارت کا اعلیٰ درجہ حاصل کرلیا تھا۔ہمیں کارخانوں میں دستکاروں کے اوزاروں کی اصلاح پر توجہ دئے جانے سے متعلق کچھ واضح تحریریں دستیاب ہوتی ہیں۔احمد آباد سے بہتر کپڑے بنانے کی خواہش کے تحت آمیر کے راجہ جے سنگھ نے حکم دیا تھا کہ جے نگر کے کارخانوں کے لئے اوزار ایک خاص قسم کی لکڑی سے تیار کئے جائیں۔(دھاتوں سے متعلق ٹیکنالوجی اور تکنیک کی تفصیل کے لئے بلاک 5 اکائی 23 دیکھیں)۔

18.7.7 دستکاری کی حرکت پذیری

17 ویں صدی میں یوروپی سیاح کورومنڈل ساحلوں پر بنکروں کی حرکت پذیری دیکھ کر تعجب میں رہ گئے۔انکی اکثریت کی ہجرت کے پیچھے اہم وجوہات تھیں۔غیر مستحکم سیاسی حالات یا پھر بڑھتے ٹیکس کے خلاف احتجاجات یا پھر قدرتی آفات۔

لیکن اس طرح کی حرکت پذیری عموماً ریاست کے ذریعہ ممنوع تھی۔23-1622 میں بھڑوچ کے حاکم نے پانچ جہاز بنانے والے بڑھئی دستکاروں کو سورت سے ہجرت کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔اسی طرح قحط کی حالت نے بھی بنکروں کو ہجرت کے لئے مجبور کیا۔گجرات کا قحط اتنا خطرناک تھا کہ کپڑے کی کارخانوں میں مصروف کاریگر بڑی تعداد میں اس علاقے کو ہی خیرآباد کہہ گئے۔انگریزوں کے ذریعہ سورت کو بڑھاوا دینے کی کوشش نے نتیجتاً مقامی پارسی کاشتکاروں نے بنائی کے پیشہ کو اختیار کیا۔جلد ہی وہ گجرات کے اندر عمدہ بنکر کاریگروں کی شکل میں رونما ہوئے۔اونگ ٹن (تقریباً 1686) انکا تذکرہ ریشم کے اہم بنکروں میں کرتا ہے۔الیگزینڈر ہیملٹن (1692) آچن میں سورت سے آئے ایک درزی کی موجودگی کا تذکرہ کرتا ہے۔جس کے تحت 10 مزدور کام کرتے تھے۔گجراتی رنگریزوں کی موجودگی کے اشارے بینٹن (انڈونیشیا) جیسے دور دراز مقامات پر بھی ملتے ہیں۔

میکس ویبر کی دلیل ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کے نظام نے دستکاری کی حرکت پذیری پر بندش لگائی۔ویبر کی دلیل کی تردید کرتے ہوئے عرفان حبیب کا خیال ہے کہ ماہر اور غیر ماہر مزدوروں اور دستکاروں کی تعداد کی زیادتی نے کاریگروں کی ایک محفوظ جماعت پیدا کی۔جس سے ایک طرف پیشہ ورں کے نئے

طبقات کی ترقی ہوئی۔اس کے برخلاف مشکل حالات میں وہ اپنے قدیمی گاؤں کے تناظر میں مدغم ہوکر اپنی عمومی حالت کی طرف واپس ہوجاتے تھے۔ایک وقت میں ایک سے زیادہ ذاتیں ایک ہی پیشہ اختیار کرتی ہیں۔اس کے علاوہ جیسا کہ عرفان حبیب ذکر کرتے ہیں کہ وہ کبھی بھی ایک ہی پیشہ یا ھنر سے مستقبل طور پر منسلک نہیں رہے۔ہم کو ان کے ذریعہ معاشی مجبوریوں کے تحت کسی دوسرے پیشہ کی طرف منتقل ہوجانے کے بھی اشارے ملتے ہیں۔اس طرح جیسا کہ عرفان حبیب نے درست ہی کہا ہے کہ ذات دستکاروں کی حرکت پذیری میں کسی ناقابل فتح بندش کی نمائندگی نہیں کرتی تھیں۔

دکن میں بھی پیداوار کی تنظیم کی ذات بنیاد کوئی بہت سخت محسوس نہیں ہوتی۔فوکازاوا (1982) ذکر کرتا ہے کہ 18 ویں صدی کے دوران درزی برادری کے ایک طبقہ نے رنگریزی کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ 17 ویں صدی کے دوران کپڑوں کے بڑھتے مطالبہ کی وجہ سے سندھ سے گجرات کی جانب بنکروں کی بڑی پیمانے پر ہجرت ہوئی۔گجرات میں چھپائی کرنے والے دستکاروں کے ذریعہ ایک الگ ذات بھادر کے نام سے منظم ہوئی۔اسی طرح گجرات میں رنگریزوں کی ایک علاحدہ ذات تھی۔شروع شروع میں گجرات کے بوہرہ شورہ کی پیداوار کے ساتھ اسکی فروخت میں بھی شامل تھے۔بعد میں بنجارے بھی اس پیشہ میں لگ گئے۔مگر ریاست کی بہت زیادہ دخل اندازی کی وجہ سے ان کو یہ پیشہ ترک کرنا پڑا۔

جنوبی ہندوستان میں بھی عہد وسطیٰ میں بنکر ذات کی کم تعداد میں پیدائش دکھائی دیتی ہے۔پٹول کرار (باندھنے اور رنگائی کے ماہر) موری یا کینگالون وغیرہ۔مگر یہاں بھی دستکار پیشہ وروں کے بیچ حرکت پذیری نظر نہیں آتی (وجیارا جاسوامی 2003) پڈوکوٹی علاقے میں کچھ سابق فوجی گروپ کیک کولار اور نیائے یٹار 13 ویں صدی کے قریب بنکر بن گئے۔مگر آلوے (1982) جنوبی ہند کی حالت پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کی اصلاحات میں کافی حد تک ذات اصولوں کا کنٹرول تھا۔مگر پھر بھی ذات پات کی حمایت نے ان کے حقوق کے محافظوں کی شکل میں کام کیا۔انکا خیال ہے کہ ذات رشتے علاقائی حدود میں منسلک شہروں میں بہت زیادہ مضبوط تھے۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ عہد وسطیٰ میں جنوبی ہند میں دستکار (سنار، بنکر، تیلی، ٹھٹیرے، بڑھئی، لوہار وغیرہ) ہتھیار رکھتے تھے اور جنگجوؤں اور فوجیوں کی شکل میں ریاستی خدمات میں مصروف عمل ہوتے تھے۔نیز مویشیوں کا واسطے چھاپے ڈالتے تھے۔ 1337 عیسوی کا مگابلا (کرناٹک میں) کتبہ تذکرہ کرتا ہے کہ ایک سنار ماروجا کا بیٹا وردن ایک مویشی چھاپے میں مارا گیا تھا۔

18.7.8 عہد وسطیٰ کے خواتین اور دستکاری پیداوار

عہد وسطیٰ میں مکمل پیداواری عمل میں کافی حد تک خواتین کا کردار ایک ماتحت شریک کا ہوتا تھا اور وہ پورے عمل میں وہ حاشیہ پر رہی تھی۔

مغل عہد کی تصویر، اکبر نامہ کا ایک صفحہ، کام میں مشغول عورتیں۔

چونا چھانتی عورت: اکبر نامہ*

کپڑا بنائی صنعت ایک ایسی دستکاری صنعت تھی جس میں عورتوں کا اشتراک کافی حد تک دیکھنے کو ملتا ہے۔خواتین عموماً کپاس سے بیج نکالنے کا کام انجام دیتی تھیں۔ندّاف اگرچہ زیادہ تر مرد ہی تھے۔مگر ہاتھ سے پیٹ کر دھننے کا کام عورتوں کے ذریعہ ہی کیا جاتا تھا۔سوت کی کتائی ایک ایسا میدان تھا جہاں عورتیں ہی اس کام کو انجام دیتی تھیں۔رنگ اتارنا اور رنگائی، چھپائی میں ممکن ہے دونوں ہی مساوی طور پر حصہ لیتے تھے۔ چھپائی کا کام انجام دینے والوں کے لئے جداگانہ لفظوں کے استعمال یعنی مردوں کے لئے چھپا اور عورت کے واسطے چھیمپیکا بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔کیمبے میں دوراٹ باربوسا (1518ء) مسلم دھوبنوں کی موجودگی کا تذکرہ کرتا ہے۔

کپڑا صنعت کے علاوہ عورتیں تعمیری کاموں میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔مغل دور کی تصویروں میں عورتیں پتھر توڑتی، چونا گارا بناتی، اس کو تسلوں میں ڈھوتی ہوئی دکھائی گئیں ہیں۔مگر اینٹوں کی چنائی اور پلاسڑ وغیرہ کرنے میں عورتوں کی شرکت کے کوئی ثبوت دیکھنے کو نہیں ملتے۔

جنوبی ہند میں عورتوں کو دھونکنی کے استعمال کی اجازت تو تھی مگر ان کو لوہا تپا کر گھڑنے کی اجازت نہیں تھی۔عورت کو زیور سازی میں بھی ایک اہم ڈیزائنر کا کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی جبکہ پالش کرنے اور کٹائی وغیرہ کے عمل میں ان کی شمولیت تھی۔مہاراشٹر سے حاصل ایک حوالہ میں آدمی کا ذکر تیل مل (کولہو) چلاتے ہوئے کیا گیا ہے۔جبکہ اس کی عورت تیل فروخت کرتی ذکر کی گئی ہے۔

18.8 اجارہ داری

اجارہ داری کا دستکاروں پر برا اثر پڑتا تھا۔اس نے نہ صرف ان کے کاموں کی آزادی ہی کو متاثر کیا بلکہ ریاست چونکہ مصنوعات مخصوص کی تنہا خریدار ہوتی تھی اس لئے دستکاروں کو رائج بازار قیمت سے کم قیمت ملتی تھی۔کارخانوں میں مصنوعات کی پیداوار ریاست کی اجارہ داری تھی۔انگریز فیکٹر بیان کرتے ہیں کہ لاہور میں ٹیپسٹری Tapestry (کپڑے کی ایک قسم) مغل شہشاہوں کی اجارہ داری میں تھی۔بٹے ہوئے ریشم کے دھاگے پر ریاست کی اجارہ داری تھی۔نیز اس کو خریدنے کے واسطے مقامی کوتوال کی اجازت لینا لازمی تھا۔عموماً اسکی قیمت حقیقی قیمتوں کے مقابلے 25 سے 37 فی صد زیادہ ہوتی تھیں۔ پٹنہ (1620-1621) میں پہلے تجارتی مشن کے کارندوں نے 30 ریشم بٹائی والے کارخانے میں کویوں سے ریشم بٹائی کا ایک ناکام تجربہ کیا۔اورنگ زیب کی چٹاگونگ، ڈھاکہ اور ھگلی علاقے میں شہد کے موم اور نمک پر اجارہ داری تھی۔کانیں اور معدنیات ہمیشہ ہی ریاست کے حق تجارت میں رہیں۔شورہ ایک دیگر صنعت تھی جہاں حکومتی داخل اندازی اور زیادہ تھی۔1647 میں مغل شہنشاہ نے حکم جاری کیا کہ شورہ صاف کرنے والوں کو ریاستی کارخانوں کے علاوہ اور کہیں بھی کام پر نہیں رکھا جا سکتا اس سے انگریزوں کی فیکٹری پر بھاری اثر پڑا کیونکہ وہ سورت میں صفائی کا کام خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے۔بارود ایک اہم عنصر کی شکل میں یہ ایک نایاب اور قیمتی پیداوار تھا۔1630 میں شاہجہاں نے گجرات سے اسکی برآمد کی۔جان البرٹ ڈی مینڈلسو (John Albert de Mandelso 1638-39) تحریر کرتا ہے کہ غیر ملکیوں کو اجازت کے بغیر شورہ، سیسہ، بارود برآمد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ٹیورنیر (Tavernier) (1640-67) ریاست کے ذریعہ چونے کی اجارہ داری کرنے کے ایک دلچسپ طریقہ کا ذکر کرتا ہے۔"سبھی گاڑیاں جو آگرہ اور جہان آباد سے سورت آتی تھیں۔چونا لانے کے لئے پابند تھیں۔جو بھڑوچ سے آتا تھا اور جو استعمال کے فوراً ہی بعد جم کر سنگ مرمر کی طرح سخت ہو جاتا تھا۔یہ بادشاہ کے لئے فائدہ کا ایک اہم ذریعہ ہے اور وہ اس کو جہاں اس کی مرضی ہو وہاں بھیجتا ہے"۔

ہیرے کی کانوں پر حکمرانوں کی ہی اجارہ داری تھی۔ یہاں تک کہ 10 کیرٹ (کچھ معاملوں میں سات کیرٹ) سے زیادہ بڑے ہیرے بادشاہ کی ملکیت ہوتے تھے۔

شیواجی نے نمک کی اجارہ داری سے بہت زیادہ فائدہ کمایا۔ شیواجی نے پربھاوتی، کلیان بھیونڈی (رتنا گری وتھانہ ضلع) علاقے میں نمک کی قیمت من مانے طور پر بڑھادی تھی۔ شیواجی کے جانب سے اونچی قیمتوں مقرر کرنے سے اس وقت تجارت کا رخ باردیش (پرتگالی گوا) کے حق میں مڑ گیا۔ اس پر قابوں پانے کے غرض سے شیواجی نے زیادہ چنگی لگانی شروع کردی تاکہ آخری تجربہ میں سنگ میشور میں نمک باردیش کے نمک کے مقابلہ تاجروں کو سستا ملے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوشش ریاست کے خزانے میں اضافہ کے خاطر کی گئی تھی۔ مگر نمک کی قیمت میں اضافہ کے وجہ سے اسی کی اپنی ہی ریاست میں مقامی صارفین خطرناک طور پر متاثر ہوئے۔ چونکہ گوا کے (سستی مصنوعات خریدنے کے) سبھی راستے شیواجی کے علاقوں سے ہی ہوکر جاتے تھے۔ تاجر بھاری چنگی سے بچ کر نہیں نکل سکتے تھے۔ لہذا شیواجی کی یہ کوشش پرتگالی گوا کے نمک کی کم قیمتوں کا توازن بنانے میں کامیاب رہی۔ شیواجی اس طرح یقینی طور اپنے تاجروں کو پامال ہونے سے محفوظ رکھ پائے۔

اسی طرح بڑودہ کے گورنر نے 36-1634 میں بنکروں پر زور ڈالا کے اس کے ذریعہ متعین کی گئی قیمتوں پر ہی کپڑا سپلائی کیا جائے۔ 1647 میں احمد آباد کے مقامی گورنر نے نیل پیدا کرنے والوں کو مجبور کیا کہ اسکو 250 روپے ادا کریں تاکہ ان کو بازار میں اپنی مصنوعات فروخت کرنے کی اجازت مل سکے۔ 1656 میں جب اس نے نیل کی پتیوں کا ذخیرہ بہت زیادہ مقدار میں کیا تو اس نے پیدا کرنے والوں پر زور ڈالا کہ پتیاں اعلیٰ قیمتوں پر اس سے ہی خریدی جائے ورنہ نیل بنانا قطعاً بند کر دیا جائے۔ 1620 کے دہے میں بھڑوچ کے گورنر نے یہ لازمی قرار دیا کہ سبھی موٹی اور پتلی بافتہ اسے ہی فروخت کیا جائے۔

18.9 بحث ومباحثہ

آیئے عہد وسطیٰ میں ہندوستان کی معاشیات کی ترقی کے امکانات کا پتا لگایا جائے۔ یہ منجمد تھی یا متحرک اور کیا اس میں سرمایہ دارانہ پیداوار کے امکانات موجود تھے؟ ہم سابق میں دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک زراعتی پیداواروں کا تعلق ہے عہد وسطیٰ کی معاشیات کسی بھی طرح منجمد اور پس ماندہ نہیں تھیں۔ غیر زراعتی پیداوار کے ضمن میں غیر ملکی مسافر خاص کر برنیر، دستکاری پیداواروں کے وسیع مفصل سائز کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ کی دلیل ہے کہ اس طرح کی پیداوار فی الحقیقت کچھ مخصوص پیداواری مرکزوں تک ہی محدود تھی۔ ورنہ خاص طور پر عوام کی کمزور قوت خرید کی صلاحیت کو ذہن نشین رکھتے ہوئے دیکھیں تو عموماً دستکاری پروڈکشن اتنے وسیع طور پر نہیں تھا جیسا کہ غیر ملکی سیاحوں کے ذریعہ نقل کیا گیا ہے۔ مگر تپن چودھری (کیمبرج 1982) کا یقینی طور پر خیال ہے۔ کہ دستیاب شواہد خصوصاً اس نظریہ کے منافی ہیں کہ مغلیہ عہد کے ہندوستان کے صنعتی نقشہ پر بقائے زندگی زراعت، معاشی ریگستان کے بیچ اہم شاہراہوں پر واقع کچھ پیداوار کے مرکزوں کے صرف نخلستان ہیں۔ غیر زراعتی پیداوار کیوں کہ سرمایہ دارانہ پیداوار کی شکل نہیں اختیار کرسکی۔ اس کی اہم وجہ آلیو (Alaev) یوروپین سیاحوں کی آمد خیال کرتے ہیں۔

مال پور (الہ آباد کے قریب) شورہ کو حاصل کرکے اسکو سورت میں موجود اپنے کارخانے میں صاف کروانے کے لئے انگریزوں کی کوشش میں پروڈکشن کے سرمایہ دارانہ شکل کے کچھ عناصر ضروری طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ مگر کچھ دیگر اسباب (خاص طور پر بارود کے لئے اس کی اہمیت کی وجہ) کی وجہ سے یہ تجربہ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔ اسی طرح نیل کی پیداوار میں یوروپی سرمایہ کی شرکت دیسی پیداواری عمل میں غیر ملکی سرمایہ کی کچھ حد رسائی کا اشارہ ضرور دیتی ہیں۔ مگر اس کا اثر ممکنہ طور پر اتنا لائق فکر نہیں تھا جتنا کہ 19-18 ویں صدی میں تھا۔ لیکن ممکن طور پر اس سے گجرات معاشیات کا نوآبادیاتی عمل ضرور شروع ہوگیا۔

آلیو (Alaev) اس بات سے متفق ہیں کہ جنوبی ہند میں تجارت دستکار تعلق سے کچھ سرمایہ دارانہ خصوصیات موجود تھیں۔ (خصوصاً بنکروں کو آمدنی نہیں بلکہ تنخواہ ملتی تھی) اس پر بھی تعلق قبل سرمایہ دارانہ تعلقات سے باہم پیوست تھے۔ یعنی ذات پات کے بھائی چارے سے (کیمبرج 1982)۔ نتیجتاً انکا خیال ہے

کہ یہ سب شکلیں روایتی طور پر طریق عمل میں اندر ہی رہیں، جس کو نہ تو دیسی سرمایہ کی سرگرمیوں سے اور نہ ہی غیر ملکی تاجر سرمایہ کی گھس پیٹ کے ذریعہ خلل ڈالا جاسکا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کے عہدِ وسطیٰ میں بازار میں اپنی محنت کو فروخت کرنے کے واسطے آزاد مزدور موجود تھے۔ جو پیداوار کی سرمایہ دارانہ شکل کی ایک اولین شرط ہے۔ مگر یہ عمل پیداوار کی سرمایہ دارانہ شکل اختیار کرنے میں کہاں تک موزوں تھا؟ اس حوالہ میں بچولیوں/ دلالوں کے کردار کا تجزیہ اہم ہے۔ چونکہ پیداوار کافی حد تک انفرادی بنیاد پر ہی منظّم تھی۔ صارف تک مال آخری شکل میں پہونچانے کے واسطے بچولئے (دلال) ہی بڑے رابطہ کا اہم ذریعہ تھے۔ ان کا رول کمپنی کی تجارت کی بڑھتی شرکت کے ساتھ ہی مرکزی ہوگیا۔ اس زمانہ میں تجارتی سرمایہ بھی پیداوار (دادنی) پر محیط تھا۔ اگر چہ تجارتی سرمایہ سبھی دستکاریوں میں قابل دید تھا۔ اس سے دستکاروں کو فقر و مصائب کے سوا کچھ حاصل نہ ہوسکا (گوپال 1975)۔ ہمیں دستکاری پروڈکشن کے کچھ میدانوں میں پیداوار سرمایہ دارانہ خصوصیات کی کچھ شرکت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر وہ آگے مزید ترقی نہ کرسکی۔ لیکن ویبر عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان میں ذات کو معاشی ترقی/ اضافہ کے لئے ایک بندش خیال کرتے ہیں۔

ہم اس موضوع پر اپنی بحث عرفان حبیب کی اس تنقید کے ساتھ ختم کرنا پسند کریں گے کہ 'جہاں تک سرمایہ کا سوال ہے وہ عملی طور پر کاروبار کے میدان تک ہی محدود تھا۔ لہذا اپنے لئے کسی آزاد بنیاد کو ترقی دینے میں ناکام رہا اس کا نصیب مغل حکمراں طبقے کے ساتھ ہی وابستہ تھا اور ان کے زوال کے بعد ایسے دیگر طبقوں کے ساتھ جنہوں نے اس طبقہ کے طریقہ کار اور اداروں کی تقلید کی یا ان کو وراثت میں ملی وہ بھی ختم ہوگئیں۔ انھیں مغل سلطنت کے ذریعہ جو وسیع بازار ملا تھا، 18ویں صدی میں نایاب تھا۔ لہذا تجارتی سرمایہ کے پاس زوال کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اہم معاشی تاریخی خصوصیت بھی پس منظر میں چلی گئی جنھیں سہواً مغلیہ عہد حکومت کے اچھے دنوں میں سرمایہ دارانہ علامت خیال کرلیا گیا'۔

18.10 خلاصہ

ہم نے اپنی بحث اس سوال کے ساتھ شروع کی کہ عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی معیشت منجمد تھیں یا متحرک۔ اپنی اختتامی الفاظ میں آیئے اس بات پر روشنی ڈالیں کہ عہدِ وسطیٰ کی معاشیات اپنے فخر کی انتہاء پر ہمارے دور مطالعہ کے آخری سالوں کے دوران پہنچ گئی تھی۔ ہندوستانی کاریگروں نے اپنی مہارت سے یوروپی سیاحوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ نیز بازار کے واسطے پیداوار میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ یہاں بڑے مزدور بازار کی موجودگی تھی جس میں حرکت پذیری کا لچیلا پن موجود تھا۔ تجارتی سرمایہ نے پیداوار کے عمل میں فعال کردار نبھایا لیکن ایسی متحرک معیشت ہونے کے باوجود وہ اور آگے ترقی نہ کرسکی۔

18.11 مشقیں

(1) عہدِ وسطیٰ میں کپڑے کی پیداوار کی ترقی کا تنقیدی تجزیہ کیجئے۔

(2) عہدِ وسطیٰ میں سرمایہ دارانہ ترقی کے امکانات پر بحث کیجئے۔

(3) عہدِ وسطیٰ میں دستکاری پیداوار کا مقابلہ پیداوار کی دوسری شکلوں سے کیجئے۔

(4) عہدِ وسطیٰ میں آزاد دستکاری پیداوار کس طرح منظّم تھی؟

(5) کارخانوں کا موازنہ فیکٹریوں کے ساتھ کس حد تک کیا جاسکتا ہے؟ وہ کس طور پر مختلف تھے؟

(6) 'عہد وسطیٰ میں مختلف دستکاریوں کے درمیان کوئی حرکت پذیری موجود نہیں تھی'، تنقید کیجئے۔

(7) دادنی کیا تھی؟ دادنی نظام کے تحت پیداوار کس طرح منظّم ہوتی تھی؟

(8) عہد وسطیٰ میں دستکار طبقے کی حالت کا تنقیدی تجزیہ کیجئے۔

(9) عہد وسطیٰ میں دستکاری پیداوار کس طرح منظّم ہوتی تھیں؟

(10) مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھئے۔

(الف) نیل پیداوار کی تکنیک۔

(ب) شورہ پیداوار کی تکنیک۔

(11) عہد وسطیٰ کے ہندوستانی کپڑا پیداوار کی غالب خصوصیات کا تجزیہ کیجئے۔

(12) عہد وسطیٰ میں غیر زراعتی پیداوار کی ترقی میں ریاست کے کردار کا تذکرہ کیجئے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU
Accn No. MA-0
Date 03.08.2015
HYDERABAD

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU
IMC LIBRARY
Hyderabad-32

اکائی 19 محصولات

ساخت

19.1 تعارف
19.2 محصول سے متعلق اسلامی نظریہ
19.3 لگان
19.3.1 شمالی ہند
19.3.2 دکن
19.3.3 ملک عنبر کا بندوبست اور مراٹھا لگان
19.3.4 جنوبی ہند
19.3.5 راحتی اقدام
19.4 ابواب (cesses)
19.5 زمینی لگان کے علاوہ دیگر ٹیکس: سائر جہات (Sair Jihat)
19.6 کسٹم اور بازار کے محصول
19.7 پیشوں اور کارخانے داروں پر ٹیکس
19.8 محصول عطیات
19.9 ریاست اور محصولات
19.10 خلاصہ
19.11 مشقیں

19.1 تعارف

عہد وسطیٰ میں لگان سے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال زمین کی ملکیت سے متعلق ہے۔ زمین کی ملکیت کے حقوق کس کے پاس ہوتے تھے۔ ریاست (شہنشاہ) کے پاس یا پھر رعیت (کاشتکاروں) کے پاس؟ یہ سوال اس کو واضح کرنے کے لئے بہت اہم ہے کہ ٹیکس زمین پر تھا یا فصل پر یا پھر لگان تھا؟

اس مضمون سے متعلق پریشانی یوروپی مسافروں کے بیانات سے شروع ہوئی، خصوصاً فرانسیس برنیر (68-1656) کے تذکروں سے۔ جس کی اتباع برطانوی سرکاری تحریروں میں کی گئی۔ برنیر کے مطابق ہندوستان میں زمین کی ملکیت کا حق بادشاہ کے پاس تھا۔ یہ پریشانی کافی حد تک جاگیر نظام کے کار عمل کے تعلق سے کلی غلط فہمی کے وجہ سے ہوئی۔ برنیر نے مغل جاگیرداروں کا موازنہ مغربی یوروپ کے حاکموں (LORDS) کے ساتھ کیا ہے۔ چونکہ جاگیردار شہنشاہ کی مرضی کے مطابق بادشاہ کے پاس ہی زمین کی ملکیت کا حق تھا نہ کہ جاگیردار کے پاس۔ محمد ہاشم کوارسال اورنگ زیب کا فرمان واضح طور پر کاشتکاروں کو مالکوں کی شکل میں مخاطب کرتا ہے۔ ابوالفضل اپنی آئین اکبری میں صاف طور سے زمین کے لگان کو کسانوں کی جائیداد پر ٹیکس کی شکل میں ذکر کرتا ہے۔ اس کے مطابق یہ بادشاہ کے ذریعہ اپنی رعایا کو حفاظت اور انصاف دینے کے بدلے میں حاصل معاوضہ تھا۔ (عرفان حبیب 1963) یہاں تک کہ کاشتکاروں کے ذریعہ زراعت کے تحت لائی گئی بنجر زمینوں پر بھی کاشتکاروں کی ملکیت کے حقوق کو منظوری دی گئی تھی۔ بی۔ آر۔ گروور اپنی پر تحقیق تحریر 'نیچر آف لینڈ رائٹس ان مغل انڈیا' میں مدلل طور پر دلیل دیتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں زمین کی ملکیت کا حق رعایا (کاشتکاروں) کے پاس ہوتا تھا۔ ان کو اپنی زمین منتقل کرنے یا فروخت کرنے یا رہن رکھنے کا اختیار حاصل تھا۔ عرفان حبیب (1999) ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا میں کاشتکاروں کے زمینی ملکیت کے

حقوق کوقبول کرتے ہوئے عہدوسطیٰ کے حالات کی خصوصیات کوواضح کرتے ہیں کہ جہاں تک کاشتکار جتائی کے لئے اسے زمین دیئے جانے میں زمیندار کے انتخاب سے متعلق حقوق کوتسلیم کرتا تھا۔ وہ کم از کم ایسی زمین کا مالک نہیں تھا۔ ان میں اور دوسرے رعیتی علاقوں میں اسکی پٹہ داری کے حق کو، اس کی حرکت پذیری پر لگی رکاوٹوں کے ذریعہ متوازن کیا جاتا تھا۔ اس حدتک وہ ایک نیم غلام تھا نہ کہ کوئی آزاد ایجنٹ اور اس کا حق جیسا کہ یہ تھا، شاید ہی فروخت ہوتا تھا۔ اسلئے مغلیہ عہد کے ہندوستان میں کسی حقیقی یا عارضی کاشتکار کی ملکیت کے ظہور کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی فرد کے پاس جائیداد سے متعلق کوئی دیگر حق نہیں ہوتا تھا۔ اس نظم میں ایک ہی زمین سے حاصل پیداوار میں جداگانہ شکلوں میں، معین حصوں کے متفرق دعویداروں (بادشاہ یا اس کا عطیہ حاصل کرنے والا زمیندار اور آخر کار کاشتکار) کے ساتھ منتقل کرنے کے حقوق اور اختیارات کا تانہ بانہ ہوتا تھا۔

اسطرح کے حالات دکن میں بھی موجود تھے۔ زمین پر میراث داروں کے موروثی اختیارات کو بھی منظوری حاصل تھی۔ کاشتکار اپنی زمین فروخت کرسکتے تھے۔ یا رہن بھی رکھ سکتے تھے۔ کہیں کہیں رعایا کی زمین بادشاہ کے ذریعہ خریدنے کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ مگر روایتی قانون کے ذریعہ وطن زمین کی خرید وفروخت پر بہت سی پابندی لگائی گئی تھی۔ کاشتکار اپنی زمین گاؤں والوں کی منظوری کے بغیر نہیں فروخت کرسکتے تھے۔

جنوبی ہند کا حوالہ دیتے ہوئے نونز (Nuniz) لکھتا ہے کہ ساری زمین راجاؤں کی ہے۔ اور ان کی (کاشتکاروں کی) اپنی کوئی زمین نہیں ہے۔ کیونکہ مکمل ریاست کا مالک راجا ہی ہے، این۔ وینکٹ رمنیا بھی اس سے متفق ہے۔ وجے نگر کے عہد میں راجا ہی زمین کا مالک ہوتا تھا۔ کنارا علاقے کو چھوڑ کر جہاں ایک 'استثناء' کی شکل میں زمین کی ذاتی ملکیت کی موجودگی تھی۔ مگر نوبورو کارشما اور وائی۔ سبرایالو برہمدیہ گاؤں میں سبھا کے ممبران کی انفرادی ملکیت کی موجودگی پر زور دیتے ہیں۔ ان کا تذکرہ ریکارڈوں میں کئی حقوق (زمین کی ملکیت کا موروثی حق) کی شکل میں ملتا ہے۔ مگر ان کا خیال ہے کہ اُر (غیر برہمدیہ گاؤں) کے ممبر کے پاس تمام لوگوں کی زمین ہوتی تھی۔ کارشما تذکرہ کرتا ہے کہ چول عہد حکومت کے آخر میں نچلی کاویری وادی میں غیر برہم دیہ گاؤں میں بھی انفرادی ملکیت کا ظہور ہوا اس کا سہرا وہ علاقائی توسیع اور نئی آبپاشی تکنیکوں (تالاب، باندھ وغیرہ) کی آمد سے زراعتی پیداوار میں اضافہ کے نتیجے میں بڑھتی خوشحالی کو دیتا ملتا ہے۔ ہمارے مطالعہ کے زمانہ میں اسی میدان میں چھتریوں (ارسو کولا ور) نے کئی حقوق حاصل کئے۔ غیر منظم سیاسی حالات کے سبب چول حکومت کے آخری سالوں میں اس عمل میں تیزی آئی۔ اس نے لازمی طور پر مقامی توازن کو بگاڑ دیا جس کے نتیجے میں پرانے (مقامی) کئی مالک زراعت چھوڑنے لگے۔ لہذا ان کے روایتی حقوق کی حفاظت کی خاطر اس عمل نے ریاستی دخل اندازی کو ترقی دی مگر برٹن اسٹائن ایسی انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ انکا خیال ہے کہ مقامی سیاست اور ملکیت سے متعلق مشترک کنٹرول کی بنیاد پر قائم کئے گئے جو یا تو خصوصی حقوق کے فرقہ وارانہ ملکیت عموماً برھمن اور مندر کے یا پھر مشترکہ زمین کے خاندانی مالک کے مشترکہ اختیار میں تھے۔ نجی زمین کی ملکیت اپنے جدید مطلب میں موجودگی میں نہیں تھی۔ فرقہ وارانہ ملکیت کے ان معاملوں میں کافی حدتک زمین کمیونیٹی کے ممبران کے ذریعہ مشترکہ رکھی جاتی تھی۔ برھمن، تمل، ویلال، کناڈیگا، وکلی گا را ور تیلگو ریڈی ایسے ہی طبقات تھے۔ باہری افراد کو گاؤں کی زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھیں۔ حالانکہ کمیونیٹی کے ممبران گاؤں کے اندر ہی اپنا حصہ فروخت کرسکتے تھے۔ ایسی زمین عطیات کی شکل میں یا جہیز (عورت کی ملکیت) میں بھی کسی خارجی آدمی کو نہیں دی جاسکتی تھی۔ برٹن اسٹائن کا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ ملکیت اور خصوصی اختیارات کی حفاظت کسی حد تک جنگ جو کاشتکار طبقوں کی جنگ کی صلاحیتوں کے سہارے کی جاتی تھی۔

19.2 محصول (ٹیکس) سے متعلق اسلامی نظریہ

ہندوستان میں ہمارے مطالعہ کا زمانہ کافی حد تک ترکی حکومت کی آمد سے میل کھاتا ہے۔ مختلف ماحول سے آنے والا یہ نیا حکمران طبقہ ثقافتی طور پر اپنے ماقبل کے حاکموں سے کافی متفرق تھا۔ ان کے اپنے حکومت کرنے کے طریقے اور قانون تھے۔ اسی وجہ سے یہاں ترکی حکومت کی وراثت پر مختصر اُبحث مناسب ہوگی کہ انھوں نے اپنے ملکی قانون کسی حدتک یہاں نافذ کئے مگر یہاں ہم اصولی نظریات میں ہی زیادہ تر متعلق ہیں یعنی وہ اصول جس کو مسلم قانون دانوں کے ذریعہ باضابطہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے حقیقتاً کیا نافذ کیا، یہ ہمارے آئندہ آنے والے اسباق کا ایک حصہ ہوگا۔

ٹیکس کے نفاذ کا اسلامی اصولوں کا خاکہ تیار کرنے کا عمل خلیفہ عمر (644ء) کے زمانہ ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ جو عباسی عہد (1258-750) تک چلتا رہا

تھا۔اسلامی فکر کے اہم دبستان میں حنفیہ (اس کے بانی ابوحنیفہ تھے، تقریباً 767-699ء) اور شافعی (امام شافعی اس کے بانی تھے، 820-767 عیسوی) ہیں۔ ہندوستان میں مسلم بادشاہوں نے بھی کافی حد تک حنفی اصولوں پر عمل کیا۔

محمد بن الحسن الطّوسی (م، 1097) نقل کرتا ہے کہ ملکیت کی نوعیت کی بنیاد پر زمین چار قسموں کی ہوتی تھی۔(الف) وہ لوگوں جنھوں نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کرلیا ہوان کو عشر ادا کرنا ہوتا تھا اوران کو مکمل زمین ملکیت کے حقوق حاصل تھے۔(ب) طاقت کے ذریعہ فتح کئے گئے مسلم طبقات کی زمین خراج زمین کہلاتی تھی۔کاشتکار کولگان کی شکل میں 1/2 یا 1/3 حصہ دینا ہوتا تھا نیز اس کو عشر بھی ادا کرنا لازمی تھا۔اسی حقیقت کو پیش نظر کئے بغیر کہ زمین پر قبضہ کرنے میں کسی نے حصہ لیا تھا یا نہیں یہ زمین مکمل مسلم طبقے کی ہوتی تھی۔اوراسکے نفع کو سبھی کے درمیان تقسیم کردیا جاتا تھا۔(ج) صلح زمین، ایسی زمین جو امام کے ذریعہ معاہدہ کرکے حاصل کئی گئی ہو۔اس زمین پر زمین کے مالکوں کو پیداوار کا نصف، ایک تہائی یا ایک چوتھائی لگان دینا ہوتا تھا۔اس درجہ کی زمین غیر مسلموں (ذمیوں) کی ہوتی تھی۔اور (د) انفل زمین میں شامل تھے: باغات اور پہاڑی زمین۔یہاں غور طلب اہم بات یہ ہے کہ مسلم قانون دانوں نے زمین کی ملکیت کے حقوق کو تسلیم کیا۔

وسیع طور پر محصول کے ذرائع کو فے اور زکواۃ میں تقسیم کیا گیا تھا۔''فے'' زمین کی وہ قسم تھی جو غیر مشروط سپردگی سے حاصل کی گئی ہو۔شافعیوں کا خیال ہے۔کہ یہ غنیم (لوٹ کا مال) ہے اوران سبھی لوگوں میں تقسیم کردی جانی چاہیے جنہوں نے اسکے حصول میں حصہ لیا تھا۔جبکہ حنفیوں کی دلیل ہے کہ یہ توان میں تقسیم کی جاسکتی ہے جنھوں نے اس کو حاصل کرنے میں شرکت کی تھی۔یا پھر امام اس کے باشندوں کوخراج کی ادائیگی کے عوض میں زمین کی ملکیت کے حقوق کی اجازت دے سکتا ہے۔حنفیوں کے مطابق ''فے'' زمین کا لگان مسلم طبقات کی فلاح کے واسطے خرچ کیا جانا چاہیے جیسے فوجیوں، علماء، اور دیگر افسران کو وظیفہ کے شکل میں، شہروں اور شاہراؤں کی نگہداشت اور حفاظت کے واسطے، باندھ، نہریں وغیرہ بنوانے کے لئے۔شافعیوں کا ماننا ہے کہ اس کا 1/5 حصہ الگ رکھ رکھا جانا چاہیے۔

'فے' کا موٹے طور پر خمس، جزیہ، اور خراج میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔خمس کا مطلب ہے پانچواں حصہ۔ریاست جنگ کی لوٹ کے 1/5 حصہ کی حقدار ہوتی تھی۔جزیہ حفاظت اور فوجی خدمات سے چھوٹ کے عوض غیر مسلموں (ذمیوں) پر لگایا جاتا تھا۔ان قانون دانوں کے ذریعہ ان کے بیچ فرق کیا گیا ہے جو جنگ کئے بنا ماتحتی قبول کرلیتے تھے (صلحن اور دوسرے وہ جو کہ جنگ میں شکست کھا جاتے تھے (انوتن ANAWATAN)۔صلحن کے ساتھ نرمی کا رخ اختیار کیا جاتا تھا۔شروع شروع میں عیسائی، یہودی وصبائی نیز بعد میں زرتشتی ذمی (غیر مسلم) کے نام سے جانے جاتے تھے۔مگر شافعیوں کا ماننا ہے کہ جزیہ صرف یہودیوں، عیسائیوں اور آتش پرشتوں پر ہی نافذ کیا جاسکتا تھا۔جبکہ مالکیوں کے مطابق سبھی کافر ذمی ہیں۔ابوحنیفہ (تقریباً 767-699ء) اورابو یوسف (1199) کی رائے ہے کہ جزیہ ان کے ذریعہ ادا کیا جاسکتا تھا جو کام کرسکتے تھے۔اسی کے مطابق خواتین، بچے، ناخواندہ، پاگل، غلام، بھکاری، ضعیف، بزرگ، اور مفلس لوگوں کو اس سے چھوٹ حاصل تھی۔غیر ملکی جو علاقے کے مستقل باشندے نہیں ہوتے تھے ان کو بھی یہ چھوٹ حاصل تھی۔یہ ٹیکس سبھی طبقوں پر برابر کی شکل میں نافذ نہیں کیا جاتا تھا۔دولت مند طبقہ 48 درہم (12 روپے 8 آنہ) اور متوسط طبقہ 24 درہم (=6 روپے 4 آنہ) اور غریب طبقہ 12 درہم (=3 روپے 2 آنہ) سالانہ دیتا تھا۔امام کے واسطے ٹیکس لگانا واجب نہیں تھا۔اس پر بھی یہ جائز تھا۔بدلے میں ذمیوں کے جان ومال کی حفاظت اور مذہبی آزادی وغیرہ کو یقینی بنایا جاتا تھا۔اس طرح وہ جو ٹیکس دیتے تھے غلام نہیں بنائے جاسکتے تھے اور وہ اپنے نجی قانون کے ذریعہ مطیع ہوتے تھے۔

خراج زمینی ٹیکس تھا جو یا تو پیداوار کی بنیاد پر مقرر کیا جاتا تھا یا پھر زراعت کے ماتحت حقیقی رقبہ کے مطابق۔پیائش جریب (رسی) کی مدد سے کی جاتی تھی۔خراج کے تعین میں مٹی کو افادیت (زرخیزی)، کاشت شدہ فصلوں کی نوعیت اور اختیار کردہ آبپاشی طریقوں کو ذہن میں رکھا جاتا تھا۔فصلوں کی بنیاد پر ریاست کا حصہ نصف سے لے کر 1/5 تک ہوسکتا تھا۔قدرتی آفات کی حالت میں کچھ رعایات حاصل ہوتی تھیں۔حصول کا طریقہ ٹیکس کے تعین پر منحصر تھا۔جنس کی شکل میں ٹیکس کے مطالبہ فصل کٹائی کے وقت کیا جاتا تھا۔نقد کی شکل میں یہ سالانہ کی بنیاد پر وصول کیا جاتا تھا۔

MEDIA CENTRE MANUU ISLAMIC LIBRARY Hyderabad-32

شروع شروع میں مسلمانوں کواسکی ادائیگی سے چھوٹ حاصل تھی۔لیکن بعد میں یہ دونوں سے مساوی طور پر وصول کیا جانے لگا۔مسلم قانون داں کاشتکاروں کو قرض دیئے جانے کے لئے طریقوں کی بھی سفارش کرتے تھے۔قرض ادا کرنے میں کاشتکار کی عدم صلاحیت کی وقت ریاست کے پاس اختیار تھا کہ وہ زمین کسی دوسرے کو لگان پر اٹھادے۔لیکن وہ زمین جلدی ہی دوبارہ حاصل کی جاسکتی تھی اگر مالک زمین یا پٹہ دار ٹیکس ادا کرنے سے متعلق اپنی خواہش ظاہر کرتا تھا۔

زکوٰۃ (صدقہ) ریاست کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ تھا۔اصولاً یہ ایک مذہبی ٹیکس تھا۔اسکی ادائیگی تمام ہی مسلمانوں کے واسطے لازمی تھی۔یہ ٹیکس رہائشی مکانوں، کپڑوں، غلاموں، بار بردار مویشیوں، غذائی اشیاء سے لیکر سونا چاندی وغیرہ منقولہ وغیر منقولہ قسم کی ملکیت پر نافذ کیا جاتا تھا۔زکوٰۃ، بچوں، غلاموں، پاگلوں، قرض داروں، دیوالیہ اور غیر مسلموں پر عائد نہیں کی جاتی تھی۔غیر منقولہ جائداد پر لگائے گئے ٹیکس کو عشر کہا جاتا تھا۔

عشر (Tithe) ایک جداگانہ ٹیکس تھا جو کہ صرف مسلمانوں سے ہی وصول کیا جاتا تھا۔یہ ٹیکس زمین کی اصل پیداوار پر نافذ کیا جاتا تھا نیز خراج سے جداگانہ تھا۔نابالغ، پاگل، وقف (مذہبی ادارے) کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا۔یہ اناج سبزیوں، وغیرہ کی شکل میں حاصل کیا جاسکتا تھا۔بارش کے ذریعہ آبپاشی شدہ فصلوں اور جنگل ثمرات پر ٹیکس، فصل کے 1/10 کے حساب سے نافذ کیا جاتا تھا۔جبکہ آبپاشی کے مصنوعی ذرایع کی مدد سے اگائی گئی فصلوں کا 1/2 ادا کرنا پڑتا تھا۔ابوحنیفہ کا خصوصی طور پر خیال ہے کہ عشر صرف مذہبی زمینوں پر ہی نافذ کیا جاسکتا تھا۔اس کا مطلب ہوا کہ خراج اور عشر دونوں ایک ساتھ نہیں نافذ کئے جاسکتے ہیں۔مگر شافعیوں کا خیال اس سے مختلف ہے۔ان کا خیال ہے کہ دونوں ایک ساتھ نافذ کئے جاسکتے تھے۔

19.3 لگان

عہد وسطیٰ میں زمین ٹیکس کی وساطت سے کاشت کاروں کی زائد پیداوار کا بڑا حصہ لے لیا جایا کرتا تھا۔یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ زمینی ٹیکس مقرر کرنے کا پیٹرن مختلف میدانوں میں کم وبیش ایک جیسا ہی تھا۔اس حصہ میں ہم سلطنت عہد سے لیکر مغلیہ عہد تک زمینی ٹیکس کی نوعیت پر بحث کریں گے۔اس نے اپنی کلاسیکل شکل اکبر کے عہد حکومت میں حاصل کی اور اس کے بعد پوری 17 ویں صدی میں تقریباً اسی طریقہ سے وصول کیا گیا۔دکن اور جنوبی ہند پر بحث الگ حصہ میں کی گئی ہے۔یہ دیکھنا باعث دل چسپ ہوگا کہ مغلوں کی دخل اندازی کے ساتھ آپس میں جذب ہونے کا عمل شروع ہوا۔موجود علاقائی انتظام کی آمیزش نئی شکلوں میں منعقد قائم ہوئی اس پر بھی انھوں نے اپنی علاقائی شناخت قائم رکھی۔

19.3.1 شمالی ہند

عہد وسطیٰ میں ریاست کی آمدنی کا اہم ذریعہ زراعت کی زائد پیداوار ہی تھا۔مختلف ثقافتی پس منظر نیز متعدد ماحول سے آنے والے اس نئے حکمراں طبقہ (ترک) کا مختلف مسائل سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ بھی جداگانہ تھا۔یہ بات ہر میدان میں دیکھنے کو ملتی ہے۔دیہی علاقوں میں ان کو تداخل پذیر ہونے میں تھوڑا وقت ضرور لگا۔شروع میں ترک حکمراں ابتدائی سطح پر صدیوں سے رائج پیٹرن کو تبدیل کئے بغیر جدید محکوم حکمرانوں سے نذر کے طور پر حاصل شدہ ایک مشت نذرانہ سے مطمئن ہوئے وہ بھی کبھی کبھی استقامت سے مانگ کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا تھا۔خصوصاً باغی علاقوں (مواست) میں۔دیہی نظام میں دخل اندازی کرنے میں اس نئے حکمراں طبقہ کو تقریباً 100 سال لگے۔ایک جیسا ٹیکس نظام نافذ کرنے کی کوشش کرنے والا پہلا آدمی علاء الدین خلجی ہی تھا۔

علاء الدین نے بغیر کسی استثناء کے سبھی طبقوں پر خراج وجزیہ نافذ کیا۔زمین کی پیائش کرائی گئی اور علاقے کی ہر ایک اکائی کی پیداوار مقرر کی گئی۔اسکو کل زراعت کے تحت علاقے سے ضرب کر کے سبھی پر مساوی طور پر کل فصل کے نصف لگان کا مطالبہ نافذ کیا گیا۔جن میں اعلیٰ حقوق یافتہ خوط، مقدم (گاؤں کا کھیا) اور چودھری (سو گاؤں کا مکھیا) بھی شامل تھے۔برنی (1357) تحریر کرتا ہے کہ یہ خوط سے بلاہر (گاؤں کے خدمتگار) سبھی پر مساوی طور پر نافذ کیا گیا۔محصول مطالبہ کا تعین اشیاء کی شکل میں طے کیا گیا مگر ادائیگی نقدی کی شکل میں ہی ہوتی تھی۔ممکن طور پر محصول جمع کرنے والوں کی پسند نقدی

ادائیگی تھی۔مگر ایسے حوالے بھی ملے ہیں کہ دوآبہ اور اسکے اردگرد کے خالصہ علاقوں میں علاؤالدین نے اشیاء کی شکل میں محصول جمع کرنے کو بڑھاوادیا۔ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ محصول کا تعین انفرادی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔مگر اس بات میں شبہ ہے کہ عملاً یہی پیٹرن تھا۔

محصول وصولی میں بچولیوں یعنی خوط اور مقدم کی خدمات کے عوض ان کو خراج وجزیہ سے رعایت دیکر غیاث الدین تعلق نے بچولیوں کو خوش کرنے کی کوشش کی۔

مگر محمد تغلق نے نہ صرف علاءالدین کے ٹیکس طریقہ کار کو اختیار کیا بلکہ اس نے محصولات میں اضافہ بھی کیا۔برنی اس میں ایک سے 10 اور ایک سے 20 کے درمیان اضافہ کی بات کرتا ہے۔یحیٰ بن احمد سرہندی نقل کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ زمین کو ناپا گیا اور سرکاری طور پر مقرر پیداوار (وفا ہائے فرمانی) کا تعین سرکاری طور پر ہی متعینہ قیمتوں (نرخ ہائے فرمانی) کی بنیاد پر کیا گیا۔سرکاری طور پر متعینہ پیداواروں یعنی معیاری پیداواروں (نہ کہ حقیقی پیداوار) اور سرکاری طور پر متعینہ قیمتوں (نہ کہ حقیقی رائج قیمتوں) کی وجہ سے ٹیکسوں کا تخمینہ بے حداونچی شرح پر کیا ہوگا۔کیونکہ زیادہ مقامات پر سرکاری طور پر متعینہ پیداوار اور حقیقی قیمتوں سے ممکن طور پر کافی زیادہ ہوتی تھیں۔(عرفان حبیب، کیمبرج 1982) مگر فیروز نے نہ صرف محمد تغلق کی کوششوں کو تبدیل کیا بلکہ وہ اس سے بھی ایک قدم بڑھ گیا۔اس نے ابواب کو ختم کیا حالانکہ اس کو خراج کے 4% تک محدود رکھا گیا اس طرح سے اس نے محصول میں رعایتیں دیں۔

سیّد اور لودھی حکمرانوں کے تحت زمین کے لگان کے پیٹرن سے متعلق مفصل تفصیل دستیاب نہیں ہے۔مگر ایسے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ قیمتوں میں تیزی سے گراوٹ کی وجہ سے ابراهیم لودی نے افسران طبقہ کو حکم جاری کیا تھا کہ محصول غذائی اجناس کی شکلوں میں وصول کیا جائے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقدی کے فقدان کی وجہ سے (اس وقت پوری دنیا میں چاندی کی غیر معمولی کمی ہوگئی تھی) ابراهیم نے اشیاء کے شکل میں محصول کے جمع کرنے پر زور دیا۔مگر ابراہیم لودی سے قبل زمینی لگان ممکن طور پر نقدی میں ہی وصول کیا جاتا رہا تھا۔

زمینی لگان نے اپنی کلاسیکل شکل مغلیہ عہد میں ہی میں اختیار کی۔اسکی بنیاد شیر شاہ سوری کے ذریعہ رکھی گئی تھی۔اکبر نے اپنے پیش رو سے ملی اس وراثت کو کافی حد تک وسیع اور آراستہ کیا۔یہ جانکاری باعث دلچسپ ہوگی کہ زمینی لگان (مال، راجستھان میں اسے بھوگ کہا جاتا تھا)، حقیقت میں زمین پر ٹیکس نہیں تھا بلکہ یہ فصلوں پر ٹیکس تھا۔

ہندوستان میں زمینی محصولات وصول کرنے کا سب سے پرانا طریقہ تھا، غلہ بخشی یا بٹائی جو کہ فصلوں کے کھیتوں میں رہتے ہی حقیقی پیداوار میں سے وصول کیا جاتا تھا۔شیر شاہ نے زمین کی تین مختلف قسموں، اعلیٰ، متوسط، معمولی قسم، پیداوار کی بنیاد پر رے (پیداوار فی بیگھ، راجستھان میں اس کو دیکھ کہا جاتا تھا) مقرر کی۔ان تین رے کا اوسط نکالا جاتا تھا اور کل مطالبہ ایک بیگھہ کی پیداوار کو کل زراعتی علاقے سے ضرب کر کے متعین کیا جاتا تھا۔اور بعد میں یہ مطالبہ شاہی دربار/خیمہ میں رائج قیمتوں کے لحاظ سے ضرب کر کے مقرر کیا جاتا تھا۔یہ طریقہ عموماً کنکوت (کن = اناج، کوت = پیانہ) کے نام سے مشہور تھا۔اس نے ریاستی ٹیکس جمع کرنے کے طریقہ کار میں حکومتی اخراجات کو کافی کم کیا۔مگر اس نے ریاست کا انحصار مقامی افسروں پر از حد زیادہ کردیا اور چونکہ عموماً قیمتیں دربار میں رائج قیمت ہی ہوتی تھیں۔یہ عموماً رائج بازاری قیمتوں کے بمقابل کافی زیادہ ہوا کرتی تھی۔لہذا اس دستور کا کاشتکاروں پر زبردست اثر پڑا اور یہ ان کے واسطے مناسب نہیں رہا۔اس میں تاخیر بھی پیش آتی تھی۔کیونکہ ٹیکس کے تعین کے واسطے پیداوار کو نقد کی شکل تبدیل کرنے کی کاروائی وقت طلب تھی۔اس کے علاوہ اس میں ٹیکس سے متعلق کافی بے یقینی بھی بنی رہتی تھیں۔ریاست کو یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ موجودہ سال میں سالانہ تخمینہ شدہ آمدنی کتنی ہوگی۔ابوالفضل نقل کرتا ہے کہ ہر پیداوار پر رے متعین کرنے کے بجائے اکبر نے ایک معیاری دستور قائم کیا۔معیاری دستور سازی کے واسطے گذشتہ دس سالوں (71-1570 سے 80-1579) کی اوسط قیمتیں (دہ سالہ) نکالی گئیں۔اور انھیں دس سالوں سے رائج قیمتوں کے اوسط کا شمار کیا گیا۔ان اوسط قیمتوں کو اوسط پیداواروں سے ضرب کر کے ''ایک معیاری آخری دستور'' (نقد لگان شرح فی بیگھہ) نافذ کیا گیا۔اس طرح سرکاری محصول کا تعین کیا گیا اور ہر فصل کی فی اکائی علاقے کے لئے نقد محصول مطالبہ متعین کردیا گیا۔عہد اکبر میں رائج ضبط طریقہ یہی تھا۔اب نہ تو کاشتکاروں کو اور نہ ہی افسر کو کوئی تشویش تھی۔نقد حساب

B.NO. 219

سے ایک بیگہ کل زراعتی علاقے سے محض ضرب کر کے دونوں کو پہلے ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کو فی الواقع کیا دینا اور ادا کرنا ہے یا پھر ریاست کو کتنا محصول ملتا ہے۔ محض ایک فرق تھا، نابود یعنی وہ علاقہ جو کہ زراعت سے خالی چھوڑ دیا گیا ہو۔ جس کے واسطے ریاست کی طرف سے رعایت دی جاتی تھی۔ اکبر کے زمانہ حکومت میں وہ اہم علاقہ جہاں ضبط طریقہ کارعمل میں تھا۔ وہ تھے: دلّی، آگرہ، الہ آباد، اودھ، اور لاہور (سندھ سے لے کر گھا گھرا تک کا علاقہ)۔ ان علاقوں میں محصول کی وصولی کی غالب شکل میں ضبطی کے دستور کی وجہ سے انکو ضبطی علاقے کہا جاتا تھا۔ بعد میں شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد حکومت میں یہ طریقہ کار دکن کی جانب بھی بڑھا۔ مگر آگے چل کر سرکاری فصلوں کے ذریعہ وقت وقت پر کچھ نظر ثانی کے ذریعہ) سالانہ قیمتیں متعین کرنے کا عمل بھی ختم کر دیا گیا اور زمین لگان کے مطالبہ کا تعین گزشتہ سال کے اعداد و شمار کی بنیاد کیا جانے لگا یہ رسم عام طور پر نسق کہلاتی تھی۔

یہاں قابل یادداشت بات یہ ہے کہ جب ہم کسی خاص علاقے کو ضبطی کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ضبط ہی اس علاقے میں محصول متعین کرنے کا اہم طریقہ تھا۔ مگر ساتھ ہی دوسرے طریقے بھی موجود تھے۔ کشمیر اور سندھ میں فصل کی بٹائی ہی محصول کے تعین کی رائج شکل تھی۔ بنگال میں لگان متعین کرنے کی رائج شکل مقطعی تھی، جس میں ایک طے شدہ ایک مشت رقم دینی ہوتی تھی۔ راجستھان میں دونوں محصول شرحیں بٹائی (جسے بٹائی جنسی بھی کہا جاتا تھا) اور ضبطی رواج میں تھی۔ مگر بٹائی جنسی کے تحت علاقے ضبطی کے مقابلہ کہیں بہت زیادہ تھے۔ کچھ علاقائی اختلافات بھی تھے۔ صوبہ ملتان، ٹھٹھ، اور سیوستان میں تین طرح کے محصول شرحیں رائج تھیں۔ دستور (ریاستی شرح) کم دستور (رعایتی شرحیں) اور بٹائی۔ مشرقی علاقوں میں خصوصاً پہاڑی علاقوں میں زراعت کو فروغ دینے کے واسطے خصوصی رعایت دی جاتی تھیں۔ کاشتکاروں کو پہلے سال میں صرف برائے نام لگان (کھل khil) دینا ہوتا تھا۔ اور دوسرے سال مطالبہ میں اور کمی کر دی جاتی تھی (کم kum)۔ یہاں اکبری قیمتیں رواج میں نہیں تھیں۔

آپ پائیں گے کہ مغلیہ عہد میں محصول متعین کرنے کے متفرق حساب تھے۔ مٹی کی زرخیزی اور فصل کے اختلاف کی بنیاد پر متعدد علاقوں میں محصول کی مانگ جداگانہ ہوتی تھی۔ شیر شاہ کے تحت پیداوار کی 1/3 معیاری محصول درتھی۔ مگر اکبر کے ضبطی طریقہ کے تحت معیاری محصول کی در پیداوار کی تقریباً نصف تھی۔ مگر گجرات کے کچھ زرخیز علاقوں میں محصول کا مطالبہ 2/3 تک بھی تھا۔ مگر خشک علاقوں میں یہ کافی کم تھا۔ مغربی راجستھان میں اوسط محصول مطالبہ 40 اور 42.5 فی صد کے درمیان تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مغل علاقوں کے بہ نسبت کم تھا۔ (بھدانی 1999) مارواڑ علاقے میں زمینی لگان کا مطالبہ فصل کی نوعیت اور موسم کے مطابق جداگانہ ہوتا تھا۔ پرگنہ میٹرتا سے دریافت دستاویز یہی ظاہر کرتی ہے کہ 17 ویں صدی میں یہاں خریف کی فصلوں پر محصول کی در کا تناسب 1/2 تھا جبکہ ربیع کے لئے بارش سے سیراب اور مصنوعی ذرائع سے آبپاشی کردہ زمین کے حصوں کے لئے جدا جدا محصول کی قیمتیں رائج تھیں۔ یہ بارش سے سیراب علاقوں میں 2/5 (پچدوئی) اور مصنوعی وسائل سے سیراب علاقوں کے لئے فصل کا 1/3 تھا۔ پرگنہ پھوکرن میں ہمیں فصل کے 1/3 شرح سے ایک باولی محصول کا مطالبہ کے متعین کرنے کے حوالہ ملتے ہیں۔ جبکہ پرگنہ سن چار، مغربی راجستھان جیسے مقامات پر محصول کا تعین ہلوں کی تعداد کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ جس کا نام مقطع تھا۔ محصول کا مطالبہ کاشتکاروں یا کسانوں کی ذات کے مطابق بھی جداگانہ ہوتا تھا۔ پرگنہ جالور (مغربی راجستھان) میں بنیا، گھانچی (تیلی) سابوگر، کن بھئی، پنجر (دھنیا) وغیرہ محصول پیداوار کے 1/3 کے حساب سے ٹیکس ادا کرتے تھے۔ جبکہ راجپوت 1/4 اور مالی 1/7 حصہ ہی ٹیکس میں دیا کرتے تھے۔ یہاں لگان مہتر (خدمتگاروں کا کھیا) پر بھی لگایا گیا تھا۔ جو کہ پیداوار کا 1/6 حصہ ہوتا تھا۔ (بھدانی 1999) اس طرح اعلیٰ اختیارات کے حامل اور اعلیٰ ذاتوں کے افراد پر محصول کے تعین کی شرح عام کاشتکاروں کے بہ نسبت کافی کم ہوتی تھی۔ رعیت کاشت (کاشتکار پٹہ) کو خود کاشت میں نہ بدلنے کے لئے مغل بادشاہوں کے تامل اور اصرار کے پیچھے یہ بڑا سبب تھا۔ مشرقی راجستھان کے تعلق سے۔ ایس۔ پی۔ گپتا کے نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ رعیت پر محصول کا تعین معاشرہ کے خصوصی حقوق یافتہ طبقے کے مقابلے کافی اونچی شرح پر کیا جاتا تھا۔

بٹائی نظام کے تحت محصول کا مطالبہ: دستور سرکل سرکار الور، صوبہ اکبر آباد

کاشتکار (لگان دہندہ)	پرگنہ جھاک 1715	پرگنہ موجپور 1713	پرگنہ انٹیلہ بھابھرا
پالتی (رعیت)	50%	40%	50%

پٹیل	40%	33%	40%
مہاجن	40%	33%	33%
جوت راجپوت وغیرہ	33%	-	-
(1) شیخاوت	-	-	25%
(2) دیگر	33%	33%	33%
پاہی (پائی)	40%	-	33%
کمین۔نائی و چمار	-	33%	40%
چودھری اور قانونگو	25%	-	25%
راجپوتوں کے بے زمین کسان (بسئی) اور برادری	-	-	33%
برہمن	33%	-	-
سردار کوتری زمیندار	25%	-	-
پروہت، چارن راجپوتوں کے مساوی	33%	-	-
قاضی	-	33%	-

ماخذ : ایس، پی، گپتا، دی میکنگ ٹیوڈ آف لینڈ ریونیو ڈیمانڈ ان دی مغل ایڈ منسٹریشن ڈیورنگ دی لیٹ سیونٹینتھ اینڈ ارلی ایٹینتھ سینچری، پروسیڈنگ آف دی انڈین ہسٹری کانگریس، 1990، کلکتہ، 51 واں اجلاس، جدول III (a)، صفحہ 341۔

اگر چہ محصول کا تعین انفرادی بنیادوں پر (آسامی وار) کیا جاتا تھا۔ٹیکس جمع کرنے کی بنیادی اکائی گاؤں ہی تھا۔عہد وسطیٰ میں کافی حد تک ٹیکس جمع کرنے کے تین اہم درجے تھے۔(الف) جہاں ریاست براہ راست اپنے افسروں کو مقرر کر کے ٹیکس وصول کرتی تھی۔ایسا نظم مغلیہ عہد میں خالصہ علاقوں میں رائج تھا۔(ب) آراضی عطیات حاصل کرنے والوں کو تنخواہ کے عوض اقطاع (دہلی سلطانوں کے تحت) اور جاگیر یا تیول (مغلوں کے تحت) کی شکل میں سرکاری ٹیکس جمع کرنے کا اختیار دیا جاتا تھا۔یہاں سرکاری ٹیکس عطیہ حاصل کرنے والے ریاستی ٹیکس جمع کرنے کے لئے خود اپنے گماشتے بھیجا کرتے تھے (ج) تیسرے درجہ میں زیادہ تر بندرگاہی شہر نیز ان بندرگاہوں سے متعلق اندرونی علاقے آتے تھے جہاں کل ملا کر ایک جداگانہ نظم رائج تھا۔

جہاں تک سرکاری ٹیکس جمع کرنے کا سوال ہے، ریاست بہت زیادہ سختی سے پیش آتی تھی۔اسکو ادا کرنے سے انکار، بغاوت کے ہم معنی مانا جاتا تھا۔جیل، بالغ مرد آبادی کا قتل عام اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لینا سزا کی شکلوں میں موجود تھا۔

دہلی کے بادشاہوں کے تحت مالگذاری کے نظم میں ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہیں مگر مغلوں کے تحت لگان جمع کرنے کے ایک منظم طریقہ کا رواج میں موجود تھا۔خالصہ اور جاگیر زمینی حصوں کے لئے متعدد طریقہ رائج تھے۔مگر سوئے قسمت جاگیر زمینی حصوں کا حکومتی نظم کیسے چلتا تھا اس تعلق سے ہمارے پاس زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں۔ہمارے پاس جو معلومات فراہم ہے ان میں زیادہ تر خالصہ علاقوں سے متعلق ہے۔پرگنہ سطح پر عامل (یا مال گزار سابقہ شقدار) اور امین ہوتے تھے۔اپنے انیسویں سال تخت نشینی 75-1574 میں جب اکبر نے کروڑی تجربہ نافذ کیا تو کروڑی (عامل) کو لگان متعین اور جمع کرنے کا کام سونپا گیا۔شاہجہاں نے لگان تعین کو لگان جمع کرنے سے الگ کر دیا اور ہر محال کے لئے الگ الگ امین کا تقرر کیا۔اس کے ساتھ ہی اس کے عہد سے زمین لگان کی تشخیص کا کام دیکھنے لگے جبکہ عامل (کروڑی) کو لگان جمع کرنے کا کام سونپا گیا۔جاگیر زمینی حصوں میں ممکنہ لگان تشخیص کرنے والا، جمع کرنے والا، خزانچی تین کام کرتا تھا۔جزیہ جمع کرنے کے واسطے جداگانہ امین، امین جزیہ، مقرر کئے گئے تھے۔گاؤں کی سطح پر چودھری کا مقام بہت اہم تھا۔ٹیکس وصولی کا کام کرنے والے زمیندار کو بہودھا چودھری کہا جاتا تھا۔اپنی خدمات کے عوض اس کو نان کر (یعنی کل جمع لگان کا 5 سے 10 فی صد) حاصل ہوتا تھا۔قانون گو

ایک جداگانہ اہم نیم موروثی افسر ہوتا تھا جو پرگنہ اور گاؤں دونوں ہی سطحوں پر مقرر کیا جاتا تھا۔ وہ خصوصاً لگان تشخیص سے منسلک تھا اور لگان سے متعلق دستاویزوں کا محافظ ہوتا تھا۔

19.3.2 دکن

دکنی علاقوں پر مغلوں کے اقتدار (87-1686) سے پہلے لگان کا مطالبہ اور لگان جمع دونوں ہی جنس کی شکل میں کرنے کا طریقہ تھا۔ ایک دیگر اہم رسم جو دکن میں رائج تھی وہ تھی پٹے اور نائب پٹوں کی ایک وسیع سلسلے کے ذریعہ ٹھیکے پر زراعت (رچرڈس 1975)۔ یہاں تک کہ گورنر (سرساتو) کا عہدہ بھی ٹھیکے کی شرائط پر حاصل کیا جاتا تھا یعنی کہ ان کو حاصل شدہ عہدہ کے بدلے میں سالانہ ایک مشت رقم ادا کرنی ہوتی تھی۔ یہ گورنر محض سٹے باز ہوتے تھے کیونکہ وہ زمین کو فوری طور پر ہی اعلیٰ نفع کے ساتھ پٹے پر دینے کے عادی تھے یہ نائب پٹے دار حوالدار کہلاتے تھے۔ ریاست کے ذریعہ کچھ عامل بھی مقرر کئے جاتے تھے مگر ان کا خاص مقصد ریاست کے محصول کو یقینی بنانا تھا۔ حالانکہ ان کی طاقت پر ایک بڑی رکاوٹ مقامی زمین مالک ذاتوں۔ رازو، ویلما، کما، کاپو (ریڈی) نیز اگر ہار گاؤں میں برہمنوں کی جانب سے ہوتی تھی۔ وہ کوئی عام کاشتکار نہیں تھے بلکہ جنگجو کاشتکار برادریاں تھیں۔ جن کے پاس گاؤں میں غیر محدود سیاسی، معاشی اور فوجی طاقتیں موجود تھیں (رچرڈس 1975)۔ گجرات میں ایسے راجپوت جنگ جو کاشتکاروں کے طویل مقابلہ کو بعد بے دخل کر دیا گیا مگر گول کنڈہ علاقے میں وہ تیلگو جنگ جوؤں کے ہمراہ مکمل تعاون سے کام کرتے تھے۔ قطب شاہی حکمرانوں نے دیش مکھ/ ڈیسائی مقرر کئے جن کے پاس اپنے فوجی تھے نیز لگان وصول کرنے میں حوالدار اور کارکنوں (محاسب) کی مدد کرتے تھے۔ بدلے میں ان کل جمع شدہ لگان کا 5% دیا جاتا تھا۔ ہر پرگنہ میں دیش پانڈے (قانونگو کا ہم منصب) مقرر کئے جاتے تھے جو عام طور پر برہمن ذات سے ہوتے تھے اور دستاویزوں کے نگراں ہوتے تھے۔ ان کی اجرت یعنی معاوضہ قریب قریب برہمنوں کے مساوی ہی ہوتا تھا۔ گاؤں کی سطح پر مقدم (گاؤں کا مکھیا جو طاقتور ذاتوں سے ہوتے تھے) اور کل کرنی (گاؤں کا محرر جو کہ برہمن ذات سے ہوتا تھا) ہوتے تھے۔ اس نظام نے مسلسل ٹیکس نظام کے باوجود گول کنڈہ میں زراعتی پیداوار میں مسلسل اضافہ کیا (رچرڈس 1975)۔

دکن میں زمین کے لگان کے طریقوں میں کافی اصلاح 1652 میں وہاں اورنگ زیب کے عہد گورنری میں ہوئی۔ اس نے یہ فریضہ برار۔ بالا گھاٹ کے دیوان مرشد قلی خان کے سپرد کیا۔ اس طرح اس نے دکن میں لگان مقرر کرنے کے ضبط طریقہ کی شروعات کی۔ مرشد نے زمین کے ناپنے کے واسطے با اعتماد امین (تشخیص کنندہ) اور ناظر متعین کئے۔ اس نے انفرادی جوت (رقبہ) سے متعلق مفصل دستاویز تیار کرائیں اور قابل زراعت زمین کو چٹانی اور پہاڑی زمین، ندیوں، جھیلوں وغیرہ سے جداگانہ طور پر دکھایا۔ لگان مقرر کرنے کے بعد اس نے تین شرحوں کی بنیاد پر بٹائی طریقہ کار کی شروعات کی (الف) بارش پر منحصر فصلوں سے ریاست فصل کا 1/2 حصہ لیتی تھی۔ (ب) ریاست کا مطالبہ غذائی اجناس پر 1/3 تھا اور نقدی فصلوں کا حالت میں 1/9 سے 1/4 تک لگان کا مطالبہ تھا۔ (ج) کنوؤں کے ذریعہ آبپاشی پر منحصر فصلوں پر اور نہر سے آبپاشی شدہ زمینی فصلوں پر یہ مطالبہ جداگانہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی نہروں کے ذریعہ آبپاشی کئے گئے زمینی حصوں پر یہ مطالبہ کنوؤں کے ذریعہ سیراب زمین کے مقابلے کافی کم ہوتا تھا۔ لگان تشخیص کی اوسطاً فصل کا 1/4 ہوتا تھا۔ مرشد نے لگان شرح کا تعین بالکل اسی طرح کیا جیسا کہ شمالی ہند میں ضبط طریقہ کار میں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت زراعتی علاقے، رائج بازاری قیمتوں، اور پیداشدہ فصلوں کی قسم اور مقدار کے بنیاد پر فی بیگھہ دریں طے کی جاتی تھیں۔ یہ دریں دکن میں عموماً دھار کہی جاتی تھیں۔ گاؤں لگان تعین کی اہم یونٹ تھا۔ کچھ تھوڑی سی ترمیمات کے ساتھ مرشد کا لگان طریقہ کار 18 ویں صدی کے زیادہ تر حصہ تک رواج میں رہا۔

90-1689 (اورنگ زیب کا 30 واں سالہ سال حکومت) میں دکن پر مغلوں کے قبضہ کے بعد حیدرآباد کے دیوان محمد شفیع نے ایک سروے کرایا اور از سر نو لگان کی دریں طے کی گئیں (جمع کامل یعنی تخمینی آمدنی)۔ یہ اعداد اور شمار پرگنہ نیز سرکار کی بنیاد پر پورے دکن محروسہ علاقے کے لئے تھے۔ نیز ان کو دہ بہ دیہی (Deh-be-Dehi) میں 18 ویں صدی کی ابتداء (7-1705) میں جمع کیا گیا۔ یہ نظام الملک (محمد شاہ کا وزیر) جس نے بعد میں آزاد حیدرآباد ریاست کی بنیاد ڈالی، کے تحت یا اس کے بعد میں بھی معیار لگان بنا رہا۔

عمومی طور پر مغلیہ اصول کے مطابق فصل کی کل پیداوار کا 1/2 حصہ سرکار کا ہوتا تھا۔ مگر یہ دیگر اسباب، خراب پیداوار، قحط وغیرہ کی بنیاد پر متفرق ہوتا

تھا۔42-1740 کا راجامندری سے دستیاب ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ 39 گاؤں میں یہ مطالبہ %3.3 سے لیکر زیادہ سے زیادہ %68 تک کے درمیان تھا (7 گاؤں کو چھوڑ کر کل ملا کر یہ شرح %50 سے بھی زیادہ تھی)۔

اس بات کی تصدیق کے لئے کہ وہ مقررہ رقم ادا کرنے کے واسطے متفق تھے، زمینی لگان سے متعلق سبھی دستاویزوں پر دیشمکھ (لگان وصول کرنے والا) اور دیش پانڈے (محاسب) کی موجودگی میں زمینداروں کے دستخط لازمی تھے۔ محمد شفیع نے علاقے کے مقامی افسران سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ تلنگانہ علاقے میں اس نے ان کے عہدے اور اختیارات کو تسلیم کرنے کی منظوری دی نیز ان کے ذریعہ سالانہ وظیفوں کی ادائیگی پر ان کو سند (یعنی سرکاری مہر کے تحت آمدنی عطیات وغیرہ کی تصدیق کرنے والی ایک دستاویز) بھی عطا کیں۔ مقررہ رقم موجودہ وظائف کا 7¹/2 گنا متعین کی گئی۔ حیدرآباد صوبہ میں اوسطاً اضافہ تقریباً %13 صد تھا۔ جبکہ تلنگانہ کے اندرونی علاقوں میں یہ اضافہ تقریباً %10 ہوا۔ مگر ساحلی آندھرا علاقوں میں لگان کے در میں زیادہ اضافہ ظہور میں آیا۔ یہاں اوسطاً اضافہ تقریباً 20 فی صد رہا۔ (%12 مچھلی پٹنم کے لئے، %24 مرتضی نگر کے لئے، %45 راج مندری کے لئے، %43 مصطفیٰ نگر کے لئے) اگر چہ یہ رقم قسطوں میں ادا کی جا سکتی تھی، کاشتکار طبقہ کے واسطے یہ بہت زیادہ نقصان دہ رہی ہوگی۔

مغل افسران چودھری اور قانون گو (دیش مکھ اور دیش پانڈے) کے طرز پر دکن میں بھی افسران کو منصب دیئے گئے مگر یہ یقین نہیں ہے کہ کیا اس طریقہ پر دیگر مقامی افسران بھی وہاں مقرر کیے گئے تھے۔ رچرڈس بیان کرتا ہے کہ تلنگانہ علاقے میں مغلوں کو اب بھی کافی حد تک ریڈی، ویلما، کما، دیش مکھوں اور کچھ کم حد تک برہمن دیش پانڈوں کی خیر خواہی، وفاداری اور قابلیت پر منحصر ہی رہنا پڑتا تھا۔ مگر ساحلی آندھرا علاقے کے چھ ضلعوں میں حالت کچھ بہتر تھی اور مقامی دیش مکھوں کے ہمراہ تعلقات زیادہ براہ راست تھے۔ ساحلی ضلعوں میں مقرر امین اور فوجداران سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے تھے مگر بندوبست کے بعد محمد شفیع کو سالانہ لگان جمع کرنے کے تعلق سے اطلاع وصول کرنے میں دشواریاں پیش آئیں۔ اس طرح حیدرآباد اور حیدرآباد کرناٹک میں لگان دستاویزوں کے نگرانی کے واسطے علاقائی محرر کی شکل میں قانون گو کو نامزد کیا گیا (غور طلب ہے کہ شمال میں قانون گو پرگنہ اور گاؤں کی سطح پر ہی مقرر کیے گئے تھے)۔ یہاں اس کی حالت شمال میں اپنے ہم رتبہ کے مقابل کافی اونچی تھی۔ اس عہدہ پر نامزد کیا گیا پہلا قانون گو بابو پنڈت تھا۔ اس کو سرکاری طور پر ایک منصب دار 200/70، زمیندار کی شکل میں نامزد کیا گیا (ہمیں کسی بھی قانون گو کے پاس منصب ہونے کا حوالہ نہیں ملتا ہے)، بعد میں اس کا منصب میں اضافہ کر کے 300/100 کر دیا گیا۔ اس کو اپنے گھوڑوں کو داغ کا نشان لگانے سے بھی رعایت حاصل تھی۔ اس سے شمال میں اسکے ہم منصب کے مقابلہ اس کی ممتاز حالت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اورنگ زیب سے پہلے ایسے قانون گوؤں کی نامزدگی دیکھنے میں نہیں آتی۔ اس کا پہلا اشارہ 1670 میں ملتا ہے جب صوبائی قانون گو کی شکل میں تین بھائیوں کو نامزد کیا گیا تھا مگر ان کو منصب نہیں عطا کیے گئے بلکہ ان کو ان علاقوں کے کل لگان کا 0.5 فی صد عطا کیا گیا تھا۔ جلدی ہی بابو پنڈت نے راجدھانی اور گولکنڈہ کے قلعہ سے سائر جمع کرنے والے محرر (کل کرنی) کا عہدہ خرید لیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ریاست کے عہدوں کی ایسی خرید کا دستور شمالی ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ حالانکہ زمینداری کے حقوق کی فروخت کے حوالے یقیناً موصول ہوتے ہیں۔ اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اس کو 1702 میں برخاست کر دیا گیا مگر 1708 میں اس کو دوبارہ پھر سے مقرر کر دیا گیا۔

19.3.3 ملک عنبر کا بندوبست اور مراٹھا لگان

ملک عنبر (1626-1549) احمد نگر کی نظام شاہی ریاست کے وزیر اعظم نے دکن میں زمینی بندوبست میں اس حد تک انقلاب برپا کیا کہ اس کی اصلاحات دکن کی سبھی زمینی اصلاحات کی بنیاد بن گئیں۔ مراٹھاؤں نے بھی کچھ ترمیمات کے ساتھ یہی طریقہ کار اختیار کیا۔

ملک عنبر نے اپنی تمام ریاست کی زمین کے جائزے اور زمین کی پیمائش کے واسطے حکم جاری کیا۔ اس سے قبل عموماً ٹھیکے پر زراعت ہی رواج میں تھی۔ زمین کی پیمائش کے واسطے کاٹھی (ایک ناپنے کی لکڑی، 5 ہاتھ (cubit) اور 5 بند مٹھی تھی، 400 مربع کاٹھی کا ایک بیگھہ ہوتا تھا اور ایک سو بیس بیگھہ کا ایک کاوڑ) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ مراٹھا اس کو سیواسی کاٹھی کہتے تھے۔ ملک عنبر نے مٹی کی زرخیزی اور کاشت شدہ فصلوں کی نوعیت کی بنیاد پر زمین کو چار درجوں میں تقسیم کیا۔ (اعلیٰ، درمیانی اور کم تر زمینوں کی بنیاد پر رہے مقرر کرنے والے مغلیہ نظم ونسق سے اس کا مقابلہ کریں) شیواجی کے عہد حکومت میں دادوجی کونڈ دیو

(1636)، موروتری مل (44-1648) اور اناجی دانو (1678) کے ذریعہ کامیابی کے ساتھ 3 بار لگان متعین کیا گیا۔ لگان کے افسران کو ایک ٹپہ، ایک پہاڑی، ایک دلدلی اور ایک کالی مٹی والے گاؤں کا دورہ کرنے کے لئے کہا گیا اور اس کے بعد ہی لگان کا اندازہ/تخمینہ لگایا جاتا تھا۔ اناجی دانو نے تجویز رکھی کہ پرگنہ و گاؤں افسران اور گاؤں کے باشندوں کی فصل کے تخمینہ پر اتفاق ضروری ہے۔ گاؤں کے باشندوں کو شامل کرنے کا یہ طریقہ، جیسا کہ آپ نے دیکھا مغل دکن میں بھی موجود تھا۔ بنجر زمینوں، عام چراگاہوں اور درختوں سے گھرے زمینی حصوں کو لگان تشخیص سے الگ رکھا گیا۔ ایک بار کی گئی پیائش کے بعد سالانہ پیائش نہیں کی جاتی تھی۔ (شروع شروع میں مغلوں نے سالانہ لگان متعین کرنے پر زور دیا تھا مگر بعد میں نسق ہی اصول بنایا گیا)۔ صرف شکایت ہونے یا بوقت ضرورت ہی از سرنو پیائش کا حکم جاری کیا جاتا تھا۔ لگان کا مطالبہ نقدی کی شکل میں بھی طے کیا جاتا تھا اور اشیاء کی شکل میں بھی۔ جنس کی شکل میں مطالبہ کے تعین کی حالت میں فصل کا 2/5 ہی ہوتا تھا۔ مگر جب یہ مطالبہ نقدی کی شکل میں کیا جاتا تھا تو کل پیداوار کا 1/3 ہی ہوتا تھا۔ جب کوئی نیا علاقہ یا قابل زراعت بنجر زمین، زراعت کے تحت لائی جاتی تھی تو خصوصی شرحیں وصول کی جاتی تھی۔ قصبہ شیروال، پرگنہ شیروال سے متعلق 1561 کی دلچسپ دستاویز دریافت ہوئی ہے۔ اس پرگنہ میں ایک تالاب کے قریب کی زمین کافی وقت سے فضول وبیکار پڑی تھی اس زمین پر کاشت کرانے کے واسطے مندرجہ ذیل شرحیں وصول کی گئیں (30 بیگھہ زمین کے لئے یعنی 1/4 کاوڑ زمین)۔

غیر مزروعہ زمینوں کے لئے متفرق خصوصی شرحیں

سال	شیروال سے متعلق شرحیں (1561ء)		داداجی کونڈیو کی شرحیں (تقریباً1636ء)
سال	نقد شرحیں	جنس میں	نقد شرحیں (فی بیگھہ)
سال اول	کوئی شرح نافذ نہیں	کوئی شرح نافذ نہیں	1/12 رقعہ
سال دوم	ایضاً	ایضاً	1/4 رقعہ
سال سوم	1/2 ٹکا کا رقعہ گاؤں کی زمین کے لئے، 1/2 ٹکا قصبہ کی زمین کے لئے	غلہ 2 1/2 من گھاس 2 بشیل	1/2 رقعہ
سال چہارم	1/4 ٹکا گاؤں کی زمین کے لئے	گھاس 50 بشیل	3/4 رقعہ
سال پنجم	3 1/4 ٹکا 6 رقعہ گاؤں اور قصباتی زمین کے لئے	غلہ 3 1/2 من گھاس 75 بشیل	4 رقعہ یا 1/4 روپیہ
سال ششم	2 1/2 ٹکا دیہی زمین کے لئے	2 ٹکا قصباتی زمین کے لئے 1/2 من اور 3 1/4 سیر اناج 1 کھنڈی 100 گھاس بشیل کپاس 1/4 کھنڈی کپاس 1 من	8 رقعہ یا 1/2 روپیہ
سال ہفتم	-	-	ایک روپیہ
سال ہشتم	-	-	ملک عنبر کا محصول تعین

1 رقعہ = ٹکے کا 1/40 واں حصہ، 1 ٹکہ = 1/4 روپیہ

ماخذ: بی۔ جی۔ تمسکر، دی لائف آف ملک عنبر، دہلی 1978، صفحہ 260: اے۔ آر۔ کلکرنی، مہاراشٹران دی ایج آف شیواجی، بمبئی 1969، صفحہ 64-163۔

ان دو دستاویزوں کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ جو بندوبست ملک عنبر نے شروع کیا تھا وہ ممکن طور پر پوری طرح نیا نہیں تھا بلکہ یہ دستور اس علاقے میں پہلے سے رائج تھا مگر ہم کو اس کی معلومات نہیں ہے کہ ملک عنبر سے قبل زمین کی حقیقی پیمائش کا دستور رواج میں تھا یا نہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ملک عنبر نے زمین کی پیمائش،

کی رسم کی ابتداء کر کے موجود نظام کو اور ترقی دی۔ 1561 کے دستاویزوں سے متعلق ایک دوسرا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ شہری اور دیہی زمینوں کے واسطے علاحدہ علاحدہ نقد شرحیں رائج تھیں۔ ہم کو اس کی معلومات نہیں کہ نقد شرحیں کس طرح متعین کی جاتی تھیں مگر مٹی کی بنیاد پر متفرق شرحیں وصول کی جاتی تھیں۔ مہاراشٹر میں گاؤں رحمت پور، پرگنہ وار کے ایک دستاویز میں منقول شرحیں اس طرح تھیں: اعلیٰ زمین کے حصوں سے 120 ٹکا فی کاوڑ، اوسط درجہ کی زمینوں سے 90 ٹکا اور خراب قسم کی زمینوں سے 60 ٹکا فی کاوڑ لینے کا رواج تھا۔

لگان کی شرحیں نہ صرف فصلوں کی بنیاد پر جداگانہ ہوتی تھیں بلکہ کچھ علاقوں میں ایک ہی طرح کی فصلوں کے لئے جداگانہ شرحیں وصول کی جاتی تھیں۔ چاول کی مثالوں میں ہم پاتے ہیں کہ شیواجی کے عہد حکومت میں کم از کم 12 شرحیں نافذ تھیں:-

اُول (Uwul)	12 1/2	من فی بیگھہ
دُون	10	من فی بیگھہ
سیر	8	من فی بیگھہ
چِرون	6 1/4	من فی بیگھہ
رانی پال	8	من فی بیگھہ
کھاروٹ (kharwwut)	7 1/2	من فی بیگھہ
باؤنل	6 1/4	من فی بیگھہ
کھری	6 1/4	من فی بیگھہ
کرِیت	6 1/4	من فی بیگھہ
روہو	5	من فی بیگھہ
تورو تور	5	من فی بیگھہ
کٹانی	1/2-1/4	من فی بیگھہ
منوت	5	من فی بیگھہ

ماخذ۔ اے۔ آر۔ کل کرنی، مہاراشٹران دی ایج آف شیواجی، بمبئی، 1969، صفحہ 167۔

باغات کی زمین سے ہونے والی فصل کا لگان تعین عموماً نقدی کی شکل ہی میں کیا جاتا تھا۔ دھان اور باغات کی زمینوں پر پوری شرحیں شیواجی کے عہد حکومت صرف سال چہارم میں ہی وصول کی جاتی تھی۔ جب زمین پر اس قسم کی رعایت دی گئی ہوا اور اس پر کاشت نہ کی جائے تو اس قسم کی زمین سے قابل ادائیگی رقم گاؤں کی کل مانگ سے کاٹ لی جاتی تھی۔ یہ حقیقت اہمیت کی حامل ہے جیسا کہ ہم نے راجستھان کی مثالوں میں بھی دیکھا کہ وہاں کنویں اور نہر سے آبپاشی شدہ زمینوں کے واسطے مختلف لگان شرحیں رائج تھیں۔ دکن اور مراٹھا علاقوں میں بھی ایسی ہی جداگانہ شرحیں قابل اطلاق تھیں کیونکہ ریاست فراہم کردہ خدمات کے لئے زائد ٹیکس وصول کرتی تھی۔

مراٹھا حکمرانوں کے تحت کنویں اور نہر سے آبپاشی شدہ زمینوں پر نقد شرحیں

فصل	کنوؤں کے ذریعہ آبپاشی شدہ فی بیگھہ	نہر سے آبپاشی شدہ
گنا	2 ہن	2 ہن
ادرک	2 ہن	3 ہن
ہلدی	2 ہن	3 ہن
سبزیاں	1 1/2 ہن	2 ہن

ہون/ہن Huns/Hons ہنوں کی مسخ شدہ شکل ہے، یہ لفظ کنڑ زبان کا لفظ ہے یعنی جنوبی ہند میں سونے کا ایک سکہ

راجستھان کی طرح مراٹھاؤں کے عہد حکومت میں بھی کچھ زمین کے حصوں پر لگان کا تعین مقبوضہ ہلوں کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ اس طرح گاؤں کے کچھ خدماتی گروپ (ٹھکانتی کے نام سے مشہور تھے) جنھیں زمین حاصل تھیں، سے کافی کم شرحوں پر لگان وصول کیا جاتا تھا یعنی ایک من فی بیگھہ۔ کم زرخیز زمینوں سے

پیداشدہ دالوں کی لگان وصولی ملک عنبر کے عہد حکومت میں، سرسری طور پر قیمتوں کے تخمینہ کے ذریعہ کی جاتی تھی، جو نذر پہانی کہلاتی تھی۔

1676 میں پاؤن ماڈل اوراس کے بعد روہڈ کھورے میں شیواجی نے بھی بٹائی بندوبست نافذ کیا۔شیواجی ریاستی حصہ کی شکل میں ایسی بٹائی زمینوں پر پیداوار کا آدھا حصہ وصول کرتا تھا نتیجتاً اس علاقے میں بازار میں غلہ کے فقدان کی وجہ سے غذائی اجناس کی قیمتوں میں زیادہ اضافہ ہوا۔

مراٹھا علاقوں میں لگان جمع کرنے کی ذمہ داری گاؤں کے پاٹل کی ہوتی تھی اورکل کرنی گاؤں کا محرر تھا پرگنہ سطح پر ان کے ہم منصب تھے دیش مکھ اور ڈیسائی۔ شیواجی نے کاشت کاروں کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جس کے لئے اس نے جداگانہ طور پر افسران مقرر کئے جو کہ گاؤں گاؤں جا کر دورے کرتے تھے۔

19.3.4 جنوبی ہندوستان

جنوبی ہند میں بھی لگان جیسا کہ شمالی ہند میں تھا، پیداوروں/فصلوں پر لگنے والا ٹیکس تھا نہ کہ زمین پر لگنے والا ٹیکس۔

گاؤں، زراعتی زمینوں اور چراگاہ زمینوں میں تقسیم تھا۔زراعتی زمینوں کو پھر آگے نم زمینوں (نیرمبا،نن جئی/نن چئی) اور خشک زمینوں (کدرمبا) میں درجہ بندی کی جاتی تھی۔نم زمین دھان اور گنے کی کھیتی نیز باغات فصلوں کے لئے مستعمل تھی جب کہ خشک زمین مکمل طور پر بارش پر منحصر تھی۔

لگان تشخیص کے لئے، گاؤں اور زمین ملکیت حقوق کی نوعیت، زمین کی جائے وقوع، پیداشدہ فصلوں اور مٹی کے پیٹرن کو ذہن نشین کرکے اس پر عمل کیا جاتا تھا۔یہاں تک کہ خشک یا نم زمین پر بھی فرق پیداشدہ مخصوص فصل کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔اور پہلے ہی اندازہ کرلیا جاتا تھا کہ گاؤں دیودان (مندر گاؤں) ہے، برہمدیہ (برہمن گاؤں) ہے، دلوے اگرہار (فوجی خدمات کے عوض دیا گیا گاؤں) ہے یا پھر کوئی کرگرام (محصول گاؤں) ہے۔ٹیکس زمین کی اکائی، بوائی کی صلاحت کی بنیاد پر بھی جداگانہ ہوتا تھا جس طرح تیلگو ضلعوں میں ایک توم (ایک مکعب پیائش) بیجوں کی بوائی کے لئے مطلوبہ زمین کے ٹیکس کا تعین 8 واراہ (varahas) ہوتا تھا۔لگان ہلوں کی تعداد کی بنیاد پر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔

زمین کے جائزہ اور پیائش کا بھی بندوبست تھا۔ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ کرشن دیورائے کے عہد حکومت میں دو طرح کے ٹیکس کے تعین قدیم وجدید کی شکل میں (1513 کے بعد سے نافذ) رائج تھے۔مگر کوئی معیاری ناپ کی لکڑی کا استعمال ممکن نہیں تھا۔یہاں تک کہ ایک ہی گاؤں میں متعدد پیائش لکڑیوں (چھڑوں) کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔اس بات سے یقینی طور پر ٹیکس کے تعین کی کوئی مساوی شرح نافذ کرنے میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ٹیکس کا مطالبہ پیداوار کے 1/6 سے لے کر 1/3 اور کچھ معاملوں میں 1/2 بھی نافذ تھا۔ٹیکس نفاذ کی ایک اہم خصوصیت جیسا کہ ہم نے شمالی ہند میں بھی دیکھا یہ تھی کہ اعلیٰ طبقوں، مندروں وبرہمنوں پر ٹیکس کے مطالبہ کا تعین عام کاشت کاروں کے مقابلے کافی کم حساب سے نافذ ہوتا تھا۔مالک 1/4، کاشتکار 1/2، سرکار 1/6، مندر 1/30 اور برہمن کل پیداوار کا 1/20 حصہ زمین کے لگان کی شکل میں ادا کرتے تھے۔جنگلات کو صاف کرکے نوآباد گاؤں کے ٹیکس کا تعین خصوصی حساب سے کیا جاتا تھا مگر ان حالات میں کوئی یکسانیت نہیں اختیار کی جاتی تھی اور یہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جداگانہ ہوتا تھا۔

نیرمبا (نم) زمینوں پر لگان کا مطالبہ عموماً جنس کی شکل میں طے کیا جاتا تھا۔کاشتکار لگان کو نقدی کی شکل میں بھی ادا کرسکتے تھے۔اور اشیاء کی شکل میں بھی۔مگر کدرمبا (خشک) اور باغات زمینوں پر لگان کا مطالبہ عموماً نقدی کی شکل میں نافذ کیا جاتا تھا۔

لگان کی وصولیابی کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے تھے (الف) ریاست لگان وصول کرنے کے واسطے اپنی انتظامی مشینری کو مقرر کرتا تھا (ب) ریاست انفرادی طور پر لین دین کرنے کے بجائے فرد کے کسی گروپ یا خصوصی اکائیوں/سبھاؤں (سبھا/ناڈو) کے ساتھ ہی لین دین کیا کرتی تھی۔ جو کہ لامحالہ کسی گاؤں یا گاؤں کے عوام سے اجتماعی شکل میں لگان وصولیابی کے واسطے ذمہ دار ہوتے تھے۔ شمالی ہند میں بھی چودھری کسی گاؤں یا کسی گاؤں کے گروپ کے کاشتکاروں سے ہی ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔ مگر شمالی ہند میں لگان وصولیابی کا کام کرتی ایسی سبھاؤں کے حوالے نظر نہیں آتے۔ یہ سبھائیں عموماً گروپوں کے حقوق کی حفاظت کا کام انجام دیتی تھیں۔

لگان کے نظم میں اعلیٰ مقام سرکاری لگان سکریٹریٹ (اٹھاونم، اٹھارنا) کا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے حصوں پر مشتمل تھا جن کا ایک بڑا (اسٹھل اور سیما) نگراں ہوتا تھا جن کی ذمہ داری متعدد ٹیکسوں کو جمع کرنے کی ہوتی تھی۔ گاؤں کے محصول ریکارڈس (کویلا) کا حساب کتاب کرنم گاؤں کا محاسب رکھتا تھا۔ ٹپا (Tappa) اور ضلعی سطحوں پر ان کے حساب کتاب کی نگرانی کاوڑیوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔

ناڈوں میں نتاور (ضلع اسمبلی) لگان وصولیابی کے لئے جوابدہ ہوتی تھی۔ نتاور لگان کے جداگانہ ٹیکس رجسٹر اور گاؤں کے حساب رکھا کرتے تھے مگر بعد کے سالوں میں آہستہ آہستہ ان کی طاقت کمزور پڑتی چلی گئی اور وہ انتشار کی نظر ہونے لگے۔ ان کے مقام پر لگان وصول کرنے اور لگان کے ٹھیکیدار آ گئے۔

19.3.5 راحتی اقدام

ان عنوان پر ہم اکائی 16 میں اوّلاً بحث کر چکے ہیں کہ کس طرح ریاست کی تشویش کا موضوع اپنے محصول کو یقینی بنانا اور اس کو بڑھانا تھا۔ ریاست کی خصوصی کوشش قابل زراعت زمین کو خالی غیر مزروع نہ چھوڑنا تھا۔ ریاست بیج وغیرہ کی خریداری کے لئے تقاوی (دیکھئے اکائی 16) کی شکل میں فراخدلی کے ساتھ عطیہ دیا کرتی تھی۔ فصل کی بربادی کی شکل میں کاشتکاروں کو دیگر رعایتیں بھی ملتی تھیں۔ مغلوں کے عہد حکومت میں جہاں بٹائی کی رسم کا دستور تھا ریاست کا حصہ نسبتاً کم ہوتا تھا جبکہ ضبطی کارروائی میں نابود (فصل) لگان کے تعین کا حصہ نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ ایسی رعایت کے لئے زیادہ سے زیادہ حد کل مزروعہ علاقہ کی 12 1/2 فی صد ہوتی تھی۔

دکن وجنوبی ہند کے لئے ایک ہی بات لاگو ہوتی تھی۔ قدرتی آفات کے وقت ریاست کے ذریعہ ضروری رعایتیں دی جاتی تھیں۔ شیواجی نے کچھ مخصوص حالات میں ٹیکس افسران کو حکم دیا کہ جو لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے ہوں لیکن واپسی کے خواہش مند ہوں ان کو سابقہ بقایا معاف کر دیا جائے۔ شیواجی نے ٹیکس کے افسران کو حکم دیا کہ جتائی اور بوائی کے وقت کسی بھی طرح کاشتکاروں کو پریشان یا مجبور نہ کیا جائے۔ سبھاسد بیان کرتا ہے کہ کاشتکاروں کو زراعت کے لئے بیج، مویشی اور نقد عطا کیا جاتا تھا۔ اور یہ رقم پھر آسان قسطوں میں واپس لی جاتی تھیں۔ نئی ترقی یافتہ زمینوں پر ٹیکس کا تعین رعایتی حساب سے کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھار کاشتکاروں کو ہاؤس ٹیکس سے بھی رعایت کا لالچ دیکر نئے علاقوں میں آباد ہونے کا لالچ دیا جاتا تھا۔ شیواجی نے مشورہ دیا کہ اگر کاشتکار کے پاس ادائیگی کی رقم نہ ہو لیکن اگر وہ کاشتکاری کے پیشہ کو جاری رکھنے کا خواہش مند ہو تو اس کو بقایا کی ادائیگی کی رعایت دی جاسکتی ہے۔ بقایا کی وصولیابی کے لئے اس کے زراعتی وسائل یا بیلوں کو نہیں چھینا جاسکتا تھا۔ نونیز بیان کرتا ہے کہ کرشن دیورائے نے لوگوں کو ایسی زمینیں تقسیم کی تھیں جو ناگپور (حوض پیٹ) میں موجود اس کی نہر کے ذریعہ آبپاش کی جاتی تھیں اور نو سالوں کے لئے اس کے ذریعہ ان زمینوں پر مفت آبپاشی کی رعایت حاصل تھی۔ کرشن دیورائے نے نو آباد گاؤں اور اس کو کُل کے کاشتکاروں کو بھی پہلے سال میں سبھی قسم کے ٹیکسوں سے چھوٹ دی مگر آئندہ سال سے ان کو کچھ یقینی ٹیکس کی رقم دینی تھی۔ ایسے گاؤں جو کچھ وقت/سالوں کے لئے سیلاب وغیرہ کی آفت کی وجہ سے غیر مزروعہ چھوڑ دئے گئے ہوں اور بعد میں پھر ان کو کاشت کے تحت لایا گیا ہو ان پر عموماً از سر نو کاشتکاری کے تحت لانے کے بعد رعایتی حساب سے ٹیکس نافذ کیا جاتا تھا۔ کاشتکاروں کو لوٹ پاٹ، خشک سالی وغیرہ کے دوران حسب ضرورت راحت دی جاتی تھی۔ ناگپانائک نے شری رنگا کے عہد حکومت میں ایک ڈکیتی کی وجہ سے تاجروں اور بنکروں کے ٹیکس معاف کر دئے تھے۔

19.4 ابواب

زمینی لگان کے علاوہ کاشتکاروں کو ابواب (cesses) کی شکل میں بے شمار نقد جرمانے بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ یہ متوازی محصول جو کاشتکاروں کو ادا کرنے پڑتے تھے زیادہ تر لگان کا تعین، جمع کرنا اور ٹیکس افسران پر کئے جانے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ہوتے تھے۔ کچھ ٹیکس موقع کے لحاظ سے بھی مخصوص ہوتے تھے۔ اس طرح حاصل محصول عموماً ریاست کے کھاتے میں نہیں جاتا بلکہ یہ یا تو موروثی افسران کو ان کی خدمات کے عوض حاصل ہوتے تھے یا پھر ٹیکس وصولیابی سے متعلق اخراجات کو پورا کرنے کے کام میں آتے تھے یا پھر دیگر مخصوص مقاصد کے کام میں آتے تھے۔ ان ابوابوں سے حاصل کل آمد علاقے میں مختلف ہوتی تھی اور یہ رقم کل زمینی محصول وصولی کا 10% سے 25% تک ہوسکتی تھی۔ علاؤالدین خلجی نے اپنے فرمان کے ذریعہ سبھی ابوابوں کو ختم کردیا تھا۔ جس میں دیہی بچولیوں، خوط، مقدم، چودھری وغیرہ کے درمیان کافی غیر اطمینانی پیدا ہوئی۔ غیاث الدین تغلق نے ایسی رعایتوں کو ازسرنو بحال کردیا لیکن ایک بار پھر محمد تغلق نے علاؤالدین کے طریقہ کو ازسرنو نافذ کیا اور ایسی ابواب رقم لگان کے زیادہ سے زیادہ 4 فی صد پر محدود کردی گئی۔

مغربی راجستھان میں محصول جمع کرنے کی کارروائی میں متعدد اخراجات کی تکمیل کے واسطے کاشتکاروں پر لگائے جانے والے ٹیکسوں کو ''خرچ بھوک'' کہا جاتا تھا۔ ایسے ہی محصول کے تعین اور جمع کرنے کے طریقہ کے مطابق اور ایک پرگنہ سے دوسرے پرگنہ میں جداگانہ طور پر ہوتے تھے۔ فصل بٹائی کے طریقہ کے لئے یہ زمینی لگان کا تقریباً 7% ہوتا تھا۔ جبکہ ضبطی کے لئے یہ محصول کا 8.5% اور 5.5% کے درمیان ہی ہوتا تھا یہ ذات اور جوتوں کی نوعیت و بنیاد پر بھی جداگانہ ہوتا تھا۔ 17 ویں صدی میں پرگنہ سوجھت میں ربیع کی فصل پر یہ کرسوں (کاشتکاروں) سے 20% کے حساب سے لیا جاتا تھا۔ جبکہ پاہیوں کو 12.5% دینا ہوتا تھا۔ پرگنہ پوکھرن میں یہ کسانوں پر 18.75 فی صد تھا جبکہ مہاجن اور بنئے 15.62% کے حساب سے دیا کرتے تھے۔ مگر برہمنوں کو اس سے عموماً رعایت حاصل ہوتی تھی۔ (بھدانی 1999)

مغربی راجستھان میں کسانوں کو کنور (مشرقی راجستھان میں شاہنا) اور ہج دار (Hujdar) کا خرچ بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ان کا کام ہوتا تھا کٹائی کے وقت فصل پر نگاہ رکھنا اور بغیر کسی تفریق کے بٹوارہ کو یقینی بنانا۔ اس سے متعلق ابواب چوکسی کہلاتے تھے۔

بھوگھ بھاڑہ محصول کے شکل میں جمع غلہ کی نقل وحرکت پر ہونیوالے خرچ کو پورا کرنے کے واسطے وصول کیا جاتا تھا۔ غلہ کے انبار کھلیان میں مشغول ہر کسان کو مالی (فی کھلیان) نام سے جداگانہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنگی کی شکل میں کچھ چھوٹے موٹے ٹیکس بھی کاشتکاروں کے ذریعہ ادا کئے جاتے تھے جیسے بھروتی (وصولیاتی) لکھاوَنی (بہی کھاتوں کے رکھ رکھاؤ کے لئے خرچ) پاٹھارا/Patha ra (کاغذ کے لئے خرچ) دوات پوجا (سیاہی کے لئے خرچ) وغیرہ۔

محصول افسران کی بقائے زندگی اور خدمات کے واسطے خرچہ بھی کاشتکاروں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سردیوں میں گرم کپڑوں وغیرہ کی سپلائی کے لئے الگ سے ٹیکس ہوتے تھے۔ کاشتکاروں کے ذریعہ ادا کئے جانے والے ایسے مطالبے کو مغربی راجستھان میں ''دھوماتو'' کہا جاتا تھا۔ کسانوں کو گھوڑوں کے لئے کمبل کی خریداری کے خرچہ پر بھی فیس دینی پڑتی تھی۔ کسی افسر کے تقرر کے وقت گاؤں کے ذریعہ 'ملانی'' ادا کی جاتی تھی۔ مہاراشٹر میں کوتوال کے دفتر کے خرچ کے واسطے ''کوتوالی'' وصول کی جاتی تھی۔ اسی طرح وہاں کے تھانوں کے اخراجات کو پورا کرنے کے واسطے ''تھانہ پٹی'' ادا کرنی پڑتی تھی۔

مہاراشٹر میں ''ویٹھ بیگاری'' موروثی افسران کا حق (خصوصی اختیار) تھا۔ ماہر اور غیر ماہر دونوں ہی طرح کے مزدوروں کو موروثی افسران کے پاس کچھ دنوں اپنی خدمات مفت مہیا کرانی پڑتی تھیں۔ 'فرمائش، بھی مہاراشٹر میں ویٹھ بیگاری کے مشابہ تھی۔ جبری مزدوری کے دستور کے نشان وجے نگر عہد حکومت میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جھیلیں گہری کرنے (ایری کولی ویٹا)، نہریں کھودنے (اروکل ویٹا اور دیاکل ویٹا)، مندر کی دیواریں بنانے اور یہاں تک کہ لکڑی مہیا کرانے کے لئے بھی لوگوں کو اپنی خدمات مفت دینی پڑتی تھی۔ کرناٹک میں جنہیں اس سے رعایت حاصل تھی انہیں بدلے میں ایک ٹیکس کوٹا گی (Kottage) ادا کرنا پڑتا تھا۔

مہاراشٹر میں ہفتہ واری بازار میں اپنی دکانیں لگانے کے واسطے تاجروں کو اجازت حاصل کرنے کے عوض میں دیش مکھ ان سے ایک لائسنس

فیس (موہترفا mohatarfa) وصول کرتے تھے۔ راستہ سے گزرنے والے افسران کے دورے کے واسطے گاؤں کو رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ مہاراشٹر میں اس کو الفاپٹی (ulphapatti) کہا جاتا تھا۔ وہیں ''تورنا بھیٹی'' ممکنہ طور پر ریاستی دوروں کے درمیان آرائش کے واسطے ادا کیا جاتا تھا۔

موروثی افسران پر سرکاری محصول

انعام پٹی، مہاراشٹر میں ریاست کو محصول مستثنیٰ عطیہ حاصل کرنے والوں کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا۔ دیش مکھوں، دیش پانڈوں، پاٹلوں اور کل کرنیوں کو اپنے عہدہ سے فائدہ حاصل کرنے کے عوض ''میراث پٹی'' ادا کرنی ہوتی تھی۔ انہیں صحیح طور پر کس حساب سے اسکو ادا کرنا ہوتا تھا اس بارے میں ہمیں معلومات نہیں ہے مگر مہاراشٹر میں سیروال پرگنہ سے فراہم دستاویزوں میں سے ایک یہ ظاہر کرتا ہے کہ 1674 میں اس پرگنہ سے میراث پٹی کے ماتحت جمع شدہ کل رقم ایک ہزار ہن (ایک سونے کا سکّہ) تھی۔

19.5 زمینی لگان کے علاوہ دیگر ٹیکس: سائر جہات

علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت سے قبل زمین لگان کے علاوہ دیگر ٹیکسوں کے پیٹرن اور نوعیت کے ضمن میں ہم کو زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں۔ مگر سبھی ٹیکس تمام زمانوں میں یکساں طور پر نافذ نہیں تھے۔ حکومت لازمی طور پر یہ ٹیکس براہ راست وصول نہیں کرتی تھی خصوصاً جنوبی ہند اور دکن میں۔ بلکہ کچھ ٹیکس محصول ٹھیکداروں کو نیلام کر دیئے جاتے تھے۔

ہاؤس ٹیکس

شمالی ہند میں ہمارے عہد کے دوران اس کے نفاذ کا سب سے پہلا حوالہ برنی (1357) سے ملتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ علاؤالدین خلجی نے زمینی ٹیکسوں کے ساتھ گھری اور چرائی ٹیکس بھی لگائے تھے۔ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہوتا ہے کہ گھروں پر نافذ کئے جانے والا ٹیکس تھا۔ مغربی راجستھان میں جھمپس Jhumpis (جھوپڑی۔ عارضی بستیاں) نام سے ٹیکس چراگاہی طبقات سے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ ٹیکس 15 دگنی (ایک روپے کا چالیسواں حصہ) فی جھمپس ہوتا تھا۔ جو ان کی بستیوں پر لگایا جانے والا ٹیکس تھا۔ مہاراشٹر میں اس کو گھرٹکا (ghartaka) کہا جاتا تھا۔ وجے نگر عہد حکومت میں مختلف طبقات کے لوگوں سے ہاؤس ٹیکس کی شکل میں مختلف حساب سے وصول کیا جاتا تھا جو تعمیر شدہ علاقوں کے ساتھ ساتھ متصرفوں یعنی قابضوں کے سماجی پس منظر کی بنیاد پر ہوتی تھی۔

غلہ کے ذخیرہ	2 پانم	ویشئے کا گھر	1 پانم
اندر برآمدے والا گھر	1 پانم	ویٹیوں کے کوٹل گھر	1/8 پانم
دیہی عوام کا گھر	3 پانم	ہر ایک قناتی	1 پانم
تنتیری مان کا گھر	1 1/2 پانم	ملحقہ گھر (out house)	1 گڈیان
مکّال کا گھر	1 1/2 پانم	تمیاپیّا طبقہ	1/2 گا فی گھر
ڈھلواں چھتوں والے برآمدے	3/4 پانم	راجیہ لنگیا طبقہ	1 گا فی گھر

پانم (panam) ایک سکہ، ایک پون (ایک طلائی سکہ) کا 1/10 واں حصہ: ٹی۔ وی۔ مہالنگم، (1969)، صفحہ 75۔

مویشیوں پر ٹیکس

علاؤالدین خلجی نے چرائی ٹیکس نافذ کیا جو دودھ دینے والی گایوں پر نافذ تھا۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ٹیکس فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت تک جاری رہا۔ عفیف (تقریباً1400) تحریر کرتا ہے کہ ''گھری'' اور ''چرائی'' دونوں ٹیکس پر بندش لگائی۔ عفیف چرائی کے بالواسطہ اثرات پر تنقید کرتا ہے کہ ایسے ٹیکس کی وجہ سے کاشتکاروں کے پاس اپنے پاس ایک گائے فی آدمی رکھنے کے علاوہ کوئی متبادل نہیں بچا تھا۔ مہاراشٹر میں چرواہوں کو 1/2 سیر مکھن دینا پڑتا تھا اور بھیڑوں کے مالک کو وطن دار کو ایک بھیڑ سالانہ دینی پڑتی تھی۔ وجے نگر کے حکمرانوں کے ذریعہ ایک الگ بکری ٹیکس (اڈاتیرے adatere) وصول کیا جاتا تھا۔ چرواہوں کو سدئیک کڈامئی (Sadaikkadamai) ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ لکڑ ہاروں کو بھی بازار کے لئے لکڑیاں کاٹنے کے واسطے کونڈا گٹا (Kondagutta) ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔

چراہ گاہ ٹیکس

چراگاہوں کے استعمال پر ایک جداگانہ ٹیکس نافذ ہوتا تھا۔ مغربی راجستھان میں اسکے مستقل نام تھے: گھاس ماری (Ghasmari) پن چرائی (Pancharai) اور کرب گھاس (Karabghas)۔ گھاس ماری (ghasmari) گھاس کھانے والے مویشیوں پر ٹیکس تھا۔ جبکہ پن چرائی پتیاں خور مویشیوں پر لگایا جاتا تھا۔ یہ اونٹ کے مالکوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ بھدانی (1999) نے مغربی راجستھان کے تعلق سے شمار کیا ہے کہ چراگاہی طبقات/ چراگاہوں پر اس طرح کی ٹیکس وصولی 17 ویں صدی میں کل ٹیکس کا تقریباً3.34 اور 7.34 فی صد کے درمیان تھی۔

آبپاشی ٹیکس

فیروز نے اپنے زیادہ تر علاقے میں نہروں کا وسیع جال قائم کیا تھا۔ نہروں کے ذریعہ آبپاشی شدہ گاؤں سے حق شرب (پانی کا ٹیکس) وصول کیا جاتا تھا۔ یہ فصل کا 1/10 حصہ ہوتا تھا۔ مغربی راجستھان میں مال ایک طرح کا آبپاشی ٹیکس تھا۔ جو کہ رہٹ پر نافذ تھا۔ یہ کل زمین کے لگان کا 5% سے کم ہوتا تھا۔ محصول کی شرحیں پٹوں (جاگیر میں عطا کردہ علاقوں) کے برعکس خالصہ علاقوں میں زیادہ ہوتی تھیں۔ پرگنہ سوجھت میں رہٹ پر ''ارہٹ مادلی'' ٹیکس نافذ ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔

چوتھ

چوتھ کی ایک طویل تاریخ ہے۔ شیواجی کے ذریعہ اس ٹیکس کی وصول کئے جانے سے کافی قبل ہی رام نگر (کونکن) کے کولی راجہ پرتگالیوں سے چوتھ وصول کرتے تھے۔ اسی وجہ سے پرتگالی کولی راجاؤں کو ''چوتھیا راجہ'' کہا کرتے تھے۔ شیواجی کے ذریعہ چوتھ کے مطالبہ پر سب سے پہلا حوالہ تب ملتا ہے جب شیواجی نے (رام نگر پر فتح کے بعد) کولیوں کو شکست دی اور پرتگالیوں سے اسی چوتھ کا مطالبہ کیا۔ اس سے وہ ناراض ہوگئے اور اس معاملے کو لے کر دونوں کے درمیان اختلاف برپا ہوگیا۔ کبھی کبھی اس کی ادائیگی میں دیر کرتے تھے اور کبھی حیلہ سازی کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ مراٹھاؤں نے مستقل بنیاد طور پر ان مغل علاقوں سے بھی وصولیابی شروع کردی جن پر ان کا دعوٰی یا راست کنٹرول تھا۔ یہ ٹیکس مراٹھا حکمرانوں کے ذریعہ وصول کئے جانے والے ٹیکس کا 1/4 حصہ کے مساوی تھا۔ تخمیناً اکیلے چوتھ سے ہی شیواجی کی آمدنی تقریباً90 لاکھ ہن تھی۔

سردیش مکھی

یہ شیواجی کے ذریعہ اس کے اپنے زیرتسلط (سوراج) والے علاقے میں ریاست کے موروثی سردیش مکھ کے طور پر اس کے دعوے کی بنیاد پر نافذ کیا جاتا تھا۔

اس طرح اس پر شواجی کا دعویٰ چوتھ سے مختلف ایک حق کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ یہ کل محصول کا 10% ہوتا تھا۔ سبھسد (Sabhasad، کرشن جی اننت) کا اندازہ ہے کہ اکیلے سر دیش مکھی سے شیواجی کی سلطنت کی آمدنی ایک کروڑ ہن تھی۔

پیش کش

سبھی زمیندار (دکن کے معاملے میں دیشمکھ، دیشپانڈے اور منی وار) اور ماتحت ریاستیں، تسلط قبول کر کے علامت کے طور پر پیش کش چکانے کے واسطے قانون کے تابع تھے۔ اس سے وصول شدہ ٹیکس براہ راست شاہی خزانہ میں جاتا تھا۔ دکن میں ہم پاتے ہیں کہ افسران کو اپنا عہدہ حاصل کرنے نیز قائم رکھنے کے واسطے رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ حیدرآباد میں انہیں 71/2 سال کی آمدنی کو شاہی خزانہ میں جمع کرنا پڑتا تھا۔ اڑیسہ میں مقامی راجہ جو خود سپردگی کر چکے تھے وہ ''گڑھ جات'' کے نام سے ایک مقررہ سالانہ رقم پیش کش کی شکل میں ادا کرتے تھے۔ اگر چہ وہ مغل بالادستی قبول کر چکے تھے پھر بھی ان کو اپنے داخلی معاملوں میں مکمل آزادی تھی۔ دکن میں ماورائے گوداوری شری کاکلم کا علاقہ زیادہ تر ماتحت راجاؤں کے پاس تھا۔ جو پیش کش کی شکل میں سالانہ نذرانہ ادا کرتے تھے۔

جزیہ

ہندوستان میں جزیہ کی سب سے پہلی مثال سندھ پر محمد بن قاسم کی فتح (712ء) کے آس پاس ہی ملتی ہے۔

فیروز شاہ کے عہد حکومت سے قبل جزیہ (انفرادی ٹیکس) خراج (زمینی ٹیکس) کا ہی ایک جز ہوتا تھا اور عموماً یہ خراج و جزیہ کے نام سے مشہور تھا (اس کی استدلالی تفصیل کے لئے دیکھیں سیکشن 19.2)۔ فیروز شاہ تغلق نے خراج کے ہمراہ جزیہ وصول کرنا بھی شروع کر دیا۔ اس طرح فیروز کے عہد حکومت سے دونوں کا تعین جداگانہ طور پر ہونے لگا نہ کہ ایک ساتھ۔ عرفان حبیب (کیمبرج 1982) کا خیال ہے کہ 'اس بات پر غور کرنا باعث دلچسپی ہوگا کہ یہاں جزیہ صرف ''گھری'' کے مقام پر نافذ کیا گیا تھا'۔ کیونکہ فیروز نے گھری (ہاؤس ٹیکس) کو ختم کر دیا تھا ان کی دلیل کی بنیاد ہے (الف) اس میں عورتوں اور نابالغوں کو ٹیکس ادا کرنے سے رعایت حاصل تھی۔ اور (ب) یہ ٹیکس گھروں پر تھا (فی خاندان) نہ کہ فرد پر۔

اکبر نے سب سے پہلے 1564 میں اور آخر میں 1579 جزیہ ٹیکس کو ختم کیا۔ مگر اورنگ زیب نے 1679 میں اس کو از سر نو نافذ کر دیا۔ یہاں ہم جزیہ کو پھر سے نافذ کئے جانے کے پس پشت اورنگ زیب کے مقصد سے وابستہ مسئلوں پر اظہار خیال نہیں کریں گے۔ مگر جیسا کہ عرفان حبیب بیان کرتے ہیں کہ کم آمدنی والے لوگوں پر بہت سخت ٹیکس تھا اور غریبوں کو یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ حبیب کے مطابق یہ ایک شہری غیر ہنرمند مزدور کے ایک ماہ کی تنخواہ کے مساوی تھا۔ ٹیکس اسلامی اصولوں کے مطابق وصول کیا جاتا تھا۔ اول درجہ لوگوں سے 48 درہم کی حساب سے اوسط درجہ سے 24 درہم تیسرے درجہ کے لوگوں سے یہ 12 درہم کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔

1687 گول کنڈہ پر مغلوں کا اختیار حاصل ہو جانے کے بعد اورنگ زیب نے دکن میں بھی جزیہ نافذ کیا۔ یہ اس زمینی ٹیکس کا 4% ہوتا تھا جو جاگیرداروں کو ریاست کو ادا کرنا ہوتا تھا اور اس کے عوض وہ اس کو کاشتکاروں سے وصول کیا کرتے تھے۔ صرف تنہا گول کنڈہ کے لئے ٹیکس سے وصول شدہ آمدنی کا رچرڈس (1975) نے تقریباً 10 لاکھ روپے کا تخمینہ لگایا ہے۔ اس کو ایک 'سخت معاشی گرفت' گردانتے ہوئے رچرڈ کہتے ہیں کہ اس سے اورنگ زیب کے سخت حالات سے گذرتے ہوئے شاہی خزانہ میں اچھا خاصہ اضافہ ہوا اور مشرقی دکن میں اپنی نئی عوام کے واسطے ایک نئے بوجھ کی نمائندگی کی۔ اس نے زبردست مخالفت کو برپا کیا اور بایں ہمہ 1704 میں مراٹھا یورشوں کے سبب اورنگ زیب نے دکن میں جزیہ وصول کرنا بند کر دیا۔

نمک ٹیکس

نینسی لکھتا ہے کہ اکیلے یہ پچ پردہ (مغربی راجستھان) کے گڈھوں (Pits) سے ہونے والی ریاست کی آمدنی 10,000 ڈگنی/ 250 روپئے تھی۔ بھدانی کی شمار کے مطابق پرگنہ سوانہ کے کل سائر جمع کا تقریباً 35% تھا۔ 1671 میں شیواجی نے 12 رقعہ فی من کے حساب سے نمک ٹیکس لگایا۔ وجے نگر سلطنت میں نمک کے گڑھے کے مطابق ہی نمک کی تیاری پر اپی ناپالے (Uppinapale) ٹیکس نافذ کیا جاتا تھا۔

فوجی اخراجات کی تکمیل کے لئے ٹیکس

مغربی راجستھان میں فوج کو راشن مہیا کرانے کے واسطے رسد اور کھچڑو ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ فوج بل ان فوجیوں کی بقائے زندگی کی ضروریات کے واسطے ادا کرنا لازمی تھا جو محصول جمع کرنے میں تعاون کرتے تھے۔

مراٹھا اپنے حملہ کئے علاقوں میں گھاس دانہ (لغوی معنی میں گھاس اور اناج) وصول کیا کرتے تھے تاکہ حملہ آور فوج کے واسطے رسد حاصل کی جا سکے۔ یہ عموماً ایک مشت رقم کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا یا سرسری طور پر اندازہ کے مطابق نافذ کیا جاتا اور نقدی کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ رعیت کبھی بھی گھاس دانہ اپنی خوشی سے ادا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب کوئی قاصد بھیجا جاتا تو مہاراشٹر میں اس کے خرچہ پورے کرنے کے واسطے ایک زائد ٹیکس لگایا جاتا تھا، حاجب پٹی۔ اسی طرح مشعلچی کا خرچہ مہیا کرانے کے لئے کپور پائک نافذ کیا جاتا تھا اس کے علاوہ گڈ چاؤنی فوجیوں کے قیام کے متعلق خرچوں کو پورا کرنے کے واسطے وصول کیا جاتا تھا۔ ممکناً اس طرح وصول شدہ ٹیکس فوجیوں کے واسطے عارضی ڈھانچہ کھڑا کرنے کے واسطے استعمال کیا جاتا تھا۔

مہاراشٹر میں دیہی باشندوں کو اپنے علاقے میں موجود قلعوں کی نگہداشت کے واسطے چیزوں کی شکل میں کچھ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کو کرسئی Karsai کہا جاتا تھا۔ مہاراشٹر میں کسی مہم کے اخراجات کی فراہمی کے لئے بھی لوگوں کو موہم پٹی/ Mohimpatti دینا پڑتا تھا۔

جنوبی ہند میں قلعہ کی نگہداشت کے واسطے رعیت کے ذریعہ وارتاریہ/ Vartaria ادا کیا جاتا تھا۔ دلاولی اور پدئی کن کئی فوج کی بقائے زندگی کے اخراجات کی تکمیل کے واسطے ادا کیا جاتا تھا۔ قلعوں کی مرمت اور نگہداشت کے واسطے بھی گاؤں کو وجے نگر عہد حکومت میں ایک جداگانہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا جو اوٹ گئی۔ ماگامئی کہلاتا تھا۔ اسی طرح دنائک سوامی نیز دنائک مگامئی کمانڈروں کے لئے تعاون کی شکل میں ادا کئے جاتے تھے۔ ہمیں نیلور پیٹ سے توپوں کے واسطے ایک جداگانہ ٹیکس وصولیابی کے بھی ثبوت دستیاب ہیں۔ تیر کمان، تلوار میں یا ترشول رکھنے کے واسطے ایک جداگانہ ٹیکس ادا کرنے کا نظم تھا۔

تیوہار محصول اور کمیونیٹی ٹیکس

ہولی، رکھشا بندھن، دیوالی وغیرہ تیوہاروں کے موقع پر جداگانہ محصول وصول کئے جاتے تھے۔ نینسی مغربی راجستھان میں ایسے محصولوں کی وصولیابی کے بارے میں لکھتا ہے۔ مہاراشٹر میں بھی متعدد تیوہاروں کے موقعوں پر اس طرح کے ٹیکس وصول کرنے کا رواج تھا۔ دسراپتی (دسہرا پر) جنگم (لنگایت پروہت) کی نگہداشت کے لئے جنگم پتی اور دیگر مذہبی رہنماؤں کے واسطے سیج وانی پتی گاؤں کے باشندوں کے ذریعہ چکائے جاتے تھے۔ شیواجی نے اس قسم کے کچھ محصولات ختم کردیے تھے جیسے عید سو بھارتی (عید کے موقع پر روشنی کے واسطے روغن گر کے ذریعہ ادا کیا جانے والا محصول)، بقر عید، ہمایوں پتی، عرس پتی (زیارت گاہوں پر چڑھائے جانے والے نذرانے) بت فروشی (مورتی بیچنے والوں پر) ملانا سار (مولانا کو دینے کے لئے) سمہس پتی ناسک کمبھ کے موقع پر 12 سالوں میں ایک بار لگایا جاتا تھا۔ گناچاری شولا پو کے لنگایوں کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا بعد میں 1647 میں ان کے اوپر کھان کوس تھوپا گیا۔ مہاراج پرویوجن ایک ٹیکس تھا جو زیادہ بڑے شاہی تیوہاروں کے موقعوں پر وجے نگر حکمرانوں کے ذریعہ وصول کیا جاتا تھا۔ شیبوں کو اپنے لنگایت پروہتوں، جنگموں کو گناچار تیرے چکانا ہوتا تھا۔ جب کہ ویشنو اپنے گرو/ جیار کوان کی نگہداشت کے واسطے جیاراتیرے دیا کرتے تھے۔ ادنگائی اور ولنگائی فرقوں کو جداگانہ فرقہ

وارانہ فرائض (اناوڑی) ادا کرنے تھے۔

وجے نگر حکمرانوں کے ذریعہ جنوبی ہند میں گاؤں کے مندر اور گاؤں دیوتا کی حفاظت کے لئے الگ سے ایک ٹیکس پیداری وڑی ادا کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مندر میں تیوہار منانے کے واسطے بھی لوگوں کو الگ سے ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا۔

برہمنوں کی نگہداشت کے واسطے رعیت کو وِپرونودی پنوادا کرنا پڑتا تھا۔ وجے نگر عہد حکومت میں لوگوں پر ایک دل چسپ ٹیکس ڈومرا پنو/ دومبریا پنو لگایا جاتا تھا جو لوگوں کو قلابازوں کی ڈومرا قبائلی برادری کے ان کے تماشوں اور نگہداشت کے لئے ڈومرا ذات کے لوگوں کو دینا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں کو ایک جداگانہ تفریحی ٹیکس (انکس لائی واڑی) بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ گداگروں کا بھی بغیر ادائیگی کے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا تھا۔ انہیں ایک ٹیکس گنا چارڈیرا کے نام سے ادا کرنا ہوتا تھا۔ اسی طرح اجتماعات منعقد کرنے کے واسطے بھی ایک لائسنس فیس ادا کرنی ضروری تھی۔

شادی ٹیکس

شادی کے جلسوں پر لوگوں کو ایک جداگانہ ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا۔ مہاراشٹر میں یہ 1/4 روپے تھا۔ جو وردٹکا یا لگن ٹکا کہلاتا تھا۔ 1/4 روپے کے حساب سے کاشتکاروں کے ذریعہ ایک فیس ادا کی جاتی تھی: پدم وجے نگر عہد میں پینڈلی سنکا یا مدوویا سنکا ٹیکس شادی کے وقت وصول کیا جاتا تھا۔ وجے نگر حکمرانوں کے ذریعہ وصول کیا جانے والا شادی ٹیکس 101 ماڈ تھا۔ یہاں تک کہ شادی رچانے والوں کو گاؤں کی گلیوں میں ادھر ادھر پالکیوں میں بیٹھ کر جلوسوں میں شادی شدہ جوڑوں کو باہر لے جانے کے لئے پنڈال (چھپر) فیس علاحدہ سے ادا کرنی ہوتی تھی۔ شادی ٹیکس کو بہت ہی تکلیف دہ تصور کیا جاتا تھا اور ویرنرسمہا کے پردھان منتری تمارسا کے ذریعہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر یہ ٹیکس اچیوت رائے کے عہد حکومت میں امرناکوں کے ذریعہ پھر سے رواج میں آ گیا۔ مگر سداشیو نے اس ٹیکس کی رقم کو 101 ماڈے کم کر کے 16 ماڈفی شادی کر دیا۔ وجے نگر حکمرانوں نے اپنے تحت مقامی سطح پر فرقوں کے بیچ اختلاف سے متعلق مدعوں پر انصاف دلانے کے تعلق سے ذات کے بزرگوں کو متعین کیا۔ ان ذات کے بزرگوں کے ذریعہ ریاست کو ایک متعینہ رقم ادا کرنی ہوتی تھی۔ بدلے میں وہ لوگوں کو جرمانہ وغیرہ کی شکل میں مروجہ فیس وصول کرتے تھے۔ اپنا فرض ادا کرنے کے واسطے وہ ''دساریوں'' کو مقرر کرتے تھے۔ ٹی۔ وی مہالنگم (1969) کا خیال کہ ان محصولوں کی وصولیابی کی نوعیت کے تجزیہ سے ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ یہ ٹیکس لوگوں پر بھاری پڑتے ہونگے۔

19.6 کسٹم اور بازار کے محصول

بازار محصول عموماً خالصہ آمدنی کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ ایسے ٹیکس وصولیابی کے واسطے ایک علاحدہ انتظامی مشینری فعال رہتی تھی۔ اس کے جداگانہ محاسب (کارکن کل کرنی) داروغہ (نگراں)، امین (تشخیص کرنے والا) ایک مشرف (ناظر Auditor) اور ایک خزانچی (فوطے دار، تحویلدار) ہوتے تھے۔ ہر ایک بازار کا برتاؤ ایک الگ مالی یونٹ (محال) کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ دکن میں کلکرنی تمام معاملات پر نظر رکھتا تھا اور ہر محال پر مقرر مقامی افسران (مقیمان) کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ شہر کی چوکی (custom posts) کا ذمہ دار بھی ہوتا تھا۔

دکن اور مہاراشٹر میں بازار کو منضبط کرنے کے واسطے اہم تاجر ہوا کرتے تھے (سیٹھ، سیٹے)۔ دکن میں یہ عہدہ حاصل کرنے کے واسطے ان کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ تمنا (Timna) کو اپنی تقرری کے واسطے 10 ہزار روپے کی ادائیگی کے لئے کہا گیا تھا۔ کچھ مخصوص اشیاء کے (مثلاً اناج، کپڑے وغیرہ) کے جداگانہ بازار مکھیا (چودھری) ہوا کرتے تھے۔ مگران منصبوں میں سے کوئی بھی منصب موروثی طور پر یا مستقل نہیں ہوتا تھا۔ گھاٹ علاقوں میں گھاٹ پانڈے مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا منصب موروثی ہوتا تھا اور گھاٹ کے رکھ رکھاؤ اور حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ''پاتکی'' چوکی کا نگراں ہوتا تھا اور اس کے تعاون کے واسطے ایک پنسارے ہوتا تھا جو تولنے کے کام پر معمور ہوتا تھا۔ دونوں گھاٹ پانڈے کو چنگی جمع کرنے میں مدد بھی کرتے تھے۔ وہاں گارڈ بھی ہوتے تھے جو گنڈا راہ یا میٹ کاری کے نام سے مشہور تھے وہ مسافروں کے گروہوں یا قافلوں کو وہاں سے گذرنے میں مدد کرتے۔ نیز ان کی حفاظت کا بندوبست بھی کرتے

MEDIA CENTRE IMC LIBRARY MANUU Hyderabad

تھے۔گھاٹوں کی حفاظت کے واسطے وہ ایک رقعہ فی بیل کے عوض وصول کرتے تھے۔پاتکی نمک واناج لے جانے کے واسطے 2 رقعہ فی بیل اور دالیس لیجانے کے واسطے 3 رقعہ فی بیل وصول کرتے تھے۔دیگر اشیاء کے واسطے بھی شرحیں متفرق تھیں: تمبا کو کے واسطے وہ 6 رقعہ وصول کرتے تھے اور کپڑے کی ایک گٹھری کے واسطے 12 رقعہ۔مودوی (چپراسی) گھاٹ پانڈے کو ٹیکس جمع کرنے کے معائنہ میں تعاون بھی دیتا تھا۔مہاراشٹر میں چنگی اور مجورہ چنگی افسر کو ظاہر کرتے ہیں۔

جنوبی ہند میں کسٹم اور چنگیاں وصول کرنے کا کام براہ راست ریاست کے ذریعہ کئے جانے کا طریقہ شاید ہی رائج تھا۔بلکہ یہ عموماً اونچی بولی لگانے والوں کو ٹھیکہ پر دیدیا جاتا تھا وصول شدہ کسٹم کی قیمتیں ایک ہی ضلع یا شہر میں الگ الگ مقامات پر جداگانہ رائج تھیں۔اس نے تاجروں کو ایسے کٹوں (کسٹم ہاؤس) سے اپنا مال بھیجنے کی طرف حوصلہ افزائی کی جہاں ان کو کم ٹیکس ادا کرنا پڑے۔فروختگی کے واسطے شہر میں آنے والی اشیاء پر کسٹم فیس استھل سنکا/استھل دائم کے نام سے جانا جاتا تھا جب کہ آنے والی چیزوں، یعنی شہر ضلع سے ہوکر گذرنے والی چیزوں پر لگنے والا ٹیکس مارگ دائم اور کراسنک کہلاتا تھا۔اور مامولا دائم یا پیٹاسنکم بازار میں فروخت شدہ اشیاء پر لگنے والا ٹیکس تھا۔وجے نگر عہد میں ایسے دکانداروں پر جداگانہ ٹیکس لگائے جاتے تھے جو کہ اپنے گھروں میں ہی اپنی دکانیں چلاتے تھے (منائک کڈیار) یہ تین پائم ہوتا تھا۔

مغربی راجستھان میں اس کا نام کائی تھا اور تول وئی غلہ تولنے پر وصول کیا جاتا تھا یہ ممکنہ طور پر بازار میں لائے گئے غلہ پر ایک بکری ٹیکس تھا۔

کسٹم اور راہگذر ٹیکس

متعدد صارفین اشیاء پر کسٹم متفرق شرحوں سے وصول کیا جاتا تھا۔مارواڑ علاقے میں پتھر کی نقل وحرکت کے لئے ایک ٹکانی گاڑی دیا جاتا تھا۔سنگ مرمر کی نقل وحرکت پر بھی ایک جداگانہ ٹیکس نافذ تھا۔

مہاراشٹر میں چول معاملا (Mamla) سے متعلق دستاویزات میں سے ایک سے دستیاب ریکارڈ سے ہم کو کسٹم کی شکلوں میں وصول شدہ محصول مندرجہ ملتے ہیں:-

اشیاء	درآمد محصول	برآمد محصول
چاول اور ناگلی ایک بوری (گونی)	12 رقعہ (Rukas)	12 رقعہ (Rukas)
گڑ فی لداؤ	20 رقعہ	30 رقعہ
مسالے فی لداؤ	36 رقعہ	36 رقعہ
گنا فی لداؤ ہزار	$1\frac{1}{2}$ لاری	$1\frac{1}{2}$ لاری
ادرک فی لداؤ	10 رقعہ	10 رقعہ
تمباکو فی لداؤ	1/2 لاری	12 رقعہ
کپڑے کا گھٹر (فی لداؤ تھان)	8 رقعہ	6 رقعہ
سوت فی لداؤ	24 رقعہ	24 رقعہ
کمبل فی پیس	08 رقعہ	6 رقعہ
گھوڑا	ایک لاری	1/4 لاری
بھینس	1/2 لاری	1/4 لاری

بیل	18 رقعہ	18 رقعہ
جودرہ (ردی Scrap) فی فردلداؤ	10 رقعہ	10 رقعہ

ماخذ: اے آرکلرنی، مہاراشٹران دی ایج آف شیواجی، بمبئی، صفحہ 114

کرشن دیورائے کے عہد حکومت میں کسٹم ٹیکس/چنگی کا پیٹرن مندرجہ ذیل تھا۔

	فی بوری
موٹے اناج (جوار، باجرہ)، نمک، آم، پھل، خشک میوے	1/2 پائے کم (Paikam)
چنا، گیہوں، تلہن، دالیں، کپاس، سوت	1 پائے کم
سبزیاں (پیاز، ہلدی) میتھی، زیرہ، سرسوں وغیرہ	1 دمہ (Damma)
ناریل، گڑ، دھنی ہوئی کپاس	2 دمہ
گھی، لوہا، اسٹیل، چینی، سوتی دھاگہ، پان	4 دمہ
مسالے، تانبہ، ٹین، سیسہ	6 دمہ

19.7 پیشوں اور کارخانے داروں پر ٹیکس

مختلف پیشوں اور پیداواری اکائیوں پر علاحدہ ٹیکس نافذ کیے جاتے تھے۔مغربی راجستھان میں ہرایک بنکر (سلوی) کو ایک من دھاگا (سوت) دینا پڑتا تھا۔جب کہ سوت دھننے والوں پر ٹیکس فی تان (Bow-string) کے مطابق لگایا جاتا تھا۔ایک دھنے (پنجر) کو اپنی تان پر ایک روپیہ سالانہ ٹیکس کی شکل میں ادا کرنا پڑتا تھا۔جنوبی ہند میں اس کو پن جنی گارو کہا جاتا تھا،مہاراشٹر میں بنکروں پر لگنے والے ٹیکس کو ماگاٹا کہا جاتا تھا۔اس ٹیکس کا تعین 1/4 ٹکافی کرگھا ہوتا تھا۔مہاراشٹر میں اگر کوئی گڈریا ساتھ میں اون کی تجارت بھی کرتا تھا تو اس کو 5 پاؤنڈ اون ایک ریوڑ پر ادا کرنی پڑتی تھی نیز اسی کے ساتھ اگر وہ بنکر بھی ہوتو اس کو ایک کمبل فی کرگھا دینا لازمی تھا۔جنوبی ہند میں بنکروں پر لگایا جانے والا ٹیکس مگاڈیرے/مگاڑی (Maggadere/Maggari) کہلاتا تھا۔وجے نگر عہد حکومت میں سالیہ بنکروں سے سالانہ 9 پانم فی کرگھا وصول کیا جاتا تھا۔

مغربی راجستھان میں چمڑا صاف کرنے والے (کھٹیک) 12 فدیان (ایک سکہ) ماہوار ادا کرتا تھا۔جب کہ جوتے بنانے والے (موچی) کو ہر ماہ ایک جوڑی جوتا دینا لازمی تھا۔مہاراشٹر میں یہ پائی پیسی کہلاتا تھا اور اس ٹیکس کی نوعیت ہو بہو ویسے ہی تھی جیسے کہ مغربی راجستھان میں تھی۔

جنوبی ہند میں وجے نگر عہد حکومت میں نائیوں کو اپنے پیشے کی خاطر ایک وِس روزانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔وہیں دھوبیوں پر بھی علاحدہ سے ٹیکس نافذ تھا۔نائی مکھیا اور دھوبی مکھیا دونوں کو 4 پانم سالانہ ٹیکس کی شکل میں ادا کرنے لازمی تھے۔سداشیو کے عہد حکومت میں نائیوں پر لگنے والے سبھی ٹیکسوں سے رعایت حاصل تھی۔

مغربی راجستھان میں صابن بنانے والوں (صابوگر) کو ماہانہ 1/2 من صابن ٹیکس کی شکل میں ادا کرنا ضروری تھا۔

کمہار اگر مال بازار کے واسطے بناتے تو ان سے بھی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔جنوبی ہند میں وجے نگر حکمرانوں کے تحت اس کو کمباراتیر یگے/تیریکیم کے نام سے جانتے تھے۔کمہار مکھیا کو 5 پانم سالانہ ٹیکس ادا کرنا ضروری تھا۔

مغربی راجستھان میں صاف تیل پیدا کرنے والوں اور فروخت کرنے والوں کو گھیان ghiyan نام سے ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا جب کہ تیلیوں (گھانچی) پر

B. NO. 219

1-1/4 من سالانہ فی کولہو کے حساب سے ٹیکس نافذ تھا۔ مہاراشٹر میں اس کو تیل پٹی کہا جاتا تھا اور یہ 1/2 1 سیر تیل فی چکی پر سالانہ طے تھا۔ جب کہ گن گاری تیل کے تاجروں کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا (1/2 پانم تیل تاجروں سے لیا جاتا تھا، جبکہ تیل تاجر کھیاؤں کو 20 پانم سالانہ ادا کرنا ہوتا تھا) اور گن گٹا، وجے نگر حکمرانوں کے ذریعہ تیل ملوں پر نافذ کیا جاتا تھا۔

ایلیے سنکا (Aleya sunka) وجے نگر حکمرانوں کے ذریعہ گنا ملوں پر نافذ کیا جاتا تھا۔ گنے پر کبینا، سنکا (Kabbina,sunka) نام سے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔

مغربی راجستھان میں شراب (Wine) بھٹی والوں (کلال) کو 12 فدیہ ماہانہ ٹیکس کی شکل میں ادا کرنا لازمی تھا۔

صراف پٹی (sarafpatti) مہاراشٹر میں صرافوں پر لگایا جانے والا ٹیکس تھا۔ جنوبی ہند میں لوہاروں، بڑھئیوں (carpenters) سناروں (Siliversmiths and Gold smiths) وغیرہ کو وجے نگر عہد حکومت میں 5 پانم سالانہ کی شرح سے ٹیکس ادا کرنا لازمی تھا۔

جنوبی ہند میں لوہے کی بھٹیوں پر بھی ٹیکس نافذ کیا جاتا تھا۔ اس کا نام ہومالا گٹا (Homalaguttas) تھا اور یہ پیدا کئے گئے لوہے کی مقدار کے تناسب ہی سے نافذ ہوتا تھا۔

جنوبی ہند میں ریاست کے ذریعہ نافذ ٹیکسوں اور مقامی ٹیکسوں کے درمیان واضح فرق نظر آتا ہے۔ ریاست کے ذریعہ نافذ ٹیکسوں کے مقامی افسران کے ذریعہ رعایت دینے کا کوئی سوال نہیں اُٹھتا تھا۔ اس طرح نئے مقامی ٹیکسوں کے نفاذ میں اور مقامی ٹیکسوں کی معافی میں ریاست کے احکام صرف صلاح ومشورہ کی شکل میں ہوتے تھے نہ کہ لازمی حکم کے طور پر۔ اگرچہ کرشن دیورائے نے شادی ٹیکس معاف کردیا تھا مگر اچیوت رائے کے عہد حکومت میں اس کی وصول یابی برابر جاری رہی۔ دستکاروں پر نافذ کئے جانے والے ٹیکس بھی مقامی ٹیکسوں کا ایک جز ہوتے تھے اور سبھی علاقوں وبستیوں میں مساوی طور پر نافذ نہیں ہوتے تھے۔ کناٹکی پلی کتبات (دھرماورم تعلقہ، ضلع انت پور) میں پنچالمورو (دستکار برادریاں) فرقوں پر متعدد ٹیکسوں سے معافی کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس کے سبب وہ پہلے کندری پیسم ہجرت کر گئے اور آس پاس کے علاقوں سے پاکل سم ہجرت کر گئے۔ ان منظروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یا تو قرب وجوار کے علاقوں میں ایسا کوئی ٹیکس نافذ کرنے کا دستور نہیں تھا یا پھر ان پر نسبتاً ٹیکس کا وزن کم تھا۔ اسی طرح تیرووام مٹو جنوبی آرکاٹ (Arcot) ضلع میں الکیا نئی نارمندر کے ٹرسٹیوں نے مقامی کئی کولاؤں (بنکروں) پر کچھ متفرق قسم کے ٹیکسوں کو ٹھیکے پر دے دیا اس کے عوض ان کو 6 پانم کرگھا سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

19 8 محصول عطیات

عموماً عہد وسطیٰ میں ہم تین قسم کے محصول عطیات / زمینوں کے پیٹرن دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خالصہ (Crown lands) جاگیر (Secular lands assignments) اور انعام۔

شاہی زمین (خالصہ)

خالصہ زمین وہ زمین کہلاتی تھی جس کا محصول شاہی خزانے میں جمع ہوتا تھا، ان زمینوں پر ریاست کا براہ راست قبضہ ہوتا تھا۔ خالصہ زمینوں کا تناسب مغلوں کے تحت جداگانہ زمانوں میں جداگانہ طور پر تھا۔ اکبر کے تحت یہ 1/4 حصہ تھا جبکہ جہاں گیر کے تحت یہ کم ہو کر کل محصول کا صرف 5% ہی رہ گیا۔ شاہ جہاں نے 1/7 تک اس میں اضافہ کیا جبکہ اورنگ زیب کے تحت یہ کل محصول کا 1/5 واں حصہ تھا۔

دکن میں اسکی سرکار چی شیری، شیری چن شیٹھ یا خالصہ زمین وغیرہ کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا جبکہ جنوبی ہند میں یہ بھنڈاروڈا/ پنڈاروڈئی کہلاتی تھی۔نوبورو کاراشیما کا خیال ہے کہ اس کے معنی میں ایک تغیر آیا۔ 16ویں صدی کے درمیان یہ شاہی زمین کی علامت نہیں تھی بلکہ اس کے معنی تھے، قابل ٹیکس زمین جو منظور شدہ زمین کے تحت غیر قابل محصول زمین سے مختلف تھی۔ڈنیاک Dannaik (گورنر) بھنڈاروڈا گاؤں کی کی نگہداشت پر مقرر تھے۔

جاگیر

جاگیر امراء طبقے کو ان کی خدمات کے عوض میں دئے گئے محصول عطیات تھے۔دہلی کے سلطانوں کے تحت ایسے عطیات کو اقطاع کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بعد میں مغلوں کے عہد حکومت میں جاگیر۔طیول (Tuyul) کہا جانے لگا۔اقطاع بردار وہ کو اقطاع دار مقطیع/ ولی اور جو جاگیر اور طیول بردار تھے ان کے نام جاگیر دار اور طیول دار پڑ گئے۔مگران دونوں کے درمیان کچھ فرق ضروری تھے۔پہلا، اقطاع دار مالی اور انتظامی دونوں ذمہ داریاں سنبھالتے تھے۔مگر جاگیر عطیات کے ساتھ انتظامی اختیارات شاید ہی دیئے جاتے ہوں گے اگر چہ اقطاع ابتداً اصولی طور پر انتقال پذیر تھے۔فیروز تغلق کے عہد حکومت تک آتے آتے یہ موروثی اور مستقل ہوگئے۔شروعات میں اقطاع دار کو سرکاری ریاستی شاہی خزانہ کے لئے فواضل (فاضل رقم) بھی ارسال کرنا لازمی تھا۔مگر فیروز کے ذریعہ حاصل شدہ رعایت کے نتیجے میں یہ مستقل ہوگیا اور فواضل واپس لوٹانے کی رسم عملاً ختم ہوگئی فیروز نے اپنے پیادے فوجیوں کو نقد میں نہیں بلکہ محصول زمینی عطیوں (وجہ۔چھوٹے اقطاع) کی شکل میں ادا کرنے کا رواج بھی شروع کیا تھا۔اسی طرح اس نے اس کو موروثی اور مستقل طور پر کر دیا۔مغل افسران کو ادائیگی زیادہ تر جاگیروں کی شکل میں کی جاتی تھی مگر اقطاع سے مختلف ان کو انتظامی اور مالی اختیارات کبھی کبھی بیک وقت نہیں عطا کئے جاتے تھے وہ اصولی طور پر منقولہ ہوتے تھے۔ایک جاگیر دار کا اوسطاً زمانہ اکثر 4-3 سالوں سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

جاگیرداری بحران

اورنگ زیب کے عہد حکومت کے آخری سالوں میں جاگیروں کے مکمل طریقۂ کار میں دشواریاں آنی شروع ہوئیں۔ جب کہ مہیا شدہ زمین محدود ہی رہی اور تقسیم شدہ زمینوں کی مقدار میں اضافہ ہوگیا۔ابوالفضل معموری بیان کرتا ہے کہ دنیا جاگیر سے محروم (بے روزگار) ہوگئی اور کوئی پائے باقی (جاگیر کی شکل میں دی جانے والی زمین جس کی تقسیم کی جانی ہو) باقی نہیں رہی۔معموری اس کی وجہ دکنی امراء طبقہ کے ہجوم کو مانتے ہیں۔اعظم خان کو تحریر کردہ خط میں اورنگ زیب نے پائے باقی کی کمی کو بذات خود قبول کیا ہے۔نئے ممبران کو تقسیم کی جانے والی جاگیروں کے فقدان نے یقینی ہی جاگیر نظام کے طریقہ کار کو متاثر کیا ہوگا۔ہمیں جاگیریں دلانے کے لئے کسی سرپرست (مربی) اور کسی کارندہ (وکیل دل سوز) کی ضرورت کے بھی حوالے ملتے ہیں۔یہاں تک کہ اس حوالہ میں رشوت (سخت رشوت) دینے کے حادثات بھی عام بات تھے۔جاگیر بحران نے حکمراں طبقے کے درمیان یقینی طور پر ہل چلوں، مقابلہ بازیوں اور گروہ بندیوں کو پیدا کیا۔مگر اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس حوالہ میں کسی حادثہ یا حالت نے مسلح جدوجہد کی شکل اختیار کی ہو اسکا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔(حبیب ،1963)

موکاسا، جاگیر اور سرانجام

مراٹھا علاقوں میں موکاسا (Mokasa) جاگیر اور سرانجام Jagir and Saranjams لفظوں کا استعمال بدل بدل کر کیا جاتا تھا۔مگر جاگیریں موکاسا کے مقابلے مستقل ہوا کرتی تھیں۔وہ جنگی خدمات۔پٹے تھے۔حالانکہ وہ اصولی طور پر مستقل ہوتے تھے نیز منقولہ بھی اور انکو مقبوضہ بھی بنایا جاسکتا تھا مگر حقیقت میں عملی طور پر انہوں نے موروثی شکل اختیار کر لی تھی۔افسران کو ان کی خدمات کے عوض زیادہ موکاسا یا جاگیروں کی شکل میں ادائیگی کی جاتی تھی۔ یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ یہاں موکاسا کی ذیلی تقسیم کی رسم مروج تھی جس کا کہ شمالی ہندوستان میں مکمل فقدان تھا۔سرانجاموں کو ذات اور فوج (مغل ذات اور سوار منصب کی طرح) میں تقسیم کیا گیا تھا۔ذات عطیہ وصول کرنے والے کی تنخواہ کو نشاندہی کرتی تھی۔ جب کہ فوج، گھوڑوں اور پیادہ فوجیوں کی نگہداشت

کے واسطے دی جاتی تھی۔ ایک دیگر لطف کی بات ہے کہ ان موکا سا داروں کو موکا سا محصول میں سے سردیش مکھی، چوتھ اور بٹائی ٹیکس کاٹ کر ہی تقسیم کئے جاتے تھے۔ شیواجی نے موکا سا اور سرانجام دئے جانے کی رسم کو ختم کر دیا اور اس کے عوض اس نے اپنے افسران کو نقد ادائیگی شروع کر دی مگر شیواجی کی موت کے بعد ہی جلدی اس کے فرزند راجارام نے موکا سا دینے کا رواج پھر شروع کر دیا۔ موکا سا برداروں کی جانب سے اس نے اپنے عطیہ کو انعام یا وطن کی شکل میں بدل دینے کا رجحان دکھایا تا کہ اس کو موروثی قرار دیا جاسکے۔ اے۔ آر۔ کلکرنی موکا ساؤں کو موروثی بنانے کی اس رسم کو ''زمینداری'' کہتے ہیں۔

امرم یا نانینکر

جنوبی ہند میں فوجی خدمات کے عوض حاصل شدہ عطیات کو امرم اور نانینکر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ چولا عہد حکومت سے وجے نگر عہد حکومت میں جو اہم تبدیلی آئی وہ تھی بڑی مقدار میں مقامی فوجی افسران (Nayaks) کا ظہور۔ نبورو کا راشیما وجے نگر حکومت میں اسے تبدیلی کا آغاز مانتے ہیں۔ امرم نانینکر لفظ بذات خود ایک ایسے عہدہ (ٹیکس) کی جانب نشاندہی کرتا ہے جو کسی فوجی افسر (نا یک) کو دیا جاتا تھا جس کے تحت (امر) میں فوجی دستہ ہوتا تھا وہ رعیت اور ریاست کے درمیان بچولیوں کے طور پر کام کرتے تھے۔ فرناؤ نونز تحریر کرتا ہے کہ 16 ویں صدی کے آغاز ہی سے ایسے 200 نائک موجود تھے اور اندازہ کے مطابق وجے نگر عہد میں تقریباً 75% زمین امرم افسران کے زیر قبضہ تھی۔ سنتھیا ٹالباٹ کا خیال ہے کہ نانینکر اختیار عموماً ایک سیما سے متعلق ہے جو کہ ایک علاقائی یونٹ ہے جس کے تحت بہت سے گاؤں آتے تھے۔ امر عام طور پر ایک گاؤں سے متعلق ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ فوجی خدمت پٹے تھے جو کہ مغل جاگیر داروں کی طرح امرنائک/ نائکوں کے ذریعہ فوجی خدمات کے عوض ان کو حاصل تھا اور وہ راجا کی مہربانی تک ہی اسے رکھ کر سکتے تھے مگر وہ مغل جاگیرداروں سے بہت زیادہ طاقتور ہوتے تھے۔ برٹن اسٹائن ان کو اپنے دائرہ اختیار میں اعلیٰ مقتدر خیال کرتے ہیں۔ ان کو سالانہ ایک مقررہ رقم نذر کی شکل میں بھیجنی پڑتی تھی۔ نہ پہنچ پانے کی حالت میں امرنائک کو جرمانہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ یہ کل جمع شدہ ٹیکس کا 33% سے 50% تک ہوتا تھا۔ مغل جاگیرداروں کی طرح یہ اختیار نہ تو موروثی تھا اور نہ ہی مستقل۔ ان کو اپنے علاقہ میں طویل مدت تک نہیں رہنے دیا جاتا تھا۔ یہ نائک اپنے علاقوں کا انتظام کاریہ کرتا (Karyakarta) نام کے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔ مگر دُرگ۔ دنائک کے لئے بذات خود دربار میں حاضری لازمی نہیں تھی۔ ان کو باشندوں کو دی گئی حفاظت کے بدلے میں درگ۔ ''دنائی نیورتن'' وصول کرنے کا بھی اختیار حاصل ہوتا تھا۔

نائک طریقہ کار کی اصل شکل 15 ویں صدی کے دوران تمل علاقے میں ترقی پذیر ہوئی اور یہ اپنی کلاسیکل شکل کو کرشن دیورائے کے عہد حکومت میں پہنچا۔ ان نائکوں کے ذریعہ اپنے پاس رکھے گئے علاقوں کو نائک کٹنم Nayakkattanam، تیلگو میں نائن کرم Nayankaram کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ نائک عموماً تیلگو نسل ہی سے تھے۔ مگر پڈوکوٹئی (Puddukottai) علاقے میں، آراسو (مقامی سربراہ) ممتاز تھے اور یہاں نائک نظام شاید ہی اپنی جڑوں کو مضبوط بنا سکا۔ ان آراسوؤں نے مالی عہدوں پر قبضہ کر لیا اور چوکیداری (پاڈی کول) کے عوض ٹیکس وصول کر لیا کرتے تھے۔ مگر آندھرا علاقے میں سنتھیا ٹالبوٹ نانینکر طریقہ نظام کی موجودگی کا نشان 13 ویں صدی میں کاکاتیوں کے تحت دیکھتے ہیں اگر چہ وہ مانتی ہیں کہ اس علاقے میں 15 ویں صدی کے آخر اور 16 ویں صدی کی ابتداء میں ان کی موجودگی میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ وجے نگر عہد میں نائکوں کے پاس اپنے نائک کٹنم کی شکل میں یقیناً ایک ریاستی علاقہ تھا۔ ایک ایسی علامت جو 14 ویں سے 15 ویں صدی میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ نوبورو کاراشیما کی دلیل ہے کہ یہ تبدیلی واضح طور پر جاگیرداروں کی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ وجے نگر عہد کے آخر میں ہم کو مندر کی زمین کے پٹے داروں کی شکل میں نائکوں کے حوالے یقیناً ملتے ہیں جس پر وہ کاشتکاروں سے کھیتی کا کام لیتے تھے۔ ان کے پٹہ اختیارات موروثی اور قابل فروخت تھے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آگے چل کر نائک پٹے پر لی یا دی زمینوں کے اصل مالکوں کے طور پر ظہور میں آئے۔

انعام

انعام زمینیں ٹیکس سے محفوظ عطیات تھیں جو کہ مذہبی افراد اور حاجت مندوں اور علماء کو عطا کی جاتی تھیں۔ اس طرح کے عطیات کے واسطے مستعمل نام علاقے

علاقے میں متعدد ہو سکتے تھے۔ مگر تقسیم کا طریقہ اور پیٹرن سب جگہ اکثر مساوی تھے۔ شمالی ہند میں انعام عطیات کو مدد معاش/سیور غال، ائمہ وغیرہ کے نام سے جانا تھا۔ اکبر کے عہد حکومت میں یہ عطیات متفرق علاقوں میں 2% سے 5% تک تھے۔ مدد معاش حاملوں کو زمین لگان اور دیگر ٹیکسوں کی ادائیگی سے رعایت حاصل تھی۔

جنوبی ہند میں انعام عطیات مانیہ (Manya) کہلاتے تھے۔ انعام زمین اداروں کو بھی دی جاتی تھیں اور افراد کو بھی۔ یہ عطیات عموماً چار قسم کے ہوتے تھے (الف) برہموں کے اختیارات میں انعام زمینوں کو برہم دیہ/ اگر ہارا کہا جاتا تھا۔ (ب) مندروں کو عطا کردہ زمین دیودان کہی جاتی تھیں۔ (ج) مٹھ پورہ وہ ٹیکس سے آزاد زمینیں تھیں جو رسمی طور پر تعلیمی اداروں یا مٹھوں کے تحت تھیں۔ مٹھوں کو دیئے گئے انعام عطیات مٹھ کی نگہداشت کے صدر مدرس کو دیئے جاتے تھے۔ مگر مندروں کو دیئے گئے عطیات ایک ٹرسٹ کے قبضہ میں تھے جو کہ مندر کے منتظم ہوتے تھے وہ مندر کی حفاظت اس دیوتا کے نام پر کرتے تھے جس کے نام پر واقعتاً عطیات ہوتے تھے۔ شمالی ہند کے مدد معاش عطیات کے برعکس دیودان، برہم دیہ اور مٹھ پورہ گاؤں عطیات وصول کرنے والے کے ذریعہ ہی صرفہ میں آتے تھے اور ریاست ان کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ کہیں کہیں ''سرونیہ'' (Sarvanya) عطیات بھی دینے کا دستور تھا۔ جہاں ان عطیات کے وصول کرنے والے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا تھا۔

وطن اور انعام مہاراشٹر میں مسلسل طور پر مستعمل تھے اس فرق کے ساتھ کہ اس سے وابستہ ان کے کوئی حقوق نہیں ہوتے تھے۔ وطن اختیار اکثر گاؤں کے افسران کے پاس ہوتے تھے۔ گاؤں کا مکھیا (پاٹل/مقدم)، گاؤں کا محاسب (کل کرنی) چنگار (پاٹل کا معاون)، شیٹھ مہاجن (گاؤں کے بازار کا افسر) اور مہار (گاؤں کا چوکیدار)، مندر، پروہت وغیرہ۔ جب تک وہ اپنے فرائض کو انجام دیتے تھے ان کے اختیارات موروثی اور مستقل ہوتے تھے مگر جب تک ان کے خاندان کے ممبران اپنے فرائض کو عمدہ طور ادا کرتے تھے اس کا استعمال خاص خاندان کے ذریعہ زمانہ تک کیا جاتا تھا۔ یہ عموماً خدماتی پٹے تھے۔ یہ بات اہم ہے کہ انعام زمینیں مکمل طور پر ٹیکس سے آزاد نہیں ہوتی تھیں۔ ان کو ان انعام پٹوں پر وصول شدہ ٹیکس 1/3 یا 1/4 حصہ ادا کرنا پڑتا تھا (اگر انعام نیمائی ہو تو 1/2، اگر انعام تیزئی ہو تو 1/3۔ اگر انعام چوتھائی ہو تو 1/4) انعام دو قسم کے ہوتے تھے۔ دیوان نسبت انعام اور گاؤ نسبت انعام۔ دیوان نسبت انعام ریاست کے ذریعہ ایک سند کے ذریعہ دیئے جاتے تھے جب کہ گاؤں نسبت انعام گاؤ کی کمیونٹی کے ذریعہ دیا جاتا تھا۔ اس کو دیہنگی (dehangi) انعام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور یہ گاؤں کے دستکاروں اور مزدوروں کو دیا جاتا تھا۔

محصول کی ٹھیکیداری : اجارہ

ریاست یا جاگیردار زمین کے قطعوں کو کسی مستاجر (محصول کاشتکار) کو اجارہ (کاشتکاری ٹھیکہ) پر منتقل کیا جاسکتا تھا۔ دونوں کے درمیان معاہدہ (تمسک) پر قاضی کے ذریعہ مہر لگائی جاتی تھی۔ اجارہ دار اصل میں جمع شدہ محصول اور ٹھیکہ میں مقرر کل رقم کے بیچ فرق رکھنے کا حقدار تھا۔ مگر مغلیہ عہد میں اجارہ پر خالصہ زمینیں دیئے جانے کی مثالیں مفقود ہیں۔ اس رواج کی مغلوں کے ذریعہ ہمیشہ ہی مخالفت کی گئی اور ریاست کے ذریعہ اس کو شاید ہی تسلیم کیا گیا ہو۔ 1676 میں اورنگ زیب نے گجرات میں اجارہ پر زمینوں کا دیا جانا ممنوع قرار دیا۔ اجارہ داری کا دستور غریبوں کے استحصال کا اہم ذریعہ تھا۔ کیونکہ اجارہ داروں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کاشتکاروں سے ہر ممکن زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنا۔ عام طور پر اجارہ دار کوئی مقامی آدمی ہی ہوتا تھا۔ راجستھان میں اجارہ داری ایک عام دستور تھا اور 18 ویں صدی کے دوران یہ مزید دستور میں آ گیا۔

مرکزی حکومت کے زوال کے ہمراہ خصوصاً 1719 کے بعد مغل منصب داروں نے راجپوت 'وطن' علاقوں کے نزدیک علاقوں میں حاصل اپنی جاگیریں راجپوت حکمرانوں کو اجارہ پر منتقل کرنا پسند کیں۔ راجستھانی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاگیردار اور اجارہ دار پٹے کی شرطیں طے کرتے وقت بہت زیادہ سودے بازی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر کافی حد تک یہ لین دین اجارہ دار کے حق میں ہی جاتا تھا یہاں تک 18 ویں صدی کے درمیان راجستھان سے ہمیں اجارہ استمراری (طویل مدتی یا مستقل عطیہ) عطیات کی کچھ مثالیں بھی ملتی ہیں۔ سوائی جے سنگھ کی وفات (1749) کے بعد اجارہ میں خالصہ زمینوں کا

دینا ایک عام علامت تھی۔ ہمیں تنخواہ اجاروں (یعنی تنخواہ کے بدلے افسران کو دئے جانے والے اجارہ) کے عطیہ کی مثالیں بھی دیکھنی کو ملتی ہیں۔ اس نے ساہوکاروں اور مہاجنوں کو خصوصاً گرویدہ کیا۔ وہ راجستھان میں اجارہ داروں کا جانب سے ضمانتیں فراہم کرایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود بھی زمین کو اجارہ پر حاصل کرلیا کرتے تھے اس رواج کا مثبت پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعہ اجاڑ گاؤں یا ترک شدہ زمینوں کو قابل کاشت بنا دیا گیا۔

اجارہ دکن اور مہاراشٹر کی ایک عام علامت تھی۔ یہ صرف زمینوں کو ٹھیکے پر اُٹھانے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ سرکاری منصب بھی اجارہ پر حاصل کئے جاسکتے تھے۔ جنوبی ہند میں ریاست کے ہمراہ نائک بھی زمین ٹھیکیداروں کو دیا کرتے تھے۔ ان کو اس کے عوض گٹا (gutta) یعنی لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔

19.9 ریاست اور محصولات

برنی (1351) علاؤالدین خلجی کی محصول پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ ٹیکس خوط سے لیکر بالاہار تک مساوی طور پر نافذ کیا گیا تھا تاکہ طاقتور کا وزن کمزور پر نہ پڑے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ چونکہ سبھی پر لگایا گیا یہ ٹیکس تقریباً ایک جیسا ہی تھا یہ استحصال کے دورہ کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ جن کے پاس بڑی جوتیں تھی وہ ان کے مقابلہ کم دباؤں میں رہے ہوں گے جن کے قبضہ میں چھوٹی جوتیں (پٹے) تھیں۔ چھوٹی جوت والے کاشتکار کے آدھی فصل ٹیکس کے طور پر دیدینا ازحد تکلیف دہ رہا ہوگا۔ علاؤالدین خلجی کی اصلاحات پر تنقید کرتے ہوئے عرفان حبیب (کیمبرج 1982) کا خیال ہے کہ یہ ٹیکس بہت بھاری اور دشوار کن رہا ہوگا۔ اس قسم کا ٹیکس وصول کرنے والی سرکار نے شاید ہی کمزور کی حفاظت کی ہو۔ اس بات کو چھوڑ کر کہ جہاں تک ریاست کا سوال ہے اس نے اپنے حصہ کی حفاظت کرنے کے واسطے گاؤں کے اعلیٰ طبقے کی طرف سے کئے جانے والے مزید استحصال کو روکنے یا مکمل ممنوع قرار دینے کی کوشش کی ہو۔ محمد تغلق کے عہد حکومت کے دوران ٹیکس کے وزنوں میں ایک ڈرامائی اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ٹیکس کے نفاذ کے واسطے محمد تغلق نے اصل کی جگہ ایک معیاری پیداوار کو ذہن نشین رکھا۔ اسی طرح حقیقی قیمتوں کی جگہ اختیاری طور پر سرکاری قیمتوں کا استعمال کیا جو کہ حقیقت میں بازار میں رائج قیمتوں کے بمقابل کافی اونچی ہوتی تھیں۔ اس سے یقیناً ٹیکس کے وزن میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہوگا۔ جس کے نتیجے میں خوط اور مقدم کی قیادت میں دوآبہ علاقے میں کاشتکار طبقہ کی سب سے زیادہ خوفناک کاشتکار بغاوت دیکھنے کو ملی (30-1326)۔ اس کے دورس اثرات ظہور میں آئے۔ جب ابن بطوطہ (1377) نے کول (جدید علی گڈھ) کے اردگرد 1342 میں اس علاقہ کا دورہ کیا تو اس نے دیکھا کہ یہ علاقہ باغیوں کے قبضہ میں ہے۔

اس طرح اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ عہد سلطنت میں زمینی ٹیکس کم آمدنی والے طبقہ پر زیادہ اور کاشتکاروں پر ازحد زیادہ تھا۔ مغلیہ عہد کے لئے ہمارے پاس اعداد وشمار اس کے مقابلے بہت زیادہ ہیں اور جہاں تک ٹیکس کی وصولیابیوں کا سوال ہے ہمیں کچھ اور باریک باتیں بطور تذکرہ ملتی ہیں۔ ٹیکس کا مطالبہ جیسے کہ ہم نے دیکھا کہ فصل کی 1/3 حصہ سے 1/2 حصہ تک ہوتا تھا۔ ریاست ٹیکس کو نقدی میں وصول کرنا پسند کرتی تھی۔ ضبطی میں ٹیکس کا مطالبہ نقدی کی شکل میں وصول کرنے کا دستور تھا۔ اگرچہ جنس یا بٹائی بھی مروج تھی۔ علاقے میں ٹیکس کا مطالبہ فی اکائی فصل کے مطابق مختلف ہوتا تھا۔ نہ کہ ٹیکس دینے والوں کی جوتوں کے سائز کے مطابق۔ (حبیب کیمبرج 1982)۔ اس کے علاوہ ٹیکس کا مطالبہ ذاتوں اور اقتدار سے وابستہ گروپوں اور افراد کے ذریعہ حاصل شدہ عہدوں کے مطابق مختلف ہوتا تھا۔ اعلیٰ اختیارات کے حامل زمینداروں، چودھریوں، مقدموں اور ایسے ہی اعلیٰ ذات کے لوگوں جیسے راجپوتوں، برہمنوں، مہاجنوں، بنیوں کے لئے ٹیکس کا تعین عام رعیت کے بمقابل کم شرح پر نافذ ہوتا تھا۔ کاشتکاروں کو سب سے زیادہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ غذائی فصلوں کے مقابلے نقدی فصلیں پیدا کرنے والے کو بھی یہ وزن نسبتاً کم محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ نقدی فصلوں سے زیادہ منافع کے مواقع تھے۔ مگر نقدی فصلوں کی زراعت کرنا عموماً عام رعایا کے بس سے باہر کی بات تھی۔ اس میں جتائی اور آبپاشی کے لحاظ سے بہت زیادہ صرفہ آتا تھا۔ اس طرح عام رعایا پورے عہد وسطیٰ میں وہ مستقل طور پر زیر بار ہی ہی۔ زمینی ٹیکس کے سوا بھی رعایا کو کئی دوسرے ٹیکس، محصول اور ابواب بھی ادا کرنے لازمی تھے۔ ایسے معاملوں میں بھی ذاتی وسماجی درجہ بندی کے بنیاد پر ٹیکس کی دروں میں فرق موجود تھا۔ جزیہ چھوٹے کاشتکاروں کے واسطے بھی کم تکلیف کا سامان نہیں تھا۔ اسی طرح عام رعیت پورے عہد وسطیٰ میں دباؤ میں ہی رہی اور اس پر ٹیکسوں کا ازحد وزن موجود تھا۔ زمین کی کثرت کے باوجود کاشتکار مقامی مہاجنوں اور بنیوں کے زیر دست وزیر بار رہے۔ اعلیٰ و نچلے طبقات کے درمیان فاصلہ کم ہونے کے باوجود مزید بڑھتا گیا۔ کاشتکاروں کی حالت قابل رحم تھی اور وہ ہمیشہ ہی بقائے زندگی کی نچلی سطح پر رہے اور کسی بھی آنے والی پریشانی کا مطلب تھا ان کے واسطے مکمل بربادی۔ ہمارے مطالعہ عہد کی تاریخ ایسی مثالوں سے پر ہے کہ قحط وغیرہ کے

وقت دباؤ میں کچھ کاشتکار عموماً ہجرت کرنے پر مجبور تھے (تفصیل کے لئے دیکھیں اکائی نمبر 16) یہ استحصال کا معاملہ اتنا زیادہ تھا کہ برنیر (1656-1665) تحریر کرتا ہے:-

> تو یہ غریب لوگ جب اپنے حریص حکمرانوں کے مطالبات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں نااہل ہوتے ہیں تو ان کو نہ صرف ان کی بقاء کی ضروریات سے محروم کر دیا جاتا ہے بلکہ ان سے ان کے بچے بھی چھین لئے جاتے ہیں جن کو غلام بنالیا جاتا ہے۔ اس طرح ایسا ہوتا ہے کہ بے شمار کاشتکار ایسے قابل نفرت ظلموں سے ہراساں ہوکر اپنا دیش ہی چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنا وجود بنائے رکھنے کی خاطر اس کے بہ نسبت کوئی بہترین زندگی کا موقع تلاش کر لیتے ہیں: یا تو شہروں یا خیموں (فوجی کیمپ) میں جاکر رہنا شروع کر دیتے ہیں، بار برداروں یا پانی ڈھونے والوں یا گھوڑسواروں کے نوکروں کی شکل میں۔ کبھی کبھی وہ فرار ہوکر کسی دوسرے راجا کی ریاست میں چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں وہ نسبتاً یہاں سے اپنا کم استحصال پاتے ہیں۔ وہاں ان کو کہیں زیادہ آرام دہ زندگی گذارنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

عرفان حبیب کی دلیل کہ '17 ویں صدی میں یہ یقین بہت مضبوطی سے جڑ پکڑ گیا تھا کہ جاگیری منتقلی نے زراعتی طبقہ کا اندھا دھند استحصال کو ناعاقبت اندیشی کے ساتھ فروغ دیا۔ یہ ایک ایسا نتیجہ تھا کہ جس پر شاہی انتظامیہ صرف کچھ وقت ہی کے واسطے کنٹرول رکھ سکتا تھا۔ مگر تا حد آخر اس پر بندش نہیں لگا سکا'۔

زراعتی بحران

جاگیر کے نظام کے طریقہ کار میں اندرونی تناقض کی موجودگی نے کاشتکاروں کے استحصال میں مزید اضافہ کیا۔ جاگیریں اصولی طور پر انتقال پذیر ہوتی تھیں جس سے کہ جاگیردار مقامی طور پر اپنی جڑوں کو مضبوط نہ بنا سکیں۔ مگر اس نے وہاں طویل مدت کے حقوق کے عدم موجودگی کی بناء پر کاشتکاروں کے از حد استحصال کئے جانے کی طرف رخ کیا۔ برنیر لکھتا ہے کہ:-

> تماریوں (جاگیردار) گورنر اور محصول ٹھیکدار اپنی جانب سے اس طرح کی دلیل دیتے ہیں کہ ''اس دیش کی نظر انداز حالت ہمارے دماغ میں باعث پریشانی کیوں ہو؟ اور کیوں اپنی دولت اپنا وقت اس کو بار آور بنانے میں خرچ کریں؟ اس سے ہم کو ایک ہی لمحہ میں محروم کیا جاسکتا ہے اور ہماری کوششیں نہ تو خود ہمارے واسطے مفید ہوں گی اور نہ ہی ہمارے بچوں کے لئے۔ چلو ہم اس زمین سے جتنا مال دولت حاصل کر سکتے ہیں حاصل کر لیں۔ بھلے ہی کاشتکار بھوکوں مرجائیں یا زمین کو ترک کر کے کہیں فرار ہوجائیں اور جب ہم کو اس مقام کو خیر باد کہنے کا حکم ہو تو ہمیں ایک تیرہ و تار بیاباں ہی یہاں چھوڑنا چاہئے''۔

مہاراشٹر کے حوالہ میں اے آر کل کرنی کا خیال ہے کہ اگرچہ ٹیکسوں کا وزن غریب آدمی پر زیادہ پڑتا ہے، ان ٹیکسوں کے خلاف بغاوت کرنے یا شکایت کرنے والے لوگوں کی مثالیں بہت کم ہی تعداد میں دستیاب ہیں۔ مگر یہاں مہاراشٹر میں بھی ہم کو غیر قانونی وصولیابیوں کے خلاف بغاوت کی مثالیں ملتی ہیں۔ پرگنہ پونا سے انعامدار کے ذریعہ میراث پٹی کی وصولی کو چیلنج دیا گیا تھا۔

دکن اور جنوبی ہند میں بھی اس کی تصویر کچھ زیادہ جدا نظر نہیں آتی۔ نونز افسوس ظاہر کرتا ہے کہ کاشتکاروں کی فصل کا صرف 1/10 حصہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت تھی۔ اور بقایا یا تو سرکار حاصل کر لیتی یا پھر امرنائک اس پر قابض ہوجاتے تھے۔ اگر ہم اس قول کو تسلیم نہ بھی کریں تو یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عہد وسطی کا کاشتکار بہت زیادہ دباؤ میں تھا۔ ایسے تذکرے ملتے ہیں کہ شری موسنم گاؤں کے کاشتکار بہت زیادہ ٹیکسوں سے زیر بار ہوکر ہی اپنے گاؤں سے ہجرت کر گئے تھے۔ نیز ان کی واپسی اسی وقت ممکن ہوئی جب 1513 میں کرشن دیورائے کے ماتحت سن نپا نائک نے ان کے لئے مناسب شرحیں طے کیں۔ کوتلم (ادونی تعلقہ ضلع بیلاری) کی ایک کیفیت میں ریاستی ملازمین کے استحصال کی وجہ سے رعیت نے گاؤں ہی کو خیر باد کہہ دیا۔

منظم سرکار کی غیر موجودگی کے فقدان کی وجہ سے 'کوتلہ سیمے' کی رعیت اپنے اصل گاؤں کو چھوڑ کر ایک جماعت کی شکل میں تنگ بھدرا کی دوسری جانب مانوے سیمے میں چلی گئی۔ جبکہ اچیوت، وجے نگر کا حکمراں اس کا سالہ سلاک راجو چک ترو ملا مہاراج نے اڈونی کا دورہ کرنے کے بعد کو تلہ کے بھی گوڑوں کو از سر نو کول دیا۔ اور ان کو قابل زراعت زمین پر پھر سے جنگلات کو صاف کر کے جو اس ترک کرنے کے زمانہ میں پیدا ہو گئے تھے جس وقت کہ وہ وہاں سے ہجرت کی وجہ سے کھیت اجاڑ پڑے تھے۔ کافی رعایت فراہم کرائیں۔ اگر چہ یہ رعایات ایک ساسن کے ذریعہ روشنی میں آ گئی تھیں کہ صرف گوڑا اور کل کرنی ہی واپس گاؤں میں آئیں وہ کاشتکار ہرگز واپس نہ آئے جو سرکار میں اپنا یقین کھو بیٹھے تھے۔ اس سبب ترو مل مہاراج نے از سر نو گفتگو شروع کرنی پڑی۔ رعیت کوتلہ میں ہندو کے مندر کے نزدیک جمع ہوئی جہاں انھوں نے سرکار کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ تب پھر وہ اپنے قدیم گھروں میں آباد ہوئے۔ معاہدہ کی شرائط ایک پتھر کی تختی پر کندہ کی گئیں جو کہ سبھا کے مقام پر قائم کی گئی۔

(این وینکٹ رمنیا، اسٹڈیز ان دی ہسٹری آف دی تھرڈ ڈائنسٹی آف وجے نگر، دہلی 1935، صفحہ 244

کبھی کبھی کاشتکار ٹیکس کے مطالبے کو پورا کرنے کے واسطے اپنی زمینیں فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ٹیکسوں کے بھاری وزن نے کاشتکاروں کے ہمراہ دستکاروں پر بھی دباؤ ڈالا۔ جس کی وجہ سے 1429 میں یہ زمینداروں اور وجے نگر کے دخل انداز فوجی سرداروں کے درمیان ہوئی کھلی بغاوتوں کی شکل میں انجام پذیر ہوا۔ آخر کار ریاست عارضی راحتیں فراہم کرانے کے واسطے مجبور ہو گئی۔

(1) ہم ولوڈلم پٹو اچاوڑی کے ونگئی 98 اور انڈ اگئی 98 کے باشندے، اس مندر میں مکمل تعداد کے ساتھ جمع ہوئے اور مذکورہ مندر کی دیوار پر یہ عبارت کندہ کرائی۔

(2) اس منڈلم (ولوڈلم پٹو) میں اگر اچاوڑی پردھانی [مقامی وجے نگر گورنر، ونیار (فوجی) اور جیوتک کرار (ریاستی زمین عطیہ رکھنے والے) ہمیں ستاتے ہیں یا پھر برہمن اور ویل لال کنیالار (کنی حقوق رکھنے والے) اراجا گرٹار (سرکاری افسران) کے ساتھ ہمیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں، ہم کبھی بھی ایسے استحصال کو تسلیم نہیں کریں گے۔

(3) اگر ایسا کوئی آدمی ہم میں سے نظر آئے جو کہ دخل اندازی کرنے والے لوگوں کی مدد کرتا ہو یا ہم سے غداری کرتا ہو چکراسر (Chikkarasar) کے ذریعہ عطا کردہ عطیوں کو نظر انداز کرتا ہو یا (موجودہ) ناپنے والی چھڑی کو برباد کرتا ہو، آج کی طرح ہم یہاں پھر جمع ہونگے اور اس کی جانچ پڑتال کریں گے۔

(4) ان کے بیچ جو اس منڈلم میں پیدا ہوئے کسی بھی اکاؤنٹ (حکومت کے لئے) نہیں لکھنا چاہئے، دوسروں کے اکاؤنٹ لکھنے دو یا سرکاری افسران اور جیوتک کاروں کے ساتھ ساز باز کرنے دو۔ اگر ایسا کوئی آدمی نظر آتا ہے تو ہم اس کی ذات کی درجہ بندی میں کم تر کر دیں گے۔

1429 کی بغاوت کے تعلق سے 4 کتبات کا خلاصہ: نوبورو کارشما، 1992، صفحہ 142۔

15 ویں صدی کے نصف آخر سے ایسی آویزشوں کی غیر موجودگی نے نوبرو کارشما کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کی جانب بڑھایا کہ چولا حکومت کے زوال کے بعد اس وقت سماجی معاشی تبدیلیاں کھلے تصادم میں ظاہر ہوئیں۔ ایک بار جب وجے نگر حکمرانوں کے تحت یہ طاقت منظم ہو گئی تو پھر اس قسم کی کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔

19.10 خلاصہ

زمین کا لگان ریاست کی آمد کا اہم سرچشمہ تھا۔ اس دور میں محصول کے تعین اور جمع کرنے کے طریقوں میں علاقائی اختلافات موجود تھے۔ ریاست کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول کر سکیں چونکہ زمین کثیر مقدار میں مہیا تھی وہ ریاست کے حق میں ہی تھا کہ کاشتکاروں کو زمین سے باندھ کر رکھا جا سکا۔ ریاست کاشتکاروں کی ہجرت کو روکنے کے واسطے احتیاطی طور پر سارے اقدامات کرتی تھی۔ بحرانی حالات میں ریاست کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ

کاشتکاروں کو ہر ممکن تعاون فراہم کرائے۔ عموماً مکمل عہد وسطی میں ٹیکس کا وزن زیادہ تھا نیز ان کی نوعیت سخت تھی۔ خصوصاً وہ کم آمدنی والے چھوٹے کاشتکاروں پر نسبتاً زیادہ ہوتے تھے۔ ریاست خالصہ علاقوں میں براہ راست ٹیکس کی وصولیابی کرتی تھی۔ مگر ٹیکس کا ایک بڑا حصہ امراء حکمراں طبقہ کو ان کی خدمات کے عوض دیا جاتا تھا (جاگیر، موکاسا، نایبنکر)۔ سلطنت کے موثر طریقہ کار کو جاری رکھنے کے لئے ٹیکس عطیات یافتہ لوگوں کو اس طبقہ پر مکمل طور پر کنٹرول رکھنا ضروری تھا۔

19.11 مشقیں

(1) ٹیکسوں کے اسلامی اصول کی نوعیت پر مختصراً تحریر کیجیے۔ ترکوں اور مغلوں نے اسلامی رواجوں کو کسی حد تک نافذ کیا؟

(2) ضبط کے خصوصی تناظر میں مغلوں کے تحت ٹیکس کے تعین کے طریقوں کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

(3) دکن میں مغلوں کی محصول پالیسی کے نفوذ کے عمل کا تجزیہ کیجیے۔

(4) ملک عنبر کے بندوبست پر اختصار کے ساتھ بحث کیجیے۔ مراٹھاؤں نے اس کو کسی حد تک اختیار کیا؟

(5) جنوبی ہند میں زمین کے لگان کے پیٹرن کا مختصراً تذکرہ کریں، اس کا موازنہ مغل لگان کے پیٹرن سے کیجیے۔

(6) زمینی ٹیکس کے علاوہ دیگر ٹیکسوں پر بھی بحث کیجیے۔

(7) متعدد تجارتوں اور صنعتوں پر نافذ ٹیکسوں کی فہرست پیش کیجیے۔

(8) عہد وسطی کے دوران زمینی لگان کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔ کاشتکاروں کے تئیں ریاست کے رویہ کا بھی جائزہ لیجیے۔

(9) قدرتی آفات کا مقابلہ کرنے کے واسطے کون کون سے راحت کاری اقدامات کئے گئے؟

(10) عہد وسطی میں زمین کی ملکیت کی مختلف قسموں پر ایک مختصر سا تنقیدی نوٹ لکھیں۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD
Acc. No. MA-027
Date 03.08.2015
INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad-32

اکائی 20 عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں شہری مرکز

ساخت

20.1 تعارف
20.2 قصبے، شہر، بندرگاہیں اور قلعے
20.3 دیہی شہری دور تسلسل
20.4 شہروں کی ترقی
20.5 شہر کاری: کچھ نظریات
20.6 عہد وسطیٰ میں شہروں کی شکل وصورت
20.7 شہری انتظام کا پیٹرن
20.8 خلاصہ
20.9 مشقیں

20.1 تعارف

عہد وسطیٰ میں تمدن نیز شہری مرکزوں کا مطالعہ زیادہ تر ایک بے توجہی کا اور نسبتاً کم تحقیقی میدان رہا ہے۔ ہمیں خاص بستیوں، شہروں اور قصبوں پر کئے گئے متعدد مطالعات یقیناً مہیا ہیں مگر یہ قصیدہ خوانی اور سوانح حیاتوں تک ہی محدود ہیں۔ ان کو شہری تاریخ کی صنف میں شاید ہی رکھا جا سکتا ہے۔ اس پر بھی انہیں یونہی درکنار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو وہ ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ ایس۔ سی۔ مشرا بیان کرتے ہیں کہ شہر وہ ہے جو اس کے شہریوں کے ذہن میں بسا ہو۔ پھر بھی ہمیں 'شہری تاریخ' اور 'شہری سوانح' کے درمیان کچھ واضح فرق کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ شہری تاریخ تنقیدی عنوانات سے متعلق ہے اور انہیں سے منسلک سوالات کو واضح بھی کرتی ہے۔

جو ترمیم یا نا منظور کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی علاقے اور علاقے کے اطراف کے شہروں، قصبوں اور گاؤں کے بیچ تعلقات کے پیٹرن پر بھی شاید ہی مطالعہ ہوا ہو۔

عہد وسطیٰ کے شہروں کو عموماً دست نگر (Parasitic) /طفیلی شہر کی شکل میں دیکھا جاتا ہے جو کافی حد تک اپنی ضروریات کے واسطے گاؤں پر منحصر تھے۔ شہروں کے ذریعہ زائد کا بڑا حصہ اپنے نجی مفاد کے واسطے مستعمل تھا۔ جب کہ اس کے عوض شاید ہی وہ واپس دیتے تھے۔ پھر بھی متحرک تجارتی سرگرمیاں شہر کو ایک مخصوص کردار ادا کرتی تھیں۔

اپنی بحث کے دوران کچھ خاص و اہم مدعوں پر توجہ مرکوز کرنی لازمی ہے کہ کیا شہر کسی خاص گاؤں کی توسیع ہوا کرتے تھے؟ اگر چہ جزوی پیداواری عمل گاؤں میں ہی کیا جاتا تھا تو عام لوگوں کو شہروں کی جانب ہجرت کیوں کرنی پڑتی تھی؟ دیہی گروپ کا کونسہ طبقہ ہجرت کرتا تھا؟ کیا یہ ہجرتیں موسموں کے لحاظ سے اور عارضی ہوتی تھیں۔ ان سب کے علاوہ شہریوں اور دیہی عوام کے درمیان کیا تعلقات تھے؟ کیا وہ خود کو مستقل جداگانہ رکھتے تھے یا پھر دیہی شہریت کا تسلسل موجود تھا؟ اگر اس طرح تھا تو اس کی شکل وصورت کیا تھی؟ شہری مرکزوں کی ترقی میں ریاست کا کیا رول تھا؟ ان تمام ہی سوالات کا جواب یقینی طور پر دیا جانا ازحد مشکل ہے۔ پھر بھی عہد وسطیٰ میں شہری مرکزوں کی ترقی اور شہر کاری کے طریقۂ کار کی وضاحت کرنے کے لئے یہ تمام ہی مدعے بہت اہم ہیں۔

اپنے نصاب ایم۔ایچ۔آئی۔01 میں ہم نے عہد وسطیٰ کی دنیا کے حوالہ میں شہری مرکزوں کی ترقی کے تعلق سے تفصیلی بحث کی ہے۔اس نصاب کی اکائی 33،پیش موجودہ اکائی کے پس منظر کے طور پر بہت مفید ثابت ہوگی۔

20.2 قصبے،شہر،بندرگاہیں اور قلعے

جدید عہد میں کسی شہری مرکز کو آبادی کی گنجانی اور سائز کی بنیاد پر متعارف کیا جاتا ہے۔1951 کی مردم شماری نے شہر کو اس طرح متعارف کرایا ہے کہ اُس کی گنجانی ایک ہزار افراد فی ایک مربع میل ہو اور اس میں کم از کم 5 ہزار افراد بستے ہوں‘۔مگر بڑے شہروں سے متعلق یورو پی سیاحوں کے ذریعہ لگائے گئے کچھ اوسط اندازوں کو چھوڑ کر عہد وسطیٰ سے متعلق ہمارے پاس مہیا اعداد و شمار مذکورہ بالا معیار کو شاید ہی پورا کرتے ہوں۔پٹنہ کے لئے فرے سے بسٹین میٹرک (43-1629) اور سورت کے لئے الیگزنڈر ہیملٹن (1723-1688) کے اندازوں کے مطابق ان شہروں کی آبادی اندازاً دو لاکھ کے قریب تھی۔ہنری پائرین نے عہد وسطیٰ کے شہر کی تعریف اس طرح کی ہے وہ علاقے جہاں کے لوگ ’صنعت اور تجارت‘ میں مشغول ہوں ایک دستوری قانون اور ادارہ ہو اور جس کا ’’قلعہ‘ والا ایک انتظامی مرکز ہو۔جامع مسجد اور علاقائی بازار اسلامی شہروں کی اہم خصوصیت تھی۔عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے شہروں کو بازار مرکزوں کی شکل میں متعارف کرایا جاسکتا ہے یعنی وہ مرکز جہاں کہ زیادہ تر آبادی اپنی زندگی گذارنے کے لئے زراعت پر منحصر نہ ہو کر دیگر پیداواری وسائل پر منحصر ہو۔

عہد وسطیٰ کے فارسی ماخذ بڑے اور چھوٹے شہر کے درمیان فرق کرنے کے لئے بلدہ/شہر (City) اور قصبہ (Small Town, Township) کے حوالے دیتے ہیں۔اسی طرح بڑی بندرگاہوں اور چھوٹی بندرگاہوں کے درمیان تمیز کی جاتی تھی وہ سلسلہ وار ’’بندر اور باڑہ‘‘ کے نام سے موسوم تھے۔جنوبی ہند میں بھی شہروں کے ایسی درجہ بندی کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔پٹنم ایمپوریا تھا جب کہ والا ر پورم ساحلی خوشحال شہر تھے۔ان کے درمیان درجہ بندی میں آتے تھے ’’نگرم‘‘ جن کا موازنہ باقاعدہ طور پر دکن وشمال کے قصبات سے کیا جاسکتا ہے پھر بھی ان کی کچھ علاقائی خصوصیات تھیں۔

قصبہ

نظام الدین احمد نے اپنی کتاب ’’طبقات اکبری‘‘ میں قصبوں کو ایک انتظامی مرکز نیز ایک پرگنہ کے صدر دفتر کے بطور تعریف کی ہے۔احمد نے قصبہ اور شہر کے درمیان واضح طور پر فرق بیان کیا ہے۔اس کے اندازہ کے مطابق اکبری سلطنت میں 3200 قصبے اور 120 شہر موجود تھے۔اگر ہم نظام الدین کی تعریف ہی کو اختیار کریں تو 1647 تک قصبوں کی تعداد بڑھ کر 4350 ہوگئی اور اس کے بعد 18 ویں صدی کے نصف اول (تقریباً 1720) میں ان کی تعداد 4716 پر پہنچ گئی۔مگر یہ یقینی نہیں تھا کہ کسی پرگنہ میں صرف ایک ہی قصبہ ہو۔18 ویں صدی کی ابتداء میں پرگنہ برسانہ (مغربی راجستھان) میں 20 قصبات تھے۔مغربی راجستھان میں قصبے عموماً شہر پناہ والے قلعوں (گڑھی) یا کوٹلوں (گڑھ) سے محصور ہوتے تھے۔

عہد وسطیٰ کے تناظر میں قصبے کافی حد تک گاؤں کی ہی توسیع ہوتے تھے۔بازار مرکز والے ایک بڑے گاؤں کے قصبے میں بدل جانے کے کافی امکانات ہوا کرتے تھے۔برسانہ (مغربی راجستھان) میں گاؤں ہری گڑھ،کنڈی،اور کاکرمی جو 17 ویں صدی میں گاؤں کے دائرہ میں آتے تھے۔ابتدائی 18 ویں صدی کی دستاویزوں میں قصبوں کی شکل میں منقول ملتے ہیں۔کبھی کبھی گاؤں ان کو حاصل حفاظت کی وجہ سے کسی قلعے سے منسلک ہو جاتے تھے اور قصبات میں تبدیل ہو جاتے تھے۔مگر قصبوں کی پہلی قسم عموماً عام تھی۔مغربی راجستھان میں 1785 میں دولت گنج کو روجھڑی سے زمین لے کر ایک بازار گاؤں کی شکل میں قائم کیا گیا۔اس قسم کے بازار شہروں کا جب زوال ہوتا تھا تو وہ گاؤں کی شکل میں اسی قصبہ کا ایک حصہ بن جایا کرتے تھے۔جس سے وہ اولاً متعلق تھے۔بہت سے قصبے بازار شہروں سے بھی ظہور میں آئے۔’’گنج‘‘ لاحقہ والے قصبات زیادہ بازار شہر ہی تھے جہاں پر ہفتہ واری بازار (ہاٹ) اور میلے بھی لگائے جاتے تھے۔مگر ایسے قصبے مغربی راجستھان میں 18 ویں صدی کے وسط میں بہت زیادہ اہم تعداد میں وجود میں آئے۔بی ایل۔بھدانی اور ساتو کے قصبوں کی ترقی سے متعلق مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 18 ویں صدی کے دوران گاؤں وغیرہ سے بازار شہروں کی ترقی ہونے کا عمل بے تخفیف طور پر جاری رہا مگر 19 ویں صدی میں یہ رفتار سست پڑ گئی۔

MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU Hyderabad-32

یہاں ایک اہم بات یہ ہے کہ کونسی علامت کسی شہر کو ایک قصبہ سے ممتاز اور جدا کرتی ہے۔ ستیش چندر کا تجزیہ ہے کہ قصبہ کا حوالہ مخصوص زمانہ اور مخصوص علاقوں میں تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ان کے مطابق عہد سلطنت میں قصبہ ایک قلعہ وار گاؤں ہوتا تھا۔ مغلیہ عہد تک آتے آتے اس کو ایک بازار والے گاؤں کی شکل میں شناخت کیا جانے لگا۔ یہ مرکز نہ صرف زراعتی پیداوار کے واسطے بازار کی شکل میں کام کرتے تھے بلکہ یہ دستکاری پیداواری کے مرکز بھی ہوتے تھے۔ مگر سنیل کمار کا خیال ہے کہ 13 ویں صدی میں وہ بازار مرکزوں کا کردار نہیں نبھاتے تھے بلکہ وہ قلعہ بند لشکر گاہ (fortified encampments) ہوا کرتے تھے اور کسی بڑے شہر سے ہمیشہ منسلک نہیں ہوتے تھے۔ مگر ہم کو ''برن'' وغیرہ قصبوں کے اندر کاروباری کاموں کے تذکرے ملتے ہیں۔ یہ قصبے ہی تھے جہاں زراعتی پیداواروں کی خرید وفروخت ہوا کرتی تھی۔

کبھی کبھی قصبے کسی سرائے کے اردگرد بھی ترقی کر لیتے تھے اس زمانہ کے تاجر اور مسافر گھوڑوں پر یا گاڑیوں میں سفر کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں وہ زیادہ سے زیادہ 10 سے 12 میل ہی سفر طے کر پاتے تھے۔ اس کے بعد ان کو کسی آرام گاہ کی ضرورت پیش آجایا کرتی۔ اس رجحان نے سرایوں کے قیام کی جانب اقدام کرایا۔ ان سرایوں (مغل سرائے وغیرہ) میں سے کچھ بعد میں قصبوں یا چھوٹے شہروں کی شکل میں وجود میں آئے۔

امراء طبقے نے بھی اسی میں کچھ تعاون دیا۔ ان کے ذریعہ قائم شدہ منڈیوں اور باغوں کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ کچھ تذکروں میں یہ منڈیاں ہی قصبوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جے سنگھ پور، جہان آباد (دہلی) شروع شروع میں ایک منڈی (بازار مقام) تھی اور 18 ویں صدی کے راجستھانی دستاویزوں میں اس کا تذکرہ ایک قصبہ کی شکل میں کیا گیا ہے۔

نگرم (شہر)

جنوبی ہند میں نگرم ہی بازار مرکز تھے۔ اور ان کا مقابلہ شمال ودکن کے قصبوں سے کیا جاسکتا تھا۔ ایک ناڈو میں کم از کم ایک نگرم (بازار مرکز) موجود تھا۔ ساحلی شہر اپنی رسد کے لئے دور دراز کے علاقوں پر کافی حد تک منحصر تھے۔ نگرم اردگرد کے گاؤں کو منسلک رکھنے کی اہلیت کے حامل ہوتے تھے۔ یہاں سفری تاجر، نقدیا مقامی طور پر پیدا نہ کی جانے والی اشیاء کے بدلے مقامی پیدا شدہ اشیاء کا سودا کرتے تھے۔ یہاں ممکن طور پر مقامی تاجر سفری تاجروں سے ہول سیل (تھوک) میں اشیاء خریدتے تھے۔ اور پھر مقامی سطح پر اس کو پرچون (خردہ فروش) کی شکل میں فروخت کرتے تھے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ نگرم کبھی کبھی انتظامی احکام سے بھی ترقی پذیر ہوتے تھے۔ ایک تذکرہ میں ''ناڈو'' اور ''نگرم'' نے مل کر ایک مقامی گاؤں کو تجارتی شہر میں تبدیل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ذخیرہ اندوزی اور تقسیم کا رمرکزی شکل میں کام کرتے تھے نیز یہ مقامی تاجروں/ پیدا کرنے والوں نیز سفری تاجروں کے درمیان اہم رابطہ کا مرکز ہوا کرتے تھے۔

بندرگاہیں اور قلعے

عہد وسطٰی میں بندرگاہی شہر متحرک شہری زندگی کے اہم مرکز تھے۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ مولینڈ نے ہندوستانی بندرگاہوں کو بحر ہند کی یوروپی بندرگاہوں سے مختلف تسلیم کیا ہے۔ بندرگاہوں کا داخلی علاقوں کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا تھا۔ وہ اپنی بقائے زندگی کے لئے کافی حد تک دور دراز کے علاقوں پر ہی منحصر تھے وہ بھی تبادلہ میں اپنے مربی شہروں کی خوشحالی پر ہی منحصر رہتے تھے۔

مہاراشٹر میں مسلسل جنگ کی حالت اور غیر مطمئن حالات کی وجہ سے قلعوں کا بہت اہم مقام تھا (1) شہری مرکزوں اور تجارت کی حفاظت کے واسطے شاہی مرکز اور فوجی چوکیاں نیز (2) بازاروں میں غذائی اجناس کی تقسیم کے مقام۔ شیواجی کی دارالسلطنت قلعہ رائے گڑھ پچڈ میں ایک مقامی بازار (پیٹھ) ہوا کرتا تھا

جہاں تاجر اور سوداگر مختلف سمتوں سے وہاں آتے تھے اور قلعہ کو رسد مہیا کراتے تھے۔

یہ قلعے عموماً یا تو شاہراوں یا تجارتی راستوں یا شہروں کے نزدیک ہی قائم ہوتے تھے اور نزدیکی شہری مرکزوں کی حفاظت کو یقینی بنائے رکھتے تھے۔ نتیجتاً اس علاقے میں تجارت اور روزگار کو مزید وسعت وفروغ ملتا تھا۔ شیونیری، پرندر، رائے گڑھ (مہاڑ) پنہالا جیسے قلعے محافظ چوکیوں کی شکل میں کام کرتے تھے۔ اور پونے (شیونیری) جنار (پرندر) اور کولہاپور (پنہالا) جیسے شہروں کو حفاظت مہیا کرتے تھے۔ کھنڈیری، اندری، کلابہ جیسے قلعے بھی بندرگاہی شہروں کو حفاظت مہیا کراتے تھے۔ مگر مغلوں کے ذریعہ رائے گڑھ پر قبضہ کر لئے جانے کے بعد پہاڑی قلعوں پر قائم شہری احاطوں کا جلدی ہی اختتام ہو گیا اور وہاں سے ہٹ کر مرکز پونا، ستارا جیسے شہری مرکزوں کی جانب مرکوز ہو گیا۔

20.3 دیہی شہری دور تسلسل

پلسارٹ (تقریباً 1624ء) تحریر کرتا ہے کہ ہندوستانی شہر گاؤں کی ایک توسیعی شکل ہوتے تھے۔ اسکا خیال ہے کہ آگرہ بیانہ کے علاقائی اختیارات میں محض ایک گاؤں تھا جو کہ اچانک شہر میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی دلیل ہے کہ اس کی ترقی کی وجہ بادشاہ اکبر کے ذریعہ اس کو 1566 کے سال میں اپنی رہائش کے لئے اس کا انتخاب ہے۔ یہاں ہمارا مقصد پلسارٹ کے قول کی تنقید پیش کرنا نہیں کیونکہ آگرہ سکندر لودی کے عہد حکومت میں ہی دارالسلطنت شہر کی شکل میں وجود میں آچکا تھا۔ یہاں اہم بات عہد وسطیٰ کے ہندوستانی شہروں کی دیہی بنیاد ہے۔ چونکہ اہم طور پر یہ ایک زراعتی معیشت تھی۔ شہروں کی دیہی بنیاد کو آسانی سے نظرانداز نہیں جاسکتا یہاں تک کہ شہر کا اعلیٰ سماجی طبقہ بھی اپنی زمینوں پر منحصر آمدنی کی وجہ سے دیہی بنیاد ہی رکھتا تھا۔ یہ دیہی شہری تسلسل ہی عہد وسطیٰ کے شہری مرکزوں کی ترقی کا ایک اہم نشان رہا۔ اس میں وہی سماجی معاشی اتحاد اور طرز تھے جنھیں ایس۔ سی۔ مشرا ''شہر میں رہنے والے دہقان'' (Peasnat Urbanites) کہتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ اس دیہی شہری تسلسل کی وجہ ان علامات واسباب کی ترقی اور ظہور پس ماندہ رہ گیا جو ''خالص شہری'' کہے جاسکتے تھے۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی شہر طفیلی (PARASITIC) تھے۔ شہر غذائی اجناس کی فراہمی اور خام مال کی فراہمی کے لئے گاؤں پر کافی حد تک منحصر تھے۔ مگر اس کے بدلے میں ہندوستانی گاؤں شاید ہی کچھ حاصل کرتے ہوں۔ عرفان حبیب کی دلیل ہے کہ چونکہ گاؤں اپنی حد سے باہر شاید ہی کسی سے کچھ مطالبہ کرتا تھا، اس کو اپنے باشندوں کی ضروریات کو کافی حد تک اپنے گاؤں کے اندر ہی سے پورا کرنا پڑتا تھا لہٰذا اس کو اسی وجہ سے ایک خود کفیل اکائی کی شکل میں کام انجام دینا ہوتا تھا۔ مگر چتمین سنگھ گاؤں اور شہر کے بیچ ایک معاشی رشتہ (Symbiotic Relationship) کی موجودگی پر زور دیتا ہے ساتھ ہی شہر دیہی علاقے کوئی خود کفیل حلقۂ اثر نہیں تھا۔ ان کی دلیل ہے کہ پنجاب کے شہروں کی ترقی کافی حد تک ترقی یافتہ زراعتی میدانوں میں ہوئی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ خام مال جس کی رسد گاؤں شہری مرکز کو کرتا تھا کی مانگ میں گراوٹ کاشتکاروں کو یکساں طور پر متاثر کرتی تھی۔

ہیزی پائرین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جہاں شہر پیداوار کا مرکز تھے، گاؤں خوردنی اشیاء وخام مال کی فراہمی کا ایک سرچشمہ تھے۔ ان کا ماڈل شہروں کو صرف استحصال کرنے والوں کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ مگر عہد وسطیٰ کے ہندوستانی گاؤں پیداوار کے مرکز بھی تھے۔ کپڑے اور نیل گاؤوں ہی میں پیدا اور تیار ہونے والی اشیاء تھیں۔ ہم اکائی 18 میں بحث کر چکے ہیں کہ گجرات میں بنکروں کے مخصوص گاؤں موجود تھے نیز رنگائی اور رنگ صاف کرنے میں کئی گاؤں مکمل طور پر مشغول تھے۔ 17ویں صدی میں کپڑا صنعت کے تعلق سے کے۔ این۔ چودھری کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب کہ شمالی ہند اور وسط ہند میں کپڑا پیداوار کا اہم مرکز شہر تھا جنوبی ہند اور بنگال میں وہیں یہ مکمل علاقوں میں وسیع طور پر پھیلا ہوا تھا۔

20.4 شہروں کی ترقی

ہمارے عہد مطالعہ کی شروعات میں شمالی ہند میں شہری مرکزوں کی ترقی میں تیز اضافہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ عمل 16-17ویں صدی کے بعد مزید تیز ہو گیا۔ یہ معلومات دل چسپ ہے کہ شہر کاری کی ترقی برطانیہ کے مقابلہ میں مغلیہ عہد کے ہندوستان میں زیادہ تیزی سے ہوئی۔ عرفان حبیب اور شیریں موسوی کے

تخمینوں کے مطابق 1600 کے اردگرد انگلینڈ میں %13 شرح افزائش کی بہ نسبت مغلیہ عہد کے شہری مرکزوں میں آبادی میں اضافہ %15 سے بھی زیادہ تھا۔

محمد حبیب نے ایلیٹ اور ڈاؤسن کی 'ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹورینس' حصہ دوم کے دیباچہ میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ ترکوں کی فتح نے شمالی ہند میں شہری انقلاب کی جانب ترقی کی۔ ان کی دلیل ہے کہ ترکی کے حملہ سے پہلے اعلیٰ طبقوں کا شہروں اور قصبوں پر مکمل طور پر قبضہ تھا جب کہ مزدور طبقہ شہر پناہ کے باہر غیر محفوظ گاؤوں اور بستیوں میں رہتے تھے۔ ترکوں کی آمد سے وہ ناکہ بندی ٹوٹ گئی۔ جب ترکوں نے شہروں میں داخلہ کیا تو ان کے ساتھ ہندو نچلی ذاتوں کے مزدور بھی گھس گئے اور وہ رہائش کے لئے آئے۔ نئی حکومت کے نظام کے تحت شہر صنعت اور کاروبار کے پھلتے پھولتے مرکزوں کی شکل میں ترقی پذیر ہو رہے تھے۔ اس طرح محمد حبیب کے مطابق اس انقلاب کے پیچھے اہم اسباب تھے: (1) منتخب حکمراں طبقہ شہری/قصبات پر منحصر تھا (2) ترک مزدور طبقہ کو آزاد کرنے میں کامیاب رہے۔ اس طرح انھوں نے شہری زندگی کے مجموعہ ترقی اور پیٹرن میں عظیم تبدیلیاں لائیں۔ مگر عرفان حبیب نے اس بات میں شک ظاہر کیا ہے کہ شہر کے مزدوروں کو ترکوں کے عہد حکومت میں شاید ہی کوئی زیادہ آزادی ملی ہو۔

'بااثر ترقی کے عنصر' کی بنیاد پر ہم عہد وسطی کے شہروں کو مذہبی، معاشی اور سیاسی شہروں کی شکل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ سیاسی شہروں کی ترقی کافی حد تک اس سیاسی طاقت کی حالت پر انحصار کرتی تھی جس سے وہ طاقت حاصل کرتا تھا۔ مذہبی اور معاشی شہر نسبتاً زیادہ محفوظ اور مستحکم تھے۔ وی۔ ڈی۔ دو یکر مذہبی شہروں کو 'دائمی' کہتے ہیں۔ کیوں کی ایسے شہروں کا اچانک عروج یا زوال ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ شہر جو اپنی طاقت تجارت اور پیداوار سے حاصل کرتے تھے کافی حد تک اپنے دور دراز علاقوں، تجارتی راستوں یا بندرگاہوں پر انحصار کرتے تھے۔ ان کی ہیئت میں کوئی تبدیلی یقینی طور پر اس شہر کی خاص ترقی کو متاثر کرتی تھی۔ مگر چونکہ وہ زیادہ تر خود دستگیر ہوتے تھے، اپنی داخلی طاقت کے سبب ہی زیادہ طویل عرصہ تک وجود بنائے رہتے تھے۔

سب سے زیادہ کمزور وہ شہر ہوتے تھے جو اپنی طاقت سیاسی سرپرستی کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔ سرپرست نے ہاتھ کھینچے نہیں کہ انکا زوال ناگزیر ہو جاتا تھا۔ ایسے سیاسی شہروں کے باشندے زیادہ تر چیدہ حکمراں طبقے اور حکمراں طبقہ ہوتے تھے۔ یہ زیادہ تر صارف طبقہ تھا۔ وی۔ ڈی۔ دُویکر نقل کرتے ہیں کہ سیاسی شہر الٹے اہرام کی شکل میں منظّم تھے جہاں پیدا کرنے والے طبقے نچلی سطح پر ہوتے تھے۔ ان کی دلیل ہے کی سیاسی شہر کے سر پر ہمیشہ کسی مناسب سیاسی تبدیلی کے نتیجہ میں ایک چھوٹے شہر یا گاؤں میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ منڈلاتا رہتا تھا۔ ایک سیاسی شہر کا انجام کسی صنعتی یا کاروباری شہر کی طرح بہت آہستہ آہستہ ختم ہونے کے مقابلے کافی اچانک ہوتا تھا۔ وجے نگر شہر کی بنیاد ایک سنسان علاقے میں رکھی گئی تھی۔ ریاستی سرپرستی کے تحت 16 ویں صدی میں اس کی غیر معمولی ترقی ہوئی اور اپنی ترقی کے انتہائی نقطہ پر جا پہنچا۔ مگر تالی کوٹ کی جنگ (1565) میں وجے نگر حکمراں کی شکست کے فوراً بعد ہی وہ مکمل کھنڈر ہو گیا۔ اطالوی سیاح کیسار فیڈر رچی جس نے جنگ کے فوراً بعد (1567) اس شہر کا دورہ کیا وجے نگر کی بربادی کے موضوع پر لکھتا ہے کہ کافی حد تک شہر جانوروں اور شیروں کا ڈیرہ تھا۔ اسی طرح بیجاپور، عادل شاہی حکمرانوں کی راجدھانی، جو وجے نگر کے کھنڈروں پر ابھرا تھا، اس علاقے میں مراٹھا طاقت کے ظہور کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے شہر میں تبدیل ہو گیا۔ پونے نے ایک چھوٹے سے گاؤں سے مراٹھاؤں کے عہد حکومت ایک ترقی پذیر شہر کا رتبہ حاصل کر لیا۔ نیز جس کو مراٹھاؤں نے اپنی حکومت کا اہم مرکز بنایا۔ اگر انگریزوں نے اس کو ممبئی پریسیڈنسی کی اپنی دوسری راجدھانی نہ بنایا ہوتا تو اس کا بھی وہی حشر ہونا یقینی تھا۔

کے۔ این۔ چودھری نے مغل شہروں کو کارعمل کی درجہ بندی کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے۔ (1) اہم شہر (Primate cities) یہ مکمل سلطنت کو متاثر کرتے تھے (2) علاقائی شہر، کسی خاص علاقے کے مرکز اور (3) صوبائی اور ضلع شہر، ان کا زیر اثر حلقہ اور میدان کار، اپنے اپنے صوبے اور ضلع (پرگنے) ہوتے تھے۔ کے این چودھری سبھی راجدھانی شہروں، آگرہ، دہلی، لاہور، پٹنہ، برہانپور اور احمد آباد کو اہم شہروں کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق ان درجوں کا معاشی کردار یہ ضروری نہیں کہ مختلف ہو۔ ان کا خیال ہے کہ مغل حکومت کے اقتدار کے انتہائی عروج میں ان ترقی یافتہ شہروں کا کردار سیاسی تھا ان کا جنگی یا فوجی نظر سے اہمیت ثانوی تھی۔ مگر محافظ فوجی شہروں کا سلسلہ بھی تھا، جیسے گوالیار، الہ آباد، چنار، اورنگ آباد، جنار جو فوج کو سلطنت چلانے میں اہم فوجی طاقت مہیا کراتے تھے۔ (یہ) اہم طفیلی شہر (Satellite Primate Cities) سیاسی اطلاعات کا تبادلہ کرتے ہوئے مرکزی مقامات کی شکل میں کام کرتے تھے۔

سرحدی شہر سرہند، جنگی فوجی اہمیت کے شہر کے عروج وزوال کی حالت بیان کرتا ہے۔ پاک پٹن۔فصلکا۔سمانا راستے کے زوال کے ساتھ ہی سرہند اہمیت کے ساتھ ابھرا۔ایک بار دہلی لاہور شاہراہ کو اہمیت مل جانے کے بعد سرہند نے ایک خاص مقام بنالیا اور جلد ہی پنجاب میں لاہور کے بعد دوسرے بڑے شہر کا درجہ حاصل کرلیا۔محمد تغلق اور فیروز تغلق کے حفاظتی منصوبہ میں سرہند کو خاص جنگی فوجی مقام حاصل ہوا۔ فیروز تغلق نے سرہند کو سمانا کی شق سے جدا کر دیا۔اور اس کے قلعہ کی مضبوطی اور مرمت کرائی اس نے ایک نہر بھی کھدوائی اور اس کو سرہند تک لے آیا۔سرہند محمد تغلق کی شمالی مہموں کے لئے فوجی اہمیت کا مقام بھی بنا شمال کے پہاڑی علاقے سے قربت نے اس کو چینی اور تبتی چیزوں کی آمد کے لئے خاص طور پر اہم مقام حاصل کروایا مگر مغل حکومت کے زوال کے فوراً ہی بعد خصوصاً اس علاقے میں سکھ اقتدار کے طلوع کے ہمراہ ہی سرہند کا بھی زوال ہوگیا۔

20.5 شہرکاری: کچھ نظریات

آر۔ریڈ فیلڈ اور ایم۔بی۔سنگر کا خیال ہے کہ عمومی طور پر ہندوستانی شہروں کی ترقی سیاسی انتظامی اور تہذیبی اہمیت کی بنا پر ہوئی اور ان کے تجارتی اور صنعتی کارنامے غیر اہم ہیں۔

حمیدہ خاتون نقوی نے عہد وسطی کے ہندوستانی شہروں کی ترقی میں سیاسی استحکام کی اہمیت پر زور دیا ہے۔وہ کہتی ہیں کہ زیادہ مرکزیت پسند صوبے جنگی بنیاد، لاہور، دہلی یا آگرہ میں تھی، نے شہری ارتکاز میں قابلیت حیات اور برداشت میں اضافہ کیا۔عہد وسطی کے ہندوستانی شہروں کا عروج وزوال کافی حد تک مرکزی سیاسی اقتدار کی طاقت اور کمزوری پر منحصر تھا۔غزنوی کے عہد حکومت تک لاہور کو ایک اہم مقام کا درجہ حاصل رہا۔وہاں ایک قلعہ موجود تھا جہاں سلطان اپنا دربار لگایا کرتا تھا۔مگر فیروز تغلق کے منصوبوں میں لاہور عملاً باہر تھا نتیجتاً یہ شہر اُجڑ کر کھنڈر کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔اس کے عہد حکومت میں حصار فیروزہ، سمانا، لدھیانہ، بہلول پور، سلطان پور اور سرہند وغیرہ نے خوب ترقی کی۔ان شہروں کو اس کی سرپرستی حاصل رہی۔مگر مغلیہ عہد میں لاہور نے اپنا گم کردہ مقام اور آبرو از سر نو حاصل کرلی۔لاہور عملی طور پر مغلوں کا تقریباً دوسرا دارالسلطنت بن گیا تھا۔حمیدہ خاتون نقوی اس پر خصوصی زور دیتی ہیں کہ امن وسلامتی وپائیداری جو مغلوں کے عہد حکومت میں اس خطہ میں رہی اسی کے سبب لاہور نیز پنجاب کے دوسرے شہروں کو از حد ترقی نصیب ہوئی۔

کے۔این۔چودھری نے معاشی عقدوی ہونے کی حالت اور سیاسی وصف پر توجہ مرکوز کی ہے۔مغلیہ عہد کے کاروباری شہروں کو وہ تجارت کی اتباعی علامت (flag following the trade) کی شکل میں تعریف کرتے ہیں۔ان کے مطابق سیاسی مہارت ان کے معاشی مفادات کو محفوظ رکھنے کے واسطے ایک لازمی چیز تھی۔

ستیش چندر کہتے ہیں کہ سیاسی اتحاد کے نتیجے میں شہروں کی بے مثال ترقی کے نظریہ پر دراصل بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ان کی دلیل ہے کہ اگر ایسا تھا تو تغلق عہد حکومت کے بعد سیاسی طاقت کا انتشار کیوں شہروں کے زوال میں انجام پذیر نہیں ہوا؟ ستیش چندر اس کے مقام پر شہروں کے اضافہ کو زراعتی توسیع سے متعلق کرتے ہیں۔ان کی دلیل ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں جب سلطنت کا دائرہ گھٹ کر نصف پر ہی محدود رہ گیا اس وقت نئے شہروں کا وجود عمل میں آیا۔فیروز تغلق کے شہروں کے جال اور نئی تکنیکوں (فارسی چرخا وغیرہ) کے اثرات، نیز باغبانی کی وسعت، وغیرہ نے زراعتی میدان کی ترقی کی جانب قدم پھیلائے۔ستیش چندر کہتے ہیں کہ ہم آسانی سے افغانوں کو صرف جنگجو کہہ کر خارج نہیں کر سکتے ہیں بلکہ ترکوں سے مختلف، گاؤں میں آباد افغان یہ اشارہ کرتے ہیں کہ ان کو زراعت سے خاص دلچسپی تھی۔ستیش چندر 18 ویں صدی کے واسطے بھی یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ 18 ویں صدی کے دوران شہروں کے زوال سے متعلق شہادتیں زیادہ تر: ادبی روایات (شہر آشوب) میں منقول ہیں۔اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ دہلی کا زوال ہوا مگر صرف ایک اہم انتظامی شہر کی شکل میں ہی ہوا۔شاہ نواز خاں تحریر کرتا ہے کہ 1772 میں دہلی سبھی طرح کی دستکاریوں سے بھرپور ایک شہر تھا۔درگاہ قلی خاں اپنی مرقعہ دہلی میں شاہ جہان آباد شہر کے بارے میں بازاروں کے ٹھاٹ باٹ کا تذکرہ کرتا ہے۔چیتن سنگھ بھی ایسے شہری مرکزوں کے اضافہ کی بات کرتے ہیں جو اہم تجارتی شاہراہوں سے دور از خود ترقی یافتہ زراعتی علاقوں میں پیداواری مرکزوں کی صورت میں ظہور میں آئے۔

عرفان حبیب شہری زوال کو زراعتی بحران سے مربوط کرتے ہیں۔ 18 ویں صدی کے مغلیہ عہد کے شہروں کا زوال ہوا کیونکہ قصبوں اور شہروں کا وجود خصوصاً زراعت کی زائد پر ہی منحصر تھا۔ کے۔ این چودھری کا یہ بھی خیال ہے کہ معاشی وجود (شہروں کا) زائد پیدا کرنے کے لئے گاؤں کی صلاحیت اور جس طریقہ سے وہ تقسیم کیا جاتا تھا اس پر بھی منحصر تھا۔

ہینری پائرین نے عہد وسطیٰ کے شہروں میں اضافہ کو طویل دوری کی تجارت سے مربوط کیا ہے۔ ہندوستانی تناظر میں آر۔ ایس۔ شرما اپنی کتاب انڈین فیوڈل ازم (Indian Feudalism) میں ذکر کرتے ہیں کہ ابتدائی عہد وسطیٰ میں طویل دوری کی تجارت کی ترقی اور زوال شہروں کی ترقی اور زوال کی شکل میں انجام پذیر ہوئی (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں حصہ 2 اکائی II)۔ حالانکہ دیگر مؤرخین نے شہروں کے زوال سے متعلق اس دلیل کے بارے میں اپنا شک ظاہر کیا ہے۔

آئی۔ پی۔ گپتا شہر کاری کی ترقی اور شہروں کی ترقی میں انتظامیہ اور فوجی اسباب کے کسی بھی اہم کردار سے انکار کرتے ہوئے دلیل دیتے ہیں کہ گجرات میں سبھی اہم شہروں وقصبوں میں انتظامی اور فوجی اثرات معاشی سرگرمیوں کے تابع رہے۔ ان کے اندازہ کے مطابق گجرات میں بڑے شہری مرکزوں میں عموماً 80% یا 90% سرگرمیاں معاشی تھیں۔ 17 ویں صدی میں گجرات میں مذکور 33 قلعوں میں سے صرف 9 ہی چھوٹے بڑے شہروں میں قائم تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی اور تعلیمی مرکز بھی اہم طور پر پیداواری مرکز تھے۔ ان کے مطالعہ میں ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات کے شہر زیادہ تر پیداواری مرکز تھے یا پھر وہ جمع یا تقسیم مرکز تھے یا پھر وہ بندرگاہی شہر تھے۔ احمد آباد، سورت، بھڑوچ، کیمبے ایسے متعدد قسم کی سرگرمیوں ہی میں مشغول تھے۔ زیادہ تر قصبے جمع کرنے کے مراکز ہی تھے۔ اور ایسی اشیاء کو آگے بھیجنے یا تقسیم کرنے کے واسطے داخلی علاقوں (hinter land) کی شکل میں کام کرتے تھے۔ یہ شہر زیادہ تر مواصلاتی مرکزوں کے مقام یا اہم زمینی راستوں پر قائم ہوتے تھے۔ شاید ہی شہر، انتظامی مرکز ہونے کے سبب ابھرے ہوں بلکہ اس کے برعکس کاروباری مراکز کی شکل میں قابل اہم ہونے کی وجہ سے ہی شہروں کے اہم انتظامی مرکز کی شکل میں ابھرنے کے ثبوت ملتے ہیں۔ انکا بیان ہے کہ ترقی کی شرح، پیداواری مرکزوں اور بڑے شہروں میں نسبتاً تیز ہوتی تھی زیادہ چھوٹے شہر نسبتاً سست رفتار سے ترقی یافتہ بنے۔ گپتا کی دلیل ہے گجرات میں شہر کاری کا عمل 17 ویں صدی کے دوران ملک کے دیگر حصوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ تیز رو تھا۔

چیتن سنگھ نے بھی شہری مرکزوں کی معاشی بنیاد پر بھی زور دیا ہے اگر چہ ان کا خیال ہے کہ کچھ شہروں نے اپنی حیثیت اہم طور پر انتظامی شہروں کی شکل میں ہی پیش کی۔ پھلتے پھولتے پیداواری مراکز کے ساتھ ساتھ تجارتی اور ٹرانسپورٹ مقامات کی شکل میں بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا بیان ہے اگر چہ لاہور ایک اہم انتظامی شہر تھا اس کی اہمیت قابل ذکر پیداواری اور ایک اہم کاروباری سرگرمیوں کے مرکز کی شکل ہی میں تھی۔ یہ اہم زمینی راستے پر قائم تھا جو ہندوستان کو مشرق وسطیٰ اور ایران سے مربوط کرتا تھا۔ اسکی معاشی حالت مکمل طور پر مغل حکمراں طبقہ یا حکومتی سرپرستی پر منحصر نہیں تھی۔ وہ پنجاب کے علاقے میں شہری مرکزوں کی لامرکزیت کے رجحان پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی بھی معاشی طور پر اتنا اہم نہیں تھا کہ علاقے کی شہری دستکاری پیداوار پر قبضہ رکھ سکے۔ ایسی ترقی ان کے مطابق شہری تانے بانے میں اس زمانہ میں محیطی علاقوں (Peripheral regions) کے اتحاد میں معاون رہی۔

اگر چہ کے۔ این۔ چودھری نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ترقی یافتہ شہروں کا اہم کام سیاسی تھا۔ شہر کا درجہ حاصل کرنے کے لئے جن عناصر کی بات وہ کہتے ہیں زیادہ تر وہ معاشی ہیں۔ موافق جغرافیائی حالت، طویل دوری کے تجارتی راستوں کا میل کلی، (Convergence) موافق بازار وغیرہ۔

نہار رنجن رے اور ارن داس گپتا اسلام کے طلوع کو بنگال میں شہر کاری سے مربوط کرتے ہیں۔ مگر انیرودھ رائے کا خیال ہے کہ اسلام کاری سے متعلق نظریہ اور بنگال کے سمندری تجارت کی تجدید کو تسلیم کرنا امر مشکل ہے۔ کیونکہ بنگال پر بختیار خلجی کا حملہ 13 ویں صدی میں ہوا مگر مذکورہ صدی کے قبل ہمیں متعدد ترقی پذیر شہروں کی موجودگی دیکھنے کو ملتی ہے جیسے ہری کیلا، ناڈیا، وکرم پور، باکلا، لکشمن وتی۔ انیرودھ رے بنگال میں 17-12 ویں صدی کے دوران شہری مرکزوں کے ظہور کے دو اہم اسباب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (1) 15 ویں صدی کے دوران مرکزی حکومت کے زوال کے ہمراہ بے شمار نیم خود مختار

ریاستوں/حکومتوں کا ظہور دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس نے بے شمار شہری مرکزوں کے طلوع کی جانب اقدام کیا۔ جیسے چمپانیر، سونار گاؤں، پانڈوآ، لکھنوتی، چٹا گانگ وغیرہ (2) ندی کے راستوں میں تبدیلیوں کے نتیجے میں بھی شہروں کا عروج و زوال ہوا۔ پانڈوآ کی ترقی کا سہرا مہاننداکے راستے کی تبدیلی کو جاتا ہے جو قریب ہی بہنے لگی۔ اسی طرح لکھنوتی کے زوال کے پیچھے گنگا ندی کے بہاؤ کا مغرب کی طرف رخ کر لینا تھا۔ بھا گیرتی کے مزید مغرب کی جانب رخ کرنے کی وجہ سے گوڑ کا بھی انجام یہی ہوا۔

20.6 عہد وسطیٰ کے شہروں کی شکل وصورت

کے۔ ایم۔ اشرف ترکوں کے عہد حکومت میں شہروں کی بدلتی شکلوں کے دستور پر زور دیتے ہیں۔ ان کے مطابق شہروں کی شکل آہستہ آہستہ تبدیل ہونی شروع ہوگئی۔ پرانے ترکی شہروں میں نئی علامات منسلک ہوگئیں۔ مسجدیں، مقبرے، گنبد وغیرہ۔ کے۔ این۔ چودھری نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی تعمیری طرز تاثرات اہم طور پر بازاروں، بڑے عام چوراہوں اور شاہی محل منسلک مساجد تھیں۔ ان کا خیال ہے کہ شمالی ہند کے شہروں کی شکل میں اسلامی طرز تعمیر پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ جنوب اور مغربی ہند کے کچھ علاقوں میں ہندو اثرات اور خیالات حقیقت میں موثر تھے۔ یوروپی سیاح اکثر مسلم (Moorish) شہروں کی خصوصیات کی شکل میں بہت اونچے دروازوں، دیواروں، مساجد، باغوں اور حماموں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اس عہد میں شہری تعمیر کی ایک دوسری خصوصیت تھی، منصوبہ بند اور دیواروں سے محصور شہروں کا ظہور۔ دہلی کے سلطانوں میں فیروز شاہ تغلق سب کا پیش رو ہے جس نے عام طور پر شہر تعمیر کے منصوبے بنائے۔ اس نے کم از کم 17 شہروں اور قلعوں کی بنیادیں رکھیں۔ دہلی شہر کی علاقائی سرحدوں میں متعدد دارالسلطنتوں کی بنیادیں رکھیں۔ فیروز سے قبل، جس نے فیروز کوٹلہ تعمیر کرایا، سیری (1303 علاؤالدین خلجی) کیلوگڑھی (87-1286 کیقوباد، بلبن کا پوتا) اور تغلق آباد (1322 غیاث الدین تغلق) وغیرہ دارالسلطنت شہر دہلی کے دائرہ میں بنائے جا چکے تھے۔ مغلیہ عہد میں دہلی میں اور اس کے آس پاس بتدریج راجدھانیاں تھیں: دین پناہ (ہمایوں)، پرانا قلعہ (شیر شاہ) اور آخر میں شاہ جہاں کی عظیم توسیع، شاہ جہاں آباد۔ ان سبھی راجدھانی شہروں کی عام خصوصیات تھیں: (ا) مقام کا انتخاب کرتے وقت دو اہم پہلوؤں کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ حفاظتی/ دفاعی اور پانی کی فراہمی۔ یہاں تک کہ فیروز شاہ کے عہد حکومت ہی میں حصار فیروزہ میں اپنی نئی شکار سیر گاہ بناتے وقت فیروز نے پانی کی فراہمی یقینی بنائی اور اپنی مشہور مغربی جمنا نہر کے توسط سے جمنا ندی سے حصار فیروزہ تک ندی کا پانی لایا۔ فیروز کے ذریعہ غیاث الدین تغلق کے تغلق آباد کو ترک کرنے اور اپنی نئی راجدھانی (فیروز شاہ کوٹلہ) بنانے کے پس منظر میں اہم وجہ اس علاقہ میں پانی کا فقدان ہی ظاہر ہوتا ہے۔ شاہ جہاں نے بھی شاہ جہاں آباد بنواتے وقت پانی کی مناسب فراہمی یقینی کی تھی۔ محمد صالح کمبوہ ''عمل صالح'' میں لکھتا ہے کہ شاہ جہاں کے ذریعہ اپنی راجدھانی فتح پور سیکری/ آگرہ سے دہلی منتقل کرنے کے پیچھے اہم سبب گرم موسم اور پانی کی کمی ہی تھی۔ شاہ جہاں نے نہ صرف فیروز شاہ کی مغربی نہر از سر نو کھدوائی بلکہ اس کو 30 کروہ (75 میل) کا مزید اضافہ کر دیا اور چاندنی چوک کے وسط سے گذرتی خوبصورت پانی کی چینل بھی تعمیر کرائی جو قلعہ کے اندر تک جاتی تھی۔ (2) سبھی سرکاری طور پر آباد شہر/ راجدھانیاں منصوبہ بند تھیں اور ان کی عمدہ مورچہ بندی کے لئے اہتمام یقینی بنائے گئے تھے۔ قلعے کے احاطہ میں چوڑے گلیارے، بازار/خرید فروخت کے مرکز وغیرہ بھی ہوتے تھے۔

قلعہ کے اندر کے شاہی محلوں کے علاوہ، شہر میں امراء کے مکانات، بازار، منڈیاں، تاجروں کے رہائشی مقام، دستکاروں کے گھر، مزدوروں کے گھر، مسجدیں، مندر، سرائے، دھرم شالہ، شمشان گھاٹ، قبرستان، باغات، تالاب، کنویں، مذبح خانے وغیرہ ہوتے تھے۔ عموماً باغات، تالاب، قبرستان، مذبح خانے، وغیرہ شہر کے وسط میں قائم نہیں ہوتے تھے۔

قصبہ متعدد کوچوں (گلیوں) اور محلوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ اس طرح ہر محلّہ میں مختلف دستکاروں، پیشوں اور ذاتوں کے لوگ رہائش پذیر ہوتے تھے۔ اس طرح کی تقسیم کبھی مذہبی تعلقات پر قائم ہوتی تھی، ایسا نہیں محسوس ہوتا۔ اسی طرح ہر کوچہ خصوصی دستکاروں/ صارفین اشیاء کی فروخت کے واسطے مشہور تھا۔ دہلی (شاہجہاں آباد) کے چاوڑی بازار میں ابھی تک تانبہ اور پیتل کے برتنوں کی دکانیں موجود ہیں۔ جامع مسجد کے نزدیک پائی والان علاقہ پتاخوں کی فروخت کے واسطے مشہور ہے۔

Hyderabad

مغل قصبہ فرخ آباد شہر: 1714 عیسوی

1126ھ (6 جنوری 1714 ۔ 27/دسمبر 1714) میں سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ فرخ آباد یا محمد آباد میں قائم سبھی عمارتیں منصوبہ بند طریقہ پر تعمیر کی گئیں تھیں ۔ اور یہ آدم، ۔۔۔۔ راج مستری کی نگہداشت میں تھیں ۔ شہر کے 12 دروازے تھے (1) قطب دروازہ، (2) پائین دروازہ (حسینی دروازہ کے نام سے بھی شہرت یافتہ) (4) گنگا دروازہ (5) امیٹھی دروازہ (6) قادری دروازہ (7) لال دروازہ (8) مدار دروازہ (9) دھالا وال دروازہ (10) کھانڈیہ دروازہ (11) جسمئی دروازہ (12) ترائین دروازہ اور (13) مئو دروازہ ۔ 7 دروازوں سے سرائیں مربوط تھیں تاکہ کوئی مسافر کسی بھی طرف سے آئے اس کو ایک سہولیات سے معمور آرام گاہ مل جائے ۔ ہر ایک دروازے پر 500 اسلحہ بردار فوجی اور 2 توپیں (دونوں طرف ایک ایک) تعینات رہتی تھیں ۔ نواب کے بیٹوں اور غلاموں (خانہ زاد) کو جو کہ کرایہ پر فوجی جوان رکھتے تھے، شہر کے باہری حصے کے آس پاس ان کو حویلی بنانے کی جگہ عطا کر دی جاتی تھی ۔ یہ خیال رکھا گیا تھا کہ صراف، تاجر، مزدور طبقہ کو شہر کے وسط میں جگہ ملے ۔ یہ سب (شہر) ایک مٹی کی دیوار کے ذریعہ محصور تھا ۔ اپنے 22 لڑکوں میں سے ہر ایک کے واسطے محمد خاں نے اینٹوں کے قلعہ اور خواتین کے کمرے بنائے ۔ ہر مکان میں ایک ذاتی باغیچہ (خانہ باغ) لگوایا جو ایک اونچی دیوار سے محصور تھا ۔ شہر کی چہار دیواری کے چاروں جانب ایک کھائی کھودی گئی تھی ۔ جس کے کنارے ڈھلوان اور مسطح ہوتے تھے جو 5 گز چوڑی اور 30 فٹ گہری تھی ۔ جب تک محمد خاں زندہ رہا اس کھائی کی روزانہ صفائی کی جاتی تھی اور دروازوں کو درست حالت میں رکھا جاتا تھا ۔

قلعہ کے آس پاس چیلوں کے گھر بنے ہوئے تھے جو کہ دن رات ڈیوٹی پر تعینات رہتے تھے ۔ بے شمار چھوٹے باغیچہ لگائے گئے تھے جو خصوصاً قابل ذکر تھے ۔ قلعہ کے نیچے نولکھا نیز بہار باغ تھا جن میں کوئی بھی عام درخت نہیں تھا بلکہ پورے باغات میں امرود، بیر، شریفہ، اور سنترے کے درخت لگے تھے ۔ نواب کے بیٹوں اور چیلوں کو حکم دیا گیا تھا کہ شہر کے باہر جہاں چاہیں چھوٹے باغات لگا سکتے ہیں ۔ مٹی آم کے باغات کے واسطے مناسب ہے اور یہاں آم بہت اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے ۔ تربوز بھی بہت بڑے بڑے اور میٹھے اور عمدہ ہیں ۔

دو گاؤں مکمل طور پر، بھیکم پور اور دیو تھان، دیگر گاؤں کے حصہ کے علاوہ شہر کی چہار دیواری سے گھرے تھے ۔ یہ کوشش کی گئی تھی کہ ہر سامان تجارت کا ایک جداگانہ بازار ہو ۔ اس کے موافق وہاں کے محلوں کے نام تجارتوں کے نام پر دیکھنے میں آتے ہیں ۔ جیسے کسرہاٹ (ٹھیرہ)، پسرہاٹ (دوائی فروش) صرافہ (مہاجن)، لوہائی (لوہا تاجر)، نمہائی (نمک فروش)، کھنڈائی (چینی کے تاجر) وغیرہ وغیرہ ۔ دیگر محلوں کو ذاتوں کے واسطے مخصوص رکھا گیا تھا جیسے کھٹ رانہ، (کھتریوں کے واسطے)، موچیانہ (موچیوں کے/ جوتا ساز کے لئے) کولیانہ (ہندو بنکروں کے لئے)، سادھوواڑہ (سادھوؤں کے لئے) بامن پوری (برہمنوں کے واسطے) جولاہا پوری (مسلم بنکروں کے لئے) رستوگی محلّہ، اگروال محلّہ، کاغذی محلّہ (کاغذ تیار کرنے والوں کے لئے) مہاجن پورہ، بنگش پورہ، کھٹک پورہ، سید پورہ، وغیرہ وغیرہ ۔

ایس ۔ ایم ۔ ولی اللہ، تاریخ فرخ آباد، ولیم اروِن، دی بنگش نواب آف فرخ آباد: اے کرونیکل (1713-1857)، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال حصہ IV، 1878، صفحہ 280-278 ۔

ان کوچوں کے نام یا تو کسی مشہور فرد یا کسی دستکاری کے نام سے موسوم ہوتے تھے ۔ جیسے کہ گاندھی گلی (عطر فروش) یا کوچۂ بلاقی بیگم، کوچہ بتاشہ والا جسے آج تک بھی بتاشے والی گلی کہا جاتا ہے ۔ (شاہ جہاں آباد دہلی) ۔

محلوں کے نام کسی مشہور ترین فرد یا کسی دستکاری کے نام پر پڑ جاتا تھا ۔ محلّہ چوڑی گران (چوڑی فروش)، محلّہ دھوبی والا (کپڑے دھونے والا) ۔ کچھ علاقوں کا نام اس علاقہ کی کسی مشہور نشان کے نام پر پڑ جاتا تھا جیسے چاہِ رہٹ (فارسی رہٹ والا کنواں شاہجہاں آباد دہلی) ۔

چاندنی چوک، شاہ جہاں آباد

چاندنی چوک شہر کا سب سے خوبصورت اور بہ افراط طور پر مزین گلیارہ ہے۔ یہ سیر و تفریح کے واسطے ایک لطف اندوزی کا مرکز ہے اور خواہشمند خریداروں کے واسطے نایاب چیزوں کی ایک گیلری ہے۔ وسیع طور پر کپڑے اور دیگر اشیاء کی مختلف قسمیں فروخت کے لئے نمائش کی جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے مختلف حصوں سے لائی گئی نایاب چیزوں سے بازاروں کا گوشہ گوشہ معمور ہوتا ہے۔ راستے کشادہ پیشانی کی طرح وسیع اور خدا کے فضل کے مانند فیاضی سے پر ہیں۔ نہریں اچھی اور صاف پانی سے معمور ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ وہ جنت میں رواں ہو۔ بدخشاں سے برآمد لعل، موتی اور ہیرے دکانوں کی رونق میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کے کاؤنٹر موتیوں سے اور قیمتی پتھروں سے مکمل بھرے رہتے ہیں۔ دکان کے مالک گلیارے کے ایک طرف خوش و مسرت کی حالت میں نشستیں لگائے رہتے ہیں، جبکہ ان کے ماتحت دکان کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ دوسری جانب کپڑے کے تاجر بھی خریداروں کا خیال اپنی جانب مبذول کرانے کے واسطے بار بار اپنے مغنی لہجہ میں تکرار کے ساتھ خریداروں کو متوجہ کرنے کی از حد کوشش کرتے ہیں۔ پورے دن وہ یک طرفہ گفتگو میں مشغول رہتے ہیں۔ چاہے کسی کی اس میں دلچسپی ہو یا نہ ہوا، ان کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں۔ عطر اور عرق کی بھی متعدد قسمیں فروخت کرتے عطار یا عطر فروش اپنے ایجنٹ اور شیریں آوازوں کی مدد سے زور شور سے تجارت کرتے ہیں۔ ان کے عطر کے خواہش مندوں کے دماغ پر خاص اثر چھوڑتے ہیں۔ جوان کے دکانداروں کی جانب بغیر کسی اشارہ سے بلائے بغیر کھینچے ہے۔ ان محراب دار اور زرق برق تلواروں میں دل کھو جاتا ہے لیکن ذرا ہشیاری سے۔۔۔۔۔ تیز دار پر کہیں آپ کا ہاتھ پھسل کر لہولہان نہ ہو جائے۔ ان سانپ نما خنجروں کو دیکھ کر دل یہ چاہتا ہے کہ دشمن اگر ہمارے نزدیک ہو تو فوراً وار کر دیا جائے۔ لہٰذا ان سے دوری بنائے رکھنا زیادہ بہتر ہوگا۔ دل پر کتنا ہی قابو رکھیں یہاں چینی مٹی کے برتن اور کانچ کے رنگین اور آب زر سے تیار شدہ متعدد قسموں کے حقوں پر دل آ ہی جاتا ہے۔ کٹورے، جگ، اور خوبصورت بنے شراب کے برتن دکانوں میں نمایاں طور پر لگائے جاتے ہیں جو کہ ایک بوڑھے ضعیف العمر متقی پرہیزگار کو بھی شراب نوشی پر آمادہ کر دیں۔ سڑکوں پر کھڑے پھیری والوں کے پاس فروخت کرنے کے واسطے اتنی عمدہ اقسام کے کپڑے ہوتے ہیں کہ ان کے مقابلہ دکانداروں کا مال بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ شاید امراء لوگوں کی حویلیوں میں بھی ایسی اشیا نایاب ہوں گی۔ اس کے علاوہ شام کے وقت جب سورج اپنا سرخ رنگ بکھیرتا ہے تو جو عکس بین کے رنگ اور شکلوں کے مشابہ منظر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں وہ شاید باغات کی سیر سے بھی نصیب نہ ہو۔

چوک کے آس پاس متعدد قہوہ خانے ہیں۔ جہاں سخن ساز اور شاعر بیٹھے دیکھے جاسکتے ہیں جو کہ اپنی نظمیں یا اشعار پڑھتے دکھائی پڑیں گے اور موجود سامعین سے داد حاصل کر رہے ہوں گے۔ امراء طبقات چاہے وہ کسی بھی درجہ کے ہوں یہاں کی سیر کی خواہش دبا نہیں پاتے۔ اس بازار میں موجود نایاب اور اعلیٰ قسم کی چیزوں کو کوئی یکبارگی خریدنے پر قادر نہیں چاہے کسی کو قارون (حضرت موسیٰ پیغمبر کے زمانہ کا ایک بہت مالدار بخیل آدمی) کا خزانہ بھی کیوں نہ حاصل ہو۔

ایک متوفی امیر کا بیٹا اس چوک کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ماں نے (مزید دولت دینے میں) بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے اس کو اسکے باپ کی متروکہ دولت سے میں ایک لاکھ روپے دیئے (اس نے کہا) اس قلیل دولت سے اس چوک سے نایاب قسم کی چیزیں نہیں خریدی جاسکتیں، مگر پھر بھی وہ وہاں جانے کی ضد اختیار کر چکا ہے تو اس کو اس کی پسند کی کچھ ضروری اشیاء ضرور مل سکتی ہیں۔

درگاہ قلی خان، مرقعہ دہلی، (40-1739)، مترجم چندر شیکھر اور شمع متراچنائے، دہلی، 1989، صفحہ 25-23۔

بڑے بازار علاقوں کو چوک کہا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر دہلی میں چاندنی چوک، جبکہ چھوٹے بازار علاقوں کو بازار کہا جاتا تھا مثلاً جوہری بازار (ہیرے فروخت کرنے والے تاجروں کا بازار) وغیرہ۔ اسی طرح پرچون اور تھوک چیزوں کے بازاروں کو گنج کہا جاتا تھا (مثال کے طور پر دریا گنج، دہلی)۔ دکا کن لفظ دکانوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، مثلاً دکا کن بساطیان (عام تاجر)۔ اس طرح منڈی کا مطلب تھوک بازار تھا۔ مثلاً سبزی منڈی (سبزی بازار)، منڈی گل فروش (پھول بازار)۔ کٹرہ تھوک بازار یا گودام یا ذخیرہ کے لئے مستعمل تھا۔ شہروں میں چھتے بھی ہوتے تھے۔ اس کا لفظی مطلب تھا ڈھکی ہوئی گلی/کوچہ، مگر یہ

ایسی جگہوں کی طرف نشاندہی کرتے تھے جہاں مخصوص دستکاری سے وابستہ کاریگر سکونت پذیر ہوتے تھے۔ چھتہ موم گران (موم ساز)، چھتہ معماران (راج مستری) وغیرہ۔ عموماً ممکن طور پر حفاظت کے لحاظ سے ہر محلے، کٹرے یا بازار میں داخلہ کا دروازہ ایک ہی ہوا کرتا تھا۔

جنوبی ہند میں ہر ایک نگر میں ''انگڈی'' (عارضی دکان) ہوا کرتی تھی۔ جہاں خرید و فروخت مستقل بنیادوں پر رائج تھی جبکہ کڈی ایسی جگہ ہوتی تھی جہاں اپنے طبقے سے باہر کے لوگ فروخت کرنے کے واسطے مال خریدتے تھے۔ ان بازار مراکز میں موسمی میلے (قلولم) منعقد کئے جاتے تھے۔

رہائشی احاطوں میں ایک طرح کی درجہ بندی نظر آتی ہے۔ حویلی ایک رہائشی احاطہ تھا جس میں ہوتا تھا: ایک داخلہ کا دروازہ (ڈیوڑھی) صحن، رہائشی علاقہ (سرس محل)، بالا اور جلاؤ خانہ (اوپری منزلیں)، دفتر (دیوان جانہ)۔ کچھ حویلیوں میں (برج) بھی ہوا کرتے تھے۔ نچلے سماجی درجہ کے لوگوں کے گھروں کو عام مکان کہا جاتا تھا۔ کوٹھی لفظ کا استعمال کسی یوروپی کمپنی کی فیکٹری کے طور پر ہوتا تھا اور کبھی اعلیٰ طبقات کے رہائشی گھروں کے لئے بھی۔ ہمارے عہد مطالعہ میں بنگلہ یا منازل جیسے الفاظ کا استعمال کہیں اتفاق سے ملتا ہو۔ ان الفاظ کو برطانوی عہد حکومت میں شہرت ملی تھی۔

نجی باغات کا تصور شاید ہی کہیں موجود تھا۔ حالانکہ تفریحی مقامات کی شکل میں شاہی اور امراء طبقوں کے ذریعہ باغات لگوائے جاتے تھے۔ خود دہلی کے اندر ہی امراء کے ذریعہ باغ بنوائے گئے جیسے کے اورنگ زیب کی بہن کے ذریعہ بنوادیا گیا روشن آرا باغ۔

سورت کے گھروں پر تھیونات کا تذکرہ

اس شہر کے گھر جہاں پر باشندے دولت خرچ کرنے کے خواہش مند رہا کرتے تھے، ایسے فلیٹ ہیں جیسے فارس (ایران) میں ہوتے ہیں اور اکثر سلیقہ سے تعمیر شدہ نظر آتے ہیں۔ مگر وہ کافی گراں قیمت ہوتے ہیں، کیونکہ اس ملک میں وہ خاص پتھر نہیں پیدا ہوتا جس کے سبب ان کو اینٹ اور چونا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کافی مقدار میں ان میں عمارتی لکڑی کام آتی ہے جو کہ بحری راستوں کے ذریعہ دمن سے درآمد کی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس ملک کی لکڑی جو بہت دور سے لائی جاتی ہے زمینی نقل و حمل کی وجہ سے کافی مہنگی پڑتی ہے۔ اینٹ اور چونا بھی بہت مہنگے ہیں۔ اور کوئی آدمی اگر سادہ سا مکان بھی تعمیر کرے تو اس کو تو کم از کم 500 یا 600 لیور (400=Livers مغل روپے) اور اس کا دوگنا قیمت کا چونا استعمال میں آتا ہے۔ مکان نصف گول اور آدھے انچ موٹی کھپریل سے ڈھکے ہوتے ہیں جس سے کہ وہ استعمال کے وقت صرف سفید نظر آتی ہے اور زیادہ دیرپا بھی نہیں ہوتی اور اسی سبب سے تعمیر کرنے والا بھی دوہری چنائی کرتا ہے اور ان کو ثابت ہی لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ بید Canes جس کو وہ بانس (Bambous) کہتے ہیں۔ کھپریل کو باندھنے میں لکڑی کی پٹی کا کام کرتا ہے اور کھپچیوں سے بنا جال جو کہ اس پوری چھت کو بنیاد فراہم کرتا ہے، صرف گول عمارتیں لکڑی سے بنا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مکان صرف امیروں کے واسطے ہی تعمیر کئے جاتے ہیں مگر جن مکانوں میں نچلے درجے کے لوگ سکونت پذیر ہیں، بید کے بنے ہوتے ہیں اور تاڑ کی پتیوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔

اب بارش کے وقت ہندوستان میں تعمیری کام کرنا بہتر ہوتا ہے، اس کے بعد صاف موسم میں، کیونکہ گرمی اتنی شدت کی ہوتی ہے اور دھوپ کی تپش اتنی تیز ہوتی ہے جب آسمان صاف ہوتا ہے کہ ہر چیز جمنے سے قبل ہیں خشک ہوجاتی ہے اور ایک ہی لمحہ میں چیخ جاتی ہے نیز اس میں شگاف بھی پڑ جاتا ہے جبکہ بارش اس سخت گرمی کو کم کردیتی ہے اور سورج کی تیز شعاؤں میں خلل ڈال کر راج مستری کے ذریعہ کئے گئے کاموں کو خشک ہونے کا وقت بھی مل جاتا ہے۔ بارش ہوجانے پر کام کرنے والے کو اپنے کام پر موم جامہ (برساتی) ڈالنے کے علاوہ کوئی زیادہ مشقت اٹھانی نہیں پڑتی۔ لیکن خشک موسم میں اس کا کوئی علاج ممکن نہیں ہو پاتا صرف اتنا ہی کیا جاسکتا ہے کہ کام پر گیلی کھپریل اتنی تیزی سے لگائی جائے کہ اس کا آخری سرا بننے سے پہلے ہی اس کو لگادیا جائے مگر وہ اتنی جلدی خشک ہوجاتی ہے کہ اس سے بس ذرا سی ہی سہولت مل سکتی ہے۔

دی انڈین ٹریولس آف تھیونات اینڈ کریری، (مرتبہ) ایس۔ سین، نئی دہلی، 1949، صفحہ 23-22۔

پٹنہ، دہلی، برہانپور وغیرہ میں کافی حدتک عام لوگوں کے گھر، جیسا کہ غیر ملکی سیاحوں نے نقل کیا ہے، چھپر یا بانس سے بنے ہوتے تھے۔ ڈھاکہ میں بڑھیوں اور کشتی سازوں کے سادہ گھروں کی افراط تھی۔ مگر بنارس کی اینٹ اور پتھر کے بنے بڑے اور عمدہ تعمیر کئے گئے گھروں کے واسطے تعریف کی جاتی تھی۔

کے۔ این چودھری تغیر پذیر (Floating) عوام کو مغل شہروں کی ایک خاص خصوصیت مانتے ہیں۔ سورت جیسے بڑے شہروں میں کافی مقدار میں تغیر پذیر آبادی تھی۔ سورت کچھ مخصوص زمانہ میں بے شمار لوگوں سے بھر جاتا تھا، خاص کر جہازوں کی روانگی کے وقت کے آس پاس (جنوری - مارچ)۔ بابر نے بھی ہندوستانی شہروں کی خصوصی نوعیت کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے:-

> ہندوستان میں چھوٹی بستی اور گاؤں ۔۔۔۔۔ ایک ہی لمحہ میں خالی ہو جاتے ہیں یا پھر آباد ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی بڑے شہر کے آدمی جہاں وہ سالوں سے آباد ہوں وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ تو وہ یہ کام اس طرح کرتے ہیں کہ ایک یا ڈیڑھ دن ہی میں وہاں ان کی کوئی نشانی باقی نہیں رہتی۔ دوسری جانب اگر وہ اپنی آنکھیں جگہ پر گاڑ لیں جہاں ان کو آباد ہونا ہے ۔۔۔۔۔ ان کو گھر تعمیر کرنے یا دیواریں کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش کرتی۔ خس کی گھاس کافی تعداد میں میسر ہے، لکڑی بھی غیر محدود ہے، جھونپڑیاں کھڑی کر لیتے ہیں اور آناً فاناً گاؤں یا شہر آباد ہو جاتا ہے۔
>
> ظہیر الدین بابر، بابر نامہ، مترجم، اے۔ ایس۔ بیورج، نئی دہلی، 1970 ص، 88-487۔

شہر کے خاکہ سے متعلق ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ شہر کے باشندوں کا تقسیم پیٹرن۔ شہر میں زیادہ تر حکمراں طبقہ / انتظامیہ طبقہ۔ کارخانہ دار اور دستکار، تاجر، ماہرین تعلیم وغیرہ رہتے تھے۔ شہری مرکزوں میں متوسط طبقہ کے لوگ ہی کافی تعداد میں آباد تھے اور عملی طور پر شہری زندگی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ حمیدہ خاتون نقوی کی دلیل ہے کہ جب تک شہری متوسط طبقہ امن وشانتی اور تحفظ میں اپنے مختلف کاموں اور پیشوں کو انجام دیتا رہا شہر پھلتے پھولتے رہے۔ مگر یہ شہری متوسط طبقہ شہروں میں قانون وانتظام کی بگڑتی صورت حال کی خبر ملتے ہی حکومت اور اختیارات سے محروم ہو کر نسبتاً محفوظ گاؤں کے دائرہ میں پناہ لینے کی کوشش کرتا تھا (ثقافتی میدانوں میں اس طبقہ کے تعاون کے لئے ہمارا نصاب ایم۔ ایچ۔ آئی۔ 06 دیکھیں)۔ جی۔ ڈی۔ شرما کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ مغربی راجستھان میں حکمراں چیدہ طبقہ کے علاوہ کافی حدتک راجپوت اور مسلمان، مہاجن، بنیا، کائستھ بھی شہری ساخت کے اہم حصہ میں شریک تھے۔ لیکن دستکار اعلیٰ درجہ شاید ہی حاصل کر پاتے ہوں اور زیادہ تر نچلی ذاتوں کے طبقے ہی میں شامل کئے جاتے تھے۔ ان دستکاروں میں جولاہا (مسلم) اور بنکر (ہندو) ایک بڑے حصہ کی تعمیر کرتے تھے۔ تعداد میں دوسرے مقام پر تھے جوتا ساز۔ ان کے علاوہ سنار، لوہار، تیلی وغیرہ ہوتے تھے۔ یہ پیٹرن شہری مرکزوں میں کپڑے کی پیداوار کے بڑھتے ارتکاز کو ظاہر کرتا ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ جی۔ ڈی۔ شرما کے تجزیہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بیرونی آدمی یہاں، سوداگر اور ملتانی بھی جو خاص تجارتی طبقات میں سے تھے شہری خاکہ میں انکو اونچا مقام حاصل نہیں تھا۔

برنیر نے مغل شہروں کا ذکر خیمہ جاتی شہروں (camp cities) ایک فوجی چھاؤنی (military encampment) کی شکل میں کیا ہے۔ برنیر کی طرح اسٹیفن پی۔ بلیک بھی شاہ جہاں آباد (دہلی) کا بھی ذکر عظیم خیمہ کے طور پر کرتے ہیں جس کی آبادی گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ جب بادشاہ اور اس کا امراء طبقہ شہر میں قیام پذیر ہوتا تو عام آبادی فوراً جمع ہو جایا کرتا اور جب یہ خیمہ شہر میں نہیں ہوتا تو وہ لوگوں سے خالی محسوس ہوتا تھا۔ تھیوناٹ ذکر کرتا ہے کہ بادشاہ کے قیام کے دوران گلیوں میں عام ازدھام نظر آتا ورنہ وہ کوئی ریگستان کا نظارہ پیش کرتا۔ دہلی یا ایسے دوسرے راجدھانی شہروں کو صرف فوجی خیمہ کہنا شاید مبالغہ آمیزی ہوگی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شاہ جہاں آباد قلعہ کی تعمیر کے بعد راجدھانی کے شکل میں دہلی نے اہم مقام حاصل کیا تھا۔ مگر اس سے قبل بھی دہلی میں بڑے تجارتی طبقہ کی موجودگی تھی۔ برنیر خود تاجروں اور ان کی رہائشوں کا واضح تذکرہ کرتا ہے مالدار تاجر، منصب دار، ماتحت امراء، عدلیہ کے افسران وغیرہ ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ عام تاجر اپنے مال گودام کے اوپر ہی اپنے گھر بنا کر رہتے تھے جو کہ چھتہ (arcades) کے عقبی حصہ میں ہوا کرتا تھا۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE
IMC
LIBRARY
Hyderabad

مغل راجدھانی شہرشاہ جہاں آباد کے خاکہ پر تنقید کرتے ہوئے اسٹیفن پی۔ بلیک نے اس کا تجزیہ ''موروثی عمال (ضابطہ پرست) ریاست/ راجدھانی'' کی شکل میں کیا ہے۔ ان کے مطابق یہ خودمختار شہر ایک خاص شکل میں وسیع موروثی خاندان تھا۔ بادشاہ رسمی طور پر سماج پر اقتدار رکھتا تھا۔ بلیک نے اس کا مقابلہ قبل عہد جدید موروثی عمال (ضابطہ پرست) راجدھانی کے ایک علاقائی جداگانہ شکل میں کیا ہے۔

20.7 شہری انتظام کا پیٹرن

عہد وسطیٰ کے شہروں کے انتظام کے پیٹرن کا مطالعہ دو سطحوں پر کیا جاسکتا ہے اول بذات خود اداروں کے حوالہ سے انتظام۔ یہ زیادہ تر شکل میں رسم ورواج اور سماجی روایات کے ذریعہ مقرر کیا جاتا تھا۔ جب کہ دوسرا ریاست کے مقررہ اصولوں اور ریاست کے ذریعہ مقرر افسران کے ذریعہ منظم شہر ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے اسکو ریاست کے اقتدار کا تعاون حاصل ہوتا تھا۔

میکس ویبر مغربی (یوروپی) مشرقی (ایشیائی) شہروں کے درمیان اس بنیاد پر فرق کرتا ہے کہ شہری (Civic) گروپ صرف مغرب میں ہی موجود تھا۔ مشرقی شہروں میں دستکاروں کا درجہ مدنی (Corporate) نہیں تھا اور وہ زیادہ تر ریاستی سرپرستی پر ہی منحصر ہوتے تھے۔ اس طرح ان کی ریاستی اقتدار کو چھوڑ کر کوئی جداگانہ شناخت نہیں ہوتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستانی شہروں میں شاید ہی قانون یا ریاستی اقتدار کا استعمال کرنے والے شہری ادارے ہوا کرتے تھے۔ اس پر بھی وہاں رسمی طور پر موجود مقامی حکومت کا کوئی نظم ضرور کام کرتا تھا۔ جس کی عموماً ریاست کا اعزاز حاصل ہوتا تھا۔

کچھ خودمختار شہری ادارے بھی موجود تھے۔ شہر میں متعدد محلے ہوا کرتے تھے (گجرات میں ان کو پول Pols کہا جاتا تھا)۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ یہ محلے یا پول کسی ذات یا مخصوص کاروبار والوں کی رہائش ہوا کرتے تھے۔ یہ محلے یا پول خودمختار اکائیوں کی شکل میں کام کرتے تھے۔ میرات احمدی میں ہر محلّہ کے واسطے ایک نگراں (میر محلّہ) کا ذکر ہے۔ یہ حوالے بعض مقامی اکائیوں کی موجودگی کو یقیناً ظاہر کرتے ہیں۔ ریاستی حکومت کو ان مقامی گروہوں کے ساتھ اشتراک قائم کرکے کام کرنا ہوتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے شہروں کے خاکہ پر بحث کرتے وقت ہم نے دیکھا کہ ہر محلّہ کا کسی طرح کا ایک ہی دروازہ داخلہ کے واسطے ہوتا تھا تاکہ کسی بھی حملے سے محفوظ رہا جاسکے۔ اندر آنے والے کسی بھی باہری آدمی پر سخت نظر رکھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان پول/ محلّہ تنظیموں میں مختلف دستکاریوں اور دستکاروں کی عموماً تنظیمیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ابوالفضل آئین کوتوال میں گلڈوں (جکی) اور گلڈ کے مکھیا (سرکردہ) کا حوالہ دیتا ہے۔ اسی طرح ہر شہری مرکز میں مہاجن بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ مہاجن کاروباری اصولوں سے مربوط تھے۔ یہ کسی خاص گروپ کے بزرگ لوگوں کا مجمع ہوا کرتا تھا جس کا سردار شیٹھ/ سیٹھ ہوتا تھا ایس۔ سی۔ مشرا نقل کرتے ہیں کہ وہ (سیٹھ) اپنے گروہ میں روایتی طور پر دستکاریوں سے متعلق اخلاق قائم کرتا تھا۔ تجارتی تعلقات کو اصولی طور پر نافذ کرتا تھا۔ قیمتوں کے طریقوں کو متعین کرتا تھا۔ کل ملا کر داخلی اتحاد قائم رکھتا تھا۔ مکمل داخلی کشاکش کو قانوناً ختم کرتا تھا۔ اور کام کی عموماً بے تعصب تقسیم کرتا تھا۔ سیٹھ ہی طبقہ کا حقیقی بچولیا اور ترجمان ہوتا تھا۔ یہاں تک کی ریاست بھی ضرورت پڑنے پر انہیں کا استعمال کیا کرتی تھی۔ یہ خصوصی دستکار مہاجن / سیٹھ ایک وسیع گروہ میں متحد ہوا کرتے تھے۔ جس کا سردار نگر سیٹھ/ نگر شیٹھ ہوا کرتا تھا۔ وہ شہر میں سبھی دستکاریوں اور دستکاروں کا نام نہاد سردار ہوا کرتا تھا۔ بوقت ضرورت وہی ان کی جانب سے سودے بازی کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک مثال میں احمد آباد کے نگر سیٹھ نے چوتھ ادا کرکے مراٹھا حملہ سے شہر کی حفاظت کی تھی۔ عوض میں شہر کا مہاجن طبقہ شہر کے محصولات کا ایک حصہ تاحیات دینے کو رضامند ہوگیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حالت ممکن طور پر موروثی ہوتی تھی۔ حالانکہ مہاجن طبقہ جہاں تک ان کے اندرونی معاملات کا سوال تھا آزاد تھا۔ مہاجنوں کے درمیان اختلافات کی حالت میں نگر سیٹھ/ نگر شیٹھ بیچ بچاؤ کرتا تھا۔ اس توسل کی حالت نے جیسا کہ ایس۔ سی مشرا کہتے ہیں کہ لازمی طور پر انتظامیہ میں بلا واسطہ خاص پہلو کو درج کرایا۔ یہاں تک کہ ریاست بھی ان کی طاقت اور عہدہ کو اہمیت دیتی تھی۔ 1723 میں جب سورت کے تاجروں نے دہائی کے متصدی (بندرگاہی شہر کا نگراں) کو اپنی درخواست پیش کی تو مومن خاں نے مہاجنوں اور تجارتی گروپوں کے اقتدار اور اہمیت کو تسلیم کیا۔

> (مہاجنوں نے مطالبہ کیا) کہ مستقبل میں کاروبار سے متعلق سبھی معاملے تاجروں کی مدد سے ہی فیصل کیے جائیں اور مہاجنوں (صرافوں) سے متعلق سبھی معاملوں میں مہاجنوں کے ساتھ صلاح ومشورہ کیا جائے۔ کوشش کی جائے کہ قید اور موت کی سزا نہ دی جائے۔

متصدی مومن خاں کا جواب تھا مستقبل میں ایسا ہی عمل درآمد ہوگا۔

ایم۔پی۔سنگھ، (1985) صفحہ، 269۔

شمالی ہند میں کوتوال ہی شہر انتظامی کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ وہ میر آتش کی سفارش پر بادشاہ کے ذریعہ نامزد کیا جاتا تھا۔ وہ شہر کی آبادی کے قانون و انتظام و حفاظت کو قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ چوری، قتل وغیرہ روکنا کوتوال ہی کی ذمہ داری تھی۔ وہ بازار کی بھی نگرانی و کنٹرول رکھتا تھا۔ شہر میں اس کا دفتر چبوترۂ کوتوالی کہلاتا تھا۔ شہر کے ہر دروازہ پر محافظ دستے تعینات رہتے تھے جن کا سردار داروغہ کے نام سے موسوم ہوتا تھا جو سورج غروب کے بعد شہر کے دروازے بند کرادیا کرتا تھا اور ان محافظوں کی تحریری اجازت کے بغیر کسی آدمی کو شہر میں داخل ہونے یا شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ داروغہ (Superintedents) کو عمومی کاموں، اشیاء کی خرید، ذخیروں، بازاروں وغیرہ کی نگرانی کے واسطے بھی متعین کیا جاتا ہے۔ ڈاک (خطوط) وغیرہ کا ایک جداگانہ داروغہ، داروغۂ ڈاک ہوتا تھا۔

اورنگ زیب نے 1659 میں محتسب کا عہدہ قائم کیا جو کہ عوام کی اخلاقیات کا بھی نگراں ہوا کرتا تھا۔ اس کا کام تھا معیاری ناپ تول وغیرہ کا نفاذ۔ پوری سلطنت اور شہروں میں بھی جاسوس (خبر رساں) افسران، واقعہ نویس، سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے متعین کئے جاتے تھے۔ انہیں بادشاہ کو اپنے دائرہ اختیار کے ماتحت علاقوں کی خفیہ رپورٹ ارسال کرنی ہوتی تھی۔ قاضی تمام عدالتی معاملات کا نگراں ہوتا تھا۔ شہر کے مالیات کا انتظام (سائر محل) کی نگرانی میں امین کروڑی (محصول وصول کرنے والا)، قانون گو (گوشواروں کا محافظ)، چودھری (تاجروں کا مکھیا)، مشرف (خازن)، تحویل دار (خزانچی) وغیرہ کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ بازار کے انتظامات کے لئے جداگانہ متصدی متعین کئے جاتے تھے۔ نگہبان (چوکیدار) اور پیادہ (پیدل سپاہی) بھی ہر ایک بازار میں متعین کئے جاتے تھے۔

بندرگاہ کا انتظام سلطنت کے دیگر شہروں کے انتظامات سے متفرق ہوتا تھا۔ بندرگاہ کا انچارج متصدی ہوتا تھا (یہ دیگر عام شہروں میں ادنیٰ محصول افسر ہوتا تھا)۔ سورت کے متصدی مومن خان نے 1723 میں سورت کے تاجروں کو خطاب کیا جو بندرگاہ کے متصدی اور کوتوال کی حالت پر خصوصی طور پر روشنی ڈالتے ہیں تاجروں نے سورت کے متصدی کو شکایت کی کہ "سابق گورنر کے تحت کوتوال متصدی کے ذریعہ نامزد کیا جاتا تھا۔ موجودہ (گورنر) بندھی (شوندھے) خان دربار (سرکار) کے ذریعہ تقرر کیا گیا ہے۔ وہ لوگوں کو تکلیف دیتا ہے۔ ہم یہ استدعا کرتے ہیں کہ اس کی عدالتی معاملات میں (مقدمات قضایا) میں کوئی اختیار نہ سپرد کیا جائے"۔

متصدی نے (تاجروں کو) تحریر کیا "کوتوال صرف اپنے دائرہ اختیار میں کوتوال ہے بھلا اس کا شہر سے کیا کام؟ اگر وہ کسی کو چوٹ پہنچاتا ہے تو اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا"۔ عموماً ایک عام مغل شہر کے افسران کی طرح بندرگاہوں پر بھی اسی طرح کے افسران متعین کئے جاتے تھے مگر بندرگاہی شہروں میں کچھ ایسے شعبے بھی ہوتے تھے جو دیگر شہروں کے اندر نہیں تھے (۱) فیضہ: اس کی نگرانی میں، بحری تجارت تھی۔ اس کا کام تھا آنے والے مال کی جانچ اور کسٹم وصول کرنا۔ کسٹم خشک منڈی کہلاتا تھا۔ (۲) خشک لنگر جہازات: یہ زمین پر فیضہ کا فریق ثانی (حزب مخالف) کہلاتا تھا۔ یہ داخلی تجارت کی نگرانی کرتا تھا (۳) جہات گودی (گودہ) یا مرمت سائر: یہ جہاز کی مرمت اور اس کے تعمیری کاموں پر نگراں تھا۔ (۴) محل جہازات: یہ آنے والے اور جانے والے جہازوں کا آنا جانا، لنگر وغیرہ کو دیکھتا تھا۔ حق لنگر (لنگر فیس) وصول کرتا تھا اور مال کے بیمہ کا کام بھی کرتا تھا۔

مہاراشٹر میں بندرگاہ کے شہر کو میرے (Mire) کہا جاتا تھا۔ مراٹھا سرحدی علاقوں میں گھاٹ علاقوں (سہیادری علاقہ) کو گھٹ پانڈے کے ماتحت رکھا گیا تھا جو اپنے علاقے کی حفاظت اور اس کے رکھ رکھاؤ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ مستقل طور پر گشت کیا کرتا تھا۔ جس کے لئے وہ حفاظتی افراد متعین کرتا تھا۔ جن کو گجارا کہا جاتا تھا۔ چنگی وصول کرنے میں گھٹ پانڈے کی مدد کرتے تھے۔ پات کی (چوکی انچارج)، دانگی، پنسارے (تولنے والا)، موودی (چپراسی) اور میت

کاری۔ گھٹ پانڈے کا منصب موروثی ہوتا تھا۔ عہد وسطیٰ میں مہاراشٹر میں پینٹھ کی ترقی اور حفاظت کا ذمہ دار آدمی سیٹے کہا جاتا تھا۔ اس کو اپنی خدمات کے عوض ٹیکس فری عطیات ملتے تھے۔ سیٹے کسٹم وغیرہ وصول کرتا تھا اور دکانداروں پر محصول کا نفاذ بھی کرتا تھا۔ وہ بازار کے کوتوال کی شکل میں بھی کام کرتا تھا۔ اس حیثیت سے وہ اپنی پولس طاقت کا بھی استعمال کرتا تھا۔ وہ چنگی وصول کرنے میں گھٹ پانڈے کا تعاون کیا کرتا تھا۔

جنوبی ہند میں نگرم سبھا کے نمائندوں کو ''نگرانکلی لار'' کہا جایا کرتا تھا۔ اس میں مقامی تاجر آتے تھے۔ ان کی ذمہ داری تھی مقامی بازار کو کنٹرول کرنا، وہ پولس کا تحفظ مہیا کرتے تھے اور گلیاں صاف کرانے، کوڑا کرکٹ جمع کرنے وغیرہ کے لئے ذمہ دار ہوتے تھے۔ ان خدمات کے واسطے تاجروں سے نگرم کے ذریعہ ایک فیس وصول کی جاتی تھی۔ آگنڈی قلی، آگنڈی پٹن، تراگو (دلالی فیس) دکانوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ کڑائی اڑائی کدے پٹم بازاروں سے وصول کیا جانے والا ٹیکس تھا۔ ان کا صفائی مزدوروں، پولس طاقت، بازار کے افسران، محرروں، وغیرہ کا مکمل ترقی یافتہ نظم ہوتا تھا۔ نگرم کو اختیار تھا کہ خاص چیز کے واسطے کسی ہول سیل تاجر کو مجاز کرے۔

20.8 خلاصہ

ہمارے عہد مطالعہ کی شروعات میں شہروں کی ترقی میں بے مثال بڑھوتری دیکھی گئی۔ یہ عمل حسب معمول چلتا رہا اور اسی عہد کے آخر تک آتے آتے مزید رفتار آ گئی۔ عہد وسطیٰ کے شہر پیداوار اور کاروباری سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ شہروں کے درمیان فرق مراتب والا نظام ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں قصبہ، بلدہ یا شہر، باڑہ اور بندر ہوا کرتے تھے۔ کچھ اہم شہر اپنی طاقت اور عمدہ حالت کے واسطے زیادہ تر ریاست کی سرپرستی پر منحصر تھے مگر پھر بھی وہ کاروباری اور پیداواری سرگرمیوں کے خاص مراکز تھے۔ یہ فرق مراتب والا نظام خود شہر کے اندر بھی واضح طور پر موجود تھا۔ ایک طرف وہاں محل اور حویلیاں موجود تھیں تو سب سے نچلی سطح کے لوگ جھونپڑیوں میں بھی سکونت پذیر تھے۔ عہد وسطیٰ کے شہروں کی ایک اہم خصوصیت قصباتی گاؤں تھے۔ جس کو ایس۔ سی۔ مشرا ''شہر میں رہنے والے دہقان'' (Peasant Urbanities) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شہر اور ملک کے درمیان ایک معائشت (Symbiotic) کا رشتہ تھا۔

20.9 مشقیں

(1) قصبوں، شہروں اور بندرگاہوں کی امتیازی خصوصیات کی تعریف کیجئے۔

(2) عہد وسطیٰ کے ہندوستانی شہروں کے مطالعہ کے لئے مختلف زاویہ نظر کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

(3) عہد وسطیٰ کے شہروں کے انتظامات کے پیٹرن پر بحث کیجئے۔

(4) عہد وسطیٰ کے شہروں کی اہم خصوصیات کا تجزیہ کیجئے۔

(5) متصدی اور کوتوال کے ذریعہ مستعمل اختیارات کے خصوصی حوالے سے بندرگاہوں اور شہری انتظامیہ کے درمیان فرق واضح کیجئے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD
Accn No MA-027
Date 03.08.2015
INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad-32

معاون کتب

عالم، مظفر(1986)، دی کرائسس آف ایمپائران مغل نارتھ انڈیا: اودھ اینڈ دی پنجاب 48-1707، نئی دہلی۔

عالم، مظفراور سنجے سبرامنیم(1998)، دی مغل اسٹیٹ 1750-1526، او۔یو۔پی۔دہلی۔

اپا دورائی، اے(1936)، اکنامک کنڈیشن ان ساؤتھرن انڈیا، (1500-1000)، جلد دوم، مدراس۔

بنگا، اندو(مرتبہ)(1991)، دی سٹی ان انڈین ہسٹری: اربن ڈیموگرافی، سوسائٹی اینڈ پالیٹکس، نئی دہلی۔

بنگا، اندو(1997)، فائیو پنجابی سینچریز: پالیٹی، اکنامی، سوسائٹی اینڈ کلچر C.1500-1900، دہلی۔

بیلی، سی، اے(1983)، رولرز، ٹاؤنس مین اینڈ بازار: نارتھ انڈین سوسائیٹی ان دی ایج آف برٹش ایکسپینشن، 1870-1770، کیمبرج۔

بھنڈاری، بی، ایل، (1999)، پیسینٹ، آرٹیزانس اینڈ اینٹرپرینیورز، راوت پبلی کیشنز، جے پور۔

چندھوری، کے، این، (1974)، دی اسٹرکچر آف انڈین ٹیکسٹائل انڈسٹری ان دی سیونٹینتھ اینڈ ایٹینتھ سینچریز، انڈین اکنومک اینڈ شوشل ہسٹری ریویو، جلد xi، نمبر 3-2۔

چندرا، ستیش (1974)، سم آسپیکٹس آف انڈیا ڈیورنگ دی ایٹینتھ سینچری۔دی پوزیشن اینڈ رول آف خود کاشت اینڈ پاہی کاشت، انڈین ہسٹوریکل ریویو، جلد 1، نمبر 1۔

چندرا، ستیش (1969)، 'جزیہ اینڈ دی اسٹیٹ ان انڈیا ڈیورنگ سیونٹینتھ سینچری، جنرل آف دی اکنامک اینڈ شوشل ہسٹری آف دی اورینٹ، جلد XII۔

چندرا، ستیش (1982)، میڈیول انڈیا: سوسائٹی، دی جاگیرداری کرائسس اینڈ دی ولیج، میک ملن، دہلی۔

چندرا، ستیش اینڈ دلباغ سنگھ (1972)، اسٹرکچر اینڈ اسٹرا ٹیفکیشن آف ولیج سوسائٹی ان ایسٹرن راجستھان، پروسیڈنگ آف دی انڈین ہسٹری کانگریس 33واں اجلاس، مظفر پور۔

دتا، رجت (2000)، سوسائٹی، اکنامی اینڈ دی مارکیٹ: کمرشیلائزیشن ان رولر بنگال، 1800-1700، منوہر، دہلی۔

فریکن برگ، روبرٹ ایرک (مرتبہ)(1992)، لینڈ ٹینور اینڈ پیسینٹ ان ساؤتھ ایشیا، او۔یو۔پی، دہلی۔

فریکن برگ، روبرٹ ایرک (مرتبہ)(1969)، لینڈ کنٹرول اینڈ شوشل اسٹرکچر ان انڈین ہسٹری، طبع ثانی، 1979، نئی دہلی۔

فو کازاوا، ہیروشی (1991)، دی میڈیول دکن: پیسینٹس، سوشل سسٹم اینڈ اسٹیٹس 18-16 سنچری، او۔ یو۔ پی، دہلی۔

گوپال، سریندر (1975)، کامرس اینڈ کرافٹس ان گجرات 16th اینڈ 17th سنچریز، نئی دہلی۔

گروور، بی۔ آر، (1963)، نیچر آف لینڈ رائٹس ان مغل انڈیا، انڈین اکنامک اینڈ شوشل ہسٹری ریویو، جلد 1۔

گپتا، ایس، پی (1986)، دی ایگریرینین سسٹم آف ایسٹرن راجستھان، دہلی۔

حبیب، عرفان (1963)، دی ایگریرینین سسٹم آف مغل انڈیا 1707-1556، دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن، او، یو، پی، دہلی 1999۔

حبیب، عرفان، (1965)، ''دی شوشل ڈسٹری بیوشن آف لینڈیڈ پراپرٹی ان پری برٹش انڈیا، (اے ہسٹوریوگرافیکل سروے)، انکوائری۔ جلد 2، نمبر 3۔

حبیب، عرفان، (1971)، پوٹینشیالیٹیز آف کیپٹالسٹک ڈیولپمنٹ ان دی اکنامی آف مغل انڈیا، انکوائری، نئی سیریز، جلد سوم، نمبر 3۔

حبیب، عرفان، (1979)، اکنامک ہسٹری آف دی دہلی سلطنت، 'انڈین ہسٹوریکل ریویو، جلد IV، نمبر 2۔

حبیب عرفان (1982)، دی پیسینٹ ان انڈین ہسٹری، پروسیڈنگ آف انڈین ہسٹری کانگریس۔

حبیب عرفان (1993)، دی ایٹینتھ سنچری ان انڈین اکنامی، پرزینٹڈ ایٹ دی سمپوزیم آن، دی ایٹینتھ سنچری ایز اے کیٹیگری ان ایشین ہسٹری، این۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ ویسینار، دی نیدرلینڈس۔

حبیب عرفان، (1995)، ایسیز آن انڈین ہسٹری: ٹوورڈس اے مارکسٹ پرسپشن، تولیکا، دہلی۔

حبیب عرفان، (1999)، ساؤتھ ایشیا، 20(1) ان ہسٹری آف ہیومینیٹی، بروک، پی اینڈ ایچ، انا للک (مرتبہ)، جلد V، روٹلیگ، یونیسکو۔

حبیب محمد، (1952)، انٹروڈکشن ٹو ایلیٹ اینڈ ڈاوسنز ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریز، جلد دوم، علی گڑھ۔

حسن، ایس، نورال (1971) تھوٹس آف ایگریرینین ریلیشنز ان مغل انڈیا، نئی دہلی۔

کراشیما، نوبورو (1992)، ٹوورڈس اے نیو فارمیشنز: ساؤتھ انڈین سوسائٹی انڈر وجے نگر رول، او، یو، پی، دہلی۔

کلکرنی، اے، آر (1969) مراٹھاس ان دی ایج آف شیواجی، بمبئی۔

کلکرنی، اے، آر، (1992-1991)، دی انڈین ولیج وِتھ اسپیشل ریفرنس ٹو میڈیول دکن (مراٹھا کنٹری)، پروسیڈنگ آف دی انڈین ہسٹری کانگریس۔

52واں اجلاس، نئی دہلی۔

لوڈن، ڈیوڈ(1989)، پیسینٹ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا، دہلی۔

مہالنگم، ٹی، وی، (1969)، ایڈمنسٹریشن اینڈ شوشل لائف انڈر وجے نگر، جلد 1، دوسرا ایڈیشن مدراس۔

موسوی، شیرین(1987)، دی اکنامی آف دی مغل ایمپائر c.1595: اے اسٹیٹس ٹیکل اسٹڈی، او، یو، پی، دہلی۔

مورلینڈ، ڈبلیو، ایچ، (1920)، انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر، لندن۔

مورلینڈ، ڈبلیو، ایچ، (1929)، ایگریئنین سسٹم آف مسلم انڈیا، لندن۔

مورلینڈ، ڈبلیو، ایچ، (1920)، فرام اکبر ٹو اورنگ زیب، لندن۔

مکھیا، ہربنس(1984)، پیسینٹ پروڈکشن اینڈ میڈیول انڈین سوسائٹی، جنرل آف پیسینٹ اسٹڈیز، جلد 12، نمبر 1۔

مکھیا، ہربنس(1993)، پرس پیکٹیوس میڈیول ہسٹری، دہلی۔

مکھیا، ہربنس، ال لیگل ایکسٹارشنز فرام پیسینٹ، آرٹیسانز اینڈ مینیلس ان دی ایٹینتھ سینچری ایسٹرن راجستھان، انڈین اکنامک اینڈ شوشل ہسٹری ریویو، جلد XIV، نمبر 2، 1974۔

نقوی، حمیدہ خاتون(1968)، اربن سینٹرز اینڈ انڈسٹریز ان اپر انڈیا 1556-1803، بمبئی۔

نقوی، حمیدہ خاتون(1972) اربنائزیشن اینڈ اربن سینٹرز انڈر دی گریٹ مغلس، شملہ۔

راماسوامی، وجے یا(1985)، ٹیکسٹائلز اینڈ ویورس ان میڈیول ساؤتھ انڈیا، او۔ یو۔ پی، دہلی۔

راماسوامی، وجے یا(2003)، کرافٹس اینڈ آرٹیسانز ان ساؤتھ انڈین ہسٹری، پریسیڈینشیل ایڈریس، میڈیول انڈیا سیکشن، پروسیڈنگ آف دی انڈین ہسٹری کانگریس، 64واں اجلاس، میسور۔

راشد(1964)، فیمائن ان دی ٹرکو۔ افغان پیریڈ، پروسیڈنگ آف دی انڈین ہسٹری کانگریس۔

رائے چودھری، تپن، عرفان حبیب (مرتبہ)(1982)، دی کیمبرج اکنامک ہسٹری آف انڈیا، جلد، اول، c.1200-c.1750، دہلی۔

رچرڈس، جے، ایف (1981)، مغل اسٹیٹ فائننس اینڈ دی پری ماڈرن ورلڈ اکنومی، کمپیریٹو اسٹڈیز ان سوسائٹی اینڈ ہسٹری، جلد 23، نمبر 2۔

رچرڈس، جے، ایف (1975)، مغل ایڈمنسٹریشن ان گولکنڈہ، او۔ یو۔ پی، آکسفورڈ۔

رچرڈس، جے، ایف (1990)، دی سیونٹینتھ سینچری کرائسس ان ساؤتھ ایشیاء، ماڈرن ایشین اسٹڈیز، جلد 24، نمبر 4۔

صدیقی، نعمان احمد (1970)، لینڈ ریوینو ایڈمنسٹریشن انڈر دی مغلز، ممبئی۔

سنگھ، چیتن (1982)، دی نیچر آف پیسینٹری ان مغل پنجاب، شوشل سائنسز ریسرچ جرنل، جلد VII، نمبر 2-1۔

سنگھ، چیتن (1985)، ویل اریگیشن میتھڈس ان میڈیول پنجاب: دی پرشین وھیل ری کنسیڈرڈ، انڈین اکنامک اینڈ شوشل ہسٹری ریویو، جلد XXII، نمبر 1۔

سنگھ، چیتن (1991)، ریجن اینڈ ایمپائر ان سیونٹینتھ سینچری، او۔ یو۔ پی۔ دہلی۔

سنگھ، دلباغ (1990)، دی اسٹیٹ، لینڈ لارڈس اینڈ پیسینٹز: راجستھان ان دی ایٹینتھ سینچری، منوہر، دہلی۔

سنگھ، دلباغ (1976)، کاسٹ اینڈ دی اسٹرکچر آف ولیج سوسائٹی ان ایسٹرن راجستھان ڈیورنگ دی ایٹینتھ سینچری، انڈین ہسٹوریکل ریویو۔ جلد II، نمبر 2۔

سنگھ، ایم، پی (1985)، ٹاؤن، مارکیٹ منٹ اینڈ پورٹ ان مغل ایمپائر 1556-1707، دہلی۔

سنگھ، ایم، پی (2000)، اسٹڈیز ان مغل اکنامی، پبلی کیشن اسکیم، جے پور۔

اسٹین، برٹن (1976)، ایسیز آن ساؤتھ انڈیا، نئی دہلی۔

اسٹین، برٹن (1980)، پیسینٹ اسٹیٹ اینڈ سوسائٹی ان میڈیول ساؤتھ انڈیا، دہلی۔

اسٹین، برٹن (1989)، ایٹینتھ سینچری انڈیا: انوتھر ویو، اسٹڈیز ان ہسٹری، جلد 5، نمبر 1۔

سبرایالو، وائی (1973)، پولیٹیکل جغرافی آف دی چولا کنٹری، مدراس۔

سبرامنیم، سنجے (1990)، دی پولیٹیکل اکنامی آف کامرس: ساؤتھرن انڈیا 1650-1500، کیمبرج۔

سبرامنیم، سنجے (1994)، منی اینڈ دی مارکیٹ ان انڈیا 1700-1100، دہلی۔

REF... ...E ONLY

ترپاٹھی، آر، پی (1973)، سم آسپیکٹس آف مسلم ایڈمنسٹریشن، الہ آباد۔

ترویدی، کے، کے، (1998)، آگرہ: اکنامک اینڈ پالیٹیکل پروفائل آف اے مغل صوبہ 1580-1707، پونا۔

وینکٹارمنیا، این، (1935)، اسٹڈیز ان دی ہسٹری آف دی تھرڈ ڈائینسٹی آف وجے نگر، دہلی۔

ورما، ایچ سی (1986) ڈائی نامکس آف اربن لائف ان پری مغل انڈیا، دہلی۔

ورما، ترپتا (1994)، کارخاناس انڈر دی مغلز فرام اکبر ٹو اورنگ زیب: اے اسٹڈی ان اکنامک ڈیولپمینٹ، پرگتی پرکاشن، دہلی۔

ونک، اینڈرے (1986)، لینڈ اینڈ سورینٹی ان انڈیا: ایگریئنین سوسائٹی اینڈ پالیٹکس انڈر دی ایٹینتھ سینچری مراٹھا سوراجیہ، کیمبرج۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD
Accn. No. MA-097
Date 03.08.2013
INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU
IMC LIBRARY
Hyderabad

فرماں رواؤں کا تاریخ وار سلسلہ

شمالی ہند

دہلی کے سلطان: 1206-1526

البار ی

قطب الدین ایبک	1206-1210
آرام شاہ	1210-1211
التتمش	1211-1236
رضیہ	1236-1240
بہرام شاہ	1240-1242
مسعود شاہ	1242-1246
نصیر الدین محمد شاہ اول	1246-1266
غیاث الدین بلبن	1266-1287
کیقوباد	1287-1290
خلجی	
جلال الدین خلجی	1290-1296
علاؤالدین خلجی	1296-1316
قطب الدین مبارک شاہ اول	1316-1320
تغلق	
غیاث الدین تغلق	1320-1325
محمد تغلق	1325-1351
فروز تغلق	1351-1388
غیاث الدین تغلق شاہ دوم	1388-1390
ناصر الدین محمد شاہ	1390-1394
محمود شاہ تغلق	1394-1412
سیّد	
خضر خاں	1414-1421
مبارک شاہ	1421-1434
علاؤالدین عالم شاہ	1443-1451
لودھی	
بہلول لودھی	1451-1489
سکندر لودھی	1489-1517
ابراہیم لودھی	1517-1526

مغل: 1526-1750

مغل	
بابر	1526-1530
ہمایوں	1530-1540
سور دائرہ	
شیر شاہ سوری	1540-1545
اسلام شاہ	1545-1553
دیگر	1553-1555
مغل از سرنو	
ہمایوں	1555-1556 (ازسرنو)
اکبر	1556-1605
جہاں گیر	1605-1627
شاہ جہاں	1627-1658
اورنگ زیب	1658-1707
بہادر شاہ اول	1707-1713
ذوالفقار خاں و جہاندار شاہ	1712-1713
فرخ سیر	1713-1718
رفیع الدرجات و رفیع الدولہ	1719
محمد شاہ	1719-1748

REFERENCE ONLY

دکن اور جنوبی ہند

یادو

سومیشور IV	1187
سمھنا	1210-1246
کرشنا	1246-1260
رام چندر	1271-1311-12

کاکتیا

کاکتی رُدردیو	1162
(پرتاپ رُدرا اول) گنا پتی	1199-1262
رودرمبے	1262-96
پرتاپ رُدرا دیو ادوم	1295-96-1326

ہویاسالاس

بلالا دوم	1173-1220
نرسمھا دوم	1234-63
نرسمھا سوم	1263-91
بلالا سوم	1291-1342

وجے نگر

کرشن دیورائے	1509-1529
اچیوت رائے	1529-1542
سداشیورائے	1542-1567

احمد نگر

احمد نظام شاہ بحری	1496-1510
برہان نظام شاہ اول	1510-1533
حسین نظام شاہ اول	1553-1565
مرتضٰی نظام شاہ دوم	1565-1588
حسین نظام شاہ دوم	1588-1589
اسمٰعیل نظام شاہ اول	1589-1591
برہان نظام شاہ دوم	1591-1595
ابراہیم نظام شاہ اول	1595
احمد نظام شاہ دوم	1595
بہادر نظام شاہ اول	1595-1600
مرتضٰی نظام شاہ دوم	1600-1610
برہان نظام شاہ سوم	1610-1631

پانڈیا

مارا ورمن سندر پانڈیا اول	1216-1238
مارا ورمن سندر پانڈیا دوم	1238-1251
مارا ورمن کل شیکھر پانڈیا	1268-1310

بہمنی

علاؤالدین مجاہد	1375-1378
شمس الدین داؤد دوم	1397-1422
احمد اول	1422-1436
احمد اول	1436-1458
ہمایوں شاہ	1458-1461
احمد سوم	1461-1465
محمد سوم	1463-1482
شہاب الدین محمود	1482-1518

بیجاپور

یوسف عادل خان	1489/90-1510
اسمٰعیل عادل خان	1510-1534
ملّو عادل خان	1534-1535
ابراہیم عادل شاہ اول	1535-1558
علی عادل شاہ اول	1558-1580
ابراہیم عادل شاہ دوم	1580-1627
محمد عادل شاہ	1627-1656
علی عادل شاہ دوم	1565-1672
سکندر عادل شاہ	1672-1686

گول کنڈہ

سلطان قلی قطب الملک	d.1543
یار قلی جمشید	1543-1550
سبحان	1550
ابراہیم قطب شاہ	1550-1580
محمد قلی شاہ	1580-1611
محمد قطب شاہ	1611-1626

حسین نظام شاہ سوم	1631-1633	عبداللہ قطب شاہ	1626-1672
مرتضیٰ نظام شاہ سوم	1633-1636	ابوالحسن قطب شاہ	1672-1687

اکائی 25 ہندوستانی تاریخ میں اٹھارہویں صدی

ساخت

25.1 تعارف
25.2 اٹھارہویں صدی: اہم خصوصیات
25.3 اٹھارہویں صدی پر مباحثہ
25.4 مغل سلطنت، اس کا زوال اور اٹھارہویں صدی کی ابتدا
25.5 علاقائیت کا عمل
25.6 یہ علاقائی ریاستیں کس حد تک 'مغل' تھیں؟
25.7 اٹھارہویں صدی کی معیشت
25.8 ہندوستانی معیشت اٹھارہویں صدی کے اواخر میں: ابھرتے اختلافات۔
25.9 خلاصہ
25.10 فرہنگ اصطلاحات
25.11 مشقیں
25.12 معاون کتب

25.1 تعارف

ہندوستان باشندوں کے لئے اٹھارہویں صدی مروجہ روایات واقدار کے زوال کا عہد تھا۔ تاریخ مغل میں کبھی بھی سلطنت مغل اتنی کمزور اور غیر محفوظ نظر نہیں آئی۔ اس کے قلعوں پر افغان لٹیرے (نادر شاہ 1739 احمد شاہ ابدالی 1748 اور 1767) مراٹھا حملہ آوروں (پیشوا) اور دیگر مختلف کسان، جنگجو گروہوں (جاٹ، روہیلا، سکھ وغیرہ) کا لگاتار حملہ ہوتا رہا لیکن فوجی عہدیداران (نظام منصب داری) جو سلطنت کی شان اور انتظام سلطنت کی اہم بنیاد تھے، اس سلسلے میں کچھ بھی کرنے سے قاصر نظر آئے۔ مالی نظام بدنظمی کا شکار ہو چکا تھا جس کی وجہ سے امراء وشرفاء طبقے اور ان کے متعلقین کے طرز زندگی پر برا اثر پڑا۔ سلطنت کا دیوالیہ پن ظاہر ہو چکا تھا اور تمامتر سیاسی حکمرانی اور مالی استحکام ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں تھا۔ خاندانِ تیموریہ پر سب سے بڑا داغ یہ تھا کہ دو بادشاہوں احمد شاہ (54-1748) اور شاہ عالم (1816-1759) کو اندھا کر دیا گیا جبکہ عالمگیر ثانی (1759-1754) کو درباریوں نے آپسی گروہ بندی کا شکار بنا کر قتل کر دیا۔

جس تیزی سے یہ سب کچھ ہوا وہ حیرت انگیز تھا۔ 1700 میں اورنگ زیب کے عہد حکومت میں سلطنت مغل اپنی علاقائی وسعت کے عروج پر تھی لیکن 1730 کے آس پاس پہونچ کر یہ سیاسی طور پر کئی علاقائی ریاستوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ان میں کچھ جیسے اودھ یا بنگال، وارث ریاستوں اور پرتشدد مخالفت کا نتیجہ تھیں۔ پھر آئندہ کے مزید تیس سال میں تو ہندوستانی سیاست کسی دوسری سمت میں ہی مڑتی نظر آتی ہے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی جو ایک یوروپی طاقت تھی، مشرقی ہند میں کافی علاقوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں بھی دخل انداز ہونے لگی تھی۔ لہٰذا سیاسی میدان میں ان کامیابیوں کی بنیاد پر کمپنی گو کہ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر پوری مضبوطی سے نو آبادیاتی طرز حکومت کی داغ بیل ڈالنے کی سمت میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ان تمام تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اس وقت کے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ان کی دنیا الٹ پلٹ ہو رہی ہے۔

ان تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے جدید مورخین اٹھارہویں صدی کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے اٹھارہویں صدی مورخین کے درمیان ایک پر جوش موضوع بحث بن گئی ہے۔ اس سے اس صدی کے تاریخ نگاری میں کچھ خوشگوار اور اختراعی ترقی ہوئی۔ ایک طرف جہاں کئی پہلوؤں کی توضیح میں سخت اختلاف ہیں وہیں دوسری طرف کئی پہلوؤں پر واضح اتفاق ہے۔ پرانی توضیح کہ مغل سلطنت کا زوال اورنگزیب کی شدت پسند مذہبی پالیسی کے سبب ہوا، اب متفقہ طور پر اسے ناقابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ جہاں اورنگزیب نے مراٹھا، جاٹ اور کچھ راجپوت خاندانوں کی مخالفت کا سامنا کیا وہیں اسے مسلم امراء اور عہدیداروں کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا جو آخر کار مغل دربار میں گروہ بندی اور سازشی ماحول کو بڑھانے میں معاون رہے۔ دوسری طرف کئی راجپوت حکمراں سلطنت مغل کے وفادار بنے رہے۔

پرانے اور دقیانوسی خیال کو بھی مسترد کیا گیا ہے کہ یہ صدی تہذیبی اور اخلاقی گراوٹ کی صدی تھی۔ اب علاقائی ریاستوں کی متحرک زندگی متوجہ کرتی ہے جن میں سے کئی مغل روایات کی پاسدار تھی اور ان روایات کو علاقائی روایات سے متعارف کرایا۔ لکھنؤ اور حیدرآباد ادب اور فن کی قدردانی کے مراکز بن گئے جہاں تہذیبی ملن کی خوشگوار ترقی ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کا بنارس مذہبی تعلیم اور مذہبی زیارتی مرکز کے ساتھ ساتھ شمالی ہند میں بینکنگ اور تجارت کے اہم مرکز کی شکل میں ابھرا۔ ناڈیا بنگال میں سنسکرت کی تعلیم اور دیابھاگ ہندو قانون کی تعلیم کا مرکز تھا وہیں وشنوپور میں علاقائی فن معماری اور فن موسیقی میں نئے تجربات و ترقی ہونے لگی۔ دکن میں مراٹھا حکمرانوں کی قدردانی سے تنجور مذہب، موسیقی اور ڈرامائی روایات کی ترقی کا ایک مشہور مرکز بن گیا۔

لہٰذا اب مورخین مغل سلطنت کے زوال کو مذہبی عدم رواداری اور کچھ حکمرانوں کی ذاتی کمزوریوں کے نتیجے کے طور پر نہ دیکھ کر ایک مسلسل تعمیری کمزوری کی طرح دیکھتے ہیں۔ لیکن اس تعمیری و تشکیلی کمزوری کے اسباب اور فطرت پر بہت اختلاف ہے۔ کچھ اس سوال کو معاشی بحران کا نتیجہ مانتے ہیں۔ جو انتہائی استحصال کرنے والے طبقے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ کچھ کا ماننا ہے کہ یہ پورا عمل علاقائی تجدید حیات جو طویل المدتی معاشی ترقی کو بڑھاوا دیتی ہے، کا نتیجہ تھا۔ ریاست اور معاشرے کے بدلتے رشتوں کے متعلق بھی الگ الگ وضاحتیں ہیں۔ معاشی ترقی کی فطرت و عوامل کیا کیا تھے؟ اور سلطنت اور علاقائی ترقی سے ہونے والے فائدے کی تقسیم کے جھگڑے سے متعلق اختلافات وغیرہ۔

لیکن اٹھارہویں صدی مغل سلطنت کے زوال اور علاقائی ریاستوں کے استحکام تک ہی محدود نہیں تھی۔ اس صدی کے درمیان برصغیر میں اور بھی بہت سی بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان کے بارے میں مورخین مختلف رائے رکھتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملتی ہے۔ بحث و مباحثہ کے کئی پہلو ہیں۔ پہلا، کمپنی کا تجارت سے سیاست میں پیش قدمی۔ دوسرا، کیا ہندوستان میں نوآبادیاتی رجحان پہلے سے موجود تھا یا باہر سے آکر پلا بڑھا۔ اور تیسرا، اس کے سماجی و معاشی اثرات کیا تھا؟ انہیں میں تسلسل اور تبدیلی کے سوال اور ان سب کا نئے نوآبادیاتی ڈھانچے میں کیا اہمیت ہے۔ یہ سب سوال آپس میں الجھے ہوئے ہیں۔

25.2 اٹھارہویں صدی: اہم خصوصیات

اٹھارہویں صدی کے وسیع تر متحرک عوامل کو سمجھنے اور مختلف افکار و نظریات کے ذریعہ وسیع تر پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لئے اس صدی کی مندرجہ ذیل اہم خصوصیات کو دھیان میں رکھنا چاہئے۔

اول: اٹھارہویں صدی نے دو تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا۔ ایک یہ کہ وسیع تر مغل سلطنت کی تقسیم کے نتیجے میں مختلف چھوٹی چھوٹی صوبائی اور علاقائی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس تبدیلی اور اس کے نتیجے میں عظیم مغل سلطنت کا زوال و تقسیم اس عظیم سلطنت پر آئے بحران کا نتیجہ تھا۔ ایک طرف جہاں یہ علاقائی معاشرتی فرقوں کے درمیان سیاسی طاقت کی تقسیم جدید تھی وہیں دوسری تبدیلیاں اور بھی زیادہ گہری تھیں۔ اور یہ اس صدی کے وسط میں تب رونما ہوئیں جب جنگ پلاسی (1757) اور جنگ بکسر (1763) کے نتیجے کے طور پر انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے سیاسی ترقی کی باضابطہ ملکی تجارتی کمپنی، ایسٹ انڈیا کمپنی، کا ایک حکمراں طاقت کی شکل میں ہندوستان میں منظم ہو جانا تھا اور اس سیاسی طاقت کا استعمال فوجی اور تجارتی مقاصد کے لئے کیا جانا تھا۔

دوئم: مورخین نے اٹھارہویں صدی کے اثرات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے اسے ایک ''طویل صدی'' کے طور پر دیکھنے کا عمل شروع کیا ہے۔ جدید وضاحتوں کے مطابق اس صدی کے سیاسی محرکات 1680 کے قریب مغل سلطنت کے انتشار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس انتشار کے سیاسی غبار 1720 کے آتے آتے علاقائی ریاستوں کے استحکام کے ساتھ ساتھ بیٹھ چکے تھے۔ 1750 سے کمپنی کی سیادت میں ایک نئے سیاسی منظرنامے کی ابتدا ہوتی ہے اور یہ 1820 تک جاری رہی جس میں تقریباً تمام ہندوستانی ریاستیں انگریزی کمپنی کی ماتحتی میں آ گئی تھیں یا وہ کمپنی کی دوستی قبول کر چکی تھیں۔ اس طرح اٹھارہویں صدی اپنی سیاسی اہمیت کے نظریئے سے سترہویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور انیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں کو بھی اپنے میں شامل کر لیتی ہے۔ معاشی نظریے سے بھی اس صدی کو ''طویل'' سمجھنا فائدے مند ہے۔ اب اس بات کے ٹھوس ثبوت فراہم ہیں کہ نئی ریاستوں کی سیاسی تجدید کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی تجدید کا عمل بھی ہوا۔ جہاں کچھ علاقوں کا زوال ہوا وہیں بہت سے دوسرے علاقے زمیندار اور تاجر طبقوں کی وجہ سے معاشی ترقی میں آگے بڑھنے لگے اور اس خیال کہ اس صدی کے وسط سے ہی معاشی انتشار کا عمل شروع ہو چکا تھا، کے مقابلے جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کمپنی کے اقتدار میں آنے پر علاقائی ریاستوں پر سیاسی تجدید کاری کے دباؤ کے باوجود معاشی ترقی کا عمل اچانک ہی نہیں رک سکا تھا۔ بنگال میں بھی جہاں کمپنی کی حکومت سب سے مضبوط تھی۔ تجارت اور زراعت میں ترقی آئی گو کہ تھوڑے تغیر کے ساتھ۔ انیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک حالت ایسی ہی بنی رہی جب اٹھارہویں صدی کی سست رفتار ترقی بالکل ہی رک گئی۔

سوئم: ایک بامعنی پہلو جو حال ہی میں ابھر کر سامنے آیا ہے وہ ہے ہندوستانی معیشت کا عالمی معیشت سے رشتوں کا جائزہ لینا۔ بحر ہند، اٹلانٹک اور بحرالکاہل کے ساتھ مل کر ایک وسیع تر تجارتی نیٹ ورک کا حصہ تھا اور ابتدائی تجارتی عمل کے یوروپی ہونے نے اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی تجارتی زندگی کی فطرت اور اس کے مستقبل پر اثر ڈالا۔ اس طویل تجارتی عرصے میں ہندوستان نے ہمیشہ اشیاء اور خدمات فراہم کی تھیں لیکن مطالبے کی صورت میں جو یوروپی تجارت کے عالمی نیٹ ورک پر منحصر ہوتی تھی۔ ہندوستان کے نظریے سے اس میں کافی فائدہ تھا اور اس ذریعہ سے کافی مقدار میں ہندوستان میں دولت آئی۔ اٹھارہویں صدی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے یہ تبدیلیاں کافی اہم ہیں۔ عہد مغلیہ سے مابعد مغلیہ عہد کے درمیان تسلسل اور پھر یہاں سے ابتدائی نوآبادیاتی عہد تک کا سلسلہ بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے اگر ہم یہ دھیان رکھیں کہ ہندوستانی کی مالی اور تجارتی زندگی خاص طور پر ان تعلقات پر ٹکی ہوئی تھی جو آگرہ اور دہلی کے ساتھ افریقہ، جنوبی، مشرقی ایشیا اور یوروپ سے تھے۔ ابتدائی نوآبادیاتی مداخلت نے اس کو اور گہرا کر دیا۔ اس کی ایک مثال ہمیں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں بین ایشیائی تجارت میں آئی تبدیلیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جب ہندوستان اور مغربی ایشیا کے تجارتی رشتہ انگریز تاجروں کی دیکھ ریکھ میں مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا کی سمت میں مڑ گیا۔ کیونکہ اٹھارہویں صدی میں سترہویں صدی کے مقابلے (جو ایک بحرانی دور سمجھا جاتا ہے) عالمی سطح پر معاشی توسیع ہوئی اور ہندوستان کی سمندری تجارت اس وقت غیر معمولی طریقے سے بڑھی۔ اس لئے کوئی بھی نظریہ جو اٹھارہویں صدی کو معاشی بحران کا دور مانتا ہو، شبہ سے بالاتر نہیں ہوسکتا ہے۔

25.3 اٹھارہویں صدی پر مباحثہ

اٹھارہویں صدی میں ہونے والی تبدیلیاں جس تیزی سے رونما ہوئیں اس کے پیش نظر مختلف پہلوؤں پر الگ الگ وضاحتیں اور رائے ہیں۔ موٹے طور پر یہ بحث اس صدی کو دو حصوں میں بانٹے جانے سے شروع ہوتی ہے اور مختلف نظریات رکھنے والے مورخین کو بھی دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ اگر ہم 1750 تک کے عہد کو لیں تو دو طرح کے نظریات نظر آتے ہیں۔ مرکوز السلطنت (Empire Centrice) اور مرکوز الریاستی (Region Centric)۔ 1750 کے بعد بھی ہمیں دو نظریات نظر آتے ہیں، ہندوستان اور یوروپین۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اول پر بحث کرتے ہوئے کچھ مورخین مغل سلطنت اور اس کے حکومتی اداروں کی مرکزیت اور سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں اس کے کردار کو زیادہ اہم مانتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق سلطنت کے زوال کے تباہ کن نتائج پیدا ہوئے۔ اس نظریے کے انتہا پسندوں کے خیال میں اس سوال کی وجہ سے ملک میں سیاسی بدنظمی اور لاقانونیت آ گئی۔ حال کی وضاحتوں میں اس زوال کو انتظامی امور میں گراوٹ کی شکل میں دیکھا گیا ہے۔ لیکن ان سب سے کوئی حتمی نظریہ نہیں ابھر سکا۔ سلطنت کے زوال کے بعد ابھرنے والی علاقائی ریاستوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کی ترقی جیسی کہ مغل صوبے کی شکل میں تھی بعد میں ویسی ترقی نہیں ہوسکی۔ اس نظریے کے طرفدار جاٹ، سکھ اور مراٹھا کی بغاوتوں کو لٹیروں کے گروہوں سے زیادہ نہیں مانتے۔

اس کے برعکس وہ ہیں جو اٹھارہویں صدی کے واقعات کو علاقائی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ سلطنت کو برتر مقام دینے کے بجائے، جیسا کہ مرکوز السلطنت نظریہ میں کیا گیا ہے، مرکوز الریاستی نظریہ کے طرفداران سماجی فرقوں پر توجہ دیتے ہیں جو سلطنت کے مختلف گوشوں میں اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے عمل میں ہی ملک کی سیاسی و اقتصادی جہت کا تعین کرتے ہیں۔ ایک سطح پر مغل صوبائی حکومت کا پورا ڈھانچہ ہی بنیادی طور پر تبدیل ہوگیا جس نے بنگال، اودھ اور حیدر آباد میں خود مختار ریاستوں کو پیدا ہونے کے لئے ماحول سازگار کر دیا۔ دوسری طرح مراٹھے اور سکھ سیاسی طاقتوں جن کا عروج مغل حکمرانوں کے مخالفت بھرے سلوک کی وجہ سے ہوا تھا، نے جس انتظامی ڈھانچے کو اپنے اپنے علاقوں میں کھڑا کیا تھا اس میں انھوں نے زیادہ تر مغل طرز کو ہی اپنایا۔ اس بدلے ہوئے علاقائی پس منظر میں صوبائی حکمرانوں نے مغل امراء کو علاقائی طور پر اپنی طاقت بڑھانے کے نئے مواقع فراہم کئے اور اس کے ساتھ ہی ان کے خاندان اور متعلقین کو زرعی اراضیات کے مالکانہ حقوق اور اجارہ داری کے اختیارات حاصل کرنے کا موقع ملا جو مزید آنے والے وقتوں میں پشتینی جائداد بن گئی۔ علاقائی سطح پر تجارتی ترقی سے ان کی حالت اور مضبوط ہوگئی۔

1750 کے بعد کے حالات کے بارے میں یوروپی مکتب فکر ایک فاتح، توسیع پسندانہ، (خاص طور پر برطانیہ) قیام اقتدار کو ترجیح دیتے ہیں جس نے بدنظمی اور بے ترتیبی کے شکار ہندوستان کو شکست دی۔ یہ ہندوستان کے قومی اور مارکسوادی مکتب فکر کے مورخین کا سب سے اہم نظریہ ہے جو ہندوستان کی اقتصادی بدحالی کے اسباب کو تاریخی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ قومی مکتب فکر اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں پھیلی بدانتظامی کو اس ملک کی تاریخ میں گو کہ عارضی لیکن زبردست کمی مانتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ترقی پذیر قوم ایک غیر ملکی طاقت کی ماتحتی میں آ کر اپنے آپ کو اس کی کالونی بنا دیا۔ روایتی مارکسوادی مکتب فکر انگریزی حکومت کو ایک لازمی برائی مانتے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کے جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا۔ حال کے کچھ مورخین اسے ایک ایسے نظام کے طور پر دیکھتے ہیں جو مسلسل منافع، اشیاء اور بازار کی تلاش میں تھا اور جس کو کسی کی ترقی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے بارے میں مورخین کے نظریات میں کچھ مشترک خیالات بھی ہیں۔ پہلا یہ کہ انتظام و استحکام، کل ہند خود مختار سیاسی نظام میں ہی ممکن ہے، چونکہ یہ استحکام اٹھارہویں صدی میں ختم ہوگیا اس لئے اس دور میں بدنظمی، بدامنی اور زوال کا راستہ ہموار ہوا۔ دوسرے یہ سبھی نے مانا ہے کہ اس صدی میں عدم تسلسل پیدا ہوا۔ دونوں ہی انگریزی حکومت کے قیام کو بنیادی طور رعدم تسلسل، جو مکمل طور پر غیر ملکی اور بیرونی تسلط جو ہندوستان کی روایتی طرز حکومت یا تمدن سے بالکل مختلف تھا، کے طور پر دیکھتے ہیں۔

دوسری طرف ہندوستانی زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کرنے والے نو آبادیاتی نظام کی سمت میں ہونے والی تبدیلیوں کو کچھ الگ ہی نظریہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو صرف فتح اور زیر انتظام لانے کے عمل کے طور پر نہ دیکھ کر ہندوستان کے یوروپ (خاص طور پر برطانیہ) سے دیرینہ تعلقات کے نتیجے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت کا طاقت کے بل پر قیام کے بجائے اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کس طرح سے ہندوستانی معاشرے کے حالات نے انگیریزی حکومت کو بڑھاوا دیا۔ اس دلیل کی مطابق ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام میں صرف شہری ضرورتوں نے ہی ہیں بلکہ ہندوستانی اداروں نے بھی تعاون دیا۔ قومی اور ہندوستانی مکتبۂ فکر اٹھارہویں صدی کو صرف بدامنی سے بھرپور عہد نہیں مانتے، بلکہ ان کے مطابق مغل سلطنت کی وارث ریاستوں نے ہندوستان کو سیاسی استحکام عطا کیا۔ مغل سلطنت کے انتشار میں ہندوستان کی اقتصادی بحران کی تصویر دیکھنے کے بجائے قومی مکتبۂ فکر کا ماننا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں بھی ہندوستان کی تجارتی اور فوجی صلاحیتیں برقرار رہی جس کا فائدہ کمپنی نے اپنے فائدے کے لئے کیا۔ ایک طرف جہاں انگریزوں کی اس بیجا مداخلت کی عوامی سطح پر زبردست مخالفت نظر آئی وہیں دوسری طرف ان کی کامیابی میں ملکی سطح پر مختلف اداروں نے تعاون دیا۔ گو کہ انگریزی حکومت ہندوستانی نظام حکومت کی بنیاد پر ہی قائم ہوئی تھی یعنی زرعی۔ تجارتی تعلقات اور وسائل انسانی کی صلاحیتوں پر منحصر تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے اسے اپنی ضرورتوں کے مطابق تبدیل کر لیا۔ ہندوستانی مکتبۂ فکر کے مطابق اٹھارہویں صدی کسی عدم تسلسل کی نشاندہی نہیں کرتی بلکہ اس میں گہرے تسلسل کی موجودگی کی تصویر پیش کرتی ہے جس میں پہلے سے چلے آ رہے ادارے اور تنظیمیں برقرار رہیں، گو کہ ان کی شکل تھوڑی تبدیل ہوگئی تھی۔ اور چاروں طرف تجارتی سرگرمیوں کا پھیلاؤ ہوا۔ اس نظریے کی حمایتی اکثر کیمبرج مکتبۂ فکر کہلاتے ہیں اس لئے کہ ان میں سے کئی شمالی امریکہ میں رہتے ہیں اور کئی ہندوستانی مورخین کا بھی یہی نظریہ ہے۔ لہٰذا انہیں مجموعی طور پر تحقیق پرست مورخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

25.4 مغل سلطنت، اس کا زوال اور اٹھارہویں صدی کی ابتدا

سلطنت مغل کے زوال کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی تحریر کیا جا چکا ہے کہ اخلاقی اقدار کا انحطاط، کمزور حکمراں اور فرقہ وارانہ سیاست جیسے نظریات کو سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ نظریات عملی طور پر قابل غور نہیں ہیں۔ فرخ سیر جیسے آخری مغل شہنشاہ نے اس انحطاط کو روکنے کی پوری کوشش کی۔ ہمیں کوئی ایسا ٹھوس ثبوت دستیاب نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ ان شہنشاہوں نے اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کی۔ لیکن اس دور کے واقعات اتنی تیزی سے رونما ہو رہے تھے کہ کسی ایک فرد خاص کو انہیں قابو میں کرنا ممکن نہیں تھا۔ دیگر نظریات سلطنت کے تیز انحطاط، اور سلطنت کی اقتصادی وجاگیرداری نظام کے بحران جس نے حکومت کے شعبہ جات میں زبردست خرابیاں پیدا کر دیں، پر توجہ دیتے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی اور اجمائی طور پر لکھا گیا ہے اور پروفیسر عرفان حبیب کے دلائل اس سلسلے میں سب سے اثر انگیز ہے۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ جہاں نظام معیشت کی توسیع کی صلاحیت بنیادی طور پر اپنے آپ میں محدود تھی اور اس طرح اس نظام معیشت کا رجحان یہ تھا کہ کسانوں کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ بطور محصول وصول کر لیا جائے۔ اس کی وجہ سے ایک سہ رخی تصادم۔ امراء طبقہ، زمینداروں اور کسانوں کے مابین، کو پیدا کیا۔ یہ تصادم بہت جلد اتنا بڑھ گیا کہ اس کو قابو میں کرنا یا روکنا غیر ممکن ہو گیا۔ ستیش چندر کے مطابق سلطنت کے زوال کا اہم سبب سلطنت کے عہدیداران کی نظام جاگیر کی صلاحیتوں کو برقرار رکھنے کی عدم صلاحیت تھا جس نے آپسی گروہ بندی اور تصادم کو پیدا کیا۔ اسی سلسلے میں اطہر علی کا خیال ہے کہ جاگیروں کی سختی کی اس زوال کا اہم سبب تھا۔ اورنگ زیب کی دکنی مہمات کے نتیجے میں زمین کے بٹوارے کے خواہش مندوں میں زبردست اضافہ ہوا جس کی وجہ سے نظام جاگیر کا انحطاط ہو گیا۔ جان رچرڈس نے اس میں خاص ترمیم کی۔ ان کا خیال تھا کہ دکن میں جاگیر کے بغیر کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ اس علاقے میں زمین کے بٹوارے کی کمی نہیں تھی بلکہ دکن کے علاقائی مخصوص طبقات کے ذریعہ مناسب نظام کا قیام تھا۔ دکن میں مناسب نظام حکومت کا قیام ہی سلطنت کا اہم ترین مسئلہ تھا۔ سلطنت کے استحکام کی سمت ناکامی کی وجہ سے حالت خراب ہو گئی۔ یہ ناکامی خاص طور پر سلطنت کے علاقائی امیر کاشتکار طبقہ کو صحیح طور پر حکومتی ڈھانچے میں شامل نہ کر پانے کی وجہ سے تھی جس کے نتیجے میں سلطنت کے انتظامی ڈھانچے میں دراڑ پڑ گئی۔

مارشل ہاگسن ایک دلچسپ دلیل پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تینوں مسلم سلطنتیں______ آٹومن (ترکی)، صفوی (Safavid) اور مغل______ اس لئے کامیاب نہیں ہوئے کہ وہ ایک مذہب کے ماننے والے تھے، بلکہ ان کی کامیابی کا اہم سبب ان کے ذریعہ بارود کا صحیح استعمال تھا۔ ان کی کمزوری اور ان کے زوال کا بھی اہم سبب بھی یہی تھا کہ وہ کامیابی سے اپنا نہ سکے۔ کیا یہی دلیل ہندوستان پر بھی لاگو ہوتی ہے؟ حال میں اقتدار عالم خان نے ہماری توجہ گولہ۔ بارود، مرکزیت اور مزاحمت کے درمیان کی عصری معقولیت کی طرف مبذول کرائی ہے۔ بندوق، توپ اور گولہ بارود نے جہاں سلطنت کی طاقت میں اضافہ کیا وہیں طاقتور عوام نے اس کا استعمال خود کو مسلح کرنے اور حکومت کی مداخلت کے خلاف مزاحمت کرنے کے لئے کیا۔ عصری حالات میں اس اہم ترین تکنیکی علم کو عام عوام تک پہونچنے سے روک پانا ناممکن تھا۔ لہٰذا گولہ بارود اور ہتھیاروں پر حکومت کے تسلط کا اصول اس لئے کامیاب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ زمیندار، چودھری اور خاص خاص کاشتکار گروہوں کے پاس بڑے پیمانے پر مسلح فوجی تھی۔ مراٹھے، سکھ اور جاٹوں کے علاوہ یہی علاقوں کے مخصوص لوگوں کے پاس بھی آتشی اسلحوں کا ذخیرہ تھا۔ یہ یاد رکھنے لائق ہے کہ ان لوگوں کو اپنے سماج یا ذات میں بلند مقام حاصل ہونے کی وجہ سے کچھ روایتی اختیارات حاصل تھے۔ جس سے وہ بوقت ضرورت اپنی فوجوں کی تعداد میں اضافہ کر سکتے تھے۔ جو وہ عام طور پر کرتے بھی تھے۔ مغل فوج کے پاس حالانکہ وافر مقدار میں فوجی وسائل تھے لیکن اس کے باوجود انہیں علاقائی سرداروں سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا کیونکہ دیہی علاقوں کے حالات ان کے مطابق ہوتے تھے اٹھارہویں صدی تک حکومت اور مقامی سرداروں کے پاس یکساں طور پر فوجی تکنیک دستیاب تھی کیونکہ دیہی علاقوں میں ایک مشترکہ لہر پھیلی ہوئی تھی۔ اسٹیورٹ گارڈن نے یہ واضح کیا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مراٹھوں نے کس طرح ایک بہت بڑے مخلوط فوجی محنت کش طبقے کا استعمال کیا جس میں یوروپی بھی شامل تھے۔

اس لئے مغل سلطنت کے زوال کو سمجھنے کے لئے طویل المدتی اور کم مدتی دونوں ہی نظریات کی ضرورت ہے۔ طویل المدتی نظریہ یہ ہے کہ مغل نظام سلطنت کے تحت اختیارات کی مرکزیت کے لئے کئی اداروں کی بنیاد ڈالی لیکن بدقسمتی سے ان کی وجہ سے سلطنت کے انتظامی اداروں اور نظام معیشت میں بعض بعض

موقعوں پر بحران پیدا ہوا جس کا حل مغل حکمراں مناسب طریقہ سے نہیں کر سکے۔ مثال کے طور پر حکومت جمع (لگان) کے تعین اور حاصل (اصل وصولی) میں مناسب تال میل قائم نہیں کر سکی۔ اسی طرح دیہی علاقوں سے تقریباً بیس فیصد تک کم لگان کی کمی کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ مغل سلطنت کے نظام حکومت کی ایک تشکیلی کمزوری یہ رہی تھی کہ وہ مقامی یا علاقائی مخصوص طبقوں اور حکومت کے درمیان مناسب تال میل پیدا کرنے میں کامیاب نہیں تھی اور نتیجتاً دونوں مستقل طور پر اختلافات اور تصادم میں مصروف رہتے تھے۔ حالانکہ بعض اوقات دونوں کے درمیانی بہتر تعلقات کی مثالیں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ جیسے اکبر کی راجپوت پالیسی۔ لیکن اس کا اثر بہت محدود تھا یہاں تک کہ پورے راجپوتانہ تک بھی نہیں اور نہ ہی تمام راجپوت قبیلے تک اور نہ ہی یہ سیاسی تصادم وانتشار کو روک سکی۔ حکومت کے ذریعہ سلطنت دور دراز کے علاقوں کے زمینداروں سے عملی تعلقات قائم کر پانے کی نااہلیت نے مسائل کو اور پیچیدہ بنا دیا۔ مواس اور زور طلب (باغی زمینداروں)، مستقل طور پر سیر حاصل علاقوں کے ساتھ ساتھ موجود ہوتے تھے۔ یہ تمام طویل المدتی انتظامی مسائل تھے۔

کم مدتی مسائل دکنی بحران کی صورت میں نمودار ہوئے اور شمالی ہند میں گنگا۔ جمنا دوآبہ کے علاقے میں چلے آ رہے جاٹ اور میواتیوں کی طویل المدتی بغاوتیں اور پنجاب میں سکھوں کی مخالفت نے خاص طور پر خطرناک صورت اختیار کر لی۔ مشرقی ہند میں جہاں سترہویں صدی میں اہم اقتصادی اور تجارتی ترقی ہوئی وہاں پیش کش (Tribute) وصولی میں مشکلات کا سامنا رہا کیونکہ زمینداروں نے نظام لگان کے کمزور ہونے کا فائدہ اپنے ذاتی فائدے کے لئے کیا۔ گو کہ سلطنت کے سیاسی استحکام میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑا تاہم اس سے معاشی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دو اور ایشیائی سلطنتوں میں بھی بحران پیدا ہو گیا۔ جس سے ہندوستان اور مغربی ایشیاء کا بہت ہی نفع بخش رشتہ ٹوٹ گیا۔ ایک نظریے کے مطابق مغل سلطنت کے اہم بندرگاہ سورت کو اس وقت جو مالی پریشانیوں کا سامنا تھا اس کا اہم ترین سبب ان دونوں سلطنتوں کا زوال ہی تھا۔

اس طرح قلیل مدتی بحران نے پہلے سے چلے آ رہے، حکومتی اور علاقائی ضرورتوں کے طویل المدتی تصادم کو مزید بڑھا دیا اور نتیجتاً سلطنت گھٹنے کے بل جھک گئی۔

یہاں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مغل سلطنت کے مرکزیت، لامرکزیت اور سلطنت کا بحران کے عمل کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے مستقبل تبدیل ہوتے رہنے والے مرکز اور علاقائی تعلقات اور شاہی حکمراں طبقہ اور علاقائی حکمراں طبقے کے درمیان کے مستقل تناؤ کے عوامل کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ یہ تعلقات کبھی بھی شاہی فرمانوں سے متعین نہیں کئے جا سکتے تھے کیونکہ یہ مستقل تبدیل ہو کر ابھرتے رہتے تھے۔ اگر مغل سلطنت کا معاہدہ پرست سیاسی تعلقات پر مبنی ادارے کی صورت میں جائزہ لیا جائے تو اس کے مختلف ادوار میں تحریک نظر آتی ہے اور اسی تحریک نے سلطنت کے مختلف حصوں میں مختلف سماجی فرقوں کو قریب آنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کی وجہ سے سلطنت کے مختلف حصوں میں رائج مختلف سماجی گروہوں کی موجودگی کی وضاحتیں کی جا سکتی ہے۔ مرکز اور صوبوں کے بدلتے رشتوں سے ہمیں مرکز اور علاقائی کے درمیان کے اندرونی رشتوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ سلطنت کے ذریعہ مرکزیت کی جتنی کوشش کی گئی، علاقائی گروہوں کو اتنا ہی فائدہ پہونچا۔ سلطنت نے جیسے جیسے نظام ٹیکس کے ذریعہ دولت جمع کیا وہیں دوسری طرف ان کے زیادہ سے زیادہ مقدار میں دولت جمع کرنے کے رجحان کو تقویت ملی۔

25.5 علاقائیت کا عمل

اگر ہم سلطنت کا علاقائیت پر مبنی نقطۂ نظر اپنائیں تو اس کے زوال کے اور بھی متبادل اسباب نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ فارسی زبان کے تاریخی دستاویزات میں بھی سلطنت کی لامرکزیت اور نازک پہلوؤں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر آندرے ونکس فتنہ کے تصور کو یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کرتا ہے کہ نظام حکومت مسلسل اندرونی طور پر پہلے سے ہی نقصاندہ تھا اور گروہ بندی و لامرکزیت کے قوی رجحانات مرکز سے مسلسل الگ ہو رہے تھے۔ اسٹیفن بلیک کے ذریعہ موروثی نوکر شاہی کی وضاحت اس کا دوسرا پہلو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مغل ہمیشہ وسیع پیمانے پر ایک انفرادی (موروثی) اور بے حد عسکری اور مرکزی پہلوؤں میں توازن رکھنے کی کوشش میں اس طرح رہے جیسے ایک تنی ہوئی رسّی پر چلتے رہنا ہو۔ اس سے ایک عجب طرح کا تضاد پیدا ہو گیا۔ اور جیسا ایم۔ این پیٹرسن کہتے ہیں ''مغل حکمراں ایک موروثی بہت زیادہ انفرادی حکومت اور اپنی فوجی تمناؤں کے درمیان کی دراڑ کو پھلانگ نہیں پائے۔'' اپنی فوج کو

کامیاب بنانے کی کوشش میں وہ ایک آزاد فوجی نوکر شاہی نظام کو قائم نہیں کر پائے۔ مظفر عالم نے اس کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح یہ علاقائی امیر طبقے اس شاہی عمل کو اندر ہی اندر کاٹ کر اپنی حالت کو اور بھی مضبوط بناتے رہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغل ریاست پر وہ کون کون سے دباؤ تھے جس نے اسے پیچھے ہٹایا۔ ان میں مرکز میں پنپنے والی گروہ بندی سے لے کر مقامی اور علاقائی امرا طبقے کی طاقت کا استحکام تھے۔ ان طبقات کی فطرت ہر جگہ ایک جیسی نہیں تھی۔ اودھ کے لوگ سماج کے اونچے نیچے طبقے (اشراف) کے تھے۔ لیکن کچھ علاقوں میں کچھ نچلے اور متوسط طبقے کے عناصر بھی شامل تھے جیسے پنجاب میں جاٹ، یا بنگال میں آباد علاقوں کی سرحد پر واقع سدگوپ زمینداری۔ مہاجن اور تاجروں نے اس میں خاص کردار ادا کیے۔ وہ کچھ رقم دیکر لاگت کی ذمے داری لیتے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں نئے علاقائی مخصوص طبقے کی یہ تفریق ان کی خاص صفت تھی جس سے ہمیں ایک ایسا نظام دکھائی دیتا ہے جو کثیر جہتی تناؤ کے تھپیڑوں سے پریشان تھا۔ یہ بحران ایسے گروہوں کے شکوک کے دوبارہ ابھرنے سے ہوا جسے سی۔ اے۔ بیلی ''کئی طرح کے فوجی، تجارتی اور سیاسی ٹھیکدار'' کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ جنھوں نے متحد ہو کر ''مغل سلطنت کی بڑھتی ہوئی تجارت اور پیداوار کا فائدہ اٹھایا۔ اس ابھار کا مطلب زوال نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اوپری سطح کی سماجی تبدیلی نے کچھ قدیم اداروں کی جگہ نئے اداروں کے لینے سے مل کر کچھ نئے اداروں کی تشکیل و قیام کے عمل کو پورا کیا۔

اٹھارہویں صدی کی سیاسی سرگرمیوں پر حال کے مطالعوں نے تین قسم کے نظام حکومت کی سمت اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے اول جو پہلے سے چلی آ رہی مغل نظام حکومت کے طرز پر تھی۔ اودھ اور بنگال کے نواب صرف نام کے ہی مغل صوبے دار تھے اور وارث ریاستوں کے طور پر ان صوبوں پر حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے مغل طرز اور رسم و رواج کو اپنایا۔ دوسری قسم ان ریاستوں کی تھی جو مغل سلطنت سے الگ ہو کر ابھری تھیں۔ ان میں مراٹھا، جاٹ اور سکھ ریاستیں آتی تھیں۔ جن کے قیام نے نئے طریقوں کو قائم کیا جن سے مغل سلطنت کو مستقل طور پر حقیقی خطرہ لاحق رہتا تھا۔ تیسری قسم کی جدید سیاسی ڈھانچے اہم ترین تھے۔ ان میں مسلمان، ہندو اور آدی واسیوں (قدیم قبیلوں) کے کئی حلقۂ اثر تھے جو نیم خود مختار ریاستوں کی سرحدوں پر واقع تھے۔ جاٹ زمینداروں کے ذریعہ گنگا، جمنا دوآبہ سے بھگائے جانے پر راجپوت خاندانوں نے مغرب میں گجرات سے لے کر شمال میں اودھ تک، فتح، ہجرت اور قیام کے ذریعہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو قائم کیا۔ روہیل کھنڈ اور بھوپال میں افغان سرداروں نے فتح، اجارہ اور جنوب۔ مغرب کے سرحدی علاقوں کے ساتھ تجارتی تعلقات کی بنیاد پر اپنی ریاستوں کو قائم کیا۔ بنارس راج اور بنگال میں بردوان اور قاسم بازار کے زمینداروں نے کاشتکاری نو آبادیاتی، اجارہ اور تجارتی تعلقات کی بنیاد پر اپنی ریاست مستحکم کی۔ ہندوستان کی شمال۔ مشرقی سرحد پر ہوم راجاؤں نے مغل سلطنت کو 1680 کے آس پاس بڑھنے سے روکا۔ اس ہندو خاندان کے راجاؤں نے انیسویں صدی کی ابتدا میں انگریزی حملوں تک آسام کو خود مختار بنائے رکھا۔

دکن میں بادشاہ نوازوں کا حقیقت میں خاص اجتماع میسور میں 1760 کے آس پاس ہی ہوا۔ ڈیوڈ لیڈن وضاحت کرتے ہیں کہ اس سے پہلے کی حالت یہ تھی کہ تیلگو داں ناپکوں نے چھوٹی چھوتی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور وہ وجئے نگر کے ماتحت تھے اور اس کے زوال کے بعد خود مختار ہو گئے ان میں سے کئی پلاپکار یا پولیگار تھے جنھوں نے نایکوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور وہ وجے نگر کے ماتحت تھے اورس کے زوال کے بعد خود مختار ہو گئے۔ ان میں سے کئی پلایکار یا پولی گار تھے جنھوں نے نایکوں کے علاقے میں، جو مندروں پر مبنی تھے اور جن کی کافی حد تک عسکریت ہو چکی تھی، اپنی ریاستیں قائم کر لی تھی۔ مالا بار ساحل پر ساحلی ریاستوں اور زمیندار خاندانوں کے درمیان تجارت، زمین اور دیگر منافعوں کے آپسی تقسیم کی بنیاد پر بڑے مشکوک تعلقات تھے۔ اس علاقے میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی سربراہی میں میسور کے حملوں کے ساتھ ایک اندرونی تضاد سے بھری ہوئی بادشاہت کی شروعات ہوئی۔

25.6 یہ علاقائی ریاستیں کس حد تک ''مغل'' تھیں؟

علاقائی نظام حکومت کے حال میں ہوئی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں شمالی ہند میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں میں ان علاقوں میں مغلوں کے ذریعہ قائم شدہ طرز سیاست میں اچانک بہت زیادہ فرق نہیں آیا۔ بنگال، حیدرآباد اور اودھ کی مغل ریاستوں کے آزاد ریاستوں کے طور پر اُبھرنے کے اشارے اورنگزیب کی حکومت کے آخری برسوں میں ہونے والی تبدیلیوں میں ہی نظر آنے لگے تھے جن کی وجہ سے طویل مدتی تبدیلیاں آئیں

اوراختیارات کا انتشار ہوا۔ وارث ریاستوں کے حکمراں جو محض نام کے مغل گورنر جیسے دکن، اودھ اور بنگال کے نوابین انھوں نے شاہی دربار کے کئی تہذیبی اقدار اور رواجوں کو اپنی راجدھانی میں رائج کیا۔ ان ریاستوں میں انھوں نے مغل طرز حکومت کا استعمال کیا۔ یہاں تک کہ آرکاٹ کے نوابوں، جن کی حکومت انگریزوں کی مدد سے چل رہی تھی، نے اپنے علاقے میں پہلی بار مغل طرز حکومت کا ہی استعمال کیا۔ مراٹھوں نے مغلوں کے نظام لگان کو اپنایا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اپنے عہدیداروں کو مختلف ناموں سے موسوم کیا۔ سکھوں نے حالاں کہ خالصہ جیسی فرقہ پرست تنظیم کا قیام کیا تھا جو مغل روایتوں کی سخت مخالف تھی لیکن وہ بھی مغل طرز پر ہی لگان وصولی کرتے تھے اور انھیں کی نظام جاگیر کی بنیاد پر زمین کے بڑے بڑے حصوں کی تقسیم کی تھی۔ حکومت کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی اور ان تمام ریاستوں میں اس کی اہمیت اعلیٰ سطح کے انتظامی امور میں قائم رہی۔

لیکن ان میں کچھ فرق بھی تھے۔ ان ریاستوں نے اپنے علاقوں میں مغل نظام اپنائے ضرور تھے لیکن انھوں نے اپنی حکومت مغل اصول پر قائم نہیں کی تھی۔ انھوں نے مغل اصولوں کا استعمال تو ضرور کیا لیکن بہت ہی محدود طریقے سے اور جو بھی استعمال کیا اسے اپنی پسند کے مطابق ترمیم سے کیا۔ اس طرح ان میں کئی اہم فرق نظر آتے ہیں۔

پہلا:- گو کہ زیادہ تر علاقائی نوابی ریاستیں مغل امراء طبقے کے ذریعہ وجود میں آئی تھیں لیکن وہ نظام جاگیرداری کو بہت ہی مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے حالاں کہ، درحقیقت ان نوابوں کی ترقی بھی اسی نظام کے تحت ہو پائی تھی۔ لہٰذا سبھی صوبہ داروں نے یا تو اس کے بنیادی عناصر کو چھوڑ دیا یا اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق اس میں مناسب ترمیم کر لی۔ بنگال میں مرشد قلی خان نے جاگیرداروں کو ملی ہوئی تمام جاگیریں واپس لے لی تھیں اور انھیں اڑیسہ بھیج دیا۔ اودھ میں جاگیرداری کا ڈھانچہ تو قائم رہا لیکن بڑی جاگیروں کو تقسیم کر کے چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں کو پھر سے عطا کر دیا گیا۔ نوابوں نے جاگیرداری عہدیداران (عامل) پر سخت نگاہ رکھنا شروع کر دی۔ حیدرآباد میں دفتر دار اور تعلقہ دار جیسے عہدیداران کی تقرری کر کے جاگیرداروں کے اختیارات کم کر دیئے گئے کیوں کہ یہ نئے عہدیداران سیدھے نواب کو جوابدہ تھے۔ دوسرا، ان ریاستوں میں عہدیداران کے انتظامی اور مالی اختیارات الگ الگ رکھنے کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ بنگال میں مرشد قلی خان اور حیدرآباد میں آصف جاہ نے دیوان اور صوبہ دار کے الگ الگ اختیارات کو اپنے اختیارات میں ضم کر لیا جب کہ اودھ میں برہان الملک نے صوبہ دار اور فوجدار کے اونچے عہدوں کو اکٹھا کر دیا۔

دوسرا:- مالی انتظام کے شعبے میں کافی فرق تھا اور یہ ریاستوں کی وسعت کے فرق کے باوجود ہر جگہ موجود تھا۔ ان ریاستوں کا اہم مالی مقصد نقد لگان متعین کرنا اور وصول کرنا تھا جس کا انتظام وانصرام ریاستوں کے ذریعہ مقررہ شدہ تنخواہ دار عہدیداران یا متوسط زمینداران کو نہ دے کر اجارہ داروں کو دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی میں اجارہ داری کا رواج، جس کو مغلوں نے بہت ہی غیر مناسب سمجھا، پورے ہندوستان میں اچھی طرح پھیل گیا۔ زرعی لگان کا دائرہ مال (زمینی لگان) سے بڑھ کر سائر (غیر زرعی لگان) اور دیگر عوامی عہدیداران کو ملنے والے فدیہ تک پھیل گیا تھا۔ روایتی طور پر مورخین اجارہ داری کو ایک جان لیوا طریقہ مانتے آئے ہیں لیکن جس دلیل پر یہ نظریہ قائم ہے وہ درحقیقت فیصلہ کن نہیں ہے۔ دلباغ سنگھ نے راجستھان میں اس طریقہ کا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اجارے کے ٹھیکے کا حساب مقررہ جمع (جو اکثر اصل سے بہت زیادہ ہوتا تھا) کی بنیاد پر نہیں بلکہ پچھلے پانچ سات برسوں کے اصل محصول (حاصل) کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ اس سے استحصالی لگان پر روک لگ جاتی تھی۔ لیکن اس طریقے میں بھی خامیاں تھیں۔ اودھ اور بنارس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اجارہ داری میں ٹیکس کو بڑھایا گیا جس سے ریاست کو فائدہ ہوا لیکن انتظامیہ کے مستقل اخراجات میں کمی آگئی۔ اس سے الگ الگ قسم کے لوگوں کو ریاست کے مالی انتظام میں حصہ داری کا موقع ملا۔ خوشحال ومتمول زمیندار اجارے پر زمین لے کر اپنے جوت کے علاقے کو بڑھا سکتے تھے اور دوسرے دولت مند لوگ بھی زرعی نظام میں داؤ لگا رہے تھے۔ یا تو خود اجارے پر زمین لے کر یا جو لوگ پہلے سے اس کام میں لگے ہوئے تھے انھیں پیشگی رقم دے کر (یہی طریقہ زیادہ رائج تھا)۔ 18ویں صدی کے وسط تک کورومنڈل علاقے میں اجارے کا نظام پوری طرح پھیل چکا تھا جس میں زمیندار اور فوجی درجہ کے امراء ان حلقوں میں بولی لگانے میں سب سے آگے تھے۔

تیسرا:- سبھی علاقائی ریاستوں میں، اس کے پھیلاؤ اور جغرافیائی صورتحال پر دھیان دیئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاستی نظام اور دولتمند لوگوں کے درمیان

ایک گہرا تعلق قائم ہوگیا۔ کیرین لیونارڈ کے خیال کے مطابق مغل سلطنت کا زوال اور بینکنگ فارموں کا علاقائی اور مقامی سطحوں پر ٹیکس وصول کے شعبے میں بڑھتا اثر دونوں ایک ہی وقت پر ہوا۔ یہ تعلق اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں اور بھی بڑھ گیا۔ 1750 تک بینکروں کا زرعی لگان کی وصولی پر مکمل تسلط قائم ہوگیا۔ کیونکہ ادھار یا نقد دینے والے وہی تھے۔ ایک طرف ان کے دیئے گئے پیسوں سے لوگ اجارہ دار بن گئے۔ ان کے ایجنٹ گاؤں گاؤں گھوم کر ان زمینوں سے لگان وصول کرتے تھے جو انھیں بطور ضمانت یا گروی رکھنے پر دی گئی تھیں۔ پورے ہندوستان میں دولت مند تاجر اور مہاجن ہی نئے سیاسی نظام میں سب سے زیادہ منافع حاصل کر رہے تھے اور 1760 کے آس پاس بہت ساری چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں یہ تاجر بینکر مخصوص سیاسی گروہ بن گئے تھے۔ بنگال جیسی بڑی ریاستوں میں مخصوص تاجروں کو نمک اور شورے جیسی اشیاء کی تجارت کا اختیار بلا شرکت عطا کیا گیا اور شورہ پیدا کرنے والے علاقوں میں ان کا سیاسی اقتدار قائم ہوگیا۔ یہ تجدید نظام کیوں ہوا؟ مستقل علاقائی مراکز کے بینکنگ پونجی کو کھینچنے لگے۔ بینکر خاص مغل علاقوں سے دور فرخ آباد، لکھنؤ، مرشد آباد، پٹنہ اور بنارس جیسے علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے جہاں انھوں نے حکمراں طبقے اور اجارہ داروں کو ادھار دینا شروع کیا اور لگان وصولی کی جگہ بھیجی گئی لگان کی رقم پر ضمانت کے طور پر ہُنڈی (Bill of Exchange) حاصل کی جو حکومت کی راجدھانی یا کسی دوسری جگہ پر، جہاں اس کی ضرورت ہو، مل جاتی تھی۔ گجرات، راجستھان، مغربی دکن جہاں سیاسی عدم استحکام تھا۔ تاجروں نے جلد ہی لاگت اور حفاظت کے متبادل راستے تلاش کر لئے۔ کئی جب مغل مراٹھوں سے کمزور پڑ گئے تو تاجر اور بینکر سورت سے نکل کر دیگر شہروں کو چلے گئے۔ کئی پونا، جو پیشواؤں کی راجدھانی تھی، چلے گئے۔ بڑودہ جیسے شہروں کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ جو مراٹھوں کے وفاق کا حصہ تھا۔ ادھار لین دین کا کام آہستہ آہستہ یوروپی کمپنیوں میں بھی پھیل گئے خاص طور پر انگریزوں تک جو اس وقت علاقائی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

چوتھا:- یوروپی خاص طور پر انگریز کس طرح سے آہستہ روی سے لیکن یقینی طور پر ہندوستان کی سیاسی زندگی میں پوری چالاکی سے داخل ہونے لگے۔ یہ ایک اہم ترین نتیجہ ہے جس کے اثرات کا مطالعہ اٹھارہویں صدی کے ہندنواز مورخین نے بڑے ہی دھیان سے کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط کے واقعات کو علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ انھیں یوروپ اور ہندوستان کے سابقہ تعلقات سے قبل کے تاریخی تناظر میں ہی اچھی طرح سے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ مسابقہ حالاں کہ خاص طور پر تجارتی لین دین پر مبنی تھا لیکن ہندوستانی حکمراں یوروپی طاقتوں کی بحری اور بری فوجی صلاحیتوں سے واقف نہیں تھے۔ مغل فوج کے اسلحہ خانے اور توپخانوں میں بہت سے یوروپی لوگوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں حالات بدلنے لگے جب کہ پی۔ جی۔ مارشل کا کہنا ہے کہ یوروپی ''ان ریاستوں میں گھس گئے جو پیسے کے بدلے خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔''

اس کا تفصیلی مظاہرہ 1740 کے آس پاس دیکھا جاسکتا ہے۔ ان دنوں ایک طرف اودھ کے نواب انوارالدین خان اور ان کے بیٹے محمود علی والا جاہ اور دوسری طرف دکن کے خاص حکمراں خاندان نوائے یتی، جن کی رہنمائی چاندہ صاحب نے کی تھی۔ 1740 میں جنگ بھڑک اٹھی۔ اس جنگ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے حصہ لیا اور خود کو تشکیل ریاست کی علاقائی سیاست میں ڈال دیا۔ انگریزوں نے والا جاہ کا ساتھ دیا جبکہ فرانسیسیوں نے چاندہ صاحب کی مدد کی۔ والا جاہ نے دکن کے پولیگاروں پر اپنا دبدبہ قائم رکھنے کے لئے کرائے پر انگریزی فوجی لئے جنھوں نے ان کے لئے تنجور کے زرخیز علاقوں پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کیا۔ چاندہ صاحب 1752 میں شکست کھا گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا۔ 1763 تک انگریزوں کی بحری فوج عظمت اور معاشی طاقت کرناٹک میں بلا مبالغہ قائم ہو چکی تھی۔ انگریزوں کو ان کی خدمات کے بدلے میں بہت سی زرخیز زمینوں کے پٹے دیے گئے اور انہیں اپنی فوجیں نواب کی زمین پر منظم کرنے کی اجازت دی گئی۔ ان تعلقات کا ایک اور اہم پہلو تھا۔ مدارس میں موجود انگریزوں نے ذاتی طور پر نواب کو بہت بڑی رقم ادھار دی جو درحقیقت انھوں نے خود ہندوستانی اور یوروپی پونجی لگانے والوں سے ادھار لی تھی۔ اس حالت کو بیلی کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ ''متضاد حالت پیدا ہوگئی جو اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں بہت ہی خاص تھی، جس میں ''دیسی پونجی ابھرتی ہوئی مسلمان ریاستوں میں انگریز سٹے بازوں کے ذریعے سے پہونچ پائی۔''

25.7 اٹھارہویں صدی معیشت

اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی نظام معیشت کے دو مسائل پر کافی مباحثہ ہوا ہے۔ اس میں پہلا ہے وہ معاشی پہلو جس میں مختلف قسم کے علاقائی رنگ دکھائی

دیتے ہیں۔ کیا یہ علاقائیت معاشی پھیلاؤ کے اشارے تھے ______ بحران کے یا استحکام کے؟ دوسرا مسئلہ نوآبادیاتی نظام کے ابتدائی برسوں میں نظام معیشت میں آئی تبدیلیوں سے متعلق ہے۔

مغلوں کے بعد کی ریاستوں کی پیدائش ہمیشہ آسان عمل نہیں تھا۔ ہم عصر ادبیات کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شدید انتشار آور بدامنی اور معاشی غیر یقینی کی حالت موجود تھی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ کچھ پہلوؤں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ بنگال اور اودھ میں آئی تبدیلیاں عام طور پر پرامن رہیں جبکہ پنجاب اور مشرقی دکن میں کافی اتھل پتھل دیکھنے کو ملتی ہے۔ مراٹھوں کے خلاف سب سے زیادہ الزام ڈالے گئے۔ صدی کی ابتداء میں ان کی فوج نے گجرات کے خوشحال تجارتی علاقوں کو اجاڑا۔ اس کے بعد 1740 کے آس پاس مشرقی ہند کو اور اس کے بعد صدی کے آخری برسوں میں راجستھان کو لوٹا۔ لیکن کیا ایسے اور غیر مستقل واقعات سے سترہویں صدی میں پائی جانے والی خوشحالی کی سطح نیچے آئی؟ یہ ایک متنازع موضوع ہے۔ اسٹوورٹ گارڈن کے ذریعے کئے گئے مالوہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فتح حاصل ہو چکی تھی اور مراٹھا ریاست مستحکم ہو چکی تھی، انتظامیہ کامیاب ہو چکی تھی اور مغل طرز پر محدود طریقے سے لگان کے مطالبے کئے جانے لگے تھے تو زراعت کو ترقی ملی، اور تجارت کو نئی زندگی۔ سندھیا، گائیکواڑ اور بھونسلے حکمراں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں طاقت ور فوج رکھنے میں کامیاب ہوئے، جسے بااثر طریقے سے منظم نظام لگان کے ذریعہ سے مزید اثر انداز بنایا گیا۔ دیگر مقامات پر بھی حالت کچھ ملی جلی سی ہی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر تک پنجاب اپنے مسائل سے ابھرنے لگا تھا جبکہ معاشی مسائل کی شروعات تبھی سے ہوئی تھی جب سے سلطنت کے انتشار کا عمل شروع ہوا تھا۔ روہیل کھنڈ، فرخ آباد اور بنارس میں مستقل ریاستیں قائم ہو چکی تھیں اور زیادہ تر ریاستوں توسیع عمل جاری تھا۔ اودھ نے روہیل کھنڈ کے افغانوں سے بہت بڑا علاقہ چھین لیا تھا۔ دکن مین میسور کے سلطان نے مالابار ساحل کے زیادہ تر علاقے اپنے قبضے میں کر لئے تھے اور آرکاٹ نے اپنی توسیع جنوب مشرقی ساحل کی طرف کی اور دکن کی نائک ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ سیاسی تنظیم کے ان مختلف عمل سے یہ نہیں لگتا کہ مغل سلطنت کے زوال سے ملک سخت معاشی بحران کا شکار ہو گیا۔

نئے شہری مراکز کی پیدائش

ارتقائی مراحل کے تعلق سے ٹھوس ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دلیل پیش کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن موٹے طور پر کچھ پہلوؤں کو لیا جا سکتا ہے۔ گو کہ نظام معیشت بنیادی طور پر زراعت پر ہی منحصر تھا لیکن اٹھارہویں صدی میں شہری ترقی کی سطح بڑھ گئی، نہ کہ گھٹی۔ ہم عصر مصنفوں نے ایس بات پر دُکھ کا اظہار کیا ہے کہ شاہجہاں آباد کا انحصار ہوا جبکہ دوسرے شہروں جیسے پنجاب میں سرہند کو بھی دھکا پہونچا۔ متھرا، جو اٹھارہویں صدی کے وسط تک ایک خوشحال اور گھنی آبادی والا شہر تھا، کو 1756 میں ابدالی کی فوجوں کے ذریعہ لوٹ جانے پر اُسے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن تھوڑا آگے جانے پر جمنا کے کنارے ہی بسے آگرہ، مغل سلطنت کا سب سے معروف شہر ابھی بھی خوشحال شہر مانا جاتا تھا کیونکہ اسے نہ تو افغانوں نے لوٹا نہ مراٹھوں نے دوسری طرف یہ ثبوت ملتا ہے کہ بلبھ گڈھ، بھرت پور اور کمبھیر جیسے چھوٹے شہروں کا ارتقاء ہو رہا تھا اور ہاتھرس اور پانی پت جیسے تجارتی مراکز کی توسیع ہو رہی تھی۔

اگر شمالی ہند میں شہریت کی ملی جلی شکل نظر آتی ہے تو ملک کے دوسرے حصوں میں کہیں بھی شہروں کے انحطاط کی مثال نظر نہیں آتی۔ ہم عصر مبصرین کلکتہ کی آبادی اور توسیع کی اہمیت کی بات کرتے ہیں۔ اگر ہم کلکتہ کو ایک نوآبادیاتی علاقہ کہہ کر ٹال بھی دیں تو 1765 میں 450000 کی آبادی والا شہر ڈھاکہ موجود تھا اور بعد میں بھی ویسا ہی گھنی آبادی اور خوشحالی والا شہر بنا رہا۔ 1756 میں مرشدآباد کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ''دنیا کے سب سے دولتمند اور خوشحال شہروں میں ایک ہے'' اور پھر 1764 میں لارڈ کلائیو جیسے شخص نے خود اس کے بارے میں کہا کہ '' (یہ شہر) اتنا ہی وسیع، گھنی آبادی والا اور دولتمند ہے جیسے کہ شہر لندن، ان دونوں میں واضح فرق صرف یہ ہے کہ مرشدآباد میں لوگوں کے پاس بہت زمین جائیداد ہے جو کہ دوسرے میں نہیں۔'' ان اہم شہروں کے ساتھ ساتھ بنگال میں متوسط درجے کے شہر بھی تھے جیسے بھگوان گولہ، عظیم گنج، کٹوہ، کلنہ، چنسورہ، اور چٹاگانگ جو اٹھارہویں صدی میں تیزی سے متوسط درجے کے تجارتی و رہائشی مراکز کے طور پر ابھر رہے تھے۔

مغربی ہند میں سورت کے جزوی انحطاط کو بمبئی کی تیز ترقی نے پورا کر دیا تھا۔ وسطی ہندوستان میں سیاسی بدامنی اور شہری انحطاط کے عمل میں کوئی اہم تعلق نظر نہیں آتا۔ مالوہ میں 1720 میں مراٹھوں کی لوٹ پاٹ نے شہری ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ یہ ترقی مغل حکومت کے شہروں کی طرز پر مسلسل برقرار رہی۔ 1760 کے آس پاس اجین کا پھیلاؤ سندھیا کی راجدھانی کی شکل میں ہوا اور اندور ہولکروں کی بنیاد بن گیا۔ یہ شہر یقینی طور پر صدی کی آخری دہائی میں ایک بڑا اور خوشحال تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ برہانپور جو آگرہ۔ سورت شاہراہ پر ایک گودام کے طور پر واقع تھا اب ملک کی اندرونی حصوں کو چھوڑ کر اس نے مشرق میں پونے، ناگپور، لکھنو، اور الہ آباد کو اپنے ساتھ شامل کرلیا دکن میں سلطنت کے زوال کا بہت ہی سطحی اثر پڑا اور شہروں کی ترقی کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مدراس کا حیرت انگیز ارتقاء ہوا اور نئے نظام حکومت میں حیدرآباد کا غیر معمولی رفتار سے ارتقاء ہوا۔ دونوں شہر تجارتی طور پر اہمیت اختیار کر گئے اور یہ امراء کی رہائش گاہ بنتے گئے۔ سلطنت کے زوال سے ابتدائی طور پر کورومنڈل ساحلی علاقے کو کچھ نقصان ضرور ہوا لیکن مسولی پٹنم، ناگ پٹنم اور دیون پٹنم جیسے شہر جلد ہی اس دباؤ سے باہر نکل گئے اور سیاسی استحکام کی وجہ سے ابھرے جو انہیں پہلے جنجی کے نایکوں اور بعد میں تنجور کے علاقائی ریاست سے حاصل ہوا۔

سمندری تجارت کی توسیع

ہندوستان کی معاشی مضبوطی کا دوسرا اشارہ تھا ملک کی سمندری تجارت میں اہم توسیع۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں مغربی ایشیائی بحران کی وجہ سے اور مراٹھوں کے حملوں سے سورت کی بندرگاہوں کا کافی نقصان پہونچا۔ اینگلو، فرنچ جنگوں کی وجہ سے کرناٹک میں کچھ عرصے کے لئے رکاوٹ آئی لیکن اس کے باوجود یوروپ کے ساتھ ہندوستان کی سمندری تجارت مستقل طور پر بڑھتی رہی۔ حال میں اوم پرکاش نے یہ ثابت کیا ہے کہ جہاں 1700 اور 1750 کے درمیان گجرات سے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی (VOC) کے برآمدات مسلسل کم ہوتے گئے۔ 1700 اور 1752 کے درمیان بنگال سے ہونے والی برآمدات میں لگاتار اضافہ ہوا جس سے ایک توازن برقرار رہا۔ یہ برآمدات بھی بعد میں کم ہوگئی لیکن اوسط پھر بھی 1785 تک دو لاکھ فلورین سالانہ کے آس پاس ہی رہا جو سترہویں صدی میں کسی بھی وقت کی برآمدات سے کہیں زیادہ تھا۔ صدی کے وسط تک ڈچ اقتدار یقینی طور پر ختم ہو چکا تھا اور انگریزی تجارت میں زبردست ترقی ہو چکی تھی۔ 1700-1698 میں یہ تجارت 1.15$ ملین تھی جو 40-1738 میں بڑھ کر 1.92$ ملین ہوگئی اور 60-1758 میں 2.1$ ملین اور 79-1777 میں بڑھ کر 5.9$ ہوگئی۔ بنگال اب سب سے اہم مقام ہو گیا تھا۔ کچھ مورخین مانتے ہیں کہ انگریزوں کے ذریعہ فتح بنگال سے قبل یوروپی ملکوں کو ہونے والی برآمدات ایشیائی بازاروں کے مقابلے بہت کم تھی لیکن اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت فراہم نہیں ہیں۔ بلکہ پلاسی کی جنگ سے قبل بنگال میں درآمد کئے گئے بولین کے تخمینوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سالانہ دس ملین بولین درآمد ہوتے تھے جبکہ ایشیاء سے حاصل شدہ بولین کبھی بھی دو ملین سے اوپر نہیں گیا۔ نوآبادیات سے پہلے ہی ہندوستان کی تجارت انتظامی طور پر یوروپ کے ساتھ جڑ چکی تھی اور اس رشتے کے نتیجے کے طور پر برآمدات میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور ہندوستانی نظام معیشت میں بہت زیادہ مقدار میں بولین کی شمولیت ہوئی۔ 1700 سے 1760 کے درمیان اوسطاً 4.69 ملین فلورین کی قیمت کے بولین ڈچ تاجر ہندوستان لائے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے 1701 اور 1721 کے درمیان ہندوستان میں 8.72$ ملین کی قیمت کا بولین لایا گیا۔ یہ 1733 اور 1756 کے درمیان بڑھ کر 12.9$ ملین ہو گیا۔ پلاسی کی جنگ سے اس تجارتی ڈھانچے میں تبدیلی آئی لیکن جب کہ ہم آگے دیکھیں گے یہ تھوڑے عرصے میں ہی ختم ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی میں تجارت کے اس زبردست پھیلاؤ کا ابھی جائزہ لینا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مثبت ہی ہوں گے۔ ایم پرکاش برصغیر کی سطح پر اس کے اثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس پھیلاؤ نے ''آمدنی، پیداوار اور روزگار'' کے مواقع ضرور بڑھائے۔ ان کا اندازہ ہے کہ اکیلے بنگال میں صدی کے وسط تک دستکاری کے شعبے میں کل وقتی روزگار میں کم از کم 10 فیصد کا اضافہ ہوا۔ وہ حالاں کہ بولین کی مقدار میں اضافے کی وجہ سے ہونے والے افراط زر کے اثرات سے انکار کرتے ہیں لیکن کلکتہ کے آس پاس انگریزی کمپنیوں کے ذریعہ خریدی گئی رسد کی فہرست سے لگتا ہے کہ چاول اور چینی جیسی اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ چاندی کے بولین کے آجانے سے پیسوں کی فراہمی میں جو اضافہ ہوا اس سے پورے علاقے میں پیداوار اور قیمتوں، دونوں میں ساتھ ساتھ اضافہ ہوا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ بنگال کی مثال ایک اکیلی مثال نہیں تھی کیوں کہ پرسنن پارتھا سارتھی نے حال ہی میں پتہ لگایا ہے کہ 1720 کے آس پاس کورومنڈل ساحل پر بھی ایسا ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE IMC LIBRARY

اہم بات یہ ہے کہ علاقائی نظام معیشت میں بولین کے آجانے سے یہ پھر سے حرکت میں آگئیں۔اس میں سے وافر رقم شاہی مراکز میں بطور نذرانہ بھیجی جارہی تھیں لیکن زیادہ تر پونجی علاقوں میں ہی رکی ہوئی تھیں۔کمپنی کے مشاہد اندازہ لگاتے ہیں کہ اس طرح سے بولین کے آنے سے بنگال کی مالی ذخیرہ اندوزی میں تقریباً 25 کروڑ روپئے۔(25$) کا اضافہ ہوا۔اس طرح سے بڑھتی ہوئی علاقائی معیشت میں علاقائی تجدیدکاری کا عمل بھی ہوا۔اس سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کا امتیازی عمل 'علاقائی مرکزیت' علاقائی جمع میں اضافہ اور حکومت کے ذریعہ نقد محصول کی وصولی کرنے کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہندوستانی مورخین میں ایک زبردست اتفاق رائے ہے کہ اٹھارہویں صدی میں ہونے والی سیاسی ہلچل نے تجارتی نیٹ ورک کو، خاص طور پر مغرب۔مشرق اور آگرہ۔سورت کو برباد کردیا تھا۔اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ انتشار آیا ہوگا لیکن اس کے نقصاندہ اثرات کی مقدار یا گہرائی واضح نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی میں بیموں کی بڑھتی ہوئی شرحوں کے بہت ہی جزوی ثبوت عرفان حبیب نے پیش کئے ہیں، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس شعبے میں تجارت کمزور رہی ہوگی۔لیکن اس سے یہ نکتہ ثابت نہیں ہوتا۔ٹیکس کی مقدار میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔1571-72 میں 460,000 روپیہ سے سورت کا ٹیکس بڑھ کر 1721 میں 700,000 روپیہ ہوگیا۔کامبے میں کل وصول شدہ ٹیکس 1719 میں 120,000 روپئے سے 1755 میں 285,000 روپیہ ہوگیا اور بھڑوچ میں ٹیکس کا حصہ جو 1714 میں 450,00 روپیہ تھا 1726 میں بڑھ کر 50000 روپیہ ہوگیا۔1750-60 کے درمیان وہ 25000 روپیہ کی گراوٹ پر آگیا لیکن 1780 کے آس پاس یہ غیر معمولی طور پر بڑھ کر 400,000 روپیہ ہوگیا۔1720 تک مغربی اور وسطی ہندوستان میں چل رہی انتشار انگیز ہلچل کم ہوگئی اور سمیت گوہا کا ماننا ہے کہ مراٹھا علاقوں میں تبھی سے تجارت کا پھیلاؤ شروع ہوا اور اشیاء کی سپلائی اور پونجی کے بہاؤ نے دیہی پیداوار اور کھپت پر اثر ڈالا۔دوسرے مقامات پر بھی تجارت میں زیادہ انحطاط نظر نہیں آتا۔جوس گومانس (Jos Gommans) نے یہ دکھایا ہے کہ افغانیوں نے مُلتان اور شِکارپور سے ہوکر وسطی ایشیاء کو جانے والے راستے کو ترقی دی۔اس سے ہندوستان کو بہت بڑی تعداد میں گھوڑے حاصل ہوتے تھے اور ہندوستانی تاجروں کے قافلے اسی راستے سے مغرب کی سمت میں جاتے تھے۔

صدی کے وسط میں معائنہ کرنے سے یہ نہیں لگتا کہ علاقائیت نے پچھلی صدی کی متحدہ تجارتی سرگرمیوں کو کسی بھی طرح کم کیا ہو۔مغل شاہراہوں پر سفر میں کم سے کم رکاوٹ ہوتی تھی اور اگر کسی ایک راستے پر رکاوٹ ہوتی بھی تھی تو اس کی کمی دوسرے راستوں کی آسانیوں سے پوری ہوجاتی تھی۔پوری صدی میں بنجاروں (اناج ڈھونے والے) کی آمدورفت مرزاپور ہوکر بنارس سے دکن تک جاری رہی۔اس سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اناج اور دیگر سستی اشیاء کی تجارت کے لئے لمبی دوری کے متحدہ راستے فراہم تھے۔مراٹھوں کے ذریعہ پیدا کی گئی تمام مبینہ مشکلات کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی ہند، مالوہ، راجستھان اور شمالی ہند کے درمیان ہنڈی کے ذریعہ رقومات کی ترسیل کا کام اچھی طرح چلتا رہا۔ہُنڈی تاجروں کا تسلط نذرانوں کی ترسیل کے نیٹ ورک مراٹھوں کے علاقوں میں بھی تھے، جیسا کہ انھوں نے مشرقی ہند سے ٹیکس کے بہاؤ کے سلسلے میں کیا تھا۔قرض ابھی بھی دستیاب تھا اور مرسلہ رقومات کو لمبی دوری تک بھیجا جاسکتا تھا۔بنگال چاول اور چینی کے بدلے کورومنڈل ساحل سے کپڑا، مالدیپ سے کوڑی اور بحر احمر کے علاقوں سے پیسہ منگواتا تھا۔شہروں کے چھوٹے چھوٹے پیداواری مراکز کی مدد سے کپڑوں کے شعبے میں علاقائی تخصیص کو اس صدی میں تیزی حاصل ہوئی۔زیادہ مقدار میں پیداوار پیشگی معاہدوں سے متعلق ہورہی تھی۔بنکروں اور کسانوں کو دولت مند پڑوسیوں یا تاجروں کے ایجنٹ کے ذریع خام مال، بیج یا پیسہ پیشگی فراہم ہوتے تھے جس کے بدلے انھیں تیار مال یا کپڑے یا تیار فصل مہیا کرادی جاتی تھی۔

دیہی علاقوں میں حالات کیسے تھے؟ پیداوار میں اضافے کے لیے کسی مستحکم تکنیکی ترقی کی غیر موجودگی میں زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے صرف کاشتکاری کا علاقہ وسیع کرنے یا شدید بازاریت کو فروغ دینے یا پھر جدید طریقوں سے زرعی مزدوروں کو کنٹرول کرنے کا طریقہ قابل عمل تھا۔اٹھارہویں صدی میں یہ تینوں عناصر موجود تھے یا تو علیحدہ علیحدہ یا مختلف ترکیبوں میں۔جب کہ پنجاب انحطاط کے دور سے گذر رہا تھا اور دہلی اور آگرہ کے اردگرد کے علاقے تیز اتار چڑھاؤ سے پریشان تھے تب مراٹھوں کے قبضے والے علاقوں اور دکن مین زرعی شعبے میں اصلاحی کاموں کا سلسلہ چل رہا تھا۔صدی کے نصف اول میں راجستھان کے زراعت کے شعبے میں کافی اثر انگیز طریقے سے ارتقاء ہوا۔زمینی لگان کے مقابلے قیمتیں زیادہ تیزی سے بڑھیں جس سے کسانوں کو کھیتی کے علاقے بڑھانے کی تحریک ملی ساتھ ہی ایسی فصلوں کی پیداوار کرنے کی تحریک ملی جس میں زیادہ پیسے حاصل ہوں۔اناج جو حکومت ٹیکس کی شکل میں وصولتی تھی،

اور نقد فصلیں دونوں ہی بڑی مقدار میں علاقے سے باہر بھیجی جاتی تھیں۔ بنگال میں رچرڈ ایٹن نے گنگا ڈیلٹا کے مشرق سمت میں رُخ بدلنے سے زرعی علاقوں کے مخصوص توسیع کا ذکر کیا ہے۔ اس سے دھان کی پیداوار کے لئے مزید نئی زمین ملی جس کی پیداوار سے کلکتہ جیسے بڑھتے ہوئے شہر کے لوگوں کو اور مغرب میں کپڑا ہنکر علاقوں کے باشندوں کو پورے مقدار میں خوردنی اشیاء کا حصول ہوا۔ زیادہ ٹیکس وصولی اور نئے بازاری مراکز کی ترقی، جو مشرق میں بہار تک وسیع تھی اودھ اور الٰہ آباد میں شہری اور دیہی علاقوں میں بڑھتی ہوئی خوشحالی کا ثبوت ہے۔

کئی ادارے زمین کی بازیافت میں مصروف تھے جن میں سرکاری انتظامیہ سے لے کر دولت مند زمیندار، اجارہ دار اور تاجر شامل تھے۔ مہاراشٹر، اودھ، بہار اور بنگال میں پینٹھ، بازار اور گنج کے نام سے وسیع پیمانے پر نئے بازاری مراکز قائم ہو رہے تھے یا پرانے مراکز کی پھر سے تجدید کاری کر کے نئے نام دیئے جا رہے تھے۔ ان میں دیہی سطح کے بازار جو ہاٹ کہلاتے تھے، کی تعداد و وسعت میں کافی اضافہ ہوا کیوں کہ یہ لین دین کے نیٹ ورک کو دیہی سطح تک پہونچاتے تھے۔ بٹائی کے رواج میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ مراٹھا دکن میں بٹائی کو واٹیکاری کہا جاتا تھا جب کہ مشرقی ہند میں بٹائی دار ادھیار یا برگدار کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ تابعدار مزدوری اودھ اور مشرقی ہند میں وسیع پیمانے پر رائج تھی جب کہ سینچائی سے ہونے والی کاشت کاری والے علاقوں میں غلامی اور بندھوا مزدوروں کے رواج میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

ایسی حالت میں معاشی خوشحالی کی راہ پر چلتے ہوئے اٹھارہویں صدی کی دیسی ریاستوں کی معاشی ترقی کے بارے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ آبادی میں اضافے کے سلسلے میں اعداد و شمار بہت کم دستیاب ہیں لیکن ان ریاستوں میں کھیتی میں ہونے والی توسیع اور تجارت کے اضافے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کل ملا کر یہ حالات اصلاح پذیر ترقی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ کہ سلطنت کے انتشار سے علاقائی معیشت پر کچھ مرکزی علاقوں کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی منفی اثر پڑا ہو۔ علاقائی معیشت کی حالت بہت اچھی تھی۔ تبدیل شدہ سیاسی ماحول میں پورے ہندوستان کے تجارتی نیٹ ورک میں ترقی اور خوشحالی آئی اور کچھ علاقوں میں اس کی توسیع بھی ہوئی جس نے انحطاط پذیر علاقوں سے ہوئے گھاٹے کو پورا کر دیا۔

1757 کے بعد کے عرصے کو ہندوستانی معیشت میں ایک خط تقسیم کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ حال میں پی۔ جی۔ مارشل نے اٹھارہویں صدی میں کمپنی کی حکومت کا پھر سے جائزہ لیتے ہوئے یہ پایا کہ کمپنی کے سیاسی اقتدار کے حصول کے بنیادی مقاصد تھے ——— (1) تجارت کے رعایتی حقوق کو تبدیل کر کے مکمل اختیارات کا تعین۔ (2) محدود علاقائی تفویض کو کمپنی کی ملکیت میں منتقلی کو یقینی بنانا۔ (3) ٹیکس اکٹھا کرنے کے لئے ملنے والی ریونیو گرانٹ کو مزید بڑھانا اور (4) اپنی حفاظت کو یقینی بنانے کے لئے فوج کو منظم کرنا۔ لیکن کمپنی کی خود اعتمادی اور حوصلہ ''ان اختیارات اور طاقت کے محتاط استعمال جس نے انگریزوں کو ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں عدم مداخلت اور ان ریاستوں کو اسی طرح بچا کر رکھنے جیسی کہ وہ تھیں۔'' کی وجہ سے کافی کم ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ''غیر ملکی حکمراں ہونے کی وجہ سے ان پر پابندیاں تھیں اور بظاہر طاقتور ہونے کے باوجود ان کے عوام کے ساتھ بہت کم تعلقات ہونے کے سبب ان کی کامیابی کم تھی''۔

اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستانی معیشت کے مستقبل کو متعین کرنے میں کمپنی کے کردار کو سمجھنے کے لیے ان کے حصول اقتدار کے عمل کو صحیح نقطہ نگاہ سے دیکھنا پڑے گا۔ سلطنت مغل کے زوال نے کمپنی کے اقتدار حاصل کرنے کی کوششوں کو آگے بڑھایا تھا۔ یہ ماننا صحیح نہیں ہے۔ پہلے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد حالات بالکل ہی غیر منظم ہو گئے تھے لیکن اب اس خیال میں ترمیم کی گئی ہے۔ تھوڑی بہت بدنظمی تو تھی لیکن یہ جغرافیائی حد تک ہی محدود تھی اور اس کی بھرپائی مختلف سطحوں پر مستقل یا تجارتی بنیادوں پر ابھرنے والے اقتدارات کے سبب ممکن ہو سکی۔ تجارتی فائدے کے لئے کمپنی کی کامیابی ایسے طریقوں کو غیر منظم کرنے پر منحصر تھی۔ لہٰذا انھوں نے عدم انتظام کی دہائی دیکر اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا اور مقامی حریفوں پر بھی اپنا دبدبہ جمایا۔ 1740 کی دہائی میں انھوں نے جنوبی ہند میں یہ چال بہت ہوشیاری سے چلی یہ تجربہ انہیں اس صدی کے آخر تک کام آیا۔ کمپنی کو جو تجارتی رعایت حاصل ہوئی جسے اس نے بعد میں سیاسی پونجی (جیسے 1717 کا فرمان بنگال) کے طور پر استعمال کیا، جو مغلوں یا ان کے صوبیداروں نے انہیں صوبوں میں عطا کئے تھے۔ اور قلعہ بند بستیوں کا مشرق، جنوب اور مغرب میں قیام اس وقت ہوا جب مغل سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے وجود کی ابتدا سے ہی

کمپنی کے تجارتی اور فوجی مقاصد جڑے ہوئے تھے اور جس کا نشانہ یہی تھا کہ ان مقاصد کے حصول کا عروج تھا۔ اس معاملے میں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ نوآبادیاتی نظام کے ابتدائی برسوں میں تبدیلی کی حالت میں بھی انہیں ملک کے سیاسی اور تجارتی حمائتیوں سے اپنی فوجی و معاشی سرگرمیوں کو بڑھانے کی اجازت حاصل تھی۔ ان کی فتح نے اس تبدیلی کو آگے بڑھایا لیکن یہ اس کا سبب نہیں تھا۔

برطانوی سلطنت کے ابتدائی برسوں کی حکومت کے معاشی عوامل کو سمجھنے کے لئے ان کی علاقائی جہتوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ سلطنت تقریباً سو سال میں اپنی موجودہ شکل میں سامنے آئی تھی اور اپنے ساتھ سابقہ حکومتوں کی طرح فتح، ساجھیدار اور معاہدہ سازی سے ہندوستانی نظام میں داخل کی ہو کر کل ہند انتظامی ڈھانچے میں تبدیل ہوگئی۔ کمپنی نے صرف 1757 سے 1792 کے درمیان 40.2 لاکھ مربع کیلومیٹر کے علاقے میں سے 388500 مربع کیلو میٹر کا علاقہ اپنے قبضے میں کرلیا تھا جس میں زیادہ تر علاقے شمالی اور مشرقی ہند میں تھے۔ 1798 اور 1805 کے درمیان رچرڈ ویلیزلی نے ہر سال 50,000 مربع کیلومیٹر کا علاقہ برطانوی سلطنت کے لئے حاصل کیا جو سی۔ اے۔ بیلی کے مطابق ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کی ابتدا تھی۔ یہ اس وقت ہوا جب نپولین سے جنگوں کی وجہ سے گریٹ بریٹین (برطانیہ) پر وسائل کی فراہمی کا غیر معمولی دباؤ تھا۔ اور جس کی خاصیت تھی ___ ''ملک کی عزت اور طاقت کی یکسوئی، فتح کی اخلاقیات اور برطانیوں کی نسلی برتری'' اس نے کلائیو کے دور میں موجود موقع پرستی محتاط نظام حفاظت جو ہیسٹنگز کے دور کا خاصہ تھا، اور کارن والس کے دفاعی نظریات وغیرہ کو یک لخت ختم کردیا۔ ہندوستان کا 34.20 لاکھ مربع کیلومیٹر علاقہ صدی کے آخر تک کمپنی کے قبضے اور حدود سے باہر تھا۔ اور 1815 کے بعد ہی اس کے ایک بڑے حصے کو نگلنے کی کوشش شروع ہوئی۔ 1856 تک 25.6 لاکھ مربع کیلومیٹر علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تھا اور سلطنت کی توسیع کا کام کامیابی سے پورا ہوگیا تھا۔ حالانکہ ابھی بھی ہندوستان کا 40% علاقہ ان کی حکومت سے باہر تھا۔

لیکن ہندوستان کے زیادہ تر مورخین اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ابتدا میں کمپنی ایک ڈھیلی ڈھالی تنظیم تھی جس میں کئی خامیاں تھیں۔ ان کے لئے اس مبینہ ''اعلیٰ نسل کے یوروپی'' کی حکومت تین وجوہات سے مختلف تھی۔ اول۔ یہ ٹیکس کو حد سے زیادہ بڑھانے کی شدت پسند خطرات سے متحرک تھی، دوئم۔ اس نے ہندوستان اور یوروپ کے درمیان چلے آرہے تجارتی تعلقات کو بالکل پلٹ کر رکھ دیا۔ اور تیسرا اس کی وجہ سے ہندوستان کی دولت کا بہاؤ (Drain of wealth) نذرانے اور تحفے کی شکل میں تیزی سے برطانیہ کی طرف ہوگیا جو پوری طرح یک طرفہ تھا۔ ایسے مربوط طرز استحصال کا معیشت پر بڑا ہی منفی اثر پڑا۔ دستکاری اور زراعت کے شعبوں میں پیداواری گراوٹ آئی اور کل ملاکر حالات بڑے خراب تھے۔ اب ان موضوعات کا ایک ایک کرکے جائزہ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زیادہ تر بحث بنگال پر ہی مرکوز ہوگی کیونکہ اٹھارہویں صدی میں بنگال کمپنی کی حکومت کا اہم مرکز اور دولت کا اہم منبع تھا۔

ٹیکس کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے معاملے میں بنگال جو کمپنی کے مالیاتی تجربات کی تجربہ گاہ تھا، سے دستیاب ثبوتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہاں زرعی پیداوار کا 40 سے 45 فیصد تک محصول اراضی کے طور پر وصول کرلیا جاتا تھا۔ اکثر محصول کے مطالبات میں اضافہ بھی کردیا جاتا تھا۔ اگر 1755 کو بنیادی سال 100 مان لیں تو جو فہرست بنے گی وہ اس طرح ہوگی 1770 ____ میں 135 میں، 1778 میں 155، 1783 میں 168 لیکن 1790 میں گھٹ کر 156.1 ہوگیا۔ وصولی گئی ٹیکس کی رقم بھی بڑھ گئی لیکن اتنا نہیں کہ موجودہ طریقے میں کوئی بنیادی تبدیل یا فرق نظر آئے۔ لیکن کمپنی کا کل محصول کبھی بھی تخمینے کے 85 فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ نوابوں کے محصول 65 سے 90 فیصد کے درمیان ہوتے تھے اور ان کے مقابلے میں ٹھیک تھا۔ وصولی صرف نقد میں ہی ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے ملک میں سکہ سازی کا رواج بڑھا۔ لیکن کمپنی کے مالیاتی عمل کا ایک پہلو اس کی پرانی روایتوں سے بالکل مختلف تھا۔ ایسے وقت میں جب قیمتیں بالکل ہی گرگئی ہوں، مغل محصول عہدیداران اکثر جنس کی شکل میں ٹیکس وصول لیتے تھے جس سے کسانوں پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ یہ نرم رویہ اب بند کردیا گیا۔ کمپنی پورا ٹیکس نقد ہی وصولتی تھی بغیر اس کا لحاظ کئے کہ زراعت کی حالت کیسی ہے۔ اس کا نتیجہ غریب کسانوں کے لئے برا تھا خاص کر جب فصل برباد ہوگئی ہو۔

اگر ہم یہ مان کر چلیں کہ ٹیکس کی وصولی صرف نقد میں ہوتی تھی تو ٹیکس میں اضافے کا معاملہ اس بات پر منحصر ہوگا کہ درحقیقت ٹیکس کا بوجھ بڑھا یا نہیں۔ اس کا علم

اس وقت کی اشیاء کی قیمتوں سے چل جائے گا۔ عمومی اتفاق رائے یہ ہے کہ اس وقت ٹیکس کا بوجھ واقعی بڑھ گیا تھا کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب حد درجہ نذرانہ وصول ہونے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں گراوٹ آ گئی تھی۔ لیکن یہ نظریہ بہت ہی چنندہ ثبوتوں کی بنیاد پر ہے جو ہم عصر تحریروں کے برعکس نظر آتا ہے جو یہ دکھاتے ہیں کہ زرعی اور غیر زرعی دونوں پیداواروں کی قیمتوں میں کافی اضافہ ہوا تھا۔ اس وقت کی قیمتوں کے اعداد و شمار جو چنسورا کی ڈچ نو آبادیاتی بستی سے حاصل ہوئے اور کلکتہ کے آس پاس رسد کی قیمتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے بنگال میں خصوصاً وسطی دور سے یقینی طور پر بنگال میں افراط قیمت کا رجحان تھا۔ بہت ہی دقیانوسی تخمینے کے مطابق اس صدی میں زرعی پیداوار کی قیمتیں دوگنی ہوگئی تھیں اور 1750 سے 1795 کے درمیان قیمتیں اپنے عروج پر پہونچ چکی تھیں۔ 1790 کے بعد قیمتوں میں تھوڑی کمی آئی لیکن وہ صدی کے درمیان میں جو حالت تھی اس سے زیادہ ہی رہی اور 1795 تک حالت ایسی ہی برقرار رہی۔ 1800 کے بعد ہی قیمتیں کچھ نیچے آئیں لیکن 40-1736 میں قیمتیں جتنی تھیں اس سے نیچے نہیں آئیں۔ اس اضافے سے دیہی سماج کے کئی حلقوں نے کمپنی کے مطالبات کو رد کر دیا۔ چھوٹے اور سرحدی کسان کافی نقصان میں رہے جبکہ زمیندار اور بڑے تاجروں نے کمپنی کے دباؤ کو آسانی سے جھیلا ہی نہیں بلکہ وہ خوشحال بھی ہو گئے، کچھ مورخوں کا ایسا خیال ہے کہ اسی وقت جوتدار کسان (Jotedars) ابھرے۔

ہندوستان اور برطانیہ کے طرز تجارت پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں اس میں کافی تسلسل نظر آتا ہے۔ پلاسی کی جنگ کے بعد بولین (سونے چاندی) کی فراہمی میں کبھی بھی کمی نہیں آئی۔ گو کہ ان کی مقدار کم کر دی گئی تھی لیکن یہ پابندی بھی جزوی ہی تھی۔ 1758 اور 1768 کے درمیان کمپنی نے 2.46$ ملین کے خزانے درآمد کیے 1679 اور 1789 کے درمیان یہ رقم 3.83$ ملین تک پہونچ گئی۔ 1790 اور 1805 کے درمیان کمپنی نے ہندوستان میں 9.14$ ملین قیمت کا سونا بھیجا جس میں سے بنگال کو اس کا زیادہ تر حصہ یعنی 5.77$ ملین ملے۔ اس سے پہلے بنگال کو کبھی بھی اتنی بڑی مقدار بولین کی نہیں ملی۔ 1796 اور 1806 کے درمیان بنگال میں 5.2$ ملین کی چاندی لانے کا سہرا غیر سرکاری یوروپی تجارت کو جاتا ہے۔ ڈچ تجارت گو کہ مندی تھی پھر بھی وہ 1790 اور 1794 کے درمیان ہر سال 4.24 ملین فلورین کی قیمت کا بولین اپنے مال کی قیمت چکانے کے لئے درآمد کرتے تھے۔ اس وقت کی شکایتیں اور موجودہ خیالات کے مطابق ہندوستان کی طرز تجارت کی دھارا الٹی ہو جانے کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کے آخر میں پیسوں کی بڑی کمی ہو گئی لیکن اس ثبوت کو دھیان میں رکھ کر پھر سے غور کرنا چاہئے۔ آرکاٹ کے روپیوں کو بنگال کے سکوں میں بدلنے کے لئے مہاجن 1770 کے آس پاس 7 فیصد سے زیادہ بٹہ نہیں لیتے تھے۔ یہ اس در سے کم ہے جو 1720 کے آس پاس لی جاتی تھی جب ظاہری طور پر بنگال میں وافر مقدار میں بولین پہونچ رہا تھا۔

1773 میں بنگال کے کارخانوں (اورنگ) سے جاری کئے گئے کمپنی کے تجارتی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز، ڈچ اور فرنچ کمپنیوں کا مشترکہ سرمایہ کاری اور پرائیوٹ یوروپی تاجروں کے ذریعہ کی گئی سرمایہ کاری، کل ملا کر پورے سال میں کمائے جانے والے پیسوں کے دوگنے سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ 1790 کے آخری برسوں میں تجارتی بورڈ کے ذریعہ اکٹھا کی گئی کسٹم کی رسیدوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ 1777 اور 1797 کے درمیان بنگال سے برآمدات تین گنا بڑھ گئی تھی جس میں زیادہ تر کپڑا، خوردنی اشیاء اور دوسرے خام مال ہوتے تھے جس کے بدلے قیمتی دھاتیں اور کچھ تیار سامان درآمد کیا جاتا تھا۔ بنگال ابھی تک کے دور میں برطانیہ کے لئے کچے مال کا ذریعہ یا صنعتی گودام نہیں بنا تھا اور کے۔ این۔ چودھری کا برطانیہ کی پیداواروں کے بارے میں کہنا ہے کہ ''1757 کے انقلاب کے بعد کی نصف صدی میں تجارت اپنے پرانے معمولات سے چلتی رہی'' اور اس حقیقت کی تائید دستیاب شواہد سے ہوتی ہے۔ اس طرح بنگال کی تجارتی معیشت کی رفتار اور محرکات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی تجارتی سرگرمیاں حوصلہ کن ہی دکھائی دیتی ہیں۔ صدی کے آخری برسوں میں ناگپور، بندیل کھنڈ، غازی پور، اور مرزا پور بنگال میں تیار شدہ اشیاء کے لئے مغربی اور جنوبی ہند کے تقسیمی مراکز بن گئے۔ 1780 کی دہائی کے آخری برسوں میں بنارس میں بنے کپڑے کا لگ بھگ 43 فیصد مغربی ہند میں فروخت کیا جاتا تھا، 49 فیصد بنگال بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے جہازوں میں لاد کر غیر ملکوں کو اور بقیہ 8 فیصد شمالی اور جنوبی صوبوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اس بات کو اگر ہم ذہن میں رکھیں کہ بنارسی ریشم، جو وہاں کا سب سے قیمتی کپڑا تھا، روایتی طور پر ہندوستان کے مغربی اور شمالی صوبوں میں فروخت ہوتا تھا جبکہ بنگال میں وہاں سے سوتی کپڑے آتے تھے جو زیادہ قیمتی نہیں تھے۔ بنارس سے چلنے والی اس تجارت کی اس علاقائی تقسیم سے ہندوستان کی اندرونی کپڑا منڈیوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ 1790 تک گجرات اور وسطی ہند سے روئی اور مالوہ سے افیم اور نیل ہندوستان کی بحری تجارت کے

خاص جزو بننے لگے تھے اور ممکنہ طور پر پہلے کی اشیاء کی شمالی امریکی بازاروں میں مانگ بڑھ رہی تھی اور ایشیاء میں یوروپی مطالبات کے ساتھ ساتھ انڈونیشیائی مانگ بھی تھی۔ 1790 تک مغربی ایشیاء کے بازار پھر سے آباد ہو چکے تھے۔ کمپنی کے ذریعہ ''افیم'' جیسی بین الاقوامی شئے کی پیداوار پر تسلط قائم کرنے کی کوشش اتنی کامیاب نہیں تھی جتنی بعد کے کچھ مورخین مانتے ہیں۔ جیسا کہ بی۔ بی۔ چودھری نے دکھایا ہے کہ ان نقدی فصلوں کی پیداوار یا فروخت کے لئے پیشگی ادائیگی کے انتظام کے باوجود بازاری اتحاد خاص طور پر قیمتوں پر کوئی روک نہیں لگ سکی اور کسی خاص فصل کی طرف کاشتکاروں کی توجہ انہیں باتوں پر منحصر ہوتی تھی۔ سرکاری کی بلا شرکت اختیار کی پالیسی، پیداوار کے ان شعبوں میں دیسی ذرائع سے آنے والے قرض کو روک نہیں پائی۔ بلکہ کسان اکثر پیشگی رقم کو آمدنی کا یقینی ذریعہ مان کر اس کی پذیرائی کرتے تھے۔ نیل کی بین الاقوامی مانگ نے اس کی پیداوار میں کچھ علاقائی خصوصیات پیدا کر دیں۔ بنگال، بہار اور بنارس اونچے درجے کا نیل تیار کرتے تھے اودھ اوسط درجہ کا اور دوآبہ اور مغربی علاقوں میں معمولی درجے کے نیل کی پیداوار ہوتی تھی۔

معاشرے میں اور بھی چیزیں تھیں جو مسلسل چلتی ہیں۔ ریاست اور مہاجنوں کے بیچ مالی رشتے جو علاقائی توسیع کے دوران قائم ہوئے تھے، ایک اہم رشتہ تھا جو چلتا رہا اور رفتہ رفتہ پہلے سے زیادہ گہرا ہو گیا۔ پلاسی کے انقلاب کے دوران دیسی مہاجنوں نے کمپنی کا ساتھ دیا تھا اور اس کے ختم ہونے پر کچھ تبدیلیاں آئیں۔ حالانکہ جگت سیٹھ کے قدیم مہاجنی طریقے میں انحطاط ہوا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال سے ہونے والی محصول کی آمدنی ہندوستانی مہاجنوں کے ذریعہ دی جانیوالی پیشگی رقومات پر ہی منحصر تھی۔ ان میں بنارس کے بڑے تاجروں کی حمایت بہت اہمیت تھی۔ ہنڈی کے ذریعہ پیسے کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچانے کی صلاحیت ان میں تھی اور اسی کے بل پر انگریز اپنی فوج کو بنگال سے جنوب یا مغرب میں بھیجنے میں کامیاب تھے۔ ہمیں ہندوستانی مہاجنی کے متحرک صفات کو کم تر خیال نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی کمپنی کی مالی چالاکیوں کی مخالفت کرنے کی ان کی صلاحیتوں کو۔ اٹھارہویں صدی کے آخر دور میں بنگال کے مہاجنی کے شعبے پر کی گئی حال کی تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ بنگال کے مہاجن (صراف) اپنے روایتی کاروباری رواج کے مطابق کام کرتے رہے۔ انھوں نے کمپنی کو مدد دی لیکن اپنی شرائط پر۔ یہ ان کی ہٹ دھرمی ہی تھی جس کی وجہ سے 1835 تک کمپنی کے بنگال کے سکوں میں تبدیلی لانے کی کوشش بار بار ناکام رہیں۔

بنگال کی مثال تنہا نہیں تھی۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جاری مہاجنی کاروبار کے مطالعے سے دیسی پونجی اور نوآبادیاتی اقتدار کے ابتدائی دنوں کے تعلقات کی بنیادوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ مشرقی ہندوستان میں سیاسی اقتدار میں جو تبدیلی آئی اس سے بہار کے کچھ علاقائی تاجروں پر الٹا اثر پڑا۔ لیکن پٹنہ اور بہار کے دوسرے شہروں کے دولتمند مہاجنی ادارے ٹکے ہی نہیں رہے بلکہ پھولتے پھلتے رہے کیونکہ کمپنی کی حفاظت میں ان کا رقم بھیجنے کا کاروبار بڑھتا ہی رہا۔ بنگال کے اپنے ہم پیشوں کی طرح صراف لوگوں نے سکوں کی تفریق کا فائدہ اٹھایا اور ان کی تجارت اچھی طرح چلتی رہی۔ مغربی ہند میں یہ تعلق متضاد طریقے یعنی کمپنی کی مالی مضبوطی نہیں بلکہ اس کی کمزوری سے ترقی پا سکا۔ یہاں کمپنی کو پیسوں کی بے حد کمی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور اس سے نکلنے کے لئے انہیں لازمی طور پر مہاجنوں کی مالی امداد لینی پڑی۔

انگریزی کاروبار کی مسلسل توسیع نے خاص طور پر چین کے ساتھ انگریزوں کے 1780 کے آس پاس کی غیر سرکاری تجارت نے اس تعلقات کو اور مضبوط بنا دیا۔ 1752-58 کے درمیان غیر سرکاری تجارت بنگال کی کل غیر ملکی تجارت کا 6.7 فیصد، 1759-64 میں 8.6 فیصد اور 1766-72 میں 5.96 فیصد تھی۔ 1790-99 میں یہ بڑھ کر 41.88 فیصد ہو گئی۔ اس تجارت کا کچھ حصہ بولین کی درآمد کی شکل میں شروع ہوا لیکن تجارت کی اتنی توسیع ہوئی کہ اپنے اندرونی ذرائع سے رقومات مہیا کرنا لازمی ہو گیا۔ اس لئے دولتمند لوگوں کے لئے کاروباری مواقع بڑھ گئے۔ یہ ہندوستانی ساہوکاروں کے پاس وافر مقدار میں دستیاب تھے جو کہ بیوپاریوں کو نقد رقم دیتے تھے یا اپنا پیسا ایجنسیوں میں لگاتے تھے۔ یہ ایجنسیاں کلکتہ اور بمبئی میں تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ یہ چین کو افیم اور کپاس بیچنے کے لئے مالی انتظام کرتی تھیں۔

جنوبی ہندوستان میں کمپنی اور مہاجنوں کے تعلقات پر دستاویزی ثبوت واضح نہیں ہے۔ لیکن کمپنی نے دیسی ساہوکاروں سے تعلقات ابتدا میں ملک میں اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے لئے استوار کئے تھے، خاص طور پر آرکاٹ میں جس کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ پرسنن پارتھا سارتھی کے مطابق جنوب میں کمپنی

کے مالی معاملات میں مہاجنوں کا خاص کردار نہیں رہا لیکن وہ مانتے ہیں کہ کمپنی کے ساتھ بیوپاری۔ مہاجنوں کا رشتہ بڑھ رہا تھا جس کی انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے لئے ضرورت تھی۔ کمپنی کو دوسرے گروہ سے بھی مالی مدد ملی۔ کمپنی نے سیاسی منافع خوری کے تو مانو دروازے ہی کھول دیئے جس سے دوباشیشوں (دلالوں/مترجموں) نے جو آندھرا کے مضبوط تجارتی فرقہ تھا، بہت دولت کمائی۔ جس سے آخرش بہت ساری دولت انھوں نے کمپنی کو مالی امداد کے طور پر دی۔ کورومنڈل میں چیٹی تاجروں اور برہمن اجارہ داروں نے کمپنی کی تجارت کے لئے ساہوکار اور لیکھا کار، دونوں کے کردار ادا کئے۔ مالابار کے ساحلی علاقوں میں بلاشرکت حقوق کو اجارے پر دینا اور نئے قسم کے کئی محصول زرعی پیداوار سے وصولنے کا عمل جو اس علاقے میں میسور حکومت کے دوران نافذ کئے گئے تھے، کا استعمال کمپنی نے کالی مرچ اور الائچی کی تجارت کے لئے دیسی تاجروں کی مدد سے کیا۔ اس طرح ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں بھی نوآبادیاتی نظام کو ابتدائی برسوں میں تاجروں اور طاقتور دیسی گروہوں کی حمایت حاصل تھی۔

ان لوگوں کے لئے اٹھارہویں صدی بڑھتے ہوئے کاروباری مواقع کا دور تھی۔ یہاں بنگال کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہاں کمپنی کی کامیاب مداخلت سے سابقہ حکمرانوں کے دور میں زمینداروں کے ذریعہ اندرونی بازاروں پر لگائی گئی پابندیاں ہٹادی گئیں۔ اس کی وجہ سے زمینداری چوکیوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی اور محصول کے تعین میں زمینداروں کے جانب دارانہ رویوں کے ذریعہ مختلف شرحوں پر محصول وصول کرتے تھے۔ تاجروں اور زمینداروں میں محصول کی شرح پر کئی بار کے حلقۂ اختیارات پر دیگر اشیاء کی آمدورفت پر تصادم ہوتے رہتے تھے۔ کمپنی نے مداخلت کر کے غیرزرعی محصولات کو محدود کیا اور اس طرح کمپنی کے ذریعہ اٹھائے گئے اقدامات کے نتیجے کے طور پر وہ 1773 اور 1790 کے درمیان حالات کو سدھارنے میں کامیاب ہوئے۔ اس میں سب سے اہم تھی اندرونی مصرف کی اشیاء پر چوکیوں میں لئے جارہے بےشمار محصولات کا خاتمہ اور آخری منزل پر لئے گئے محصول کا تعین۔ اس کی دیکھ ریکھ کے لئے کلکتہ ،ہگلی ،مرشدآباد، ڈھاکہ اور پٹنہ میں پانچ سرحدی محصول (Custom duty) مراکز قائم کئے گئے۔ دوسرا مسئلہ تھا زمینداروں اور تعلقہ داروں کا بازار پر تسلط۔ 1790 میں کمپنی کے ذریعہ اِسے ختم کردیا گیا۔ کمپنی نے ان بازاروں سے جمع ہونے والے محصولات اور تجارتی محصولات کو الگ کردیا۔ کرایہ پہلے کی طرح ہی انفرادی طور پر جمع کیا جاسکتا تھا لیکن محصول کے تعین کا اختیار اب صرف کمپنی کو تھا۔ اس کارروائی سے داخلی تجارت کا ڈھانچہ آسان اور کارگر ہوگیا تھا اور ریاست، زمینداروں اور تاجروں کی آمدنی مناسب طور پر منظّم ہوگئی۔ ان پالیسیوں کا ملا جلا اثر یہ ہوا کہ بنگال میں ہر طرف بازاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ بازاروں کی کمی والے علاقوں میں ان کے قیام یا اضافے سے کسانوں کو فائدہ ہوا کیوں کہ اب وہ ایک وسیع بازار سے اپنا تعلق قائم کرسکتے تھے۔ تاجر بھی اپنی ساکھ کے نیٹ ورک کی وجہ سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آسانی سے آجاسکتے تھے۔

زمیندار جنھوں نے اندرونی علاقوں میں بازار لگار کھے تھے، کسانوں کو قرض دیتے تھے اور جو لوگ زراعت کی اصلاح کے لئے مالی امداد دیا کرتے تھے وہ بھی اس کاروبار میں شامل ہوگئے۔ بنگال میں یقینی طور پر یہی ہوا۔ اودھ، مہاراشٹر اور جزیرہ نما ہند اٹھارہویں صدی کے آخر میں حالت موافق نہ ہونے کے باوجود چھوٹے موٹے شریف لوگوں اور امراء طبقے کے لوگوں کے ذریعہ قائم کئے گئے بازار نظر آنے لگے تھے۔ سمیت گوہا کی رائے کے مطابق مہاراشٹر میں کچھ مقامات پر تو انھوں نے چھوٹے شہروں کی شکل اختیار کرلی تھی جہاں طرح طرح کے لوگوں نے کاروبار، زمین کی ملکیت اور ٹھیکے پر محصول وصول کو اپنالیا۔ بڑے زمینداروں نے اپنے ہاتھ سیدھے نیل کی کھیتی میں بھی آزمائے کیوں کہ وہ منافع بخش تھی۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے بڑھتی ہوئی نیل اور افیم کی تجارت میں اُن ایجنسیوں کے ذریعہ پیسہ لگایا جو اپنی پونجی مقامی ذرائع سے اکٹھا کرتے تھے۔

25.8 ہندوستانی معیشت اٹھارہویں صدی کے اواخر میں: اُبھرتے اختلافات

یہ سب نوآبادیاتی نظام کے ابتدائی برسوں میں ہونے والی تباہی اور بربادی کے متعلق نظریات کے ساتھ (جیسا کہ اس کے بارے میں عام طور پر مانا جاتا ہے) میل نہیں کھاتا۔ یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ کہ ہندوستان میں کچھ نہیں بدلا یا سارا بدلاؤ بھلے کے لئے ہی ہوا۔ کمپنی کا اقتدار زبردست طریقے سے مالیاتی تھا اور اس کا رجحان یوروپی تھا، ہندوستانی نہیں۔ سرکار کی پالیسیوں کا مقصد معاشی فائدہ تھا اور تمام ادارے اس مقصد کو دھیان میں رکھ کر آسان اور کارگر بنائے گئے۔ باوجود اس کے کہ مستقل بندوبست کے بارے میں بہت بڑھا چڑھا کر کہا گیا تھا۔ مستقل بندوبست (Permanent Settlement) ایک ایسا کاروباری اور سماجی قانون تھا جسے کمپنی نے بنگال میں نظام محصول میں استحکام لانے اور اپنی تجارت میں فائدے کے مقصد سے لاگو کیا تھا۔ اس کے تحت

محصولات وصولنے کا اختیار جو روایتی طور پر مغلوں نے زمینداروں کو سونپا تھا اب ان کی ملکیت میں شامل کر دیا گیا اور اب انھیں بیچا جاسکتا تھا۔ اس سے بنگال کے گاؤں میں ذاتی ملکیت کے رجحان میں اضافہ ہوا لیکن 1790 کے بعد قیمتوں میں گراوٹ سے چھوٹے کسانوں کو زبردست پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور اُن میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بندوبست کے نتیجے میں کسانوں کی مشکلات میں بہت اضافہ ہوا۔

اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی اقتدار نے ابتدائی برسوں میں ایسے دیسی اقتدار کو سہارا دیا جس کے پاس زمین اور کاروباری پونجی تھی لیکن اس سے غریب لوگوں کا نقصان ہی ہوا۔ بنگال میں اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ کمپنی محصولات کی وصولی کے معاملے میں بہت سخت تھی اور نقد محصول وصولتی تھی خواہ فصل جیسی بھی ہو۔ اس سے کسان بے سہارا ہو گئے جب کہ وہ سابقہ حکومت میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ کسان 79-1769 کے قحط میں زبردست مشکلات اور اموات کا شکار ہوئے۔ لیکن یہ سوچنا کہ زراعت میں بڑی مشکلات تھیں اور تمام کسانوں پر تباہی آگئی تھی، زیادہ ناامیدی کی بات ہوگئی۔ حقیقی حالات اور بھی پیچیدہ تھے۔ ریاست کے شمالی کنارے پر اور ندی کے بڑے میدانوں پر زرعی توسیع کا کام تیزی سے چل رہا تھا اور اس کے نتیجوں کا مزہ زمیندار اور جوتدار لے رہے تھے۔ ان کی حالت خصوصاً زمینداروں کی، بٹائی داروں اور زرعی مزدوروں کے مقابلے زیادہ بہتر تھی۔ حالاں کہ ہمیں اس معاملے میں زیادہ شواہد نہیں ملتے لیکن چند مورخین کا ماننا ہے کہ شمالی سرحدوں میں جوتدار کو لک مالک زمین کی طرح برتاؤ کر رہے تھے: وہ قرض دیتے تھے اور کم دوری کی زرعی تجارت میں لگے ہوئے تھے۔ اس صدی میں دیہی معیار زندگی میں ترقی ہوئی خاص طور پر صدی کے آخری برسوں میں جب اس کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔

جنوبی ہندوستان میں انگریزوں کی مداخلت سے جہاں ایک طرف نقد سودوں کا علاقہ بڑھا وہیں دوسری طرف میراث داروں (مالک زمین کاشتکار) نے گاؤں کے ٹھیکے دار کے طور پر اپنی پوزیشن مضبوط کر لی۔ ڈیوڈ لڈن کا کہنا ہے کہ یہ میراث دار اب کھیتی کے ساتھ ساتھ اجارہ داری اور مقامی سطح پر زرعی انتظام کا کام بھی سنبھالنے لگے۔ مہاجن میراث داروں نے اپنی زمین مزدوروں اور مختلف کاروباری پونجی کے ذریعہ سے مختلف مالی وسائل کو اکٹھا کیا۔ جس سے ان کے لئے گاؤں کے محصولات کی وصولی کا ٹھیکہ لینا آسان ہو گیا۔ لیکن اس سے گاؤں میں کم اختیارات والے فرقوں کی سماجی حالت میں خاص تبدیلی آئی اور انہیں مجبوراً سماج اور معاشی ماتحتی قبول کرنا پڑی۔ ڈیوڈ واش بروک اپنی تحقیق میں یہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح کمپنی کی سیدھی مداخلت نے دو مخالف عناصر ــــــ روایتی سماجی رشتوں اور جدید سمجھوتوں کا طریقہ، کو ایک ساتھ لا کر انہیں منظم کیا۔ ان میں پہلا موجودہ سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھنے کے لئے اور دوسرا بڑھتے ہوئے تجارتی مواقع کو اپنے فائدے کے موافق ڈھالنے کے لئے تھا۔ یہ دونوں ہی مزدوروں کے لئے نقصان دہ تھے۔ جہاں ایک طرف روایتی طرز پر چلے آرہے مزدوروں کی تحدید کے بندھنوں کو قانونی حیثیت عطا کی گئی وہیں دوسری طرف زرعی مزدوری مانگ اور سپلائی کے اصولوں پر طے کی جانے لگی اور وہ معاہدے کے تحت بے بس تھے۔ مزدور خصوصاً نچلی ذات کے، ایسے حالات میں دوہرے طور پر محروم ہوئے۔

کمپنی ایک سخت کاروباری منتظم بھی تھی۔ تجارت پر بلاشرکت اختیارات مسلط کرنے والے تاجر کی شکل میں اس کا ان آجروں (پروڈیوسروں) کے متعلق بہت سخت سلوک تھا جو اس کے ماتحت تھے اور اس سے لین دین کرتے تھے۔ مال کی ڈیلیوری کے معاملے میں وہ بہت سخت تھی اور ہمیشہ اپنے بنکروں کی مزدوری کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے انہیں اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافہ ہونے سے مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ قحط کے حالات میں مرنے والوں کی تعداد میں زیادہ تعداد کمپنی میں کام کرنے والے مزدوروں کی ہوتی تھی۔ پارتھا سارتھی نے جنوبی ہند کے کورومنڈل میں بنکروں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نئے نظام میں کاریگروں کی بڑھتی ہوئی مشکلات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق کمپنی میں کام کرنے والے کاریگر ایک ایسے نئے قسم کے پابند نظام مزدوری کے زیر تحت آگئے تھے جس سے ان کے کئی روایتی حقوق سلب ہو گئے تھے۔ اس سے ان کی مزدوری کم ہوئی اور ان کی مالی حالت میں گراوٹ آئی۔

لیکن ہمیں یہ بھی دھیان رکھنا چاہئے کہ کم سے کم بنگال میں یہ سخت معاملہ زیادہ تر سوتی کپڑے کے بنکروں پر لاگو نہیں تھا اور بہت سے کاریگروں نے اس سے بچنے کے راستے نکال لئے تھے۔ معمولی سوتی کپڑوں کے لئے بہت ابتدائی بازار تھا اور عمدہ کپڑے کی پیداوار بھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسے مشکل حالات میں سوتی کپڑے کی پیداوار کرنے والے اور گاؤں کے سوتی کپڑے کے تاجر اپنا کام ابھی اچھی طرح سے چلا سکتے تھے۔ اس تکلیف دہ پالیسی کے اثرات کے لئے ریشم کی صنعت ایک بہتر مثال ہو سکتی ہے جبکہ بنگال کی سورت کو ریشم کی برآمدات 1766 میں 0.45 ملین روپیہ سے گھٹ

کر 1789 میں 0.03 ملین روپیہ کا ہوگیا، وہیں شمال ہند کے بازار میں اس وقت اچھے دل رہے تھے۔ 1789 میں دیہاتوں میں بنگال کے خام ریشم کی کھیت 1.99 ملین روپئے تھی جو 1790 میں گھٹ کر 1.68 ملین روپیہ پر آگئی۔ اس بیچ بنگال میں ریشم کے شعبے میں کمپنی کی لاگت 1766 میں 0.92 ملین روپیہ سے بڑھ کر 1789 میں 5.54 ملین روپیہ ہوگئی۔ اس سے بنگال کی ریشم کی تجارت میں انتظامی تبدیلیاں آئیں اور وہ گھریلو بازار سے بین الاقوامی بازار کی طرف مڑگئی جس کے بڑے ہی سنجیدہ نتائج سامنے آئے۔ ریشم میں کمپنی کی لاگت کم ہونے سے اس کا برا اثر ریشم کی پیداوار کرنے والے (چاسر) اور ریشم لپیٹنے والوں کی آمدنی پر پڑا اور چونکہ سوتی کپڑوں کی پیداوار کے مقابلے ریشم کا گھریلو بازار بہت چھوٹا تھا، اس کے دوبارہ سنبھلنے کی امید بہت کم تھی۔ کوئی بھی سدھار بین الاقوامی بازار کی سمت پر منحصر تھا۔ 1790 کے آس پاس حالت میں کچھ سدھار تو آیا لیکن یوروپ میں نپولین کے ساتھ چھڑی جنگ کی وجہ سے جو گراوٹ آئی اس حالت پھر سے وہیں پہونچ گئی۔ اور آگے جانے پر 1813 کے بعد ہی بنگال کے ریشم کی برآمدات میں اضافہ ہوا تب تک مرشد آباد اور راج شاہی جیسے مقامات پر ریشم کی پیداوار کا مکمل زوال ہو چکا تھا۔

تجارتی لین دین کے شعبے میں، حجم اور مقدار میں اضافے کے باوجود کمپنی کی مداخلت کا یہ انجام ہوا کہ اس نے ہندوستانی معیشت کو شمالی۔ یوروپی ڈھانچے، تجارت اور پیداوار کے دائرے میں ڈھال دیا۔ یہ موافقت نئی نہیں تھی۔ یہ سترہویں صدی میں شروع ہوئی جب ہندوستان میں یوروپی تجارت کا مستقل طور پر پھیلاؤ ہوا اور اٹھارہویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اس کی تیزی نے اس عمل کو اور بھی تیز کر دیا۔ اب فرق یہی تھا کہ ہندوستانی نظام معیشت کے اہم جزو اب بین الاقوامی نظام معیشت کے اتار چڑھاؤ سے بندھ گئے تھے اور اس میں کسی طرح کی بھی گراوٹ آنے سے ہندوستانی معیشت کے ان اہم حصوں کو نقصان ہوتا یا ان کی انفرادی ترقی رک جاتی۔ اس کی وجہ سے کئی ہندوستانی خوشحال ہوئے۔ لیکن اس بڑھتے ہوئے اقتصادی مواقع سے معاشی فائدے میں جو اضافہ ہوا اس کے زیادہ تر حصے کا ہندوستان سے باہر کی طرف بہاؤ ہوا اور اس سے ملک کو کوئی بھی مناسب فائدہ نہیں پہونچا۔ ملک میں غیر منظّم ڈھنگ سے مالی اور کاروباری منافع خوری پھیلی ہوئی تھی۔ غیر سرکاری طور پر انگریزوں اور یوروپیوں نے انفرادی اجارہ داری کے ذریعہ افیم اور نیل کے بڑھتے بیوپار اور سیاسی حلقوں میں پھیلی ہوئی بے ایمانی سے بہت فائدہ کمایا۔ اس طرح سے جمع ہوئی رقم زیادہ تر انفرادی طور پر چلائی جانے والی بحری سفر کی غیر سرکاری کمپنیوں کے جہازوں یا پرتگالی تاجر کمپنیوں کے ذریعہ مشرقی ایشیاء خصوصاً مکاؤ اور کینٹن (چین کی جنوبی سرحد کے قریب کی دو بندرگاہ) بھیجی جاتی تھیں جہاں غیر مقیم یوروپی اس سے اور منافع کماتے تھے۔ ان ایجنسیوں کی آڑ میں یوروپی لوگوں کی تنخواہ، ابواب اور اکثر غیر قانونی ڈھنگ سے کمایا گیا دھن ہندوستان سے باہر لے جایا جاتا تھا۔ 1757 اور 1796 کے درمیان صرف بنگال سے ہی ان راستوں سے 17.67$ ملین دولت کو باہر بھیجا گیا۔ غیر سرکاری انفرادی تجارت میں لگائی گئی ہندوستانی پونجی کا زیادہ تر حصہ اس طرح سے بھیجی گئی رقم کی وجہ سے برباد ہوا۔

غیر سرکاری ذاتی دولت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بچت کا بہت بڑا حصہ، برطانیہ سرکاری طور پر نذرانہ کے طور پر بھیجا جانے لگا۔ یہ کلاسیکی معنی میں دولت کا بہاؤ (Drain of wealth) تھا جو ابتدائی برسوں میں ہندوستانی معیشت پر نوآبادیاتی نظام کے اثرات کو سمجھنے کی خاص بنیاد تھی اور ایک اندازے کے مطابق غیر سرکاری اور سرکاری دونوں ملاکر 90-1780 کے آس پاس یہ بہاؤ 4$ ملین تھا۔ ایک اور تھوڑے کم اندازے کے مطابق 1757 اور 1793 کے بیچ ہر سال 1.8 ملین پاؤنڈ اور 1.92$ ملین کی رقم کے بہاؤ کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اعداد وشمار کے پیش نظر غیر متنازعہ اعداد وشمار پیش کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ رقومات یقینی طور پر بہت زیادہ تھی۔ یہ صرف بڑی رقومات ہونے کی وجہ سے اہم نہیں تھے۔ 1720 کے آس پاس ایک کروڑ روپیہ (ملین .1$) کی بڑی رقم سالانہ بنگال سے دہلی بھیجی جاتی تھی۔ اس میں اور اٹھارہویں صدی کے آخر میں بھیجی گئی رقومات کی منتقلی میں بنیادی فرق یہ تھا کہ اب پہلی مرتبہ سرکاری تجارت کے ذریعہ سے ذاتی دولت بھیجی جارہی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور برطانیہ کے بیچ اس نقصان کو کم از کم جزوی طور پر پورا کرنے کے لئے مزدوروں اور پونجی کی تحریک نہیں تھی۔ جیسا کہ پہلے (مغل سلطنت میں) ہوتا تھا جب بہت بڑی رقم شاہی محصول کی شکل میں بنگال سے دہلی بھیجی جاتی تھی۔ لیکن ان معاشی نشانوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ استحصال ہندوستانی نظام معیشت کو مفلوج کرنے میں کامیاب رہا۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں صدی کے آخر تک مستحکم رہیں اور دولت کی کمی نہیں تھی۔ لیکن یہ غیر متنازعہ ہے کہ ہندوستان سے اتنی مقدار میں رقموں کے بھیجے جانے سے برطانیہ کے ہندوستان اور چین کے ساتھ توازن تجارت میں جو گھاٹا تھا اس سے وہ فرق کم ہوگیا جس سے کمپنی کو موقع مل گیا کہ وہ اپنی دولت کو ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنے اور اس کی توسیع کی طرف موڑ دے۔ اس کے لئے ہندوستانی حکمرانوں سے مالی امداد کو بڑھائے اور ہندوستانی و یوروپی غیر سرکاری ذاتی پونجی والوں سے اُدھار

لے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اپنی معیشت کے نو آبادیاتی منتقلی میں مدد کر رہا تھا۔

25.9 خلاصہ

اٹھارہویں صدی کی اہم خصوصیت مغل سلطنت کا زوال اور اس کے نتیجے کے طور پر علاقائی وصوبائی خودمختار ریاستوں کی پیدائش تھی۔ صدی کے وسط میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی اقتدار کے قیام کے ساتھ ہی ایک نیا عنصر سامنے آیا جس کا بہت گہرا اور دیرپا اثر تھا۔ اٹھارہویں صدی کی وضاحت مورخین نے دو نقطۂ نظر سے کی ہے۔ مورخین کا ایک گروہ جو مغل سلطنت کے زوال کو مرکوز المملکت (Emipre Centric) نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ سلطنت کا زوال بہت ہی انقلابی اور انتشار انگیز تھا جس نے بدنظمی اور عدم استحکام کو پیدا کیا۔ دوسرے گروہ کے مورخین جو اس زوال کو علاقائی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ حالاں کہ سلطنت کا زوال ہوا لیکن اس کے نتیجے کے طور پر کوئی بدنظمی یا عدم استحکام پیدا نہیں ہوا۔ علاقے متحرک ہو گئے جہاں سماجی ومعاشی سرگرمیوں میں نئی زندگی نظر آنے لگی اور ہندوستانی معیشت کی توسیع سیاسی مشکلات کے باوجود جاری رہی۔ یہ سلسلہ برطانوی حکومت کے قیام سے بالکل بھی بند نہیں ہوا گو کہ کئی اہم تبدیلیوں کی وجہ سے ہندوستانی معیشت پر غیر معمولی دباؤ بڑھ گیا۔

25.10 فرہنگ اصطلاحات

چودھری: پرگنے کی سطح کا نیم پشتینی عہدیدار جس کا کام محصول اکٹھا کرنا تھا۔

فلورین (Florin): چاندی کا سکہ:- اس کا چلن سب سے پہلے اٹلی کے فلورینس شہر میں بارہویں صدی میں ہوا اور جو اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے۔ ہندوستان میں ڈچ تاجروں نے اس کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ اس کی قیمت تقریباً 40 سینٹ تھی۔

جگت سیٹھ: اس کے لفظی معنی ہے ''پوری دنیا کا مہاجن (بینکر)''۔ یہ لقب بنگال کے جین مہاجنوں کو ملا تھا۔ سراج الدولہ کے دورِ حکومت میں اس وقت کے جگت سیٹھ نے سراج کے ماموں میر جعفر، امی چند اور رائے دُرلبھ کے ساتھ مل کر سراج کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ کیا تھا جس کی وجہ سے اُسے 1757 میں پلاسی کی جنگ میں شکست کھانی پڑی اور وہ اپنا اقتدار کھو بیٹھا۔

نظام جاگیرداری: سرکاری عہدیداران کو نقد تنخواہ کے بدلے زمین کے علاقے دیے جانے کا طریقہ۔ اس طرح سے دیئے گئے علاقے جاگیر کہلاتے تھے اور جن کو یہ زمین دی جاتی تھی وہ جاگیردار کہلاتے تھے۔ لیکن جاگیردار کو زمین کا حق ملکیت حاصل نہیں تھا بلکہ اس سے حاصل ہونے والی محصول کی رقم کا حق حاصل تھا۔ جاگیریں اکثر منتقل ہوتی رہتی تھیں۔

جوتیدار (Jotedars): گاؤں کے مالکِ زمین۔ جوتیدار عام طور پر زمیندار سے ان کی زمین پٹے پر لے کر اُسے ٹھیکے پر دے دیتا تھا اور اس میں بٹائی میں کھیتی کرواتا تھا۔ زمیندار ان زمینوں کو پٹے پر اس لئے دے دیتا تھا کہ ان پر کم لاگت میں کھیتی ہو سکے۔ لیکن اُن زمینوں یا جوت پر روایتی اصولوں کی بنیاد پر کسان کا حق تسلیم کیا جا سکتا تھا۔

نظام منصب داری: منصب کا معنی ہے عہدہ۔ مغل انتظام حکومت میں جو بھی شامل ہوتا تھا اس کو منصب دیا جاتا تھا جو

REFERENCE ONLY

دوہرے عہدے والا ہوتا تھا۔ ذات اور سوار۔ ذات سے اُس شخص کی سرکاری حیثیت معلوم ہوتی تھی جب کہ سوار سے مراد گھوڑوں کی وہ تعداد تھی جو اسے اپنے پاس سوار سمیت رکھنی ہوتی تھی۔

تعلقہ دار — زمیندار کا مترادف۔ یہ لفظ سترہویں صدی کے آخر برسوں میں استعمال میں آیا۔

زمیندار — پشتینی طور پر برتر حقوق رکھنے والا۔ زمیندار کو کل محصول کا کچھ فیصد کا حق حاصل تھا۔ عمومیت سے کل محصول کا 10 فیصد (حالاں کہ بعض علاقوں میں بعض حالات میں یہ 25 فیصد تک تھا) ملتا تھا۔ جب زمیندار حکومت کے لئے محصول وصول کرتے تو اس میں سے ان کے حق کو ان کا کیا جاتا تھا اور جب حکومت سیدھے کسانوں سے محصول وصول کرتی تو زمیندار کا حق مالکانہ کہلاتا تھا۔

25.11 مشقیں

(1) ''اٹھارہویں صدی عالمی زوال کی صدی تھی''۔ تبصرہ کیجیے۔

(2) ''مملکت پر مرکوز'' نظریہ (Emipre Centric) کا تنقیدی تجزیہ کریں۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ اٹھارہویں صدی ''بدنظمی اور لاقانونیت'' کی صدی تھی؟

(3) متحرک سماجی و معاشی سرگرمیوں کے مراکز کے طور پر علاقائی ریاستوں کے فروغ کے تناظر میں اٹھارہویں صدی کا جائزہ لیں۔

(4) اٹھارہویں صدی کے متعلق مورخین کے ''علاقائیت پرمبنی'' نظریہ کا جائزہ لیجیے۔

(5) اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی نظام معیشت کا تجزیہ کیجیے۔

(6) اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستانی نظام معیشت میں آپ کو کون کون سا تسلسل اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں؟

25.12 معاون کتب

مظفر عالم : دی کرائسس آف امپائر ان مغل نارتھ انڈیا، اودھ اینڈ دی پنجاب 1707-1748، دہلی، 1986۔

سیما علوی (مرتبہ) : دی ایٹینتھ سینچری ان انڈیا، دہلی۔ 2002۔

ایم اطہر علی : دی ایٹینتھ سینچری: این انٹرپریٹیشن؛ انڈین ہسٹوریکل ریویو، جلد 5، نمبر 2-1 79-1978۔

سی۔ اے۔ بیلے : رولرس، ٹاؤنس مین اینڈ بازارس: نارتھ انڈین سوسائٹی ان دی ایج آف برٹش ایکس پینشن 1770-1801، کیمبرج۔ 1983۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD
Accn No. MA-028
Date 03.08.2015
INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad-34

عرفان حبیب : دی ایٹینتھ سینچری ان انڈین اکونومک ہسٹری؛ سیما ملوی کی ''دی ایٹینتھ سینچری ان انڈیا''، دہلی 2002۔

پی۔ جے۔ مارشل (مرتب): دی ایٹینتھ سینچری اِن انڈین ہسٹری: ایوولیوشن اور ریوولیوشن، دہلی 2003۔

چیتن سنگھ :اے کریٹک آف ریویزنسٹ اپروچز، پروسیڈنگس آف انڈین ہسٹری کانگریس، 52واں سیشن، دہلی۔ 1991۔

برٹن اسٹین :اسٹیٹ فارمیشن اینڈ اکونومی ریکنسیڈرڈ؛ ماڈرن ایشین اسٹڈیز، جلد 19 نمبر۔3 جولائی۔1982۔